اللہ کے ولی

خان آصف

وَلی اللہ کون؟

ممتاز قلمکار خان آصف مرحوم کی دلوں کو منور کرنے والی کتاب ''اللہ کے وَلی'' کا پانچواں ایڈیشن پیش خدمت ہے۔ اُمید ہے یہ ایڈیشن بھی حسبِ سابق آپ کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے گا۔

وَلی اللہ بننے کے لئے اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا حاصل کرنا پڑتی ہے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے خالصتاً اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہونا پڑتا ہے۔

وَلی ہونا آسان نہیں۔ یہ بوریا نشین دنیا کی ہر نعمت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ یہ ایسے فقیر ہوتے ہیں جن کی خانقاہوں میں بادشاہ وقت برہنہ پا حاضر ہوتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں سے حاجت مندوں کی جھولیاں مُرادوں سے بھر دیتا ہے۔ یہ اپنے لئے کچھ نہیں مانگتے، ان کے ہاتھ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حضور دوسروں کیلئے پھیلتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو شکر کی ایسی کیفیت کو جانتے ہیں جو نعمتوں کو دوام بخشتی ہے۔ یہ شکر اور صبر جیسی عظیم نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کی کسی منزل اور ماحول کی کسی کشمکش میں بھی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وخوشنودی کی شاہراہ سے ڈانواں ڈول نہیں ہونے دیتے۔ اُنہیں کوئی نعمت دی جاتی ہے تو اللہ کے اس احسان کا شکر ادا کرتے ہیں اور کوئی آزمائش، آتی ہے تو صبر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں بھی صبر اور شکر کرنے والا بنائے۔

دعاؤں کا طالب

(میر جاوید رحمٰن)

فہرست

حضرت منصور حلاجؒ

ولادت......244ھ

وفات......309ھ

فارس کے شہر ''بیضا'' میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اسم گرامی حسین تھا۔ اور والد کا نام منصور حلاج۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ آپ کو والد کے نام سے شہرت دوام حاصل ہوئی۔ بیس سال کی عمر میں عظیم وجلیل صوفی بزرگ حضرت جنید بغدادیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ طویل سیر وسیاحت کی۔ اور تین بار حج بیت اللہ کی سعادت سے شرف یاب ہوئے۔ آپ صوفیائے کرام کی طویل تاریخ میں سب سے زیادہ متنازع شخصیت ہیں۔

سرعام ''انا الحق'' (میں حق ہوں) کا نعرہ لگایا کرتے تھے۔ بالآخر اسی نعرے کی بنیاد پر علمائے بغداد نے حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف فتویٰ دیا۔ اور ۱۸ ذی قعدہ ۳۰۹ ہجری کو آپ قتل کر دیئے گئے۔ مغربی مصنفین اور بہت سے غیر ذمہ دار فارسی اردو شاعروں نے ''انا الحق'' کے نعرے کو بہت اُچھالا تا کہ بے خبر اور کم علم مسلمانوں کے ذہن منتشر ہو جائیں۔

یہ اس جاں سوختۂ عشق کی داستان حیات ہے جو ایک معمولی باپ کا بیٹا تھا۔ وہ سولہ سال کی عمر میں گھر سے نکلا۔ سینے میں عشق کی چنگاری بچپن سے موجود تھی۔ پھر یہی چنگاری شعلہ بنی اور اس شعلے نے ایک عاشق کے پورے وجود کو پھونک ڈالا۔ اس کا معاملہ ''تاریخ عشاق'' کا بڑا عجیب اور اذیت ناک باب ہے۔ ہر سطر آتش فراق سے جلی ہوئی اور ہر سطر تمناؤں کے خون سے رنگی ہوئی۔ وہ عاشقوں کی طویل فہرست میں سب سے زیادہ متنازع عاشق ہے۔ ایک گروہ کا دعویٰ ہے کہ وہ شعبدہ باز تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر ملمع چڑھا لیا تھا اور عشق کا مصنوعی لباس پہن کر شہر در شہر گھومتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو ایک دھوکا تھے اور اس کی فغان نیم شب ایک فریب تھی۔ وہ عشاق کی قبا میں ایک دنیا دار انسان تھا۔ وہ عشق کا نام لے کر جذبوں کا جھوٹا کاروبار کرتا تھا۔ وہ اپنے عشق کی جانبازیوں کے افسانے سرعام سنایا کرتا تھا...... مگر حقیقتاً وہ ایک آرام طلب عاشق تھا۔ عشق کی جانگداز مشقوں سے نا آشنا...... اور دیار عشق میں نارسیدہ۔ اردو شاعر میر تقی میر کے بقول ؎

ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

وہ لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے کیلئے کھوکھلے نعرے لگایا کرتا تھا۔ اس کے دل سے کبھی آہ جگر گداز نہیں ابھری۔ وہ اپنے قول میں سچا نہیں تھا۔ بس زبانی باتیں کرتا تھا۔

اس کے برعکس دوسری جماعت سے عاشق جانباز تسلیم کرتی ہے۔ اس کے نزدیک موت جیسی خوفناک حقیقت عاشق کے ایک رنگین و پُر کیف خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ خاردار راستوں کو مخمل وریشم کی رہ گزر سمجھتا تھا۔ جب آفات ومصائب کی آتش سوزاں اس کے جسم کو چھوتی تھی تو وہ اس چھیڑ چھاڑ کو باد صبا کے جھونکوں کی شرارت کہتا تھا۔ جب محبت نا آشنا لوگ اس پر سنگ باری کرتے تھے تو اس جابرانہ کھیل کو گل پاشی سے تعبیر کرتا تھا۔ پھر جب اسے ایک تاریک زنداں کے حوالے کیا گیا تو اس نے اپنے عشق کی آگ سے دوسرے قیدیوں کی زنجیروں کو پگھلا دیا۔ آہنی

دروازے اس کے جذبۂ سوز دروں سے پگھل کر موم ہو گئے۔ پھر اس نے تمام اسیروں سے کہا کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ اس کے فیضِ عشق کے سبب سارے قیدی چھوٹ گئے۔ اسیروں نے زنداں سے رخصت ہوتے وقت اپنے محسن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ہمیں رہائی دینے کے بعد آپ خود زنجیریں پہنے کیوں بیٹھے ہیں۔؟''

عاشق جانباز اس وقت وصال کی لذتوں سے مخمور تھا۔ زنجیروں کو بوسہ دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یہ آہن فولاد، عاشق کا زیور ہیں۔ اگر انہیں اتار پھینکوں تو پھر میں عاشق کہاں رہوں گا؟ عشق سر بازار عالم رسوا ہو جائے گا اور میں عشق کی رسوائی برداشت نہیں کر سکتا۔''

قیدیوں نے کہا۔ ''آپ نے ہمیں آزادی کا پروانہ بخش دیا مگر خود یہاں سے کیوں نہیں نکلتے۔''

عاشق جاں سوز پر انتہائی سرشاری کی کیفیت طاری تھی۔ جذب و کیف کے لہجے میں بولا۔ ''یہ زنداں تو میرا گھر ہے۔ تم نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہے جو خوشی سے اپنا گھر چھوڑ کر چلا جائے۔''

پھر جب داروغۂ زنداں کو معلوم ہوا کہ اس شخص کی وجہ سے تمام قیدی فرار ہوئے ہیں تو وہ غضب ناک ہو کر کہنے لگا۔ ''تجھے معلوم ہے کہ تو نے قانون شکنی کی ہے۔ اس جرم کی پاداش میں زنداں کے اندھیرے اور بڑھا دیئے جائیں گے۔''

عاشق جانباز نے قانون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''تم مجھے تاریکیوں سے ڈراتے ہو۔ اگر تمام زمانے کے اندھیرے بھی لا کر یہاں جمع کر دو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ روشنی تو میرے اندر ہے۔ میں اسی روشنی سے زندان وقت میں چراغاں کر لوں گا۔''

اہل ستم کو شدید حیرت تھی اور جفا کار پریشان نظر آ رہے تھے کہ وہ کس مزاج کا عاشق ہے؟ مرا غالب کے بقول۔

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

ہاں! وہ اسی انداز کا مقتول تھا کہ اس نے قتل ہونے سے پہلے اپنے قاتلوں کو معاف کر دیا۔ اس کے عشق پر گواہی دیتے ہوئے اپنے وقت کے بڑے بڑے عارفوں نے کہا تھا۔

''وہ سرمست ازل تھا اور بڑی نرالی شان کا عاشق تھا۔ اس کے بعد اس جیسا کوئی دوسرا عاشق نہیں آیا۔''

اسے اس بے وفا اور ناپائیدار دنیا سے گئے ہوئے گیارہ صدیاں گزر چکی ہیں مگر وہ آج بھی مست و بے خود عاشقوں کی محفل میں میر مجلس کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ عشق گزیدہ صوفی ہوں یا اردو، فارسی زبانوں کے شاعر، جب بھی بے خودیٔ عشق کے معیار کا حوالہ دیا جاتا ہے تو سب کی زبانوں پر بے اختیار اسی کا نام آتا ہے۔

موسم آیا تو نخل دار پہ میر
سر منصور ہی کا بار آیا!

یہ عاشق جانباز تھے، حضرت حسین بن منصور حلاجؒ جو اپنے جذب و کیف اور سرور و مستی کیلئے ایران و عراق اور برصغیر پاک و ہند میں عجیب شہرت رکھتے ہیں۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

آپ کا اسم گرامی حسین تھا۔ باپ کا نام منصور حلاج تھا۔ حلاج عربی زبان میں جلاہے کو کہتے ہیں۔ چونکہ شیخ حسینؒ کے والد روئی دھننے کا کام کرتے تھے، اس لئے پیشہ ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ عام طور پر یہی مشہور ہے لیکن مؤرخ خطیب بغدادی نے اس روایت کی نفی کی ہے۔ بغدادی شیخ ابوعبدالرحمٰنؒ کے حوالے سے تحریر کرتا ہے کہ حسین بن منصور کو ''حلاج'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بار عراق کے شہر واسطہ میں ایک دھنیے (جلاہے) کی دکان پر پہنچے اور اسے کسی کام کیلئے بھیجنا چاہا۔ دھنیے نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کا کام کر دیتا مگر مجبوری یہ ہے کہ مجھے شام تک روئی دھن کر دینا ہے۔ اگر میں آج یہ کام نہ کر سکا تو مجھے اُجرت نہیں ملے گی۔''

حضرت شیخ حسینؒ بن منصور نے اس دھنیے سے فرمایا۔

''تم میرا کام کر دو، میں تمہارا کام کر دوں گا۔''

آپ کی بات سن کر جلاہا چلا گیا۔ پھر جب وہ کام کر کے واپس لوٹا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دکان میں موجود ساری روئی دھنی ہوئی رکھی تھی۔ یہ روئی کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ اسے دو چار ماہ میں بھی دھننا دشوار تھا۔ پھر اس جلاہے نے دوسرے لوگوں پر یہ راز فاش کر دیا۔ نتیجتاً حضرت حسین بن منصورؒ ''حلاج'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔

بعض روایتوں کے مطابق حضرت حسین بن منصور اپنی ابتدائی حالت میں اسرار پر گفتگو کرتے تھے۔ لوگوں کے چھپے ہوئے بھید ظاہر کر دیتے اور مریدوں کے دلوں کی باتیں بتا دیتے تھے۔ اس لئے پہلے آپ کا نام ''حلاج الاسرار'' پڑ گیا۔ بعد میں حلاج کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ بہر حال تاریخ کا یہ بھی بڑا عجیب زاویہ ہے کہ ایک بیٹے نے اپنے باپ کے نام سے شہرت دوام حاصل کی۔

حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کوئی معتبر روایت موجود نہیں۔ بعض مؤرخین نے صرف اندازے اور قیاس کے سہارے 244ھ کو آپ کا سال ولادت قرار دیا ہے۔ حضرت منصور حلاجؒ کی کنیت ''ابومغیث'' ہے مگر مشہور مؤرخ طبری اور خطیب بغدادی کے نزدیک ابو عبداللہ...... آپ کے دادا کا نام محمی تھا جو اپنے عقائد کے اعتبار سے مجوسی (آتش پرست) تھا۔ محمی ''بیضا'' کا رہنے والا تھا جو فارس (ایران) کا ایک شہر ہے۔ حضرت شیخ حسینؒ کے والد منصور کے حالات کا کسی کو علم نہیں مگر یہ امر طے شدہ ہے کہ انہوں نے آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔

مؤرخ خطیب نے تاریخ بغداد میں حضرت شیخ حسینؒ کے صاحب زادے احمد سے روایت کیا ہے کہ ان کے والد حسین بن منصورؒ بیضا کے ایک موضع ''طور'' میں پیدا ہوئے مگر نشو و نما ''تستر'' میں ہوئی۔

حضرت حسین بن منصورؒ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا...... مگر جب وہ سولہ سال کے ہوئے تو مشہور بزرگ حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

گردش وقت نے حضرت منصور حلاجؒ کو ایک متنازع شخصیت بنا دیا ہے۔ اس لئے ان بزرگوں کا ذکر ضروری ہے، جن کی نگرانی میں حضرت حسین بن منصورؒ کی روحانی تربیت ہوئی تھی۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کا شمار صوفیائے کرام میں ہوتا ہے۔ آپ تین سال کی عمر ہی سے اپنے ماموں شیخ محمد بن سوارؒ کے ساتھ عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ حضرت سہلؒ نے ابتداء میں قرآنی تعلیم حاصل کی اور سات سال کی عمر سے روزہ رکھنے لگے۔ پھر جب بارہ سال کی عمر میں ایک فقہی مسئلہ پیش آیا تو آپ مشہور بزرگ حضرت شیخ حبیب حمزہؒ کی خدمت میں بصرہ حاضر ہوئے۔ حضرت شیخؒ نے چند لفظوں میں وہ مشکل ترین مسئلہ حل کر دیا۔ آپ حضرت حبیب حمزہؒ کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ پھر کچھ دن بصرہ میں رہ کر حضرت شیخؒ کی صحبت سے فیضیاب ہوئے اور بعد میں اپنے شہر تستر لوٹ آئے۔ پھر آپ کا یہ معمول بن گیا کہ دن کو روزے رکھتے اور رات کو جو کی دو ٹکیاں کھا کر شکم کی آگ بجھا لیتے۔ بعض روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ حضرت سہلؒ نے سات سات دن تک کچھ نہیں کھایا۔ آپ ممنوع ایام کے سوا ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور راتیں یادِ الٰہی میں گزارتے تھے۔

پھر ایک ایسا نازک وقت بھی آیا کہ اہل تستر نے حضرت سہل بن عبداللہؒ پر کفر کا فتویٰ عائد کر دیا۔ آپ لوگوں کی اس تنگ نظری سے اس قدر دلبرداشتہ ہوئے کہ اپنا سارا اثاثہ فروخت کر کے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے اور یہ عہد کر لیا کہ آئندہ کسی سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ پھر جب آپ مسلسل فاقہ کشی کرتے ہوئے کوفہ پہنچے تو آپ کے نفس نے سوال کیا۔

''سہل بن عبداللہ! تم نے مجھ پر بہت مظالم ڈھائے ہیں۔ پھر بھی اگر تم مجھے مچھلی اور روٹی کھلا دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ مکہ معظمہ تک کوئی شے طلب نہیں کروں گا۔''

اپنے نفس کی آواز سن کر حضرت سہل بن عبداللہؒ مچھلی اور روٹی کی تلاش میں نکلے۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ ایک اونٹ چکی چلا رہا ہے اور چکی کا مالک قریب ہی بیٹھا ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہؒ اس شخص کے پاس پہنچ کر فرمانے لگے۔ ''دن بھر کی محنت کے بعد تم اونٹ والے کو کیا دیتے ہو؟''

چکی کے مالک نے حیرت سے ایک مفلوک الحال شخص کو دیکھا اور بے پروائی سے کہا۔ ''میں اونٹ کے مالک کو دو دینار دیتا ہوں۔''

حضرت سہل بن عبداللہؒ نے فرمایا۔ ''تمہاری بڑی مہربانی ہوگی کہ اگر تم اونٹ کو کھول کر اس کی جگہ مجھے باندھ دو۔ میں تم سے دن بھر کی محنت کے بعد صرف ایک دینار طلب کروں گا۔''

الغرض حضرت سہل بن عبداللہؒ نے پوری توانائی کے ساتھ چکی چلائی اور شام کو ایک دینار لے کر مچھلی اور روٹی خریدی۔ پھر جب کھانا کھا چکے تو آپ نے اپنے نفس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''جب بھی تو مجھ سے بھوک کی شکایت کرے گا تو اس طرح محنت کرنی پڑے گی۔''

اس کے بعد حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ نے ارکان حج ادا کئے اور مشہور صوفی بزرگ حضرت

ذوالنون مصریؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔

حضرت سہل بن عبداللہؒ کی یہ خاص عادت تھی کہ نہ تو آپ کبھی دیوار سے ٹیک لگاتے، نہ پاؤں پھیلاتے اور نہ کبھی کسی کے سوال کا جواب دیتے۔ ایک بار مسلسل چار ماہ تک آپ کے پاؤں کی انگلیوں میں شدید درد رہا۔ حضرت سہلؒ نے کسی کے سامنے اس درد کا اظہار تک نہیں کیا اور خاموشی سے اپنے پاؤں پر پٹی باندھ لی۔ پھر جب ایک شخص نے اس کا سبب پوچھا تو حضرت سہل بن عبداللہؒ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دن بعد وہی شخص مصر پہنچ کر حضرت ذوالنونؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سہل بن عبداللہؒ کی طرح حضرت شیخؒ کے پاؤں کی انگلیوں پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

''شیخ! یہ کیا ہے؟'' اس شخص نے حضرت ذوالنون مصریؒ سے پوچھا۔

''میں چار مہینے سے پاؤں کے درد میں مبتلا ہوں۔'' حضرت ذوالنون مصریؒ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

''بڑی عجیب بات ہے۔'' اس شخص نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے مرید سہل بن عبداللہؒ کے پاؤں میں بھی پٹی بندھی ہوئی ہے۔''

یہ سن کر حضرت ذوالنون مصریؒ کے چہرۂ مبارک پر محبت کا ایک خاص رنگ ابھر آیا، پھر آپ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔

''سہل کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو میرے درد کو محسوس کرتے ہوئے اس طرح پیروی کرے۔''

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت سہل بن عبداللہؒ کو اپنے پیر و مرشد سے کس قدر محبت تھی؟

ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ حضرت سہل بن عبداللہؒ بیٹھے بیٹھے رونے لگے۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو آپ نے حسب معمول کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر دوسرے دن حاضرین مجلس نے خلاف معمول آپ کو دیوار سے پشت لگائے اور پاؤں پھیلائے ہوئے دیکھا۔ لوگوں کو حضرت سہلؒ کے اس طرزِ عمل پر بڑی حیرت تھی مگر ادب و احترام کے پیش نظر کوئی بھی اس تبدیلی کی وجہ دریافت نہیں کر سکا۔ یکایک آپ حاضرین کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

''تم لوگ مجھ سے بہت سوال کیا کرتے تھے۔ اب تمہیں جو کچھ پوچھنا ہے، پوچھ لو۔''

ایک شخص نے بصد احترام عرض کیا۔ ''شیخ! یہ کیسا انقلاب ہے کہ آپ کل تک کسی کے سوال کا جواب نہیں دیا کرتے تھے مگر آج فرما رہے ہیں کہ جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو۔''

''پیر و مرشد کا اتنا احترام تو لازم ہے کہ ان کی زندگی میں مرید کسی سوال کا جواب نہ دے۔'' حضرت سہل بن عبداللہؒ نے فرمایا۔

لوگوں نے اس واقعے کو اپنے ذہنوں میں محفوظ کر لیا۔ پھر جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ وہی

وقت تھا جب ایک دن پہلے حضرت ذوالنون مصریؒ نے انتقال فرمایا تھا۔ حضرت سہل بن عبداللہؒ اپنے پیرومرشد کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ جب تک حضرت ذوالنون مصریؒ حیات رہے، آپ نے کسی مجلس میں نہ دیوار سے پشت لگائی اور نہ لوگوں کے سامنے پاؤں پھیلائے۔

ایک جابر حاکم عمرولیث ایک بار ایسا بیمار ہوا کہ طبیبوں نے اسے لاعلاج قرار دیدیا۔ پھر ہر طرف سے مایوس ہوکر اس نے حضرت سہل بن عبداللہؒ سے درخواست کی کہ وہ اس کی صحت کیلئے دعا فرمادیں۔

آپ نے نہایت جرأت مندانہ لہجے میں فرمایا۔ ''دعا اس شخص کے حق میں اثر انداز ہوتی ہے جو اپنے گناہوں سے تائب ہو چکا ہو۔ اس لئے تم زندگی بھر کی معصیت سے توبہ کرو۔ پھر میں دعا کروں گا۔''

عمرولیث نے بآواز بلند اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور حق تعالیٰ سے مغفرت کا طالب ہوا۔

پھر حضرت سہل بن عبداللہؒ نے عمرولیث کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اب تم ان تمام قیدیوں کو رہا کرو جو تمہارے جبر ناروا کو برداشت کررہے ہیں۔''

عمرولیث نے کسی حیل وحجت کے بغیر تمام اسیروں کو رہا کردیا۔

اس کے بعد حضرت سہل بن عبداللہؒ نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھادیئے۔ ''اے اللہ! جس طرح تونے اس شخص کو اپنی نافرمانی کی ذلت عطا کی، اسی طرح میری عبادت کی عظمت بھی اسے دکھادے۔''

ابھی حضرت سہل بن عبداللہؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ عمرولیث نے اپنے جسم میں نئی توانائی محسوس کی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بستر علالت سے اس طرح اٹھ کھڑا ہوا جیسے کبھی بیمار ہی نہیں تھا۔

پھر حضرت شیخؒ رخصت ہونے لگے تو عمرولیث نے نذر کے طور پر ایک کثیر رقم پیش کی۔ آپ نے شان بے نیازی کے ساتھ نذر قبول کرنے سے انکار کردیا اور عمرولیث کے محل سے نکل کر اپنی خانقاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ حضرت سہل بن عبداللہؒ کا ایک مرید بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ اس نے حریصانہ لہجے میں عرض کیا۔

''شیخ! اگر آپ حاکم کی نذر قبول فرمالیتے تو میں قرض سے سبکدوش ہوجاتا۔''

''میں اتنی معمولی رقم کس طرح قبول کرلیتا۔؟'' مرید کی بات سن کر حضرت سہل بن عبداللہؒ نے فرمایا۔

''معمولی رقم؟'' پیرومرشد کے ارشادگرامی پر مرید کو شدید حیرت تھی۔

''تونے ابھی دولت کہاں دیکھی ہے؟'' یہ کہہ کر حضرت سہل بن عبداللہؒ نے اپنے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ''دولت اسے کہتے ہیں۔''

مرید نے نظر اُٹھائی تو ہر طرف سونا ہی سونا تھا۔

''خلاق عالم نے جسے مرتبہ عطا کیا ہو، اسے دولت کی تمنا کیسے ہوسکتی ہے؟'' حضرت سہل بن عبداللہؒ نے فرمایا۔

روایت ہے کہ آپ پانی پر بھی اسی طرح چلتے تھے جیسے عام راستے پر۔ کسی شخص نے کشتی کے بغیر آپ کو دریا عبور کرتے دیکھ لیا۔ پھر جب آپ کی اس کرامت کا شہرہ ہوا تو لوگوں نے برسرِ مجلس پوچھا۔

''شیخ! ہم نے سنا ہے کہ آپ کو دریائی سفر میں کشتی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔''

جواب میں حضرت سہل بن عبداللہؒ نے فرمایا۔ ''اب میں اپنی زبان سے کیا کہوں؟ میرے بارے میں مسجد کے مؤذن سے پوچھ لو، وہ جھوٹ نہیں بولتا۔''

پھر جب لوگوں نے مؤذن سے پوچھا کہ کیا اس نے حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کو پانی پر چلتے ہوئے دیکھا ہے تو مؤذن نے حیران ہوکر کہا۔

''اس کا تو مجھے علم نہیں مگر ایک بار ایسا ضرور ہوا تھا کہ شیخ حوض پر نہاتے ہوئے پھسل کر گرنے لگے تو میں تیزی سے آگے بڑھا اور انہیں تھام لیا۔''

لوگ مؤذن کی بات سن کر خاموش ہوگئے۔ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوعلی دقاقؒ فرماتے ہیں

''حضرت سہل بن عبداللہؒ صاحب کرامت ولی تھے مگر خود کو لوگوں کی نظروں سے چھپاتے تھے۔''

ایک بار حضرت سہل بن عبداللہؒ کو ریگستان میں ایک شکستہ حال بڑھیا ملی۔ آپ نے ضعیف خاتون کی مدد کرنی چاہی تو اس نے زمین سے کچھ ریت اٹھا کر اپنی مٹھی میں بند کرلی۔ حضرت سہل بن عبداللہؒ نے دوبارہ بوڑھی عورت سے اس کی ضرورت کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنی مٹھی کھول دی جو سونے سے بھری ہوئی تھی۔ پھر وہ حضرت سہل بن عبداللہؒ کو مخاطب کرکے کہنے لگی۔

''تم تو اپنی جیب سے رقم نکالتے ہو مگر مجھے غیب سے ملتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ بوڑھی عورت یکایک غائب ہوگئی۔

پھر جب حضرت سہل بن عبداللہؒ مکہ معظمہ پہنچ کر طواف کعبہ میں مصروف تھے تو اچانک آپ نے دیکھا کہ وہ بوڑھی عورت بھی طواف کررہی ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہؒ کو اس بات پر بڑی حیرت تھی کہ ایک ضعیف خاتون دور دراز کا سفر طے کرکے بیت اللہ تک کس طرح پہنچی؟ ابھی آپ یہ سوچ رہے تھے کہ بوڑھی عورت کی رفتار سست ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد فاصلے کم ہوگئے اور جب حضرت سہل بن عبداللہؒ ضعیف خاتون کے نزدیک پہنچ گئے تو اس نے کہا۔

''جو اختیاری طور پر یہاں آتے ہیں انہیں سواری کی ضرورت ہوتی ہے اور جو اضطرار کی کیفیت میں سفر کرتے ہیں، خدا غیب سے انہیں اسباب فراہم کرتا ہے۔''

حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کے بہت سے اقوال مبارکہ مشہور ہیں مگر ہم اختصار کے سبب چند اقوال ہی تحریر کرتے ہیں تاکہ قارئین حضرات منصور حلاجؒ کے پہلے پیرومرشد کے عقائد ونظریات سے آگاہ ہوسکیں۔

آپ نے فرمایا۔ ''جس وجد وحال کے لئے قرآن وحدیث میں دلیل موجود نہ ہو، وہ لغو اور باطل ہے۔''

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا۔ ''دوسروں کی بہ نسبت عالم کا درجہ زیادہ بلند ہے مگر عالم کی

شناخت یہ ہے کہ روز ازل جو مقدرات طے ہو چکے ہیں، ان پر مطمئن اور خوش رہے۔" پھر فرمایا کہ "علماء کی بھی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلا وہ عالم جو اپنے علم ظاہری کو عام لوگوں کے سامنے پیش کر دے۔ دوسرا وہ عالم جو علوم باطنی کو اہل باطن کے روبرو بیان کرے...... اور تیسرا وہ عالم جس کے علم کو اس کے اور اللہ کے سوا کوئی نہ جانتا ہو۔"

ایک بار فرمایا۔ "سب سے بڑی معصیت جہالت ہے۔"

حضرت سہل بن عبداللہ کا مشہور قول ہے کہ اسلام کے زریں اصول تین ہیں (1) اعمال میں سرور کونین حضور اکرم ﷺ کا اتباع (2) رزق حلال کا استعمال (3) اور افعال میں اخلاص۔

ان اقوال مبارکہ کی روشنی میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ اپنی تمام تر روحانیت کے باوجود کس قدر باہوش بزرگ تھے۔ حضرت حسین بن منصورؒ سب سے پہلے اسی مرد جلیل کی صحبتوں سے دو سال تک فیضیاب ہوئے۔

پھر ایک دن تستر کے باشندوں نے دیکھا کہ حضرت منصور حلاجؒ اپنے پیرومرشد کی خانقاہ سے نکل کر بصرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب انہیں نئے مرشد یا شیخ کی تلاش تھی۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔

"یہاں میرے قلب کو سکون حاصل نہیں ہوا۔"

دراصل حضرت حسین بن منصورؒ فطرتاً ایک بے قرار طبیعت کے مالک تھے۔ اس لئے حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کی صحبتوں سے پُرسکون نہ ہو سکے...... اور اس وقت حضرت منصور حلاجؒ کی عمر بھی صرف اٹھارہ سال تھی۔ شاید اسی نوعمری نے انہیں کسی ایک جگہ چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔

☆☆..............☆☆..............☆☆

الغرض حضرت منصور حلاجؒ اٹھارہ سال کی عمر میں مشہور بزرگ حضرت شیخ عمرو بن عثمان مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرت حسین بن منصورؒ کے جسم پر صرف دو رنگین کپڑے تھے۔ ایک چادر اور ایک تہبند۔

حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کا شمار اکابر صوفیاء میں ہوتا ہے۔ آپ صاحب علم بھی تھے اور صاحب تقویٰ بھی۔ صحیح بخاری کی روایت کرتے تھے اور آپ کو اس دور کے محدثین میں ایک بلند مقام حاصل تھا۔ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ بڑے بڑے مشائخ کی صحبتوں سے فیضیاب ہوئے مگر حقیقتاً آپ حضرت جنید بغدادیؒ کے شاگرد تھے اور ہمیشہ اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ انہوں نے جنیدؒ جیسے مرد باصفا سے روحانی فیض حاصل کیا ہے۔ آپ ایک عرصۂ دراز تک مکہ معظمہ میں معتکف رہے۔ جس کے سبب "پیرحرم" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے حضرت منصور حلاجؒ پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ مشہور مؤرخ خطیب بغدادی نے محمد علی بن کنانی کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے کہ جب منصور حلاجؒ مکہ معظمہ پہنچے تو ایک گدڑی میں ملبوس تھے۔ ہم لوگوں نے قریب جا کر دیکھا تو ان کی

پوری گدڑی جوؤں سے بھری ہوئی تھی۔ بعض جوئیں منصورؒ کا خون پیتے پیتے غیر معمولی جسامت اختیار کر گئی تھیں۔ انہیں اپنی ریاضت کی وجہ سے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ لباس بدل ڈالیں یا کپڑوں کو جوؤں سے صاف کر لیں۔

دوسرے بزرگ ابو یعقوب نہرجوریؒ بیان کرتے ہیں کہ حسین بن منصورؒ پہلی بار مکہ معظمہ میں آئے تو سال بھر تک مسجد حرام کے صحن ہی میں بیٹھے رہے۔ وضو اور طواف کے سوا کسی وقت بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے تھے۔ انہیں نہ بارش کی پرواہ تھی اور نہ دھوپ کی۔ شام کے وقت حسین بن منصورؒ کیلئے ایک روٹی اور ایک کوزے میں پانی لایا جاتا تھا۔ آپ کھانے سے پہلے ایک گھونٹ پانی پیتے تھے۔ پھر روٹی کے چاروں طرف سے ایک ایک نوالہ توڑ کر کھاتے تھے۔ اس کے بعد ایک گھونٹ پانی پیتے تھے اور باقی روٹی کو پانی کے کوزے پر رکھ دیتے تھے جسے بعد میں ان کے سامنے سے ہٹا لیا جاتا تھا۔

ان ریاضتوں سے گزر کر حضرت منصور حلاجؒ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر باقاعدہ حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کی صحبتوں سے فیضیاب ضرور ہوئے تھے مگر بیعت نہیں کی تھی۔ اس روایت کی روشنی میں حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ ہی ان کے مرشد اوّل تھے۔

بہرحال حضرت شیخؒ کی اجازت سے حضرت منصور حلاجؒ نئی ریاضتوں اور مجاہدات میں مشغول ہو گئے۔

اسی زمانے میں ایک دن مشہور بزرگ ابوعبداللہ مغربیؒ اپنے مرید خاص ابراہیم بن شیبانؒ کے ساتھ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کے سلام کیلئے حاضر ہوئے۔ دونوں بزرگوں میں بہت دیر تک مختلف مسائل پر بات چیت ہوتی رہی۔ اچانک گفتگو کے دوران ہی میں حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ نے حضرت ابوعبداللہ مغربیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"یہاں جبل ابوقبیس پر ایک جوان بیٹھا ہے جو زیارت کے قابل ہے۔"

حضرت ابوعبداللہ مغربیؒ غائبانہ طور پر اس جوان کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے کیونکہ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ جیسے بزرگ نے اس جوان کی تعریف کی تھی۔ الغرض کچھ دیر بعد حضرت عبداللہ مغربیؒ، ابراہیم بن شیبانؒ کے ہمراہ خانقاہ سے اٹھے اور پہاڑ ابوقبیس کی طرف جانے لگے۔

حضرت ابراہیم بن شیبانؒ نے بصد احترام عرض کیا۔ "شیخ! کس طرف کا ارادہ ہے؟"

حضرت ابوعبداللہ مغربیؒ نے فرمایا۔ "تم نے سنا نہیں کہ کچھ دیر پہلے شیخ عمرو بن عثمانؒ کسی جوان کی تعریف کر رہے تھے؟ پھر میں اس کی زیارت سے کس طرح محروم رہ سکتا ہوں۔"

مرشد کا جواب سن کر حضرت ابراہیم بن شیبانؒ خاموش ہو گئے۔

پھر جب حضرت ابوعبداللہ مغربیؒ پہاڑ ابوقبیس پر پہنچے تو دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔ آپ نے ایک

جوان کو دیکھا جو تپتے ہوئے پتھر پر بیٹھا تھا اور اس کے چہرے سے پسینہ بہہ کر پتھر پر ٹپک رہا تھا۔ حضرت ابوعبداللہ مغربیؒ چند لمحوں تک اس جوان کو بہت غور سے دیکھتے رہے جس کی آنکھیں بند تھیں اور جو دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ پھر آپ نے اپنے مرید خاص کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''ابراہیم! واپس چلو۔''

حضرت ابراہیم بن شیبانؒ نے حیرت زدہ لہجے میں عرض کیا۔ ''آپ نے پہاڑ پر چڑھنے میں اس قدر مشقت برداشت کی۔ کیا اس جوان سے ملاقات نہیں کریں گے؟''

''ہرگز نہیں؟'' حضرت ابوعبداللہ مغربیؒ نے فرمایا اور پہاڑ سے اترنے لگے۔ حضرت ابراہیم شیبانؒ راستے بھر پیرومرشد کے اس عمل پر حیران رہے۔

پھر نیچے آ کر حضرت ابوعبداللہ مغربیؒ نے نہایت پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ''ابراہیم! اگر تم زندہ رہے تو اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ اس شخص کے ساتھ کیا سانحہ پیش آئے گا؟''

حضرت ابراہیم بن شیبانؒ کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ آپ نے بصد احترام عرض کیا۔

''پیرومرشد بہتر جانتے ہیں۔''

حضرت ابوعبداللہ مغربیؒ نے فرمایا۔ ''تم دیکھتے نہیں کہ یہ بے عقل انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری دکھا رہا ہے۔ خلاق عالم نے سایہ پیدا کیا اور یہ شخص جلتی دھوپ میں بیٹھا ہے۔ اسی حماقت کی وجہ سے حق تعالیٰ اسے ایسی بلا میں مبتلا کریں گے جسے یہ برداشت نہیں کر سکے گا۔''

حضرت ابراہیم بن شیبانؒ فرماتے ہیں کہ دوسرے دن ہم نے لوگوں سے جوان کے بارے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ منصور حلاجؒ ہیں۔

پھر آنے والے زمانے نے حضرت ابوعبداللہ مغربیؒ کی پیش گوئی کو درست ثابت کر دیا مگر اس سلسلے میں حضرت حسین بن منصور حلاجؒ قطعاً بے قصور تھے۔ وہ جاں سوختۂ عشق تھے۔ ان کے اپنے سینے میں جو آگ کا شعلہ بھڑک رہا تھا، اس کے سامنے سورج کی گرمی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

حضرت منصور حلاجؒ اٹھارہ ماہ تک حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی خدمت میں حاضر رہے اور اس عارف کامل سے اکتساب فیض کرتے رہے۔ حضرت منصور حلاجؒ کی عادت تھی کہ اپنے پیرومرشد سے عجیب عجیب سوال کرتے تھے مگر حضرت عمرو بن عثمانؒ ہمیشہ یہی تلقین فرماتے تھے۔

''حسین! معرفت کے راستے میں صبر و استقامت پہلی شرط ہے۔ جوش اور اضطراب سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے حضرت منصور حلاجؒ اور پیرومرشد حضرت عمرو بن عثمانؒ کے درمیان میں ایک خلیج سی حائل ہو گئی۔ واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ ایک دن حضرت منصور حلاجؒ حضرت شیخؒ کے سامنے ابویعقوب اقطع کی لڑکی سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت عمرو بن عثمانؒ نے واضح الفاظ میں فرمایا۔

''حسین! یہ شادی تمہارے لئے نفع بخش ثابت نہیں ہوگی۔ تم اور بے قرار ہو جاؤ گے۔''

حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی اس ہدایت کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت منصور حلاجؒ جیسے انسان کیلئے شادی مناسب نہیں تھی یا پھر ابویعقوب اقطع کی لڑکی ان کیلئے ناموزوں تھی۔ بہرحال حقیقت کچھ بھی ہو، حضرت منصور حلاجؒ نے حضرت عمرو بن عثمانؒ کی اس ہدایت پر عمل نہیں کیا اور پیرومرشد کی مرضی کے بغیر شادی کر لی۔ اگرچہ شادی سنت ہے لیکن معرفت کے راستے میں حضرت منصور حلاجؒ حکم شیخ سے روگردانی کے مرتکب ہوئے۔ یہ حضرت عمرو بن عثمانؒ اور حضرت منصور حلاجؒ کے درمیان کشیدگی کی ابتداء تھی۔

پھر یہ کشیدگی اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب حضرت عمرو بن عثمانؒ کا ایک قلمی رسالہ کسی نے چرا لیا۔ یہ رسالہ تصوف کے ان اسرار و رموز پر مشتمل تھا جسے ایک عام انسان تو کیا، بڑے بڑے عالم و فاضل لوگ بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ حضرت عمرو بن عثمانؒ اس رسالے کو بڑی حفاظت کے ساتھ چھپا کر رکھتے تھے مگر ان ساری احتیاطوں کے باوجود وہ نسخہ چوری ہو گیا۔ یہ ایک انتہائی نایاب رسالہ تھا جس کے گم ہو جانے پر حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ بہت افسردہ نظر آ رہے تھے۔ پھر آپ نے اپنے تمام مریدوں اور شاگردوں کو جمع کر کے پوچھا۔

''تم میں سے وہ کون شخص ہے جس نے میرے حجرۂ خاص میں داخل ہو کر رسالہ چرایا ہے؟''

تمام لوگ خاموش رہے۔ اس وقت حضرت منصور حلاجؒ بھی مجلس میں موجود تھے۔

حضرت عمرو بن عثمانؒ نے دوبارہ یہی سوال کیا مگر جواب میں کسی کے ہونٹوں کو جنبش نہ ہوئی۔

دراصل وہ رسالہ حضرت منصور حلاجؒ نے پیرومرشد کے حجرے سے اُٹھا لیا تھا مگر حضرت شیخ کے مسلسل پوچھنے کے بعد بھی آپ خاموش رہے۔

آخر حضرت عمرو بن عثمانؒ برہم ہو گئے اور آپ نے انتہائی غضب کے عالم میں بددعا دی۔ ''تم سب لوگ پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن لو کہ جس شخص نے بھی میرا رسالہ چرایا ہے، اس کے دست و پا قطع کر کے اسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ پھر اسے نذر آتش کر کے اس کی راکھ دریائے دجلہ میں بہا دی جائے گی۔''

بڑی خوفناک بددعا تھی۔ حاضرین مجلس لرز کر رہ گئے۔ مگر حضرت حسین بن منصور حلاجؒ سکون و اطمینان کے ساتھ بیٹھے رہے۔

بعض روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کی نیت چوری کی نہیں تھی۔ اپنے ذوق تجسس سے مجبور ہو کر انہوں نے وہ رسالہ حضرت شیخؒ کے حجرے سے اٹھا لیا تھا۔ پھر اس کی نقل کرنے کے بعد پیرومرشد کو واپس کر دیا تھا۔ حضرت منصور حلاجؒ کے اعتراف کے بعد بھی حضرت عمرو بن عثمانؒ کا دل ان کی طرف سے صاف نہیں ہوا تھا۔ جب منصور حلاجؒ نے رسالہ واپس کیا تو پیرومرشد نے انتہائی ناگوار لہجے میں فرمایا۔

''حسین! تجھے اس رسالے کی نقل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہ معرفت کے وہ اسرار ہیں جن تک تیری رسائی ممکن نہیں۔''

کسی معتبر تاریخ سے پتا نہیں چلتا کہ حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے اس فعل پر ندامت محسوس کرتے ہوئے پیرومرشد سے معافی مانگی ہو۔ ہم اس نازک موضوع پر رائے زنی کا کوئی استحقاق نہیں رکھتے مگر ظاہری طور پر یہی محسوس ہوتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نے دومرتبہ پیرومرشد کے حکم سے اختلاف کیا۔ اب یہ ان کی جذب و مستی کا عالم تھا یا ہوش مندی کا؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

بعض بزرگوں نے حضرت عمرو بن عثمانؒ کی بددعا کو ان کے اضطراری عمل کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ چونکہ حضرت شیخؒ کو رسالے کی چوری سے شدید اذیت پہنچی تھی، اس لئے اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ بہرحال واقعہ کچھ بھی ہو، حضرت عمرو بن عثمانؒ کی بددعا رنگ لا کر رہی اور حضرت منصور حلاجؒ کو قدم بہ قدم اسی تکلیف دہ مرحلے سے گزرنا پڑا۔

اکثر تاریخ نگاروں نے حضرت عمرو بن عثمانؒ کی ناراضی کا تیسرا سبب بھی بیان کیا ہے۔ روایت ہے کہ ایک دن حضرت منصور حلاجؒ کچھ تحریر کر رہے تھے۔ اسی دوران میں حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ تشریف لے آئے اور اپنے شاگرد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''حسین! کیا لکھ رہے ہو؟''

حضرت حسین بن منصورؒ نے عرض کیا۔ ''ایسی عبارت تحریر کر رہا ہوں جو قرآن کا مقابلہ کر سکے۔''

یہ سنتے ہی حضرت عمرو بن عثمانؒ نے غضب ناک ہو کر فرمایا۔ ''پہلے تیرے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں گے۔ پھر سولی پر چڑھا کر نذر آتش کیا جائے گا۔ اس کے بعد تیرے جسم کی راکھ دریائے دجلہ میں بہادی جائے گی۔''

بعد میں آنے والے محققین نے اس روایت کو ضعیف اور مجہول قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم کا جواب لکھنا کھلا ہوا کفر ہے اور حضرت منصور حلاجؒ سے تمام تر اختلافات کے باوجود ان پر کفر کا الزام ثابت نہیں کیا جا سکا تھا۔ وہ اپنے جذب و مستی کے باوجود صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ حضرت عمرو بن عثمانؒ کی بددعا کا تعلق قرآن کا جواب لکھنے سے نہیں، رسالے کی چوری سے تھا۔

الغرض اس واقعے کے بعد حضرت منصور حلاجؒ کا اضطراب اور بڑھ گیا۔ پھر یہی وحشت انہیں حضرت جنید بغدادیؒ کے آستانۂ عالیہ پر لے گئی۔

معاذ اللہ! اگر حضرت منصور حلاجؒ قرآن کریم کا جواب لکھنے کی کوشش کرتے تو حضرت جنید بغدادیؒ انہیں اپنے حلقۂ بیعت میں کس طرح شامل فرماتے؟ چونکہ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ بھی حضرت جنید بغدادیؒ کے شاگرد تھے، اس لئے وہ اپنے استاد گرامی کو حضرت منصور حلاجؒ کے عقائد و نظریات سے آگاہ کر سکتے تھے ...... اور پھر حسین بن منصورؒ پر درس گاہ جنیدیہ کے دروازے ہمیشہ کیلئے بند ہو جاتے مگر تاریخ گواہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے نہ صرف انہیں اپنے مکتب میں داخل ہونے کی اجازت دی بلکہ بیعت سے بھی سرفراز فرمایا۔ اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کا جواب لکھنے کی روایت سراسر مہمل اور جھوٹ ہے، اختراع اور بہتان ہے۔

اگرچہ حضرت منصور حلاجؒ کی شادی کو بھی بہت دن ہو گئے تھے اور انہوں نے شیخؒ کا رسالہ بھی

واپس کر دیا تھا مگر ان کی طرف سے حضرت عمرو بن عثمانؒ کا دل صاف نہیں ہوا تھا۔ جب بھی حسین بن منصورؒ کا ذکر آتا تو آپ کی پیشانی مبارک پر شکن پڑ جاتی۔ بعض روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ حضرت عمرو بن عثمانؒ ہمیشہ انتہائی ناخوشگوار لہجے میں اپنے شاگرد کا ذکر کرتے۔ پھر حضرت عمرو بن عثمانؒ کے شاگرد خاص ابویعقوب نہرجوریؒ بھی منصور حلاجؒ کی مخالفت پر اتر آئے اور جوش غضب میں انہیں نازیبا کلمات کے ساتھ یاد کرنے لگے۔ حضرت منصور حلاجؒ، حضرت جنید بغدادیؒ سے اس اذیت ناک سلوک کی شکایت کرتے تو آپ انہیں صبر و سکون کی تلقین فرماتے۔

''حسین! وہ تمہارے استاد ہیں، تم ان کی خاطر داری کرتے رہو۔''

حضرت منصور حلاجؒ تقریباً ایک سال تک حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں رہے۔ پھر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور ایک سال تک مجاور مکہ رہے۔ اس دوران حضرت منصور حلاجؒ سے بے شمار کرامات ظاہر ہوئیں۔

ایک بار کچھ فاقہ کش اور شکستہ حال لوگ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے۔ ''شیخ! ہماری مدد کرو۔''

''میں تمہاری کیا مدد کروں؟'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''میں تم سے بھی زیادہ مفلوک الحال ہوں۔ تم میرا چہرہ اور لباس نہیں دیکھتے۔''

ضرورت مندوں نے عرض کیا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ آپ مستجاب الدعوات ہیں۔ اگر ظاہری طور پر کچھ نہیں دے سکتے تو پھر ہمارے حق میں دعا فرما دیجئے۔''

حضرت منصور حلاجؒ مختلف بہانوں سے انہیں ٹالتے رہے مگر جب وہ لوگ کسی طرح بھی نہیں مانے تو آپ نے اپنا دایاں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر عرض کیا۔

''جب آپ نے اپنے بندوں کو میری طرف متوجہ کیا ہے تو پھر خود ہی ان کی ضرورت کا سامان فراہم کیجئے۔''

یہ کہہ کر حضرت منصور حلاجؒ نے اپنا ہاتھ نیچے کیا تو اس میں درہم موجود تھے۔ پھر آپ نے وہ درہم حاجت مندوں میں تقسیم کر دیئے۔ ان تمام درہموں پر ''قل ھواللہ احد'' لکھا ہوا تھا۔

کسی شخص نے پوچھا۔ ''شیخ یہ کیا ماجرا ہے اور ان سکوں پر آیت قرآنی تحریر ہونے کا کیا مفہوم ہے؟''

حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''یہ خالص قدرت کا عطیہ ہے۔ اس لئے ہر درہم پر ''قل ھواللہ احد'' تحریر ہے۔''

پھر یہ ایک معمول سا بن گیا۔ جب بھی کوئی ضرورت مند پریشان کرتا تو آپ اسی طرح فضا میں ہاتھ بلند کر دیتے اور پھر مٹھی میں بھرے ہوئے درہم اس کے حوالے کر دیتے۔ یہ کرامت اس قدر تواتر کے ساتھ ظاہر ہوئی کہ پڑھے لکھے مسلمان بھی حضرت منصور حلاجؒ کو شعبدہ باز کہنے لگے۔ پھر جب کسی شخص نے مشہور بزرگ حضرت ابن عطاؒ سے ان واقعات کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا۔

’’منصور حلاج کے قبضے میں جن ہیں اور یہی جن آناً فاناً ان کا کام کر دیتے ہیں۔‘‘

ایک دن حسین بن منصور حلاجؒ اپنی ریاضت میں مشغول تھے۔ اسی دوران میں ایک عقیدت مند ملاقات کیلئے حاضر ہوا۔ حضرت منصورؒ کو استغراق کے عالم میں دیکھ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ حضرت منصور حلاجؒ کو آواز دے کر مخاطب کر سکے۔ چنانچہ وہ اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ حضرت شیخؒ آنکھیں کھولیں تو عرض حال کرے۔ آخر بہت دیر گزر گئی مگر حضرت منصور حلاجؒ مراقبے کی کیفیت سے باہر نہ آئے۔

اچانک اس شخص نے ایک بہت بڑا بچھو دیکھا جو حضرت منصور حلاجؒ کے عقب سے برآمد ہوا اور پھر آپ کے گرد چکر لگانے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ شخص بے اختیار چیخ اٹھا۔ انسانی چیخ سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے فرمایا۔

’’میرے بھائی! تمہیں کیا تکلیف پہنچی ہے جو اس طرح چیخ رہے ہو؟‘‘

’’شیخ! ایک بہت زہریلا اور خوف ناک بچھو آپ کی عبا میں چھپ گیا ہے۔‘‘ ابھی وہ شخص اپنے چیخنے کا سبب بیان ہی کر رہا تھا کہ وہ بچھو دوبارہ حضرت منصور حلاجؒ کے عقب سے نکلا۔

’’وہ دیکھئے!‘‘ یہ کہہ کر وہ شخص اٹھا اور اس نے غیر معمولی جسامت رکھنے والے بچھو کو مارنے کی کوشش کی۔

’’خبردار! اسے ہاتھ نہ لگانا۔‘‘ حضرت منصور حلاجؒ کی پُر جلال آواز گونجی۔

وہ شخص رک گیا اور عرض کرنے لگا۔ ’’شیخ! یہ ایک نہایت موذی اور زہریلا کیڑا ہے۔ اس کی موجودگی کے سبب کسی وقت بھی آپ کو نقصان پہنچ جانے کا احتمال ہے۔‘‘

’’تو کیا جانے کہ یہ کون ہے؟‘‘ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ’’یہ بارہ برس سے ہمارا ندیم (دوست) ہے اور اسی طرح ہمارے گرد گھومتا رہتا ہے۔‘‘

اس شخص نے یہ واقعہ دوسرے لوگوں کے سامنے بیان کیا تو بعض افراد نے بے ساختہ کہا۔ ’’حضرت منصور حلاجؒ باکرامت ولی ہیں اور یہی ان کی ولایت کی پہچان ہے کہ ایک زہریلا کیڑا اپنی فطری تاثیر کھو چکا ہے۔‘‘

مگر جب مکہ معظمہ کے علمائے ظاہر نے یہ بات سنی تو نہایت برہم لہجے میں کہا۔ ’’یہ طلسمی داستان ہے۔ خرافات سے لبریز ایک افسانہ ہے۔ فرضی باتیں ہیں، تو جھوٹ بولتا ہے۔‘‘

اس شخص نے قسم کھا کر کہا۔ ’’یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔‘‘

علمائے ظاہر نے جواب دیا۔ ’’تو پھر تری نظروں کو دھوکا ہوا ہے۔ منصور حلاجؒ ولی باکرامت نہیں، ایک شعبدہ باز ہیں۔‘‘

ایک ایسی ہی کرامت دیکھ کر مشہور بزرگ حضرت شیخ ابن عطاء نے فرمایا تھا۔ ’’منصور حلاجؒ کے قبضے میں جن ہیں۔‘‘ مگر اب علمائے ظاہر برملا کہنے لگے تھے کہ منصور حلاجؒ شعبدہ باز ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے آپ کی مخالفت کا آغاز ہوا۔

ایک دن حضرت منصور حلاجؒ کے خدمت گاروں اور عقیدت مندوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ وہ بات ہی ایسی تھی۔ جب لوگوں نے حضرت منصور حلاجؒ کو ان کے حجرۂ مبارک میں تلاش کیا تو وہ غائب تھے۔ اگر عام حالات میں حضرت منصورؒ موجود نہ ہوتے تو کوئی حیرت کی بات نہ ہوتی...... مگر جب کسی کمرے کا دروازہ بند ہو اور دروازے پر ایک دربان کی طرح کئی خدمت گار حاضر ہوں اور اس کے باوجود ایک شخص اپنے کمرے سے غائب ہو جائے تو پھر حیران ہونے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔

تمام مرید اور خدمت گار ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ ’’شیخ! کہاں تشریف لے گئے؟‘‘ مگر کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد لوگوں نے ایک ناقابل یقین منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ حضرت حسین بن منصورؒ شیر پر سوار تشریف لا رہے تھے۔ حاضرین سوچ رہے تھے کہ وہ خواب کی حالت میں ایک خوفناک منظر دیکھ رہے ہیں...... مگر وہ خواب نہیں، ایک زندہ حقیقت تھی۔

حضرت منصور حلاجؒ شیر سے اترے اور اس درندے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ’’بس اب تم جاؤ۔‘‘

شیر نے حضرت منصور حلاجؒ کی طرف دیکھا، سر جھکایا اور چپ چاپ چلا گیا۔ وہاں موجود لوگوں پر شدید خوف کی کیفیت طاری تھی۔ پھر جب وہ شیر چلا گیا تو بعض خدام نے عرض کیا۔ ’’شیخ! یہ کیا تھا؟‘‘

حضرت حسین بن منصور حلاجؒ نے بے نیازانہ فرمایا۔ ’’مجھے ایک سفر درپیش تھا۔ حق تعالیٰ نے اپنے بندے کو غیب سے ایک سواری فراہم کر دی۔ اس کائنات میں جو کچھ موجود ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اسی کے فضل و کرم سے اِن تمام چیزوں پر اس کے بندوں کا حق ہے۔ پھر تم اس بات پر حیرت زدہ کیوں ہو؟‘‘

حضرت منصور حلاجؒ کے خدمت گاروں اور عقیدت مندوں نے عوام کے سامنے اس واقعہ کو بیان کیا تو لوگوں نے باآواز بلند اقرار کیا۔ ’’یہ حضرت شیخؒ کا منصب خاص ہے۔ آپ ہی اس طرح کی کرامت کا اظہار کر سکتے ہیں۔‘‘

پھر جب ذی ہوش لوگوں تک یہ خبریں پہنچیں تو ان حضرات نے بیک زبان کہا۔ ’’یہ بات انسانی ذہن سے بالاتر ہے، ہمیں یقین نہیں آتا۔‘‘

بعض علماء نے اس واقعے پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔ ’’منصور حلاجؒ ایک ساحر ہیں، وہ اپنی جادوگری کے کرتب دکھا کر مخلوق خدا کو متاثر کرنا چاہتے ہیں مگر انہیں اپنے شعبدوں کے مظاہرے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔‘‘

بہرحال یہ وہی زمانہ تھا جب حضرت منصور حلاجؒ شدید مشقتیں اور ریاضتیں کر رہے تھے اور ابتداء ہی میں ان کی شخصیت متنازع بن گئی تھی۔ صاحبان عقیدت و خدمت انہیں ولی کامل قرار دیتے تھے...... اور صاحبان علم و فضل حضرت منصور حلاجؒ کے کمالات کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے انہیں

غیر معتبر قرار دیتے تھے۔ یہ ان لوگوں کا طرزِ عمل تھا جو اظہار کے سلسلے میں محتاط رویہ رکھتے ہیں......اس کے برعکس علماء کی وہ جماعت جو مذہب کے معاملے میں زیادہ جذباتی تھی، اس نے کھلے الفاظ میں حضرت منصور حلاجؒ کو ساحر اور شعبدہ باز قرار دیدیا تھا۔

☆☆.................☆☆.................☆☆

الغرض مکہ معظمہ میں ایک سال گزارنے کے بعد حضرت منصور حلاجؒ بغداد تشریف لائے تو ان کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی۔ درویشوں کی ایک بڑی جماعت ان کے ہمراہ تھی اور وہ تمام درویش حضرت منصور حلاجؒ کو اپنا مخدوم تصور کرتے تھے۔ یہ صورتحال دیکھ کر اہلِ بغداد نے اندازہ کر لیا کہ اب منصور حلاجؒ طالبِ معرفت نہیں رہے بلکہ خود منصب ''مشیخیت'' پر فائز ہیں اور ولایت کے مدعی ہیں۔

لوگوں کی یہ قیاس آرائی اس وقت درست ثابت ہوئی جب حضرت منصور حلاجؒ درویشوں کی جماعت کے ساتھ اپنے پیرومرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہم اپنے ایک مضمون میں حضرت جنید بغدادیؒ کے سلسلے میں یہ بات بہت تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ حضرت شیخؒ اپنی علمی مجلسوں میں ہر کس و ناکس کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے......مگر چونکہ حسین بن منصور حلاجؒ حاضر ہوئے تھے، اس لئے انہیں فوری اجازت مل گئی۔ پھر جب منصور حلاجؒ خانقاہ میں داخل ہوئے تو ان کے ہمراہ درویشوں کی ایک جماعت تھی......اور یہ درویش اپنی حرکات و سکنات سے ظاہر کر رہے تھے کہ منصور حلاجؒ ان کے پیشوا ہیں۔ بعض معتبر مؤرخین نے لکھا ہے کہ ایک سال تک مجاورِ مکہ رہنے کے بعد حضرت حسین بن منصور حلاجؒ پیرومرشد کی بارگاہ معرفت میں اس طرح ظاہر ہوئے کہ ان کے چہرے، لباس اور رفتار سے ''مخدومانہ'' شان ظاہر ہوتی تھی اور خادمانہ ادا رخصت ہو چکی تھی۔

یہ حضرت جنید بغدادیؒ کی درویشانہ تواضع تھی کہ آپ اپنے شاگرد کے ساتھ اسی محبت سے پیش آئے......اور بہت دیر تک منصور حلاجؒ سے ان کے گزشتہ حالات پوچھتے رہے۔

پھر جب حضرت جنید بغدادیؒ نے سکوت اختیار فرمایا تو حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے پیرومرشد سے معرفت کا ایک مسئلہ دریافت کیا۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

حضرت منصور حلاجؒ نے مختصر سے سکوت کے بعد اپنا سوال پھر دہرایا۔

اس بار بھی حضرت جنید بغدادیؒ نے خاموشی اختیار کی اور منصور حلاجؒ کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔

حضرت منصور حلاجؒ نے تیسری بار بھی وہی سوال کیا اور حضرت جنید بغدادیؒ نے اس طرح بے توجہی کا مظاہرہ کیا۔

آخر منصور حلاجؒ کے چہرے پر ناخوشگواری کا رنگ ابھر آیا اور وہ اپنے درویشوں کو لے کر خانقاہ سے چلے گئے۔

یہاں یہ نکتہ غور طلب ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ کے طرزِ عمل سے ناراضی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس بات کو حاضرینِ مجلس میں سے ایک ایک فرد نے محسوس کر لیا تھا......مگر حضرت منصور حلاجؒ پیرومرشد کی

اس ناراضی کو کیوں محسوس نہیں کر سکے حالانکہ وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں حضرت شیخؒ کے زیادہ مزاج آشنا تھے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ اکثر اوقات جذب و مستی کے عالم میں رہا کرتے تھے مگر اس روز وہ اپنے پورے ہوش و حواس میں تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو منصور حلاجؒ عقل و خرد کے حوالے سے ایک نازک سوال نہ کرتے۔ پھر جب وہ ہوش میں تھے تو انہوں نے پوری شدت کے ساتھ حضرت جنید بغدادیؒ کی ناراضی کا احساس کیوں نہیں کیا؟ اور اگر احساس کیا تو مجلس شیخ سے اٹھ کر کیوں چلے گئے؟ پیرومرشد کے قلب مبارک پر ناخوشی کا جو غبار آ گیا تھا، اسے صاف کیوں نہیں کیا؟ اگر حضرت جنید بغدادیؒ اپنے شاگرد سے خفا تھے تو منصور حلاجؒ نے پیرومرشد کو منایا کیوں نہیں؟ کیا منصور حلاجؒ کے نزدیک شیخؒ کی ناراضی کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی؟

ہم اس موقع پر حضرت امیر خسروؒ اور سلطان علاء الدین خلجی کے حوالے سے ایک تاریخی واقعے کا ذکر کرتے ہیں جسے پڑھ کر قارئین کو اندازہ ہوگا کہ شیخ کی خوشی یا ناخوشی کیا ہوتی ہے۔ مشہور روایت ہے کہ فرمانروائے ہند سلطان علاء الدین خلجی حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا جبکہ محبوب الٰہیؒ ہر بار ملاقات سے انکار کر دیتے تھے۔ پھر ایک وہ منزل بھی آئی کہ سلطان علاء الدین نے اپنے قاصد کے ذریعے حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا اور اپنی درخواست میں واضح طور پر تحریر کر دیا۔

''اگر حضرت شیخ مجھے باریابی کا شرف نہیں بخشیں گے تو میں ایک دن اجازت کے بغیر ہی حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔''

والیٔ ہندوستان کا خط پڑھ کر حضرت محبوب الٰہیؒ نے ان الفاظ میں اپنا جواب تحریر کرایا۔ ''علاء الدین! میرے گھر کے دو دروازے ہیں، اگر تو ایک دروازے سے داخل ہوگا تو میں دوسرے دروازے سے نکل کر چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد بھی تنگ کرے گا تو میں تیرا ملک ہی چھوڑ دوں گا کیونکہ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔''

علاء الدین نے مایوس ہو کر حضرت امیر خسروؒ سے رجوع کیا۔ امیر خسروؒ نے سلطان سے وعدہ کر لیا کہ وہ کسی دن مناسب موقع دیکھ کر فرمانروائے ہند کو حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں لے چلیں گے۔ پھر جب حضرت امیر خسروؒ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے ایک روز خلوت میں علاء الدین سے معذرت کر لی۔

''سلطان معظم! میں اس حکم کو بجالانے سے قاصر ہوں۔''

''تمہارا انکار نافرمانی کے مترادف ہے۔'' علاء الدین نے برہم لہجے میں کہا۔ ''خسرو! تم اس نافرمانی کی سزا جانتے ہو؟''

''جانتا ہوں سلطان معظم'' حضرت امیر خسروؒ نے ایک مطلق العنان حکمراں کے ہیبت و جلال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔ ''آپ کی نافرمانی کی زیادہ سے زیادہ سزا یہ ہوگی کہ مجھے قتل کر دیا جائے گا اور میری دنیا خراب ہو جائے گی......مگر پیرومرشد کی نافرمانی کی کم سے کم سزا یہ ہوگی کہ میری

آخرت خراب ہو جائے گی......اور میں اتنا کم عقل ہرگز نہیں ہوں کہ دنیا کے بدلے میں آخرت کا سودا کرلوں۔"

اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرید کیلئے پیر و مرشد کی رضا اور خوشی کیا حیثیت رکھتی ہے؟

بہرحال حضرت جنید منصور حلاجؒ حضرت جنید بغدادیؒ کی خانقاہ سے اُٹھ کر چلے گئے۔ منصورؒ کے جانے کے بعد کسی شاگرد نے عرض کیا۔ "شیخ! کیا حلاج کا سوال جواب طلب نہیں تھا؟"

"حسین کا سوال جواب طلب تھا۔" حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ "مگر دشواری یہ تھی کہ حسین خود مدعی بن کر آئے تھے۔ تحقیق و جستجو ان کا مقصد نہیں تھا۔"

حضرت جنید بغدادیؒ کے قول مبارک کی تشریح یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے حضرت منصور حلاجؒ ایک طالب کی حیثیت سے درس گاہ میں داخل ہوتے تھے مگر اس باران کی آمد اور سوال کرنے کا انداز مدعیانہ تھا یعنی وہ خود استادانہ شان کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

دوسرے یہ کہ جب حضرت منصور حلاجؒ خانقاہ میں داخل ہوئے تو خرقہ پہنے ہوئے تھے اور ان کی شان مشائخ جیسی تھی۔ نظام خانقاہی کا یہ بنیادی اصول ہے کہ کوئی مرید، شیخ کی مرضی کے بغیر خرقہ خلافت نہیں پہن سکتا اور اسی طرح کسی سے بیعت بھی نہیں لے سکتا۔ بعض مؤرخین نے واضح طور پر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ کی اجازت کے بغیر نہ صرف خرقہ پہن لیا تھا بلکہ لوگوں کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طرف سے حضرت جنید بغدادیؒ کے دل میں کدورت پیدا ہو گئی تھی......مگر آپ نے زندگی بھر اس کا اظہار نہیں کیا۔ صرف سوال کا جواب نہ دینے کے واقعہ سے بعض صوفیاء نے اندازہ کر لیا کہ حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت منصور حلاجؒ سے ناراض تھے۔

اس کے برعکس حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ نے اپنا رسالہ چرانے والے کو بددعا دی کہ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں، پھر جسم کو نذر آتش کر کے اس کی راکھ دریائے دجلہ میں بہا دی جائے۔ اگرچہ حضرت شیخؒ کو چوری کرنے والے کا نام معلوم نہیں تھا لیکن ان کی بددعا کا ہدف حضرت منصور حلاجؒ ہی تھے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کی درس گاہ سے اٹھ جانے پر بعض مؤرخین نے اس طرح تبصرہ کیا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ، اپنے مرشد حضرت جنید بغدادیؒ سے متوحش اور آزردہ خاطر ہو گئے۔ اس وحشت اور آزردگی کا ایک ہی سبب تھا کہ حضرت جنید بغدادیؒ، حسین بن منصورؒ کے سوالوں کا جواب نہ دے سکتے تھے۔ یہ سوالات کیا تھے، کسی مؤرخ یا محقق نے ان کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ بس قیاس کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عشق کے اضطراب اور خلش نے انہیں وحشت زدہ بنا دیا تھا اور پھر اسی عالم میں وہ اپنے اساتذہ سے عجیب عجیب سوال کرتے تھے۔

ان واقعات کی روشنی میں حالات کا ایک ہی رخ سامنے آتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ اپنے پہلے

استاد حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کی اجازت کے بغیر حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ ان کے اضطراب کی ابتدا تھی۔ منصور حلاجؒ کا خیال تھا کہ وہ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی صحبت میں سکون پا جائیں گے اور ان کی وحشت ختم ہو جائے گی مگر یہاں پہنچ کر تو معاملہ اور بھی سنگین ہو گیا۔

اٹھارہ ماہ کی صحبت اور رفاقت بھی ان کے پیچ و تاب اور خلش کو دور نہ کر سکی۔ پھر جب حضرت منصور حلاجؒ اپنے دوسرے استاد حضرت عمرو بن عثمانؒ کی درس گاہ سے اٹھے تو مرشد کی بددعائیں ان کے ساتھ تھیں۔ اہل نظر سمجھتے تھے کہ حضرت جنید بغدادیؒ ان کی بے قراریوں کا علاج کر دیں گے مگر مشیت الٰہی نے منصور حلاجؒ کیلئے کچھ اور ہی رقم کر لیا تھا۔ وہ اپنے تیسرے استاد اور مرشد کے آستانہ عالیہ سے بھی شدید اضطراب کے عالم میں اٹھے۔ پھر یہ خلش ایک آگ بن گئی اور حضرت منصور حلاجؒ زندگی بھر اس آگ میں جلتے رہے۔

بعض مؤرخین نے حضرت جنید بغدادیؒ کی ناراضی کے واقعے کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر غیر ذمہ دارانہ انداز میں تحریر کیا ہے "تذکرۃ الاولیاء" میں حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ لکھتے ہیں۔

"منصور حلاجؒ ایک سال تک مجاور مکہ رہے۔ پھر بغداد پہنچ کر اپنے مرشد حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تصوف و معرفت کے حوالے سے چند سوالات کئے جنہیں سن کر حضرت شیخ خاموش رہے۔ منصور حلاجؒ نے اپنے سوالات دہرائے تو حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

"حسین! تم بہت جلد لکڑی کے ٹکڑے کو سرخ کرو گے۔" مطلب یہ تھا کہ پھانسی کا تختہ منصور حلاجؒ کے خون سے سرخ ہو جائے گا۔

بعد میں آنے والے محققین نے اس روایت کو غلط ثابت کر دیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ اپنے شاگرد سے ناراض ضرور تھے مگر آپ نے منصور حلاجؒ کو نہ بددعا دی تھی اور نہ ان کے مصلوب ہونے کی پیش گوئی کی تھی۔ یہ افسانہ طرازوں کا ستم ہے کہ ان لوگوں نے حضرت منصور حلاجؒ کو بدنام اور مطعون کرنے کیلئے غلط حوالے پیش کئے۔

بعض روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ بھی حضرت منصور حلاجؒ کے استاد تھے۔ اس سلسلے میں ہماری نظروں سے کوئی تفصیل نہیں گزری مگر یہ امر طے شدہ ہے کہ حسین بن منصورؒ حضرت شیخ نوریؒ کی صحبتوں سے بھی فیضیاب ہوئے تھے۔

حضرت منصور حلاجؒ کے صاحبزادے احمد کی روایت ہے کہ میرے والد حضرت جنید بغدادیؒ کی درس گاہ سے نکل کر تستر چلے آئے۔ اس سفر میں میری والدہ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔

تستر پہنچ کر حضرت منصور حلاجؒ کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اس شہرت کی وجہ آپ کی وہ مسلسل کرامات تھیں جن کے اظہار نے عوام سے لے کر خواص تک کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔

ایک دن حضرت منصور حلاجؒ اپنے خدمت گاروں اور عقیدت مندوں کے ساتھ مجلس میں بیٹھے تھے۔ اچانک کسی طرف سے ایک شخص نمودار ہوا اور حضرت منصور حلاجؒ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''حسین! تم یہ احمقوں اور جاہلوں کا مجمع لگائے کیا بیٹھے ہو؟''

''آؤ! تم بھی بیٹھ جاؤ۔'' حضرت حسین بن منصور نے فرمایا۔ ''تمہارے لئے بھی جگہ خالی ہے۔''

''تم ان ہی بے خبر لوگوں کو متاثر کر سکتے ہو۔'' اس دریدہ دہن شخص نے کہا۔ ''ولایت کا دعویٰ کرتے ہو مگر میں جانتا ہوں کہ تم کچھ نہیں جانتے۔''

''میں ولایت کا مدعی ہوں اور نہ آگہی کا دعویٰ کرتا ہوں مگر مجھے تیرے حال کی خوب خبر ہے۔'' یہ کہہ کر حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے مخاطب کے گزرے ہوئے حالات بتانا شروع کر دیئے۔ پھر جب اس کے خفیہ اور پوشیدہ امور پر پڑا ہوا پردہ ہٹنے لگا تو وہ شخص بے اختیار پکارا تھا۔

''بس کرو حسین! میں تمہاری قوت کشف کا قائل ہو گیا۔''

تمام معتبر کتابوں میں یہ بات درج ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ پر وہ زمانہ بھی گزرا ہے، جب آپ لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں چھپی ہوئی باتیں بھی بتا دیا کرتے تھے...... مگر یہ دور زیادہ طویل نہیں تھا۔ لوگ تنگ کرنے لگے تو آپ نے خاموشی اختیار کر لی اور مستقبل کا حال بتانا چھوڑ دیا۔

جب آپ کی شہرت زیادہ بڑھی تو مخالفین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اور حاسدوں نے عجیب عجیب انداز سے آپ کو ستانا شروع کر دیا۔ تستر کے کچھ بااثر لوگوں نے ایک شخص کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جب منصور حلاجؒ راستے میں جا رہے ہوں تو ان کے سر پر ایک تھپڑ مار دیا جائے۔ الغرض وہ شخص آپ کی تلاش میں رہنے لگا۔ ایک دن حضرت منصور حلاجؒ غسل کر کے حمام سے باہر نکلے اور اپنے گھر کی طرف جانے لگے۔ یہ ایک عام گزرگاہ تھی اور اس وقت لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ شخص خاموشی سے آپ کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ پھر جب حضرت منصور حلاجؒ اس مقام پر پہنچے جہاں انسانی بھیڑ زیادہ تھی، اس نے آپ کی گدی پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔

حضرت منصور حلاجؒ اس بے ہودگی کی توقع نہیں رکھتے تھے، اس لئے برہم لہجے میں فرمانے لگے۔

''اے شخص! تو نے مجھے کیوں مارا ہے؟ کیا میری ذات سے تجھے کوئی تکلیف پہنچی ہے؟''

اجنبی شخص نے نفی میں جواب دیا۔

''جب میں نے تجھے کوئی اذیت نہیں پہنچائی ہے تو پھر تو نے یہ ناشائستہ اور غیر انسانی حرکت کیوں کی؟'' حضرت منصور حلاجؒ نے پوچھا۔

اس شخص نے بڑی بے شرمی کے ساتھ جواب دیا۔ ''یہ حرکت میں نے اپنے ارادے سے نہیں کی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا حکم دیا ہے۔''

یہ ظالمانہ جواب سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ''اگر حق تعالیٰ نے تجھے اس کام کا حکم دیا ہے تو دوبارہ مجھے مار اور حکم کی تعمیل کر؟''

وہ شخص اسے ایک دلچسپ کھیل سمجھ رہا تھا۔ اس نے حضرت منصور حلاجؒ کو مارنے کیلئے پوری طاقت سے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا مگر وہ اپنے ارادے کو تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ چند لمحوں میں خون کی گردش رک گئی اور اجنبی کا ہاتھ مفلوج ہو گیا۔ حضرت منصور حلاجؒ اپنے گھر کی طرف تشریف لے گئے

اور وہ شخص تکلیف کی شدت سے چیختا رہا۔ پھر اہل تستر نے دیکھا کہ چند دنوں میں اس کا ہاتھ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔

☆☆............☆☆............☆☆

حضرت منصور حلاجؒ کی ایک کرامت گزشتہ صفحات میں بیان کی جا چکی ہے کہ جب ضرورت مند لوگ ان سے نقد رقم کا سوال کرتے تھے تو وہ آسمان کی طرف ہاتھ بڑھا کر درہم لے آتے تھے۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا تھا کہ بہت سے حاجت مند جمع ہو جاتے تھے اور حضرت منصور حلاجؒ سے سوال کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر آپ کا عجیب عمل ہوتا تھا۔ دونوں ہاتھ اوپر کی جانب اٹھا دیتے تھے اور انہیں زور زور سے حرکت دیتے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دینار و درہم کی بارش شروع ہو جاتی تھی۔ حاضرین کو یہی محسوس ہوتا تھا جیسے خلاء میں کوئی درخت موجود ہے جسے حضرت منصور حلاجؒ ہلا رہے ہیں اور پھلوں کی طرح سکے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گر رہے ہیں۔ پھر جب سکوں کا ڈھیر لگ جاتا تو حضرت منصور حلاجؒ اپنے ہاتھ روک دیتے اور ضرورت مندوں سے مخاطب ہو کر فرماتے۔

''ان سکوں کو آپس میں برابر سے تقسیم کر لو...... مگر خبردار ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی نہ کرنا۔''

حضرت منصور حلاجؒ کی اسی قسم کی کرامات کو علماء اور مخالفین کی جماعت نے ''شعبدہ بازی'' اور ''ساحری'' سے تعبیر کرتے تھے۔

یہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے جب حضرت حسین بن منصورؒ ''تستر'' میں سکونت پذیر تھے۔ ایک دن درویشوں کی ایک جماعت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مالی امداد کی درخواست کرنے لگی۔

یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ ایک معمولی اور شکستہ لباس زیب تن فرماتے تھے۔ خوراک اور دوسرے اسباب ضرورت سے بھی بے نیاز رہا کرتے تھے۔ اگر کوئی اجنبی شخص انہیں اس حالت میں دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا کہ حضرت منصور حلاجؒ ایک نہایت مفلس انسان ہیں...... مگر درویشوں کی جماعت آپ کی روحانی شخصیت سے واقف تھی، اس لئے مالی امداد کا سوال کیا گیا تھا۔ تاہم حضرت منصور حلاجؒ نے ان لوگوں کو ٹالنے کیلئے عرض کیا۔

''دوستو! تم تو میرا ظاہری حال دیکھ رہے ہو کہ میں کتنا شکستہ اور مجبور ہوں۔''

''ہم آپ کے ظاہر کی نہیں، باطن کی بات کر رہے ہیں۔'' ایک درویش نے کہا۔ ''آپ اپنی اسی باطنی طاقت کو استعمال کر کے ہماری مشکل دور فرمائیے۔''

''تمہیں میری باطنی طاقت کی کیا خبر؟'' حضرت منصور حلاجؒ نے گریز سے کام لیتے ہوئے فرمایا۔

''میں تو ایک عام انسان سے بھی زیادہ کمزور ہوں۔ اگر مشکل کشائی کی طاقت رکھتا ہوتا تو خود یہ آزار کیوں جھیلتا؟ سب سے پہلے اپنی آسائش کا سامان جمع کرتا۔''

حضرت حسین بن منصورؒ مسلسل گریز کرتے رہے اور درویش پیہم اصرار کرتے رہے۔ واقعتاً وہ لوگ ضرورت مند تھے اور یہ بات بھی جانتے تھے کہ حضرت منصور حلاجؒ کوئی صاحب ثروت انسان نہیں ہیں۔ پھر ان کی کفالت کس طرح کریں گے؟ دراصل واقعہ یہ تھا کہ درویشوں کی جماعت

حضرت منصور حلاجؒ کی کرامات کا شہرہ سن کر تستر پہنچی تھی اور اب وہ لوگ اپنی آنکھوں سے حضرت منصور حلاجؒ کا روحانی کمال دیکھنا چاہتے تھے۔

بالآخر منصور حلاجؒ مجبور ہو گئے۔ پھر آپ نے اپنے خدمت گاروں سے پوچھا۔ ''اس شہر میں ایسا کون آسودہ حال شخص ہے جو ہمارے مہمان درویشوں کی مالی ضرورتیں پوری کر سکے۔''

حضرت منصور حلاجؒ کے خدمت گار اس سوال کا جواب دینے سے قاصر رہے۔

پھر ایک خادم کھڑے ہو کر نہایت ادب سے عرض کرنے لگا۔ ''تستر میں ایک آتش کدہ ہے جہاں مجوسی لوگ قیمتی نذریں اور کچھ تحائف پیش کرتے ہیں۔''

حضرت منصور حلاجؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے اور پھر مہمان درویشوں کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔

''میرے ساتھ آؤ! اب یہ آتش پرست ہی تمہاری ضروریات پوری کریں گے۔''

حضرت منصور حلاجؒ کی بات سن کر درویشوں کی جماعت حیران رہ گئی۔

رات کا وقت تھا۔ حضرت حسین بن منصورؒ اپنی خانقاہ سے باہر آئے اور آتش کدے کی طرف روانہ ہو گئے۔ درویشوں کی جماعت آپ کے پیچھے پیچھے تھی مگر اس پر شدید حیرت وسکوت کا عالم طاری تھا۔

مختصر یہ کہ طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد حضرت منصور حلاجؒ آتش کدے کے قریب پہنچے۔ دور دور تک سناٹا طاری تھا مگر آتش کدے کے دروازے پر ایک محافظ پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے کچھ مسلمانوں کو اپنی عبادت گاہ کی طرف آتے دیکھا تو اونچی آواز میں بولا۔

''تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟''

''ہم لوگ آتش کدے کے اندر جانا چاہتے ہیں۔'' جواب میں حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

''تم لوگ تو اپنی ظاہری حلیے سے مسلمان معلوم ہوتے ہو۔ پھر ہماری عبادت گاہ میں داخل ہو کر کیا کرو گے؟'' آتش کدے کے محافظ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ہم اس آگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں جو تمہارے بقول صدیوں سے روشن ہے اور جس کے بارے میں تمہارا دعویٰ ہے کہ وہ آگ کبھی نہیں بجھتی۔'' حضرت حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔

''مگر اس وقت تم آگ کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔'' آتش کدے کے محافظ نے کہا۔

حضرت منصور حلاجؒ نے سبب پوچھا تو محافظ نے بتایا کہ آتش کدہ بند ہے۔

''تم ہمارے لئے اپنی عبادت گاہ کا دروازہ کھول دو۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

''میں مجبور ہوں۔'' آتش کدے کے محافظ نے کہا۔ ''اس لئے کہ معبد کی چابی میرے پاس نہیں ہے۔''

حضرت منصور حلاجؒ نے دروازے کی طرف دیکھا جس پر ایک بھاری تالا پڑا تھا۔ ''پھر چابی کس کے پاس ہے؟''

''آتش کدے کی چابی بڑے پجاری کی تحویل میں رہتی ہے۔'' محافظ نے جواب دیا۔

''تمہارا بڑا پجاری کہاں ہے؟ اس سے چابی لے آؤ۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

''آدھی رات ہو چکی ہے۔ بڑے پجاری آرام کر رہے ہوں گے۔'' آتش کدے کے محافظ نے کہا۔ ''ان کو اس وقت جگایا نہیں جا سکتا اور پھر اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تم لوگ دن کے اجالے میں کسی وقت آنا۔ میں تمہیں آگ کا دیدار کرا دوں گا۔''

''ہم لوگ طویل فاصلہ طے کر کے یہاں تک پہنچے ہیں۔'' محافظ کا جواب سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا ''جب ہم نے اس قدر مشقت اٹھائی ہے تو پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم آگ کا مشاہدہ کئے بغیر واپس چلے جائیں۔''

''تو پھر مجبوری ہے۔'' آتش کدے کے محافظ نے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''مگر ہم بفضل خدا مجبور نہیں ہیں۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا اس وقت آپ ایک لمبی عبا پہنے ہوئے تھے۔ دروازے کی طرف دیکھا اور عبا کی آستین کو جھٹکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تالا کھل گیا۔ اس تالے کی ظاہری ساخت ایسی تھی کہ اگر تین چار مزدور مل کر ضربیں لگاتے تو وہ تالا بہت دیر میں ٹوٹ پاتا۔

یہ منظر دیکھ کر آتش کدے کے محافظ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کبھی وہ کھلے ہوئے تالے کی طرف دیکھتا اور کبھی حضرت منصور حلاجؒ کی طرف کہ جن کی آستین کی ایک جنبش سے یہ ناقابل یقین واقعہ پیش آیا تھا۔

''تالا کھل گیا، اب تم دروازہ کھول دو۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے محافظ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

محافظ پر خوف طاری تھا۔ وہ لرزتے قدموں سے آگے بڑھا اور اس نے اپنے معبد کا دروازہ کھول دیا۔

حضرت منصور حلاجؒ درویش ساتھیوں کو لے کر آتش کدے میں داخل ہو گئے۔

آگ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ بھڑک رہی تھی۔

''اس آگ کی کیا حقیقت ہے؟'' حضرت حسین بن منصورؒ نے محافظ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''یہ اس آگ کا حصہ ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ڈالے گئے تھے۔'' آتش کدے کے محافظ نے حضرت منصور حلاجؒ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم لوگ اس آگ سے برکت حاصل کرتے ہیں اور مجوسی اسی آگ کو لے کر مختلف ممالک میں جاتے ہیں اور نئے آتش کدے آباد کرتے ہیں۔''

''یہ آگ بجھتی بھی ہے یا اسی طرح روشن رہتی ہے؟'' حضرت منور حلاجؒ نے محافظ سے دوسرا سوال کیا۔

''یہ آگ ہمہ وقت روشن رہتی ہے۔'' محافظ نے جواب دیا۔ ''ہمارے بزرگوں (پیشواؤں) کا کہنا ہے کہ یہ آگ اس وقت بجھے گی جب زمین پر قیامت کا نزول شروع ہو جائے گا۔''

حضرت منصور حلاجؒ نے بھڑکتی ہوئی آگ پر ایک نظر کی اور محافظ سے مخاطب ہوئے۔ ''تمہاری

روایتوں کے مطابق کیا کوئی ایسا شخص ہے جو اس آگ کو بجھانے کی قدرت رکھتا ہے؟''

''ہم نے اپنی کتابوں میں پڑھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوا کوئی ہستی اس آگ کو بجھانے کی طاقت نہیں رکھتی۔'' آتش کدے کے محافظ نے جواب دیا۔

حضرت منصور حلاجؒ نے دوبارہ آگ پر نظر کی اور اپنی آستین کو جھٹک دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھڑکتی ہوئی آگ بجھ گئی اور حضرت حسین بن منصورؒ کے ہمراہ آنے والے درویش حیرت زدہ رہ گئے۔

یہ منظر دیکھ کر آتش کدے کا محافظ چیخنے لگا۔ ''قیامت آگئی...... قیامت آگئی۔''

حضرت منصور حلاجؒ نے محافظ سے پوچھا۔ ''تو کس قیامت کی بات کر رہا ہے؟''

''وہی قیامت جسے ایک دن آنا ہے۔'' محافظ کی چیخوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ ''اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ وہی قیامت کی گھڑی ہوگی جب مشرق و مغرب میں مجوسیوں کی آگ بجھا دی جائے گی۔''

''تمہارا عقیدہ کچھ بھی ہو مگر ہمارے نزدیک ابھی قیامت نہیں آئی ہے۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے محافظ کی چیخیں سن کر فرمایا۔ ''کیا اس آگ کو دوبارہ روشن کیا جاسکتا ہے؟ اس ذیل میں تمہاری کتابیں کیا کہتی ہیں؟''

''ہماری کتابوں میں واضح طور پر تحریر ہے کہ اس آگ کو وہی شخص دوبارہ روشن کرسکتا ہے جو اسے بجھانے کی قدرت رکھتا ہو۔'' آتش کدے کے محافظ نے خوف و دہشت سے لرزتے ہوئے کہا۔

''پھر تم اس شخص کو پکارو جو بجھی ہوئی آگ کو روشن کرسکے۔'' یہ کہہ کر حضرت منصور حلاجؒ واپس جانے لگے۔

آتش کدے کے محافظ نے گھبرا کر حضرت حسین بن منصورؒ کا دامن پکڑ لیا اور گریہ وزاری کرنے لگا۔ ''یہ آگ تمہارے ہی ایک اشارے سے بجھی تھی اور تم ہی اسے دوبارہ روشن کرسکتے ہو۔''

حضرت منصور حلاجؒ محافظ کی آہ و فغاں سن کر خاموش رہے۔

آتش کدے کا محافظ زار و قطار رو رہا تھا۔ آخر حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''تیرے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو ان درویشوں کو پیش کی جاسکے؟''

''ہاں! میرے پاس دیناروں سے بھرا ہوا ایک صندوق ہے۔'' آتش کدے کے محافظ نے کہا۔

''تو پھر وہ صندوق اٹھا لا اور میرے مہمانوں کی خدمت میں پیش کردے۔'' حضرت حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔ ''تو پھر میں تیرے معبد کی بجھی ہوئی آگ کو دوبارہ روشن کردوں گا۔''

محافظ خوشی خوشی دوڑتا ہوا گیا اور صندوق اٹھا لایا۔ واقعتاً وہ دیناروں سے بھرا ہوا تھا۔ ''اس کے سوا معبد میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو تمہارے مہمانوں کو پیش کی جاسکے۔'' محافظ نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''بس! یہ دینار کافی ہیں۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا اور اپنا ہاتھ فضا میں بلند کرکے آستین کو جھٹک دیا۔ مجوسیوں کے معبد کی آگ اسی شدت کے ساتھ دوبارہ بھڑکنے لگی۔

یہ منظر دیکھ کر آتش کدے کا محافظ حضرت منصور حلاجؒ کے قدموں پر گر پڑا اور نہایت عاجزانہ لہجے

میں شکریہ ادا کرنے لگا۔

درویشوں پر شدید حیرت و سکوت کا عالم طاری تھا۔ وہ اس واقعے کو اپنے کسی خواب کا حصہ سمجھ رہے تھے۔

''ان تمام دیناروں کو سمیٹ لو۔ تمہاری ضرورت پوری ہوگئی۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے مہمان درویشوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا اور آتش کدے سے باہر نکل آئے۔

بعض تاریخوں میں ''آگ'' کے بجائے قندیل کا لفظ استعمال ہوا ہے...... یعنی مجوسیوں کے معبد میں ایک ''قندیل'' صدیوں سے روشن تھی اور اسی قندیل کو حضرت منصور حلاجؒ نے ہاتھ کے ایک اشارے سے بجھا دیا تھا اور دوسرے اشارے سے اسے دوبارہ روشن کردیا تھا۔ بہرحال وہ مجوسیوں کی آگ ہو یا قندیل حضرت منصور حلاجؒ نے آتش پرستوں پر یہ بات ثابت کردی تھی کہ وہ جس آگ کو خدا سمجھ رہے ہیں، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ مرد مومن کی ایک جنبش چشم اس آگ کو نہ صرف بجھا سکتی ہے بلکہ اسے روشن بھی کرسکتی ہے۔ یہ حضرت منصور حلاجؒ کی ایک عظیم الشان کرامت تھی جسے تصوف کے دشمنوں نے شعبدہ بازی اور جادو سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں اس موضوع پر زیادہ بحث کی گنجائش نہیں مگر قارئین کو اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ شعبدہ بازی محض نظر کا فریب ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی شعبدہ باز نہ آگ روشن کرسکتا ہے اور نہ اسے بجھا سکتا ہے۔ یہ حضرت منصور حلاجؒ کا تصرف روحانی تھا جس نے آتش کدے کے محافظ کو حیران و عاجز کردیا تھا۔

بعض مخالفین نے حضرت منصور حلاجؒ کی اس کرامت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ اعتراض بھی وارد کیا ہے کہ آپ نے دینار حاصل کرنے کیلئے جبر سے کام لیا پہلے آگ کو بجھایا اور پھر اسے روشن کرنے کیلئے محافظ سے معاوضہ طلب کیا۔ ہمارے نزدیک حضرت منصور حلاجؒ کا یہ عمل ''جبر'' اور ''زبردستی'' نہیں۔ دراصل یہ عقائد کی جنگ تھی اور آتش پرست جنگ ہار گیا تھا۔ دنیا کا ہمیشہ سے یہی اصول رہا ہے کہ جنگ ہار جانے والے کو خراج ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس مجوسی نے بھی ایک اعتبار سے حضرت منصور حلاجؒ کو خراج ہی ادا کیا تھا۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

''خرق عادت'' یا ''کرامت'' اسے کہتے ہیں جس کے اظہار پر عام انسان قادر نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اہل دانش اور علمائے ظاہر کسی ولی کی کرامت کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ لوگ اپنی ذہنی رسائی کے مطابق کمالات روحانی کا انکار کرتے ہوئے منطق و استدلال کا سہارا لیتے ہیں اور عوام الناس کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کرامت حقیقت نہیں، محض افسانہ طرازی ہے۔ بعض انتہا پسند اپنے انکار میں شدت پیدا کرنے کیلئے کرامت کو جادوگری کا نام دے دیتے ہیں اور انہیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ ایک مسلمان بزرگ پر کفر کا الزام عائد کررہے ہیں کیونکہ ''جادو'' حرام ہے اور اس کا کرنے والا کافر۔ جب حضرت منصور حلاجؒ کی کرامات کا شہرہ عام ہوا تو کچھ مخالفین نے انہیں بھی ''ساحر'' قرار دیدیا۔

مشہور مؤرخ خطیب بغدادی لکھتا ہے کہ خلیفہ معتضد باللہ نے اپنے ایک معتمد کارندے کو چ
باتوں کی تحقیق کیلئے ہندوستان بھیجا۔ جب کشتی روانہ ہوئی تو خلیفہ کے کارندے نے ایک شخص
دیکھا جو خاموش بیٹھا سمندر کی لہروں کا نظارہ کر رہا تھا۔ بحری سفر کی طوالت سے اکتا کر خلیفہ
کارندے نے اس شخص سے گفتگو شروع کر دی۔ بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ وہ حسین
منصورؒ تھے۔

خلیفہ کا کارندہ اس سفر کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ''حسین بن منصورؒ کی معاشر
بہت اچھی اور صحبت نہایت پاکیزہ تھی۔ پھر جب سفر تمام ہوا اور کشتی کنارے پر پہنچی تو ہم لوگ نیچے
آئے۔ میں نے حسین بن منصورؒ سے پوچھا کہ تم کس ارادے سے ہندوستان آئے ہو؟''

''میں یہاں جادو سیکھنے آیا ہوں تا کہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دے سکوں۔'' حسین
منصورؒ نے جواب دیا۔

مقامی مزدور کشتی سے سامان اتار رہے تھے اور ہمارے درمیان گفتگو جاری تھی کہ ایک بوڑھا
آیا جو سمندر کے کنارے آباد ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔

''تمہاری کسی ایسے شخص سے شناسائی ہے جو سحر (جادو) جانتا ہو۔'' حسین بن منصورؒ نے بوڑ
سے پوچھا۔

ہندوستانی بوڑھے نے ایک نظر حسین بن منصورؒ کو دیکھا۔ پھر اپنی جیب سے سوت کے دھا
لچھا نکالا اور اس کا ایک سرا حسین بن منصورؒ کے ہاتھ میں دے کر لچھے کو ہوا میں اچھال دیا۔ ہمار
دیکھتے ہی دیکھتے حد تک نظر تک دھاگے کا ایک تار بن گیا۔ بوڑھا چند قدم آگے بڑھا اور دھاگا پکڑ
اوپر چڑھنے لگا۔ ہم بڑی حیرت سے یہ ناقابل یقین منظر دیکھتے رہے۔ ہندوستانی بوڑھا دھاگے
چڑھتے چڑھتے بہت بلندی تک چلا گیا اور پھر کچھ دیر بعد اسی طرح واپس آ گیا۔ زمین پر قدم ر
کے بعد اس نے حسین بن منصورؒ سے پوچھا۔

''کیا تم ایسے ہی کسی شخص سے ملنا چاہتے ہو؟''

خلیفہ کے کارندے کا بیان ہے کہ اس کے بعد ہم دونوں جدا ہو گئے۔ پھر بغداد میں حسین بن م
سے ملاقات ہو گئی۔

خطیب بغدادی تک یہ روایت کئی حوالوں سے پہنچی ہے۔ علمائے تحقیق کے نزدیک اس کا
راوی بھی معتبر نہیں بلکہ ایک راوی علی بن احمد کے بارے میں تو کہا گیا ہے کہ وہ جھوٹا اور شیخی باز تھا
حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانویؒ اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
روایت سند کے لحاظ سے قابل اعتبار نہیں۔ جن لوگوں نے جادوگروں کو دیکھا ہے، وہ خوب جا
ہیں کہ تمام ساحر نہایت ناپاک، غلیظ اور گندے ہوتے ہیں۔ انہیں حسن معاشرت اور صحبت کی پاکیز
سے کیا واسطہ؟ جبکہ راوی نے واضح الفاظ میں حسین بن منصورؒ کی یہ صفات بیان کی ہیں۔ دوسر
کہ کوئی بھی جادوگر مخلوق کو اللہ کی طرف دعوت نہیں دیتا۔''

آتش کدے کی ''آگ'' یا ''قندیل'' بجھا دینے کا واقعہ اس قدر مشہور ہوا کہ عام لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور بے اختیار پکار اٹھے۔

''حضرت منصور حلاجؒ ایک ولیٔ کامل ہیں اور ان کی عارفانہ شان یہ ہے کہ ایک اشارے سے آتش کدے کی آگ بجھ گئی اور ان ہی کے دست مبارک کی ایک جنبش نے بجھی ہوئی آگ کو دوبارہ روشن کر دیا۔''

اور جن علماء کے نزدیک ''خرق عادت'' یا کرامت شعبدہ بازی کے مماثل تھی، انہوں نے کسی رعایت سے کام نہیں لیا۔ وہ پہلے بھی حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کے مخالف تھے اور ان کے روحانی تصرف کو علی الاعلان شعبدہ بازی قرار دیتے تھے۔ پھر جب آتش کدے کے واقعے نے عام شہرت حاصل کی تو علماء کے اسی گروہ نے حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کو بڑا شعبدہ باز کہہ کر پکارا۔

علماء کا ایک مخصوص گروہ جو حضرت منصور حلاجؒ سے بہت زیادہ ناراض تھا، اس کے نزدیک حضرت حسین بن منصورؒ ساحر تھے۔ آتش کدے کے حوالے سے ان علماء نے نہایت سخت لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''اس شخص کی جادوگری میں اگر اسی طرح اضافہ ہوتا رہا تو مخلوق خدا ایک نئے فتنے میں مبتلا ہو جائے گی۔''

یہ تو مخالفین کا حال تھا مگر چند لوگ جو حضرت منصور حلاجؒ سے اپنی بے پناہ عقیدت کا دعویٰ کرتے تھے، انہوں نے حضرت حسین بن منصورؒ کی عظمت و تکریم میں اس قدر غلو کیا کہ نہ صرف بات اُلجھ کر رہ گئی بلکہ ایک نئے فتنے کی بنیاد بھی پڑ گئی۔ یہ مخصوص افراد جو ہمہ وقت حضرت منصور حلاجؒ کے ساتھ رہا کرتے تھے، آپ کی کرامتوں کو ایک نئے انداز کے ساتھ عوامی حلقوں میں پیش کرنے لگے۔ ان میں سے بعض لوگ اس وقت بھی موجود تھے جب حضرت منصور حلاجؒ نے اپنی آستین کی جنبش سے آتش کدے کا آہنی قفل کھول دیا تھا اور مجوسیوں کی عبادت گاہ کے اندر داخل ہو کر اس قندیل کو بجھا دیا تھا جس سے دنیا بھر کے آتش پرست استفادہ کرتے تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ کے ان مخصوص عقیدتمندوں نے آتش کدے کے محافظ کی گفتگو کو بنیاد بنایا اور پھر ایک نیا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ بعض مؤرخین نے جو تحقیق کے میدان میں اعتبار کا درجہ رکھتے ہیں، حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست تیار کی ہے۔ ان الزامات میں ''شعبدہ بازی'' اور ''ساحری'' کے ساتھ یہ الزام بھی نمایاں ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ ''مہدی'' ہونے کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔ بعض مؤرخین نے واضح طور پر لکھا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی تشبیہہ دیا کرتے تھے۔

جب حسین بن منصورؒ سے دریافت کیا گیا کہ تم عیسیٰ علیہ السلام ہو یا مہدی ہو؟ تو حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

''معاذ اللہ! یہ تو مجھ پر ایک سنگین تہمت ہے۔ میں تو ایک گناہ گار عاجز بندہ ہوں۔ اس کے سوا میرا

کوئی کام نہیں کہ میں اپنے رب کی پاکی بیان کرتا ہوں اور صبح وشام اسی کی عبادت کرتا ہوں۔"

حضرت حسین بن منصور حلاجؒ واشگاف الفاظ میں اپنے آپ کو اس الزام سے بری الذمہ قرار دیتے تھے مگر مخالفین نے آپ کی ذات سے ایک ایسے عمل کو وابستہ کر دیا جو کھلا ہوا کفر تھا۔ آخر اس الزام کی حقیقت کیا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ انکار کر رہے ہیں اور لوگ اپنی ضد پر قائم ہیں کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام تھے...... اور مہدی علیہ السلام تھے۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ جب حضرت منصور حلاجؒ نے آتش کدے کے محافظ سے پوچھا کہ اس آگ کو بجھانے اور روشن کرنے والا کوئی شخص ہیڈ تو محافظ نے اپنی کتابوں کے حوالے سے کہا تھا کہ اس آگ کو صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی بجھا سکتے ہیں اور وہی اسے دوبارہ روشن کر سکتے ہیں۔ محافظ کا یہ دعویٰ سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے اپنی کرامت کا اظہار کیا۔ نتیجتاً مجوسیوں کے معبد کی آگ بجھ بھی گئی اور دوبارہ روشن بھی ہوگئی۔ اس واقعے کے رونما ہونے کے بعد دو ہی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ یا تو آتش کدے کا محافظ حضرت منصور حلاجؒ کے سامنے خم ہوگیا اور آپ کی بزرگانہ شان کا اعتراف کرنے لگا۔

"آپ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں (معاذ اللہ)"

اور اس کی منطقی وجہ یہ ہے کہ آتش پرستوں کی کتاب میں صاف صاف لکھا ہے کہ اس آگ کو صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی بجھا سکتے ہیں۔ پھر جب محافظ نے آگ بجھانے والے کو دیکھا تو اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق حضرت منصور حلاجؒ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سمجھ بیٹھا۔

اگر یہ واقعہ اس طرح پیش نہیں آیا تو پھر دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کے ساتھ جو عقیدت مند اور درویش موجود تھے، ان لوگوں نے محافظ کی گفتگو سنی تھی، اس لئے بعض لوگوں نے جوش عقیدت میں یا ایک سازش کے تحت حضرت منصور حلاجؒ سے یہ الفاظ منسوب کر دیئے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام یا مہدی علیہ السلام ہونے کے مدعی تھے۔ مختصر یہ کہ اس الزام کی ایک بنیاد موجود ہے مگر اس معاملے میں حضرت منصور حلاجؒ بے قصور تھے۔ اپنے کیف و جذب کے باعث انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ ان کے گرد کیسی خوفناک سازش کا جال بچھایا جا رہا ہے۔ فارسی زبان کا ایک مشہور مقولہ ہے۔

"پیراں نمی پرند، مریداں می پرانند (پیر نہیں اڑتے ہیں بلکہ ان کے مرید انہیں اڑاتے ہیں)

حضرت منصور حلاجؒ کے بعض مرید یا تو سخت جاہل اور بے خبر تھے یا پھر نہایت عیار و مکار کہ ایک عاشق جانباز کو رسوا کرنے کیلئے انتہائی شرمناک منصوبہ تیار کر رہے تھے۔

الغرض، حضرت منصور حلاجؒ تستر کے باشندوں کی اس جاہلانہ عقیدت سے بیزار ہو کر بصرہ تشریف لے گئے۔

☆☆.........☆☆.........☆☆

بصرہ پہنچ کر حضرت منصور حلاجؒ عبادت و ریاضت میں مشغول ہوگئے۔ یہاں بھی آپ کے

مجاہدات اور مشقتوں کا وہی عالم تھا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے۔ صوفیا ان کی ریاضتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور برملا اپنی رائے کا اظہار کرتے۔

"منصور حلاجؒ ایک عاشق جاں سوز ہیں۔ عشق کی تپش اور حرارت ان کے جسم و جاں کو جلائے ڈالتی ہے...... اور اسی وجہ سے ان پر جذب و کیف کا غلبہ ہے۔"

اس کے برعکس بصرہ کے علمائے ظاہر کا وہی فتویٰ تھا کہ منصور حلاجؒ شعبدہ بازی کے فن میں مہارت حاصل کرنے کیلئے کوشاں ہیں اور فطرت کے اصولوں سے جنگ کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔

بے شک! حضرت منصور حلاجؒ ایک عاشق جاں باز تھے اور انہیں اس بات کی ہرگز پروا نہیں تھی کہ علمائے ظاہر ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ وہ اپنے انداز سے منزل عشق کا سفر طے کر رہے تھے۔ عشق کی سرمستی نے انہیں اس قدر بے باک بنا دیا تھا کہ وہ اپنے اساتذہ اور مرشد سے بھی عجیب عجیب سوالات کرتے تھے۔ پھر جب انہیں اپنے سوالوں کا جواب نہیں ملتا تھا تو اسی اضطراب کے عالم میں شیخ کی بارگاہ سے اٹھ جاتے تھے۔ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ بھی ان کی اسی بے باکی کی وجہ سے اس قدر ناراض ہوگئے تھے کہ شدید عالم غضب میں اپنے شاگرد کو دنیا کی خوفناک ترین بددعا دے ڈالی تھی (میں اپنی کم علمی اور بے نظری کے سبب اس واقعے پر رائے زنی کا حق نہیں رکھتا مگر ہزار غور و فکر کے بعد بھی میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ عارف کامل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کے اکابر صوفیاء میں نمایاں حیثیت بھی رکھتے تھے۔ پھر آپ نے حضرت منصور حلاجؒ کو اتنی سنگین بددعا کیوں دی؟ عارف کا کام تو دعائیں دینا ہوتا ہے۔ پھر بھی اگر ہم حضرت عمرو بن عثمانؒ کی بددعا کو تسلیم کر لیں تو شدت غضب کے اظہار کیلئے اتنا کہہ دینا ہی کافی تھا کہ خدا اسے ہلاک کر ڈالے...... مگر بددعا میں یہ اہتمام کیوں کہ اس کے دست و پا کاٹے جائیں...... پھر اسے نذر آتش کیا جائے...... اور آخر میں اس کی راکھ دریائے دجلہ میں بہادی جائے۔ حالانکہ قتل کے سلسلے میں سرور کونین ﷺ کی یہ حدیث پاک موجود ہے کہ ایک ہی وار میں قتل کیا جائے خواہ وہ پاگل کتے کا قتل ہی کیوں نہ ہو۔ اسلام جسمانی اعضاء کو مرحلہ وار کاٹنے کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر حضرت منصور حلاجؒ کو یہ بددعا کیوں دی گئی؟ میرے خیال میں اس روایت پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے کہ واقعتہً حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی بددعا ہے یا حضرت منصور حلاجؒ کے مخالفین نے زیب داستاں کیلئے اس بددعا کو حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ جیسے عظیم و جلیل بزرگ کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا ہے؟)

اگرچہ اس وقت حضرت جنید بغدادیؒ حیات تھے لیکن حضرت منصور حلاجؒ ایک بار مرشد کے آستانے سے اُٹھے تو دوبارہ اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ بعض لوگوں نے حسین بن منصورؒ کے اس عمل کو ان کی سرکشی سے تعبیر کیا ہے...... لیکن صاحبان نظر کہتے ہیں کہ یہ منصورؒ کی آشفتہ سری نہیں، عشق کی شوریدگی تھی جو انہیں کسی لمحے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت منصور حلاجؒ مستقل طور پر بصرہ میں سکونت پذیر ہوجائیں گے...... مگر ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ وہ

بے قرار عشق اس سرزمین سے بھی بیزار ہو گیا۔ اس نے اپنا بوریا کاندھے پر ڈالا اور بصرہ سے کسی دوسرے مقام کی طرف کوچ کر گیا۔ یہ بیزاری علمائے ظاہر کے مخالفانہ طرزِ عمل کے سبب نہیں تھی۔ اب کی بار اس کے عقیدت مندوں کی انتہا پسندی نے اسے وحشت میں مبتلا کر دیا تھا۔

ابوالحسن محمد بن عمر قاضی فرماتے ہیں۔ ''ایک دن میرے ماموں مجھے حضرت حسین بن منصورؒ کے پاس لے گئے۔ اس وقت وہ بصرہ کی جامع مسجد میں مشغولِ عبادت تھے۔ میں ان دنوں بچہ تھا۔ اس لئے خاموشی سے دونوں کی گفتگو سنتا رہا۔

بات چیت کے دوران حضرت حسین بن منصور حلاجؒ نے میرے ماموں سے فرمایا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ اب میں زیادہ دن بصرہ میں قیام نہیں کر سکوں گا۔''

میرے ماموں نے عرض کیا۔ ''یہ تو اہلِ دل کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ وہ ایک مردِ خدا کی زیارت سے محروم ہو جائیں گے۔''

''میں بھی کیا کروں؟'' حضرت منصور حلاجؒ نے آزردہ لہجے میں فرمایا۔ ''یہاں کے لوگوں نے میری ذات کو ایک طلسمی افسانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ جس سے میرا دل تنگ ہے اور مجھ پر وحشت طاری ہونے لگی ہے۔''

''آخر ایسا کون سا واقعہ پیش آیا ہے جس سے آپ کی طبیعت میں تکدر اور وحشت کے اثرات پائے جاتے ہیں۔'' میرے ماموں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں کے لوگوں کی عادت ہے کہ وہ اپنی خیال آرائی میں گم رہتے ہیں۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے انتہائی افسردہ لہجے میں فرمایا۔ ''یہ لوگ بہت سے افعال و احوال کو میری طرف منسوب کر دیتے ہیں اور سوچے سمجھے بغیر اعتقاد کر لیتے ہیں کہ فلاں فلاں کام میں نے کئے ہیں۔ نہ کوئی ذاتی طور پر تحقیق کرتا ہے اور نہ کوئی مجھ سے دریافت کرتا ہے۔ خواہ مخواہ یہ بات مشہور کر دی جاتی ہے کہ حلاج مستجاب الدعوات اور صاحبِ کرامات ہیں۔ حالانکہ تم میرے بارے میں خوب جانتے ہو۔ میں کیا چیز ہوں جو یہ درجہ اور مرتبہ مجھے حاصل ہو۔''

''آپ ان باتوں پر دھیان ہی کیوں دیتے ہیں؟'' میرے ماموں نے عرض کیا۔

حضرت حسین بن منصور حلاجؒ نے میرے ماموں کے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔ ''ابھی کل کا واقعہ ہے کہ ایک متمول شخص نے کچھ درہم میرے پاس بھیجے تھے اور درخواست کی تھی کہ میں ان سکوں کو فقراء میں تقسیم کر دوں۔ اتفاق سے اس روز کوئی ضرورت مند نہیں آیا۔ میں نے وہ درہم بورے کے نیچے ڈال دیئے۔ دوسرے دن چند فقراء میرے پاس آئے تو میں نے بورے کے نیچے سے درہم نکال کر ان کے حوالے کر دیئے۔ اب میں اپنے بارے میں عجیب عجیب باتیں سن رہا ہوں۔ لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں کہ حلاج مٹی پر ہاتھ مارتا ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے۔''

اس کے بعد حضرت حسین بن منصور حلاجؒ نے اسی قسم کے بہت سے واقعات سنائے۔

میرے ماموں خاموشی سے حضرت منصور حلاجؒ کی گفتگو سنتے رہے۔ پھر جب منصورؒ خاموش

ہوئے تو میرے ماموں نے رخصت کی اجازت چاہی۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد ابوالحسن محمد بن عمر قاضی فرماتے ہیں۔ ''میرے ماموں دوبارہ حضرت منصور حلاجؒ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ ایک دن مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ''اس شخص کا حال مشتبہ ہے اور عنقریب تم دیکھو گے کہ منصور حلاجؒ ایک خاص شان کے ساتھ ظاہر ہوں گے۔'' ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ منصور حلاجؒ بصرے سے چلے گئے اور پھر ان کے بارے میں عجیب عجیب واقعات شہرت پانے لگے جیسا کہ میرے ماموں نے اشارتاً مجھ سے کہا تھا۔

اس روایت سے پتا چلتا ہے کہ حضرت حسین بن منصور اپنے بعض عقیدت مندوں سے عاجز و پریشان تھے۔ یہ لوگ آپ کی صفات بیان کرتے وقت بہت زیادہ مبالغے سے کام لیا کرتے تھے۔ اسی روایت کی بنیاد پر اس دور کے بہت سے علماء نے حضرت منصور حلاجؒ کی کرامات سے انکار کیا ہے اور اپنی شدت پسندی کے باعث انہیں شعبدہ باز اور ساحر قرار دیدیا ہے۔ یہ حضرت حسین بن حلاجؒ کی عاجزی ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہ گار اور مجبور انسان ظاہر کرتے تھے مگر جہاں تک آپ کی کرامات کا تعلق ہے، وہ اسی طرح روشن تھیں جیسے خورشید ضیا بار۔

حضرت منصور حلاجؒ کی بنیادی محرومی یہ تھی کہ اہلِ ظاہر نے ان کے عشق کی سرمستیوں اور بے قراریوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک عاشقِ جانباز کو ظاہری آنکھ سے دیکھا اور ظاہری علم کا سہارا لے کر ان پر مختلف قسم کے فتوے لگا دیئے۔ واضح رہے کہ اس سلسلے میں علماء اور فقہا بھی بے قصور تھے کہ احکامِ شریعت کا اطلاق ظاہری اعمال ہی پر ہوتا ہے۔

اور جہاں تک حضرت منصور حلاجؒ کی کرامات کا معاملہ ہے تو شروع میں صاحبانِ نظر بھی یہی کہتے تھے کہ ''جنات'' ان کے تابع ہیں اور وہی آتشیں مخلوق ان کے کام سرانجام دیتی ہے۔ بعد میں جب کچھ اہلِ علم حضرات نے گہرائی کے ساتھ ان واقعات کا مشاہدہ کیا تو ان کی رائے تبدیل ہوگئی۔ اس ذیل میں ہم مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ کی گواہی پیش کریں گے جو تحقیق کے میدان میں اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔

اس شہادت کو پیش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ حضرت شیخ ابن عطاؒ کا مختصر تعارف پیش کر دیا جائے تاکہ ہمارے قارئین کو حضرت ابن عطاؒ کی عارفانہ شان کا کسی قدر اندازہ ہو جائے۔

''تذکرۃ الاولیاء'' میں حضرت شیخ فریدالدین عطاؒ فرماتے ہیں۔ ''حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ کا شمار اکابر مشائخ میں ہوتا ہے۔ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوسعید خرازؒ نے حضرت ابن عطاؒ کے بہت سے اوصاف بیان کئے ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت شیخ ابوسعید خرازؒ آپ کے مقابلے میں کسی دوسرے کو صوفی ہی تصور نہیں کرتے تھے۔''

آگے چل کر حضرت شیخ فریدالدین عطاؒ فرماتے ہیں۔ ''ایک دن لوگوں نے حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ کو گریہ وزاری کرتے ہوئے دیکھا اور پھر جب اس کا سبب پوچھا تو حضرت ابن عطاؒ نے فرمایا۔

''میں نے اپنی کم سنی کے زمانے میں ایک شخص کا کبوتر پکڑ لیا تھا۔ اپنے اس جرم کے معاوضے میں

کبوتر کے مالک کو آج تک ایک ہزار دینار دے چکا ہوں لیکن پھر بھی نہیں جانتا کہ مجھے اس جرم کی کیا سزا دی جائے گی؟''

حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ قرآن کریم کی تلاوت بہت ذوق وشوق کے ساتھ کرتے تھے۔ ایک دن کسی دوست نے سوال کیا۔''شیخ! آپ روزانہ کتنی تلاوت کر لیتے ہیں۔''

حضرت ابن عطاؒ نے فرمایا۔''آج سے چودہ سال پہلے ایک قرآن یومیہ ختم کر لیتا تھا مگر اب یہ حال ہے کہ چودہ سال قبل میں نے جو قرآن شروع کیا تھا، وہ ابھی تک ختم نہیں ہو سکا ہے، صرف سورۂ ''انفاق'' تک پہنچا ہوں۔''

حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ کے دس صاحبزادے تھے۔ ایک بار آپ اپنے تمام فرزندوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ جب ایک ویران جنگل سے گزر ہوا تو اچانک کچھ ڈاکو برہنہ شمشیریں لئے ہوئے نمودار ہوئے اور حضرت ابن عطاؒ کے صاحبزادوں کو پکڑ لیا۔ پھر ایک ایک کر کے انہیں قتل کرنا شروع کر دیا، قزاقوں کا خیال تھا کہ حضرت ابن عطاؒ اپنے صاحبزادوں کو قتل ہوتے دیکھ کر گریہ وزاری کریں گے اور ان سے رحم کی بھیک مانگیں گے...... مگر آپ کے صبر واستقامت کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہر بیٹے کے قتل پر آسمان کی طرف دیکھتے اور مسکرانے لگتے۔

پھر جب دسویں صاحبزادے کے قتل کی باری آئی تو ڈاکوؤں نے اپنی شمشیریں روک لیں اور حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ کو مخاطب کر کے کہا۔''ہم نے آج تک ایسا بے حس اور سنگدل باپ نہیں دیکھا کہ اپنے بیٹوں کی جان بچانے کیلئے کوئی تدبیر کرنے کے بجائے آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔''

حضرت ابن عطاؒ نے انتہائی ضبط وتحمل کے ساتھ فرمایا۔''تمہاری کیا مجال کہ تم میرے بیٹوں کو قتل کر سکو۔ فاعل حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ اپنی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے۔ خلاق ازل نے میرے صاحبزادوں کا مقدر اسی طرح رقم کیا تھا۔ مسکراتا اس لئے ہوں کہ میں اس کی رضا میں راضی ہوں۔ کاش! وہ بھی راضی ہو جائے۔''

حضرت ابن عطاؒ کی گفتگو سن کر قزاقوں پر عجیب سے کیفیت طاری ہو گئی۔ ڈاکوؤں کے سردار نے اپنی شمشیر نیام میں کر لی اور معذرت خواہانہ لہجے میں افسوس کرتے ہوئے کہا۔''اگر تم یہ بات پہلے کہہ دیتے تو تمہارے تمام بیٹے قتل ہونے سے بچ جاتے۔''

حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ نے فرمایا۔''جب خالق کسی کو مٹانا چاہتا ہے تو پھر کون ہے جو اس کو قائم رکھ سکے۔'' یہ کہہ کر حضرت ابن عطاؒ نے ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ پھر قزاقوں کے ساتھ مل کر اپنے نو بیٹوں کی تدفین کی اور شمشیر قضا سے بچ جانے والے صاحبزادے کو ہمراہ لے کر سفر پر روانہ ہو گئے۔

حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ کے چند مشہور اقوال حسب ذیل ہیں۔

''ظاہر میں مخلوق سے اور باطن میں خالق سے وابستگی گوشہ نشینی سے بہتر ہے۔''

''عمدہ گناہ وہی ہے جس سے توبہ کی توفیق نصیب ہو...... اور بدترین ہے وہ عبادت جس میں

خود بینی (غرور) نمایاں ہو جائے۔''

''دنیا کچھ لوگوں کیلئے سرائے ہے، کچھ کیلئے تجارت گاہ، بعض کیلئے شہرت وعزت حاصل کرنے کی جگہ، بعض کیلئے درس عبرت اور کچھ کیلئے باعث عیش ونشاط یہی وجہ ہے کہ ہر شخص اپنے خیالات کے مطابق دنیا سے دلچسپی رکھتا ہے۔''

''اللہ تعالیٰ ناواقف لوگوں کے گناہ کبیرہ بھی معاف کر دے گا لیکن عارفین سے گناہ صغیرہ کی بھی باز پرس ہو گی۔''

''قرآن وحدیث سے بلند کوئی مقام نہیں۔''

''مجھے آتش دوزخ میں جلنے کا اتنا خوف نہیں جتنا حق تعالیٰ کی عدم توجہی سے خائف رہتا ہوں۔''

ان اقوال مبارکہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ کس شان کے بزرگ تھے۔ اسی مرد حق سے کسی شخص نے سوال کیا۔''شیخ! آپ کا حضرت منصور حلاجؒ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''منصور ایک جانباز صوفی ہیں۔'' حضرت ابن عطاؒ نے فرمایا۔

''منصور حلاجؒ سے ایسے فعال سرزد ہوتے ہیں جن کی عقلی توجیہہ ممکن نہیں۔'' اس شخص نے اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

حضرت ابن عطاؒ نے فرمایا۔''جنات منصور حلاجؒ کے تابع ہیں۔ اسی لئے ان کے کام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔''

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شروع میں حضرت شیخ ابن عطاؒ جیسے بزرگ بھی حضرت منصور حلاجؒ کی کرامات کو جنوں کی کارکردگی کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس دوسرے علماء اسے شعبدہ بازی قرار دیتے تھے۔

ایک سال بعد کسی شخص نے حضرت منصور حلاجؒ کے بارے میں وہی سوال کیا تو حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ نے فرمایا۔''حسین بن منصورؒ کی کرامات حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔''

اس شخص نے عرض کیا۔''پہلے تو آپ نے فرمایا تھا کہ جنات منصور حلاجؒ کے تابع ہیں۔''

جواب میں حضرت شیخ ابن عطاؒ نے فرمایا۔''اس وقت مجھے منصور حلاجؒ کے حالات کی تفصیل تحقیق کے ساتھ معلوم نہیں تھی مگر اب میں حقیقت سے آگاہ ہو گیا ہوں اور صحیح بات وہی ہے جو تم نے اب سنی ہے۔''

اس واقعے کو مشہور مؤرخ خطیب بغدادی نے بیان کیا ہے جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر علماء اور فقہا تحقیق کرنے کے بجائے سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیا کرتے تھے اور پھر حضرت منصور حلاجؒ ان کے اعتراضات کا نشانہ بن جاتے تھے۔

☆☆..............☆☆..............☆☆

الغرض حضرت منصور حلاجؒ اہل بصرہ کے جوش عقیدت سے بیزار ہو کر دوبارہ تستر چلے گئے۔

مشہور مؤرخ خطیب بغدادی حضرت منصورؒ کے بیٹے احمد بن حسین کے حوالے سے لکھتا ہے۔

بصرہ سے واپس آنے کے بعد میرے والد کچھ دنوں تک تستر میں مقیم رہے۔ ایک بار پھر عقیدت مندوں کا ہجوم ان کے گرد سمٹ آیا۔ وہ جدھر جاتے تھے، ہزاروں انسان دست بستہ ان کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ یہ صورتحال دیکھ کر بہت سے صوفیاء اور علماء میرے والد سے حسد کرنے لگے۔ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ تو مسلسل خوزستان والوں کو خطوط لکھتے رہتے تھے۔ ان خطوط میں میرے والد کے متعلق بری بری باتیں تحریر ہوتی تھیں۔ آخر وہ ان تمام باتوں سے تنگ آگئے اور انہوں نے صوفیانہ لباس اتار پھینکا۔ پھر اہل تستر نے میرے والد کو سپاہیانہ لباس میں دیکھا۔ اب وہ مشائخ کی صحبت چھوڑ کر عام دنیادار لوگوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

پھر ایک دن میرے والد تستر سے روانہ ہوگئے۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے میری والدہ کو بھی نہیں بتایا کہ وہ کہاں جارہے ہیں؟ پانچ سال تک ہم سے دور رہے۔ بس لوگوں کی زبانی خبریں ملتی رہیں کہ میرے والد خراسان تشریف لے گئے ہیں۔ پھر کہنے والوں نے کہا کہ وہ ماوراء النہر کے علاقے میں دیکھے گئے ہیں۔ پھر کچھ عرصے بعد یہ خبر ملی کہ وہ بجستان اور کرمان کی سیاحت میں مصروف ہیں۔

پھر بتانے والوں نے بتایا کہ میرے والد فارس (ایران) میں موجود ہیں اور وہ اپنی پرانی روش پر لوٹ آئے ہیں۔ انسانی ہجوم کے سامنے عارفانہ گفتگو کرتے ہیں۔ مجالس منعقد کرتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ فارس (ایران) میں ان کی شہرت اس قدر بڑھی کہ لوگ انہیں ''عبداللہ زاہد'' کے لقب سے پکارنے لگے۔ اسی زمانے میں انہوں نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔

پھر میرے والد فارس سے ''اہواز'' چلے گئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے ایک شخص کو تستر بھیجا پھر اس شخص نے مجھے اور میرے والدہ کو ''اہواز'' پہنچا دیا۔ یہاں میں نے اپنی آنکھوں سے ان کی مجلس دیکھیں۔ وہ لوگوں میں بے پناہ مقبولیت رکھتے تھے۔

''اہواز'' میں میرے والد کی کشف کا یہ حال تھا کہ وہ لوگوں کے دلوں کی باتیں بتا دیا کرتے تھے۔

اسی وجہ سے لوگ انہیں ''حلاج الاسرار'' کہہ کر پکارنے لگے۔ پھر ''حلاج'' قلب مشہور ہوگیا۔

پھر کچھ دن بعد مجھے ''اہواز'' میں اپنے دوستوں کے پاس چھوڑ کر بصرہ تشریف لے گئے۔ پھر میں نے لوگوں سے سنا کر بصرہ میں مختصر قیام کرنے کے بعد میرے والد مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ بتانے والوں نے بتایا کہ اس بار ان کا عجیب حال تھا۔ وہ ایک گدڑی کے ساتھ بہت اونچا پاجامہ پہنے ہوئے تھے (پاجامہ گھٹنوں سے ذرا نیچے تھا تاکہ شریعت کے مطابق ستر پوشی ہو سکے) اس سفر میں مخلوق خدا کی بہت بڑی بھیڑ ان کے ساتھ تھی۔ میرے والد کے ساتھ لوگوں کی یہ عقیدت دیکھ کر ابو یعقوب نہر جوریؒ حسد کی آگ میں جل اٹھے۔

حضرت ابو یعقوب نہر جوریؒ کا شمار اس دور کے بڑے مشائخ میں ہوتا ہے۔ ابو یعقوبؒ، حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کے مرید تھے۔ بہت سی روایتوں میں واضح طور پر درج ہے کہ جب حضرت ابو یعقوب نہر جوریؒ نے حضرت منصور حلاجؒ کی بے پناہ مقبولیت دیکھی تو شدت غضب سے لوگوں کو

مخاطب کر کے کہنے لگے۔

''تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ ایک شعبدہ باز کے پیچھے بھاگے چلے جاتے ہو۔ منصور حلاجؒ کا ساتھ چھوڑ دو ورنہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ گے۔''

بعض روایتوں میں اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ درج ہیں۔ حضرت ابو یعقوب نہر جوریؒ کی مخالفت کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے پیرو مرشد حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ، حضرت منصور حلاجؒ سے ناراض تھے، اس لئے اپنے شیخ کے اتباع میں ابو یعقوبؒ بھی حضرت منصور حلاجؒ کی مخالفت میں بہت زیادہ شدت اختیار کر گئے تھے۔ بہرحال اس بار حضرت منصور حلاجؒ کا قیام مکہ مختصر تھا۔ آپ چند ماہ قیام کر کے بصرہ واپس لوٹ آئے۔ پھر ایک ماہ بعد ''اہواز'' پہنچے اور وہاں سے اپنے بیوی بچوں کو لے کر بغداد پہنچے۔ حضرت منصور حلاجؒ کے صاحب زادے احمد بن حسینؒ کا بیان ہے کہ سفر بغداد میں بڑے بڑے لوگ میرے والد کے ہمراہ تھے۔ یہ بڑے لوگ کون تھے، اس کی تفصیلات کسی کتاب میں نہیں ملتیں۔

حضرت منصور حلاجؒ تقریباً ایک سال تک بغداد میں مقیم رہے۔ اس وقت بھی آپ کے پیرو مرشد حضرت جنید بغدادیؒ زندہ تھے مگر کسی روایت سے پتا نہیں چلتا کہ استاد اور شاگرد میں ملاقات ہوئی ہو۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت منصور حلاجؒ سے بدستور ناراض تھے......اور اس بات کا بھی سراغ نہیں ملتا کہ حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے مرشد کی ناراضی کو دور کرنے کی کوئی کوشش کی ہو...... مگر یہ امر اپنی جگہ طے ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے حضرت منصور حلاجؒ کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی اور کسی موقع پر مجمع عام یا مجلس خاص میں اپنی خفگی کا اظہار نہیں کیا۔

بغداد میں اپنے ایک سالہ قیام کے بعد حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے ایک دوست سے کہا۔ ''تم اس وقت تک میرے بیٹے احمد کی نگرانی کرنا جب تک میں واپس نہ آجاؤں۔''

''شیخ! اب کدھر کا ارادہ ہے؟'' دوست نے پوچھا۔

''میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ میں بلاد شرک (کفرستان) کی طرف جاؤں اور گم کردہ راہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاؤں۔'' حضرت حسین بن منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

(بلاد شرک اور کفرستان سے مراد ہندوستان ہے)

حضرت منصور حلاجؒ کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے دوست کے سپرد کر کے میرے والد صاحب نامعلوم مقام کی طرف چلے گئے۔ پھر کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ وہ ہندوستان میں موجود ہیں اور بت پرستوں کو خدائے واحد کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔''

حضرت منصور حلاجؒ کے سفر ہندوستان کے بارے میں فرانس کے مشہور مستشرق ''لوئی ماسینون'' کہتا ہے کہ حسین بن منصورؒ نے اپنے اس سفر کا آغاز بحری راستے سے کیا اور وہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے اور ملتان سے ہوتے ہوئے کشمیر پہنچے۔ ''اہواز'' کے تجارتی قافلے تستر کا زربفت (کپڑا) کشمیر لاتے اور اس کے بدلے میں بہترین چینی کاغذ جسے ''چاچو'' کہتے تھے، بغداد

لے جاتے۔ بعد میں اسی کاغذ پر منصور حلاجؒ کے شاگرد اپنے استاد کی کتابیں لکھا کرتے تھے۔ منصور حلاجؒ کشمیر میں ان ہی تاجروں کے ساتھ ساتھ ہو لئے اور پہاڑوں کے پر پیچ راستوں سے گزر کر شمال مشرق کی طرف ''توزمان'' (چین) تک جا پہنچے۔

کسی تاریخ سے یہ تو پتا نہیں چلتا کہ حضرت منصور حلاجؒ ہندوستان میں کتنے دن مقیم رہے۔ ''لوماسینون'' کی کتاب سے بس اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت حسین بن منصور حلاجؒ نے ہندوستان کے گیانیوں اور پنڈتوں سے ملاقات کی تھی۔ اس کے علاوہ حضرت منصور حلاجؒ خراسان میں ''مانی'' کے پیروکاروں اور ماوراء النہر کے بودھوں سے بھی ملے تھے۔

حضرت منصورؒ کے صاحبزادے احمدؒ کا بیان ہے کہ جب میرے والد اس طویل سیاحت سے واپس آئے تو ہندوستان کے لوگ ان کے نام کے ساتھ ''مغیث'' لکھتے تھے۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نے کچھ دن بت پرستوں میں رہ کر انہیں بھی اسلام کی دعوت دی تھی۔ اس تبلیغی مشن میں یقیناً کچھ ہندو مسلمان بھی ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ حضرت منصور حلاجؒ کی کرامات نے مشرکوں اور دیوتاؤں کے پجاریوں کو بھی متاثر کیا ہوگا۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنا آبائی مذہب ترک کر کے حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے ہوں گے۔

حضرت منصور حلاجؒ کے اسی سفر ہندوستان کو بنیاد بنا کر مخالفین نے ان پر یہ الزام تراشی کی ہے کہ وہ جادو سیکھنے کیلئے کفرستان کی طرف گئے تھے۔

بہرحال جب حضرت منصور حلاجؒ اس طویل سفر سے واپس آئے تو مختلف علاقوں کے لوگ انہیں مختلف ناموں سے یاد کرتے تھے۔ چین اور ترکستان کے لوگ انہیں ''مقیت'' کہتے تھے۔ خراسان کے باشندے ''ممیز'' کے نام سے پکارتے تھے اور فارس کے لوگ ''ابوعبداللہ زاہد'' کہتے تھے۔

واضح رہے کہ جہاں حضرت منصور حلاجؒ پر شعبدہ بازی اور ساحری کے الزامات تھے، وہاں ایک الزام یہ بھی تھا کہ ان کے ماننے والوں کی ایک جماعت انہیں ''خدا'' سمجھتی تھی۔ اس موضوع پر آئندہ صفحات میں تفصیلی بحث کی جائے گی مگر یہاں اتنی وضاحت ضروری ہے کہ مخالفین کے اس الزام کی بنیاد وہ ''القاب'' بھی ہو سکتے ہیں جو حضرت منصور حلاجؒ کے عقیدت مندوں نے ان کی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیئے تھے۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے رہنے والے حسین بن منصور کو ''مغیث'' کے لقب سے پکارتے تھے۔ ''مغیث'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''فریاد کو پہنچنے والا'' مادی دنیا میں ہم ایسے مناظر دیکھتے ہیں کہ ایک شخص نے فریاد کی اور دوسرے شخص نے فریاد سنی اور فریاد کرنے والے کی مشکل کو دور کر دیا...... مگر حقیقتاً صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ایسی ہے جو اپنے بندوں کی فریاد کو پہنچتی ہے۔ ممکن ہے اسی لقب کو بنیاد بنا کر مخالفین نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ حضرت منصور حلاجؒ اپنے بعض ماننے والوں کی نظر میں خدا تھے۔

حضرت منصور حلاجؒ چین اور ترکستان کے لوگوں میں ''مقیت'' کے لقب سے مشہور تھے۔ یہ بھی عربی زبان کا لفظ ہے اور واضح طور پر اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں سے ایک اسم مقدس ہے۔

''مقیت'' کے معنی ہیں، توانا، روزی دینے والا اور حاضر۔ ممکن ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کے مخالفین نے ان ہی القاب سے دھوکا کھایا ہو اور ان پر اپنی پرستش کرانے کا الزام عائد کر دیا ہو۔ بہرحال کچھ بھی ہو مگر حضرت منصور حلاجؒ برسرِعام اس الزام کو جھٹلایا کرتے تھے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

الغرض حضرت منصور حلاجؒ کی بے قراریوں اور وحشتوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ منزل عشق کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے اور اہل دنیا انہیں مختلف زاویوں سے دیکھ رہے تھے۔ اکثر عقیدت مند ولی کامل سمجھتے تھے مگر بعض ماننے والوں نے انہیں خدا کا درجہ دیدیا تھا۔ دوسری طرف مخالفین کے اعتراضات میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی تھی۔ پہلے بات شعبدہ باز اور جادوگر تک محدود تھی، اب انہیں کافر و زندیق بھی کہا جانے لگا تھا۔ مخلوق خدا کا یہی وہ رویہ تھا جس نے حضرت منصور حلاجؒ کے اضطراب کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔

پھر جب 290ھ میں حضرت منصور حلاجؒ تیسرے حج کیلئے حجاز مقدس پہنچے تو سوزش عشق سے وارفتہ ہو گئے۔ پہلے ضبط سخن سے سینہ جلتا تھا، دل پگھلتا تھا اور روح پھنکتی تھی...... مگر اب زبان بھی جل اٹھی۔ علامہ اقبال کے بقول ۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

آخر حج کا دن آ پہنچا۔ حضرت منصور حلاجؒ بھی دوسرے حاجیوں کی طرح ''لبیک اللھم لبیک'' کی صدائیں لگاتے رہے۔ پھر جب میدان عرفات میں پہنچے تو رب کعبہ کو مخاطب کر کے گریہ وزاری کرنے لگے۔

''اے خدائے بزرگ و برتر! مجھے اس سے زیادہ بے نوا اور حاجت مند بنا دے جیسا کہ میں نظر آتا ہوں۔ اے خلاق عالم! مجھے رسوا کر دے تا کہ لوگ مجھ پر لعنت بھیجیں...... اے میرے رب! لوگوں کو مجھ سے بیزار کر! تا کہ شکر کا ہر کلمہ جو میری زبان سے نکلتا ہے، فقط تیرے لئے ادا کیا جائے...... اے میرے کریم! مجھے اس بات پر استقامت عطا فرما دے کہ میں تیرے سوا کسی کا احسان نہ اٹھاؤں۔''

عجیب دعا تھی۔ شاید ہی بنی نوع آدم میں سے کسی نے اپنے مالک سے ایسی درخواست کی ہو۔

عوام الناس معصوم اور بے قصور تھے۔ انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ پکارنے والا کس مقام سے آواز دے رہا ہے...... مگر جو لوگ باخبر تھے وہ اسے پہچاننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ نتیجتاً مشہور کر دیا گیا کہ منصور حلاجؒ ''مجنون'' ہیں۔ بدخواہوں کی یہ تشہیری مہم اپنی جگہ اور حضرت منصور حلاجؒ کی وارفتگی شوق اپنی جگہ۔ وہ اپنے خالق کو اپنے انداز سے پکارتے رہے۔ شوق کی لے تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی اور آتش عشق کے شعلے حصار جاں سے نکل کر جسم کی چار دیواری میں بھی بھڑکنے لگے۔

پھر ایک ایسا عجیب واقعہ پیش آیا کہ جس کی گونج دربار خلافت میں بھی سنائی دینے لگی۔ بات یوں ہوئی کہ عباسی خلیفہ مقدر باللہ کا حاجب (امیر) ابن نصر قشوری بیمار ہوا۔ طبیب خاص کو طلب کیا گیا۔

اس نے ابن نصر کا معائنہ کیا۔ مرض تشخیص کیا اور اس کے ساتھ ہی دوا بھی تجویز کر دی۔ ابن نصر قشو
نے طبیب خاص کا نسخہ استعمال کیا مگر اسے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ درباری حکیم کو دوبارہ طلب
گیا۔ اس نے ایک بار پھر حاجب کا معائنہ کیا اور نئی دوا تجویز کرتے ہوئے کہا۔ ''امیر! اس مرض م
سیب کھانا بہت مفید ہوتا ہے...... مگر میں نے سیب اس لئے تجویز نہیں کیا کہ یہ موسم سیبوں کا نہیں
پھر بھی اگر کہیں سے سیب مل جائے تو آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔''

ابن نصر قشوری نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ بغداد کے گوشے گوشے میں سیب تلا
کریں۔ خدام نے اپنے امیر کے حکم پر بغداد اور اس کے مضافات کا ایک ایک چپہ چھان مارا مگر سیب
کہیں نہیں ملا۔

آخر ایک خدمت گار نے ابن نصر قشوری سے عرض کیا۔ ''امیر! میں یہاں ایک ایسے شخص کو جا
ہوں جو ہر حال میں سیب فراہم کر سکتا ہے۔''

''وہ کون ہے؟'' ابن نصر قشوری نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بغداد میں ایک درویش منصور حلاجؒ ہیں جو آپ کی اس خواہش کو بحسن و خوبی تکمیل تک پہنچا سک
ہیں۔'' خدمت گار نے کہا۔

''اس کے باوجود کہ یہ موسم سیبوں کا نہیں ہے؟'' ابن نصر قشوری بدستور حیران تھا۔

''دنیا کے کسی مقام پر تو سیبوں کا موسم ہوگا۔'' خدمت گار نے عرض کیا۔ ''منصور حلاجؒ دنیا کے د
دراز علاقے سے بھی سیب لے آئیں گے۔''

''مجھے یقین نہیں آتا مگر پھر بھی ایسے شخص کو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ابن نصر قشوری نے پُرتجسس
میں کہا۔

پھر جب ابن نصر کے خدمت گار نے حضرت منصور حلاجؒ سے اس واقعے کا ذکر کیا تو آپ
فرمایا۔ ''چلو! میں خود ہی ابونصر کی عیادت کو چلتا ہوں۔''

حضرت منصور حلاجؒ اپنی اسی شانِ قلندرانہ کے ساتھ خلیفہ مقتدر باللہ کے محل میں داخل ہو
قصر خلافت کے مکینوں نے بڑی حیرت سے اس گدڑی پوش درویش کو دیکھا۔ اس وقت ابن نصر قشو
کی عیادت کیلئے بڑے بڑے عمائدین شہر موجود تھے۔

''امیر! تم جانتے ہو کہ تمہیں بے موسم کے پھل کی خواہش ہے۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے ابن ن
کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''میں بھی یہی کہتا ہوں۔'' ابن نصر قشوری نے عرض کیا۔ ''مگر میرے اس خدمت گار کو آپ
ساتھ بہت حسن ظن ہے۔''

حاضرین بھی بڑی حیرت سے اس مرد درویش کو دیکھ رہے تھے۔ جس کا لباس بہت بے ترتی
تھا۔ ابن نصر قشوری کی بات سن کر حضرت حسین بن منصور حلاجؒ نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کر دیا
پھر دوسرے ہی لمحے آپ کے دست مبارک میں ایک تر و تازہ سیب موجود تھا۔

حضرت منصور حلاجؒ کی اس کرامت پر ابن نصر قشوری کے ساتھ حاضرین بھی حیرت زدہ رہ گئے۔

پھر وہاں موجود ایک معزز شخص نے اس مرد درویش سے پوچھا۔

''جب اس پھل کا موسم ہی نہیں ہے تو پھر تم یہ سب کہاں سے لائے؟''

''جنت سے۔'' حضرت منصور حلاج نے بے نیازانہ فرمایا۔

پھر اس سیب کو کاٹا گیا تو اس میں ایک کیڑا موجود تھا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا۔

''جنت کے پھل میں تو کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیڑا کیسا ہے؟''

حضرت منصور حلاجؒ نے بے ساختہ فرمایا۔ ''چونکہ یہ پھل ''دار بقا'' سے دار فنا میں آ گیا ہے، اس لئے اس میں یہاں کی بلا کا ایک حصہ شامل ہو گیا ہے۔''

روایت ہے کہ حاجب ابن نصر قشوری اور دیگر حاضرین نے حضرت منصور حلاجؒ کے برجستہ جواب کو ان کے فعل سے بھی زیادہ عجیب سمجھا۔

اس واقعے کے بعد ابن نصر قشوری حضرت منصور حلاجؒ کی بزرگی کا قائل ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی قصر خلافت میں ایک شور سا مچ گیا۔ عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کے خاندان کے کچھ لوگ اور بہت سے بااثر افراد آپ کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہو گئے۔

اسی طرح حضرت منصور حلاجؒ سے اور بھی کئی کرامات منسوب ہیں۔

حضرت شیخ رشید خرد سمرقندیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار تقریباً چار سو درویش سفر حج میں حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کے ہمراہ تھے۔ پیدل کا سفر تھا، اس لئے درویشوں کے قافلے پر شدید تھکن کے آثار طاری تھے...... مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ حضرت منصور حلاجؒ سے کسی قسم کی شکایت کرتا۔ پھر یوں ہوا کہ کئی دن تک راستے میں کھانے کا کوئی سامان میسر نہیں آیا۔ حضرت منصور حلاجؒ تو اس فاقہ کشی کے عادی تھے، اس لئے پیشانی مبارک پر ہلکی سی شکن تک نہیں تھی...... مگر دوسرے درویشوں کے حوصلے جواب دے گئے۔ آخر ایک درویش نے بصد احترام عرض کیا۔

''شیخ! ہم آپ جیسی استقامت کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔''

''مجھ میں ایسی کون سی خاص بات ہے۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

''ہماری طرح آپ بھی کئی دن سے فاقے میں مبتلا ہیں مگر یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ کسی شکایت یا اضطراب کا مظاہرہ نہیں کرتے۔'' درویش نے عرض کیا۔

''اللہ کے راستے میں گامزن ہو تو ہمت بھی بلند رکھو۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''جسے تم استقامت کہہ رہے ہو، اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ استقامت کسی اور شے کا نام ہے۔''

''شیخ کے فرمودات بجا مگر ہم اس استقامت سے آشنا نہیں۔'' درویش نے عرض کیا۔ ''بھوک سے ہماری ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ اب چند قدم بھی نہیں چل سکتے۔''

''تمہیں صبر بھی کرنا ہوگا اور سفر بھی جاری رکھنا ہوگا۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''میں اس ویرانے میں تمہارے لئے غذائی سامان کہاں سے لاؤں؟''

حضرت منصور حلاجؒ کے ساتھی درویش طویل سفر کی تھکن اور بھوک کی شدت کے سبب تھک راستے ہی میں بیٹھ گئے۔ حضرت حسین بن منصورؒ ان لوگوں کو چھوڑ کر تنہا بھی سفر جاری رکھ سکتے تھے آپ نے ایسا نہیں کیا۔

''آخر تم کس چیز کے انتظار میں اس طرح سرِراہ بیٹھے ہو؟'' ساتھیوں کا یہ حال دیکھ کر حضرت منصور حلاجؒ نے پوچھا۔

''اس انتظار میں کہ شاید اللہ کے بندوں کا کوئی قافلہ اِدھر سے گزرے اور اس کے پاس کچھ غذا سامان موجود ہو۔'' دوسرے درویش نے عرض کیا۔

''مگر اس کے پاس اتنا سامان کہاں ہوگا جس سے اتنے لوگوں کا پیٹ بھرا جا سکے۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے درویشوں کی جماعت پر نظر کی جس میں چار سو افراد شامل تھے۔ حضرت منصورؒ کا تج درست تھا کہ کوئی بھی قافلہ غذا کے سلسلے میں اتنے لوگوں کی کفالت نہیں کر سکتا تھا۔

آخر جب درویشوں نے تھک کر راستے میں پڑاؤ ڈال دیا تو حضرت منصور حلاجؒ نے فر

''کس کس کے سامنے اپنا سوال دہراؤ گے اور کس کس سے اپنی ضرورت بیان کرو گے؟''

''شیخ! مجبوری ہے۔ اب ہم صرف پانی پی کر یہ سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔'' کئی درویشوں نے یک زبان کہا۔

حضرت منصور حلاجؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر آپ نے ساتھی درویشوں کو مخاطب کر ہوئے فرمایا۔ ''اللہ ہی اپنی تمام مخلوق کا رازق ہے اور اللہ ہی اپنے بندوں کا کارساز ہے۔ تم لوگ انسانی قافلے کا انتظار نہ کرو بلکہ اللہ کے بھروسے پر اپنے اپنے دسترخوان بچھا لو۔''

درویشوں نے بڑی حیرت سے حضرت منصور حلاجؒ کی بات سنی۔ ''شیخ! کیا آپ ہمیں کھلائیں گے؟''

''بندوں کو کھلاتا تو وہی ہے جو سارے خزانوں کا مالک ہے..... مگر آج میں تمہاری میزبانی کروں گا۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

ساتھی درویشوں کو شدید حیرت تھی کہ شیخ اس بیابان میں اتنے لوگوں کی غذا کا انتظام کیسے کر گے مگر پھر بھی تمام درویشوں نے اپنے اپنے رومال زمین پر بچھا لئے۔

''شیخ! جب آپ ہماری میزبانی کر ہی رہے ہیں تو پھر پسندیدہ چیز کھلائیے؟'' ایک درویش عرض کیا۔

''تمہیں کیا پسند ہے؟'' حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے ہم سفر درویشوں سے پوچھا۔

''شیخ! بہت دنوں سے سری نہیں کھائی ہے۔'' بیک وقت کئی درویشوں نے اپنی پسندیدہ غذ خواہش کا اظہار کیا۔

''صف بندی کر لو۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

اور پھر درختوں کے سائے میں تمام درویش ایک ترتیب کے ساتھ بیٹھ گئے۔

حضرت منصور حلاجؒ پہلے درویش کے پاس پہنچے۔ پھر آپ نے اپنا دایاں ہاتھ کمر کے پیچھے کیا۔ تمام درویشوں پر حیرت و سکوت کا عالم طاری تھا۔ چند لمحوں بعد حضرت حسین بن منصورؒ کا ہاتھ سامنے آیا تو سالن کا ایک برتن اور دو گرم روٹیاں موجود تھیں۔ ''بسم اللہ کرو۔'' حضرت منصورؒ نے درویش سے فرمایا۔ پھر اسی طرح اپنا ہاتھ کمر کے پیچھے لے گئے۔ یہاں تک کہ چار سو درویشوں نے شکم سیر ہو کر اپنا مرغوب کھانا کھایا۔ پھر حضرت منصور حلاجؒ سے عرض کیا۔

''شیخ! یہ کیا تھا؟''

''تمہارے پیٹ بھر گئے؟'' حضرت منصور حلاجؒ نے ایک درویش کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے فرمایا۔

''شیخ! بھوک تو مٹ گئی مگر حیرت بڑھ گئی۔'' دوسرے درویش نے عرض کیا۔

''حیرت کا کیا ہے؟ جب تک زندہ ہو، حیرت تو بڑھتی ہی رہے گی۔'' حضرت حسین بن منصور حلاجؒ نے اپنے ساتھیوں کو ٹالنے کی کوشش کی مگر جب درویشوں کا اصرار زیادہ بڑھ گیا تو آپ نے فرمایا۔

''یہ اس کی رزاقی کا ادنیٰ ترین کرشمہ ہے۔ وہ اپنے بندوں کو ایسی جگہ سے رزق فراہم کرتا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

الغرض حاجیوں کا یہ قافلہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ تمام درویش اپنی کھلی آنکھوں سے حضرت منصور حلاجؒ کی یہ کرامت دیکھ ہی چکے تھے۔ پھر ایک مقام پر پہنچ کر ان لوگوں نے اپنی دوسری خواہش کا اظہار کیا۔

''شیخ! ہمارا دل تازہ خرموں کو چاہتا ہے۔''

''یہی تو انسان کی کمزوری ہے کہ وہ قناعت نہیں کر سکتا۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے درویشوں کی بات سن کر فرمایا۔ ''شکم کی آگ بجھی تو لذت کی آگ بھڑک اٹھی۔ پھر کوئی اور آگ بھڑک اٹھے گی۔ یہاں تک کہ ایک دن انسان آخری آگ کا ایندھن بن جائے گا۔''

درویشوں نے حضرت منصور حلاجؒ کی عبرت اثر تقریر سنی مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔ درویش یا تو حضرت منصور حلاجؒ کی نئی کرامت دیکھنا چاہتے تھے یا واقعتاً اپنی خواہش سے مغلوب ہو گئے تھے۔

آخر حضرت منصور حلاجؒ ایک جگہ کھڑے ہو گئے اور درویشوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''مجھے زور زور سے ہلاؤ۔''

درویشوں نے ایسا ہی کیا اور پھر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ حضرت منصور حلاجؒ کے جسم کو ہلا رہے تھے اور زمین پر تازہ خرموں کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا۔ پھر تمام ہم سفروں نے جی بھر کے تازہ کھجوریں کھائیں اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔

ایک اسی انداز کا واقعہ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ نے اپنی تصنیف ''تذکرۃ الاولیاء'' میں تحریر کیا ہے کہ ایک بار حضرت منصور حلاجؒ اپنے مریدوں اور خدمت گاروں کے ساتھ کسی جنگل میں جا رہے تھے۔ خدام نے عرض کیا۔ ''شیخ! انجیر کھانے کو دل چاہتا ہے مگر اس جنگل میں نہ انجیر کے درخت ہیں

اور نہ موسم۔"

حضرت منصور حلاجؒ نے خدمت گاروں کی خواہش سن کر فضا میں اپنا ہاتھ بلند کیا۔ پھر دوسر
لمحے تازہ انجیروں سے بھرا ہوا ایک طباق موجود تھا۔ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ ایک اور واقعہ
کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک بار حضرت منصور حلاجؒ اپنے مریدوں کے ہمراہ کسی جنگل سے
رہے تھے۔ یہ مقام بغداد سے کئی دن کی مسافت کے فاصلے پر تھا۔ خدمت گاروں نے حلوہ کھا
خواہش ظاہر کی تو حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

"میں اس بیابان میں تم لوگوں کیلئے حلوہ کہاں سے لاؤں؟"

"شیخ! آپ بے موسم کے انجیر کھلا سکتے ہیں تو حلوہ لانے میں کیا قباحت ہے؟" خدمت گا
نے عرض کیا۔

حضرت منصور حلاجؒ نے حسب عادت اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور حلوے سے بھرے ہوئے
اپنے مریدوں کے سامنے رکھ دیئے۔

خدمت گاروں نے وہ لذیذ حلوہ کھانے کے بعد عرض کیا۔ "شیخ! یہ حلوہ تو بازار کے بغداد و
ملتا ہے۔"

حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے مریدوں کی حیرت کے جواب میں فرمایا۔ "میرے لئے بغدا
بازار اور جنگل سب برابر ہیں۔"

اسی قسم کی کرامات کا شہرہ سن کر مکہ معظمہ، بصرہ، بغداد اور دیگر شہروں کے لوگ کئی گروہوں میں
ہو گئے۔ ایک گروہ حضرت منصور حلاجؒ سے محتاط عقیدت رکھتا تھا، اس کی نظر میں حسین بن منصو
باکرامت تھے۔ اس گروہ میں اپنے زمانے کے مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ اور ح
عبداللہ خفیفؒ نمایاں تھے۔

دوسرا وہ گروہ جس نے اپنی عقیدت میں انتہائی مبالغے سے کام لیا تھا۔ یہ لوگ حضرت منصو
کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور امام مہدی سمجھتے تھے۔ (معاذ اللہ)

تیسرا گروہ اگرچہ علماء پر مشتمل تھا لیکن اس گروہ کے لوگ حضرت منصور حلاجؒ کو "شعبدہ با
"ساحر" کہہ کر پکارتے تھے۔

چوتھے گروہ میں بھی علماء شامل تھے مگر یہ لوگ کھلی دشمنی پر اتر آئے تھے اور تحقیق کی زحمت اٹھا
بغیر سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر حضرت منصور حلاجؒ کو زندیق اور کافر کہا کرتے تھے۔

چونکہ حضرت منصور حلاجؒ مسلمانوں میں انتہائی متنازع شخص ہیں، اس لئے ان کے بار
جس قدر معلومات حاصل ہو سکی ہیں، وہ حرف بہ حرف درج کی جارہی ہیں۔ جس مؤرخ نے
سے پہلے حضرت منصور حلاجؒ کا ذکر نہایت گستاخانہ اور جارحانہ لہجے میں کیا ہے، وہ عریب بن
ہے۔ اس کی لکھی ہوئی تاریخ "صلہ طبی" کافی شہرت رکھتی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس
کے ایک باب کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

"حلاج ایک گمراہ اور خبیث آدمی تھا۔ وہ شہر بہ شہر پھرا کرتا تھا اور جاہلوں کو دھوکا دیا کرتا تھا۔ بعضوں کے سامنے یہ ظاہر کرتا کہ وہ اہل بیت کا داعی ہے اور بہت سے لوگوں سے کہتا کہ وہ (عقیدتاً) سنی ہے۔ شیعوں کے سامنے شیعہ بن جاتا اور معتزلہ کے سامنے کسی معتزلی کا روپ دھار لیتا۔ اس کے علاوہ ہاتھ کا بڑا چالاک اور شعبدہ باز تھا۔ اسے طب کا دعویٰ تھا کیمیا کا تجربہ رکھتا تھا۔ ہمیشہ شعبدے کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے بہت سے بے وقوفوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ پھر اس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور "حلول" کا قائل ہوا (اس عقیدے کو ماننے والوں کا خیال ہے کہ خدا کسی خاص انسان کی ذات میں سما جاتا ہے) پھر اس نے اللہ اور رسول پر افترا باندھا۔ اس کے بہت سے خطوط ملے جن میں حماقتیں اور الٹی سیدھی باتیں تحریر تھیں۔ بعض خطوں میں تحریر تھا کہ میں ہی قوم نوح کا ڈبونے والا ہوں اور قوم عاد و ثمود کو ہلاک کرنے والا ہوں......اور اپنے مریدوں سے کہتا کہ تم نوح اور موسیٰ ہو میں نے ان کی روحیں ان کے بدن میں لوٹا دی ہیں۔"

آگے چل کر علامہ سید سلیمان ندویؒ حضرت منصور حلاجؒ کے حوالے سے مشہور مؤرخ ابن ندیم کا ایک اقتباس اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"حلاج ایک حیلہ گر اور شعبدہ باز تھا۔ اس نے صوفیا کے طریقے اختیار کر لئے تھے۔ ان کے الفاظ بولتا تھا اور ہر علم کا دعویٰ کرتا تھا۔ حالانکہ وہ اس سے خالی تھا۔ البتہ علم کیمیا کچھ جانتا تھا۔ اپنے مقلدوں میں بیٹھ کر الوہیت کا مدعی تھا اور حلول کا قائل تھا۔ سلاطین کے سامنے اپنا مذہب شیعہ ظاہر کرتا اور عوام کے سامنے صوفیوں کا مذہب......اور بیچ بیچ میں یہ بھی دعویٰ کرتا جاتا کہ الوہیت اس میں حلول کر گئی ہے......اور وہ خدا ہے......"

اس طرح علامہ سید سلیمان ندویؒ نے کئی تاریخی حوالے پیش کئے ہیں اور انہیں معتبر قرار دیا ہے۔ اس کے بعد علامہ موصوف نے حضرت منصور حلاجؒ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"تمام تاریخیں اس امر پر متفق اللفظ ہیں کہ حلاج، نیرنگ، شعبدہ بازی اور ہاتھوں کے کھیل میں بہت چالاک اور بہت مشاق تھا۔ روپے برسا دیتا تھا، طرح طرح کے میوے منگوا دیتا تھا...... ہوا پر اڑتا تھا......اور بھی کچھ عجائبات دکھاتا تھا۔ ایک بار ایک شخص نے کہا کہ تم کوئی ایسا سکہ دکھاؤ جس پر خلیفہ کے بجائے تمہارا نام کندہ ہو......لیکن یہ بازی گر الوہیت کے دعوے کے باوجود اپنے نام کا ایک سکہ بھی بنا کر نہ دکھا سکا......اس کے ہم سفر کا بیان کہ حلاج اس کے ساتھ اس غرض سے ہندوستان آیا کہ یہاں کی مشہور شعبدہ بازیوں کی تعلیم حاصل کرے۔ چنانچہ اس کے سامنے ایک عورت سے حلاج نے رسی پر چڑھ کر غائب ہو جانے کا شعبدہ سیکھا۔ راہ میں گڑھے کھود کر کہیں پانی، کہیں میوہ، کہیں کھانا پہلے چھپا دیا جاتا۔ پھر وہ اپنے ہمراہیوں کو لے کر اس سمت میں سفر کرتا اور بوقت ضرورت اپنی کرامتوں کے تماشے دکھاتا۔"

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے مضمون میں ابوریحان البیرونی کی کتاب "آثار الباقیہ" سے بھی

ایک اقتباس پیش کیا ہے۔ البیرونی، حضرت منصور حلاجؒ کے بارے میں لکھتا ہے۔

''ابن مقنع کے بعد ایک صوفی منش شخص حسین بن منصور حلاجؒ پیدا ہوا۔ نسلاً یہ ایرانی تھا۔ پہلے یہ ''مہدی'' بنا۔ وہ ایک شعبدہ باز اور پُر فریب آدمی تھا۔ ہر مذہب اور ہر فرقے کے آدمی کے سامنے اپنے آپ کو اسی فرقے اور مذہب کا بتاتا تھا۔ پھر یہ دعویٰ کیا کہ اس میں روح الٰہی حلول کر گئی ہے اور اس لئے اپنے آپ کو خدا کہنے لگا۔ خط میں اپنے پیروکاروں کو لکھا۔ ''خدائے ازلی کی طرف سے فلاں بندے کے نام۔'' اس کے مرید جواب میں لکھتے۔ ''اے وہ ذات جو ہر زمانے میں مختلف قالب اختیار کرتی رہی ہے اور اب حسین بن منصور کے قالب میں ہے۔''

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا یہ مضمون مشہور رسالے ''معارف'' کے شمارے اپریل 1917ء میں شائع ہوا تھا۔ علامہ نے جس قدر بھی تاریخی حوالے پیش کئے ہیں، وہ سب کے سب حضرت منصور حلاجؒ کی صوفیانہ شخصیت کی نفی کرتے ہیں۔ خود سید سلیمان ندویؒ کی ذاتی رائے جو حضرت منصور حلاجؒ کے بارے میں ہے، اسے پڑھ کر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کے دل میں حسین بن منصورؒ کیلئے کوئی نرم گوشہ موجود نہیں۔ صوفی اور ولی سمجھنا تو درکنار، سید سلیمان ندویؒ، حضرت منصور حلاجؒ کو مسلمان ماننے کیلئے بھی تیار نہیں۔ عریب بن سعد، ابن ندیم، ابوریحان البیرونی اور دوسرے مؤرخین کی طرح علامہ ندویؒ بھی حضرت منصور حلاجؒ کو ایک دھوکے باز اور جادوگر سمجھتے تھے۔ سید سلیمان ندویؒ کے خیال میں حسین بن منصورؒ جس فرقے کے لوگوں سے ملتے تھے ان ہی کا مذہب اختیار کر لیتے تھے۔ گویا وہ موقع محل کے اعتبار سے اپنے عقائد اور نظریات کو تبدیل کر لیا کرتے تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ کیا تھے، اس بحث سے قطع نظر، وہ زمانہ ساز انسان نہیں تھے۔ ایک نہیں، ہزاروں شہادتیں موجود ہیں کہ منصور حلاجؒ جس بات کو درست سمجھتے تھے، اس کا اظہار برملا کرتے تھے۔ حسین بن منصورؒ کی اسی بے باکی کے سبب ان کے اساتذہ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ اور حضرت جنید بغدادیؒ ان سے ناراض ہو گئے تھے۔ پھر آٹھ سالہ قید کے دوران اور آخر میں سولی پر چڑھتے وقت منصور حلاجؒ نے جو استقامت دکھائی ہے وہ کسی شعبدہ باز یا جادوگر کے بس کی بات نہیں تھی۔

بعد میں آنے والے محققین نے عریب بن سعد، ابن ندیم، خطیب بغدادی، ابوریحان البیرونی اور اسی قسم کے دیگر مؤرخین کی روایتوں کو غلط قرار دیا ہے۔ حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ، حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ اور حضرت شیخ عبداللہ خفیفؒ جیسے اولیائے کرام کے سامنے مذکورہ مؤرخین کی روایتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہ تینوں بزرگ نہ صرف حضرت منصور حلاجؒ کی صوفیانہ عظمت کے قائل تھے بلکہ اس زمانے میں موجود بھی تھے جب ایک سوختہ جاں عاشق کو تہمتوں کی آگ میں جلایا جا رہا تھا۔

☆☆......☆☆......☆☆

الغرض مسلسل کرامتوں کا اظہار حضرت منصور حلاجؒ کیلئے وبال جان بن گیا۔ پہلے انہیں شعبدہ باز اور ساحر قرار دیا گیا۔ پھر الزام لگایا گیا کہ حضرت منصور حلاجؒ حکومت وقت کے خلاف در پردہ سازشیں کر رہے ہیں اور عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کا تختہ الٹ کر تخت خلافت پر متمکن ہونا چاہتے ہیں۔

لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ ایک شخص جسے اپنی جان تک کا ہوش نہ ہو، وہ سیاست کی ہنگامہ آرائیوں میں کس طرح ملوث ہو سکتا ہے۔ آدمی اقتدار تو اس لئے حاصل کرتا ہے کہ وہ عیاشانہ اور آمرانہ زندگی بسر کرے...... مگر جس شخص کا یہ حال ہو کہ ایک ہی لباس میں کئی سال گزار دے، کئی کئی دن بھوکا اور پیاسا رہے، اسے تخت خلافت کی ہوس کس طرح ہو سکتی ہے...... مگر چونکہ ہمارے مؤرخین حضرت منصور حلاجؒ کو حیلہ باز اور فتنہ گر قرار دیتے ہیں اس لئے علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی ان ہی کے ہم خیال ہیں۔ ذیل میں ان کے مضمون کا ایک اہم اقتباس پیش کیا جا رہا ہے، جس سے بظاہر اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کی شدید ترین ریاضتیں اس لئے تھیں کہ وہ عوام میں شہرت حاصل کر سکیں اور پھر اس شہرت کا سہارا لے کر منصب اقتدار تک پہنچ جائیں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ تحریر کرتے ہیں کہ منصور حلاج کے واقعہ میں جو اصل حقیقت پوشیدہ ہے، اسے تلاش کرنا چاہئے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ اور بنوعباس کی خلافت کا قیام، صرف اہل عجم کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ابومسلم خراسانی جو اس انقلاب کا ہیرو ہے، وہ کوہستان اور خراسان میں پہلے ''داعی'' بنا۔ پھر داعی سے ''نبی''...... اور آخر میں نبی سے خدا ہو گیا...... یعنی لوگ اسے خدا کا ''اوتار'' ماننے لگے (ہندوؤں کا بھی یہی نظریہ ہے۔ رام، کرشن اور شنکر وغیرہ کو خدا کا اوتار سمجھا جاتا ہے) آخر خلافت عباسیہ کے قیام کے بعد خلیفہ منصور نے ابومسلم خراسانی کو قتل کرا دیا...... لیکن اس کے باوجود ان علاقوں میں اس کی ''خدائی'' کا زور باطل نہیں ہوا۔ مجوسی، پارسی اور اہل عجم اپنی ملکی اور وطنی حکومت کے قیام کی مختلف تدبیریں سوچتے تھے اور وہ سب بیکار ثابت ہوئی تھیں۔ آخر وہی تدبیر کامیاب نظر آئی جو ابومسلم نے اختیار کی تھی۔ چنانچہ خلافت عباسیہ کے قیام کے ساتھ یہ سازشیں شروع ہو گئیں۔ بابک خرمی اور مقنع خراسانی نے کوہستان، خراسان اور ترکستان کے علاقوں میں سالہا سال تک خدائی کی...... اور خلیفہ کی فوجیں شکست پر شکست کھاتی رہیں اور بڑی مشکل سے یہ فتنہ فرو ہو سکا۔

اہل عجم کا ایک اور گروہ تھا جو ملکی حکومت سے مایوس ہو کر حکمراں طبقے میں اثرات پیدا کر کے دخیل کار ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس میں ان لوگوں کو کامیابی ہوئی...... اور خلافت عباسیہ کے پہلے خلیفہ سفاح سے لے کر مامون رشید تک تمام کاروبار ان ہی کے ہاتھوں انجام پاتا رہا۔ پھر جب معتصم باللہ تخت نشین ہوا تو اس نے ایرانیوں کی جگہ ترکوں کو دے دی۔ اب عرب و عجم کے بجائے ''ترک و عجم'' میدان میں تھے۔ عام ہر دل عزیزی اور جمہوری کی ہمدردی ایران و عراق میں اہل بیت نبوی ﷺ کے ساتھ تھی۔ چنانچہ دونوں طاقتیں اسی عصا کے سہارے کھڑی ہوئی تھیں۔

معتصم باللہ کے بعد عباسیوں کا زوال شروع ہو گیا۔ ایران و ترکستان میں ''دیالمہ'' نے ایک مستقل حکومت قائم کر لی۔ اس کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں پیدا ہو گئیں۔ اب خلافت بغداد کی حیثیت ایک قدیم یادگار کی رہ گئی تھی۔ ان رئیسوں اور سلاطین میں سے جس کا قابو چل جاتا، خلافت کے کاروبار پر اپنا قبضہ جما لیتا۔

اسی اثناء میں دو عظیم الشان طاقتیں پیدا ہو گئیں۔ عراق میں قرامطہ کا گروہ پیدا ہوا اور افریقا میں

ایک مہدی کا ظہور ہوا جو فاطمیت کے مدعی بھی تھے ان کے داعی اور جاسوس، درویشوں اور زاہدوں کی صورت میں تمام بلاد اسلامیہ میں پھیل گئے تھے۔ "مہدیوں" کا گروہ بڑھتے بڑھتے مصر پر قابض ہو گیا اور کئی سو برس تک وہاں بڑے جاہ و جلال سے حکومت کی۔

قرامطہ نے جو حقیقتہً مجوسی تھے، دس بارہ سال تک مسلمانوں پر وہ مظالم توڑے کہ ان کے بیان سے اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے عین حج کے زمانے میں عرب پر حملہ کیا اور حاجیوں کے قافلے کو لوٹ لیا۔ ہزاروں حاجیوں کو تہہ تیغ کیا۔ بیت اللہ سے حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے۔ پھر ادھر سے فرصت پا کر دارالخلافت کا رخ کیا۔ دم بہ دم ان کے آگے بڑھنے کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ خلیفہ بغداد سے فوجوں پر فوجیں بھیج رہا تھا اور وہ شکست کھا کھا کر پیچھے لوٹ جاتی تھیں۔ آخر بڑی مشکل سے کئی سال میں جا کر ان کا زور گھٹا اور وہ صرف ایران کے کوہستانی علاقے میں "باطنیہ" کے لقب سے سمٹ کر رہ گئے۔

301ھ سے 310ھ تک ان فتنوں کے عین عروج اور شباب کا زمانہ تھا۔ ان فرقوں کے "داعی" عوام کو فریب دینے والے عجیب و غریب دعوؤں کے ساتھ اٹھتے تھے۔ ظاہری زہد و تقویٰ اور شعبدہ گری کی کرامات دکھاتے ہوئے خاموشی کے ساتھ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں پھرا کرتے تھے۔ عوام ان کے گرویدہ ہوتے جاتے اور معتقد بن جاتے تھے۔ جب ایک جمعیت پیدا ہو جاتی تھی تو موقع پا کر یہ بازی گر جدھر چاہتے تھے، ان بے وقوفوں کو جھونک دیتے تھے۔

عین اسی ہنگامہ "رستخیز" میں حلاج کا ظہور ہوا۔ یہ شخص دنیا کو دکھانے کیلئے بڑی بڑی ریاضتیں ہائے شاقہ برداشت کرتا تھا۔ پہاڑ پر چڑھ کر دن دن بھر دھوپ میں بیٹھا رہتا۔ ہندوستان آ کر یہاں کے "نٹوں" سے بہت سے شعبدے سیکھے۔ پھر واپسی میں اس نے عراق کو اپنا مسکن بنایا۔ پہلے ایک داعی کی حیثیت اختیار کی۔ لوگوں کو اپنی کرامتیں دکھاتا ہوا، سرکاری عہدیدار سے نظریں بچاتا ہوا، گاؤں سے اس گاؤں اور اس شہر سے اس شہر میں پھرا کرتا تھا۔ لوگوں کا بڑا مجمع اس کے گرد جمع ہو گیا۔ اب اس نے نئے نئے دعوے شروع کئے اور اس کے مرید ہر بات پر "آمنا وصدقنا" کہتے جاتے تھے۔ آخر خدائی تک نوبت پہنچی۔

سب سے پہلے 299ھ میں سرکاری عہدیداروں پر اس کا راز فاش ہوا۔ عراق میں ایک مقام "سوس" ہے۔ ایک دن محکمۂ خبر رسانی کا افسر اعلیٰ وہاں کی ایک گلی سے گزر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت آپ ہی آپ بڑبڑاتی جا رہی تھی۔

"مجھے چھوڑ دو۔ ورنہ میں کہہ دوں گی۔"

محکمۂ خبر رسانی کے افسر اعلیٰ نے اس بوڑھی عورت کو مشکوک سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ پھر تنہائی میں اس سے پوچھا۔

"تو کیا کہتی جا رہی تھی؟ اور کن لوگوں سے پیچھا چھڑا رہی تھی؟"

شروع میں تو بوڑھی عورت نے کچھ بتانے سے انکار کیا مگر جب افسر اعلیٰ نے اسے ڈرایا دھمکایا تو وہ

زبان کھولنے پر مجبور ہو گئی۔ "میرے گھر کے پاس حلاج نامی ایک شخص آ کر اترا ہے، جس کے پاس دن رات لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ وہ لوگ چپکے چپکے آتے ہیں اور عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔"

افسر اعلیٰ نے اسی وقت سپاہی بھیجے اور حلاج کو اس کے مریدوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔

پھر جب حلاج سے باز پرس کی گئی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ "نہ میں حلاج ہوں اور نہ اس نام کے کسی شخص کو جانتا ہوں۔"

محکمۂ خبر رسانی کے افسر اعلیٰ نے بہت کوشش کی مگر حلاج نے اپنی زبان سے اقرار نہیں کیا کہ وہ حلاج ہے۔ آخر کچھ جاننے والے لوگوں نے گواہی دی کہ وہی حلاج ہے۔ پھر جب مزید تفتیش کی گئی تو بہت سے خطوط اور کاغذات اس کے پاس سے برآمد ہوئے۔ افسر اعلیٰ نے دربار خلافت کو اطلاع دی اور خلیفہ کے حکم پر حلاج کو زنجیریں پہنا کر بغداد روانہ کیا۔ پھر اسے حوالۂ زنداں کر دیا گیا۔

اس زمانے میں اسلامی حکومتوں میں اعلیٰ ترین عہدے دو تھے۔ وزارت اور حجابت۔ اس وقت بغداد میں حامد بن عباس وزیر تھا، اور بن نصر قشوری حاجب۔ حامد بن عباس اور ابن نصر قشوری میں باہم چشمکیں تھیں۔ حامد نے حلاج کو قید کیا تھا۔ حلاج نے اپنا منتر نصر قشوری پر پھونکنا شروع کر دیا۔ عباسی خلیفہ مقتدر باللہ نام کا مقتدر تھا۔ حکومت کی باگ حرم سراؤں (شاہی خاندان کی عورتوں) کے ہاتھ میں تھی۔ حرم سرا کی بڑی ماما کو "قہرمانہ" کہتے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں تمام حرم سرا جز و کل ہوتا ہے۔ یہ قہرمانہ سلطنت کے انتظامات میں اس قدر دخیل کار ہو گئی تھی کہ اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام انجام نہیں پاتا تھا۔ خلیفہ مقتدر باللہ کی ماں باقاعدہ دربار لگا کر بیٹھتی تھی اور احکام نافذ کرتی تھی۔

عورتوں کو ہر زمانے میں دعا، تعویذ، گنڈے اور دیگر عجائبات و کرامات پر جس قدر جلد یقین آ جاتا ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ منصور حلاج ان فنون میں طاق تھا اس نے ان ہی ہتھیاروں سے ان پر وار شروع کر دیئے۔ یہ وار کارگر ثابت ہوئے۔ حرم کی عورتیں، بہت سے وزراء آس پاس کے امراء، دارالخلافے کے بہت سے اعلیٰ عہدیدار اور شہر کے عوام کو اس نے اپنا ہم آہنگ بنا لیا۔ ابن نصر قشوری حاجب بھی اس سے جا کر مل گیا۔ اب حکومت کے خلاف انقلاب کا مسالا تیار تھا۔ حامد بن عباس نے خلیفہ مقتدر باللہ سے حلاج کے قتل کا اذن طلب کیا...... اور اس کی کتابیں پیش کیں جن میں بعض باتیں خلاف شریعت تھیں۔ قاضی نے اس کے قتل کا محضر تیار کیا۔

یہ ہے حضرت منصور حلاجؒ کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق جسے ہم نے حرف بہ حرف نقل کر دیا ہے۔ اس تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت حسین بن منصور حلاجؒ، ابو مسلم خراسانی، بابک خرمی اور مقنع خراسانی کی طرح (معاذ اللہ) خدائی کے دعویدار تھے اور ان کی ساری ریاضتیں محض اس لئے تھیں کہ وہ قصر خلافت کی تو ہم پرست خواتین کو اپنی شعبدہ بازیوں سے اور بغداد کے عوام کو اپنے ساحرانہ کمالات سے متاثر کر کے انقلاب کی فضا تیار کریں اور موقع ملتے ہی عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کا تختہ الٹ دیں۔ اس کے بعد یا تو خود خلیفۂ وقت بن بیٹھیں یا پھر اپنی طرح گمراہ لوگوں کو برسر اقتدار لے آئیں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ اپنے اس سیاسی تجزیئے کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ''ہم نے جو کچھ اوپر لکھا ہے، وہ ابن سعد قرطبی، ابن حوقل بغدادی اور ابن ندیم بغدادی کے بیانات کا لفظی ترجمہ ہے مزید اطمینان کیلئے ہم اصل عبارت نقل کر دیتے ہیں۔''

ابن سعد قرطبی کا بیان ہے کہ حلاج ایک گمراہ اور خبیث آدمی تھا شہر بہ شہر پھرا کرتا تھا اور جاہلوں کو بہکایا کرتا تھا۔ کچھ لوگوں کو اس نے بتا دیا تھا کہ وہ امام رضاؒ کا داعی ہے۔ غرض ہمیشہ ان ہی شعبدہ بازیوں سے اس نے بہت سے بے وقوفوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔''

ابن حوقل بغدادی کا بیان ہے کہ حلاج شعبدے دکھا کر وزیروں کی ایک جماعت کو اور حکومت کے عہدیداروں کو اور شہروں کے افسروں اور عراق و جزیرہ وغیرہ کے حاکموں کو اس نے اپنی طرف مائل کر لیا...... لیکن وہ ادھر ایسا پھنس گیا تھا کہ اس کی واپسی ناممکن ہوگئی تھی اور یہ امید نہ تھی کہ اگر یہاں کے لوگوں کے سامنے آجائے تو وہ اس کے معتقد ہو جائیں گے۔ بہر حال گرفتار ہوا اور قید ہوا اور دارالحکومت بغداد میں اس وقت تک قید رہا، جب تک یہ خوف نہ ہوا کہ دارالخلافے کے بہت سے لوگوں کو، حاجب کو اور حرم کو بہکا لے گا۔''

ابن حوقل بغدادی کی اس عبارت سے بس اتنا پتا چلتا ہے کہ اس کی نظر میں حضرت حسین بن منصور حلاجؒ محض ایک شعبدہ باز اور ساحر تھے۔ یہ ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت منصور حلاجؒ کسی قسم کے سیاسی عزائم رکھتے تھے اور ایک خاص منصوبے کے تحت ملک میں شورش پیدا کر کے حکومت وقت کے خلاف انقلاب لانا چاہتے تھے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے نظریئے کی تائید میں مؤرخ ابن ندیم بغدادی کی تاریخ کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ ابن ندیم لکھتا ہے کہ حلاج ایک جاہل، دلیر، زمانہ ساز اور بڑے بڑے ارادوں کا ارتکاب کرنے والا تھا اور چاہتا تھا کہ سلطنتوں کو الٹ دے۔ وہ اپنے پیروؤں کے سامنے الوہیت کا مدعی تھا اور حلول کا قائل تھا۔ امرائے وقت کے سامنے اپنا کوئی اور مذہب ظاہر کرتا تھا مگر عوام کے روبرو یہی کہتا تھا وہ صوفیوں کے طریقے پر چلتا ہے...... پھر وہ دارالخلافہ بھیجا گیا اور وہاں قید کر دیا گیا۔ دارالحکومت کے لوگوں میں اہلسنت کا عقیدہ ظاہر کر کے قربت حاصل کرنے لگا۔ نتیجتاً حکومت کے اعلیٰ عہدیدار سمجھنے لگے کہ یہ شخص پہلے پہلے امام رضاؒ کا داعی تھا۔ لوگوں نے اس کی شکایت کر دی وہ ''کوہستان'' میں پکڑا گیا...... اور اس کو کوڑے لگائے گئے۔ ایک ایرانی رئیس ابوسہل نوبختی کو حلاج نے دعوت دی اور اس کے قاصد سے کہا کہ میں ایک مذہب کا امام ہوں۔ میرے پیچھے ہزاروں آدمی ہیں۔ اگر میں ان سے کہہ دوں تو وہ سب کے سب ابوسہل نوبختی کے فرمانبردار ہو جائیں گے۔ پھر نصر حاجب کے سامنے پیش کیا گیا تو حلاج نے اسے بہکا لیا۔ اصل میں جو شخص حلاج کے قتل کے درپے ہوا وہ حامد بن عباس وزیر تھا۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آ گیا تھا خلیفہ مقتدر باللہ سے آزاد کر دیا کیونکہ خلیفہ کے محل میں جتنے نوکر چاکر اور عورتیں تھیں ان سب کو حلاج نے اپنی دعاؤں، تعویذوں اور منتروں سے رام کر لیا تھا۔ حلاج کھاتا کم تھا۔ نماز بہت پڑھتا تھا۔ ہمیشہ روزے سے رہتا تھا۔

ان حیلوں سے اس نے سب کو بہکا لیا تھا اور اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ ابن نصر قشوری حاجب اس کو شیخ اور زاہد کہنے لگا۔ حالانکہ وہ غلطی پر تھا حامد بن عباس وزیر اس کو ثابت کرتا تھا اور حلاج پر بعض الزام قائم کرتا تھا پھر ایک دن حلاج نے حامد بن عباس سے کہا کہ میں تم سے ''مباہلہ'' کروں گا اس پر حامد بن عباس نے کہا کہ اب ثابت ہو گیا کہ جس کا تم نے ارتکاب کیا، اس کے مدعی بھی ہو۔ غرض حلاج قتل کیا گیا اور بہت چیخا چلایا۔''

ابن ندیم کی اس تحقیق پر بعد میں آنے والے محققین نے سخت اعتراضات وارد کئے ہیں اور بہت سی روایتوں کو یکسر جھٹلا دیا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس پر تفصیلی بحث کی جائے گی۔

اس سلسلے میں سید سلیمان ندویؒ نے علامہ ابن جوزی کی بھی ایک روایت نقل کی ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں کہ حسین بن منصور حلاج شہر ''سوس'' میں گرفتار کیا گیا اور اس کے بہت سے خطوط اور رقعے پکڑے گئے جن میں رمزوں اور اشاروں میں باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ پھر حلاج کو بغداد بھیج دیا گیا۔ ایک اونٹ پر حلاج سوار تھا اور دوسرے اونٹ پر اس کا غلام۔ راستے میں منادی پکارتا جاتا تھا۔ ''لوگو! دیکھ لو! یہ قرمطیوں کا ایک داعی ہے۔''

یہ ہیں وہ تمام تاریخی روایات جن کی بنیاد پر علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی حضرت منصور حلاجؒ کو گمراہ، شعبدہ باز، کافر، جھوٹا اور خدائی کا دعویدار سمجھتے تھے۔ علامہ موصوف نے کسی ایک مقام پر بھی حضرت منصور حلاجؒ کی شخصیت کا دفاع نہیں کیا۔ دوسرے مؤرخین کی طرح علامہ کو حضرت منصور حلاجؒ کے روزوں اور کثرت نماز میں بھی دکھاوا نظر آیا۔ حالانکہ ایک عالم کی حیثیت سے ان کا فرض منصبی تھا کہ وہ حضرت منصور حلاجؒ کی ظاہری عبادات کو تحسین کی نظروں سے دیکھتے کیونکہ سب سے پہلے اعمال ظاہریہ ہی کسی کے مسلمان ہونے کی شہادت پیش کرتے ہیں مگر چونکہ سید سلیمان ندویؒ نے ایک خاص زاویئے کے تحت مضمون تحریر کیا ہے، اس لئے انہیں حضرت منصور حلاجؒ شروع سے آخر تک بدترین مجرم اور لائق نفرت انسان نظر آتے ہیں۔ ہماری نظر میں یہ علامہ ندویؒ کی مجبوری تھی کہ جب انہوں نے حضرت منصور حلاجؒ کو ابومسلم خراسانی، بابک خرمی اور مقنع خراسانی کی صف میں کھڑا کر دیا تو پھر یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ حضرت منصور حلاجؒ کی شخصیت میں بے گناہی کا کوئی پہلو تلاش کرتے۔ تاریخ لکھتے وقت غیر جانبدار رہنا، دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ جب کوئی مؤرخ یا محقق ایک دعویٰ کرتا ہے تو پھر اس میں رنگ بھرنے کیلئے روایتوں کے انبار میں سے اسی روایت کا انتخاب کرتا ہے جو اس کے دعوے کو مضبوط ترین بنا سکے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ بھی یہی مجبوری تھی۔

امام الحرمین اپنی کتاب ''الشامل'' میں تحریر کرتے ہیں۔ ''مستند اور ثقہ راویوں میں ایک جماعت نے بیان کیا ہے کہ تین آدمیوں نے باہم فیصلہ کیا کہ لوگوں کو اپنی طرف مائل کر کے اس سلطنت کو الٹ دینا چاہئے۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک گوشہ لے لیا۔ جنابی قرمطی نے بحرین کا علاقہ لیا، ابن مقنع خراسانی پرکستان نکل گیا اور حلاج نے بغداد کے صوبے پر نظر جمائی۔ اس لئے حاکم بغداد نے اس پر موت کی سزا کا حکم لگایا۔''

علامہ ابن خلکان نے یہ کہہ کر اس روایت کو مسترد کر دیا ہے کہ ابن مقنع خراسانی، حضرت منصور حلاج سے بہت پہلے گزرا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی علامہ ابن خلکان کی اس دلیل کو درست مانتے ہیں مگر اس کے باوجود اپنی اس بات پر قائم ہیں کہ روایت کا ایک حصہ غلط ثابت ہونے سے پورے واقعے کی تکذیب نہیں ہوتی۔ اس طرح سید سلیمان ندویؒ کی نظر میں حضرت منصور حلاجؒ بھی اسی تحریک کے داعی تھے جس کا دعویٰ ابو مسلم خراسانی، بابک خرمی اور ابن مقنع کرتے تھے۔

اب ہم ان لوگوں کی شخصیات کا مختصر جائزہ لیں گے جو خدائی کا دعویٰ کرتے تھے...... اور جن لوگوں کی صف میں حضرت منصور حلاجؒ جیسے ''موحد'' اور جانباز صوفی کو جبراً کھڑا کر دیا گیا ہے۔

ابو مسلم خراسانی ایک ایرانی سپہ سالار تھا جس نے امام ابراہیم بن محمد کے ایماء پر خراسان میں بغاوت کا پرچم بلند کیا۔ ''مرو'' پر قبضہ کرنے کے بعد ابو مسلم خراسانی نے اموی فوجوں کو پے در پے شکست دی۔ یہاں تک کہ بنو امیہ کی خلافت کا خاتمہ ہو گیا...... اور پہلا عباسی خلیفہ سفاح تخت خلافت پر جلوہ افروز ہوا۔ سفاح کے دور حکومت میں ابو مسلم خراسانی کی طاقت بڑھتی چلی گئی مگر جب سفاح کے بعد اس کا بھائی منصور خلیفہ ہوا تو اس نے بڑی دشواریوں کے بعد ابو مسلم خراسانی پر قابو پایا اور پھر اس فتنہ گر انسان کو قتل کر کے ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا گیا۔ ابو مسلم خراسانی کے ماننے والے کہا کرتے تھے کہ (معاذ اللہ) خدا اس میں حلول کر گیا ہے۔ اسی عقیدے کی بنیاد پر ابو مسلم خراسانی خدائی کا دعویٰ کرتا تھا۔

ابو مسلم خراسانی کے بعد بابک خرمی کا نام آتا ہے۔ 813ء اور 842ء کے درمیان عباسی خلیفہ مامون الرشید اور معتصم باللہ کے دور حکومت میں ایک نیم مذہبی اور سیاسی تحریک شروع ہوئی۔ تقریباً 25 سال تک یہ تحریک عالم اسلام کیلئے شدید پریشانیوں کا باعث بنی رہی۔ اس تحریک کا بانی بابک خرمی تھا۔ وہ آذربائیجان میں پیدا ہوا۔ بابک کے باپ کا مطر تھا اور وہ ایک کرائے کا سپاہی تھا۔ بابک اسی سپاہی کی ناجائز اولاد تھا۔ وہ دس سال تک اپنی ماں کے ساتھ رہا۔ 18 سال تک اس نے مویشی چرائے پھر دوبارہ ماں کے پاس آ گیا۔

اس زمانے میں جاویدان بن سہرک خرمی قائد تھا۔ ایک دن جاوید بابک کی ماں سے ملنے آیا۔ اس نے اٹھارہ سال کے نوجوان کو دیکھا تو بہت زیادہ متاثر ہوا۔ جاویدان اپنی جن عیارانہ صلاحیتوں کیلئے مشہور تھا، وہی صفات بابک خرمی کے چہرے سے بھی روشن تھیں۔ جاویدان نے بابک کی ماں سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کو اس کے حوالے کر دے۔ بابک کی ماں قائد کے حکم کو کس طرح ٹال سکتی تھی۔ وہ فوراً رضامند ہو گئی اور جاویدان کی بیوی نے ایک نوجوان کو دیکھا تو وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ یہاں تک کہ بابک خرمی اور جاویدان کی بیوی کے درمیان ناجائز تعلقات قائم ہو گئے۔ پھر ایک دن جاویدان بن سہرک اور ابو عمران میں خونریز جنگ ہوئی۔ جاویدان شدید زخمی ہو کر مر گیا۔ جاویدان کی بیوی ایک نہایت عیار اور بوالہوس عورت تھی۔ اس نے شوہر کا دم نکلتے ہی اس تحریک کے حامیوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے انتہائی اثر انگیز تقریر کی۔

''لوگو! سنو! تمہارے قائد نے مرتے وقت میرے کان میں کہا تھا کہ وہ دنیا سے جا رہا ہے مگر اس کی روح بابک کے جسم میں حلول کر جائے گی۔ اس لئے تم پر لازم ہے کہ میرے مرنے کے بعد بابک کی اطاعت کرنا۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہیں میری روحانی تائید ہمیشہ حاصل رہے گی۔ جاویدان کی بیوی نے ایسا طلسمی افسانہ تراشا تھا کہ اس گمراہ فرقے نے بابک کے آگے سر جھکا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک آوارہ نوجوان ''خرمیوں'' کا قائد بن گیا۔ پھر 201ھ میں بابک نے علم بغاوت بلند کیا اور آذربائیجان کی مسلم آبادی پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کی املاک کو جی بھر کے لوٹا گیا اور بے شمار مسلم عورتوں اور بچوں کو تہہ تیغ کیا گیا۔

اس بزدلانہ فتح کے بعد باقی ''خرمی'' بھی بابک کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہو گئے اور مقامی مسلمانوں کو اپنے جان و مال کے خوف سے ''مراغہ'' میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید نے بابک کی بغاوت کو کچلنے کیلئے کئی بار مختلف سالاروں کی قیادت میں فوجیں بھیجیں مگر ہر مرتبہ اسلامی لشکر کو شکست ہوئی۔ مامون الرشید کے انتقال کے بعد خلیفہ معتصم باللہ نے اسحاق بن ابراہیم کی قیادت میں فوج روانہ کی جس نے خرمیوں کو شکست دی۔ 220ھ میں معتصم باللہ نے اپنے سالار افشین کو بابک کے مقابلے کیلئے بھیجا۔ افشین نے خرمیوں کے مرکز کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اس گمراہ فرقے کے ہزاروں پرستاروں کو تہہ تیغ کر ڈالا۔ بابک فرار ہو کر پہاڑوں میں جا چھپا۔ ایک دن کسی کسان نے اسے پہچان لیا اور شکار کے بہانے سے بابک کو افشین کے حوالے کر دیا۔ افشین بابک کو لے کر بڑی شان سے سامرا میں داخل ہوا اور پھر اس وقت کے دستور کے مطابق عالم اسلام کے دشمن کو ہاتھی پر بٹھا کر پیادوں اور سواروں کے جلوس کے ساتھ مختلف راستوں سے گزر کر خلیفہ معتصم باللہ کے دربار میں پیش کیا گیا۔

پہلے بابک کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے۔ بعد میں اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ خلیفہ معتصم باللہ اس معاملے میں اس قدر غضبناک تھا کہ اس نے بابک کا سر خراسان بھیج کر مختلف شہروں میں تشہیر کرائی اور دھڑ سامرا کی ایک عام گزرگاہ پر لٹکا دیا گیا۔ بابک کی موت کے بعد ''خرمیوں'' میں سے اکثر مسلمان ہو گئے اور بعض نے قرامطہ اور اسماعیلیہ فرقوں کے مسلک کو اپنا لیا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ بابک خرمی ایک مضبوط ارادے کا انسان تھا۔ قتل کرتے وقت جب اس کا ایک ہاتھ کاٹا گیا تو اس نے بہتا ہوا خون اپنے چہرے پر مل لیا۔ بابک کا یہ عمل اس لئے تھا کہ وہ موت کے خوف سے چہرے پر ظاہر ہونے والی زردی پر اپنے خون کا پردہ ڈال دے تاکہ لوگ اسے بہادر کہہ کر پکاریں اور یہ الزام عائد نہ کریں کہ موت کی دہشت سے اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔

ہم نے عقیدہ ''حلول'' کے ماننے والے دو گمراہوں کے مختصر حالات بیان کر دیئے۔ ابو مسلم خراسانی بھی ایک بدکار انسان تھا اور بابک خرمی بھی اپنی سنگدلی اور سیاہ کاری میں ایک مثال کی حیثیت رکھتا تھا۔ جن مؤرخین نے حضرت منصور حلاج کو اس فہرست میں شامل کیا ہے، وہ ایسا کوئی واقعہ ہی پیش کر دیتے جس سے حضرت حسین بن منصورؒ کے قدموں کی لغزش کا اظہار ہوتا ہو۔

حضرت منصور حلاجؒ عین عالم شباب میں بھی پارسا تھے اور اس وقت بھی ان کی یہی پاکیزگی برقرار تھی جب کچھ بے خبر اور نادان لوگ انہیں پرستش کی حد تک چاہنے لگے تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ کے مخالفین نے انہیں بدترین القاب سے یاد کیا مگر کسی ایک دشمن نے بھی آپ پر سیاہ کاری کا الزام عائد نہیں کیا۔ ابو مسلم خراسانی اور بابک خرمی کے علاوہ اس قسم کی تحریکوں کے تمام داعی انتہائی درجے کے زناکار، شرابی، سفاک اور قاتل ہوتے ہیں۔ پھر یہ کیسا ظلم ہے کہ ایک مجذوب الحال عاشق کو شیطان صفت لوگوں سے تشبیہہ دی گئی؟

اب آخری شخص ابن مقنع خراسانی باقی رہ جاتا ہے۔ جس کا مختصر تعارف یہ ہے کہ عباسی خلیفہ مہدی بن منصور کے عہد حکومت میں ایک شخص ہاشم نے خدائی کا دعویٰ کیا جس کے سبب بڑے ہنگامے کھڑے ہوئے۔ اس فتنہ گر انسان کا قول تھا۔

''خدا کبھی کبھی انسانی جسموں میں حلول کر کے اپنی قدرت کا جلوہ دکھاتا ہے۔ حضرت آدمؑ اور ان کے بعد آنے والے پیغمبروں میں خدا بحیثیت نور موجود تھا۔ آخری زمانے میں خدا ابو مسلم خراسانی کی شکل میں ظاہر ہوا اور اب وہی خدا میرے پیکر میں جلوہ گر ہے۔''

ہاشم انتہائی بدصورت انسان تھا۔ اپنی کریہہ المنظری کو چھپانے کیلئے وہ ہمیشہ ایک سنہری نقاب پہنے رہتا تھا۔ اسی لئے مقنع کے لقب سے مشہور ہوا۔ مقنع کا مطلب ہے نقاب پوش۔ مقنع کے آبائی وطن کا تو پتہ نہیں چلتا مگر وہ خراسان میں رہا کرتا تھا، اس لئے اسے مقنع خراسانی کہتے ہیں۔ اس نے سب سے پہلے خراسانی باشندوں کے سامنے خدائی کا دعویٰ کیا جس کے نتیجے میں ہزاروں سادہ لوح انسان گمراہ ہو گئے۔ پھر مقنع کی تحریک نے بڑی شورشیں برپا کیں۔ خراسان کے علاوہ شام، عراق اور ایران بھی فتنوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ مقنع نے اپنے خدائی دعوے کو ثابت کرنے کیلئے ایک چاند بنایا تھا جو چاہ نخشب سے طلوع ہو کر دو ماہ تک غروب نہیں ہوتا تھا۔ دراصل مقنع ایک کیمیا گر تھا اور اس نے چند کیمیائی مادوں کو ملا کر ایک دائرہ نما چیز تخلیق کی تھی جسے وہ چاند کہا کرتا تھا۔ کم عقل لوگ اس روشن دائرے کو دیکھ کر مقنع کے خدائی دعوے پر ایمان لے آتے تھے۔

عباسی خلیفہ مہدی نے 161ھ میں معاذ بن مسلمؒ اور سعد حرشی کو مقنع کی گرفتاری کیلئے بھیجا۔ جب محاصرے نے طول پکڑا اور مقنع خراسانی زندگی سے مایوس ہو گیا تو اس نے اپنے پیروکاروں کو آگ روشن کرنے کا حکم دیا۔ اسی دوران مسلمان سپاہی قلعے میں داخل ہو گئے اور ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ لوگ اس کے قریب تھے اور سمجھ رہے تھے کہ آگ روشن کرنے کے بعد مقنع اپنی خدائی کا نیا کرشمہ دکھائے گا مگر اس وقت اندھے پجاری حیرت زدہ رہ گئے جب ان کا خدا بھڑکتی ہوئی آگ میں کود گیا۔ مسلمان سپاہی بھی پوری طرح مستعد تھے۔ جیسے ہی مقنع خراسانی بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کودا، مسلمان سپاہی بھی آگ میں کود پڑے...... اور خدائی کے دعویدار کا سر کاٹ لیا۔ باقی جسم کو خود اسی کی دہکائی ہوئی دوزخ میں جلنے کیلئے چھوڑ دیا۔ بعد میں مقنع خراسانی کا سر خلیفہ مہدی کے دربار میں بھیجا گیا...... اور اس طرح یہ خوفناک فتنہ اپنے عبرت خیز انجام کو پہنچا۔

یہ تھا اس شخص کا مختصر احوال جو حضرت منصور حلاجؒ کی پیدائش سے 83 سال پہلے مر چکا تھا۔ پھر بھی ہمارے تاریخ نویسوں نے مقنع خراسانی کو نہ صرف حضرت منصور حلاجؒ کا ہم عصر قرار دیا بلکہ دونوں میں ملاقات بھی ثابت کر دی ...... اور اس منصوبے کو بھی ظاہر کر دیا جس کے مطابق مقنع خراسانی اور حضرت منصور حلاجؒ نے اپنی اپنی خدائی کیلئے علاقے تقسیم کر لئے تھے۔

سید سلیمان ندویؒ نے امام الحرمین کی تصنیف ''الشامل'' کے حوالے سے جس منصوبے کا ذکر کیا ہے، اس میں تیسرا فریق جنابی قرمطی تھا۔ مصنف کے بقول جنابی نے اپنی فتنہ انگیزیوں کیلئے بحرین کا علاقہ منتخب کیا تھا۔ جنابی کا نام ابوطاہر تھا اور وہ 294ھ میں پیدا ہوا۔ اب اس روایت کی ضعیفی کا عالم دیکھئے۔ تمام معتبر اور غیر معتبر تاریخیں اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ کو 301ھ میں حوالۂ زنداں کیا گیا تھا۔ اس وقت جنابی قرمطی کی عمر صرف سات سال تھی۔ کیا ایک کم سن بچہ حضرت منصور حلاجؒ سے مل کر سلطنت بغداد کے خلاف سازش کا منصوبہ بنا سکتا ہے؟ اہل نظر غور فرمائیں کہ یہ کیسی بوالعجبی ہے؟

ان تاریخی روایات سے قطع نظر، حضرت منصور حلاجؒ 301ھ میں گرفتار ہوئے اور انہیں زنداں کی تاریکیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ حضرت حسین بن منصورؒ کی گرفتاری کے حسب ذیل اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔

پہلا سبب یہ کہ حضرت منصور حلاجؒ قرآن کے مثل آیت بنانے کا دعویٰ کرتے تھے۔ مؤرخ خطیب بغدادی نے اس روایت کو ابن باکویہ صوفی شیرازی کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ ابن باکویہ نے ابوزرعہ طبری سے سنا اور ابوزرعہ طبری نے محمد بن یحییٰ رازی سے سنا۔ گویا دو واسطے درمیان میں ہیں۔ بعد میں آنے والے محققین نے ابن باکویہ شیرازی محمد بن یحییٰ رازی کے بارے میں چھان بین کی تو یہ دونوں اشخاص غیر ثقہ ثابت ہوئے۔ ابن باکویہ شیرازی کو حکایتیں بیان کرنے میں شہرت حاصل تھی۔ محدثین ان کا اعتبار نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح محمد بن یحییٰ راز بھی کمزور اور ضعیف روایتیں بیان کرتے تھے۔ اس لئے حضرت منصور حلاجؒ پر یہ الزام کہ وہ قرآن جیسی آیات بنانے کا دعویٰ کرتے تھے محض ایک الزام اور تہمت ہے۔ واضح رہے کہ حضرت منصور حلاجؒ 301ھ میں گرفتار ہوئے اور 310ھ میں آپ کو پھانسی دی گئی۔ اس طرح آپ کی قید و بند کا زمانہ 9 سال پر محیط ہے۔ اس قدر طویل اسیری کے دوران سیکڑوں بار آپ کے مقدمے کی سماعت ہوئی مگر یہ الزام ثابت نہیں کیا جا سکا کہ حضرت حسین بن منصورؒ قرآن کے مثل کوئی آیت بنانے کا دعویٰ کرتے تھے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

دوسرا الزام یہ ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے ایک خط کے ذریعے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ ابوالقاسم رازی نے ابوبکر بن شاد کے حوالے سے اس روایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ دینور کے مقام پر ایک شخص آیا جس کے پاس ایک تھیلا تھا۔ عام لوگوں نے دیکھا کہ وہ ایک معمولی سا تھیلا تھا مگر اجنبی شخص ہر وقت اس تھیلے کو اپنے سینے سے لگائے رکھتا تھا۔ لوگوں کو شک ہوا۔ آخر تھیلے کی تلاشی لی گئی تو اس میں سے حضرت منصور حلاجؒ کا ایک خط برآمد ہوا۔ جس کا عنوان اس طرح تھا۔

"من الرحمٰن الرحیم الیٰ فلاں بن فلاں"

(یہ خط رحمٰن رحیم کی طرف سے فلاں شخص کے نام ہے)

خط برآمد کرنے والے لوگوں نے یہ مکتوب سرکاری کارندوں کے حوالے کر دیا......اور پھر سرکاری کارندوں نے اس خط کو بغداد پہنچا دیا۔

حضرت منصور حلاجؒ کو طلب کر کے پوچھا گیا کہ یہ خط تمہارا ہے؟ آپ نے اس خط کو بغور دیکھا اور پھر مستحکم لہجے میں فرمایا۔

"ہاں! یہ خط میرا ہی ہے۔"

عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کا وزیر حامد بن عباس حضرت منصور حلاجؒ کا بدترین دشمن تھا اور اس کی شدید خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح حضرت حسین بن منصورؒ پر کفر کا الزام ثابت ہو جائے اور پھر وہ انہیں دار پر کھینچ کر اس فتنے سے محفوظ ہو جائے۔ (واضح رہے کہ حامد بن عباس نے خلیفہ مقتدر کے سامنے حضرت منصور حلاجؒ کو فتنہ ثابت کرنے کیلئے اپنی پوری طاقت بیان صرف کر دی تھی)

جب حضرت منصور حلاجؒ نے اعتراف کر لیا کہ وہ خط ان ہی کا لکھا ہوا ہے تو حامد بن عباس نے غضبناک لہجے میں کہا۔"کل تک تو تم نبوت کے مدعی تھے، اب خدائی کا دعویٰ بھی کرنے لگے۔"

یہ واقعہ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے۔ حامد بن عباس کے الفاظ کی ظاہری ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت منصور حلاجؒ کے دعویٰ نبوت سے باخبر تھا۔ پھر جب اس نے منصورؒ کو خدائی کا دعویٰ کرتے ہوئے سنا تو گرفتار کر لیا۔ قارئین ایک لمحے کیلئے اس روایت کی کمزوری کو ملاحظہ کریں۔ اگر کسی مملکت اسلامی میں کوئی شخص معاذ اللہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہوا پکڑا جائے تو اس کے قتل میں کسی حجت کی گنجائش باقی نہیں رہتی، خطیب بغدادی کی اس روایت سے صاف پتا چلتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور حامد بن عباس اس دعوے سے باخبر بھی تھا۔ پھر حضرت حسین بن منصورؒ کو اتنے دن زندہ رہنے کی مہلت کیوں دی گئی اور ان کے نئے دعوے کا انتظار کیوں کیا جاتا رہا؟

اس ضعیف روایت سے قطع نظر، وزیر حامد بن عباس کی بات سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے انتہائی واضح الفاظ میں فرمایا۔

"معاذ اللہ! میں نہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہوں اور نہ خدائی کا۔ میں تو ایک عام سا آدمی ہوں اور اپنے اللہ کی عبادت کرتا ہوں۔ روزہ رکھتا ہوں اور اس کے سوا کچھ نہیں جانتا۔"

اس اقرار کے بعد حضرت منصور حلاجؒ کی بے گناہی کو تسلیم کر لینا چاہئے تھا مگر حامد بن عباس اور اس کے ہم نواؤں نے آپ سے مسلسل جرح کی۔ نتیجتاً حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

"اللہ کے سوا لکھنے والا کون ہے؟ میں اور میرا ہاتھ تو اس کام میں محض آلے کے سوا کچھ نہیں۔"

یہ ایک بہت مشکل اور طویل بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں، مختصر یہ کہ بہت سے علمائے وقت نے اپنے طاقتور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کے اس خط میں شریعت کے خلاف

کوئی بات تحریر نہیں تھی۔ صرف عنوان غیر مناسب تھا۔ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابن عطاؒ نے اس معاملے میں حضرت منصور حلاجؒ کی مکمل حمایت کی۔ خطیب بغدادیؒ کے بقول حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے کہا کہ ایسے شخص کو روکنا چاہئے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے شاگرد رشید ابومحمد جریر طبریؒ نے فرمایا۔

"ایسا کہنے والا کافر ہے۔ اسے قتل کر دیا جائے۔"

محققین نے حضرت ابوجریر طبریؒ کے اس فتوے پر شدید اعتراض کیا ہے۔ ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے خط کی وضاحت کر دی تھی تو حضرت ابوجریر طبریؒ نے انہیں کافر اور واجب القتل کیوں قرار دیا۔

خطیب بغدادی کہتا ہے کہ اس خط کی وجہ سے حضرت منصور حلاجؒ کے قتل کا فرمان جاری ہوا۔ بعد میں آنے والے محققین نے ثابت کر دیا کہ اس خط کے حوالے سے علماء اور فقہا کی ایک بڑی جماعت بھی منصور حلاجؒ کو کافر ثابت نہیں کر سکی تھی۔ اس لئے یہ واقعہ ان کے قتل کی بنیاد نہیں تھا۔ بعض مؤرخین نے خطیب بغدادی کی اس روایت ہی کو غلط قرار دیا ہے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

حضرت منصور حلاجؒ کی گرفتاری کا تیسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جادو کا علم سیکھنے کیلئے ہندوستان گئے تھے اور وہاں سے واپس آ کر اسلامی مملکت میں جا بجا اپنی جادوگری کے کرشمے دکھایا کرتے تھے۔ ہم نے گزشتہ اوراق میں حضرت منصور حلاجؒ کی کئی کرامات بیان کی ہیں۔ جنہیں مخالفین ساحری اور شعبدہ بازی سے تعبیر کرتے تھے۔ اس سلسلے میں حضرت منصور حلاجؒ کے خسر ابو یعقوب اقطع کی گواہی کو ثبوت کے طور پر بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ واقعے کی تفصیل اس طرح ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کی گرفتاری کے بعد ابو یعقوب اقطع کو طلب کر کے پوچھا گیا۔

"یہ شخص منصور حلاج، تمہارا داماد ہے۔ تم اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟"

داماد کے سلسلے میں خسر کی گواہی اس لئے طلب کی گئی تھی کہ اس نازک رشتے میں دونوں فریقین اپنے معاملات کے حوالے سے ایک دوسرے پر کم و بیش عیاں ہوتے ہیں۔ حضرت منصور حلاجؒ پر مقدمہ دائر کرنے والوں نے بھی یہی سوچ کر اس تعلق کو استعمال کیا تھا۔

ابو یعقوب اقطع نے اراکین سلطنت کے سامنے صاف صاف کہا۔"میں نے حسین بن منصور کا عمدہ طریقہ اور اچھا مجاہدہ دیکھ کر اپنی بیٹی کو اس کے نکاح میں دے دیا تھا پھر تھوڑے دن بعد ہی مجھ پر یہ راز فاش ہو گیا کہ وہ تو حیلہ باز، ساحر، خبیث اور کافر ہے۔"

کسی تاریخ سے یہ تو پتا نہیں چلتا کہ ابو یعقوب اقطع نے یہ بیان صاحبان اقتدار کے خوف سے دیا تھا یا وہ واقعتہً حضرت منصور حلاجؒ کی ذات میں مذکورہ خامیاں دیکھ کر بیزاری کی اس منزل پر پہنچے تھے۔ عام طور پر تو یہی دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی شخص حکومت وقت کے عتاب کا نشانہ بن جاتا ہے تو یار دوست اور عزیز و اقارب اسے پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض قریبی رشتہ دار یہ کہہ کر منہ پھیر لیتے ہیں کہ "معتوب" سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں، اگر تھا تو قطع کر لیا گیا۔ پھر بھی یہ بات

وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف ان کے خسر ابو یعقوب اقطع کی گواہی کا حقیقی پس منظر کیا تھا؟ پھر بھی بعض محققین نے ابو یعقوب اقطع کی شخصیت کو دنیادار اور غیر معتبر قرار دیا ہے۔ واضح رہے کہ جب حضرت منصور حلاجؒ اور ابو یعقوب اقطع کی لڑکی کے رشتے کی بات چلی تھی تو حسین بن منصورؒ کے استاد گرامی حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ نے اس رشتے کی مخالفت کی تھی اور اپنے شاگرد کو صاف الفاظ میں منع کر دیا تھا کہ وہ ابو یعقوب اقطع کی دختر سے ازدواجی رشتہ قائم نہ کریں۔ الغرض شادی کے بعد حضرت عمرو بن عثمانؒ اور ابو یعقوب اقطع کے تعلقات ختم ہو گئے تھے اور حضرت منصور حلاجؒ کا خسر عام مجلسوں میں حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ جیسے بزرگ کو برا بھلا کہتا پھرتا تھا۔ لیکن علماء کی رائے کے مطابق اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس نے حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ جیسے شیخ طریقت کی رعایت نہیں کی، وہ اپنے داماد حضرت منصور حلاجؒ کے سلسلے میں اعتدال اور حقیقت بیانی سے کس طرح کام لے سکتا تھا؟

بعض محققین نے اس واقعے کی مزید تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابو یعقوب اقطع کی لڑکی اپنے شوہر حضرت منصور حلاجؒ سے خوش نہیں تھی۔ ایک اسی پر کیا منحصر ہے، اکثر جوان لڑکیاں اس قسم کے شوہروں سے ناخوش ہی رہتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک عارف کی بیوی بھی عارفانہ شخصیت کی حامل ہو یا دنیا کے ہر سرد و گرم میں اپنے شوہر کا ساتھ دے سکے۔ عام جواں سال لڑکیاں اپنے تارک الدنیا شوہروں سے شاذ و نادر ہی راضی ہوتی ہیں۔ کچھ یہی حال ابو یعقوب اقطع کی لڑکی کا بھی تھا۔ وہ اپنے شوہر حضرت منصور حلاجؒ کی شدید ترین ریاضتوں سے نالاں تھی۔ جب عورت کے دل کی تشنگی کا یہ عالم ہو تو کہاں کی ریاضت اور کیسی کرامت؟ اس قسم کی عورتیں اپنے شوہروں کی ریاضتوں کو مکر و فریب اور کرامتوں کو شعبدہ بازی ہی سمجھتی ہیں۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کی زوجہ نے شوہر کی یہ خرابیاں باپ سے بیان کی ہوں گی اور پھر ابو یعقوب اقطع بھی حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف گواہی دینے والوں میں کھڑا ہو گیا۔

بعض علمائے تحقیق کا بیان ہے کہ اولیائے کرام کی صفوں میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ بعض مشائخ کی بیویاں ان سے برائے نام بھی عقیدت نہیں رکھتی تھیں بلکہ مریدوں کے سامنے اپنے کامل شوہروں کو برا بھلا کہتی تھیں۔ اگرچہ بیوی کی گواہی قریب ترین گواہی شمار ہوتی ہے لیکن تذکرہ نگاروں نے ان شہادتوں کو ذرا بھی لائق اعتنا نہیں سمجھا...... اور اولیاء کے حق میں یہ دلیل پیش کی کہ کثرت ریاضت کے سبب بیویوں کی دنیاوی خواہشیں پوری نہیں ہوتی تھیں، اس لئے تنگ آ کر وہ اپنے شوہروں کو بدنام کیا کرتی تھیں۔

یہاں زیادہ تفصیلات میں جانے کی گنجائش تو نہیں لیکن پھر بھی حضرت امام اعمشؒ کی مثال اس صورتحال کی نزاکت اور پیچیدگی کو واضح کرنے کیلئے کافی ہے۔ حضرت امام اعمشؒ کا شمار فقہائے عظام میں ہوتا ہے۔ آپ کی جلالت علمی کیلئے یہی ایک مثال کافی ہے کہ امام اعظمؒ حضرت ابو حنیفہؒ، حضرت امام اعمشؒ کے شاگرد تھے۔ امام اعمشؒ کی ازدواجی زندگی انتہائی ناخوشگوار تھی۔ ان کی زوجہ محترمہ اکثر

کہا کرتی تھیں۔

''وہ وقت کب آئے گا جب تجھ بڈھے سے میرا پیچھا چھوٹے گا۔''

مختصر یہ کہ حالات اس قدر خراب ہوئے کہ نوبت طلاق تک جا پہنچی۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے اس بگڑی ہوئی صورتحال کو اپنی ذہانت سے سنبھالا اور ایک عظیم و جلیل فقیہہ کی گھریلو زندگی کو تباہی سے بچا لیا۔

کبھی کبھی حاضرین مجلس حضرت امام اعمشؒ کے علم و فضل کی تعریف کرتے تو آپ نہایت تلخ اور آزردہ لہجے میں فرماتے۔ ''حدیث و فقہ کی مجلسوں میں تمہارے امام کا یہ حال ہے مگر اپنے گھر میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔''

اسی انداز کا واقعہ حضرت منصور حلاجؒ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اہل دنیا ان کی عارفانہ عظمت کے آگے خم تھے اور ان کا خسر ابو یعقوب اقطع انہیں شعبدہ باز و ساحر اور خبیث و کافر کہہ کر پکار رہا تھا۔

اس روایت کو بھی مؤرخ خطیب بغدادی نے ابن باکویہ شیرازی اور ابو زرعہ طبری کے حوالے سے بیان کیا ہے جس میں شک، کمزوری اور عدم صحت کی گنجائش موجود ہے۔

☆☆.........☆☆.........☆☆

حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کی گرفتاری کا چوتھا سبب ان کا ''زندیقوں'' جیسا کلام تھا۔ مؤرخ خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ انہوں نے محمد بن حسین نیشاپوری سے سنا اور نیشاپوری نے ابو بکر غالب سے سنا اور ابو بکر غالب نے اپنے دوستوں سے سنا کہ جب حسین بن منصور حلاجؒ کے قتل کا ارادہ کیا گیا تو ایک مجلس میں اس دور کے اکابر علماء اور فقہا کو جمع کیا گیا۔ پھر اسی مجلس میں حضرت منصور حلاجؒ کو ایک قیدی کی حیثیت سے طلب کر کے پوچھا گیا۔ اس وقت عباسی خلیفہ مقتدر باللہ بھی اس مناظرے میں موجود تھا۔

''حسین بن منصور! تم سے ایک مسئلہ دریافت کرنا ہے۔'' ایک عالم اور فقیہہ نے حضرت حلاجؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''پوچھو!'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''میں بساط بھر تمہارے سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔''

''برہان کسے کہتے ہیں؟'' بغداد کے فقیہہ نے حضرت منصور حلاجؒ کی آزمائش کیلئے سوال کیا۔

''برہان'' کے لغوی معنی دلیل کے ہیں۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے جواباً فرمایا۔ ''برہان ان شواہد و دلائل کو کہتے ہیں جنہیں حق تعالیٰ اہل خلوص کی صورتوں میں پیدا فرماتے ہیں اور جن کی طرف لوگوں کے دل کھنچتے ہیں۔''

حضرت منصور حلاجؒ کا جواب سن کر تمام علماء اور فقہا نے بالاتفاق کہا۔ ''یہ تو زندیقوں جیسا کلام ہے۔''

پھر عالموں اور فقیہوں کی جماعت نے عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کو مشورہ دیا کہ جو شخص ایسا کلام کرے

وہ زندیق ہے اور اسے بے دریغ قتل کر دیا جائے۔ "زندیق" کے معنی ہیں، وہ شخص جو ظاہر میں مسلمان ہو اور اندر سے کافر ہو۔ یہ بڑا عجیب معاملہ ہے کہ ایک شخص علی الاعلان اپنے آپ کو مسلمان کہہ رہا مگر ذمے دار علماء کی جماعت دعویٰ کر رہی ہے کہ اس شخص کا ظاہری قول قابل قبول نہیں، وہ اندر کافر ہے۔ اب اس بات کی توجیہہ کس طرح کی جائے کہ علماء اور فقہا کے پاس وہ آنکھ کہاں سے تھی جو انسانی قلب کی گہرائیوں میں اتر کے ثابت کر سکے کہ حضرت منصور حلاجؒ کا ظاہر مسلمان اور ان کا اندرون کافر ہے۔

اگر مؤرخ خطیب بغدادی حضرت منصور حلاجؒ کے حامیوں میں نہیں ہیں لیکن انہوں نے بھی اور فقہا کے فیصلے پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"منصور حلاجؒ کے جواب میں کفر اور زندقہ کی تو کوئی بات نہیں تھی۔"

اس اعتراض کے ساتھ ہی خطیب بغدادی یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ اس روایت کا راوی مجہول ہے، اس کی بات قابل قبول نہیں۔

بعض علمائے تحقیق کے نزدیک اگر خطیب بغدادی کی روایت درست بھی ہوتی حضرت منصور حلاجؒ کے جواب سے کفر کا کوئی پہلو ظاہر نہیں ہوتا۔ حسین بن منصورؒ نے یہی تو کہا تھا کہ حق تعالیٰ دل کے طور پر اہل اخلاص کو پیدا کرتا ہے جن کی طرف لوگوں کے دل کھنچتے ہیں۔ ان کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے بعض علماء نے تحریر کیا ہے۔

"اہل اخلاص کی صورت دیکھ کر ان کی طرف انسانی دل اس لئے کھنچتے ہیں کہ جاذب باطنی کی سے ان میں ایک خاص کشش ہوتی ہے۔ جیسا کہ سرور کونین حضور اکرم ﷺ کی ایک حدیث مبا ہے کہ ان کی صورت دیکھ کر اللہ یاد آجاتا ہے۔

حضرت منصور حلاجؒ کے بھی کم و بیش یہی الفاظ تھے۔ اور عین ممکن ہے کہ انہوں نے اسی حدیث پاک کا مفہوم بیان کیا ہو۔ پھر علماء اور فقہا کی موجودگی میں انہیں زندیق اور کافر اور واجب القتل ق دینا، بڑی عجیب بات ہے۔

☆☆ ...... ☆☆ ...... ☆☆

حضرت منصور حلاجؒ کی گرفتاری کا پانچواں سبب وہ کفریہ اشعار تھے جو بعض مواقع پر آپ کی زبان سے ادا ہوئے۔ اس واقعے کو بھی مؤرخ خطیب بغدادی نے ابن باکویہ شیرازیؒ کے حوالے سے کیا ہے۔ ابن باکویہ کے بقول اس نے عیسیٰ بن بزول قزوینی سے سنا کہ ایک دن وہ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوعبداللہ بن خفیفؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور چند اشعار پڑھنے لگا۔ حضرت ابوعبداللہ خفیف انتہائی کراہت اور ناگواری کے عالم میں وہ اشعار سنتے رہے۔

پھر عیسیٰ بن بزول قزوینی عرض کرنے لگا۔ "شیخ! ان اشعار کا مفہوم کیا ہے؟"

حضرت شیخ ابوعبداللہ بن خفیفؒ نے نہایت بے زاری کے عالم میں فرمایا۔ "ان اشعار کے والے پر اللہ کی لعنت۔"

عیسیٰ بن بزول قزوینی نے کہا۔ "یہ اشعار حسین بن منصور کے ہیں۔"

حضرت شیخ ابوعبداللہ بن خفیفؒ نے کسی تکلف کے بغیر فرمایا۔ "اگر حسین بن منصور کا عقیدہ یہی ہے جیسا کہ ان اشعار کے مفہوم سے ظاہر ہوتا ہے، تو وہ کافر ہے۔"

حضرت ابوعبداللہ خیفؒ کا جواب سن کر مخالفین نے شور مچا دیا کہ ان جیسے بزرگ کی نظر میں بھی منصور حلاجؒ کافر ہیں۔

بعد میں علمائے تحقیق نے ثابت کر دیا کہ عیسیٰ بن بزول قزوینی ایک مجہول راوی ہے۔ کسی معتبر کتاب میں اس کا برائے نام بھی ذکر موجود نہیں۔ اب یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ابن باکویہ شیرازیؒ کو قصے بیان کرنے کا شوق تھا۔ اس لئے اس نے حضرت منصور حلاجؒ کی داستان خوں چکاں کو مزید رنگین کرنے کیلئے ایک نیا افسانہ تراش لیا۔ جن اشعار کی بنیاد پر حضرت شیخ ابوعبداللہ ابن خفیفؒ جیسے بزرگ نے حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کو کافر قرار دیا تھا، وہ اشعار حضرت منصورؒ کے تخلیق کردہ نہیں تھے...... اور نہ کسی موقع پر حلاجؒ نے یہ اشعار اپنی زبان سے ادا کئے۔

اگر حضرت منصور حلاجؒ کے مخالفین اپنے تمام تر منطقی دلائل کے ساتھ مذکورہ اشعار کو حضرت منصور حلاجؒ سے منسوب بھی کر دیں، تب بھی اس روایت کی کوئی حیثیت برقرار نہیں رہتی۔ عیسیٰ بن بزول قزوینی کا دعویٰ ہے کہ حضرت ابوعبداللہ بن خفیفؒ نے وہ اشعار سن کر حضرت منصور حلاجؒ کو کافر قرار دیا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جب حکومت وقت کے خوف سے بڑے بڑے علماء اور فقہا کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں، اس وقت بھی حضرت ابوعبداللہ بن خفیفؒ علی الاعلان حضرت منصور حلاجؒ کو عارف کامل قرار دیتے تھے۔ پھر مردان تحقیق کی نظر میں اس جھوٹ کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔

☆☆ ...... ☆☆ ...... ☆☆

حضرت منصور حلاج پر چھٹا الزام یہ تھا کہ ان کے مرید و خدمت گار انہیں خدا کہتے تھے۔ مؤرخ خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانے میں منصور حلاجؒ بغداد پہنچے اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ وہ صوفیاء کی صحبت میں رہا کرتے تھے اور خود کو بھی صوفی ظاہر کرتے تھے۔ اس وقت حامد بن عباس وزیر تھا اور وہ دربار خلافت میں نہایت اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ ایک دن کسی جاسوس نے حامد بن عباسی کو خبر دی کہ حاجب ابن نصر قشوری کے علاوہ قصر خلافت کی بیگمات اور کنیزیں بھی منصور حلاجؒ نامی ایک شخص کے حلقۂ اثر میں شامل ہو گئی ہیں۔

ہم یہ واقعہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حاجب ابن نصر قشوری کی بیماری کے دوران حضرت منصور حلاجؒ نے اسے ایک سیب فراہم کیا تھا۔ اس کرامت کو دیکھ کر ابن نصر قشوری اور دیگر امراء حضرت منصور حلاجؒ کی روحانی عظمت کے قائل ہو گئے تھے۔ پھر جب قصر خلافت میں یہ واقعہ مشہور ہو گیا تو حامد بن عباس کے جاسوس نے اسے خبر دی۔

"منصور حلاج کس قسم کے دعوے کرتا ہے کہ لوگ اس کے اسیر ہوئے جا رہے ہیں؟" حامد بن عباس نے اپنے مخبر سے پوچھا۔

"وہ شاہی بیگمات، کنیزوں، دربانوں اور خدمت گاروں کو اپنی روحانی طاقتوں کا یقین دلانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔" حامد بن عباس کے جاسوس نے کہا۔"اس کا دعویٰ ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ جنات اس کے تابع ہیں اور ہر وقت اس کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ وہ جنوں سے ایسے ایسے کام لیتا ہے کہ انسانی عقل وفہم عاجز رہ جاتے ہیں۔ حلاج کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ اس نے بہت سے پرندہ زندہ کئے ہیں۔"

حامد بن عباس یہ خبر سن کر پریشان نظر آنے لگا۔

پھر ایک اور شخص ابوعلی اوراجی نے دوسرے وزیر علی بن عیسیٰ کو خبر دی کہ درباری منشی محمد بن علی قنائی منصور حلاج کی پرستش کرتا ہے اور لوگوں کو اس کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے۔ یہ سن کر وزیر علی بن عیسیٰ نے فوری طور پر کارروائی کی۔ محمد بن علی قنائی کو گرفتار کر لیا اور اس کی املاک ضبط کر لیں۔ پھر جب درباری منشی زنجیروں میں جکڑا ہوا آیا تو علی بن عیسیٰ نے غضب ناک لہجے میں اس سے پوچھا۔

"حلاج سے تیرا کیا رشتہ ہے؟"

درباری منشی محمد بن علی قنائی نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔"میں حلاج کے اصحاب میں سے ہوں۔"

بعض مؤرخین نے اصحاب سے یہ مطلب لیا ہے کہ محمد بن علی قنائی منصور حلاج کی پرستش کرتا تھا حالانکہ اس لفظ کے معنی بہت وسیع ہیں اور کسی بھی زاویئے سے یہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا کہ منصور حلاجؒ خدا تھے اور محمد علی بن قنائی ان کا بندہ۔ اصحاب کا لفظ عام طور پر اطاعت گزاروں، صحبت اٹھانے والوں اور شاگردوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

پھر جب محمد بن علی قنائی کے گھر کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے بہت سی کتابیں اور رقعے برآمد ہوئے جن کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ سب کے سب منصور حلاجؒ کے تحریر کردہ تھے۔

حامد بن عباس کو اس نے ایک بااثر شخص کے ذریعے خلیفہ مقتدر باللہ کی بارگاہ میں یہ درخواست پیش کی کہ منصور حلاجؒ اور اس کے منادیوں (اعلان کرنے والوں) کو اس کے حوالے کیا جائے۔

جب ابن نصر قشوری حاجب کو حامد بن عباس کے ارادوں کی خبر ہوئی تو اس نے وہ درخواست مقتدر باللہ تک پہنچنے ہی نہیں دی اور حامد بن عباس سے ملاقات کر کے کہا۔"ایک چھوٹے سے معاملے میں امیر المومنین کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔ حلاج کا مسئلہ یہیں حل ہو جائے گا۔"

حامد بن عباس کا مخبر پہلے ہی اسے خبر دے چکا تھا کہ ابن نصر قشوری حلاج کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگیا ہے، اس لئے حامد بن عباس نے بظاہر بات کو ٹال دیا، مگر ایک روز رات کو تنہائی میں اس نے عباسی خلیفہ مقتدر باللہ سے ملاقات کی۔

پھر حامد بن عباس نے ایسی شاطرانہ گفتگو کی کہ مقتدر باللہ کو حقیقی صورتحال کا پتا ہی نہیں چل سکا اور اس نے فوری طور پر احکام جاری کر دیئے کہ منصور حلاجؒ کو حامد بن عباس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی مقتدر نے حامد بن عباس کو بھی ہدایت کر دی کہ منصور حلاجؒ کے ساتھ انصاف ہونا چاہئے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مقتدر خود بھی قصر خلافت میں حضرت حسین بن منصورؒ کی کرامات کا شور سن چکا تھا۔

الغرض حامد بن عباس نے حیلہ سازیوں کے ذریعے حضرت منصور حلاجؒ پر قابو پالیا اور انہیں پابہ زنجیر کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔ دیکھ بھال کیلئے اپنے خاص آدمیوں کی ایک بڑی تعداد مقرر کی جو دن رات حضرت منصور حلاجؒ کی اس طرح نگرانی کرتے تھے جیسے وہ کوئی خوفناک سیاسی مجرم ہوں۔

حامد بن عباس روزانہ حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کو اپنی مجلس میں بلاتا اور ان سے نہایت بے ہودہ گفتگو کرتا۔ اس موقع پر بغداد کے دوسرے علماء بھی موجود ہوتے جو منصور حلاجؒ کے جواب کو بغور سنتے اور اس بات کے منتظر رہتے کہ ایک مرد درویش کی زبان کو کوئی لغزش ہو اور پھر اسے واجب القتل قرار دیدیا جائے۔ حامد بن عباس کی بے ہودہ گوئی کی وجہ بھی یہی تھی کہ حضرت منصور حلاجؒ غصے میں آ جائیں اور ان کے منہ سے کوئی غیر معقول بات نکل جائے۔ پھر ایسی بات کو بنیاد بنا کر ان کی گرفت کی جا سکے۔

حامد بن عباس کی منصوبہ بندی اپنی جگہ مگر حضرت منصور حلاجؒ کلمۂ شہادت اپنی زبان سے ادا کرنے کے سوا کچھ اور نہ کہتے۔ اگر ان سے مزید جرح کی جاتی تو وہ شرع کے دوسرے مسائل بیان کرنا شروع کر دیتے۔ حامد بن عباس جھنجھلا کر رہ جاتا...... اور حضرت منصور حلاجؒ کو واپس لے جا کر زنداں کے اندھیروں میں ڈال دیا جاتا۔

پھر دوسرا دن طلوع ہوتا اور ایک مرد درویش کے ساتھ یہی اذیت ناک کھیل شروع ہو جاتا۔

پھر ایک دن حامد بن عباس کے کسی مخبر نے اسے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔"بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ حلاج خدائی کا دعویٰ کرتا ہے۔"

"میں بھی تو کوشش کر رہا ہوں کہ کسی دن اس کی زبان لڑکھڑا جائے مگر اب تو اس نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔"

حامد بن عباس نے غصے میں آ کر کہا۔"یا تو تم لوگ جھوٹے ہو یا پھر حلاج بہت ہوشیار انسان ہے کہ علماء کے سامنے اپنی زبان پر قفل لگائے رکھتا ہے اور چہرے پر نقاب پہنے رہتا ہے۔"

"ہماری اطلاعات غلط نہیں ہیں، حلاج بہت ہوشیار انسان ہے۔" مخبر نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"پھر میں کیا کروں؟" حامد بن عباس، بہت دنوں سے شدید پیچ وتاب میں مبتلا تھا۔

"اس کی خدائی کا اقرار کرنے والے بھی یہاں موجود ہیں۔" مخبر نے حامد بن عباس کو نئی راہ دکھائی۔"انہیں طلب کر کے پوچھا جائے کہ وہ حلاج کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟"

حامد بن عباس کے چہرے پر خوشی کی لہر ابھر آئی۔ اس کے نزدیک یہ طریق کار زیادہ آسان تھا۔ اگر حضرت منصور حلاجؒ کے پرستاران کی خدائی کو تسلیم کر لیتے تو حلاج خود بخود مجرم ثابت ہو جاتے۔

حامد بن عباس نے بلاتاخیر ان لوگوں کو گرفتار کر لیا جو منصور حلاجؒ کی خدائی کے قائل تھے۔

ان لوگوں سے باز پرس کی گئی تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا۔"ہم لوگ حلاج کے اصحاب اور منادی ہیں۔"

اصحاب اور منادی کے الفاظ سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان لوگوں کے نزدیک منصور حلاجؒ نعوذ باللہ خدا تھے۔ منادی پکارنے والے کو کہتے ہیں اور "اصحاب" کا لفظ دوستوں اور اطاعت

گزاروں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

حامد بن عباس نے دوبارہ ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تم لوگ اپنے عقیدے کی وضاحت کرو۔ تمہارے نزدیک حلاج کی کیا حیثیت ہے؟''

پھر ان لوگوں نے کھل کر اپنا عقیدہ بیان کیا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ حلاج ہمارے نزدیک خدا ہے۔''

''تم کس بنیاد پر حلاج کو خدا کہتے ہو؟'' حامد بن عباس نے دوسرا سوال کیا۔

''اس لئے کہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے۔'' حضرت منصور حلاجؒ کے پرستاروں نے جواب دیا۔

حامد بن عباس بہت خوش تھا۔ اس کے خیال میں اب حضرت منصور حلاجؒ کو خدائی کا دعویدار ثابت کرنا بہت آسان تھا۔

دوسرے دن حامد بن عباس نے اپنی مجلس میں حضرت منصور حلاجؒ کے ساتھ ان لوگوں کو بھی طلب کیا جو حسین بن منصورؒ کو خدا تسلیم کرتے تھے۔

جیسے ہی حضرت منصور حلاجؒ زنجیریں پہنے ہوئے مجلس میں داخل ہوئے، حامد بن عباس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''ان لوگوں کو جانتے ہو؟'' وزیر حامد بن عباس کا اشارہ ان لوگوں کی طرف تھا جو منصور حلاجؒ کی خدائی کے قائل تھے۔

اگر حضرت منصور حلاجؒ اس الزام میں ملوث ہوتے تو ان لوگوں کو پہچاننے سے انکار کر کے، آسانی کے ساتھ اپنا دامن بچا سکتے تھے...... مگر چونکہ وہ بے قصور تھے، اس لئے کسی جھجک کے بغیر فرمانے لگے۔ ''ہاں! میں ان لوگوں کو جانتا ہوں۔ یہ اکثر میرے پاس آیا کرتے تھے۔''

''یہ لوگ تجھے خدا سمجھتے ہیں۔'' حامد بن عباس نے غضب ناک ہو کر کہا۔ ''اب تو بتا کہ تیرا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟''

حضرت منصور حلاجؒ نے نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میں کسی دوسرے شخص کے اعمال و افعال کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔''

حامد بن عباس نے حضرت منصور حلاجؒ کا جواب سن کر نہایت غیر مہذبانہ اور ناشائستہ گفتگو کی مگر حضرت حسین بن منصورؒ یہی فرماتے رہے۔

''یہ سب کے سب جھوٹے ہیں اور مجھ پر افترا باندھتے ہیں۔ اس کے سوا میری کوئی پہچان نہیں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اسی کی عبادت کرتا ہوں اور اسی کے لئے روزے رکھتا ہوں۔ مجھے نبوت اور خدائی کے دعوے سے کوئی نسبت نہیں۔ میں اپنے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، ان جھوٹے اور افترا ساز لوگوں سے۔''

بات واضح ہو چکی تھی مگر حامد بن عباس اپنی ضد پر قائم رہا۔ وہ ہر حال میں حضرت منصور حلاجؒ کو مجرم ثابت کر کے انہیں ان کے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا اور وہ انجام اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ حضرت منصور حلاجؒ تہہ تیغ کر دیئے جائیں۔

اگرچہ مقدمہ یکطرفہ قائم کیا گیا تھا اور دلائل ناکافی تھے لیکن حامد بن عباس نے علماء اور فقہا کی

ایک جماعت سے کہا۔ ''حلاج کے قتل کا شرعی جواز پیدا ہو چکا ہے، اس لئے اس کے خلاف فتویٰ صادر کر دیا جائے۔''

حکومت کے دباؤ کے باوجود علماء نے حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف فتویٰ دینے سے انکار کر دیا۔

''اب تک ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہو سکی ہے جو اس شخص کے قتل کی بنیاد بن سکے۔''

''یہ لوگ اسے خدا مانتے ہیں۔'' علماء کا انکار سن کر حامد بن عباس مشتعل ہو گیا تھا۔ ''کیا ان لوگوں کا اقرار حلاج کے قتل کا جواز نہیں بن سکتا؟''

''ان لوگوں نے حلاج کے متعلق جو دعویٰ کیا ہے، وہ اس وقت تک حجت نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسے مضبوط دلائل کے ساتھ ثابت نہ کیا جائے۔'' علماء نے حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف فتویٰ نہ دینے کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''یا پھر وہ شخص جس کے خلاف دعویٰ دائر کیا گیا، خود اس بات کا اقرار کرے۔''

مختصر یہ کہ علماء کا انکار سن کر حامد بن عباس ایک بار پھر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا...... اور حضرت منصور حلاجؒ کے قتل کیلئے نئے بہانے ڈھونڈنے لگا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

اس واقعے کی کچھ تفصیلات مؤرخ عریب بن سعد قرطبی نے بھی تحریر کی ہیں۔ عریب بن سعد لکھتا ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے منصور حلاجؒ کی اس حالت (یعنی خدائی دعوے) کو ظاہر کیا، وہ بصرہ کا رہنے والا تھا۔ بعد میں آنے والے مؤرخین نے اس شخص کو مجہول قرار دیا ہے کیونکہ کسی تاریخ میں اس شخص کا نام و نشان نہیں ملتا۔ بہر حال بصرہ کا وہ گمنام شخص سرکاری گواہ بن گیا اور اس نے وزیر علی بن عیسیٰ کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''میں حلاج کے اصحاب کو خوب پہچانتا ہوں، جو مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں اور لوگوں کو حلاج کی خدائی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ پہلے میں بھی اس کے طلسم میں گرفتار ہو گیا تھا۔ بعد میں جب مجھ پر حلاج کی فریب کاری عیاں ہوئی تو میں اس جماعت سے علیحدہ ہو گیا...... اور حقیقت منکشف ہو جانے پر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ نفل نماز پڑھی اور اب تک اپنی اس غلطی پر استغفار کر رہا ہوں۔'' سرکاری گواہ نے حضرت منصور حلاجؒ کی فریب کاری اور اپنی معصومیت و بے خبری کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔

پھر اسی شخص نے ایک اور انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''درباری منشی ابو علی ہارون بن عبد العزیز اور انجی بھی اسے خدا مانتا ہے۔ منشی نے حلاج کی تعریف میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کتاب میں حلاج کے بہت سے خوارق اور شعبدوں کو جمع کیا ہے۔ یہ کتاب حلاج کے ماننے والوں کے پاس موجود ہے جو اسے بہت ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔''

عریب بن سعد قرطبی کی روایت کے مطابق منصور حلاجؒ اس وقت شاہی محل میں نظر بند تھے اور ہر خاص و عام کو ان سے ملنے کی اجازت تھی۔ ابن نصر قشوری حاجب منصورؒ کا نگہبان تھا اور وہ بھی ان کے

مکر و فریب کے پھندے میں پھنس گیا تھا۔ (یہ اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ جب ابن نصر قشوری بیمار تھا اور طبیبوں نے اس کیلئے سیب تجویز کیا تھا۔ بہت تلاش و جستجو کے بعد جب سیب نہ مل سکا تو حضرت منصور حلاجؒ نے اپنی روحانی طاقت کے ذریعے وہ سیب فراہم کر دیا تھا) ابن نصر قشوری کے علاوہ خدام شاہی بھی حلاج کا ذکر عظمت کے ساتھ کرتے تھے۔ عباسی خلیفہ مقتدر نے حلاج کو علی بن عیسیٰ کے حوالے کر دیا۔ اس روایت سے پتا چلتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ سب سے پہلے علی بن عیسیٰ کی سختیوں کا نشانہ بنے۔ علی بن عیسیٰ نے حضرت منصور حسینؒ کو اپنی مجلس میں طلب کیا اور نہایت جارحانہ انداز میں گفتگو شروع کی۔

''تو اپنی اس طاقت پر خدائی کا دعویٰ کرتا ہے کہ زنجیریں پہنے ہوئے مجرموں کی طرح میرے سامنے کھڑا ہے۔''

حضرت منصور حلاجؒ نے علی بن عیسیٰ کے غضب ناک لہجے کو محسوس کیا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی کے ساتھ اس شخص کو دیکھتے رہے، جو اقتدار کے نشے میں مست تھا اور گلا پھاڑ کر بول رہا تھا۔

''تو کیسا خدا ہے؟ یہاں سے چلا کیوں نہیں جاتا۔'' علی بن عیسیٰ حضرت منصور حلاجؒ کو مخاطب کر کے گرجا۔ ''مجھے بھی تو اپنی خدائی کا کوئی کرشمہ دکھا؟''

اس بار حضرت منصور حلاجؒ نے اپنی جگہ سے جنبش کی۔ زنجیریں بج اٹھیں جن کے شور سے مجلس کا سکوت درہم برہم ہو گیا۔ حضرت منصور حلاجؒ علی بن عیسیٰ کے قریب ہوئے اور نہایت پر جلال لہجے میں فرمانے لگے۔

''علی بن عیسیٰ! میں تمہیں تنبیہہ کرتا ہوں کہ تو جس حد تک پہنچ چکا ہے، اس سے آگے نہ بڑھ ورنہ میں تیرے اوپر زمین کا تختہ الٹ دوں گا۔''

خدا ہی جانتا ہے کہ ایک بے دست و پا قیدی کے الفاظ میں کیا تاثیر تھی کہ علی بن عیسیٰ لرز اٹھا۔ عریب بن سعد قرطبی کی روایت کے مطابق علی بن عیسیٰ حضرت منصور حلاجؒ سے مزید گفتگو نہ کر سکا اور وہ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ اس معاملے سے الگ ہو گیا۔

اس کے بعد حامد بن عباس نے خلیفہ مقتدر باللہ سے درخواست کی اور حضرت منصور حلاجؒ کو اس جابر و سفاک وزیر کے حوالے کر دیا گیا۔

☆☆............☆☆............☆☆

علی بن عیسیٰ کا اس معاملے سے دستبردار ہو جانا، حضرت منصور حلاجؒ کے جلال روحانی کی ایک دلیل ہے۔ ایک طاقتور آمر نے حضرت منصور حلاجؒ کی شخصیت کا کوئی ایسا زاویہ یقیناً دیکھا ہو گا جس سے وہ خوف زدہ ہو گیا اور اس نے قاتلین منصور کی فہرست سے اپنا نام خود ہی کاٹ لیا۔ یہ علی بن عیسیٰ کی سعادت تھی کہ وہ ایک جانباز صوفی کی دل آزاریوں سے محفوظ رہا۔ اس کے برعکس حامد بن عباس دن رات اسی تگ و دو میں مصروف رہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح حضرت منصور حلاجؒ کو کافر ثابت کر دے اور پھر ان کی شہ رگ پر خنجر ستم پھیر دے۔

آخر وقت نے حامد بن عباس کو ایک اور موقع فراہم کر دیا۔ مخبروں نے اسے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ''بغداد میں ایک جواں سال عورت بھی حلاج کے دعوئ خدائی کی گواہ ہے۔''

حامد بن عباس نے پوچھا۔ ''یہ عورت کون ہے؟''

مخبروں نے بتایا۔ ''سمری نام کا ایک شخص حلاج کے اصحاب میں شامل ہے اور یہ عورت اسی کی لڑکی ہے۔''

حامد بن عباس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس عورت کو بھی طلب کر لیا۔ کسی بھی تاریخ میں سمری کی بیٹی کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔ ہر مؤرخ اسے بنت سمری کے نام سے پکارتا ہے۔

جب بنت سمری حامد بن عباس کے پاس آئی تو اس وقت معززین شہر میں سے ابوالقاسم بن زنجی اور ابو علی احمد بن نصر بھی موجود تھے۔ ابوالقاسم بن زنجی کا بیان ہے کہ بنت سمری ایک خوبصورت خاتون تھی۔ جب اس نے حامد بن عباس کے کچھ سوالوں کے جواب دیئے تو یہ بات ظاہر ہوئی کہ خوبصورت ہونے کے علاوہ بنت سمری فصیح البیان اور شیریں گفتار بھی تھی۔

حامد بن عباس نے بنت سمری کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''تجھ پر لازم ہے کہ تو کچھ دن حلاج کے ساتھ تنہائی میں گزار اور پھر جو واقعات پیش آئیں میرے روبرو بیان کر!''

اس کے بعد بنت سمری کو اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں حضرت منصور حلاجؒ قید تھے۔

ہم کسی تاریخ کے حوالے سے اس مدت کا تعین تو نہیں کر سکتے کہ بنت سمری نے حضرت منصور حلاجؒ کے ساتھ تنہائی میں کتنے دن گزارے مگر حامد بن عباس کے منصوبے کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ خوبصورت عورت چند ماہ خلوت میں ضرور رہی ہو گی۔

پھر ایک مقررہ وقت گزارنے کے بعد حامد بن عباس نے بنت سمری کو طلب کر کے پوچھا۔ ''تو نے اتنے دنوں میں حلاج کو کیسا پایا اور کیا کیا واقعات مشاہدہ کئے۔''

''میں نے انہیں ہر چیز سے بے نیاز پایا۔'' بنت سمری نے صاف صاف کہہ دیا۔

بنت سمری کا جواب سن کر حامد بن عباس کا چہرہ بجھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ خلوت میں بنت سمری کی موجودگی حضرت منصور حلاجؒ کی پاک دامنی کو داغدار کر دے گی یا کم سے کم ایسی بات ضرور کہے گی جس سے حضرت حسین بن منصورؒ کے کردار کی کمزوری ظاہر ہوتی ہو مگر بنت سمری کے ان الفاظ نے حامد بن عباس کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا کہ وہ ہر چیز سے بے نیاز نظر آتے ہیں۔ یہ حضرت منصور حلاجؒ کے متقی اور پرہیز گار ہونے کی دلیل ہے۔

پھر جب حامد بن عباس نے بنت سمری سے مسلسل سوالات کئے تو اس نے صرف ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''حلاج ہمہ وقت اپنے خیالات میں گم رہتے ہیں مگر ایک دن انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''میں نے تیرا نکاح اپنے بیٹے سلمان سے کر دیا جو مجھے اپنی تمام اولادوں میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ نیشا پور میں مقیم ہے اور تو عنقریب اس کے پاس پہنچ جائے گی۔''

اس کے بعد حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''میاں بیوی میں کوئی نہ کوئی تلخ بات ہو ہی جاتی ہے اور کوئی نہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آہی جاتا ہے۔ میں نے تیرے متعلق سلیمان کو ہدایت کردی ہے۔ اگر تم دونوں میاں بیوی کے درمیان کبھی ناگوار بات ہوجائے تو اس دن روزہ رکھنا اور دن کے آخری حصے میں چھت پر جا کر کھڑی ہونا اور خالص نمک سے روزہ افطار کرکے میری طرف متوجہ ہونا اور جو ناگواری پیش آئی ہو اس کا ذکر کرنا۔ میں تیری بات سنوں گا اور تجھے دیکھوں گا۔''

بنت سمری کی بات سن کر حامد بن عباس جوشِ غضب میں بول اٹھا۔ ''یہ بھی تو خدائی کا دعویٰ ہے کیونکہ خدا ہی اپنے بندوں کے حالات دیکھتا ہے اور ان کی باتیں سنتا ہے۔''

مجلس میں موجود علماء اور فقہا نے حامد بن عباس کی اس دلیل کو مسترد کردیا۔ ''یہ انسانی جذب کی کیفیت بھی ہوسکتی ہے۔ اس واقعے سے خدائی دعوے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔''

حامد بن عباس بنت سمری کو مجبور کرتا رہا کہ وہ اپنے حافظے پر زور دے کر ایسا کوئی واقعہ بیان کرے جس سے حلاجؒ کا کفر ثابت ہوتا ہو۔ بنت سمری کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے حضرت منصور حلاجؒ کے حوالے سے ماضی کا ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

''میں ایک دن صبح کے وقت چھت سے اتر رہی تھی۔ حلاج کی لڑکی میرے ساتھ تھی اور حلاج مکان کے صحن میں موجود تھے۔ پھر جب ہم دونوں زینے میں اس جگہ پہنچیں جہاں سے حلاج ہمیں نظر آرہے تھے اور وہ ہمیں دیکھ رہے تھے، تو ان کی لڑکی نے مجھ سے کہا۔

''ان کے آگے سجدہ کرو۔''

میں نے چونک کر حلاج کی لڑکی سے کہا۔ ''کیا اللہ کے سوا بھی کسی کو سجدہ کیا جاسکتا ہے؟''

میری بات حلاج نے سن لی اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں! آسمان میں بھی معبود ہے ......اور زمین میں بھی معبود ہے۔ اللہ وحدہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

اس کے بعد پتا نہیں چلتا کہ بنت سمری نے حضرت منصور حلاجؒ کو سجدہ کیا یا نہیں؟ البتہ علمائے کرام نے اس واقعے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر حضرت منصور حلاجؒ کے قول میں ''لا الٰہ الا اللہ وحدہ'' نہ ہوتا تو واقعی یہ کلمۂ کفر تھا مگر آخری جملے نے مجبور کردیا ہے کہ ان کے پہلے جملے کو بھی توحید پر محمول کیا جائے۔ یہاں سجدے سے مراد سجدۂ تعظیمی ہے جو علماء کے درمیان ایک متنازع مسئلہ ہے۔ اگر حضرت منصور حلاجؒ نے بنت سمری کو سجدۂ تعظیمی کا حکم دیا تو یہ ان کی علمی اور فقہی غلطی تھی۔ اس سے ان پر کفر کا الزام نہیں آتا۔ وہ علی الاعلان کہتے تھے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

بنت سمری کے بارے میں بھی علمائے تحقیق کی متفقہ رائے ہے کہ وہ ایک مجہول عورت ہے۔ اس کے حالات یکسر مفقود ہیں۔ اس لئے اس کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کا کسی کو علم نہیں۔ مزید یہ کہ بنت سمری اس روایت میں تنہا ہے اور ایک عورت کے بیان سے کوئی حجت قائم نہیں ہوسکتی۔ اسلامی قانونِ شہادت کے مطابق کسی معاملے میں دو عورتوں کی گواہی قابلِ قبول ہوتی ہے۔

اسی دوران میں بنت سمری نے حامد بن عباس کو حضرت منصور حلاجؒ کی روحانیت سے متعلق کئی اہم واقعات سنائے جنہیں ان کی شعبدہ بازی اور جادوگری سے تعبیر کیا گیا۔

ایک دن حلاجؒ نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ اس وقت ایک بوریے پر بیٹھے ہوئے تھے اور کمرے میں چاروں طرف بوریوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔

''آپ نے مجھے کس لئے یاد کیا ہے؟'' میں نے حلاجؒ سے کہا۔

''بیٹھ جاؤ!'' حلاجؒ نے کہا۔ پھر جب میں بیٹھ گئی تو مجھ سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں دولت کی ضرورت ہے؟''

میں نے حیرت سے حلاجؒ کی طرف دیکھا۔ وہ شکستہ حالی کی زندگی بسر کررہے تھے اور اس وقت بھی ان کے جسم پر ایک پرانی گدڑی تھی۔ پھر ایسا مفلس و غریب شخص کسی کو دولت کس طرح دے سکتا تھا؟ میں اسی کے متعلق سوچ رہی تھی کہ حلاجؒ نے دوبارہ مجھے مخاطب کرکے کہا۔

''تم اپنی ضرورت کا اظہار کرو۔ یہ مت سوچو کہ ایک مفلوک الحال فقیر تمہیں کیا دے سکتا ہے؟''

میں ایک بار پھر شدید حیرت میں مبتلا ہوگئی۔ حلاجؒ نے میرے خیالات پڑھ لئے تھے۔ ''دولت کی ضرورت کسے نہیں ہوتی؟'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ اگرچہ انہوں نے میرے دل کا حال جان لیا تھا لیکن پھر بھی مجھے یہ اُمید نہیں تھی کہ وہ میری خواہش پوری کرسکیں گے۔

''تو پھر جاؤ اور بوریا اٹھا کر جتنی دولت چاہو لے لو۔'' حلاجؒ نے اس قدر پر یقین لہجے میں کہا جیسے پورا کمرہ دولت سے بھرا ہو۔

میں ہچکچاتی ہوئی کمرے کے ایک گوشے میں گئی اور بوریا الٹ دیا۔ پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی، دینار اس طرح زمین پر بچھے ہوئے تھے جیسے سارا فرش دیناروں سے تیار کیا گیا ہو۔ میں نے گھبرا کر دوسرے بوریے کو الٹا۔ وہاں بھی دینار بچھے ہوئے تھے۔ پھر دیناروں کی چمک سے میری آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔'' جب بنت سمری نے یہ واقعہ بیان کیا تو حامد بن عباس اور وہاں موجود تمام علماء نے بیک زبان حضرت منصور حلاجؒ کی اس کرامت کو ''ساحری'' قرار دیا چونکہ اسلام میں جادو حرام ہے، اس لئے حضرت منصور حلاجؒ کے روحانی کمالات کو پہلے جادوگری کا نام دیا جاتا تھا اور بعد میں اسی حوالے سے ان پر کفر کا الزام عائد کردیا جاتا تھا۔

اولیائے کرام کے نزدیک دولت کے دریا بہا دینا، ایک ادنیٰ کرامت ہے۔ اگرچہ وہ خود فاقے سے ہوتے ہیں لیکن حق تعالیٰ انہیں بے شمار خزانوں پر قبضہ و اختیار عطا کردیتا ہے۔ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ ارادتاً جس پتھر پر تھوک دیا کرتے تھے وہ سونا بن جاتا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ کے آگے سونے کا دریا بہتا تھا۔ یہ منظر ان امیرزادوں نے کئی بار دیکھا جو حضرت محبوب الٰہیؒ کو مفلسی اور غربت کا طعنہ دیا کرتے تھے۔ حضرت سیدی مولہؒ کے بارے میں تو مشہور ہے کہ ان کے مصلے کے نیچے سیم و زر کا سمندر موجزن تھا۔ وہ بظاہر کوئی کام نہیں کرتے تھے مگر ان کا روزانہ کا خرچ لاکھوں روپے تھا۔ سیدی مولہؒ، سلطان جلال الدین خلجی کے دورِ حکومت میں گزرے ہیں اور ان کی یہ

کرامت تاریخ ہندوستان کا ایک روشن اور نا قابل فراموش باب ہے۔ اس دور کے علماء سیدی مولہؒ کو بھی شعبدہ باز اور جادوگر کہتے تھے۔ بعض علماء نے اس معاملے میں احتیاط برتی اور سیدی مولہؒ کو "جادوگر" کہنے کے بجائے "کیمیاگر" قرار دیا۔ علماء کی اس جماعت کی نظر میں سیدی مولہؒ سونا بنانے کا ہنر جانتے تھے، اسی لئے لاکھوں روپے روزانہ خیرات کیا کرتے تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ کا بھی یہی معاملہ تھا۔ اکثر علمائے بغداد کی نظر میں، یہ جانباز صوفی ایک جادوگر کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ابوالقاسم زنجی کا بیان ہے کہ جو خطوط منصور حلاجؒ کے ماننے والوں کے پاس سے ضبط کئے گئے تھے، ان میں عجیب باتیں درج تھیں۔ مزید یہ کہ ان خطوط میں حلاج کی ہدایت بھی تحریر تھی کہ لوگوں کو کس بات کی دعوت دی جائے؟ انہیں کس طرح ایک حال سے دوسرے حال کی طرف اور ایک مرتبے سے دوسرے مرتبے کی طرف لایا جائے۔ یہاں تک کہ وہ انتہائی درجے پر پہنچ جائیں۔ ابوالقاسم زنجی کے بقول حلاجؒ نے اپنے اصحاب (پرستاروں) کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ ہر جماعت کے افراد کے ساتھ ان کی ذہنی سطح کے مطابق اس طرح بات کی جائے کہ وہ اطاعت پر آمادہ ہو جائیں۔ جو لوگ حلاج سے خط و کتابت کرتے تھے انہیں خاص رموز میں جواب دیا جاتا تھا جسے کاتب اور مکتوب الیہ کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مخصوص لوگوں کے علاوہ منصور حلاجؒ کے خطوط کا مفہوم کوئی دوسرا شخص سمجھ ہی نہیں سکتا تھا تو پھر حامد بن عباس کے حاشیہ برداروں پر یہ بات کیسے ظاہر ہوگئی کہ حضرت منصور حلاجؒ ایک نئے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے یا پھر وہ اسلام سے باغی ہو کر معاذ اللہ خود خدا بن بیٹھے تھے۔ مقدمۂ منصور کے سلسلے میں ابوالقاسم زنجی کے نام کے ساتھ کئی روایتیں منسوب ہیں۔ حضرت منصور حلاجؒ کے مخالفین بڑے زور، شور سے ان روایتوں کو بیان کرتے ہیں مگر علمائے تحقیق نے ابوالقاسم زنجی کو مجہول قرار دیا ہے۔ ابوالقاسم زنجی اور اس کا باپ حامد بن عباس کے درباریوں میں سے تھے۔ جب ان کا آقا قتل منصور کے درپے ہو تو پھر خوشامدی غلام ایک معتوب شخص کی بے گناہی پر کس طرح گواہی دے سکتے تھے۔

الغرض ان ہی جھوٹی شہادتوں کے ہجوم میں حضرت منصور حلاجؒ کو زنجیریں پہنا کر علماء اور فقہا کے درمیان تقریباً روزانہ پیش کیا جاتا۔ دن دن بھر، مختلف زاویوں سے جرح ہوتی مگر حضرت حسین بن منصورؒ پر خدائی دعوے اور کفر کا الزام ثابت نہ ہوتا۔

اسی دوران، جب حضرت منصور حلاجؒ بیڑیاں پہنے ہوئے زنداں کے ایک ایسے کمرے میں قید تھے، جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا، ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس نے حامد بن عباس کے ہوش اڑا دیئے۔

مقتدر باللہ کا یہ جابر و سفاک وزیر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ قید خانے کے ایک دربان نے آ کر لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"امیر بڑا غضب ہوگیا کہ حلاج کا ایک مرید اس کے پاس آیا اور ملاقات کر کے واپس چلا گیا۔"

حامد بن عباس نے زنداں کے دربان کو ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے پوچھا۔ "تیرے ہوتے ہوئے وہ مردود حلاج تک کیسے پہنچ گیا؟"

"یہی تو حیرت ہے کہ وہ سخت ترین پہرے میں کس طرح اندر گیا؟" دربان حامد بن عباس کے خوف سے کانپ رہا تھا۔ "میں نے تو بس اتنا دیکھا کہ وہ شخص حلاج سے بات کر رہا تھا۔ پھر وہ اُٹھا اور اچانک میری نظروں سے اُوجھل ہوگیا۔"

حامد بن عباس کو دربان کی بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ گالیاں دیتا ہوا اٹھا اور اس جگہ پہنچا جہاں حضرت منصور حلاجؒ قید تھے۔ پھر اس نے تمام چوکیداروں کو جمع کر کے انتہائی غضب ناک لہجے میں کہا۔

"کیا میں نے تمہیں حکم نہیں دیا تھا کہ میری مرضی کے بغیر حلاج سے کوئی ملاقات نہیں کرے گا؟"

"ہم آپ کے حکم ہی کے مطابق حلاج کی نگرانی کرتے ہیں۔" تمام دربانوں نے بیک زبان کہا۔ "ہم نے کسی شخص کو حلاج سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔"

"پھر یہ نافرمانی کیوں ہوئی۔" حامد بن عباس بھڑک اٹھا اور اس نے کئی چوکیداروں کی پشت پر کوڑے برسائے۔ بعض دربان لہولہان ہوگئے مگر اپنے جرم سے انکار کرتے رہے تمام چوکیداروں نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ وہ اس معاملے میں یکسر بے قصور ہیں۔ اب حامد بن عباس کو احساس ہوا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ اس نے قید خانے کا دروازہ کھلوایا او بچشم خود ایک ایک دیوار، ایک ایک گوشے اور قید خانے کی چھت کا معائنہ کیا۔ وہاں نقب لگانے کا کوئی نشان تھا اور نہ کوئی شگاف جس سے گزر کر باہر سے کوئی آدمی آ سکتا اور پھر اسی راستے سے واپس چلا جاتا۔

آخر حامد بن عباس زچ ہوگیا اور اس نے حضرت منصور حلاجؒ سے پوچھا۔ "قید خانے کا دربان کہتا ہے کہ تیرا ایک مرید تجھ سے ملنے یہاں آیا تھا اور پھر واپس چلا گیا۔"

حضرت منصور حلاجؒ خاموش رہے مگر سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیا۔

حامد بن عباس شدید جھنجھلاہٹ میں مبتلا تھا کیونکہ اس کی ساری احتیاطی تدبیریں ناکام ہوگئی تھیں۔ "ہزار بندشوں اور پہروں کے باوجود وہ یہاں کس طرح داخل ہوا تھا؟"

حضرت منصور حلاجؒ نے اسی بے نیازی کے انداز میں فرمایا۔ "وہ قدرت الٰہی سے یہاں اترا اور جس طرح میرے پاس آیا تھا، اسی طرح واپس چلا گیا۔"

"یہ کھلا ہوا جادو ہے۔" حضرت منصور حلاجؒ کا جواب سن کر حامد بن عباس ایک بار پھر ہذیانی کیفیت کا شکار ہوگیا۔ "میں بھی دیکھوں کہ تو کب تک اپنے جادو کے کرشمے دکھائے گا۔"

حضرت منصور حلاجؒ نے سکوت اختیار کیا اور حامد بن عباس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

اگرچہ علمائے تحقیق نے ابوالقاسم زنجی کو مجہول اور جھوٹا قرار دیا ہے لیکن پھر بھی اس کے حوالے سے حضرت منصور حلاجؒ کی ایک عجیب کرامت مشہور ہے۔ ابوالقاسم بن عباس کی تقلید کرنے کیلئے مجبور تھے۔ نتیجتاً ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے دارالعلوم کے برآمدے میں جا کر بیٹھ گئے اور وہ خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ پھر میں اور میرا باپ انتظار کرنے لگے کہ حامد بن عباس کی طرف

سے کب ہمارا بلاوا آتا ہے؟ ابھی ہم دونوں کو بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ہارون ابوعم میرے والد کے پاس تشریف لائے۔ وہ ایک بڑے عالم تھے۔ دونوں میں گفتگو شروع ہوگئی اور خاموشی سے سنتا رہا۔

اچانک میں نے حامد بن عباس کے اس غلام کو آتے ہوئے دیکھا جو حلاجؒ کی نگرانی پر مامور تھا اسے کھانا وغیرہ پہنچایا کرتا تھا۔ غلام کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ مجھے پہلی ہی نظر میں اندا ہوگیا کہ یقیناً کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آچکا ہے۔

حامد بن عباس کے غلام نے ہارون ابوعمران کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ پھر انہیں کچھ بتا لگا۔ فاصلہ زیادہ تھا، اس لئے ہم اس غلام کی گفتگو نہ سن سکے۔ مگر اس کے چہرے پر خوف و دہشت سائے لرز رہے تھے اور پورا جسم کانپ رہا تھا۔ پھر وہ غلام واپس چلا گیا اور ہارون ابوعمران ہمار پاس آئے مگر ان کے چہرے کا رنگ بھی بدلا ہوا تھا۔

''شیخ! کیا بات ہے؟ میں آپ کی حالت کو متغیر پاتا ہوں۔'' میرے والد نے ہارون ابوعمرا سے پوچھا۔

''تم اس شخص کو پہچانتے ہو جو ابھی کچھ دیر پہلے آیا تھا اور مجھ سے بات کر رہا تھا۔'' ہارون ابوعمرا نے میرے والد سے کہا۔

''ہاں! یہ وزیر محترم کا غلام ہے اور حلاج کی نگرانی پر مامور ہے۔'' میرے والد نے اثبات میں جواب دیا۔

''یہ غلام کچھ دیر پہلے حلاج کے پاس کھانے کا طباق لے کر گیا تھا۔ یہ اس کا روزانہ کا معمو ہے۔'' ہارون ابوعمران نے میرے والد کو واقعے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔ ''غلام کہہ رہا تھا کہ جیسے ہی حلاجؒ کے کمرے میں داخل ہوا تو پورا کمرہ اس کے جسم سے بھرا ہوا تھا۔ کوئی جگہ بھی خالی نہیں تھی۔ یہ منظر دیکھ کر غلام پر دہشت طاری ہوگئی۔ اس نے کھانے کا طباق دروازے میں پھینک دیا بھاگ کھڑا ہوا۔ جب وہ مجھ سے بات کر رہا تھا تو پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور خوف سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھو کر دیکھا تو وہ بخار میں جل رہا تھا۔''

ابوالقاسم زنجی کا بیان ہے کہ ابھی ہم تینوں اس واقعے پر حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ حامد بن عباس کا قاصد آیا اور اس نے ہمیں مجلس میں حاضر ہونے کی اجازت دیدی۔ پھر جب ہم لوگ مجلس میں پہنچے اور ہارون ابوعمران نے غلام کا بیان کردہ واقعہ سنایا تو ہماری طرح حامد بن عباس بھی شدید حیرت میں مبتلا ہوگیا۔ پھر اس نے اسی وقت اپنے غلام کو طلب کر کے اس کی زبانی پورا واقعہ سنا۔

غلام جب حامد بن عباس کی مجلس میں داخل ہوا تو بخار کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور جسم پر لرزہ طاری تھا۔

تمام واقعہ سننے کے بعد حامد بن عباس نے غلام کو غلیظ ترین گالیاں دیں اور نہایت غضبناک لہجے میں کہا۔ ''تو بھی حلاج کی نیرنگیوں سے ڈر گیا؟ تجھ پر خدا کی لعنت۔ میرے پاس سے دور ہوجا!''

غلام کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ واپس چلا گیا...... اور ایک طویل مدت تک بخار میں مبتلا رہا۔

علمائے تحقیق نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں بھی حضرت منصور حلاجؒ کی کوئی خطا نہیں تھی۔ کرامات اولیاء کے حوالے سے ایسے واقعات کتابوں میں بکثرت درج ہیں کہ کبھی ان کا جسم بڑھ جاتا تھا اور کبھی ایک ایک عضو الگ ہوجاتا تھا...... مگر چونکہ حضرت منصور حلاجؒ کو مجرم ثابت کرنا تھا، اس لئے ان سے منسوب ہر بات کفر تھی یا شعبدہ بازی تھی۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

ابوبکر صولی کی روایت ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے حلاجؒ کو گرفتار کیا، وہ ابوالحسن علی بن احمد راسبی تھا۔ اس نے حلاجؒ اور اس کے غلام کو ربیع الآخر 301ھ میں بغداد پہنچایا اور دو اونٹوں پر سوار کر کے گلی گلی تشہیر کرائی اور ان کے ساتھ ایک کتبہ بھی لگوا دیا جس پر تحریر تھا۔

''میرے پاس شہادت موجود ہے کہ حلاجؒ خدائی کا دعویٰ کرتا ہے اور حلول کا قائل ہے۔''

علمائے تحقیق کے مطابق ابوبکر صولی جھوٹا تھا۔ وہ ایک درباری ادیب اور شاعر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اگر ابوبکر صولی سچا ہوتا تو 301ھ میں ہی حضرت منصور حلاجؒ پر خدائی دعوے کا الزام ثابت ہوجاتا اور وہ اپنے انجام کو پہنچ چکے ہوتے...... مگر تاریخ گواہ ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نو سال تک مسلسل گرفتار رہے ان پر مقدمہ چلتا رہا اور ہزار کوشش کے باوجود ان کے خلاف فتویٰ نہیں دیا جاسکا۔

پھر حالات نے ایک اور کروٹ لی۔ حامد بن عباس کو حضرت منصور حلاجؒ کی کتابوں میں کچھ ایسے مضامین ملے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسلامی عبادات کا مفہوم بدلنا چاہتے تھے۔

ان روایتوں کے مطابق اگر کوئی شخص تین دن، تین رات متواتر روزے رکھے اور درمیان میں افطار نہ کرے۔ پھر چوتھے دن بندیا کے پتوں پر افطار کرے تو اسے رمضان کے روزوں کی ضرورت نہ رہے گی۔

اور اگر کوئی شخص کسی رات میں شروع سے صبح تک دو رکعتیں پڑھے تو اسے زندگی بھر نماز کی ضرورت نہ رہے گی۔

اور اگر کوئی شخص کسی دن اپنی ساری مملوکات کو جو اس وقت اس کی ملکیت میں ہوں، صدقہ کردے تو اس کا یہ عمل ہمیشہ کیلئے زکوٰۃ کا قائم مقام ہوجائے گا۔

اور اگر کوئی شخص ایک کمرہ بنا کر چند روزے رکھے۔ پھر اس کے گرد بے لباس ہو کر طواف کرے تو اسے حج کی ضرورت نہ رہے گی۔

اور اگر کوئی شخص قریش کے قبرستان میں جا کر شہداء کی قبروں کی زیارت کرے اور وہاں دس روز قیام کر کے نماز پڑھے اور دعا کرتا رہے اور متواتر روزے رکھے اور افطار کے وقت جو کی تھوڑی سی روٹی اور خالص نمک کے سوا کچھ نہ کھائے تو اسے تمام عمر عبادت کی ضرورت نہ رہے گی۔

حامد بن عباس نے بغداد کے علماء، فقہا اور قاضیوں کو جمع کیا۔ پھر حلاجؒ کو ایک کتاب دکھا کر پوچھا۔ ''تم اس کتاب کو پہچانتے ہو؟''

حضرت منصور حلاجؒ نے بآواز بلند فرمایا۔ ''ہاں! یہ امام حسن بصریؒ کی کتاب ''السنن'' ہے۔''
حامد بن عباس نے دوسرا سوال کیا۔ ''کیا تم اس کتاب کے مضامین کو نہیں مانتے؟''
''کیوں نہیں؟'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''یہ تو ایسی کتاب ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے اس کے موافق معاملہ کرتا ہوں۔'' (یعنی میں اس کتاب کے مضامین کے مطابق اسلامی احکام پر عمل کرتا ہوں)

حضرت منصور حلاجؒ کا جواب سن کر قاضی ابوعمر نے کہا۔ ''یہ کتاب تو سراسر اسلامی احکام کے منافی ہے۔''

اس کے بعد قاضی ابوعمر نے حضرت منصور حلاجؒ سے بہت دیر تک جرح کی اور اسی بحث کے دوران ان کے منہ سے نکل گیا۔ ''حلاج کا خون حلال ہے۔'' یعنی وہ واجب القتل ہیں۔ اس کے بعد قاضی ابوعمر نے حضرت منصور حلاج کے قتل کا فتویٰ دیدیا اور دوسرے علماء نے اس فتوے پر دستخط کر دیئے۔

علمائے تحقیق نے اس واقعے پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کو کتاب کا مضمون نہیں سنایا گیا۔ صرف دور سے کتاب دکھا کر سوال کیا گیا کہ اس کتاب کو مانتے ہو یا نہیں؟ حضرت منصور حلاجؒ نے جواب میں فرمایا کہ یہ کتاب امام حسن بصریؒ کی ہے اور میں اس کے مضامین کے مطابق عمل کرتا ہوں۔ اس جواب سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ حضرت امام حسن بصریؒ جیسے بزرگ اور محدث کی تحریروں پر یقین رکھتے تھے۔ پھر وہ واجب القتل کیوں قرار پائے؟

بعض علماء نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ دشمنان اسلام نے فریب کاری کے ساتھ اس کتاب میں اپنی طرف سے کچھ غیر اسلامی باتیں شامل کر دی تھیں اور حضرت منصور حلاجؒ اس تحریف سے بے خبر تھے۔ ہماری رائے میں اگر حضرت حسین بن منصورؒ بے خبر تھے تو قاضی ابوعمر تو باخبر تھے۔ پہلے انہیں تحقیق کرنی چاہئے تھی کہ حضرت امام حسن بصریؒ کی کتاب اصلی نسخے کے مطابق ہے یا نہیں؟ اور اگر وہ کتاب امام حسن بصریؒ کی نہیں تھی تو قاضی ابوعمر کو واضح کر دینا چاہئے تھا کہ اس تصنیف کا امام حسن بصریؒ سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر جن مضامین اور احکام کے ماننے کے سلسلے میں حضرت منصور حلاجؒ کو واجب القتل قرار دیا گیا، انہیں فرداً فرداً پڑھ کر سنانا چاہئے تھا۔ اگر حضرت منصور حلاجؒ ان خلاف شرع احکام کو تسلیم کرتے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا اقرار کرتے تو قاضی ابوعمر کا فتویٰ درست ہو سکتا تھا..... مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف قائم کیا جانے والا مقدمہ ایک طلسمی داستان ہے جس کے بیشتر گواہ جھوٹے ہیں اور خود قاضی اب جانب داری سے کام لیتے ہوئے عجیب و پراسرار انداز میں فیصلہ کر رہا ہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اپنی تالیف ''سیرت منصور حلاج'' میں اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو شخص کئی بار مکہ معظمہ جا کر سالہا سال قیام کرتا ہو، بار بار حج کرتا ہو اور روزانہ ہزار رکعتیں

اس حال میں پڑھتا ہو کہ پیروں کی وزنی بیڑیاں پڑی ہوں اور زندگی بھر روزہ رکھنے کا عادی رہا ہو، وہ ایک رات کی دو رکعت کو عمر بھر کی نماز کے برابر...... یا تین دن کے روزوں کو رمضان المبارک کے روزوں کے برابر یا اپنے گھر کے طواف کو حج کا قائم مقام (نعم البدل) کیوں کر کہہ سکتا ہے؟ اگر معاذ اللہ ابن منصورؒ ساحر و زندیق ہوتے تو خود اپنی ذات کیلئے روزانہ ہزار رکعتیں کیوں پڑھتے؟ زندگی بھر روزے کیوں رکھتے؟ بار بار سفر حج کیوں اختیار کرتے؟ اور مکہ معظمہ میں طویل مدت تک قیام کیوں کرتے؟ پس، یقیناً کسی نے یہ مضامین امام حسن بصریؒ کی کتاب ''السنن'' میں اپنی طرف سے شامل کر دیئے تھے۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے تبصرے کی روشنی میں یہ قاضی ابوعمر کے عہدۂ و منصب کی ذمہ داری تھی کہ وہ پہلے امام حسن بصریؒ کی کتاب کے بارے میں تحقیق کرتے اور پھر حضرت منصور حلاجؒ کو مجرم قرار دیتے...... مگر ایسا نہیں ہوا اور ایک جانباز صوفی کے ساتھ عجیب سنگدلانہ سلوک روا رکھا گیا۔

☆☆.............☆☆.............☆☆

مشہور مؤرخ عریب بن سعد قرطبی اور خطیب بغدادی نے حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف قتل کے فتوے کو دوسرے انداز سے بیان کیا ہے۔ ان دونوں مؤرخین کے بیان کے مطابق حلاجؒ کے اصحاب اور مریدوں کے گھروں سے دفتر کے دفتر حامد بن عباس کے پاس لائے جاتے تھے جن میں حلاجؒ کے خطوط اور کتابیں شامل ہوتی تھیں۔ ایک دن حامد بن عباس کے سامنے حلاجؒ کی ایک کتاب پڑھی جا رہی تھی جس میں یہ مضمون درج تھا۔

''اگر کوئی شخص حج کا ارادہ رکھتا ہو مگر یہ سعادت حاصل کرنے سے مجبور ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے گھر سے ایک کمرے کو عبادت کیلئے مخصوص کر لے اور اسے پاک صاف رکھے۔ کسی قسم کی نجاست وہاں نہ پہنچ سکے اور نہ وہاں کوئی دوسرا شخص جا سکے۔ تمام لوگوں کو اس کمرے کی طرف جانے سے روک دے۔ پھر حج کے ایام میں اس گھر کا طواف کرے جیسا کہ خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہیں...... اور جو مناسک مکے میں ادا کئے جاتے ہیں، سب بجا لائے۔ پھر جب یہ کر چکے تو تیس یتیموں کو جمع کر کے اس گھر کے سامنے اپنی استطاعت کے مطابق کھانا کھلائے اور بذات خود ان یتیموں کی خدمت کرے۔ جب وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ دھو لیں تو ہر ایک کو ایک ایک کرتا پہنائے۔ پھر ہر ایک کو سات درہم دے۔ یہ عمل اس کیلئے حج کا قائم مقام ہوگا۔''

جس وقت یہ کتاب پڑھی جا رہی تھی، اس وقت حامد بن عباس کی مجلس میں قاضی ابوعمر، قاضی ابوالحسن، قاضی ابوجعفر بن بہلول اور علماء کی ایک جماعت موجود تھی۔ جب مضمون ختم ہو گیا تو قاضی ابوعمر نے حلاجؒ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔
''تجھ تک یہ مضمون کیسے پہنچا۔''
حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''امام حسن بصریؒ کی کتاب ''الاخلاص'' سے۔''
قاضی ابوعمر نے بے ساختہ کہا۔ ''اے حلال الدم! تو جھوٹا ہے۔'' (حلال الدم کا مطلب ہے، وہ

شخص کہ جس کا خون (قتل) جائز ہو)

پھر جیسے ہی قاضی ابوعمر کی زبان سے ''حلال الدم'' نکلا، وزیر حامد بن عباس نے اس لفظ کو پکڑ لیا اور زور دے کر کہا۔ ''اس لفظ کو کاغذ پر لکھ دیجئے۔'' حامد بن عباس کا مطلب تھا کہ منصور حلاج کے قتل کا فتویٰ دیدیا جائے۔

جب قاضی ابوعمر نے حامد بن عباس کی بات سنی تو وہ حضرت منصور حلاجؒ سے دوسرے امور پر گفتگو کرنے لگے۔ دراصل قاضی ابوعمر بات کو ٹالنا چاہتے تھے مگر حامد بن عباس اصرار کرنے لگا۔

''اب مزید گفتگو فضول ہے۔ تمام اقرار کر چکے کہ حلاج واجب القتل ہے۔''

قاضی ابوعمر نے یہ تاثر دیا کہ جیسے انہوں نے وزیر کی بات نہیں سنی۔ وہ مسلسل اس معاملے کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر حامد بن عباس اس حد تک پہنچ گیا کہ اس نے قلم اور دوات قاضی ابوعمر کے سامنے رکھ دیئے اور چند کاغذ حوالے کرتے ہوئے بولا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے تم نے جو کچھ اپنی زبان سے کہا ہے اسے کاغذ پر منتقل کر دو۔''

قاضی ابوعمر نے حامد بن عباس کے تیور دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آئے گا۔ مجبوراً انہوں نے قلم اٹھا کر لکھ دیا کہ منصور حلاجؒ کا قتل جائز ہے۔ جیسے ہی یہ فتویٰ تحریر کیا گیا اور قاضی ابو عمر نے اپنے دستخط ثبت کئے، حامد بن عباس نے وہ کاغذ دوسرے علماء کی طرف بڑھا دیا۔ پھر ایک کے بعد ایک، حضرت منصور حلاجؒ کے قتل نامے پر مہریں لگنے لگیں۔

یہ منظر دیکھ کر حضرت منصور حلاجؒ نے قاضی ابوعمر اور دوسرے علماء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''میری پشت شرعاً ممنوع و محفوظ ہے (یعنی مجھے کوڑوں کی سزا بھی نہیں دی جا سکتی) اور میرا خون بہانا حرام ہے۔ تمہارے لئے ہرگز نہیں کہ تم جھوٹی باتیں گھڑ کر میرے قتل کا فتویٰ دو...... حالانکہ میرا عقیدہ اسلام کے موافق ہے...... میرا مذہب سنت کے مطابق ہے...... اور میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعدؓ، حضرت سعیدؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ (یعنی تمام عشرہ مبشرہ) کی فضیلت کا قائل ہوں۔ سنت کے بیان میں میری تصانیف کتب فروشوں کے پاس موجود ہیں۔ پس میرے خون کے معاملے میں اللہ سے ڈرو...... اللہ سے ڈرو۔''

حضرت منصور حلاجؒ مسلسل اسی بات کو دہرا رہے تھے اور علماء برابر ان کے قتل نامے پر دستخط کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ حسب منشا فتوے کی تکمیل کر لی گئی تو حاضرین مجلس اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت حسین بن منصورؒ کو اسی جگہ بھیج دیا گیا جہاں وہ پہلے سے قید تھے۔

نو سال تک بحث اور جرح کے بعد جس شخص کو خدائی کا دعویدار یا کافر ثابت نہیں کیا جا سکا، قاضی ابو عمر کی زبان سے نکلے ہوئے ایک لفظ نے اس کی موت کا فیصلہ کر دیا۔ ''حلال الدم'' کا لفظ، قاضی ابوعمر کے منہ سے شدت جذبات میں ادا ہوا تھا...... مگر حامد بن عباس نے اسے آیت قرآنی اور حدیث بنا لیا۔ قاضی صاحب گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑتے رہے، بات کو ٹالتے رہے مگر خلیفہ مقتدر باللہ کا

وزیر ایک ہی نقطے پر جم کر رہ گیا۔ یعنی منصور حلاج کا سر...... قاضی ابوعمر فتویٰ لکھنا نہیں چاہتے تھے مگر حامد بن عباس بار بار قلم دوات اور کاغذ ان کے سامنے پیش کر دیتا تھا۔ یہ انصاف تھا یا اقتدار کے جبر کا بے رحم مظاہرہ؟

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ سرور کونین حضور اکرم ﷺ نے وجوبی حکم دیا ہے کہ شبہات سے حدود کو دفع کرو۔ یعنی شبہات کے ذریعے سزاؤں کو دور کرو...... مگر یہاں سب سے بڑی حد یعنی قتل میں بس مجرم کو شک کا فائدہ نہیں پہنچایا جاتا۔ یقیناً وزیر حامد بن عباس کا ایک جملے کو پکڑ لینا اور اس کو قرآنی آیت و حدیث سمجھ لینا ہرگز جائز نہ تھا۔ یہ احتمال ہونا ضروری تھا کہ شاید ویسے ہی غصے میں ابوعمر کی زبان سے نکل گیا ہو...... اور اگر بالفرض قاضی نے قصداً یہ بات کہی تھی جب بھی وزیر کو خود اس پر اصرار کرنے کا کوئی حق نہیں تھا بلکہ ٹالنا واجب تھا...... جب تک خود قاضی اپنی بات پر اصرار نہ کرتا...... مگر یہاں معاملہ برعکس ہے کہ قاضی اپنی بات سے ہٹنا اور اس کو ٹالنا چاہتا ہے مگر وزیر بضد ہو کر اسے اپنی بات سے ہٹنے نہیں دیتا۔''

آگے چل کر مولانا ظفر احمد عثمانیؒ تحریر کرتے ہیں۔ ''بعض مورخین کا یہ لکھنا بالکل غلط ہے کہ علماء اور فقہا نے ابن منصورؒ کے قتل کا فتویٰ دیا تھا بلکہ یہ لکھنا چاہئے تھا کہ وزیر نے بضد ہو کر علماء پر زور ڈالا اور مجبور کر کے ان سے فتویٰ حاصل کیا۔ پس ابن منصور کے قتل کا اصل مفتی وزیر حامد بن عباس تھا۔ نہ علماء تھے، نہ فقہا اور نہ قاضی کیونکہ جس صورت سے یہ فتویٰ حاصل کیا گیا تھا، وہ ہرگز شرعی فتویٰ کہلانے کا مستحق نہیں۔ اسی لئے حضرت مولانا رومؒ نے فرمایا ہے۔

''جب قلم کسی غدار کے ہاتھ میں آئے گا تو یقیناً منصور کو دار پر کھینچا جائے گا۔'' (ترجمہ)

(یہاں غدار سے مراد وزیر حامد بن عباس ہے)

آگے چل کر مولانا ظفر احمد عثمانیؒ رقم طراز ہیں۔ ''رہا یہ سوال کہ پھر قاضی نے وزیر کی زبردستی کیوں مانی؟ حامد بن عباس سے صاف کیوں نہ کہہ دیا کہ ''حلال الدم'' کا لفظ میری زبان سے غصے میں نکل گیا تھا۔ میں نے فتویٰ کے طور پر یہ بات نہیں کہی تھی۔ پھر قاضی اور ابوعمر کے ساتھی علماء نے ایسے جبری فتوے پر دستخط کیوں کئے؟ تو اس کا جواب وہ علماء ہی دے سکتے ہیں...... مگر جو صورتحال خطیب بغدادی وغیرہ کے بیان سے ہمارے سامنے آئی ہے، اسے دیکھ کر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ فتویٰ شریعت کا فتویٰ نہیں تھا بلکہ وزارت اور حکومت کا فتویٰ تھا جو وزیر کے اصرار اور جبر سے لکھا گیا تھا۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے قاضی ابوعمر اور فتوے پر دستخط کرنے والے دوسرے علماء کے بارے میں محتاط رائے کا اظہار کیا ہے اور اس پوری جماعت کو ریاستی جبر کے سامنے بے دست و پا ثابت کیا ہے۔ خطیب بغدادی کی روایت سے بس اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ حامد بن عباس قاضی ابوعمر کے سامنے بار بار قلم دوات رکھ کر کہتا تھا کہ بس یہ الفاظ کاغذ پر رقم کر دو۔ ظاہری طور پر یہ ایک زبانی اصرار ہے، ایک ہی جملے کی تکرار ہے، کوئی کھلا ہوا جبر نہیں جس کے آگے قاضی ابوعمر اور دوسرے علماء اپنی ذاتی رائے بدلنے پر مجبور ہو جاتے۔ یہ کوئی تنہا واقعہ نہیں تھا۔ حضرت منصور حلاجؒ پر گزشتہ نو سال سے مقدمہ چل رہا تھا۔

بلا مبالغہ وہ ہزاروں بار اسی عدالت کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ پر اس سے زیادہ سنگین الزامات عائد کئے گئے تھے......اور یہی قاضی ابو عمر تھے جو حضرت حسین بن منصورؒ کا مقد سنا کرتے تھے......اور ہر مرتبہ ایک ہی جواب دیتے تھے کہ ان تمام باتوں سے حلاجؒ کے قتل کا جو پیدا نہیں ہوتا۔ پھر وہ کون سی مجبوری تھی کہ حضرت امام حسن بصریؒ کی کتاب سے ایک ''الحاقی وا کو بنیاد بنا کر قاضی ابو عمر اور ان کے ہم نواؤں نے قتل منصورؒ کا شرعی حکم جاری کر دیا۔ یہ تسلیم کہ قاضی عمر کی زبان سے اضطراب یا غصے کی حالت میں ایک لفظ نکل گیا تھا......مگر وہ اس بات پر بھی قادر تھے کہ اپنے بیان کی تردید کر دیتے۔ یا پہلے کی طرح وہی جملہ دہرا دیتے کہ ابھی قتل منصور کا جواز پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پس پردہ ایسی کوئی بات ضرور تھی جس نے قاضی ابو عمر اور علماء کی جماعت کو اپنی مرضی کے خلاف فیصلے لکھنے پر مجبور کر دیا تھا......اور وہ بات اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ حامد بن عباس نے قاضی ابو عمر اور دیگر فقہا سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر منصور حلاجؒ کے قتل کا فتویٰ نہیں دیا گیا تو پھر خود ان کی جانیں محفوظ نہیں رہیں گی۔ موت کی دھمکی دراصل ایک ایسی تنبیہہ ہے جو انسانی ارادے کو بدل دیتی ہے اور قلم کا رخ موڑ دیتی ہے۔ اگر بالفرض حامد بن عباس نے قاضی ابو عمر اور ان کے ساتھیوں پر موت کا خوف مسلط نہیں کیا تھا تو پھر دنیا میں ایک کوئی مجبوری نہیں تھی کہ محض قلم دوات آگے بڑھانے سے حضرت منصور حلاجؒ کی داستان حیات پر خط تنسیخ پھیر دیا جائے......یا پھر صاف صاف کہا جائے کہ قاضی ابو عمر اور ان کے ساتھی علماء انتہائی کمزور ارادے کے دنیا دار انسان تھے کہ حامد بن عباس کی پیشانی پر بل آیا اور ان کے قلم نے وزیر کی مرضی کے مطابق اپنے قلم کا رخ تبدیل کر لیا۔ بہر حال وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ قاضی ابو عمر اور دوسرے فقہا پر کیا گزری تھی کہ وہ لوگ حضرت منصور حلاجؒ کی موت کا شرعی فرمان جاری کرنے پر مجبور ہوئے۔ پھر بھی داستان منصور کا آخری باب پڑھتے ہوئے اتنی خلش ضرور محسوس ہوتی ہے۔

کسی کے منہ سے نہ نکلا ہمارے دفن کے وقت
کہ ان پہ خاک نہ ڈالو، یہ ہیں نہائے ہوئے

☆☆..................☆☆..................☆☆

الغرض قاضی ابو عمر اور دوسرے علماء نے قتل کے فتوے پر دستخط کر دیئے اور حضرت منصور حلاجؒ اسی کمرے میں بھیج دیا گیا، جہاں وہ پہلے سے قید تھے۔

اسی دوران ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا جس نے عباسی خلیفہ مقتدر باللہ اور قصر خلافت کے تمام مکینوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

مقتدر باللہ کے بیٹے اور ابو العباس کے پاس ایک خوبصورت اور نایاب طوطا تھا۔ ابو العباس اس پرندے سے بہت محبت کرتا تھا۔ اتفاق سے ایک دن وہ طوطا مر گیا۔ شہزادہ ابو العباس رونے لگا۔ خدمت گاروں نے کہا کہ اب رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس مردہ طوطے کو محل سے باہر پھنکوا دیجئے......مگر ابو العباس طوطے کو اپنے آپ سے جدا کرنے پر راضی نہیں ہوا۔ خدام نے خلیفہ مقتدر باللہ کو

اس واقعے کی خبر دی، خلیفہ بیٹے کے پاس آیا اور سمجھانے لگا۔

''فرزند! تم اداس نہ ہو، میں تمہارے لئے اس سے بھی زیادہ خوبصورت طوطے منگوا دوں گا۔''

شہزادہ ابو العباس کی عمر بمشکل تین چار سال کی ہوگی۔ اس نے طفلانہ ضد کا مظاہرہ کیا اور باپ کے سامنے مچل گیا۔ ''مجھے یہی طوطا چاہئے آپ اسے زندہ کر دیں۔''

مقتدر باللہ بیٹے کی ضد دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ''بیٹے! تمہارے طوطے کو تمام انسان مل کر بھی زندہ نہیں کر سکتے۔ بس وہ اللہ ہی کی ذات ہے جو اس مردہ پرندے کے جسم میں دوبارہ روح ڈال سکتی ہے۔''

''تو پھر اللہ سے کہیے کہ وہ میرے طوطے کو زندہ کر دے۔'' شہزادہ ابو العباس اپنی ضد پر قائم تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

خلیفہ مقتدر باللہ بہت دیر تک مختلف بہانوں سے ابو العباس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کرتا رہا مگر جب وہ ناکام ہو گیا تو اچانک اسے حضرت منصور حلاجؒ کا خیال آیا۔ حضرت حسین بن منصورؒ کے بارے میں ان کے عقیدت مندوں، مریدوں اور پرستاروں نے یہ بات مشہور کر رکھی تھی کہ وہ اپنی روحانی طاقت سے مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی مقتدر باللہ نے اپنے ایک خادم خاص کو قید خانے بھیجا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ شہزادہ ابو العباس کے طوطے کو دوبارہ زندہ کر دیا جائے۔

حضرت منصور حلاجؒ خلیفہ مقتدر باللہ کے خادم کی بات بہت غور سے سنتے رہے۔ پھر کوئی جواب دیئے بغیر کمرے کے ایک گوشے میں چلے گئے اور پیشاب کرنے لگے۔ پھر اس کام سے فارغ ہو کر خادم کے پاس آئے اور فرمانے لگے۔

''جو شخص اپنے جسم میں اتنی غلاظت لئے پھرتا ہو، وہ کسی مردے کو زندہ نہیں کر سکتا۔'' حضرت منصور حلاجؒ کا مفہوم یہ تھا کہ انسان خود اللہ کا محتاج ہے، اس لئے وہ کسی بے جان جسم میں دوبارہ روح داخل نہیں کر سکتا۔

خادم چپ چاپ کھڑا رہا۔ حضرت منصور حلاجؒ نے مختصر سے سکوت کے بعد فرمایا۔ ''تم نے جو کچھ اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور جو کچھ میں نے کہا ہے، اسے من و عن خلیفہ کے سامنے دہرا دینا۔''

مقتدر باللہ کا خادم واپس جانے لگا تو حضرت منصور حلاجؒ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''ہاں! یہ ضرور ہے کے میرے لئے ایک ایسا بھی ہے جسے میں ادنیٰ اشارہ کر دوں تو وہ پرندے کو اصلی حالت میں لوٹا دے گا۔''

(علماء نے حضرت منصور حلاجؒ کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا اشارہ حق تعالیٰ کی طرف تھا جو اپنے خاص بندوں کی دعا قبول فرماتے ہیں۔ حضرت حسین بن منصورؒ کو حق تعالیٰ کے ساتھ اپنے معاملات کا علم تھا، اس لئے پورا یقین تھا کہ ان کی دعا قبول ہوگی......اور یہی بات انہوں نے اشارتاً خلیفہ مقتدر باللہ کے خادم سے کہہ دی تھی)

مختصر یہ کہ خادم نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، خلیفہ کے روبرو بیان کر دیا۔ مقتدر باللہ نے پورا واقعہ بہت غور سے سنا اور پھر اپنے خادم سے کہا۔ ''اس مردہ طوطے کو حلاج کے پاس لے جا اور ان سے کہہ کہ مقصد تو پرندے کا زندہ ہونا ہے۔ وہ جسے چاہیں اشارہ کریں۔''

خادم دوبارہ قید خانے پہنچا اور حضرت منصور حلاجؒ کے سامنے خلیفہ مقتدر باللہ کی خواہش کا اظہار کر دیا۔

''لا! پرندے کو میرے حوالے کر!'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''میں اس سے درخواست کرتا ہوں کہ اس طوطے کو زندہ کر دے۔''

خلیفہ مقتدر باللہ کے خادم نے مردہ طوطا حضرت منصور حلاجؒ کے سپرد کر دیا۔ حضرت حسین بن منصورؒ نے ایک نظر بے جان پرندے کو دیکھا۔ پھر اپنے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اسے آستین میں چھپا لیا۔

خادم بہت حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

حضرت منصور حلاجؒ زیر لب کچھ پڑھتے رہے۔ پھر آستین اٹھائی تو مردہ طوطا زندہ ہو چکا تھا۔

خادم کا چہرہ متغیر تھا اور آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ پھر وہ اسی حالت میں زندہ طوطا لے کر خلیفہ مقتدر باللہ کے پاس پہنچا۔ تھوڑی ہی دیر میں پورا قصر خلافت حضرت منصور حلاجؒ کی اس کرامت کے شور سے گونج اٹھا۔

مقتدر باللہ نے اسی وقت حامد بن عباس کو تنہائی میں طلب کر کے کہا۔ ''تو نے جس شخص کو قید خانے میں ڈال رکھا ہے، آج اس نے شہزادہ ابوالعباس کے مردہ طوطے کو زندہ کر دیا۔''

یہ سن کر حامد بن عباس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ پہلے تو ابن قشوری اور شاہی بیگمات ہی حلاجؒ کے زیر اثر تھیں، اب خلیفہ بھی حسین بن منصورؒ کے روحانی کمالات کا قائل ہو گیا تھا۔ حامد بن عباس کو اپنی بچھائی ہوئی بساط الٹتی نظر آئی تو وہ خوشامدانہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔

''امیر المومنین! اس شخص کو قتل کر دینا ہی مناسب ہے ورنہ لوگ اس کی وجہ سے فتنے میں پڑ جائیں گے۔''

حامد بن عباس لہجہ بدل بدل کر، بہت دیر تک مقتدر باللہ کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر عباسی خلیفہ نے حضرت منصور حلاجؒ کے قتل میں سکوت اور توقف سے کام لیا۔

عریب بن سعد قرطبی کی روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ طوطے کو زندہ کرنے کا واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب حضرت منصور حلاجؒ کا مقدمہ زیر سماعت تھا اور قاضی ابو عمر نے ان کے قتل کا فتویٰ صادر نہیں کیا تھا۔

☆☆........☆☆........☆☆

اگرچہ شرعی عدالت کی طرف سے حضرت منصور حلاجؒ کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا لیکن ابھی خلیفہ مقتدر باللہ کے سامنے مذکورہ فتویٰ پیش نہیں کیا گیا تھا۔ حامد بن عباس جانتا تھا کہ خلیفہ بھی حلاجؒ کے زیر اثر ہے، اس لئے وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ اسی دوران قید خانے میں ایک اور عجیب

واقعہ پیش آیا جس نے حامد بن عباس کے ہوش اڑا دیئے۔

ایک رات حضرت حسین بن منصورؒ اپنے کمرے سے نکلے اور زنداں کے اس گوشے کی طرف چلے گئے، جہاں تین سو آدمی تھے۔ واضح رہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کو ایک علیحدہ کمرے میں قید کیا گیا تھا جس کے دروازے پر ہمیشہ ایک بھاری تالا پڑا رہتا تھا۔ اس وقت بھی دروازہ مقفل تھا مگر حضرت حسین بن منصورؒ کمرے سے نکل گئے۔ ان کے کمزور پیروں میں تیرہ بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دوسرے قیدیوں نے بیڑیوں کی آواز سنی تو چونک کر دیکھا۔ حضرت منصور حلاجؒ ان کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ ہر قیدی نے اپنی جگہ حیرت سے سوچا کہ اتنی بندشوں کے باوجود منصورؒ یہاں کیسے آ گئے؟

''کیا تم لوگ اس قید سے آزاد ہونا چاہتے ہو؟'' حضرت منصور حلاجؒ نے قیدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

تمام اسیروں نے شدید استعجاب کے عالم میں اس شخص کی طرف دیکھا جو خود پابہ زنجیر تھا مگر دوسرے قیدیوں سے ان کی رہائی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

''دیکھو! میری اس پیشکش سے فائدہ اٹھاؤ ورنہ وقت تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے قیدیوں کو ورطۂ حیرت میں غرق دیکھ کر فرمایا۔

''ہم تو آزاد ہونا چاہتے ہیں مگر تم ہمیں اس قید سے کس طرح رہائی دلاؤ گے؟'' ایک قیدی نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔ تم صرف اپنی خواہش بیان کرو۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

''تم تو خود ہی ہماری طرح قید میں ہو۔ پہلے اپنے آپ کو تو آزاد کرا لو۔'' دوسرے قیدی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''میں اللہ کی قید میں ہوں اور شریعت کا پاس کرتا ہوں۔ اس لئے خود کو رہا نہیں کر سکتا۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

قیدی ایک مرد خدا کی بات سمجھنے سے قاصر تھے۔ حضرت منور حلاجؒ ان لوگوں کو متعجب پا کر دوبارہ گویا ہوئے۔ ''اگر میں چاہوں تو ایک اشارے سے تم سب کی بیڑیاں کھول دوں۔'' یہ کہہ کر حضرت منصور حلاجؒ نے اپنی انگلی کا اشارہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے تمام اسیران زنداں کی بیڑیاں ان کے پیروں سے الگ ہو گئیں۔

قیدیوں پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ چند لمحوں تک وہ سکتے کے سے عالم میں رہے۔ پھر ان کے حواس بحال ہوئے تو کہنے لگے۔ ''بے شک! ہمارے جسم زنجیروں کے بوجھ سے آزاد ہیں مگر ہم باہر کیسے جائیں کہ قید خانے کا دروازہ بند ہے؟''

''میں حصار زنداں میں تمہارے لئے دوسرا دروازہ بنائے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر حضرت منصور حلاجؒ نے اشارہ کیا اور دیوار شق ہو گئی۔ ''بس اب تم لوگ چلے جاؤ۔ کوئی چیز تمہارے راستے میں حائل نہیں ہے۔''

قیدی دم بخود بھی تھے اور حضرت منصور حلاجؒ کے شکر گزار بھی۔ ''آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟'' اسیروں نے اس شخص سے درخواست کی جس کے اپنے پیروں میں بیڑیاں موجود تھیں مگر وہ دوسروں کی آزادی کیلئے راستہ ہموار کر چکا تھا۔

''میں تمہارا ہم سفر نہیں ہو سکتا۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے بے نیازانہ فرمایا۔

''کیوں؟'' تین سو قیدیوں کا قافلہ جو کچھ دیر بعد کھلی فضاؤں میں قدم رکھنے والا تھا، اپنے نجات دہندہ کا انکار سن کر اداس ہو گیا۔

''یہ ایک راز ہے جسے تم لوگ نہیں سمجھ سکتے۔'' حضرت حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔ ''جلدی کرو اور اس مہلت کو غنیمت جانو۔''

قیدی ایک ایک کر کے دیوار میں نمایاں ہونے والے شگاف سے گزرنے لگے۔ اسیروں نے اس راز کو جاننے کی کوشش کی تو حضرت منصور حلاج نے فرمایا۔ ''ہمارا اللہ کے ساتھ ایک راز ہے جسے سولی پر چڑھے بغیر فاش نہیں کیا جا سکتا۔''

بے چارے قیدی کیا سمجھتے کہ منصور حلاجؒ کون ہیں اور وہ راز کیا ہے جو فراز دار سے گزرے بغیر کہا نہیں جا سکتا۔

جب تمام قیدی حصار زنداں سے نکل گئے تو حضرت حسین بن منصورؒ اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔

دوسرے دن صبح کو قید خانے کا محافظ آیا تو یہ دیکھ کر بدحواس ہو گیا کہ وہاں ایک بھی قیدی موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں پر برسنے لگا...... مگر ماتحت کیا جواب دیتے۔ دروازوں پر قفل موجود تھے۔ انہیں زمین کھا گئی یا پھر وہ فضا میں تحلیل ہو گئے تھے۔ زنداں کے محافظ نے زیادہ ہنگامہ آرائی کی تو حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

''ان مجبوروں پر کیوں بگڑتے ہو؟ وہ بے چارے بے قصور ہیں۔''

''پھر قصوروار کون ہے؟'' داروغۂ زنداں نے اس قیدی سے پوچھا جو حکومت وقت کا معتوب تھا۔

''ہم نے ان قیدیوں کو آزاد کر دیا۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

قید خانے کا محافظ خوف زدہ ہو گیا۔ کچھ دن پہلے اسی طرح حضرت منصور حلاجؒ کا ایک مرید بھی زنداں میں داخل ہوا تھا اور اپنے مرشد سے ملاقات کر کے واپس چلا گیا تھا۔

''جب ان قیدیوں کو آزاد کر دیا تو خود یہاں کیوں رہ گئے؟'' داروغۂ زنداں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''مجھ پر حق تعالیٰ کا عتاب ہے اور میں اس وقت تک نہیں جا سکتا جب تک عتاب پورا نہ ہو جائے۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''محبوب کے عتاب سے بھاگنا عشق کے خلاف ہے۔''

مشہور فارسی شاعر نے حضرت منصور حلاجؒ کے عشق کی اس کیفیت کو اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

نو شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(یہ دشمن کا نصیب کہاں کہ وہ تیری شمشیر سے ہلاک ہو جائے۔ تیری خنجر آزمائی کیلئے تو تیرے دوستوں ہی کا سر سلامت ہے)

☆☆..........☆☆..........☆☆

اسی انداز کا ایک واقعہ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابو عبداللہ خفیفؒ کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ حضرت شیخؒ کا مختصر تعارف یہ ہے کہ آپ اپنے زمانے میں شریعت اور طریقت کے امام تھے۔ نامور صوفی حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کے بقول حضرت ابو عبداللہ خفیفؒ یکتائے روزگار صوفی تھے۔ آپ کے بعد فارس میں ایسا کوئی دوسرا شیخ پیدا نہیں ہوا۔ حضرت عبداللہ خفیفؒ کا تعلق شاہی خاندان سے تھا مگر آپ بیس سال تک ٹاٹ کا لباس استعمال کرتے رہے۔ آپ نے بہت سے مشائخ سے فیض روحانی حاصل کیا۔ حضرت عبداللہ خفیفؒ کا معمول تھا کہ ایک رکعت میں دس ہزار مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھا کرتے تھے اور پورے سال میں چار چلے کھینچا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کا انتقال بھی چلے کے دوران ہی ہوا تھا۔ آپ کو ''خفیف'' کا خطاب اس لئے دیا گیا تھا کہ افطار میں سات منقوں کے سوا کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک بار ضعف و نقاہت کی وجہ سے آپ کے خادم نے سات کے بجائے آٹھ منقے پیش کر دیئے۔ حضرت عبداللہ خفیفؒ نے شمار کئے بغیر آٹھوں منقے کھا لئے مگر اس رات آپ کو عبادت میں وہ کیف حاصل نہیں ہوا جو اس سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ پھر جب آپ کو صحیح واقعے کا علم ہوا تو اس خادم کو برطرف کر کے دوسرا خادم رکھ لیا۔

حضرت عبداللہ خفیفؒ کا بیان ہے کہ میں ایک دن حضرت منصور حلاجؒ سے ملاقات کیلئے قید خانے پہنچا۔ نماز کا وقت آیا تو میں نے دیکھا کہ ان کے کھڑے ہوتے ہی ساری بیڑیاں خود بخود کھل کر گر پڑیں۔ حلاجؒ نے قید خانے کے کنارے پر وضو کیا۔ اگلے حصے میں ایک رومال لٹکا ہوا تھا جو حسین بن منصورؒ سے بہت دور تھا۔ خدا کی قسم! میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ رومال خود ان کے پاس آ گیا یا وہ رومال کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے تو بس اتنا دیکھا کہ رومال ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسی جگہ بیٹھے ہوئے جہاں وضو کیا تھا۔ ابھی میں حیرت میں مبتلا تھا کہ اچانک حسین بن منصورؒ پر شدید رقت طاری ہو گئی۔ انہیں روتا دیکھ کر، میں ان کے قریب پہنچا اور کہنے لگا۔

''حسین! تم اپنے آپ کو اس قید سے رہا کیوں نہیں کرا لیتے؟''

(حضرت عبداللہ بن خفیفؒ کا مطلب یہ تھا کہ جس بات کی وجہ سے قید کئے گئے ہو، اس سے رجوع کر لو، آزاد کر دیئے جاؤ گے)

میری بات سن کر حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔ ''ابو عبداللہ! میں قید نہیں ہوں اور نہ قید کی تکلیف سے رو رہا ہوں۔ تم بتاؤ کہ کہاں جانا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''میری خواہش ہے کہ میں کچھ دیر کیلئے نیشاپور ہو آؤں۔''

حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔ ''ابوعبداللہ! اپنی آنکھیں بند کرلو۔''

میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ چند لمحوں بعد مجھ سے کہا گیا۔ ''ابوعبداللہ! آنکھیں کھول دو۔''

میں نے حسین بن منصورؒ کے کہنے پر آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو نیشاپور کے اسی محلے میں جہاں جانے کا ارادہ کیا تھا حالانکہ میں نے انہیں محلے کا نام نہیں بتایا تھا۔

''اب کیا چاہتے ہو؟'' حسین بن منصورؒ نے پوچھا۔ وہ نیشاپور میں میرے ساتھ موجود تھے۔

میں نے کہا۔ ''مجھے اسی جگہ پہنچادیں جہاں سے آیا تھا۔''

حسین بن منصورؒ نے دوبارہ آنکھیں بند کرنے کیلئے کہا۔ پھر جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں قید خانے میں تھا۔

مجھے حیران دیکھ کر حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔

''خدا کی قسم! اگر عشاق اس بات پر قسم کھائیں کہ وہ عشق کی وجہ سے مردہ یا مقتول ہیں تو وہ اپنی قسم کو توڑنے والے نہیں ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو وصال کے بعد ہجر میں مبتلا ہوں تو مر جاتے ہیں ...... اور اس کے بعد پھر وصال سے کامیاب ہوجائیں تو جی اٹھتے ہیں، تم عشاق کو منزل محبوب میں بچھڑا ہوا دیکھو گے جیسے ''اصحاب کہف'' بچھڑے ہوئے پڑے تھے کہ ان کو بیداری کے بعد یہ بھی خبر نہیں تھی کہ کتنی مدت تک سوتے رہے؟

یہ ہے حضرت منصور حلاجؒ کے بارے میں اس عظیم صوفی کا بیان جس کے علم و فضل اور روحانی عظمت پر اس دور کے تمام مشائخ اور علماء متفق تھے۔

ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ تقریباً 9 سال تک وزیر حامد بن عباس کی قید میں رہے۔ اسیری کے دوران حضرت منصور حلاجؒ کا ایک مرید اپنے مرشد سے ملاقات کرنے کیلئے اس طرح قید خانے پہنچا کہ در زنداں بند تھا اور چاروں طرف سخت پہرے موجود تھے۔ یہ حضرت حسین بن منصورؒ کی بڑی کرامت تھی، جس سے اشارہ ملتا ہے کہ جب وہ اپنے ایک ادنیٰ شاگرد کو ہزار پابندیوں سے گزار کر اپنے آپ تک بلا سکتے ہیں تو خود بھی قید خانے سے باہر جانے کی طاقت رکھتے تھے۔

دوسری بار تین سو قیدیوں کو رہا کردیا اور زنداں کے محافظ ان کو اس ارادے سے باز نہ رکھ سکے۔ جسے بحکم خدا اسیروں کی اتنی بڑی تعداد کو رہائی دلانے پر قدرت حاصل ہو، وہ خود حکومت کی بنائی ہوئی چار دیواری میں کس طرح مقید رہ سکتا تھا؟

ان تمام واقعات سے بڑھ کر حضرت شیخ ابوعبداللہ بن خفیفؒ کی گواہی موجود ہے کہ ان جیسے بزرگ کو حضرت منصور حلاجؒ نے چشم زدن میں نیشاپور پہنچا دیا تھا اور اسی طرح دوبارہ قید خانے میں واپس لے آئے تھے۔ ان تمام روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کیلئے حامد بن عباس کی قائم کردہ قید و بند کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ جب چاہتے حصار زنداں سے چلے جاتے اور انہیں روکنے والا کوئی نہ ہوتا۔ عام ذہنوں میں یہ سوال اُبھر سکتا ہے کہ پھر حضرت منصور حلاجؒ قید خانے سے چلے کیوں نہیں گئے ...... اور طویل عرصے تک یہ مظالم کیوں برداشت کرتے رہے؟

اس سوال کا جواب زنداں کے محافظ کو اس طرح دیا گیا تھا۔ ''ہم اللہ کے قیدی ہیں اور اپنے محبوب کے زیر عتاب ہیں۔ جب تک وہ عتاب پورا نہیں ہوجاتا، اس وقت تک ہم کہیں نہیں جاسکتے ...... کیونکہ محبوب کے عتاب سے بھاگنا محبت و عاشقی کے خلاف ہے۔''

ایک موقع پر فرمایا تھا۔ ''ہمارے اور اللہ کے درمیان ایک راز ہے جو سولی پر چڑھے بغیر نہیں کہا جاسکتا۔''

ایک بار جب حضرت ابوعبداللہ بن خفیفؒ نے پوچھا تھا کہ آپ خود کو آزاد کیوں نہیں کرا لیتے، تو فرمایا تھا کہ ہم قید کب ہیں؟ اور پھر دوسرے ہی لمحے حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے دعوے کا ثبوت بھی فراہم کردیا تھا۔

ان تمام واقعات کا گہرائی سے مشاہدہ کرنے کے بعد پورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ عام صوفی نہیں تھے۔ جو اپنی روحانی طاقت کے ذریعے حصار زنداں سے نکل کر کہیں دور چلے جاتے۔ وہ ایک بہت ہی خاص قیدی تھے ...... اور بہت ہی خاص مسئلے پر قید ہوئے تھے۔ ہنگامۂ دار برپا ہونا ان کے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا۔ اس لئے وہ مشیت الٰہی سے کس طرح گریز اختیار کرتے اور قدرت کی کھینچی ہوئی چار دیواری سے نکل کر کہاں جاتے؟ حضرت منصور حلاجؒ کو معلوم تھا کہ ایک دن وہ اپنے ہی خون میں نہائیں گے تو امر الٰہی سے بچنے کی تدبیر کیوں کرتے اور حکام کے سامنے حرف معذرت اپنی زبان پر کیوں لاتے؟ وہ اپنے عشق میں سچے تھے، اس لئے پوری توانائی کے ساتھ عشق کے مرحلے طے کرتے رہے۔ مخالفین کا کام الزام عائد کرنا تھا ...... اور حضرت منصور حلاجؒ کا کام اپنے کام سے کام رکھنا۔ شرعی عدالت سوال کرتی رہی اور حضرت حسین بن منصورؒ صاف صاف جواب دیتے رہے کہ وہ نہ خدا ہیں نہ مہدی ہونے کے دعویدار۔ وہ صرف ایک عاجز اور گناہ گار بندے ہیں ...... اور اللہ کی وحدانیت، خاتم النبیین سرور کونین ﷺ کی رسالت اور خدا کے اصحاب عشرۂ مبشرہ کی فضیلت کے قائل ہیں۔ (عشرۂ مبشرہ ان دس صحابۂ کرامؓ کو کہا جاتا ہے جنہیں ان کی زندگی میں جنت کی بشارت مل چکی تھی۔)

الغرض حضرت منصور حلاجؒ نے اپنی صفائی پیش کردی اور علمائے بغداد نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ حضرت حسین بن منصورؒ کہتے رہے کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں مگر فقہا کی مہریں اعلان کرتی رہیں کہ یہ شخص واجب القتل ہے۔

☆☆..............☆☆..............☆☆

قتل کے فتوے پر قاضی ابوعمر اور دیگر علماء کے دستخط ہوجانے کے بعد حامد بن عباس موقع کی تلاش میں رہا۔ وہ نہایت عیار انسان تھا۔ اس نے براہ راست خلیفہ مقتدر باللہ کو یہ خبر نہیں دی کہ اس کی 9 سالہ کوششیں بار آور ثابت ہوئیں بلکہ دستخط شدہ کاغذ اپنے ایک درباری مصاحب زنجی کے حوالے کردیا۔

''اسے امیر المومنین کی خدمت میں اس طرح پیش کرنا کہ تاخیر کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔'' حامد

بن عباس نے زنجی کو ہدایت کی۔ ''جب تک حلاجؒ قتل نہیں ہو جاتا، اس وقت تک میں چین سے نہیں رہ سکوں گا۔''

''آپ مطمئن رہیں۔'' زنجی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''مملکت کا ضروری سے ضروری معاملہ بھی التواء میں ڈال دیا جائے گا۔ امیرالمومنین پوری شدت کے ساتھ اس حقیقت کو محسوس کریں گے کہ حکومت کے سامنے قتل منصور کے سوا کوئی دوسرا مسئلہ ہی نہیں ہے۔''

بظاہر حامد بن عباس زنجی کی چرب زبانی سے مطمئن ہو گیا تھا مگر حقیقتہً وہ بہت مضطرب تھا۔ اسے ہر وقت ایک ہی فکر بے قرار رکھتی تھی کہ کہیں حلاجؒ اپنی شعبدہ بازی اور جادوگری سے کام لے کر قید خانے سے فرار نہ ہو جائیں...... اور اس کی تمام محنت اکارت چلی جائے۔ (واضح رہے کہ حامد بن عباس حضرت حسین بن منصورؒ کی گرفتاری اور پھر ان کے قتل کو اپنا ایک عظیم الشان کارنامہ سمجھتا تھا)

زنجی نے دوسرے ہی دن خلیفہ مقتدر باللہ کے نام دو خط تحریر کئے اور ان خطوط کے درمیان حضرت منصورؒ کے قتل کا فتویٰ رکھ کر وہ لفافہ امیرالمومنین کی خدمت میں بھیج دیا۔ پھر اس نے حامد بن عباس کی خلوت میں پہنچ کر یہ خوشخبری سنائی۔

''میں نے امیرالمومنین کو معاملے کی نزاکت اور شدت سے باخبر کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شام تک آپ کی مرضی کے مطابق جواب آ جائے گا۔''

حامد بن عباس زنجی کی اس اطلاع سے بہت خوش ہوا مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔

پھر جب دو دن تک خلیفہ مقتدر باللہ کی طرف سے زنجی کی عرضداشت کا کوئی جواب نہیں آیا تو حامد بن عباس کے ہوش اڑ گئے۔ ایک رات تو اس نے اس طرح گزاری کہ تھوڑی دیر کیلئے اس کی آنکھ لگ جاتی تھی اور پھر وہ گھبرا کر اٹھ جاتا تھا...... مگر دوسری رات تو حامد بن عباس کی وحشت کا یہ عالم تھا کہ ایک لمحے کیلئے اس کی پلکیں تک نہ جھپک سکیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی زندگی کی آخری رات ہو اور صبح ہوتے ہی حضرت منصور حلاجؒ کی جگہ خود اسے دار پر کھینچ دیا جائے گا۔

حامد بن عباس کی بدحواسی کے دو بنیادی اسباب تھے۔ ایک یہ کہ اگر خلیفہ مقتدر باللہ فتوے کی توثیق نہ کرتا تو حکومتی سطح پر اس کی ساری عزت خاک میں مل کر رہ جاتی۔ وہ جس کھیل کا آغاز کر چکا تھا، اسے انجام تک پہنچانا ضروری تھا...... ورنہ وہ خلافت کا نہیں، علمائے وقت اور معززین شہر کا بھی معتوب بن جاتا۔ اس لئے قتل منصورؒ ہی حامد بن عباس کے اقتدار کا ضامن تھا۔

دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ مجلس علماء کے فیصلے کی خبر اڑتے اڑتے عوام تک پہنچ گئی تھی اور اہل بغداد کی بڑی تعداد حامد بن عباس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ بعض مؤرخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اسے اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے حضرت منصور حلاجؒ کی فوری موت ہی میں حامد بن عباس کی بقا تھی...... مگر جب خلیفہ مقتدر باللہ کی طرف سے دو دن تک کوئی جواب نہیں آیا تو وہ زنجی پر برہم ہو گیا۔

''یہ تو نے امیرالمومنین کو کیسا خط لکھا ہے کہ انہوں نے اتنے بڑے مسئلے پر غور کرنا بھی گوارہ نہیں کیا۔''

''میں نے معاملے کی سنگینی کو ظاہر کرنے کیلئے بہترین الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔'' حامد بن عباس کو غضب ناک پا کر زنجی بھی پریشان نظر آ رہا تھا۔ ''اب میں کیا کروں کہ امیرالمومنین نے میری دونوں درخواستوں کو لائق اعتنا نہیں سمجھا۔''

حامد بن عباس کچھ دیر تک غور کرتا رہا۔ پھر زنجی کو مخاطب کر کے بولا۔ ''جس طرح میں کہتا ہوں، اس طرح تحریر کر!''

زنجی اپنی جان چھڑانے کیلئے اسی وقت کاغذ اور قلم لے کر تیار ہو گیا۔

پھر حامد بن عباس نے خلیفہ مقتدر باللہ کے نام ایک اور خط لکھایا جس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

''امیرالمومنین! میں نے ایک بہی خواہ کی حیثیت سے خدمت عالیہ میں عرض کر دیا تھا کہ منصور حلاجؒ کا معاملہ عام نوعیت کا نہیں کہ اسے نظرانداز کر دیا جائے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے، صورتحال انتہائی نازک ہوتی جا رہی ہے۔ علماء کی مجلس میں حلاجؒ کے متعلق جو کچھ طے کیا گیا ہے، بغداد کے عوام اس سے باخبر ہو چکے ہیں۔ اب اگر حلاجؒ کو قتل نہیں کیا گیا تو لوگ بہت بڑے فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے...... اور پھر اس سے اختلاف کرنے والے دو آدمی بھی باقی نہیں رہیں گے۔'' اس بات سے حامد بن عباس کا مطلب یہ تھا کہ پورا بغداد حضرت حسین بن منصورؒ کا ہم نوا ہو جائے گا۔ پھر حکومت اس حیثیت میں نہیں رہے گی کہ آسانی کے ساتھ اپنے احکام پر عمل کرا سکے...... اور اگر بالفرض جبر سے کام لیا گیا تو عوام سلطنت عباسیہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

عیاروں اور سازشیوں کا ہمیشہ ایک ہی طریقہ رہا ہے کہ جب وہ کسی مقبول ہستی کو معتوب بنانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے یہی کہہ کر حکمران کے کان بھرتے ہیں کہ فلاں شخص کی موجودگی سے حاکم کے اقتدار کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ چنانچہ حامد بن عباس نے حضرت منصور حلاجؒ کے سلسلے میں بھی اسی حکمت عملی سے کام لیا۔ اگر کوئی عوام کے غیظ و غضب کا نشانہ بنتا تو وہ حامد بن عباس ہوتا...... مقتدر باللہ کو رعایا کی نفرت کا سامنا نہیں تھا...... مگر حامد بن عباس نے چال ہی ایسی چلی تھی کہ عباسی خلیفہ مجبور ہو گیا۔

حامد بن عباس کی عیاری کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے زنجی کو آلہ کار بنایا۔ اگر وہ چاہتا تو خود بھی مقتدر باللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر صورتحال بیان کر سکتا تھا...... مگر حامد بن عباس فطرتاً ایک شاطر انسان تھا۔ مقتدر باللہ کو لکھے جانے والے آخری خط میں الفاظ اس کے تھے لیکن قلم ایک دوسرے درباری کا۔ جھوٹا افسانہ حامد بن عباس کا تراشا ہوا تھا مگر تحریر زنجی کی تھی۔ ایک اسی واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت منصور حلاجؒ کے سلسلے میں کیسی کیسی چالیں چل رہا تھا۔

پھر اس کے شاطرانہ ذہن نے ایک اور کروٹ لی۔ زنجی سے خط تحریر کرایا اور دوسرے درباری مفلح کو قاصد بنایا۔ شاید اسے زنجی پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ الغرض مفلح فوری طور پر وہ خط لے کر مقتدر باللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

عباسی خلیفہ نے خط ایک طرف رکھ دیا اور دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

حامد بن عباس نے مفلح کو سختی سے تاکید کی تھی کہ امیر المومنین اپنی عدیم الفرصتی کا کوئی بھی مظاہرہ کریں، اسے ہر حال میں خط کا جواب چاہئے۔ مفلح نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر انتہائی پر جوش انداز میں صورتحال کی عکاسی کی اور بہت زیادہ مبالغے سے کام لیا۔ نتیجتاً مقتدر باللہ نے زنجی کا تحریر کردہ خط پڑھا اور اسی وقت حکم جاری کر دیا۔ حکم نامے کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

"جب قاضی القضاۃ اور علمائے بغداد نے حلاجؒ کے قتل کا فتویٰ دیدیا ہے تو پھر اسے محمد بن عبدالصمد کوتوال کے حوالے کر دیا جائے۔ کوتوال کی نگرانی میں حلاج کے ایک ہزار تازیانے لگائے جائیں اگر وہ اس سزا کے نتیجے میں مر جائے تو بہتر ہے ورنہ گردن ماردی جائے۔"

حضرت منصور حلاجؒ کے سلسلے میں جہاں دوسرے لوگوں نے اذیت ناک مذاق کئے ہیں وہاں تاریخ نویسوں نے بھی قتل منصورؒ کو ایک تکلیف دہ افسانہ بنا دیا ہے۔ مقتدر باللہ کے حکم کی تشریح کرتے ہوئے بعض مورخین نے لکھا ہے کہ عباسی خلیفہ نے حضرت منصورؒ کے بارے میں توقف اختیار کیا تھا اور سارا بوجھ قاضی ابو عمر اور دیگر علمائے بغداد پر ڈال دیا تھا۔ چلئے! ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ مقتدر باللہ دل سے نہیں چاہتا تھا کہ منصور حلاجؒ قتل کئے جائیں۔ وہ شرعی عدالت کے بار گراں سے جھک گیا تھا اس لئے اس نے حضرت منصورؒ کی موت پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی تھی......مگر ذرا مقتدر باللہ کا حکم ملاحظہ کیجئے کہ پہلے حلاجؒ کے ایک ہزار تازیانے مارے جائیں......اور اگر وہ اس سزا کو برداشت کر جائے تو اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ واقعتاً اگر مقتدر باللہ حضرت منصور حلاجؒ کیلئے اپنے دل میں برائے نام بھی نرم گوشہ رکھتا ہوتا تو براہ راست انہیں قتل کر دینے کا حکم جاری کرتا۔ یہ ایک ہزار تازیانوں کی سزا کس حساب میں تھی؟ کیا اس زمانے میں تازیانے گلاب کے پھولوں سے بنائے جاتے تھے؟ بات بالکل واضح ہے کہ مقتدر باللہ بھی حضرت منصور حلاجؒ سے ناراض تھا......اور اپنی اسی ناراضی کا اظہار کرنے کیلئے اس نے ایک ہزار کوڑوں کی سزا تجویز کی تھی تاکہ حضرت حسین بن منصورؒ شدید اذیتیں دے دے کر اور تڑپا تڑپا کر مارا جائے۔ اگر بالفرض ایسا نہیں تھا تو ہمارے مورخین نے بیشتر واقعات تحریر کرتے وقت غلط بیانیوں اور قیاس آرائیوں سے کام لیا ہے۔

پھر جب حامد بن عباس نے خلیفہ مقتدر باللہ کا حکم نامہ دیکھا تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ 9 سال تک اس نے جس پیچ و تاب کے ساتھ اپنے دن رات گزارے تھے، آج دربار خلافت سے اس خلش اور اضطراب کا صلہ مل گیا تھا۔ حامد بن عباس کو سر منصورؒ کی ضرورت تھی اور مقتدر باللہ کی عو اختیار نے اسے حلاجؒ کے سلسلے میں مکمل طور پر با اختیار بنا دیا تھا۔

☆☆..............☆☆..............☆☆

اس سے پہلے کہ ہم ایک صوفی جانباز اور ایک عاشق جاں سوختہ کی داستان حیات کا آخری باب رقم کریں، ضروری ہے کہ ایک اور تاریخی روایت بھی پیش کر دیں۔ جس سے قارئین کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس مقدمے میں کس قدر جھوٹی گواہیاں پیش کی گئی ہیں اور مورخین نے ایک صحیح العقیدہ مسلمان کو

زندیق، کافر اور خدائی دعویدار ثابت کرنے کیلئے کیسی مہمل روایات کا انبار لگایا ہے۔

پاکستان کے ایک مشہور اشاعتی ادارے نے 1981ء میں ایک کتاب "حسین بن منصور حلاجؒ" شائع کی تھی۔ مذکورہ کتاب میں ایک مضمون "منصور حلاجؒ" کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے جس کے مصنف مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ ہیں اور مترجم خواجہ عبدالحمید یزدانی۔ اسی کتاب کے صفحہ 12 پر یہ عبارت درج ہے جسے ہم حرف بہ حرف نقل کر رہے ہیں۔

"بغداد میں منصور حلاجؒ نے جنیدؒ کی قربت و صحبت اختیار کی۔ جنیدؒ نے اسے خلوت اور سکوت کی تلقین فرمائی۔ کچھ عرصے تک اس کی صحبت میں صبر اختیار کئے رکھا اور آخر وہاں سے حجاز پہنچا۔ جہاں ایک برس تک مجاور رہا۔ یہاں سے دوبارہ بغداد آیا اور چند صوفی حضرات کے ساتھ جنیدؒ کی خدمت میں پہنچا۔ ان سے کچھ مسائل پوچھے۔ جنیدؒ نے جواب نہ دیا۔ بس اتنا کہا۔

"جلد ہی لکڑی کے ٹکڑے کو سرخ کر دو گے۔" (اس کا مفہوم یہ ہے کہ بہت جلد قتل کئے جاؤ گے)

تمام معتبر تاریخوں میں یہ واقعہ موجود ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے شاگرد منصور حلاجؒ کا سوال سن کر سکوت اختیار کیا تھا۔ پھر جب حاضرین نے حضرت جنید بغدادیؒ سے خاموشی کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ منصورؒ اس مسئلے میں سائل نہیں، مدعی بن کر آئے تھے۔ کسی مستند تاریخ میں یہ بات درج نہیں کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے حضرت حسین بن منصور کے قتل کی پیش گوئی کی تھی۔ اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ تک یہ روایت کس طرح پہنچی؟ میرا ذاتی خیال ہے کہ جس طرح حضرت امام حسن بصریؒ کی کتاب میں کسی فتنہ گر نے حج کا مضمون اپنی طرف سے شامل کر دیا تھا اور پھر وہی مضمون نقل کرنے پر حضرت منصورؒ کے قتل کا فتویٰ دیا گیا تھا......اسی طرح حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کے مضمون میں بھی اضافہ کیا گیا ہوگا تاکہ حضرت منصور حلاجؒ کی داستان حیات میں زیادہ سے زیادہ رنگ آمیزی کی جا سکے۔

اس مضمون کی باقی عبارت حسب ذیل ہے۔

جواب میں منصورؒ نے کہا۔ "جس روز میں سر چوب پارہ (لکڑی کا ٹکڑا) سرخ کروں گا، اس روز تو اہل ظاہر کا لباس پہنے گا۔ چنانچہ جس دن آئمہ نے فتویٰ دیا کہ حسین کو قتل کر دینا چاہئے، جنیدؒ اس دن جامۂ تصوف پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے فتویٰ نہ لکھا۔ جبکہ خلیفہ کا فرمان یہ تھا کہ تحریر جنیدؒ کی ہو۔ نتیجتاً جنیدؒ نے دستار اور جبہ پہنا اور مدرسے پہنچے۔ جہاں انہوں نے فتویٰ لکھا۔

"ظاہری حال کے مطابق وہ گردن زنی ہے اور فتویٰ ظاہر پر ہے۔ باطن کا حال اللہ جانے۔"

اس سے قطع نظر کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے حضرت منصور حلاجؒ کے قتل کی پیش گوئی کی تھی یا نہیں، یہ بات تاریخ کے ایک معمولی طالب علم کو بھی حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے حضرت منصور حلاجؒ کے قتل کا فتویٰ اپنے قلم سے تحریر کیا تھا۔ حضرت حسین بن منصورؒ کے قتل کا فتویٰ 310ھ میں دیا گیا تھا اور حضرت جنید بغدادیؒ 297ھ میں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ پہلی بار 301ھ میں قید ہوئے۔ اس وقت بھی حضرت جنیدؒ اس

عالم فانی میں موجود نہیں تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ کی شہادت کا واقعہ آپ کے وصال کے 9 برس بعد پیش آیا۔

تاریخی حقائق کی روشنی میں اب دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کو مغالطہ ہوا اور انہوں نے اپنے مضمون میں ایک ایسی روایت نقل کر دی جس کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا...... حضرت شیخ عطارؒ ایک عالم و فاضل صوفی تھے۔ اس لئے ان سے اس قسم کی غلطی سرزد ہونا امر محال ہے۔ زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ حضرت شیخ عطارؒ کے مضمون میں اضافہ کر دیا گیا تھا تا کہ ایک طرف عام مسلمانوں کے ذہن الجھ جائیں اور دوسری طرف حضرت جنید بغدادیؒ جیسے امام شریعت وطریقت کو بھی قتل منصورؒ کے المناک واقعے میں ملوث کر دیا جائے۔ جب فتنہ پردازوں نے آسمانی کتابوں میں تحریف کر دی، بہت سی احادیث گھڑ لیں تو پھر ایک بزرگ کے مضمون میں آمیزش کر دینا کون سی مشکل بات ہے؟

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اپنی تالیف ''سیرت منصور حلاجؒ'' میں ایک مقام پر یہ واقعہ درج کیا ہے۔ ''علامہ عبدالوہاب شیرانی اپنی کتابوں میں جابجا لکھتے ہیں کہ لوگوں نے میری زندگی میں میری کتابوں کے اندر الحاق کر دیا تھا جس کی مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ جب علماء نے میرے خلاف فتوے لکھے اس وقت مجھے خبر ہوگئی۔ پھر میں نے اپنا اصلی نسخہ ان کے پاس بھیجا تو فتنہ فرو ہوا۔''

جب ایک عالم کی زندگی میں مفسدین کی شرارت کا یہ عالم ہو تو پھر حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ جیسے لوگوں کی فتنہ پردازیوں سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں جنہیں اس دنیا سے گزرے ہوئے تقریباً آٹھ سو سال ہو چکے ہیں۔ میرے پاس حضرت شیخ عطارؒ کی مشہور تصنیف ''تذکرۃ الاولیا'' کا وہ نسخہ موجود ہے جو جنوری 1973ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اسے مولانا زبیر افضل عثمانی نے مرتب کیا ہے۔ میں نے حضرت منصور حلاجؒ کے سلسلے میں تحریر کردہ مضمون کا ایک ایک حرف پڑھ ڈالا مگر اس نسخے میں قتل منصورؒ سے متعلق حضرت جنید بغدادیؒ کی پیش گوئی اور فتویٰ لکھنے کا واقعہ مذکور نہیں ہے۔ اب ان حالات میں اللہ ہی علیم وخبیر ہے کہ کس نے جھوٹ بولا ہے اور کون سچا ہے؟ اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

کوتوال محمد بن عبدالصمد اپنے سپاہیوں کے ہمراہ بہت احتیاط کے ساتھ زنداں پہنچا۔ پھر اس غلام کو اپنے پاس بلایا جو حضرت منصور حلاجؒ کی نگرانی پر مقرر تھا۔

''امیر المومنین کا حکم ہے کہ حلاج کو قید خانے سے باہر لا کر میرے حوالے کر دے۔'' محمد بن عبدالصمد نے تحکم آمیز لہجے میں غلام سے کہا۔

''اب انہیں کہیں اور منتقل کیا جا رہا ہے؟'' غلام نے کوتوال شہر سے پوچھا۔

''اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔'' محمد بن عبدالصمد نے کہا۔ ''کل صبح ہوتے ہی حلاج کو پھانسی دیدی جائے گی۔''

غلام واپس جانے لگا تو کوتوال نے اسے سخت لہجے میں تنبیہ کی۔ ''خبردار! حلاجؒ کو اس کی خبر نہ ہو۔'' غلام نے سہمے ہوئے انداز میں اپنے سر کو جنبش دی اور واپس چلا گیا۔ پھر اس نے اس کمرے کا دروازہ کھولا جہاں حضرت منصور حلاجؒ قید تھے۔ یہ دروازہ کھلنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لئے حضرت حسین بن منصورؒ نے قدرے تعجب سے اس غلام کی طرف دیکھا۔

''باہر آؤ!'' غلام نے حضرت حلاجؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''وزیر کے پاس اس وقت کون ہے؟'' حضرت حسین بن منصورؒ نے غلام سے پوچھا۔

''محمد بن عبدالصمد کوتوال!'' غلام نے مختصر جواب دیا۔

حضرت حسین بن منصورؒ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کھڑے ہوگئے۔ اس وقت ان کے پیروں میں تیرہ بیڑیاں موجود تھیں۔ حضرت منصور حلاجؒ جسمانی طور پر بہت کمزور تھے مگر اتنی وزنی بیڑیاں پہن کر بھی آپ نہایت سبک رفتاری کے ساتھ چلتے تھے۔ غالباً یہ بھی آپ کی کرامت تھی۔ غلام کا بیان ہے کہ میری بات سنتے ہی منصور حلاجؒ کھڑے ہوگئے اور نہایت سرشاری کے لہجے میں فرمایا۔

''اللہ کی قسم! اب ہم ہلاک ہوئے۔''

پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ غلام کی روایت کے مطابق حضرت منصور حلاجؒ کو اپنی موت کا علم ہو چکا تھا مگر ان کے چہرے پر خوف و ہراس کا ہلکا سا عکس تک نہیں تھا۔ وہ بہت زیادہ مطمئن نظر آ رہے تھے بلکہ ان کا چہرہ پہلے سے زیادہ روشن و تابناک نظر آ رہا تھا۔ پھر حلاجؒ یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے۔

''میں تیرے دیدار کو حاضر ہو رہا ہوں۔''

غلام کا بیان ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نے زنداں کا طویل صحن عبور کیا اور وہ ایک ہی جملہ دہراتے رہے۔ ''میں تیرے دیدار کو حاضر ہو رہا ہوں۔''

زنداں سے باہر آکر حضرت حسین بن منصورؒ نے ایک نظر کوتوال محمد بن عبدالصمد کو دیکھا مگر خاموش رہے۔ پھر انہیں ایک خچر پر سوار کرا دیا گیا۔ وہ سائیسوں کی جماعت کے درمیان میں تھے۔ اس لئے کوئی انہیں پہچان نہیں سکتا تھا۔ آخر سپاہیوں کا یہ پراسرار قافلہ پل تک پہنچا۔ اس جگہ سے حامد بن عباس کے غلام واپس چلے گئے۔ محمد بن عبدالصمد اور اس کے سپاہی کوتوالی کے میدان میں حضرت منصور حلاجؒ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے اور ساری رات جاگتے رہے۔

بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ کوتوال رات بھر شدید اضطراب کے عالم میں ٹہلتا رہا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں حلاجؒ کے عقیدت مندوں اور پرستاروں کو اس واقعے کی خبر نہ ہوگئی ہو اور وہ جوش میں آ کر حملہ نہ کر دیں۔ یہ محض کوتوال کے وسوسے تھے ورنہ بغداد کے سکوت کا یہ عالم تھا کہ تمام شہر انتہائی سکون کے عالم میں گہری نیند سو رہا تھا۔ جاگ تو وہ رہے تھے جنہیں ایک مظلوم کو پھانسی پر چڑھانا تھا...... یا پھر وہ عاشق جاں سوختہ بیدار تھا جسے منزل دار سے گزر کر اپنے محبوب کے دیار کو حاضر ہونا تھا۔

آخر وہ پرہول اور سیاہ رات گزر گئی جو قیامت تک کیلئے ''تاریخ عشق'' کا ایک ناقابل فراموش

باب بن کر رہ گئی ہے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

پھر جب آفتاب طلوع ہوا تو وہ 24/ ذیقعدہ 309ھ منگل کا دن تھا۔ (واضح رہے کہ بعض مؤرخین نے 310ھ تحریر کیا ہے مگر دن اور تاریخ میں کوئی اختلاف نہیں) حضرت منصور حلاجؒ کو کمرے سے نکال کر قید خانے کے میدان میں لایا گیا۔ اس وقت بھی آپ کے پیروں میں بیڑیاں موجود تھیں۔ کوتوال محمد بن عبدالصمد کے سپاہیوں کا بیان ہے کہ جب حلاجؒ کمرے سے باہر آئے تو ان کے چہرے پر عجیب وغریب روشنی تھی۔ وہ مستانہ چال کے ساتھ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے۔

''پانے والے کیلئے یہی کافی ہے کہ تنہا اللہ اس کا ہے اور کوئی بے یار و مددگار نہیں۔'' (ترجمہ)

صبح ہوتے ہی یہ خبر عام ہوگئی تھی کہ حضرت منصور حلاجؒ کو پھانسی دی جانے والی ہے۔ نتیجتاً پورے بغداد میں ایک حشر سا برپا ہوگیا اور بے شمار انسان اس میدان کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے جہاں ایک عاشق جانباز کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

حضرت منصور حلاجؒ ہر خوف سے بے نیاز اور اپنے انجام سے بے پروا، جھومتے ہوئے چل رہے تھے اور یہ اشعار پڑھتے جا رہے تھے۔

''میرا ندیم (صحبت میں بیٹھنے والا) ذرا بھی ظالم نہیں۔''

''اس نے مجھے بھی ویسی ہی شراب محبت پلائی جیسی وہ خود پیتا تھا۔'' (ایک مہمان جیسا دوسرے مہمان کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے یعنی کھانے پینے کی چیزوں میں اسے اپنا شریک بناتا ہے)

''پھر جب شراب کا دور چلنے لگا اور نشہ پورا ہوگیا تو میں نشے کی وجہ سے آداب ضیافت بھول گیا۔ پھر اس نے ترک ادب پر مجھے سزا دی۔ تلوار منگائی اور مجھے چمڑے کے بستر پر بٹھا کر قتل کر دیا۔''

''اس شخص کی یہی حالت ہوتی ہے جو گرمی کے موسم میں اژدھے کے ساتھ بیٹھ کر پرانی شراب پیتا ہے۔''

(ایک تو پرانی شراب کا نشہ، دوسرے گرمی کے موسم کی تیزی اور تیسرے اژدھے کے زہر کا اثر۔ گرم دنوں میں شدت اختیار کر لیتا ہے)

بعض علمائے تحقیق نے ان اشعار کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نے قتل سے پہلے اپنے جس ندیم اور جلیس کو مخاطب کیا ہے، وہ حضرت شیخ جنید بغدادیؒ تھے۔ واضح رہے کہ جب حضرت منصور حلاجؒ حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو آپ نے انہیں خلوت اور صبر و ضبط کی تلقین فرمائی تھی مگر جب حسین بن منصورؒ سے ضبط نہ ہو سکا اور ان کی زبان سے ایسے کلمات ادا ہونے لگے جو شریعت کی نظر میں قابل گرفت تھے تو حضرت جنید بغدادیؒ نے ناخوش ہو کر حلاجؒ کو اپنے آپ سے جدا کر دیا۔ حضرت منصورؒ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان ہی کی صحبت میں رہ کر مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوئی جیسی کہ خود ان پر طاری تھی مگر وہ ضبط کرتے تھے اور مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔

اشعار پڑھنے کے بعد حضرت منصور حلاجؒ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی۔

''جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے وہ قیامت کو جلدی بلانا چاہتے ہیں اور جو اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ یقینی آنے والی ہے۔''

اس آیت کی تلاوت سے حضرت منصور حلاجؒ کا مفہوم یہ تھا کہ جو لوگ مظالم پر اصرار کر رہے ہیں وہ گویا قیامت کو جلدی بلانا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ مظالم کی کثرت بھی قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ کے قتل کئے جانے کی خبر سن کر تقریباً پورا بغداد ہی مقتل کی جانب اُمڈ آیا تھا۔ میدان میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ لوگ شاہراہوں پر جمع ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ مقتل کی طرف جانے والے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔

تذکرۃ الاولیاء میں حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کی روایت ہے کہ انسانی ہجوم میں حضرت جنید بغدادیؒ کے شاگرد خاص حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ بھی موجود تھے۔ اس وقت حضرت منصور حلاجؒ سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے آپ کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''حسین! تصوف کیا ہے؟''

حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''جو کچھ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، وہ تصوف کا ادنیٰ ترین درجہ ہے۔''

''پھر اعلیٰ ترین درجہ کون سا ہے؟'' حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے سوال کیا۔

''اس درجے سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔'' حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا اور سیڑھیوں پر چڑھ کر اس مقام تک پہنچ گئے جہاں سولی نصب کی گئی تھی۔

پھر جیسے ہی حضرت منصور حلاجؒ نے انسانی ہجوم کی طرف رخ کیا، اگلی صفوں میں کھڑے ہوئے لوگوں نے پتھر اٹھا کر مارنے شروع کر دیئے۔ واضح رہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ عوامی عتاب کا نشانہ نہیں تھے۔ سنگ باری کرنے والوں میں حامد بن عباس کے غلام اور کوتوال محمد بن عبدالصمد کے سپاہی شامل تھے۔ حکومت کے حاشیہ بردار حضرت حلاجؒ پر پتھر برسا کر خلیفۂ وقت اور دوسرے حکام کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ تذکرۃ الاولیاء کی روایت کے مطابق حضرت حسین بن منصورؒ پتھروں کی بارش سے لہولہان ہو گئے مگر آپ نے اف تک نہ کی۔

پھر حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے اتباع شریعت میں اک چھوٹی سی کنکری ماری تو حضرت منصور حلاجؒ چیخ اُٹھے۔

حضرت منصور حلاجؒ سے ہمدردی رکھنے والے لوگوں نے پوچھا۔ ''بھاری پتھروں سے پہنچنے والی اذیت پر تو آپ خاموش رہے مگر شیخ ابوبکر شبلیؒ کی پھینکی ہوئی ایک حقیری کنکری پر اس طرح چیخ اٹھے کہ مقتل میں دور تک اس کی گونج سنائی دی۔''

حضرت منصور حلاجؒ نے جواباً فرمایا۔ ”شبلی کی کنکری میرے دل پر لگی ہے، اس لئے تکلیف کی شدت سے چیختا ہوں۔“

”یہ کیسی تکلیف ہے جسے آپ ضبط نہ کرسکے؟“ لوگوں نے وضاحت طلب کی۔

حضرت حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔ ”شبلیؒ کو ان لوگوں کی تقلید نہیں کرنی چاہئے تھی کہ یہ لوگ مجھے جانتے نہیں...... مگر شبلیؒ خوب پہچانتا ہے کہ میں کون ہوں؟“

یہ واقعہ صرف حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کی تصنیف تذکرۃ الاولیاء میں ملتا ہے۔ دوسرے مؤرخین نے اس روایت سے انکار کیا ہے کہ حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ مقتل میں موجود ہی نہیں تھے، پھر وہ لوگوں کی تقلید میں حضرت منصور حلاجؒ پر کنکری کیوں مارتے؟ وہ کوئی اور بزرگ ہوں گے جن کے اس عمل پر حضرت حسین بن منصورؒ نے شدید تکلیف کا اظہار کیا تھا۔

البتہ ”صلہ طبری“ میں عریب بن سعد قرطبی نے یہ واقعہ ضرور تحریر کیا ہے کہ جب حضرت منصور حلاجؒ مقتل میں داخل ہوئے تو ایک بوڑھی خاتون فاطمہ نیشاپوریہؒ آپ کے پاس آئیں اور کہنے لگیں۔

”مجھے شبلیؒ نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسرار میں سے تمہیں ایک راز کا امین بنایا تھا مگر تم نے اس راز کو فاش کردیا جس کے نتیجے میں تمہیں لوہے کی دھار کا مزہ چکھایا گیا ہے۔“

فاطمہ نیشاپوریہؒ کی بات سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے یہ اشعار پڑھے۔

”تجھ جیسے محبوب کے معاملے میں کیا ہی اچھی بات ہے کہ پردہ ٹوٹ جائے۔“ (یعنی ایسے محبوب کی محبت میں اظہار محبت ہی مناسب ہے۔ اسے راز رکھنا مناسب نہیں)

”اور اگر لوگ مجھے ملامت کریں تو تیرے چہرۂ زیبا میں میرا عذر پوشیدہ ہے۔“ (یعنی ایسے چہرے کا عاشق کس طرح ضبط کرسکتا ہے)

”اے بدر حقیقی! یہ بدر ظاہری بھی تیرے ہی چہرے کا محتاج ہے۔“

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے تحریر کیا ہے کہ یہ اشعار حسین بن خماک بابلی کے ہیں۔ اپنے عشق کی کیفیت ظاہر کرنے کیلئے حضرت منصور حلاجؒ نے سرِ مقتل ان اشعار کو باآواز بلند پڑھا۔

اس کے بعد حضرت حسین بن منصورؒ نے فاطمہ نیشاپوریہؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”شبلی سے جاکر کہو کہ اللہ کی قسم! میں نے اس کا کوئی راز فاش نہیں کیا۔“

یہ نعرۂ ”اناالحق“ کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت منصور بن حلاجؒ پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ ”اناالحق“ کہا کرتے تھے۔ یعنی میں حق ہوں۔ اس نعرے کی حقیقت پر آئندہ صفحات میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

اس کے ساتھ ہی حضرت ابوبکر شبلیؒ نے فاطمہ نیشاپوریہؒ کو یہ ہدایت بھی کی تھی کہ حضرت حسین بن منصورؒ سے تصوف کی تعریف معلوم کرنا اور ان کے الفاظ کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا۔ پھر جب فاطمہؒ نے تصوف کے بارے میں سوال کیا تو حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

”میں اس وقت جس حالت میں ہوں، اسی کا نام تصوف ہے۔ میں نے نعمت اور بلا (خوشی اور غم)

میں کسی وقت بھی فرق محسوس نہیں کیا۔“

فاطمہؒ نے واپس آکر حضرت منصور حلاجؒ کے الفاظ دہرا دیئے۔ اس وقت حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ کی خدمت میں کچھ عقیدت منداور شاگرد موجود تھے۔ آپ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”پہلا جواب تم لوگوں کیلئے ہے کہ اس سے زیادہ تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتا...... اور دوسرا جواب میرے لئے ہے۔ میں اس حقیقت کو جانتا ہوں کہ ایک عالی ہمت عارف کی نظر میں نعمت اور بلا دونوں برابر ہوتے ہیں۔“

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ فاطمہ نیشاپوریہؒ کو مشہور بزرگ حضرت ذوالنون مصریؒ اپنی استانی کہا کرتے تھے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ بھی آپ کا بےحد احترام کرتے تھے۔ فاطمہ نیشاپوریہؒ 223ھ میں عمرے کیلئے مکہ معظمہ تشریف لے گئی تھیں۔ راستے ہی میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ 309ھ یا 310ھ میں شہادت منصورؒ کا واقعہ پیش آیا۔ اس وقت فاطمہ نیشاپوریہؒ کو دنیا سے رخصت ہوئے ستاسی سال گزر چکے تھے۔ پھر وہ سرِ مقتل حضرت منصور حلاجؒ سے کس طرح ملاقات کرسکتی تھیں؟ یقیناً فاطمہ نام کی کوئی اور بزرگ خاتون ہوں گی جنہیں حضرت شبلیؒ نے حضرت حسین بن منصورؒ کے پاس بھیجا تھا...... اور یہ ملاقات مقتل میں نہیں، قید خانے میں ہوئی تھی۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

جب سنگ باری ختم ہوگئی تو حضرت منصور حلاجؒ کا ایک خادم آگے بڑھا اور زاروقطار روتے ہوئے عرض کرنے لگا۔ ”شیخ! مجھے آخری نصیحت فرمایئے۔“

حضرت منصور حلاجؒ نے زخمی ہونے کے باوجود انتہائی استقامت کے لہجے میں فرمایا۔ ”اپنے نفس کو دنیا کی تمام نسبتوں (خواہشوں) سے خالی کرلے ورنہ یہ نفس تجھے ایسی چیزوں میں پھانس دے گا جو تیری برداشت سے باہر ہوں گی۔“

پھر آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے احمد بن حسینؒ نے وصیت کی خواہش ظاہر کی۔ احمد شدتِ غم سے نڈھال تھے۔

اولوالعزم باپ نے ایسے سنگین لمحات میں غمزدہ بیٹے سے چند تسلی آمیز کلمات کہے۔ پھر فرمایا ”میرے بیٹے! ساری دنیا اعمال صالحہ کی کوشش کرتی ہے مگر تجھے علم حقیقت حاصل کرنا چاہئے کیونکہ علم حقیقی کا ایک نکتہ بھی تمام اعمال صالحہ پر بھاری ہوتا ہے۔“ (علم حقیقی اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسانی دل اور روح دنیا کی آلائشوں سے پاک ہوجاتے ہیں۔ حضرت منصور حلاجؒ کے قول مبارک میں یہی نکتہ پوشیدہ ہے)

کوتوال محمد بن عبدالصمد کے سپاہیوں نے حضرت منصور حلاجؒ کے صاحبزادے احمد کو کھینچ کر دور کردیا۔

ہجوم میں بہت سے لوگ گریہ وزاری کررہے تھے مگر ان میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ حضرت منصور حلاجؒ کو مقتل سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر لے جاتے۔ ایک تو یہ کہ حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے۔

دوسرے یہ کہ حامد بن عباس نے شورش برپا ہونے کے خوف سے ایک دن پہلے ہی معززین شہر کے ذریعے پورے بغداد میں یہ اعلان کرا دیا تھا۔

”حلاج مذہب اسلام کا مجرم ہے۔اس لئے اس کا قتل ہو جانا ہی عوام الناس کے مفاد میں ہے۔“

عوام نے اپنے علماء کا فتویٰ سن لیا تھا۔اس لئے ان کی زبانیں خاموش تھیں۔ وہ شریعت کے معاملے میں دم کہاں مار سکتے تھے اور حقیقت حال کی انہیں خبر نہیں تھی......مگر ان کے دل حضرت حسین بن منصورؒ کے ساتھ تھے۔اس لئے آنکھیں اشک برسا رہی تھیں اور ہونٹوں سے شور فغاں بلند ہو رہا تھا۔

فرانسیسی عالم لوئی ماسینیون کی روایت کے مطابق حامد بن عباس نے مقتل میں بھی معزز گواہوں کو جمع کر لیا تھا جو دار (پھانسی) کے قریب کھڑے تھے اور لوگوں سے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

”اس کا قتل کرنا مسلمانوں کے نفع میں ہے۔قتل کر دو، خون ہماری گردنوں پر۔“

اس قسم کے مسلسل اعلانات کے سبب مجمع میں شورش پیدا نہ ہو سکی......مگر شدت غم سے لوگوں کے چہرے اداس تھے اور آنکھیں اشکبار تھیں۔ ہر طرف چیخیں تھیں اور انتشار برپا تھا۔لوگ صفیں چیرتے اور ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر عقیدت مند اس عاشق جانباز کا آخری دیدار کرنے کیلئے بے چین تھا جسے تھوڑی دیر بعد ایک انتہائی دردناک سزا دی جانے والی تھی۔

کوتوال محمد عبدالصمد کے سپاہی لاکھوں کے مجمع پر قابو پانے کی تدبیروں میں مصروف تھے۔اسی ہنگامے کے دوران ہجوم میں سے ایک شخص نے پکار کے کہا۔

”منصور! عشق کسے کہتے ہیں؟“

حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔”آج اور کل میں تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ عشق کسے کہتے ہیں؟“

پھر کسی نے پوچھا۔”آپ کا اپنے ماننے والوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”اللہ انہیں ایک اجر عطا کرے گا۔“حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

”اور اپنے دشمنوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“ دوسرے شخص نے سوال کیا۔

”اللہ مجھ سے اختلاف کرنے والوں کو دہرا اجر دے گا۔“ حضرت حسین بن منصورؒ نے انتہائی پرجوش لہجے میں فرمایا۔

”یہ کیسی عجیب بات ہے؟ ہمارے ذہن اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔“اسی شخص نے دوبارہ پوچھا۔

”تمہیں ایک اجر اس لئے ملے گا کہ تم مجھ سے صرف حسن ظن رکھتے ہو۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔”میرے مخالفین دہرا اجر اس لئے پائیں گے کہ وہ قوت توحید کا مظاہرہ اور شریعت کی استواری چاہتے ہیں۔شریعت میں اصل شے توحید ہے اور حسن ظن فرع۔“فرع عربی زبان میں شاخ کو کہتے ہیں۔حضرت منصور حلاجؒ کا مفہوم یہ تھا کہ توحید ایک درخت ہے اور حسن ظن (خوش گمانی) اس کی شاخ۔درخت اپنی جڑ سے قائم رہتا ہے، شاخوں سے نہیں۔

حضرت منصور حلاجؒ کے صحیح العقیدہ ہونے کیلئے یہی ایک جملہ کافی تھا مگر حامد بن عباس تو انہیں قتل

کرنے پر تلا ہوا تھا۔علماء سے جبری فتویٰ لینے والا وزیر کس طرح سنتا کہ منصور حلاجؒ آخری لمحات میں کس بات کا اقرار کر رہے تھے۔اس نے تقریباً نو سال تک اپنے کان بند رکھے تھے۔پھر وہ منصوبے کی تکمیل کے وقت اپنی سماعت کے دروازے کیسے کھولتا؟

اور وہ علماء جو نظام جبر کے سامنے بے دست و پا ہو گئے تھے، منصورؒ کی زبان سے توحید کا بیان سن کر اپنا فیصلہ کیوں بدلتے؟ وہ تو بس اس کام پر مامور تھے کہ عوام کے ذہنوں کو دھو ڈالیں اور کسی شورش کے بغیر قتل منصورؒ کی راہ ہموار کر دیں۔اس لئے وہ مضطرب عوام کو بار بار ایک ہی تلقین کر رہے تھے۔

”مسلمانو! حلاج کا قتل ہو جانا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔“

پھر لوگوں نے دیکھا کہ حضرت منصور حلاجؒ پھانسی کو بوسہ دے رہے تھے۔ان کی وارفتگی قابل نظارہ تھی۔ پھانسی کو کئی بار بوسہ دینے کے بعد حضرت حسین بن منصورؒ مجمع کی طرف متوجہ ہوئے اور بآواز بلند یہ اشعار پڑھے۔

”میرے دوستو! مجھے قتل کر دو کہ موت ہی میں میری زندگی ہے۔“

”اور دنیاوی زندگی میں میری موت ہے۔“

”اور جو زندۂ جاوید ہے اس کی صفات معدوم نہیں ہوتیں (حق تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی ذات و صفات قدیم ہیں)

”اور میں اسی سے تربیت یافتہ ہوں۔ میں نے تربیت کرنے والوں کی آغوشوں میں پرورش پائی ہے۔“

”اس لئے قتل سے میری روح اور میری معرفت و محبت فنا نہ ہوگی۔“(ترجمہ)

پھر جیسے ہی حضرت منصور حلاجؒ خاموش ہوئے، کوتوال محمد بن عبدالصمد نے جلاد کو اشارہ کیا۔اس وقت تک منتشر مجمع پر قابو پایا جا چکا تھا۔

جلاد نے اپنی قوت بازو کا مظاہرہ شروع کر دیا۔کثرت ریاضت اور زندگی بھر روزہ رکھنے کی عادت نے بظاہر حضرت منصور حلاجؒ کو تھکا ڈالا تھا اور وہ جسمانی طور پر بہت کمزور نظر آتے تھے۔اس لئے عوام کے ساتھ جلاد کا بھی یہی خیال تھا کہ حضرت حسین بن منصورؒ ایک تازیانے کی ضرب بھی برداشت نہیں کر سکیں گے اور پہلے ہی کوڑے میں کسی شاخ کی طرح ٹوٹ کر زمین پر گر جائیں گے......مگر کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ حلاجؒ جس شجر سے پیوستہ ہیں اس کے پتے اور شاخیں دنیا کی ہر آندھی کا مقابلہ کر سکتے ہیں......اور پھر ایسا ہی ہوا۔حضرت منصورؒ کے جسم پر تازیانوں کی بارش ہوتی رہی مگر ان کی زبان سے اُف تک نہ نکلی۔بس ہر کوڑے پر ”احد، احد“ کہتے تھے۔یعنی اللہ کی وحدانیت پر گواہی دیتے تھے۔یہ استقامت اور شجاعت کی عجیب مثال ہے۔

پھر جب چھ سو تازیانے لگائے جا چکے تو حضرت منصور حلاجؒ نے کوتوال محمد بن عبدالصمد کو اشارہ کیا جو قریب ہی کھڑا تھا۔جلاد نے ہاتھ روک دیا۔کوتوال چند قدم آگے بڑھا اور انتہائی درشت لہجے میں بولا۔

"کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میری بات غور سے سن!" حضرت منصور حلاجؒ نے محمد بن عبدالصمد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں تجھے ایک نصیحت کرتا ہوں جو تیرے فائدے میں "فتح قسطنطنیہ" کے برابر ہے۔"

کوتوال نے گھبرا کر کہا۔ "مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا ہے کہ تم اس سے بھی بڑھ کر باتیں کرو گے مگر میں تازیانوں کی سزا کو روک نہیں سکتا۔"

محمد بن عبدالصمد کو حامد بن عباس کی ہدایت یاد آ گئی۔ جب اس نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اگر حلاج تجھے دریائے دجلہ میں سونا چاندی بہتا ہوا بھی دکھا دے تو کوڑوں کی سزا موقوف نہ کرنا۔"

یہ خیال آتے ہی کوتوال نے جلاد کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "اپنے جسم کی پوری طاقت استعمال کر۔"

پھر کوڑوں کی سزا پوری ہو گئی...... اور قریب کھڑے ہوئے لوگ ایک ہی صدا سنتے رہے۔ "احد......احد......احد۔"

حضرت منصور حلاجؒ اپنی زندگی میں والہانہ ترنم کے ساتھ یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

"اللہ تعالیٰ کو خوب خبر ہے کہ میری ذات میں کوئی عضو ایسا نہیں ہے جس میں اے محبوب! تیری یاد رچی بسی نہ ہو۔"

"میری روح تجھے ساتھ لے کر اپنے حرکت کے مقامات میں حرکت کرتی ہے۔" (یعنی تو ایک لمحے کیلئے بھی مجھ سے جدا نہیں ہوتا)

"جب سے تو آنکھوں سے جدا ہوا ہے، اگر میری آنکھ نے تیرے سوا کسی کو دیکھا ہو تو خدا کرے، اس کے گوشے اس کو دغا دیں۔" (اس کا مفہوم ہے کہ آنکھیں پھوٹ جائیں)

"تجھ سے بچھڑنے کے بعد اگر میرے نفس نے تیرے سوا کسی مخلوق سے اُلفت کی ہو تو خدا کرے کہ اس کو اس کی مرادیں نصیب نہ ہوں۔"

ان اشعار سے حضرت منصور حلاجؒ کے عشق کی سرشاری بھی ظاہر ہوتی ہے اور وحدانیت پرستی بھی۔ وہ اپنے عہد میں اس قدر سچے ہیں کہ حق تعالیٰ کو فراموش کر دینے کے جرم میں اپنے آپ کو ہلاکت کی دعا دے رہے ہیں۔

جب ایک ہزار تازیانوں کی سزا پوری ہو چکی تو حضرت منصور حلاجؒ نے اسی وارفتگی کا اظہار کیا اور وہی اشعار پڑھے جو زندگی بھر کا وظیفہ تھے۔

جس جلاد نے حضرت حسین بن منصورؒ کے ایک ہزار کوڑے لگائے تھے، اس کا بیان ہے کہ میں ہر کوڑے پر دو آوازیں سنتا تھا۔ ایک آواز حضرت منصور حلاجؒ کی تھی جو "احد......احد" کہتے تھے۔

اور دوسری آواز غیب کی تھی اور اس میں بڑا جلال تھا۔ جب میں حلاجؒ کے کوڑا مارنے کیلئے اپنا ہاتھ بلند کرتا تھا تو ایک صدائے غیب ابھرتی تھی۔

"یا ابن منصور لاتخف" (اے ابن منصور! خوف زدہ نہ ہو)

بعض علماء نے اس جلاد کے حوصلے کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ شریعت کے معاملے میں انتہائی بلند

ہمت تھا۔ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو "لاتخف" کی آواز سن کر مقتل سے بھاگ کھڑا ہوتا۔

اس واقعے میں حضرت منصور حلاجؒ کی ذات سے وابستہ دو کھلی ہوئی کرامات موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ جلاد نے ہر تازیانے پر "یا ابن منصور لاتخف" کی آواز سنی۔ اس نے اپنے دور ملازمت میں بہت سے افراد کی پشت پر کوڑے مارے ہوں گے مگر کسی ایک شخص کو بھی سزا دیتے وقت اس نے یہ صدائے غیبی نہیں سنی تھی۔ اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ وہ آواز غیب حضرت حسین بن منصورؒ کے ساتھ مخصوص تھی۔ ایسے سنگین لمحات میں حضرت حلاجؒ کو صبر و استقامت کی تلقین کرنے والا، حق تعالیٰ کے سوا کون ہو سکتا ہے؟ بے شک! وہی ذات پاک تھی جس نے اس قدر نازک ساعتوں میں حسین بن منصورؒ کی یہاں تک دستگیری کی کہ وہ آخری لمحے تک اپنے پیروں پر کھڑے رہے۔ نہ شور فغاں بلند کیا اور نہ کسی سے رحم کی درخواست کی۔ جو کچھ کہا، اپنے اللہ سے کہا...... اور آخری سانس تک اسی کو پکارا۔ "احد...... احد......"

اگر یہ کرامت نہیں تو اور کیا تھی؟ خلیفہ مقتدر باللہ نے حضرت منصور حلاجؒ کیلئے ایک ہزار تازیانوں کی سزا اسی غرض سے منتخب کی تھی کہ اتنے کوڑوں کے درمیان ان کی موت واقع ہو جائے گی...... اور یہ امر واقعہ بھی ہے کہ اگر ایک ہزار کوڑے کسی پہلوان کے بھی مار دیئے جائیں تو وہ جاں بحق ہو جاتا۔ اور بالفرض جان سے نہ گزرتا تو زمین پر پڑا ہوا سسک رہا ہوتا...... مگر تمام تاریخیں اسی صورتحال پر متفق ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ آخری تازیانے تک نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑے رہے بلکہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اپنے اللہ کو پکارتے رہے۔ ان کے ہوش و حواس کی درستگی کا تو یہ عالم تھا کہ چھ سو کوڑوں کی ضرب برداشت کرنے کے بعد بھی انہوں نے کوتوال محمد بن عبدالصمد کو ایک انتہائی قیمتی نصیحت کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک عظیم الشان کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا کوئی ساحر اور زندیق ایسی اعلیٰ ظرفی، کشادہ دلی اور استقامت کا مظاہرہ کر سکتا ہے؟ اہل نظر غور کریں۔

الغرض ایک ہزار تازیانوں کی سزا مکمل ہو چکی تو جلاد نے کوتوال کی طرف دیکھا۔ وہ دوسرے حکم کا منتظر تھا۔

بیشتر مؤرخین کی روایات کے مطابق عباسی خلیفہ مقتدر باللہ نے یہی تحریر کیا تھا کہ اگر حلاجؒ ایک ہزار کوڑوں کی سزا کے دوران مر جائیں تو اچھا ہے ورنہ ان کا سر قلم کر دیا جائے۔ اس حکم نامے میں کسی شبہ کی گنجائش موجود نہیں تھی۔ صاف تحریر تھا کہ اگر تازیانوں سے منصورؒ کا کام تمام نہ ہو تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ اصولی طور پر کوتوال محمد بن عبدالصمد کو خلیفہ مقتدر باللہ کے حکم کا تابع ہونا چاہئے تھا...... مگر اس نے نیا حکم جاری کر دیا۔

"حلاجؒ کا ایک ہاتھ کاٹ دیا جائے۔"

اب سوال یہ ہے کہ کیا کوتوال محمد بن عبدالصمد اس بات کا مجاز تھا کہ وہ خلیفہ کے حکم کو نظر انداز کر کے اپنی طرف سے نیا حکم جاری کر سکے؟ بظاہر اس کا عہدہ و منصب اس لائق نہ تھا کہ وہ مقتدر باللہ کے حکم سے کھلی ہوئی سرتابی کر سکے۔ پھر اس نے جلاد کو اشارہ کیوں کیا کہ حضرت منصور

حلاجؒ کا ایک ہاتھ قطع کر دیا جائے۔ محمد بن عبدالصمد تو حکومت کا انتہائی کمزور آلہ تھا۔ وہ آخری وقت تک اس بات سے خائف تھا کہ کہیں حلاجؒ کے پرستار اپنے ممدوح کو اس سے چھین کر نہ لے جائیں۔ پھر اس نے اس قدر سنگدلانہ حکم کیوں جاری کیا؟ جبکہ اسلامی شریعت میں انسانی اعضا کا کاٹنا سختی کے ساتھ ممنوع ہے۔ ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ اس سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کا فرمان مقدس موجود ہے کہ انسانی جسم تو کجا، پاگل کتے کے بھی اعضا نہ کاٹو۔ پھر حضرت حسین بن منصورؒ کے حق میں یہ ستم کیوں روا رکھا گیا اور اس ظلم کا بانی کون تھا؟

کوتوال محمد بن عبدالصمد کی بے اختیاری دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نئے حکم کا جاری کرنے والا، حامد بن عباس کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ وزیر حامد بن عباس نے یہ سفاکانہ فرمان کیوں جاری کیا؟ ہماری نظر میں اس کا بس ایک ہی جواب ممکن ہے کہ حامد بن عباس حضرت منصور حلاجؒ کا بدترین دشمن تھا۔ اس لئے وہ انہیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچا کر اپنے قلب کو تسکین پہنچا رہا تھا۔ ذاتی انا کی تسکین کے علاوہ اس واقعے میں ایک سیاسی مقصد بھی پوشیدہ تھا۔ حامد بن عباس حضرت منصور حلاجؒ جیسی محبوب و مقبول شخصیت کو عبرتناک سزا دے کر عوام کے دلوں پر حکومت کا رعب و جلال قائم کرنا چاہتا تھا۔

اب تیسرا سوال یہ ہے کہ اس وقت بعض علماء اور فقہا بھی موجود تھے۔ ان بزرگ ہستیوں نے حامد بن عباس کو اس جارحانہ بلکہ وحشیانہ اقدام سے کیوں نہیں روکا؟ اس کا سیدھا سا جواب تو وہی ہے کہ قاضی ابوعمر اور دوسرے علماء نے جبراً فتوے پر دستخط کئے تھے۔ اگر وہ حامد بن عباس سے اختلاف کر سکتے تو پھر منصورؒ کو کھینچ کر سردار لایا ہی کیوں جاتا؟ وہ اس لمحے میں بھی خاموش تھے جب حضرت منصور حلاجؒ کی موت کا فیصلہ سنایا جا رہا تھا...... اور اس وقت بھی ان کی زبانیں بند تھیں جب حضرت حسین بن منصورؒ کو مرحلہ وار قتل کرنے کا حکم جاری کیوں کیا جا رہا تھا۔

آخر انتہائی بے رحمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت منصور حلاجؒ کا ایک ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ پھانس یا کانٹا چبھ جانے پر بھی بہت سے لوگوں کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل جاتی ہے مگر اس مرد خدا نے اپنے جسم کا ایک حصہ الگ ہو جانے پر اُف تک نہ کی بلکہ اسی وارفتگی کے ساتھ جو اہل عشق کا شیوہ ہے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے۔

"میں اسی محبت کی قسم کھا کر کہتا ہوں جسے انقلابِ زمانہ کبھی نہ بگاڑ سکے گا (یعنی گردش ماہ و سال کے سبب اس محبت میں نہ تبدیلی واقع ہوگی اور نہ کسی قسم کی کمزوری آئے گی بلکہ یہ محبت آج کی طرح ہمیشہ تازہ، شاداب اور پرجوش رہے گی)

"ہجوم بلا کے وقت نہ مجھے کوئی ضرر پہنچا اور نہ کوئی تکلیف محسوس ہوئی (اس دعوے کا ثبوت یہ ہے کہ ہزار تازیانوں کی سزا اور پھر ہاتھ کاٹے جانے کے بعد بھی وہ مسکراتے رہے اور مخالفین کو دعاؤں سے نوازتے رہے۔)

"میرا کوئی عضو یا جوڑ نہیں کاٹا گیا جس میں تمہاری یاد شامل نہ ہو۔" (چونکہ وہ حق تعالیٰ کی یاد میں

غرق تھے، اس لئے کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوا)

پھر کچھ دیر بعد حضرت منصور حلاجؒ کا دوسرا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اگرچہ ان کے جسم پر مسلسل قیامت ٹوٹ رہی تھی مگر زبان پر اللہ کی کبریائی کا بیان جاری تھا۔ حضرت حسین بن منصورؒ نے آسمان کی طرف دیکھ کر پُرشوق لہجے میں اپنے رب کو پکارا۔

"میرے معبود! میرے معبود! میں مرغوبات کے گھر میں عجائبات کو دیکھ رہا ہوں۔"

علماء کے نزدیک حضرت منصور حلاجؒ پر عالم مثال یا عالم آخرت ظاہر ہو گیا ہوگا اور آپ کھلی آنکھوں سے عجائبات دیکھ رہے ہوں گے...... یا پھر شوق وصال میں دنیا ہی کو "مرغوبات کا گھر" کہہ دیا ہو اور سامان قتل کو عجائبات سے تعبیر کیا ہو۔

پھر بڑی نیازمندی کے ساتھ عرض کیا۔ "میرے معبود! آپ تو اس شخص سے بھی دوستی کا سلوک کرتے ہیں جو آپ کو ایذا دیتا ہے...... پر آپ اس شخص سے دوستی کا برتاؤ کیوں نہ کریں گے جسے آپ کے راستے میں ایذا پہنچائی جاتی ہے۔"

اللہ کو ایذا پہنچانے والے منکر، کافر اور مشرک ہیں...... مگر اللہ ان کے ساتھ بھی دوستی کا سلوک کرتا ہے یعنی انہیں رزق فراہم کرتا ہے، اولاد کی دولت سے مالا مال کرتا ہے اور دنیا میں ہر قسم کا سامان راحت فراہم کرتا ہے۔ پھر جو اللہ کے راستے میں ستائے گئے ہیں، انہیں کس طرح فراموش کیا جا سکتا ہے۔

حضرت منصور حلاجؒ کے یہ الفاظ جو آخری لمحات میں آپ کی زبان مبارک سے ادا ہوئے، تصوف کی دنیا میں عالمگیر شہرت رکھتے ہیں کئی صدیاں گزر جانے کے بعد فارسی کے مشہور بزرگ شاعر شیخ مصلح الدین سعدیؒ نے اسی مضمون کو اپنے شعر میں اس طرح ادا کیا۔

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

(اپنے دوستوں کو کس طرح محروم رکھے گا، جبکہ تو دشمنوں کے ساتھ بھی مہربانی سے پیش آتا ہے)

یہ قول بھی حضرت منصور حلاجؒ کی وحدانیت پرستی پر کھلی دلیل ہے...... مگر علمائے بغداد کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ ان کے دلائل کو سنجیدگی کے ساتھ سنتے اور ان کے اقوال پر غور کرتے۔

جب قتل کے فتوے پر دستخط کئے جا رہے تھے تو حضرت منصور حلاجؒ نے پوری وضاحت کے ساتھ اپنا عقیدہ بیان کیا تھا۔ بعض مؤرخین نے حضرت حسین بن منصورؒ کے اس بیان کو ان کے خوف پر محمول کیا ہے کہ وہ موت کے ڈر سے اپنے آپ کو ایک صحیح العقیدہ مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ایک انتہائی کمزور دلیل اور نہایت ضعیف دعویٰ ہے۔ حضرت منصور حلاجؒ پر کوئی بھی الزام عائد کیا جا سکتا ہے مگر یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ وہ موت کے خوف سے اپنا بیان تبدیل کر رہے تھے۔ دنیا میں ایسے بہت کم لوگ گزرے ہیں جن کے نزدیک موت ایک دلچسپ کھیل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی...... حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ کسی خوف کے زیر اثر، علماء کی

جماعت کے سامنے اللہ کی وحدانیت، سرورِ کونین ﷺ کی رسالت اور اصحاب عشرۂ مبشرہ کی فضیلت پر گواہی نہیں دے رہے تھے۔ ان کی پوری زندگی بے باکی اور شجاعت کی اعلیٰ ترین مثال تھی۔ سندھ کے مشہور بزرگ حضرت لعل شاہ باز قلندرؒ کے نام سے فارسی کی یہ غزل منسوب ہے جسے سن کر صوفی اور غیر صوفی سبھی وجد میں آجاتے ہیں۔

نہ می دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقصم
مگر نازم بہ ایں ذوقے کہ پیش یار می رقصم

(میں نہیں جانتا کہ جب دیدار کا مرحلہ آتا ہے تو میں کیوں رقص کرنے لگتا ہوں (بات کچھ بھی ہو) مگر مجھے اس پر ناز ہے کہ میں اپنے دوست کے سامنے رقص کرتا ہوں)

اسی غزل کا مشہور شعر ہے جس سے عشق کی وارفتگی اور تسلیم و رضا کی انتہائی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔

تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خون من ریزی
من آں بسمل کہ زیر خنجر خونخوار می رقصم

(تو وہ قاتل ہے کہ دنیا کو تماشا دکھانے کیلئے میرا خون بہاتا ہے اور میں وہ بسمل ہوں کہ خوں آشام خنجر کے نیچے رقص کرتا ہوں)

ہمیں یقین ہے کہ جب حضرت لعل شاہ باز قلندرؒ نے یہ شعر کہا ہوگا تو حضرت منصور حلاجؒ کا واقعہ ان کے پیش نظر ہوگا...... اور اگر بالفرض ایسا نہیں تھا، تب بھی حضرت حسین بن منصورؒ ہی اس شعر کی عملی تشریح ہیں۔ صوفیا کی کثیر جماعت میں حضرت حلاجؒ ہی واحد صوفی ہیں جنہیں اس قدر دردناک سزا دی گئی اور زیر خنجر خونخوار انہوں نے جس طرح رقص کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

پھر حضرت منصور حلاجؒ کے دونوں پاؤں بھی کاٹ دیئے گئے۔ اس وقت وہ سولی پر لٹکے ہوئے تھے۔ اس ناقابل بیان اذیت کے تمام مرحلوں سے گزرنے کے بعد حضرت حسین بن منصورؒ نے حامد بن عباس، کوتوال محمد بن عبدالصمد اور دوسرے اراکین حکومت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”تم لوگوں نے میرے ظاہری ہاتھ تو کاٹ دیئے مگر میرے باطنی ہاتھ کون قطع کرسکتا ہے جنہوں نے ہمت کا تاج عرش کے سر پر سے اتارا ہے۔“

پھر اپنے بریدہ پیروں کی طرف دیکھ کر فرمایا۔

”تم نے میرے ظاہری پاؤں قطع کردیئے لیکن ابھی میرے باطنی پاؤں باقی ہیں جن سے میں دونوں عالم کا سفر کرسکتا ہوں۔“

ہم اس موقع پر فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینیون کی ایک اور روایت پیش کرتے ہیں جس سے وزیر حامد بن عباس کی سنگدلی اور سفاکی کا انتہائی خوفناک زاویہ منکشف ہوتا ہے۔ فرانسیسی عالم لکھتا ہے۔

”24/ذی الحجہ 309ھ کو ”باب خراسان“ میں پولیس چوکی کے سامنے دجلہ کے کنارے، لوگوں کی بہت بڑی بھیڑ جمع تھی۔ حلاج کو میدان میں لایا گیا۔ اس وقت ان کے سر پر افسر نما کلاہ (ٹوپی)

موجود تھی۔ پہلے ان کے تازیانے مارے اور پھر ہاتھ پاؤں کاٹے گئے۔ ابھی وہ زندہ تھے کہ انہیں دار پر لٹکا دیا گیا۔ دوست اور دشمن حلاجؒ کی طرف بھاگ رہے تھے تاکہ ان سے سوال کریں اسی اثناء میں شورش پسندوں نے چند دکانوں کو آگ لگادی۔ خلیفہ مقتدر باللہ کی طرف سے حلاجؒ کے سر کاٹنے کا حکم رات گئے تک نہ پہنچا تھا۔ اس لئے یہ کام دوسرے دن پر ملتوی کردیا گیا۔“

فرانسیسی عالم لوئی ماسینیون کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ شدید تکلیف کے عالم میں رات بھر پھانسی پر لٹکے رہے۔

حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ پہلے حضرت حلاجؒ کے ایک ہزار تازیانے مارے گئے۔ پھر آپ کے دست و پا کاٹے گئے۔ آخر میں خلیفہ مقتدر باللہ کا حکم پہنچا کہ سر بھی قلم کردیا جائے۔

قتل منصورؒ کے سلسلے میں عجیب متضاد روایتیں موجود ہیں۔ فرانسیسی دانشور کے علاوہ تمام مؤرخین نے 24/ذیقعدہ کو قتل کی تاریخ قرار دیا ہے۔ مگر لوئی ماسینیون 24/ذی الحجہ پر اصرار کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو یا پھر فرانسیسی مستشرق سے سہو ہوگیا ہو۔ بہرحال جہاں تک ہماری رسائی ممکن تھی ہم نے ایک ایک روایت کو جمع کردیا ہے تاکہ اس ”شہید حق“ کی زندگی اور موت کا کوئی پہلو تاریکی میں نہ رہے۔

الغرض، شمشیر بدست جلاد آگے بڑھا۔ اب حضرت منصورؒ کے رشتۂ حیات کو منقطع کرنے کا وقت آگیا تھا۔ جسمانی اعضا الگ ہوجانے اور اس قدر خون بہہ جانے کے بعد بھی حضرت حسین بن منصورؒ پورے ہوش و حواس میں تھے۔ آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور کئی بار زبان مبارک سے یہ جملہ ادا کیا۔

”پانے والے کیلئے یہی کافی ہے کہ تنہا اللہ اس کا ہے اور کوئی یار و مددگار نہیں۔“

مشہور مؤرخ خطیب بغدادی، حضرت منصور حلاجؒ کی ولایت کا قائل نہیں تھا۔ پھر بھی وہ حسین بن منصورؒ کے آخری لمحات کا حال اس طرح بیان کرتا ہے۔

فارس بغدادی قتل منصورؒ کے وقت موجود تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ قتل سے پہلے حلاجؒ کے ایک ایک عضو کاٹا گیا مگر ان کے چہرے کا رنگ بھی متغیر نہ ہوا۔

ابوبکر عطوفی کا بیان ہے کہ میں حلاجؒ کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ ان کے کوڑے لگائے گئے بعد میں دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹے گئے مگر ان کی زبان سے کچھ بھی نہیں نکلا۔ (یعنی حلاجؒ نے اُف تک نہ کی)

خطیب بغدادی کے بقول عیسیٰ القصار کا بیان ہے کہ قتل سے ذرا دیر پہلے حلاجؒ کی زبان سے یہ کلمہ ادا ہوا تھا۔

”پانے والے کیلئے بس یہی کافی ہے کہ تنہا اللہ اس کا ہے اور کوئی یار و مددگار نہیں۔“

روایت ہے کہ جب مشائخ بغداد تک یہ خبر پہنچی کہ حضرت منصور حلاجؒ نے مرنے سے پہلے اپنے

اللہ کو اس طرح پکارا تھا تو ان سب پر رقت طاری ہوگئی۔ پھر تمام صوفیاء نے بالاتفاق حضرت منصور حلاجؒ کے اس قول کی تعریف کی۔ ''حسین نے سچ کہا۔''

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''اللہ اس شخص پر کتنا قوی حال غالب تھا کہ ایک ہزار کوڑے کھائے، ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور اف تک نہ کی۔ احد...... احد ہی کہتا رہے۔ اس حال کے سامنے ہزار کرامات بھی بے حقیقت ہیں...... اور آخری کلمہ جو زبان سے ادا ہوا وہ تو سراسر توحید میں ڈوبا ہوا تھا۔ اعتبار خاتمے کا ہوتا ہے (یعنی ایک شخص کا انجام کس حالت پر ہوا) بالفرض حلاجؒ کی زبان سے کسی وقت کوئی ایسا کلمہ نکلا ہو جس کے سبب علماء کو تکفیر کی جرأت ہوئی تو ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ابن منصورؒ کی آخری حالت ان کے سچے موحد (خدا پرست) ہونے کو کس طرح ظاہر کر رہی ہے۔ لہٰذا ان عبارات میں تاویل ضروری ہے جن سے علماء کو شبہ ہوا ہے۔''

☆☆......☆☆......☆☆

جلاد کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ حضرت منصور حلاجؒ کی زبان مبارک پر وہی ایک کلمہ تھا۔

''پانے والے کیلئے بس یہی کافی ہے کہ تنہا اللہ اس کا ہے اور کوئی یار و مددگار نہیں۔''

پھر حضرت حسین بن منصورؒ کا سر قلم کر دیا گیا۔ حامد بن عباس خوش تھا کہ اس نے کسی بڑی ہنگامہ آرائی کے بغیر حلاجؒ سے نجات حاصل کر لی تھی...... مگر اس کا سکون بہت عارضی تھا جیسے ہی حضرت منصورؒ کا سر خاک پر گرا، پورا مقتل شور ''انا الحق'' سے گونج اٹھا۔

حاضرین کو اپنی سماعتوں پر شک ہونے لگا مگر آواز اتنی واضح اور مسلسل تھی کہ کچھ دیر بعد تمام شبہات دور ہوگئے۔ وہ ''انا الحق'' کی صدا تھی جو حضرت منصور حلاجؒ کے لہولہان جسم سے ابھر رہی تھی۔

''یہ فتنہ مرنے کے بعد تو اور بھی شدید ہوگیا۔'' حامد بن عباس نے کوتوال محمد بن عبدالصمد کو انتہائی غضبناک لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

کوتوال پر بھی ہیبت طاری تھی۔ ''اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' محمد بن عبدالصمد نے گھبرا کر کہا۔ ''میں نے تو امیر المومنین اور آپ کے حکم پر عمل کر دیا۔''

''اس کے جسم کے مزید ٹکڑے کر دو تا کہ یہ شور ختم ہو جائے۔'' حامد بن عباس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بدحواسی کے عالم میں نیا حکم جاری کر دیا۔

کوتوال محمد بن عبدالصمد نے جلاد کو اشارہ کیا۔ پھر حضرت حسین بن منصورؒ کے جسم کے بہت سے ٹکڑے کر دیئے گئے مگر شور ختم نہ ہوا۔ مقتل میں موجود ہر شخص ''انا الحق'' کی آواز سن رہا تھا۔

یہاں تک کہ رات سر پر آگئی۔ حامد بن عباس کی طرف سے حکم جاری ہوا کہ لوگ اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ مجمع منتشر ہوگیا مگر اس طرح کہ اکثر چہروں پر اداسی تھی اور اکثر ذہن پریشان تھے۔ کچھ آنکھوں میں اطمینان اور بہت سی آنکھوں میں دبے دبے غصے کے سائے تھے۔

حامد بن عباس، کوتوال محمد بن عبدالصمد اور تمام سپاہی ساری رات مقتل میں موجود رہے۔ حامد بن

عباس بار بار کوتوال سے پوچھتا تھا۔ ''اس شور کو کیسے بند کیا جائے؟ اگر یہ بات بغداد میں عام ہوگئی تو اس کے لاکھوں نئے معتقد پیدا ہو جائیں گے۔''

کوتوال، حامد بن عباس کے سوال کا کیا جواب دیتا؟ وہ تو خود دہشت زدہ تھا۔ آخر رات گئے تک حامد بن عباس اپنے حامیوں سے مشورے کرتا رہا۔ پھر یہ طے پایا کہ حلاجؒ کے ٹکڑے ٹکڑے جسم کو اسی طرح مقتل میں چھوڑ دیا جائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ آواز خود بخود بند ہو جائے گی۔

آخر حامد بن عباس حضرت منصور حلاجؒ کا سر لے کر مقتل سے چلا گیا۔

دوسرے دن بغداد کے باشندوں نے دیکھا کہ حضرت حسین بن منصورؒ کا خون آلود سر بغداد کے پل پر آویزاں ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر لوگ خوفزدہ بھی تھے اور دل گرفتہ بھی۔ حامد بن عباس کے نقارچی چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے۔

''یہ ان لوگوں کی سزا ہے جو مذہب اور حکومت کے خلاف باغیانہ اقدام کرتے ہیں۔''

دوسری طرف حضرت منصور حلاجؒ کے بکھرے ہوئے اعضا کا وہی حال تھا۔ جسم کے ایک ایک ٹکڑے سے صدائے ''انا الحق'' کی آواز ابھر رہی تھی۔

حامد بن عباس ناقابل بیان وحشت میں مبتلا تھا۔ آخر اس نے مقتول کی نعرہ زنی سے چھٹکارا پانے کیلئے ایک اور حکم جاری کیا۔

''حلاج کے بریدہ جسم کو آگ لگا دی جائے۔''

حضرت حسین بن منصورؒ کے بدن کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر دفن بھی کیا جا سکتا تھا مگر ان کے ساتھ بڑا ظالمانہ سلوک روا رکھا گیا۔ پہلے ان کے اعضاء کاٹے گئے جو ایک غیر اسلامی فعل تھا۔ جو مذہب ایک پاگل کتے کو بھی ''مثلہ'' کرنے کی اجازت نہیں دیتا، وہ ایک انسان کے ساتھ یہ وحشیانہ برتاؤ کس طرح گوارہ کرے گا؟ کچھ دیر کیلئے ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ شریعت کی نظر میں گناہ گار تھے اور ان کا جرم ثابت ہو چکا تھا۔ نتیجتاً انہیں ایک ہی وار میں قتل کر کے حامد بن عباس اور اس کے حامیوں کے بقول اس فتنے سے نجات حاصل کر لی جاتی۔ پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ مفتیان وقت کی موجودگی میں ایک شخص کو ایسی دردناک سزائیں دی گئیں جن کے تصور سے بھی انسانی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اب اس کے مردہ جسم کو آگ میں جلانے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ جیسے مرنے والا اپنی زندگی میں آگ کا پجاری رہا ہو۔

فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینیون کہتا ہے کہ حلاجؒ کے جسم کو تیل سے بھگویا گیا اور آگ لگا دی گئی۔

خطیب بغدادی کی روایت ہے کہ جب حلاجؒ کے جسم کو آگ لگائی گئی تو ایک شخص وہاں موجود تھا۔ اس کا بیان ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ کے جسم کے ٹکڑے بھڑکتی ہوئی آگ پر پیچ و تاب کھاتے رہے یہاں تک کہ گوشت اور ہڈیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ خطیب بغدادی نے اس شخص کا نام ظاہر نہیں کیا۔ صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ شخص کوتوال محمد بن عبدالصمد تھا اور غالباً یہ اسی کا بیان ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ خطیب بغدادی نے حضرت منصور حلاجؒ کو دی جانے والی تمام سزاؤں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے......مگر شور انا الحق کے بارے میں کوئی روایت پیش نہیں کی۔ تذکرۃ الاولیاء اور "تاریخ قزوینی" میں یہ واقعہ اجمالی طور پر موجود ہے۔

فرانسیسی عالم لوئی ماسینیون کہتا ہے کہ حلاجؒ کی خاکستر کو ایک مینار کی بلندی سے دریائے دجلہ میں پھینک دیا گیا۔

تذکرۃ الاولیاء میں حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کا بیان ہے کہ جیسے ہی حضرت منصورؒ کی راکھ دریا میں ڈالی گئی، دجلہ کے پانی میں ایک تغیر رونما ہونے لگا۔ کچھ دیر پہلے یہی دریا سکون کی حالت میں بہہ رہا تھا۔ حلاجؒ کی راکھ پڑتے ہی موجیں سر ابھارنے لگیں اور دریا کا پانی تیزی سے بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ شدید طغیانی کے آثار پیدا ہوگئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دجلہ کا پانی کناروں سے باہر نکلنے لگا۔

حامد بن عباس اور دیگر اراکین سلطنت حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ بارش کے بغیر دریا میں سیلاب کہاں سے آ گیا؟

طغیانی بڑھتی جارہی تھی۔ یہاں تک کے بغداد کے غرق ہوجانے کے آثار پیدا ہوگئے اور لوگ خوف زدہ تھے اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

"یہ قتل منصور کی پاداش ہے۔"

یکایک ہجوم میں سے ایک تیز آواز ابھری۔ "ہاں! یہ میرے شیخ کے قتل کا بدلہ ہے جو قدرت تم سے لے رہی ہے۔ تم تھوڑی ہی دیر میں اپنی آنکھوں سے پورے بغداد کو غرق ہوتے ہوئے دیکھو گے؟"

حامد بن عباس یہ آواز سن کر چونک اٹھا۔ پھر اس نے کوتوال محمد بن عبدالصمد سے کہا۔ "تلاش کرو کہ یہ کون شخص ہے؟"

کوتوال نے پکار کر کہا۔ "جس نے بغداد کے غرق ہونے کی بات کہی ہے، وہ شخص سامنے آئے کیونکہ یہ مخلوق خدا کی زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔"

کوتوال کی پکار سن کر ایک شکستہ حال شخص آگے بڑھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ غالباً وہ بہت دیر تک روتا رہا تھا۔ "ہاں میں نے ہی یہ بات کہی ہے کہ دریائے دجلہ میں ایک خوفناک طوفان آئے گا اور پورا بغداد غرق ہوجائے گا۔"

"اے شخص تو کون ہے؟" حامد بن عباس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اور تو کس بنیاد پر بغداد کی تباہی کا دعویٰ کررہا ہے؟"

"میں دعویٰ نہیں کررہا ہوں، تم کھلی آنکھوں سے پانی کا یہ پیچ و تاب دیکھ رہے ہو۔" اس شخص نے بے باکانہ انداز میں کہا۔ "میں اپنے شیخ کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔"

دریائے دجلہ کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر حامد بن عباس کا سارا غصہ اور طنطنہ ختم ہوگیا تھا۔ اب وہ اس شخص سے بہت دھیمے لہجے میں بات کررہا تھا۔ "کیا تیرے شیخ نے کہا تھا کہ اس کے قتل کے بعد دجلہ میں طغیانی آجائے گی؟"

"ہاں! میرے شیخ نے فرمایا تھا کہ ان کے جسم کو جلا دیا جائے گا۔" خادم نے روتے ہوئے کہا۔
"پھر جب ان کی راکھ دریا میں ڈالی جائے گی تو دجلہ بے قابو ہوجائے گا۔"

اس میں حیل و حجت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ حامد بن عباس اپنی آنکھوں سے دریائے دجلہ کو بے قابو ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ "تیرے شیخ نے کچھ اور بھی کہا تھا؟" حامد بن عباس بدحواس نظر آرہا تھا۔

"ہاں! شیخ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جب سرکش موجیں کناروں سے باہر نکل جائیں تو میرا خرقہ دریا کو دکھا دینا۔ دجلہ پرسکون ہوجائے گا۔" خادم نے گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہے وہ خرقہ؟" حامد بن عباس نے گھبرا کر خادم سے پوچھا۔

"میرے پاس محفوظ ہے۔" خادم نے جواب میں کہا۔

"تو خرقے کی حفاظت کررہا ہے اور شہر بربادی کے قریب پہنچ چکا ہے۔" حامد بن عباس نے حضرت منصور حلاجؒ کے خدمت گار کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اگر شیخ کی وصیت نہ ہوتی تو میں کبھی اس راز کو فاش نہ کرتا۔" خادم نے اذیت ناک لہجے میں کہا۔ "جب میرا مخدوم ہی نہ رہا تو پھر یہ شہر باقی رہے یا غرقاب ہوجائے۔"

"کیا باقی رہے اور کیا ختم ہوجائے گا؟ یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔" حامد بن عباس پر وحشت طاری تھی۔ جس کے حکم سے حضرت منصور حلاجؒ کے اعضا کاٹے گئے......اور جو زندگی بھر ایک جانباز موحد کو زندیق و ساحر سمجھتا رہا......اور جس نے کوتوال محمد بن عبدالصمد کو تنبیہ کی تھی کہ اگر حلاج تجھے دریائے دجلہ میں سونا چاندی بہتا ہوا دکھا دے، تب بھی اپنا ہاتھ نہ روکنا اور کوڑوں کی سزا جاری رکھنا......اب وہی شخص حضرت حسین بن منصورؒ کے خادم سے التجا کررہا تھا۔ کچھ دیر کیلئے ہم نے تسلیم کرلیا کہ حضرت منصور حلاجؒ ایک شعبدہ باز اور جادوگر تھے۔ پھر یہ کیسا عجیب انقلاب تھا کہ حامد بن عباس دریائے دجلہ میں اٹھنے والے طوفان کو روکنے کیلئے اسی جادوگر کا خرقہ طلب کررہا تھا۔ بعض مؤرخین نے حامد بن عباس کی شان میں بہت قصیدے پڑھے ہیں کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان تھا اور ایک زندیق ساحر کی فتنہ انگیزیوں سے عالم اسلام کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا پھر حامد بن عباس ایک کافر اور جادوگر کی شعبدہ بازیوں سے کیوں متاثر ہوگیا؟ اس نے اہل بغداد کو مخاطب کرکے یہ بات کیوں نہیں کہی کہ دریا میں اٹھنے والے طوفان کا تعلق اس شعبدہ باز کی راکھ سے نہیں ہے......اور اگر بالفرض خاکستر منصور ہی کے اثر سے دریائے دجلہ میں تلاطم برپا ہوا تھا تو حامد بن عباس نے بغداد کو غرق ہوجانے دیا ہوتا اور ایک جادوگر کے خرقے سے معاونت طلب نہ کی ہوتی۔ اہل ایمان مرجانا پسند کرتے ہیں مگر غیر اللہ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ حامد بن عباس اور اس کے حامیوں کو بھی اپنے عقائد کی اسی مضبوطی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا مگر یہ تو اہل اللہ کی شان ہے۔ حامد بن عباس کو تو اپنی زندگی اور کرسی عزیز تھی۔ وہ زبان و بیان کی حد تک خدمت اسلام کا مدعی تھا۔ پھر جب بغداد کی غرقابی کا اندیشہ پیدا ہوا تو وہ اسی "جادوگر" کے لباس سے مدد حاصل کرنے پر آمادہ ہوگیا۔

آخر حامد بن عباس کے برق رفتار شہسوار حضرت منصور حلاجؒ کے خادم کو گھوڑے کی پشت پر سوار کر کے اسے اس کے مکان تک لے گئے۔ پھر خادم اپنے شیخ کا خرقہ لے کر دریائے دجلہ کے کنارے پہنچا۔ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کی بیان کردہ روایت کے مطابق جیسے ہی خادم نے حضرت حسین بن منصورؒ کا خرقہ دریا کے مقابل کیا، لہروں کا سارا پیچ و تاب ختم ہو گیا اور دجلہ پہلے کی طرح پرسکون نظر آنے لگا۔

تذکرۃ الاولیاء میں درج ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کی بکھری ہوئی راکھ سمٹ کر ساحل پر آ گئی جسے لوگوں نے نکال کر دفن کر دیا۔

☆☆.........☆☆.........☆☆

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اپنی تالیف "سیرت منصور حلاجؒ" میں "تذکرۃ الاولیاء" کی روایت قدرے مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔

"جب حضرت حسین بن منصورؒ کو سولی دینے کیلئے باہر لایا گیا تو آپ نے اپنے ایک مرید کو طلب کر کے فرمایا۔

"جب میری راکھ دجلہ میں ڈالی جائے گی، اس وقت ایک سخت طوفان آئے گا جس سے بغداد کے غرق ہو جانے کا خطرہ ہو گا۔ اس وقت تم میرا خرقہ دریا میں ڈال دینا۔ دجلہ پرسکون ہو جائے گا۔"

چنانچہ جب سولی دیکر حضرت منصور حلاجؒ کے جسم کو جلایا گیا اور راکھ دریا میں ڈالی گئی تو ایک طوفان آ گیا اور راکھ کے ہر ذرے سے "انا الحق" کا شور بلند ہوا۔ پانی اس قدر بڑھا کہ بغداد کے ڈوب جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس وقت مرید نے اپنے شیخ کی وصیت کے مطابق حضرت حسین بن منصورؒ کا خرقہ دریا میں ڈال دیا۔ چند لمحوں میں دریا پرسکون ہو گیا اور شور انا الحق بھی بند ہو گیا۔

☆☆.........☆☆.........☆☆

علامہ زکریا بن محمد قزوینیؒ نے اپنی کتاب "آثار البلاد و اخبار العباد" میں قدرے مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے جو اس وقت بھی ڈھاکا یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ آپ حضور اکرم ﷺ کے خادم خاص حضرت انسؓ بن مالک کی اولاد ہیں۔ علامہ زکریا محمد بن قزوینیؒ فرماتے ہیں۔

"جب حضرت منصور حلاجؒ قتل کیلئے زنداں سے نکالے گئے تو آپ نے ایک دربان کو بلا کر فرمایا۔

"جب مجھے جلایا جائے گا تو دجلہ کا پانی بڑھنے لگے گا۔ یہاں تک کہ بغداد غرقابی کے نزدیک ہو جائے گا۔ جب تم یہ حالت دیکھو تو میرے جلے ہوئے جسم کی تھوڑی سی راکھ پانی میں ڈال دینا، دجلہ پرسکون ہو جائے گا۔"

چنانچہ جب حضرت حسین بن منصورؒ کو سولی دیدی گئی اور پھر ان کے جسم کو جلا دیا گیا تو اچانک دریائے دجلہ میں ہلچل پیدا ہوئی اور کسی موسمی تغیر کے بغیر پانی بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ بغداد کے غرق ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

چند اراکین سلطنت نے فوری طور پر عباسی خلیفہ تک یہ خبر پہنچائی جسے سن کر مقتدر باللہ پریشان ہو گیا۔ اس نے خبر دینے والوں سے پوچھا۔ "کیا حلاجؒ نے اس سلسلے میں کوئی بات کہی تھی؟"

خبر دینے والوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ خلیفہ مقتدر باللہ نے کہا۔ "ان لوگوں سے دریافت کرو جو زنداں میں حلاجؒ کی نگرانی پر مامور تھے۔"

پھر اس دربان کو عباسی خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا گیا جو رات کے وقت پہرہ دیا کرتا تھا۔

"حلاج نے تجھ سے کچھ کہا تھا؟" مقتدر باللہ، دریائے دجلہ میں بڑھتی ہوئی طغیانی کی خبر سن کر بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔

"ہاں! امیر المومنین! حلاجؒ نے زنداں سے رخصت ہوتے وقت یہ بات کہی تھی۔" قید خانے کے نگہبان نے پورا واقعہ بیان کر دیا۔

"جلدی کرو! جلدی کرو!" مقتدر باللہ بدحواس ہو گیا تھا۔ "حلاج کے کہنے کے مطابق عمل کرو اور بغداد کو تباہی سے بچا لو۔"

نتیجتاً حضرت حسین بن منصورؒ کی راکھ پانی میں ڈال دی گئی جس کے ہر حصے سے "اللہ" کا نقش دریا کی سطح پر ابھر آیا اور چند لمحوں میں دجلہ پرسکون ہو گیا۔

علامہ زکریا بن محمد قزوینیؒ نے اس کے آگے کا حال تحریر نہیں کیا ہے۔ بظاہر "آثار البلاد" اور تذکرۃ الاولیاء" کی روایات میں قدرے اختلافات پایا جاتا ہے مگر یہ واقعہ کم و بیش ہر تاریخ میں موجود ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ کے جسم کو جلایا گیا تھا اور پھر ان کی راکھ دجلہ میں ڈال دی گئی تھی۔ اس کے بعد دریا کا پانی سیلاب کی کیفیت اختیار کر گیا تھا...... اور اس طغیانی کو حضرت منصور حلاجؒ کے مریدوں نے ان کی کرامت سے تعبیر کیا تھا۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "اس واقعہ میں حضرت منصور حلاجؒ کی کرامت کے علاوہ ان کے صادق اور حق پرست ہونے کی دلیل بھی موجود ہے۔ معاذ اللہ! اگر وہ صاحب باطل (زندیق، کافر اور جادوگر) ہوتے تو اپنے دشمنوں کے حال پر رحم کیوں فرماتے؟ بلکہ خود ان کے غرق ہو جانے کی تمنا کرتے؟ اور اگر حضرت حلاجؒ کا بس چلتا تو اپنے تصرف روحانی کو کام میں لا کر اس سے بھی بڑی کوئی مصیبت اہل بغداد پر نازل کر دیتے...... مگر وہ عارف، صادق اور صاحب حق تھے۔ اس لئے دشمنوں کی دشمنی پر نظر نہیں کی...... بلکہ اپنی عارفانہ خیر خواہی اور ہمدردی کو کام میں لائے کیونکہ عارف اپنے دشمنوں اور مخالفوں کا بھی خیر خواہ ہوتا ہے، بدخواہ ہرگز نہیں ہوتا۔"

آفات و مصائب پر مسکراتے ہوئے صبر کرنا اور ایذا پہنچانے والوں کیلئے دعائے خیر کرنا، دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ اور یہی سرور کونین حضور اکرم ﷺ کی معروف ترین سنت ہے۔ حضرت منصور حلاجؒ سے لاکھ کوئی اختلاف کرے مگر زیر شمشیر ستم رقص کرنا اور اپنے دشمنوں کو دعاؤں سے سرفراز کرنا، ان کی خاص عادت تھی...... اور یہ عادت اولیاء کے سوا کسی انسانی طبقے میں نہیں ملتی۔ تاریخ

سے پتہ چلتا ہے کہ بعض مادہ پرست لوگوں نے بھی مقتل میں پہنچ کر بڑی استقامت کا مظاہرہ کیا ہے مگر ان لوگوں نے اپنے دشمنوں کو دعائیں نہیں دیں، بس حضرت حسین بن منصورؒ کی استقامت اور مادہ پرستوں کی شجاعت میں یہی بنیادی فرق ہے۔

☆☆............☆☆........ ......☆☆

اب ہم تاریخی حقائق کی روشنی میں حضرت منصور حلاجؒ کے اس نعرے پر بحث کریں گے جو خاص و عام میں مشہور ہے۔ یعنی نعرۂ ''انا الحق'' (میں حق ہوں) عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ''انا الحق'' کہنے کی وجہ سے حضرت منصور حلاجؒ شرعی عدالت میں مجرم قرار پائے اور پھر انہیں بڑے سنگدلانہ انداز میں قتل کر دیا گیا۔

علامہ زکریا بن محمد قزوینیؒ کی روایت ہے کہ جب حضرت منصور حلاجؒ نے ''انا الحق'' کہنا شروع کیا تو لوگ ان سے بے اعتقاد ہو گئے اور ان کے بارے میں مخالفانہ گفتگو کرنے لگے۔

بعض دوستوں اور ساتھیوں نے سمجھایا۔ ''حسین! ''انا علے الحق'' کہو۔'' جس کا مفہوم ہے کہ میں حق پر ہوں۔''

جواب میں حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''نہیں! میں انا الحق ہی کہوں گا۔'' اس کے بعد آپ نے یہ اشعار پڑھے۔

''میں عین محبوب ہوں......اور محبوب میرا عین ہے۔''

''ہم دو روحیں ہیں جو ایک بدن میں حلول کئے ہوئے ہیں۔'' (ترجمہ)

علامہ زکریا بن محمد قزوینیؒ کے مطابق حضرت حسین بن منصورؒ کا یہ قول بھی مشہور ہے۔ آپ بڑے والہانہ انداز میں کہا کرتے تھے۔

''مجھے تجھ پر اور اپنے آپ پر بڑا تعجب ہے۔ تو نے اپنے ساتھ مشغول کر کے مجھے اپنے آپ سے فنا کر دیا۔ پھر اپنے سے اتنا قریب کیا کہ مجھے گماں ہونے لگا کہ ''تو'' میں ہے۔''

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے بقول یہ اشعار حضرت منصور حلاجؒ کے نہیں ہیں، وہ اپنے غلبۂ شوق کی مثال دینے کیلئے کبھی کبھی مذکورہ اشعار پڑھ دیا کرتے تھے......اور اگر بالفرض ان اشعار کا تعلق حضرت حسین بن منصورؒ سے ثابت ہو جائے، تب بھی یہ بات تسلیم شدہ نہیں کہ انہوں نے حق تعالیٰ کو مخاطب کیا ہو۔ ان کی مراد حضرت رسالت مآب ﷺ سے بھی ہو سکتی ہے اور شیخ بھی ان کا مطلوب و مقصود ہو سکتے ہیں۔

امام ابونصر عبداللہؒ ان اشعار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''یہ ایک مخلوق کا دوسری مخلوق سے خطاب ہے...... جب عشق مجازی میں انسان کا یہ حال ہوتا ہے تو عشق حقیقی میں اس پر کیا گزرتی ہوگی؟ حضرت منصور حلاجؒ نے ان اشعار کے ذریعے اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے۔''

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں۔ ''اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت حلاجؒ نے حق تعالیٰ کو مخاطب کیا تھا، تب بھی ان کی مراد اتحاد یا حلول سے نہیں۔'' حضرت حسین بن منصورؒ علماء کی جماعت

کے سامنے بار ہا اپنا عقیدۂ توحید ظاہر کر چکے تھے......اور قتل کے وقت بھی انہوں نے اسی ذات واحد کو پکارا تھا۔

حضرت امام قشیریؒ نے اپنے رسالے میں حضرت منصور حلاجؒ کے کئی اقوال پیش کئے ہیں۔ ایک موقع پر حضرت حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔

''اور جو چیز اس کے پیدا کرنے سے پیدا ہوئی، وہ اس میں کس طرح حلول کر سکتی ہے؟ اتحاد تو ''حال اور محل'' میں ہوتا ہے حادث، قدیم کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتا۔''

(انسان اور دیگر مخلوقات حادث کہلاتی ہیں اور اللہ کی ذات قدیم ہے)

''اور جس چیز کو اس نے نشو و نما دیا، اس کی طرف کیوں کر پہنچ سکتی ہے۔''

''آنکھیں اسے اپنے اندر نہیں لے سکتیں اور گمان اس کے پاس تک نہیں پہنچ سکتا۔''

''اس کا قرب یہ ہے کہ مکرم (معزز) بنا دے اور دوری یہ ہے کہ ذلیل کر دے۔''

''وہ اول بھی ہے اور آخر بھی...... باطن بھی ہے اور ظاہر بھی......قریب بھی ہے اور بعید بھی...... اس کے مثل کوئی شے نہیں۔ وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

یہ ہیں وہ چند اقوال جنہیں پڑھ کر ایک عام مسلمان بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کا عقیدۂ توحید کیا تھا؟

علمائے تحقیق کے نزدیک حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت منصور حلاجؒ کا عقیدۂ توحید ایک ہی تھا۔ ہم اپنے مضمون ''حضرت جنید بغدادیؒ'' میں اس واقعے کی تفصیلات پیش کر چکے ہیں کہ جب حضرت شیخؒ نے عام مجلسوں میں ''توحید'' پر گفتگو کی تھی تو علمائے بغداد ان سے بھی ناراض ہو گئے تھے۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ خلیفہ مقتدر باللہ نے تمام صوفیائے عراق کے ساتھ حضرت جنید بغدادیؒ کے قتل کا بھی فرمان جاری کر دیا تھا۔ آخر حضرت جنید بغدادیؒ کو قاضی القضاۃ کے سامنے اقرار کرنا پڑا تھا کہ صوفیاء کی جماعت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو صرف ایک عالم اور فقیہہ ہیں اس واقعے کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ نے عام لوگوں پر اپنی مجلسوں کے دروازے بند کر دیئے تھے۔

حضرت منصور حلاجؒ کی طرح تمام صوفیائے عراق پر کافر و زندیق ہونے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ ان بزرگ ہستیوں کے بارے میں بھی کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ حضرت حسین بن منصورؒ کی طرح عقیدۂ حلول کے قائل ہیں۔ (حلول کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ انسان کی ذات میں سما جاتا ہے یا انسان اللہ کی ذات میں جذب ہو جاتا ہے)

حضرت حسین بن منصورؒ کی طرح ان صوفیائے عراق کو بھی زنجیریں پہنا کر مقتل میں لے جایا گیا تھا۔ آخر حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کی ایک جرأت مندانہ تقریر نے صوفیائے کرام کی جانیں بچائیں۔ خلیفہ معتقد باللہ نے اپنا حکم واپس لیا اور اس جارحانہ اقدام پر حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ سے معذرت کی۔

یہ بھی تاریخ کا عجیب و غریب موڑ ہے کہ خلیفہ مقتدر باللہ جس نے قتل کے فتوے پر اپنی مہر ثبت کی وہ خلیفہ معتقد باللہ کا بیٹا تھا۔

اور حضرت منصور حلاجؒ جنہیں انتہائی سفاکانہ انداز میں قتل کیا گیا، وہ حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کے شاگرد تھے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

''تذکرۃ الاولیاء'' میں حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ لکھتے ہیں کہ جب خلیفہ کے پاس مسلسل خبریں پہنچنے لگیں کہ ابن منصورؒ ''انا الحق'' کہتا ہے تو مقتدر باللہ نے قتل کی دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد لوگوں نے منصورؒ کو سمجھایا۔ ''انا الحق نہیں، ھوالحق کہو۔''

لوگوں کی نصیحت سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''ہاں! سب کچھ وہی ہے مگر تم لوگ کہتے ہو کہ وہ غائب ہے...... اور حسین کہتا ہے کہ میں غائب ہوں۔ بحرِ محیط بھی کہیں غائب یا گم ہوا کرتا ہے۔''

علماء نے حضرت منصور حلاجؒ کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''وحدت الوجود کی اجمالی حقیقت یہ ہے کہ ممکنات کا وجود نظر سے غائب ہو جائے۔ اسے حقیقت نہیں کہتے کہ ممکنات کو خدا مان لیا جائے۔ حضرت منصور حلاجؒ کے نزدیک ''انا الحق'' کے معنی یہ ہیں کہ میں کچھ نہیں۔ یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ میں سب کچھ ہوں۔''

جب حضرت حسین بن منصورؒ کے ساتھی ان سے پوچھتے۔ ''شیخ! تم انا الحق کیوں کہتے ہو؟''

جواب میں حضرت منصور حلاجؒ فرماتے۔ ''میں انا الحق نہیں کہتا، کوئی اور کہتا ہے۔''

دوست حیران ہو کر کہتے۔ ''حسین! تمہاری یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔''

حضرت منصور حلاجؒ فرماتے۔ ''میرے سارے اختیارات سلب کئے جا چکے ہیں، میں مجبورِ محض ہوں...... اور اس کے سوا کچھ نہیں۔''

''شیخ! آپ ہی اس مجبوری کی وضاحت کر سکتے ہیں۔'' دوست عرض کرتے۔

حضرت حسین بن منصورؒ فرماتے۔ ''انبیائے کرام علیہم السلام احوال و کیفیات پر غالب اور ان کے مالک ہوتے ہیں، وہ احوال (کیفیات) کو پلٹ دیتے ہیں مگر احوال انہیں پلٹنے کی طاقت نہیں رکھتے...... انبیائے پاک علیہم السلام کے سوا دوسرے لوگوں یعنی اولیاء کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ان پر احوال و کیفیات حکومت کرتے ہیں احوال انہیں پلٹ دیتے ہیں اور وہ احوال کو پلٹنے کی طاقت نہیں رکھتے۔''

حضرت منصور حلاجؒ کے اس قول مبارک کی تشریح یہ ہے کہ دنیا میں صرف انبیائے کرام علیہم السلام کی ذات پاک ایسی ہے جو انتہائی جذب کی حالت میں بھی پورے ہوش و حواس رکھتے ہیں۔ وہ ایک لمحے کیلئے بھی بے خبر نہیں ہوتے۔ رسول اور نبی سے زیادہ قدرت حق کا مشاہدہ کون کر سکتا ہے۔ ایک رسول اور نبی سے زیادہ کس انسان پر محبت کا غلبہ ہو سکتا ہے...... مگر چونکہ یہ برگزیدہ ہستیاں رشد و ہدایت کے منصب عظیم پر فائز ہوتی ہیں، اس لئے ہمہ وقت ہوش میں رہتی ہیں۔ ان کا عہدۂ منصبی اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ وہ جذبۂ عشق سے سرشار ہونے کے باوجود مناظر قدرت حق میں گم نہیں ہوتے...... اور اگر کبھی گم بھی ہوتے ہیں تو اس وقت ان کا تعلق مجلس اور مخلوق سے نہیں ہوتا۔ وہ عین خلوت کی کیفیت ہوتی ہے اور خلوت میں حق کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس وہ اولیاء جو پوری طرح رسالت مآب ﷺ کی سنت پر عمل پیرا ہوتے ہیں، ان کی بھی یہی حالت ہوتی ہے یعنی وہ اپنے احوال پر غالب ہوتے ہیں۔...... مگر درجۂ کمال تک پہنچنے سے پہلے ان پر احوال و کیفیات ہی غالب رہتے ہیں۔ نتیجتاً حضرت منصور حلاجؒ نے اس بات کا اقرار کرتے ہوئے فرمایا۔

''مجھ پر حال کی حکومت ہے اور ایک خاص کیفیت کا غلبہ ہے۔''

☆☆..................☆☆..................☆☆

مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ، حضرت منصور حلاجؒ سے نہایت عقیدت رکھتے تھے۔ ایک بار آپ نے اپنے ایک خادم خاص کو حضرت حسین بن منصورؒ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا۔

''شیخ! جو بات تم نے کہی ہے، اس سے توبہ کر لو۔ شاید تمہیں قید خانے سے رہائی مل جائے۔''

حضرت ابن عطاؒ کا پیغام سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے ان کے خادم سے فرمایا۔ ''ابن عطاؒ کو میرا سلام کہنا...... اور اپنے شیخ سے یہ بھی کہہ دینا کہ جس نے یہ بات کہی ہے، اس سے کہو کہ وہ توبہ کر لے۔''

تذکرۃ الاولیاء میں حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کی روایت ہے کہ جب خادم نے حضرت منصور حلاجؒ کے الفاظ دہرائے تو حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ رو پڑے اور نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''ہم تو خود حسین بن منصورؒ کے ادنیٰ غلام ہیں۔''

(یعنی ہماری کیا مجال کہ اس معاملے میں دخل دیں)

اب ہم حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ کی زندگی کا وہ تاریخ ساز واقعہ بیان کریں گے جس سے ایک طرف آپ کی بے مثال شجاعت و استقامت کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف حضرت منصور حلاجؒ سے بے پناہ عقیدت کا۔

یہ حضرت منصور حلاجؒ کے قتل سے چند ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔ ابھی ان کے خلاف ''حلال الدم'' کا فتویٰ نہیں دیا گیا تھا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران ایک روز حامد بن عباس نے حضرت حسین بن منصورؒ سے سوال کیا۔

''شہر بغداد میں بہت سے صوفی ہیں۔ کیا کوئی ایک شخص بھی تیرے عقیدے کی درستگی پر گواہی دے سکتا ہے؟''

حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ''بے شک! دارالخلافے میں بہت سے صوفی ہیں مگر یہاں صرف تین افراد مجھے پہچانتے ہیں۔ وہ میرے کلام پر شہادت دے سکتے ہیں۔ ایک شیخ ابومحمد جریریؒ دوسرے شیخ ابوبکر شبلیؒ اور تیسرے شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ۔''

جب حامد بن عباس ان تینوں بزرگوں کو طلب کرنے کیلئے اپنے خادم کو بھیجنے لگا تو حضرت حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔ ''شیخ ابومحمد جریریؒ اور شیخ ابوبکر شبلیؒ حقیقت کو چھپاتے ہیں...... اگر کچھ کہہ سکتے ہیں

"تو صرف شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ۔"

واضح رہے کہ حضرت شیخ ابو محمد جریریؒ حضرت جنید بغدادیؒ کے خلیفۂ اول تھے اور حضرت شیخ ابوبکر ابوبکر شبلیؒ شاگردِ خاص، چونکہ حضرت منصور حلاجؒ بھی حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید یا شاگرد تھے، اس لئے ان دونوں بزرگوں سے آپ کا رشتۂ خاص تھا۔ اس کے باوجود حضرت منصور حلاجؒ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ شیخ ابو محمد جریریؒ اور شیخ ابوبکر شبلیؒ ان کے معاملے میں گواہی دینے سے معذور ہوں گے۔

الغرض حامد بن عباس نے تینوں بزرگوں کو اپنی عدالت میں طلب کرلیا۔ حضرت شیخ ابو محمد جریریؒ اور حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے حضرت منصور حلاجؒ کی موافقت سے انکار کردیا۔

حامد بن عباس نے حضرت منصور حلاجؒ کو مخاطب کرتے ہوئے باآواز بلند کہا۔ "سن لیا تو نے؟ یہ دونوں بزرگ تیرے عقیدے سے انکار کرتے ہیں۔"

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ دونوں اخفائے راز کرتے ہیں۔ اس لئے میرے حال پر گواہی نہ دے سکیں گے۔" حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

حضرت شیخ ابو محمد جریریؒ اور حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ واپس چلے گئے۔ ان دونوں بزرگوں کے رخصت ہوجانے کے بعد حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ تشریف لائے۔ حامد بن عباس نے ان سے پوچھا۔

"تم حلاجؒ کے عقیدے کی تصدیق کرتے ہو؟"

حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ نے فرمایا۔ "یہ عقیدہ درست ہے۔ میں اس کا معتقد ہوں اور جس کا یہ اعتقاد نہ ہو، وہ بے اعتقاد ہے۔"

حامد بن عباس کو یقین نہیں تھا کہ حضرت ابن عطاؒ اس قدر بے باکانہ انداز میں حضرت حسین بن منصورؒ کی حمایت کریں گے۔ ابھی وزیر مملکت حضرت ابن عطاؒ کے جواب پر حیران ہو رہا تھا کہ حضرت شیخ نے حامد بن عباس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"میں وزیر سلطنت ہوں۔" حامد بن عباس نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ "صرف میری یہی ذمہ داری نہیں کہ میں امور مملکت کی نگرانی کرتا رہوں۔ عوام کے عقائد پر نظر رکھنا میرا اسلامی فریضہ ہے۔"

"تم جس کام کیلئے مقرر کیے گئے ہو، بس اسی کو انجام دیتے رہو۔" حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ نے کسی جھجک کے بغیر فرمایا۔

"آخر میں کس کام کیلئے مامور کیا گیا ہوں؟" غالباً حامد بن عباس حضرت شیخ ابن عطاؒ کا اشارہ سمجھ گیا تھا، اس لئے اس کے لہجے میں مزید شدت پیدا ہوگئی تھی۔

یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ جس وزیر مملکت نے فقہائے کرام اور مفتیانِ وقت کو جبری فتوے پر مجبور کردیا تھا، حضرت شیخ ابن عطاؒ جانتے تھے کہ وہی وزیر مقتدر باللہ کے دور حکومت میں کتنا طاقتور اور کس قدر بااختیار تھا؟ حامد بن عباس کی مرضی کے خلاف کوئی بات کہنا ایسا ہی تھا کہ جیسے کوئی شخص

بیٹھے بٹھائے آفات و مصائب کو کھلی دعوت دیدے۔ حضرت شیخ ابن عطاؒ اس راز سے واقف تھے۔ وقت کی مصلحت اور نزاکت کے پیش نظر حضرت شیخ کو خاموش رہنا چاہئے تھا...... مگر پھر سچ کون بولتا؟ کسی کو تو حرفِ حق زبان پر لانا تھا۔ اگر بالفرض حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ بھی سکوت اختیار کرتے تو پھر بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی؟ وقت کا غیر جانب دار مورخ تو صاف صاف لکھ دیتا کہ حامد بن عباس کے عہدِ اقتدار میں بڑے بڑے زہاد، بڑے بڑے فقہا اور بڑے بڑے باکردار انسان موجود تھے...... مگر کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو ظلم کے خلاف عملی احتجاج کر سکے یا کم سے کم ایک ظالم کو حقیقت کے آئینے میں اس کے مکروہ خدوخال ہی دکھا سکے۔ بڑا ہی نازک وقت تھا۔ آخر ایسی قیامت خیز ساعتوں میں بارِ امانت کون اٹھاتا؟ زمانہ کتنا بھی خراب ہو مگر ہمیشہ سے حق تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ وہ "صنم خانہ عصر" میں ایک نہ ایک اذان دینے والے کو باقی رکھتا ہے۔ انجام کار حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ ناتواں جسم کے ساتھ آگے بڑھے اور پہاڑ سے بھی زیادہ گراں بوجھ اپنے کمزور کاندھوں پر اٹھالیا۔

"تمہیں اس کے سوا کیا کام ہے کہ لوگوں کا مال غصب کرتے رہو۔" حضرت شیخ ابن عطاؒ اپنے انجام سے قطعاً بے پروا ہوگئے تھے۔ اس لئے آپ نے انتہائی پُر جلال لہجے میں حامد بن عباس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "تمہارے عہدہ و منصب کا تقاضا اس کے سوا کیا ہے کہ تم بندگانِ خدا پر ظلم کرتے رہو اور ناحق اس کا خون بہاتے رہو۔"

جیسے ہی حضرت شیخ ابن عطاؒ کی زبانِ مبارک سے یہ آتشیں الفاظ ادا ہوئے، حامد بن عباس کا پیرہنِ اقتدار جل اٹھا۔ حیرت و غضب کی شدت سے اس کا چہرہ بگڑ گیا۔

"تمہیں ان بزرگوں کے کلام سے کیا تعلق ہے؟ تم اسے کیا سمجھو گے؟" حضرت شیخ ابن عطاؒ نے وقت کی عدالت میں اپنا مکمل بیان قلم بند کرادیا۔

حامد بن عباس نے اب تک کوئی ایسا گواہ نہیں دیکھا تھا جو ایک مظلوم کے حق میں شہادت دینے کے ساتھ ساتھ ظالم کے اعمال کا بھی محاسبہ کرتا ہے۔ آخر وزیر مملکت کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ حضرت شیخ ابن عطاؒ کے آئینے میں اپنا کریہہ المنظر چہرہ دیکھتے ہی حامد بن عباس خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے باآواز بلند اپنے سپاہیوں سے کہا۔

"جس منہ سے اس نے یہ بات کہی ہے، اسی منہ پر گھونسے مارو۔"

حامد بن عباس کے غلاموں نے حضرت شیخ ابن عطاؒ کے جبڑوں پر گھونسے مارنے شروع کردیئے۔

حضرت شیخ ابن عطاؒ نے حاکمِ حقیقی کے سامنے فریاد کی۔ "اے اللہ! آپ نے اس شخص کو کس گناہ کی سزا میں مجھ پر مسلط فرمایا ہے کہ میں اس کے پاس چلا آیا۔"

یہ سن کر حامد بن عباس اور بھی غضب ناک ہوگیا۔ "اس کے سر پر اتنے جوتے مارو کہ یہ اٹھا ہوا سر میرے سامنے جھک جائے۔" وزیر مملکت نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

مؤرخ خطیب بغدادی لکھتا ہے کہ حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ کے سر پر اتنی ضربیں لگائی گئیں

کہ ان کی ناک سے خون جاری ہوگیا۔ یہاں تک کہ وہ لڑکھڑائے اور فرش پر گر پڑے۔

"اسے بھی حلاجؒ کی طرح حوالۂ زنداں کردو۔" حامد بن عباس نے ایک اور بزرگ صوفی کو قید خانے میں ڈالنے کا حکم جاری کردیا۔

بعض مصاحبوں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "آپ ایسا نہ کریں۔ شیخ ابن عطاؒ کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہے۔ عام مسلمان ان کی اسیری کی خبر سن کر بگڑ جائیں گے۔"

رعایا کی برگشتگی کے خیال سے حامد بن عباس نے اپنا ارادہ بدل دیا...... اور حضرت شیخ ابن عطاؒ کو اس حالت میں گھر بھیج دیا گیا کہ ان کے دونوں نتھنوں سے مسلسل خون جاری تھا۔

پھر جب حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ کو گھر پہنچایا گیا تو آپ نے نہایت رقت آمیز لہجے میں حاکم کون ومکاں کے دربار میں عرض کیا۔

"اے اللہ! اس وزیر کو قتل کرا اور بری طرح قتل کر۔ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دے۔"

طویل ایذا رسانی کے دوران حضرت شیخ ابن عطاؒ کے جسم مبارک سے بہت زیادہ خون بہہ گیا تھا۔ پھر یہ کہ بروقت علاج بھی نہ ہوسکا۔ نتیجتاً اس واقعے کے ایک ہفتے بعد حضرت شیخ ابن عطاؒ انتقال فرماگئے۔

جب قید خانے میں حضرت منصور حلاجؒ نے حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ کی وفات کی خبر سنی تو بے اختیار رونے لگے۔ "ان معاملات میں اپنا ایک ہی گواہ اور ایک ہی راز دار تھا۔ سو وہ بھی چل بسا۔ اللہ شیخ کی مغفرت کرے۔"

جب سپاہیوں نے حامد بن عباس کے سامنے حضرت شیخ ابن عطاؒ کی بددعا کا واقعہ بیان کیا تو وہ زور سے ہنسا۔ "اس جادوگر کی شعبدہ بازیوں نے میرا کیا بگاڑ لیا؟" حامد بن عباس کا اشارہ حضرت حسین بن منصورؒ کی طرف تھا۔ "اگر ابن عطاؒ اتنا ہی بڑا ولی باکرامت تھا تو مجھ پر کوئی آفت کیوں نہیں لے آیا؟"

الغرض حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ کے انتقال کے پندرہ دن بعد حضرت منصور حلاجؒ کو دار پر کھینچ دیا گیا۔

ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ حضرت حسین بن منصورؒ کے عقائد پر حضرت شیخ ابوعبداللہ بن خفیفؒ اور شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ جیسے بزرگوں کی گواہی کافی ہے۔ یہ دونوں بزرگ شریعت اور طریقت میں "امام وقت" کا درجہ رکھتے تھے۔ اگر انہیں حضرت منصور حلاجؒ کے مسلک پر ذرا بھی شبہ ہوجاتا تو وہ ہرگز ایک بے عقیدہ شخص کی حمایت نہ کرتے...... اور جہاں تک حضرت شیخ ابن عطاؒ کا معاملہ ہے تو انہوں نے حضرت منصور حلاجؒ کی عقیدت میں جان تک گنوادی۔ اگر حضرت شیخ کو گمان بھی ہوتا کہ حضرت حسین بن منصورؒ خدائی کے دعویدار ہیں تو ان جیسا حق گو کس طرح خاموش رہتا؟ حضرت شیخ ابن عطاؒ تو اس شان کے بزرگ تھے کہ وہ برسرعام کہہ دیتے۔

"حلاجؒ سے کوئی تعلق نہ رکھو کہ وہ گمراہ ہوگئے ہیں۔"

اس طویل بحث کا حاصل یہ ہے کہ دونوں گروہ اپنی اپنی جگہ درست تھے۔ جو لوگ حضرت منصور حلاجؒ کے جذب و مستی کو سمجھنے سے قاصر رہے، ان کے نزدیک حضرت منصورؒ مورد الزام تھے...... اور جو حضرات غلبۂ عشق کے اثرات مابعد سے آشنا تھے، ان کی نظر میں حضرت حسین بن منصورؒ "موحد" بھی تھے اور عاشق جانباز بھی۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت منصور حلاجؒ سے کہا جاتا تھا کہ تم "اناالحق" کیوں کہتے ہو؟ تو آپ بے اختیار فرماتے تھے۔

"میں "اناالحق" نہیں کہتا، کوئی اور کہتا ہے۔"

جب ایک موقع پر "اناالحق" کے سلسلے میں لوگوں نے شدید اعتراض کیا تو حضرت منصور حلاجؒ نے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے۔

"مجھے شراب محبت پلا کر کہتے ہیں کہ نغمہ سرا نہ ہو۔"

"حالانکہ اگر "سرات" کے پہاڑوں کو یہی شراب پلادی جاتی جو مجھے پلائی گئی ہے تو وہ بھی گانے لگتے۔"

(سرات ایک قصبے کا نام ہے)

"سلیمی کی آرزو یہ ہے کہ میں اس کی محبت میں مرجاؤں۔"

"اور اس کی یہ آرزو تو ہمارے نزدیک ہر چیز سے زیادہ آسان ہے۔"

بعض علماء نے حضرت منصور حلاجؒ کے نعرۂ "اناالحق" پر دلائل کے ساتھ تفصیلی بحث کی ہے۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں۔ "حسین بن منصورؒ کا مشہور قول ہے کہ جو چیز اسی کے پیدا کرنے سے پیدا ہوئی وہ اس میں کیوں کر حلول کرسکتی ہے۔ حادث، قدیم کے ساتھ متحد نہیں ہوسکتا۔ (انسان حادث ہے اور اللہ کی ذات قدیم) اس لئے جو لوگ حضرت منصور حلاجؒ پر "حلول اور اتحاد" کے عقیدے کا الزام عائد کرتے ہیں، ان کا خیال درست نہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو اول و آخر اور باطن و ظاہر سمجھتا ہو، اگر اس کی زبان سے کسی وقت "اناالحق" نکل گیا ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کہتا تھا۔ لہٰذا اس کے اقوال کی تاویل ضروری ہے۔"

آگے چل کر مولانا ظفر عثمانیؒ تحریر کرتے ہیں۔ "اور ایک تاویل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس وقت ابن منصورؒ کی زبان کلام حق کی ترجمان تھی۔ ان کی زبان سے اسی طرح "اناالحق" نکلا تھا جیسے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ لینے کیلئے گئے تھے۔ اچانک ایک درخت سے آواز آئی۔ "اے موسیٰ! میں ہی اللہ ہوں۔" (سورۃ القصص۔ آیت 30)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلویؒ فرماتے ہیں۔ "یہ درخت نہیں بول رہا تھا بلکہ اللہ کلام کررہا تھا۔ درخت تو اس کلام کا مظہر تھا۔ اسی طرح اگر اولیاء نے کسی وقت "اناالحق" کہہ دیا تو وہ خود نہیں کہہ رہے تھے۔ کہنے والا اللہ تھا۔ اولیاء تو اس کلام کے مظہر تھے۔"

اس سلسلے میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں۔ "ظاہر ہے کہ درخت نے اپنے آپ کو اللہ

رب العالمین نہیں کہا تھا بلکہ اس وقت وہ کلام الٰہی کا ترجمان تھا۔ اسی طرح ابن منصورؒ کے متعلق بھی خیال کیا جاسکتا ہے۔ غلبۂ واردات وحالات میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ عارف کی زبان سے اللہ تعالیٰ تکلم فرماتے ہیں۔ اسے سالکین اصحاب حال سمجھ سکتے ہیں۔ پس یہ بات تو مانی جاسکتی ہے کہ ابن منصورؒ کی زبان سے ''اناالحق'' نکلا ہو مگر یہ تسلیم شدہ نہیں کہ ابن منصورؒ نے خود ''اناالحق'' کہا تھا۔''

تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ کو نعرۂ ''اناالحق'' کی وجہ سے قتل نہیں کیا گیا۔ ان کے قتل کا جواز صرف وہی ایک واقعہ تھا جس میں حضرت حسین بن منصورؒ نے کہا تھا کہ اگر کوئی عاجز شخص حج بیت اللہ کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے گھر کو پاک صاف کر کے اس کا طواف کرے۔ یہ عمل حج کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔

ہمارے نزدیک یہ واقعہ بھی متنازع ہے کیونکہ حضرت منصور حلاجؒ کے بقول انہوں نے ''حج کا مضمون'' حضرت امام حسن بصریؒ کی کتاب سے مستعار لیا تھا۔

صرف علامہ زکریا بن محمد قزوینی نے اپنی کتاب ''آثار البلاد'' میں ''اناالحق'' کا ذکر کیا ہے۔ علامہ کے بقول ''اناالحق'' کہنے کی وجہ سے لوگوں میں حضرت منصور حلاجؒ کی مخالفت کا جوش پیدا ہوا مگر قتل کیلئے اس بات کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ حامد بن عباس اور اس کے ساتھی قتل کا جواز ڈھونڈنے میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن بحث کے دوران قاضی ابوعمر کی زبان سے غصے میں ''یا حلال الدم'' (اے جس کا خون جائز ہے) نکل گیا اور پھر ان ہی دولفظوں کو بنیاد بنا کر ایک بے گناہ کا خون بہادیا گیا۔

بہ لوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول راجز بے گناہی نیست تقصیرے
(میری قبر پر غیب سے یہ تحریر لکھی گئی کہ بے گناہ کے سوا اس مقتول کا کوئی جرم نہیں تھا)

☆☆.........☆☆.........☆☆

اکثر مؤرخین کے مطابق حضرت منصور حلاجؒ کی مقبولیت عوام الناس کے عقائد میں خلل انداز ہورہی تھی۔ اس لئے کسی مذہبی فتنے کے خوف سے حامد بن عباس نے حضرت حسین بن منصورؒ کو قتل کرا دیا۔ ہمارے نزدیک یہ ایک گمراہ کن تجزیہ ہے۔ مؤرخین کے تبصروں کو پڑھ کر ایک عام مسلمان قاری یہی سوچتا ہے کہ حامد بن عباس ایک باکردار وزیر تھا اور اپنے سینے میں خدمت اسلام کا درد رکھتا تھا۔ اگرچہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہم مختصراً پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ دربار خلافت کا ایک بااثر شخص حاجب ابن نصر قشوری حضرت منصور حلاجؒ سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ خلیفہ مقتدر باللہ کی ماں شغب بھی حضرت منصور حلاجؒ کے حلقۂ عقیدت میں شامل تھی ...... اور اس عقیدت میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یہ صورتحال دیکھ کر وزیر حامد بن عباس پریشان ہوگیا۔ سیاسی اعتبار سے حاجب ابن نصر قشوری اس کا قریب ترین حریف تھا۔ حامد بن عباس کو خطرہ پیدا ہوا کہ اگر خلیفہ مقتدر باللہ بھی حضرت حسین بن منصورؒ کے زیر اثر آگیا تو ابن نصر قشوری دربار خلافت کا طاقتور ترین مہرہ بن جائے گا

......اور وہی مہرہ بالآخر اسے شکست سے دوچار کر دے گا۔ نتیجتاً حامد بن عباس نے حضرت منصور حلاجؒ کے قتل کا منصوبہ بنالیا۔ کیونکہ ان ہی کی روحانی شخصیت کے سائے میں خاندان شاہی کے افراد جمع ہورہے تھے۔ حامد بن عباس نے جس کو مذہبی فتنہ قرار دیا تھا، دراصل وہ ایک سیاسی فتنہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت حسین بن منصورؒ کی آڑ لے کر اسلام دشمنوں کی ایک مختصر سی جماعت مملکت میں ہنگامہ برپا کرنا چاہتی تھی۔ یہی لوگ حضرت منصورؒ کو خدا کہتے تھے اور ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے...... مگر اس سلسلے میں ہمیں حضرت حلاجؒ کا رویہ بھی دیکھنا چاہئے بہت سے تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ بات ثابت کی جاچکی ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ ان گمراہ لوگوں سے سخت بیزار تھے۔ آپ نے کئی بار علماء کی مجلس میں کھلے الفاظ کے ساتھ فرمایا تھا۔

''میں صحیح العقیدہ مسلمان ہوں، خدائے واحد کا پرستار ہوں۔ سرور کونین ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھتا ہوں اور اصحاب عشرۂ مبشرہ کی فضیلت کا قائل ہوں۔ جو لوگ مجھے خدا کہتے ہیں یا مجھ سے خلاف شریعت امور منسوب کرتے ہیں، وہ جھوٹے ہیں اور ہذیان بکتے ہیں۔''

اس وضاحت کے بعد اصولی طور پر حضرت منصور حلاجؒ کو تمام باتوں سے بری الذمہ قرار دینا چاہئے تھا مگر حامد بن عباس انہیں مجرم ثابت کرنے پر تلا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر حضرت حسین بن منصورؒ کو رہا کر دیا گیا تو ان کے حلقۂ اثر میں غیر معمولی اضافہ ہوجائے گا اور اسی مقبولیت کا سہارا لے کر حاجب ابن نصر قشوری اس کے اقتدار کی بساط الٹ دے گا۔ حامد بن عباس کی نظر میں حضرت منصور حلاجؒ اس سیاسی فتنے کی بنیاد تھے۔ نتیجتاً اس نے سیاسی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے 'بنیاد' پر وار کیا اور بالآخر ایک دن بنیاد کو ڈھانے میں کامیاب ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کی اکثریت نے حضرت حسین بن منصورؒ کو کشتۂ شریعت نہیں ''قتیل سیاست'' قرار دیا ہے۔

اب مستند تاریخی حوالوں کے ذریعے مختصراً حامد بن عباس کی شخصیت اور کردار کا جائزہ لیں گے۔ پھر قارئین کو خود پتا چل جائے گا کہ حامد بن عباس کے سینے میں خدمت اسلام کا درد تھا یا اس کے دل میں خواہش نفسانی کا خنجر پیوست تھا جو اسے ہمہ وقت پریشان و مضطرب رکھتا تھا۔

علامہ سیوطیؒ اپنی کتاب ''تاریخ الخلفاء'' میں فرماتے ہیں۔ ''300ھ میں مملکت اسلامیہ شدید انتشار کی لپیٹ میں آگئی۔ بغداد میں چیزیں مہنگی ہوگئیں اور لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ حامد بن عباس نے دیہات پر تاوان ڈال دیا تھا اور وہ عوام پر نئے نئے مظالم ڈھاتا تھا۔ نتیجتاً شہر میں لوٹ مار شروع ہوگئی۔ سیاسی حالات اس قدر بگڑ گئے کہ مجبور ہوکر فوج کو انتظام اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ عوام کے غیظ و غضب کا یہ حال تھا کہ انہوں نے فوج کو منتشر کر دیا اور مسلسل کئی دن تک لڑائی ہوتی رہی۔ مشتعل لوگوں نے قید خانے جلادیئے اور زنداں کے دروازے کھول دیئے۔ کئی روز تک لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رہا۔ وزیر حامد بن عباس پر پتھر برسائے گئے۔ غرض حکومت عباسیہ کی حالت بہت زیادہ دگرگوں ہوگئی۔ 309ھ میں حلاجؒ کو قاضی ابوعمر اور دیگر علماء کے اس فتوے کی وجہ سے قتل کیا گیا کہ وہ ''حلال الدم'' ہیں۔ منصورؒ کے احوال رفیعہ (بلند کرداری) کے سلسلے میں بہت سی روایتیں ہیں جنہیں بعض

لوگوں نے مستقل تصانیف میں مدون کیا ہے۔"

علامہ سیوطیؒ کے اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ حامد بن عباس اعمال کی کن پستیوں میں رینگ رہا تھا اور حضرت منصور حلاجؒ کردار کی کن بلندیوں پر رواں دواں تھے۔

فرانسیسی عالم لوئی ماسینیون اپنی کتاب "حسین بن منصور حلاجؒ" میں تحریر کرتا ہے۔ "منصور حلاجؒ کے تمام بدخواہوں اور دشمنوں کا سرغنہ خلیفہ مقتدر باللہ کا بوڑھا وزیر حامد بن عباس تھا۔ یہ آدمی مدت سے مستوفی مالیات (وزیر خزانہ) چلا آرہا تھا۔ اس عہدے نے حامد بن عباس کو اس قدر مغرور وم کر دیا تھا کہ اگر درآمد سے ایک دینار بھی بیت المال (سرکاری خزانے) میں جاتا تو وہ یہی سمجھتا کہ وہ اپنی جیب سے دے رہا ہے۔ اس شخص نے بڑی چال بازی اور ریاکاری سے بہت سی دولت جمع کر لی تھی...... اس کی زندگی کا بیشتر حصہ عیش وعشرت میں گزرا تھا...... مگر ایسی عیش وعشرت کہ جس میں لطف و اخلاق کا گزر نہ تھا (فرانسیسی عالم کہنا چاہتا ہے کہ حامد بن عباس ایک عیاش انسان تھا) حامد بن عباس بظاہر مسلمان تھا مگر اس کا ایمان پختہ نہ تھا۔ وہ ایک حریص اور کوتاہ نظر آدمی تھا اور بیکار سپاہی تھا۔ اسی فساد اخلاق کے باعث حامد بن عباس نے حضرت منصور حلاجؒ سے دشمنی رکھی۔ اسے حلاجؒ کا ہر کام برا نظر آتا تھا۔ اسے روحانیت منصورؒ اچھی نہ لگتی اور نہ اس کی پارسائی۔ وہ حلاجؒ کے انداز آخرت پر کان دھرتا اور نہ ان کی کرامات سے متاثر ہوتا۔ مختصر یہ کہ منصورؒ اس کی نظر میں ایک ایسا برا جادوگر تھا جو ہر رنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حامد بن عباس چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو، دنیا کو حلاجؒ کے وجود سے پاک کر دیا جائے۔"

فرانسیسی عالم آگے چل کر لکھتا ہے کہ دوسرا شخص شلمغانی تھا جو حامد بن عباس کو ابن منصورؒ کی مخالفت پر بھڑکاتا تھا۔ شلمغانی کو حامد بن عباس کے داماد نے یہ کہہ کر اپنے خسر سے ملایا تھا۔

"یہ شخص آپ کے کاموں میں بہت معاون ثابت ہوگا۔"

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ابن منصورؒ کی دشمنی میں شلمغانی حد سے گزر گیا اور واقعتاً وہ حامد بن عباس کے بہت کام آیا۔ شلمغانی پست فطرت، ظالم اور شرابی انسان تھا۔ حامد بن عباس کے قتل کے تیرہ سال بعد شلمغانی بھی دردناک موت سے دوچار ہوا۔

فرانسیسی عالم لوئی ماسینیون، قاضی ابوعمر کے بارے میں لکھتا ہے۔ "وہ عیش پرست اور ہوشیار انسان تھا۔ **317**ھ کے انقلاب میں قاضی ابوعمر کی سب سے بڑی خواہش پوری ہوئی یعنی وہ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے عہدے تک پہنچ گیا، قاضی ابوعمر ایک زمانہ ساز درباری اور ہوا کے رخ پر چلنے والا انسان تھا۔ وہ بڑی آسانی کے ساتھ ہر سانچے میں ڈھل جاتا تھا۔ قاضی ابوعمر کی تلون مزاجی مشہور تھی (یعنی وہ کسی ایک بات پر قائم نہیں رہ سکتا تھا) اسے عطریات سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔" عجیب انداز سے اپنے حکم کے خلاف نیا حکم جاری کر دیا کرتا تھا اسے اپنے غلط کام کو درست اور معقول ثابت کرنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ قاضی ابوعمر فقہ میں کمزور تھا اور دوسرے کاموں کے ذریعے اپنی اس کمزوری کو چھپاتا تھا۔"

لوئی ماسینیون خلیفہ مقتدر باللہ کے بارے میں تحریر کرتا ہے کہ وہ سست رائے اور متلون مزاج انسان تھا۔ جب اسے یہ بات یاد دلائی جاتی کہ خلیفۃ اللہ کے سامنے جواب دہ ہے، تو وہ آزردہ خاطر ہو جاتا۔ اپنے پورے دور اقتدار میں مقتدر باللہ کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ اسے میدان حشر میں اللہ کے حضور، اپنے اعمال کا حساب پیش کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے حلاجؒ سے منہ پھیر لیا تھا۔ مقتدر باللہ سونے کے ڈھیر پر فریفتہ تھا۔ اس نے ایک رشوت خور حبشی "مفلح" کو اپنے حرم کا خواجہ سرا اور نگہبان مقرر کیا تھا۔

(مفلح وہی شخص ہے جس نے حامد بن عباس کی مرضی کے مطابق حضرت منصور حلاجؒ کے قتل نامے پر خلیفہ سے مہر تصدیق ثبت کرائی تھی) مقتدر باللہ کی ماں شغب بیٹے کی منت سماجت کرتی اور اسے قسم دیتی کہ وہ حلاجؒ کو آزار پہنچانے سے باز رہے...... لیکن اس نے ماں کی گریہ وزاری کو بھی جھٹلا دیا تھا۔"

یہ ہیں حضرت منصور حلاجؒ کے مخالفین اپنے کردار کے آئینے میں۔

☆☆.................☆☆.................☆☆

خطیب بغدادی کی روایت ہے کہ قتل کے بعد سر منصورؒ کو دو دن کیلئے بغداد کے پل پر آویزاں کر دیا گیا۔ پھر اسے خراسان لے جا کر گلی کوچوں میں پھرایا گیا اور حامد بن عباس کے حکم کے مطابق حکومت کے نقارچیوں نے جی بھر کے تشہیر کی۔ عام طور پر دنیادار حکمراں سلطنت کے باغیوں سے اس قسم کا برتاؤ روا رکھتے ہیں ورنہ اسلام میں کافروں کے ساتھ بھی یہ برتاؤ جائز نہیں۔ حامد بن عباس اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کیلئے، حضرت منصور حلاجؒ کو حکومت کا باغی قرار دے چکا تھا تاکہ دور دراز کے لوگوں پر اس کی ہیبت قائم ہو جائے۔

ہماری تحقیق کی حد تک، کسی تاریخ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ سر منصورؒ کی تشہیر کے بعد اسے کہاں دفن کیا گیا؟ البتہ فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینیون کہتا ہے کہ خلیفہ مقتدر باللہ کی والدہ "شغب" نے حضرت منصور حلاجؒ کے سر مبارک کو ایک سال تک شاہی خزانے میں حفاظت سے رکھا۔ پھر درعلج کے تعاون سے اپنے بھائی کے مقبرے کے نزدیک دفن کرا دیا۔ درعلج ایک دلیر شخص تھا جس نے حضرت حسین بن منصورؒ کے سر کو اپنی نگرانی میں سپرد خاک کیا۔

لوئی ماسینیون کی اس روایت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مقتدر باللہ کی والدہ نے ایک سال تک سر منصورؒ کی حفاظت کیوں کی؟ بس قیاس ہی کیا جا سکتا ہے کہ خلیفہ کی ماں حامد بن عباس اور اس کی جماعت سے خائف تھی کہ کہیں یہ بے رحم لوگ سر منصورؒ کو بھی نذر آتش نہ کر دیں۔ خیال ہے کہ جب حامد بن عباس دنیا سے گزر گیا ہوگا تو حضرت حلاجؒ کے سر کی تدفین عمل میں آئی ہوگی۔

خطیب بغدادی کی روایت ہے کہ حضرت منصورؒ کے قتل کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ حامد بن عباس کو بھی قتل کر دیا گیا۔ پہلے اس کے دونوں ہاتھ کاٹے گئے، پھر دونوں پاؤں جسم سے جدا کر دیئے گئے۔ حامد بن عباس تکلیف کی شدت سے اس قدر چیخا کہ اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ بہت دیر

تک زمین پر تڑپتا رہا اور لوگ عبرت کی آنکھ سے رقص بسمل دیکھتے رہے۔ یہ خون رنگ تماشا بہت دیر تک جاری رہا۔ آخر کسی شخص کو حامد بن عباس پر رحم آ گیا۔ وہ شمشیر بدست آگے بڑھا اور وزیر مملکت کو مخاطب کر کے کہا۔

"ہمارا جی تو یہی چاہتا ہے کہ تیرے بدن سے خون کا ایک ایک قطرہ بہہ جائے اور تا دیر تجھ پر جان کنی کی کیفیت طاری رہے مگر ہم لوگ مسلمان ہیں۔ اس لئے تیری مشکل آسان کئے دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس شخص نے حامد بن عباس کا سر قلم کر دیا۔

پھر وزیر مملکت کے گھر کو آگ لگا دی گئی۔ بندگان خدا کے حقوق کا خون کر کے، عمر بھر جو دولت جمع کی گئی تھی، وہ خونخوار شعلوں کی زد میں تھی۔ ہر طرف موت کا دھواں پھیلا ہوا تھا اور وہاں موجود تمام لوگ باآواز بلند کہہ رہے تھے۔

"حامد بن عباس کو حضرت شیخ ابن عطاؒ کی بددعا کھا گئی۔"

اس کے دردناک انجام میں دو عوامل نمایاں طور پر کارفرما تھے۔ ایک حضرت منصور حلاجؒ کا قتل کہ حامد بن عباس نے اسی طرح ان کے دست و پا بھی قطع کئے تھے...... اور دوسرے حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ کی بددعا کہ اے اللہ! اسے قتل کرا اور اس طرح قتل کر کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں۔ قدرت کے اس محاسبے میں اہل نظر کیلئے بڑی نشانیاں ہیں۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

اور اب اس شخص کا انجام جو صاحب اقتدار تھا یعنی عباسی خلیفہ مقتدر باللہ۔ اگر وہ چاہتا تو حضرت حسین بن منصورؒ کو معاف کر سکتا تھا یا کم سے کم ان کی سزا میں تخفیف کر سکتا تھا...... اور اگر علماء کے فتوے کے مطابق یہ ممکن نہیں تھا تو پھر حامد بن عباس کو وحشت و درندگی کے مظاہرے سے باز رکھ سکتا تھا مگر مقتدر باللہ نے تو ماں کی التجاؤں اور بہتے ہوئے آنسوؤں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔

آخر خون منصورؒ رنگ لایا۔ 320ھ میں مونس نے موصل پر قبضہ کر لیا اور کچھ دن بعد ہی بغداد پر حملہ کرنے کی غرض سے اپنی فوجوں کو کوچ کا حکم دیدیا۔ جب مقتدر باللہ کو خبر ملی تو وہ اپنا لشکر لے کر آگے بڑھا...... اور پھر "باب شماسیہ" پر فریقین میں خونریز تصادم ہوا۔ مقتدر باللہ کو شکست فاش ہوئی اور وہ میدان جنگ سے فرار ہو کر بغداد کی طرف پلٹا۔ راستے میں بربریوں کے ایک فوجی دستے نے مقتدر باللہ کو گھیر لیا۔ معمولی سی مزاحمت کے بعد خلیفہ کے مختصر لشکر نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور ایک بربری نے آگے بڑھ کر مقتدر باللہ کا سر قلم کر دیا۔ کچھ لوگوں نے عباسی خلیفہ کے کپڑے اتار لئے اور اس کی برہنہ لاش وہیں چھوڑ دی۔ پھر سر کو نیزے پر بلند کر کے مونس کے سامنے لے گئے۔

جب مقتدر باللہ کا کٹا ہوا سر گلی کوچوں سے گزرا اور اس کی داستان رسوائی گھر گھر پہنچی تو لوگوں کو حضرت منصور حلاجؒ کے وہ الفاظ یاد آئے: آپ نے قتل کے فتوے پر دستخط کرنے والے علماء سے کہے تھے۔

"میرے معاملے میں اللہ سے ڈرو...... میرے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔"

اس لئے ان کے انجام کی کسی کو خبر نہیں۔ پھر بھی عوام نے انہیں پسندیدہ نظروں
علماء مجبور تھے۔
سے نہیں دیکھا۔ بعد میں آنے والی نسلوں نے بھی اپنے دلوں میں اس کیلئے کوئی گنجائش محسوس نہیں کی
مگر جو صاحبان اختیار تھے، ان کی بے اختیاری عبرت خیز تھی۔ قتل منصورؒ میں شریک ہونے والا کوئی ......
ایک فرد بھی سلامتی کے ساتھ دنیا سے نہیں گیا۔

چلے تو منصور حلاجؒ بھی گئے کہ ایک دن سبھی کو جانا ہے...... مگر ان کے جانے کی ادا بڑی نرالی تھی۔ اس شان سے گئے کہ تاریخ عشق کے سینے پر قدموں کے نشان چھوڑ گئے۔ کتنے زلزلوں نے زمین کو زیروزبر کیا اور کتنے سیلابوں نے سنگی عمارتوں کے آثار تک دھو ڈالے مگر وہ کیسے عجیب نشانات ہیں کہ گیارہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی دھندلے نہیں ہوئے۔ ظاہر پرست مؤرخ کہتے ہیں کہ حسین بن منصورؒ کو ان کے ہم عصر صوفیاء نے رد کر دیا تھا، اس لئے وہ گمراہ تھے، شعبدہ باز، جادوگر اور زندیق تھے مگر ان لوگوں کا حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ حضرت شیخ ابن عطاؒ، حضرت حسین بن منصورؒ کے ہم عصر ہی نہیں تھے بلکہ اپنے زمانے میں امام شریعت و طریقت بھی تھے ......اور برملا کہا کرتے تھے۔

"ہم تو منصورؒ کے ادنیٰ غلاموں میں سے ہیں۔"

ابن عطاؒ سے بڑھ کر کس کی گواہی ہو گی کہ حضرت حلاجؒ کے عقائد پر شہادت دیتے دیتے خود بھی شہید ہو گئے۔

حضرت ابو عبداللہ محمد بن خفیفؒ یکتائے بروزگار صوفی اور شیخ المشائخ ہونے کے باوجود حضرت حسین بن منصورؒ کے نیازمندوں میں شامل تھے۔ آپ اکثر قید خانے میں حاضر ہوتے اور حضرت منصور حلاجؒ سے تصوف کے رموز و نکات پر گفتگو کرتے؟ خود بھی صاحب کرامت تھے اور حضرت ابن منصورؒ کی کرامات بھی برسر مجلس بیان کیا کرتے تھے۔ آپ کا مشہور قول ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ عالم ربانی تھے۔

حضرت شیخ ابوالقاسم نصر آبادیؒ صوفیاء میں بھی ممتاز تھے اور علمائے ظاہر میں بھی آپ کا درجہ بہت بلند تھا۔ حضرت شیخ ابوالقاسمؒ کو ثقہ محدثین میں شمار کیا جاتا ہے۔ حطیب بغدادیؒ کے بقول ایک دن محمد بن حسین حضرت شیخ ابوالقاسم نصر آبادیؒ کی مجلس میں موجود تھے۔ حضرت منصور بن حلاجؒ کا ذکر آیا تو آپ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے روح کے بارے میں حضرت حلاجؒ کا قول نقل کیا تو ایک شخص برہم ہو گیا اور کہنے لگا۔

"اس کی مثال کیوں لاتے ہو؟ منصور کو خدائے واحد سے کیا سروکار؟"

"پھر آپ نے کیا جواب دیا؟" محمد بن حسین نے پوچھا۔

"میں نے صاف کہہ دیا کہ انبیائے کرام اور صدیقین کے بعد اگر کوئی موحد ہے تو وہ حلاج ہی ہیں۔"

حضرت شیخ ابوالقاسم نصر آبادیؒ کا انتقال 369ھ میں ہوا۔ اگرچہ حضرت شیخ ؒ ابن منصورؒ کی

شہادت کے وقت کم عمر ہوں گے لیکن پھر بھی آپ کا زمانہ حضرت حلاجؒ کے زمانے سے بہت زیادہ قریب ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ فرمایا کرتے تھے۔ ''میں اور ابن منصورؒ دونوں ایک ہی ہیں۔ میرا بھی وہی حال ہے جو ان کا ہے مگر فرق یہ ہے کہ انہوں نے اپنا حال ظاہر کردیا اور میں نے چھپائے رکھا۔''

حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے ایک موقع پر فرمایا۔ ''لوگوں نے مجھے دیوانہ سمجھ کر چھوڑ دیا مگر منصورؒ کو ان کی عقل نے ہلاک کرڈالا۔''

بعض تاریخوں میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ جب حضرت حسین بن منصورؒ کو سرمقتل لے جایا گیا تو حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ بھی وہاں تشریف لے گئے اور حضرت منصورؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''کیا ہم نے تمہیں دنیا والوں سے روکا نہیں تھا؟''

حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے علمائے تحقیق نے لکھا ہے کہ شبلیؒ نے ابن منصورؒ کو نصیحت کی تھی کہ وہ مغلوب الحال ہیں اور ایسے شخص کو مکمل طور پر خلوت میں رہنا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جذب و مستی کی وجہ سے ان کی زبان لڑکھڑا جائے اور عوام معرفت کے اسرار و رموز سمجھنے سے قاصر رہیں۔ پھر بات بدل جائے اور لوگ نئے نئے مفہوم تراشنے لگیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے بھی شروع میں حضرت ابن منصورؒ کو صبر اور خلوت کی تلقین کی تھی...... مگر دل کی خلش نے انہیں حجرے کے کسی گوشے میں چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ یہاں تک کہ مقتل سج گیا اور صلیب ان کے خون سے رنگین ہوگئی۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

امام ابوالقاسم عبدالکریم قشیریؒ بھی فرماتے ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ کا عقیدہ اہلسنت کے عقیدے کے مطابق تھا۔

شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ، حضرت حسین بن منصورؒ کی بہت تعظیم کیا کرتے تھے۔

سیدنا غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت ابن منصورؒ کو سالک طریقت مانتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی معذور بھی سمجھتے تھے۔ حضرت غوث اعظمؒ فرماتے ہیں۔

''حسین بن منصورؒ کو طریقت میں ایک دشواری پیش آگئی تھی۔ ان کے زمانے میں کوئی ایسا نہ تھا کہ ان کا ہاتھ پکڑ لیتا اور سلامتی کے ساتھ اس دشواری سے نکال دیتا۔ میں اپنے اصحاب، مریدوں اور محبت کرنے والوں میں سے ہر اس شخص کا ہاتھ پکڑنے والا ہوں جس کی سواری کو ٹھوکر لگ جائے۔''

حضرت غوث اعظمؒ کے قول مبارک کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا ظفر احمد عثمانیؒ تحریر کرتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادیؒ 297ھ میں انتقال فرما چکے تھے اور حضرت حسین بن منصورؒ 309ھ میں قتل کیے گئے۔ اگر حضرت جنید بغدادیؒ حیات ہوتے تو اپنے شاگرد کی دستگیری ضرور کرتے۔ اسی طرح حضرت شیخ عمرو بن عثمان مکیؒ 296ھ میں اور حضرت شیخ ابوالحسن 295ھ میں دنیا سے رخصت

ہوچکے تھے...... اور یہی وہ تینوں بزرگ تھے جن سے حضرت حسین بن منصورؒ نے رجوع کیا تھا۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا خیال ہے کہ اگر یہ مشائخ زندہ ہوتے تو حضرت منصور حلاجؒ کو اس مشکل سے نکال سکتے تھے...... مگر میں عاجز و ناقص عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لوح محفوظ پر یہی لکھا جاچکا تھا کہ ابن منصورؒ کے دست و پا قطع کئے جائیں اور پھر انہیں نذر آتش کرکے ان کی راکھ دریائے دجلہ میں بہا دی جائے۔ حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ اور حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ صاحبان کشف تھے۔ ان تینوں مشائخ پر یہ راز فاش ہوچکا تھا کہ ابن منصورؒ کا یہی مقدر ہے۔ اس لئے تینوں بزرگوں نے خاموشی اختیار کی۔

مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ اس طرح حضرت حسین بن منصورؒ کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

''وہ اللہ کے راستے میں اللہ کے قتیل، میدان تحقیق کے شیر، بہادر، صف شکن، صدیق، بڑی موجیں مارنے والے دریا کے غریق، حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ۔ ان کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ ان کے واقعات کی عجیب شان ہے جو ان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ بے انتہا سوز و اشتیاق رکھتے تھے اور شورش فراق کی شدت میں مست و بے قرار تھے۔ وہ عاشق صادق و پاکباز تھے۔ مشقت اور مجاہدے میں بڑے درجے پر فائز تھے۔ وہ بلند ہمت، عالی منزلت اور شیریں بیان تھے۔ حقائق و اسرار و معانی میں بہت کامل تھے۔ باریک بین تھے اور فراست و دانائی میں بے نظیر تھے۔ اول سے آخر تک ان کے معاملات کی بنیاد بلا پر رہی۔''

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ بھی حضرت ابن منصورؒ کی ولایت و معرفت کے قائل تھے۔

علامہ شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ اپنے وقت میں علوم ظاہری و باطنی کے مسلم امام تھے۔ علامہؒ نے حضرت منصور حلاجؒ کو اولیاء میں شمار کیا اور ان کے عارفانہ اقوال سے اپنی کتاب ''طبقات کبریٰ'' کو زینت دی۔

حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ) کے نزدیک حضرت حسین بن منصورؒ بڑے قوی حال اور عالی ہمت بزرگ تھے...... مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے۔ ''وہ بحمد اللہ مجھے دل سے عزیز ہیں مگر ان کا طریق مستقیم نہ تھا اور حال بھی مقرر نہ تھا۔ ایسے لوگوں کا کلام تقلید کے قابل نہیں ہوتا کہ وہ مغلوب الحال ہوتے ہیں۔''

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ فرماتے ہیں کہ قتل کے بعد میں نے حضرت منصور حلاجؒ کو خواب میں دیکھا۔ وہ بہت خوش نظر آرہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟''

حضرت ابن منصورؒ نے فرمایا۔ ''اللہ نے اپنی نوازش سے مجھے قصر صدق (سچائی کے محل) میں اتارا۔''

''ان دونوں گروہوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا جو آپ کو اچھا اور برا کہتے تھے؟'' حضرت شبلیؒ نے

دوسرا سوال کیا۔
"اللہ نے دونوں گروہوں پر اپنی رحمت نازل فرمائی۔" حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ "ایک پر اس لئے رحمت نازل کی گئی کہ اس نے میرے حال سے واقف ہو کر مجھ پر مہربانیاں کیں اور دوسرے پر اس لئے کہ وہ مجھ سے واقف ہی نہیں تھا اور صرف اللہ کے واسطے مجھ سے بغض رکھتا تھا۔"

کسی دوسرے بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ میدان حشر نظروں کے سامنے ہے اور حضرت حسین بن منصورؒ ایک ہاتھ میں جام لئے کھڑے ہیں اور سر جسم سے غائب ہے۔ بزرگ نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ سر قلم شدہ بندوں ہی کو جام عنایت فرماتا ہے۔"

اگر گیتی سراسر باد گیرد
چراغ مقبلاں ہرز نمیرد

(اگر زمین سراسر ہوا بن جائے، تب بھی صاحب اقبال اور مقبول لوگوں کے چراغ کو بجھایا نہیں جا سکتا۔)

حضرت سیّد علی ہجویریؒ

ولادت......400ھ (غزنی)

وفات......465ھ (لاہور)

غزنی کے ایک علاقے "ہجویر" میں پیدا ہوئے۔ والد محترم کا نام سیّد عثمان......آپ کا سلسلۂ نسب براہ راست حضرت امام حسینؓ سے ملتا ہے۔ علوم شریعت حاصل کرنے کیلئے طویل سیاحت کی اور اپنے وقت کے اکابر صوفیاء اور علماء سے اکتساب فیض کیا۔ پیر و مرشد کے حکم سے سلطان محمود غزنوی کے دور میں لاہور تشریف لائے۔ آپ نے تبلیغ اسلام کے لئے شدید اذیتیں برداشت کیں۔ حضرت سیّد علی ہجویریؒ کا شمار اُن صوفیائے عظام میں ہوتا ہے جن کا ہر عمل رسول اللہ ﷺ کے تابع تھا۔ لوگ فرط عقیدت میں آپ کو "داتا گنج بخشؒ" کہہ کر پکارتے تھے......مگر آپ اِس لقب سے سخت بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے تھے......

"داتا تو ایک ہی ہے......یعنی اللہ......"

آپ نے تصوف کے موضوع پر بے مثال کتاب "کشف المحجوب" تحریر کی۔

بت شکن سلطان محمود غزنوی دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور اس کے وارثوں میں اقتدار کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ 431ھ کا سال اہل غزنی کے لئے بڑا گراں ثابت ہوا تھا۔ سلطان مسعود غزنوی نے اپنے حقیقی بھائی امیر محمد کو اندھا کرا کے زنداں کے حوالے کر دیا تھا۔ وقت نے کروٹ لی تو اسی نابینا امیر محمد کے وفادار سپاہیوں نے سلطان مسعود کو گرفتار کر کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ پھر 433ھ میں سلطان مسعود کو قتل کرا دیا گیا۔ عجیب نیرنگیٔ زمانہ تھی۔ ایک بھائی قاتل تھا اور دوسرا مقتول۔ عظیم فاتح کی اولاد ایک دوسرے کی شہ رگ پر خنجر کھینچ رہی تھی۔ یہ جانگداز مناظر دیکھ کر غزنی کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ ابوالفضلؒ نے اپنے مرید خاص سے کہا۔

''سید! اب تم یہ علاقہ چھوڑ کر پنجاب کی طرف چلے جاؤ۔ وہاں کے لوگوں کو تمہاری ضرورت ہے۔''

''اور شیخ محترم آپ؟'' مرید نے عرض کیا۔

''میرا کیا ہے؟ میں اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا۔'' خواجہ ابوالفضلؒ نے فرمایا...... ''جتنی سانسیں لکھ دی گئی ہیں، وہ پوری کروں گا اور پھر تہہ خاک سو جاؤں گا۔''

مرید کے لئے پیر و مرشد کی جدائی سخت گراں تھی مگر حکم شیخ کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر جواں سال درویش حضرت خواجہ ابوالفضلؒ کی دعاؤں کے سائے میں ہندوستان کی طرف روانہ ہوا اور ڈیڑھ ماہ کی طویل مسافت طے کر کے لاہور پہنچا۔

اگرچہ اس وقت لاہور اسلامی سلطنت کے زیر نگیں تھا لیکن غزنی کے انتشار اور مسلمانوں کی باہمی رنجشوں نے اہل ہنود کے حوصلے بڑھا دیئے تھے۔ دہلی اور دوسرے علاقوں کے ہندو راجہ متحد ہو گئے تھے اور پھر انہوں نے سیاسی حکمت عملی کے طور پر ہانسی اور تھانیسر کے مسلمانوں کو محصور کر دیا تھا۔ محصورین نے اہل لاہور سے مدد مانگی مگر آپس کی نااتفاقی کے سبب تھانیسر اور ہانسی کے مسلمانوں کو فوجی کمک نہ پہنچ سکی۔ نتیجتاً ان دونوں تاریخی شہروں پر ہندوؤں کا غلبہ ہو گیا اور مسمار شدہ بت خانے دوبارہ تعمیر کئے جانے لگے۔ پھر یہ ہندو راجہ دس ہزار کا لشکر لے کر آگے بڑھے اور لاہور کا محاصرہ

کرلیا۔مقامی مسلمانوں پر بڑا نازک وقت تھا۔لاہور کے باشندے دن میں نہ کاروبار کر سکتے تھے اور نہ رات کو چین کی نیند سو سکتے تھے۔آخر یہاں کے حاکم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے غزنی کی اطاعت قبول کرتے ہوئے مدد کی درخواست کی......مگر اس سے پہلے کہ غزنی سے کوئی فوجی مدد آتی، دست قدرت نے کفار کی بچھائی ہوئی بساط الٹ دی۔اچانک ہندو راجاؤں میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ اپنی اپنی فوج لے کر واپس چلے گئے۔اس طرح لاہور اغیار کی یورشوں سے محفوظ رہا۔

غزنی سے آنے والے درویش نے اہل لاہور کی معاشرت کا جائزہ لیا۔مرکز کی کمزوری نے مفتوحہ علاقوں کے مسلمانوں کو خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا تھا۔ہر شخص اپنی ذات میں گم تھا اور اسے تبلیغ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔رشد و ہدایت کا جو کام سلطان محمود غزنوی کے دور میں شروع ہوا تھا،اس پر جمود کی کیفیت طاری تھی۔

غزنی کے جواں سال درویش نے لاہور آتے ہی ایک نئی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔مقامی باشندوں نے خدا کا نیا گھر تعمیر ہوتے دیکھا تو ایک دن درویش کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے۔

''یہاں پہلے ہی کئی مسجدیں موجود ہیں،پھر نئی عبادت گاہ کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت ہے۔''درویش نے پرزور لہجے میں کہا۔''وہ امراء کی بنائی ہوئی مسجدیں ہیں اور اس مسجد کو اللہ کا ایک مزدور بندہ تعمیر کر رہا ہے۔''

مقامی باشندوں نے بڑی حیرت سے درویش کا جواب سنا مگر وہ اس بات کی گہرائی کو نہ سمجھ سکے۔

نئی مسجد کی تعمیر کا کام زور و شور سے جاری رہا۔خانۂ خدا کی تعمیر میں جواں سال درویش کی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ وہ خود بھی اپنے ہاتھوں سے اینٹیں اور گارا اٹھایا کرتا تھا۔لاہور کے امراء کو حیرت تھی کہ اب تک درویش نے مسجد کے سلسلے میں ان سے کسی قسم کے تعاون کی درخواست نہیں کی ہے۔پھر یہ اخراجات کس طرح پورے ہوتے ہیں؟درویش ذاتی طور پر کوئی مالدار شخص ہے یا پھر کچھ خفیہ ہاتھ اس کی مدد کر رہے ہیں؟الغرض لاہور کا ہر مسلمان باشندہ تعمیر مسجد اور نو وارد درویش کے بارے میں سوچ رہا تھا......اور درویش اپنے کاموں میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے گرد و پیش کی خبر تک نہیں تھی۔

پھر جب مسجد کی تعمیر کا پون کام مکمل ہو گیا تو ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔مغل شہزادہ دارا شکوہ اپنی مشہور تصنیف ''سفینۃ الاولیا''میں تحریر کرتا ہے کہ ایک دن لاہور کے کچھ علماء غزنی کے درویش کے پاس آئے اور کہنے لگے۔

''تمہاری ساری محنت اکارت گئی۔''

درویش نے علمائے لاہور کی طرف حیرت سے دیکھا اور کہا......''ایک مزدور کی محنت کیسے رائیگاں جا سکتی ہے جبکہ وہ خلوص نیت کے ساتھ خدا کے کاموں میں مصروف ہو۔''

''یہ سب کچھ تمہاری لاعلمی اور بے خبری کے سبب ہوا ہے۔''علمائے لاہور نے جواب دیا......''اگر تم مسجد کی تعمیر سے پہلے کسی ہوشمند انسان سے مشورہ کر لیتے تو خانۂ خدا میں یہ نقص واقع نہ ہوتا۔''

''کیا نقص؟''درویش کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

''کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ مسجد کے قبلے کا رخ صحیح نہیں ہے۔اس کا جھکاؤ کسی قدر جنوبی سمت کی طرف ہے۔''علمائے لاہور نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

غزنی کے درویش نے ایک نظر مسجد کی طرف دیکھا۔پھر انتہائی پر یقین لہجے میں کہا......''میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں،وہ آپ حضرات کو نظر نہیں آ رہا ہے۔اس مسجد کا قبلہ بھی درست ہے اور میرے دل کا بھی۔''

علمائے لاہور کو جواں سال درویش کی یہ بے نیازی پسند نہیں آئی......''عنقریب تمام لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ کس کی بصارت میں خلل ہے۔''یہ کہہ کر علماء کی جماعت واپس چلی گئی اور درویش پورے ذوق و شوق کے ساتھ خانۂ خدا کی تعمیر میں مصروف ہو گیا۔

پھر جب مسجد مکمل ہو گئی تو غزنی کے درویش نے تمام علمائے لاہور کو خانۂ خدا میں جمع ہونے کی دعوت دی۔

علمائے لاہور پورے ذوق و شوق کے ساتھ تشریف لائے۔ان کا خیال تھا کہ غزنی کے درویش کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور اب اس نے اپنی کوتاہی کے ازالے کی کوئی تدبیر دریافت کرنے کیلئے انہیں بلایا ہوگا۔اپنے ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں علمائے لاہور مسجد میں جمع ہوئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ خانۂ کعبہ کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے......اور قبلے کا رخ وہی ہے جس پر انہیں اعتراض تھا۔

ظاہر پرست علماء اس صورتحال سے بہت خوش تھے کہ اب وہ غزنی کے درویش کی بھرپور گرفت کر سکیں گے اور مخلوق خدا کے سامنے علی الاعلان کہہ سکیں گے کہ فاضل اور تجربہ کار بزرگوں کو نظر انداز کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

غزنی کے درویش نے بڑے والہانہ انداز میں علمائے لاہور کا استقبال کیا۔تھوڑی دیر بعد مؤذن نے پورے زور و شور کے ساتھ اذان کہی۔

علمائے لاہور سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ آخر اس اجتماع کا مقصد کیا ہے؟

ابھی سرگوشیوں کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ غزنی کا درویش اگلی صف سے اٹھا اور امامت کے مصلے پر پہنچ کر حاضرین مسجد سے مخاطب ہوا۔''آیئے حضرات،نماز ادا کریں۔''

پھر نماز ادا کی گئی۔عام لوگوں کو درویش کی امامت میں ایک خاص کیف حاصل ہوا۔خود علمائے لاہور نے بھی محسوس کیا کہ یہ نماز کیفیت کے اعتبار سے دوسری نمازوں سے کچھ مختلف تھی۔

نماز ختم ہوئی تو درویش نے رقت آمیز لہجے میں دعا کی......''اے خالق ارض و سما!اپنے عاجز بندوں کی اس حقیر سی خدمت کو قبول فرما۔''

دعا کے بعد غزنی کا درویش علمائے لاہور سے مخاطب ہوا......''آپ حضرات کو اس مسجد کے قبلے کے رخ پر اعتراض تھا؟''

''وہ اعتراض تو اب بھی ہے۔''لاہور کے ایک عالم نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا......''تم نے خانۂ خدا کی تعمیر کو اپنی انا کا مسئلہ بنایا،بزرگوں کی علمی حیثیت کو نظر انداز کیا اور اللہ کی زمین پر ایک

ایسی مسجد کھڑی کر دی جس کا قبلہ درست نہیں ہے۔"

"میں نہیں جانتا کہ انا کیا ہے؟" غزنی کے درویش نے اپنے روایتی صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ "میں کسی بزرگ کی علمی حیثیت پر معترض نہیں تھا۔ بس روز و شب اپنے کام میں مصروف رہا۔ جس کا عبادت کرتا ہوں، اسی سے استعانت کی بھیک مانگتا رہا۔ اب یہ کام تکمیل کو پہنچ گیا تو آپ حضرات نے اس لئے زحمت دی کہ اپنی آنکھوں سے قدرت خداوندی کا مظاہرہ دیکھ لیں۔"

یہ کہہ کر غزنی کے درویش نے مسجد کے میناروں کی طرف اشارہ کیا...... "اب ملاحظہ کیجئے کہ قبلہ کس طرف ہے؟"

بات علمائے لاہور کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ پھر بھی ان حضرات نے اس طرف دیکھا، جدھر غزنی کے درویش نے اشارہ کیا تھا۔ چشم حیرت پر عجیب منظر نمودار ہوا۔ لاہور کے مذہبی دانشوروں نے کھلی آنکھوں سے قبلے کا مشاہدہ کیا۔

"اب بتایئے کہ اس مسجد کی تعمیر میں کیا نقص ہے؟" غزنی کے درویش نے حیرت میں ڈوبے ہوئے علماء سے سوال کیا۔

"جب حقیقی قبلہ ہماری آنکھوں کے سامنے روشن ہے تو پھر شک کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے؟" علمائے لاہور نے بیک زبان کہا۔ معترضین اپنے طرز عمل پر نادم تھے اور بار بار جواں سال درویش کے سامنے معذرت کا اظہار کر رہے تھے۔ بعض بزرگ درویش کے شکر گزار بھی نظر آ رہے تھے۔

"یہ آپ کا فیض روحانی ہے کہ ہم لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ کر قبلۂ مکرم کے دیدار سے شرفیاب ہوئے۔"

درویش نے شکایت کرنے کے بجائے عجز و انکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا...... "میں کیا اور میرا فیض روحانی کیا؟ یہ تو حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ وہ اپنے نام لیواؤں کی شرم رکھ لیتا ہے۔ اللہ ہم سب کو ہدایت دے اور ہمارے دلوں کی تنگیوں کو دور فرمائے۔"

غزنی کے جس درویش سے یہ کرامت ظاہر ہوئی، وہ سید علی ہجویریؒ تھے جنہیں "داتا گنج بخش" کے لقب سے شہرت دوام حاصل ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت سید علی ہجویریؒ 400ھ یا 401ھ میں غزنی کے ایک محلے "ہجویر" میں پیدا ہوئے۔ اکثر مقامات پر آپ کو "جلابی" بھی لکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے والد محترم سید عثمانؒ "جلاب" کے رہنے والے تھے اور مادر گرامی کا تعلق "ہجویر" سے تھا۔ بعض محققین کی نظر میں "ہجویر" اور "جلاب" غزنی کے دو مشہور محلے ہیں۔ آپ کی کنیت ابوالحسن تھی اور شجرۂ نسب براہ راست حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ فقہی اعتبار سے امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کے مسلک پر عمل کرتے تھے۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے حصول علم کی خاطر بڑی مشقتیں برداشت کی ہیں۔ کئی بار ہجرت کی۔

کبھی فرغانہ کو اپنا مسکن بنایا، کبھی خراسان جا پہنچے اور کبھی ماوراء النہر کی سکونت اختیار کی۔ جہاں بھی کسی فاضل کا پتا ملا، اسی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اس لئے کوئی نہیں جانتا کہ حضرت سید علی ہجویریؒ کے اساتذہ کی تعداد کتنی ہے؟ پھر بھی مشہور ہے کہ مذہبی علوم میں آپ کے استاد حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ تھے۔

حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ کا معروف قول ہے...... "فقر کے راستے میں مرشد کی رضا جوئی سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ پس فقیر کو چاہئے کہ ہر وقت مرشد کو اپنے پاس ہی سمجھے۔"

مرشد کے بارے میں حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ کا یہ قول بھی شہرت رکھتا ہے...... "مرشد میں خواہشات نفسانی کے دریا کے پار اترنے کی صلاحیت موجود ہونی چاہئے۔ اگر مرشد ماہر تیراک نہیں ہوا تو ایک دن خود بھی ڈوبے گا اور مرید کو بھی لے ڈوبے گا۔"

ایک بار حضرت سید علی ہجویریؒ اپنے استاد گرامی حضرت ابوالقاسم گرگانیؒ کے دیدار کو حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرت شیخؒ طوس کی ایک مسجد میں تنہا بیٹھے تھے اور مسجد کے ستون سے باتیں کر رہے تھے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ فرماتے ہیں۔ "میں نے اپنے کانوں سے سنا۔ حضرت شیخؒ کوئی واقعہ ستون سے بیان کر رہے تھے۔ میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر جب استاد گرامی اپنی بات مکمل کر چکے تو میں آگے بڑھا۔ خدمت عالیہ میں سلام پیش کرنے کے بعد میں نے عرض کیا۔ "شیخ محترم! آپ کس سے ہم کلام تھے؟ یہاں مسجد میں تو کوئی دوسرا شخص موجود نہیں ہے۔"

حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ نے جواباً فرمایا...... "بیٹا! اس وقت اللہ نے مسجد کے ستون کو قوت گویائی عطا کی ہے۔ اس نے مجھ سے ایک بات پوچھی تھی میں اسی سوال کا جواب دے رہا تھا۔"

حضرت سید علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ استاد گرامی کا جواب سن کر مجھے اس ستون کا واقعہ یاد آ گیا جو سرور کونین ﷺ کے فراق میں رویا کرتا تھا۔

مسجد نبوی کی تعمیر سے پہلے رسالت پناہ ﷺ کھجور کے ایک ستون سے ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ پھر جب منبر تعمیر ہو گیا اور حضور اکرم ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر جمعہ کا خطبہ دیا تو کھجور کا وہ ستون رونے لگا۔ اس کے رونے کی آواز اتنی تیز تھی کہ تمام حاضرین مسجد نے سنی۔ آقائے دو جہاں ﷺ نے اپنا دست مبارک اس ستون پر رکھا تو وہ خاموش ہو گیا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت سید علی ہجویریؒ کی سیاحت محض حصول علم کے لئے تھی۔ آپ بزرگان دین کی صحبتوں سے فیض روحانی حاصل کرتے اور دنیاداروں کے اشغال سے اس طرح نظر بچا کر گزر جاتے جیسے اللہ کی زمین پر ان چیزوں کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ایک بار آپ نے خراسان میں ایک ایسے شخص کو دیکھا جو بیس سال سے یاد الٰہی میں کھڑا تھا۔ اس شخص کا معمول تھا کہ نماز کیلئے یا پھر فطری کاموں کی تکمیل کیلئے بیٹھتا تھا ورنہ باقی لمحات میں آنکھیں بند کئے کھڑا رہتا تھا۔ اس شخص کا نام ادیب کمندی تھا اور وہ خراسان کے ایک گاؤں کمندور میں رہتا تھا۔ ایک دن لوگوں نے ادیب کمندی سے پوچھا۔

"آخر تمہارے اس طرح کھڑے رہنے میں کیا راز ہے؟"

"کوئی راز نہیں ہے۔" ادیب کُمندی نے بے نیازانہ کہا...... "مجھے ابھی تک یہ درجہ حاصل نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کے مشاہدے میں بیٹھنے کی عزت حاصل کر سکوں۔"

ایک بار حضرت سید علی ہجویریؒ ماوراالنہر تشریف لے گئے۔ اس وقت آپ کے میزبان شیخ بزرگ احمد حماد سرخسیؒ تھے۔ ایک دن آپ نے حضرت شیخ احمد حمادؒ سے پوچھا...... "آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟"

"مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔" شیخ احمد حماد سرخسیؒ نے فرمایا۔

"آخر آپ شادی کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کرتے؟" حضرت سید علی ہجویریؒ نے دوبارہ سوال کیا۔

"میں اکثر اپنے زمانے سے غائب رہتا ہوں۔" شیخ احمد حمادؒ نے فرمایا...... "جب غائب رہتا ہوں تو پھر دونوں جہانوں میں سے مجھے کچھ یاد نہیں رہتا...... اور جب حاضر ہوتا ہوں تو اپنے نفس کو اس قدر قابو میں رکھتا ہوں کہ مجھے ایک روٹی ہزار حوروں سے بہتر نظر آتی ہے۔ اس لئے میری نظر میں دل کے شغل سے بہتر کوئی شغل نہیں ہے۔"

یہی وہ مشاہدات تھے جن کے ذریعے حضرت سید علی ہجویریؒ کی روحانی تربیت ہوئی۔

☆☆......☆☆......☆☆

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ، حضرت ابوالفضل بن حسین ختلیؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور حضرت ابوالفضل کا روحانی سلسلہ مشہور بزرگ حضرت جنید بغدادیؒ سے ملتا ہے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ اپنے پیر طریقت کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"ایک بار میرے شیخ "بیت الجن" سے دمشق تشریف لئے جا رہے تھے۔ میں بھی حضرت کے ہمراہ تھا۔ اتفاق سے رات کو تیز بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے پورا علاقہ کیچڑ سے بھر گیا تھا اور مسافروں کو چلنے میں بہت دشواری پیش آ رہی تھی۔ چلتے چلتے اچانک میری نظر حضرت شیخ کے پائے مبارک پر پڑی اور میں حیران رہ گیا۔ حضرت شیخ کا پاجامہ اور جوتا مکمل طور پر کیچڑ سے محفوظ تھا۔

"شیخ محترم! یہ کیا ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ اس واقعہ کی مجھ پر بہت ہیبت طاری تھی۔

جواب میں پیرومرشد نے فرمایا...... "سید! جب سے میں نے اپنی نفی کی اور توکل اختیار کیا، اسی دن سے اللہ نے میرے قدموں کو بھی ان آلائشوں سے پاک کر دیا ہے۔"

حضرت شیخ ابوالفضلؒ اپنے مریدوں کو کم گوئی اور کم خوابی کی بہت تاکید کیا کرتے تھے۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "کشف المحجوب" میں ایک مقام پر اپنے پیرومرشد کا یہ قول مبارک نقل کیا ہے۔

"غلبے کے سوا نہ سوؤ...... اور جب جاگو تو پھر سونے کی کوشش نہ کرو۔ کیونکہ یہ مرید کے واسطے حرام

ہے اور بیکاری کی نشانی ہے۔"

حضرت سید علی ہجویریؒ اپنے پیرومرشد کے بارے میں فرماتے ہیں...... "میرے شیخ رسمی صوفیوں (دکانداروں) کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتے تھے۔ میں نے ان سے بڑھ کر کوئی شخص ہیبت ناک (پرجلال) نہیں دیکھا۔ ایک دن میں پیرومرشد کے ہاتھ دھلا رہا تھا۔ دفعتاً مجھے یہ خیال گزرا کہ جب سارے کام تقدیر پر منحصر ہیں تو پھر ہم لوگ غلاموں کی طرح پیروں کی خدمت میں کیوں مصروف رہتے ہیں؟"

پیرومرشد نے میری طرف دیکھا اور نہایت شیریں لہجے میں فرمایا...... "بیٹا! جو کچھ تمہارے دل میں ہے، مجھے سب معلوم ہے...... مگر ہر حکم کے لئے ایک سبب ہوا کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تاج وتخت کسی کے سپرد کرے تو پہلے اس میں تاج وتخت کے سنبھالنے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے اور پھر وہی خدمت اس کی بزرگی کا سبب بن جاتی ہے۔"

حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے چھپن سال تک ایک ہی لباس زیب تن کیا۔ آپ کسی تکلف کے بغیر اپنے جامے میں پیوند لگایا کرتے تھے۔ پھر پیوندوں کی تعداد اس قدر بڑھی کہ اصلی کپڑے کا نشان تک باقی نہیں رہا۔

یہ تھے وہ مرد کامل حضرت شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلیؒ جن کی آغوش محبت میں حضرت سید علی ہجویریؒ نے روحانی تربیت حاصل کی۔

☆☆......☆☆......☆☆

حضرت سید علی ہجویریؒ نے اپنی تصنیف "کشف الاسرار" میں بہت سے عجائبات زمانہ کا ذکر کیا ہے۔ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں۔

"غزنی میں ایک پیر مرد تھے۔ ان کا نام شیخ بزرگؒ تھا اور وہ اپنے کردار میں بھی حقیقتاً بزرگ ہی تھے۔ ایک دن شیخ بزرگؒ نے مجھ سے فرمایا۔

"علی! کوئی ایسی کتاب لکھ کہ زمانے میں تیری یادگار رہ جائے۔"

اس وقت میری عمر صرف بارہ سال تھی۔ ایک بچے سے کسی یادگار تصنیف کا ذکر کرنا بڑا عجیب تھا۔ میں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا۔ "حضرت میں ابھی اس قابل کہاں ہوں؟ نہ مجھے علم حاصل ہے اور نہ میں اپنی کم عمری کے سبب علم کے رموز کو سمجھ سکتا ہوں۔ پھر آپ کے حکم کی تعمیل کس طرح ہو سکتی ہے؟"

شیخ بزرگؒ نے جواباً فرمایا...... "علی کچھ بھی ہو، تجھے کتاب لکھنی ہی پڑے گی۔"

میں نے کچھ دن پہلے ہی ایک کتاب تحریر کی تھی۔ شیخ بزرگؒ کے اصرار پر وہی کتاب ان کی خدمت میں پیش کر دی۔

شیخ بزرگؒ کتاب کا مطالعہ کرتے رہے اور میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا رہا کہ ایک بچے کی تحریر پڑھ کر ان کا کیا تاثر ہوگا؟

آخر کتاب ختم ہوئی اور شیخ بزرگؒ مجھ سے مخاطب ہوئے ...... ''علی! تو دین کے معاملے میں بڑا بزرگ ہوگا۔''

شیخ کا ارشاد سن کر کچھ دیر تک تو مجھے اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا۔ میں حیرت میں ڈوبا ہوا کسی مجسمے کی طرح شیخ ؒ کے سامنے بیٹھا رہا۔

شیخ ؒ نے میری دلی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس لئے ایک بار پھر وہی الفاظ دہرائے...... ''انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔''

پھر مجھے یقین آیا کہ شیخ بزرگؒ نے میری طفلانہ تحریر کو نظر انداز نہیں کیا ہے...... ''اگر شیخ کی دعائیں شامل حال رہیں۔'' میں نے عرض کیا۔

''تو ہماری دعاؤں میں شامل ہے۔'' شیخ بزرگؒ نے فرمایا...... ''حق تعالیٰ نے چاہا تو سارا زمانہ ان دعاؤں کی تاثیر دیکھے گا۔''

پھر ایسا ہی ہوا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ برصغیر پاک و ہند کے اتنے بڑے بزرگ ثابت ہوئے کہ ایک ہزار سال گزر جانے کے باوجود آپ کا فیض روحانی روز اول کی طرح جاری و ساری ہے۔

شیخ بزرگؒ نے جس کتاب کے تحریر کرنے پر اصرار کیا تھا، دراصل وہ ''کشف المحجوب'' تھی۔ شیخ بزرگؒ کی چشم معرفت پر یہ بات روشن تھی کہ یہی بارہ سالہ لڑکا جوان ہو کر ایک ایسی کتاب تحریر کرے گا جسے تصوف کی دنیا میں شہرت دوام حاصل ہوگی۔

☆☆..............☆☆..............☆☆

بعض روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ حضرت سید علی ہجویریؒ کے ماں باپ نے ان کی شادی نو عمری میں کر دی تھی۔ اگرچہ آپ ازدواجی زندگی کو پسند نہیں فرماتے تھے لیکن والدین کے حکم سے مجبور تھے۔ آخر کچھ دن بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ گیارہ سال تک آپ نے آزادانہ زندگی بسر کی اور اس طویل عرصے میں نہایت خوش و خرم رہے۔ والدین کو ایک بار پھر اولاد کی فکر لاحق ہو گئی۔ نتیجتاً حضرت سید علی ہجویریؒ کو دوبارہ رشتۂ ازدواج سے منسلک کر دیا گیا۔ دوسری شادی کے بارے میں آپ خود تحریر فرماتے ہیں۔

''میں ایک سال تک اس آفت میں غرق رہا۔ قریب تھا کہ میرا دین تباہ ہو جائے کہ حق تعالیٰ نے اپنی کمال مہربانی اور رحمت سے مجھے خلاصی عطا کی۔''

حضرت سید علی ہجویریؒ کی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک سال بعد آپ کی دوسری بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔

حضرت سید علی ہجویریؒ کی کنیت ''ابوالحسن'' ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن آپ کا بیٹا تھا اور پہلی بیوی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ بعض محققین کی رائے کے مطابق حسن کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ الغرض قدرت نے آپ کو اہل و عیال کی زنجیروں سے آزاد کر دیا اور آپ پورے انہماک کے ساتھ جستجوئے حق میں مشغول ہو گئے۔

حضرت سید علی ہجویریؒ کو اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ ابوالفضلؒ سے بے پناہ محبت تھی۔ آپ ہمہ وقت پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر رہتے۔ ایک دن حضرت شیخ ؒ نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''علی! اب تمہارے قلب میں اتنی استقامت پیدا ہو چکی ہے کہ اس خارزار ہستی سے سلامتی کے ساتھ گزر جاؤ گے۔''

''یہ سب میرے اللہ کا کرم اور مرشد کی دعاؤں کا ثمر ہے۔'' حضرت سید علی ہجویریؒ نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ عرض کیا۔

''علی! اگر حق تعالیٰ نے تمہیں ثمر بار بنایا ہے تو پھر دوسروں کو بھی اس ثمر سے فائدہ پہنچاؤ!'' حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے فرمایا۔

''جو شیخ کا حکم ہو۔'' حضرت سید علی ہجویریؒ نے سر تسلیم خم کر دیا۔

''تمہیں لاہور جانا ہوگا۔'' پیر و مرشد نے فرمایا...... ''وہاں ایک مخلوق خدا تمہاری منتظر ہے۔ لوگ پیاس کی شدت سے ادھر اُدھر بھٹک رہے ہیں مگر انہیں کوئی چشمۂ معرفت نہیں ملتا۔''

حضرت سید علی ہجویریؒ کو ایک لمحے کے لئے بھی پیر و مرشد کی جدائی گوارا نہیں تھی اور حکم شیخ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ منزل فراق قریب آ گئی ہے۔ ''میں پیر و مرشد کے قدموں سے جدا ہو کر کہاں جا سکتا ہوں؟'' آپ نے رقت آمیز لہجے میں عرض کیا۔

''علی! بظاہر یہ منزل فراق ہے مگر تم مجھ سے دور نہیں رہو گے۔'' حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے اپنے محبوب مرید کی دلی کیفیات کا اندازہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''مگر وہاں تو آپ کے مرید کامل حضرت شیخ حسین زنجانیؒ موجود ہیں اور وہ بحکم خدا قطب الاقطاب ہیں۔ ان کی موجودگی میں میری کیا ضرورت ہے؟'' حضرت سید علی ہجویریؒ نے عذر پیش کرتے ہوئے عرض کیا...... ''اور اگر میں لاہور چلا بھی جاؤں تو شیخ حسین زنجانیؒ کے ہوتے ہوئے میری ذات سے وہاں کے لوگوں کو کیا فائدہ پہنچے گا؟''

''یہ حجت ہے یا انکار؟'' حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے دریافت کیا۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے پیر و مرشد کے لہجے کی تلخی کو محسوس کر لیا اور فوراً ہی عرض کرنے لگے۔

''خادم کو مجال انکار کہاں؟ بس تصور فراق سے آزردہ ہوں۔''

''اگر قریب رہو گے تو ساعت فراق نہیں آئے گی؟'' حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے فرمایا...... ''کیا میرے پیر و مرشد مجھ سے جدا نہیں ہوئے؟ یہی نظام قدرت ہے۔''

''خادم تو بس حضوری چاہتا ہے۔'' حضرت سید علی ہجویریؒ نے عرض کیا۔ ''یہی ایک آرزو ہے کہ خدمت شیخ میں زندگی گزار دوں۔''

''علی! اب یہی میری خدمت ہے کہ تم لاہور چلے جاؤ۔'' حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے فرمایا...... ''یہ دوری نہیں، حضوری ہے۔''

الغرض حضرت سید علی ہجویریؒ پیرو مرشد کی دعاؤں کے سائے میں اس طرح رخصت ہوئے آپ کی آنکھیں اشکبار تھیں اور چہرۂ مبارک پر رنج والم کے گہرے سائے لرز رہے تھے۔

تاریخ اور جغرافیے پر نظر رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ غزنی سے لاہور تک کا سفر کس قدر طویل اور کتنا دشوار گزار ہے؟ ملک الگ، زبان اور تہذیب و معاشرت جدا۔ ایسے سفر کی تیاریوں کیلئے جس قسم کے ساز وسامان کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ...... مگر حضرت سید علی ہجویریؒ منزل عشق کے مسافر تھے۔ اس لئے کسی زادِ راہ کے بغیر ہی پیادہ پا روانہ ہو گئے۔

تقریباً دو ماہ بعد حضرت سید علی ہجویریؒ لاہور پہنچے۔ یہ 431ھ کا زمانہ تھا۔ جب آپ لاہور تشریف لائے تو شام ہو چکی تھی۔ کسی سے جان پہچان نہیں تھی، اس لئے آپ نے شہر سے باہر ہی قیام کیا۔ پنجابی زبان کے ایک قدیم قلمی نسخے میں درج ہے کہ جہاں حضرت سید علی ہجویریؒ آ کر ٹھہرے تھے وہ جگہ ایک بلند ٹیلہ تھا اور اس پر ایک "کریر" کا درخت بھی تھا۔ اس درخت کی لکڑی آج تک دربار میں موجود ہے۔

پھر جب صبح ہوئی تو حضرت سید علی ہجویریؒ شہر میں داخل ہوئے۔ اسی وقت سامنے سے ایک جنازہ آ رہا تھا۔ آپ نے شرکاء سے پوچھا۔ "یہ کس کی میت ہے؟"

لوگوں نے بتایا حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کل رات انتقال فرما گئے۔

یہ جانگداز خبر سن کر چند لمحوں کے لئے حضرت سید علی ہجویریؒ دم بخود رہ گئے۔ پھر آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اس اشک ریزی کے دو اسباب تھے۔ ایک یہ کہ آپ نے پیرومرشد کے حکم کی مصلحت کو نہیں سمجھا اور سفر لاہور کے سلسلے میں عذر پیش کیا۔ دوسرے حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کا دیدار آپ کی قسمت میں نہیں تھا۔ اس لئے اپنی محرومی پر آبدیدہ ہو گئے۔

معتبر روایات سے پتا چلتا ہے کہ حضرت سید علی ہجویریؒ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کی تدفین میں شریک ہوئے۔ مقامی باشندوں نے بڑی حیرت سے اس اجنبی شخص کو دیکھا جو دفن کے بعد بھی بڑی دیر تک قبر کے قریب اداس بیٹھا رہا۔

حضرت سید علی ہجویریؒ اکثر حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کے مزار پر حاضر ہوتے تھے اور رقت قلب کے ساتھ اپنے "پیر بھائی" کے لئے دعائے خیر فرماتے تھے، بہت دن بعد لاہور کے باشندوں پر راز کھلا کہ جو روشنی زیر خاک روپوش ہو گئی ہے، اور جو روشنی مزار کے باہر اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ نظر آ رہی ہے، دونوں ایک ہی آفتاب معرفت کا حصہ ہیں۔

☆☆......☆☆......☆☆

حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کا مختصر تعارف یہ ہے کہ آپ 26 رشعبان 347ھ کو ایران کے مشہور تاریخی شہر زنجان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شجرۂ نسب براہ راست حضرت سیدنا امام حسینؓ تک پہنچتا ہے۔ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کے والد ماجد کا نام سید علی محمود تھا۔ آپ کی تعلیم و تربیت زنجان ہی میں ایک امام مسجد کے زیر سایہ ہوئی۔ قرآن مجید پڑھنے کے بعد آپ نے تفسیر، حدیث اور فقہ کی بنیادی

تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کے دل میں روحانیت کے باطنی اسرار جاننے کا جذبہ پیدا ہوا۔ پھر اسی جذبے سے سرشار ہو کر آپ مرشد کامل کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ان دنوں حضرت شیخ ابوالفضلؒ کی روحانیت کا بہت چرچا تھا۔ چنانچہ آپ اپنے والد محترم کے ساتھ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہی کے دست حق پرست پر بیعت ہو گئے۔

حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے پیرومرشد کی نگرانی میں سخت مجاہدے کئے۔ روایت ہے کہ حضرت شیخ کے حکم کے مطابق طویل عرصے تک ایک مکان میں گوشہ نشین رہے۔ اس دوران آپ نے نہایت قلیل غذا استعمال کی اور شب و روز کے بیشتر لمحات ذکر الٰہی میں گزار دیئے۔ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ اسم اللہ کا بہت زیادہ ورد کیا کرتے تھے۔ جب آپ کی روحانی تربیت مکمل ہو گئی تو حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے خرقۂ خلافت عطا کرتے ہوئے فرمایا۔

"سید حسین! میں نے تمہیں اللہ کے سپرد کیا۔ اب دیار ہند تمہارا مسکن ہے۔ جاؤ اور بت پرستوں کو خدائے واحد کا پیغام سناؤ...... یقیناً اس راستے میں تمہیں بے شمار تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن ایسے جاں گسل لمحات میں تم اپنے اللہ ہی کو یاد کرنا اور اسی سے مدد مانگنا کہ وہی سارے عالم کا مشکل کشا ہے اور وہی دستگیر ہے۔"

پیرومرشد کا حکم پا کر حضرت سید حسینؒ اپنے شہر زنجان میں واپس آئے اور وہاں سے ایک چھوٹے سے قافلے کی صورت میں آپ نے ہندوستان کی طرف اپنے تبلیغی سفر کا آغاز کیا۔ اس قافلے میں حضرت سید حسین زنجانیؒ کے حقیقی بھائی حضرت سید یعقوب زنجانیؒ اور حضرت سید موسیٰ زنجانیؒ بھی شامل تھے۔ یہ 385ھ کا زمانہ تھا۔ آخر دو سال کے طویل سفر کے بعد حق پرستوں کا یہ قافلہ سبزوار، نیشا پور، ہرات، غزنی، جلال آباد اور پشاور ہوتا ہوا لاہور پہنچا۔

لاہور میں آنے کے بعد حضرت شیخ حسین زنجانیؒ اور آپ کے ساتھیوں نے شہر کے جنوبی علاقے میں قیام کیا۔ یہ مقام آج کل "شاہ عالمی" کہلاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے اپنے چھوٹے بھائی حضرت سید یعقوب زنجانیؒ سے فرمایا کہ وہ تبلیغ کیلئے شہر کے جنوبی حصے کو مرکز بنا لیں۔ دوسرے بھائی حضرت سید موسیٰ زنجانیؒ کو حکم دیا کہ وہ "مستی دروازے" کے آباد علاقے میں خیمہ زن ہو جائیں۔ آخر میں آپ نے اپنے لئے لاہور کے مشرقی علاقے میں آبادی سے دور ساحل دریا کی تنہائی کو پسند فرمایا۔ یہ علاقہ آپ کی ذات گرامی کی نسبت سے آج بھی "چاہ میراں" کہلاتا ہے۔ "میراں" حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کا لقب ہے۔

ان دنوں لاہور کے لوگوں کی اکثریت ہندو مذہب کے پیروکاروں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ سورج دیوتا کے مندر میں اپنی مذہبی رسوم ادا کیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے کچھ عرصے تک ہندوؤں کی زبان سیکھی تا کہ مقامی لوگوں کو ان ہی کی زبان میں دین اسلام کا مفہوم سمجھایا جا سکے۔ پھر آپ نے تبلیغ کا آغاز اس طرح کیا کہ روزانہ شہر کے گلی کوچوں میں جاتے اور بت پرستوں کو اسلام کی دعوت دیتے۔ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کی تقریریں بہت پُرجوش ہوتی تھیں۔ جب ہندو

سرداروں کو خبر ملی کہ ایک مسلمان درویش ان کے ہم مذہبوں کو ورغلا رہا ہے اور بت پرستی کو باطل ق دے رہا ہے تو انہوں نے محلے کے شریر لڑکوں کو سید حسین زنجانیؒ کے پیچھے لگا دیا۔ حضرت شیخؒ جہاں جاتے، شریر ہندو لڑکے سائے کی طرح آپ کے تعاقب میں لگے رہتے۔ پھر جیسے ہی سید حسین زنج بت پرستوں کو مخاطب کر کے اپنا وعظ شروع کرتے، وہ فتنہ پرداز لڑکے شور مچانے لگتے۔

''اپنے کان بند کر لو۔ اس مخبوط الحواس شخص کی کوئی بات نہ سننا ورنہ تم پر دیوتاؤں کا قہر نازل ہو

لڑکوں کا شور و غوغا سن کر بت پرست منتشر ہو جاتے اور حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نہایت اف لہجے میں فرماتے...... ''لوگو! میری بات سنو! تم لوگ آگ کے اس گڑھے کی طرف بڑھ رہے فطرت میں نہایت ہولناک ہے۔ یہ آگ کسی بت پرست کو نہیں چھوڑے گی۔ اس سے پہلے کہ تم ایندھن بن جاؤ، حق کی طرف لوٹ آؤ۔''

بت پرست استہزا کرتے ہوئے کہتے...... ''ہم نے ساری زندگی اس آگ کی پوجا کی ہے۔ اپنے پرستاروں کو کبھی نہیں جلاتی۔ یہی ہماری نجات دہندہ ہے۔''

حضرت شیخ حسین زنجانیؒ آدم زادوں کی اس ضلالت و گمراہی پر مغموم ہو جاتے اور آسمان طرف دیکھ کر کہنے لگتے۔ ''بے شک! تو ہی اپنی مخلوق کو ہدایت دینے والا ہے۔ تیری مرضی کے ب کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اپنے عجز و ناتواں بندے سید حسین کو استقامت دے کہ وہ تجھ سے مد طالب رہے۔''

معتبر روایت ہے کہ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے تین سال تک مسلسل تبلیغ کی اور اس راستے م بے شمار اذیتیں برداشت کیں مگر ایک ہندو بھی حلقۂ اسلام میں داخل نہ ہو سکا۔ آپ اپنی ناکا بہت دل شکستہ تھے کہ ایک رات پیر و مرشد کو خواب میں دیکھا، حضرت شیخ ابوالفضلؒ فرما رہے تھے۔

''حسین! ہم نے تمہارے صبر کو آزما لیا۔ اب سوائے جمعہ کے اپنی قیام گاہ پر ہی رہا کرو۔''

پیر و مرشد کے حکم کے مطابق حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے تبلیغ کا طریق کار بدل ڈالا۔ اب آ صرف جمعہ کے دن ہندو آبادی میں جاتے اور بت پرستوں کو خدائے وحدہٗ لاشریک کا پیغام سنا ایک دن آپ ہندو محلے میں تقریر کر رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور بہ آواز بلند کہنے لگا۔

''اگر تم سچے ہو تو میرے بیمار باپ کو ٹھیک کر دو۔ لاہور کے سارے وید اور حکیم اسے لاعلاج قر دے چکے ہیں۔''

حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے فرمایا...... ''شفا تو وہی دیتا ہے جو اپنی ذات میں واحد ہے پرستش کے لائق ہے۔ پھر بھی تم تھوڑا سا پانی لاؤ۔ میں اپنے مالک سے التجا کروں گا کہ وہ تمہارے باپ کو شفا دیدے۔''

ہندو نوجوان پانی کا برتن لے کر آیا۔ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے چند آیات الٰہی پڑھ کر پانی پ کر دیا۔ پھر ہندو نوجوان سے فرمایا...... ''یہ پانی اپنے باپ کو پلا دو۔ طبیب حقیقی شفا بخشے گا۔'' یہ ک حضرت شیخ حسین زنجانیؒ اپنی خانقاہ کی طرف لوٹ آئے۔

دوسرے دن وہی ہندو نوجوان آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور قدموں پر گر کر کہنے لگا...... ''بے شک! آپ سچے سنت ہیں، میرا باپ جو کل تک اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتا تھا، اب وہ پلنگ سے اٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہونے لگا۔ کچھ دن بعد آپ کے سلام کیلئے حاضر ہوگا۔''

اس واقعہ کے بعد بت پرستوں کے حلقے میں ایک شور سا مچ گیا، بہت سے بیمار ہندو آپ کی خانقاہ کے دروازے پر سر جھکائے ایستادہ نظر آنے لگے۔ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ انہیں پانی دم کر کے دیتے اور پھر مریض چند ہی روز میں صحت یاب ہو جاتا۔ حضرت شیخؒ کی یہ کرامت دیکھ کر لاہور کے باشندے آپ کو ''مسیحا'' کہہ کر پکارنے لگے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بت پرستوں کی صفیں ٹوٹنے لگیں اور کافرانہ عقائد کے مضبوط قلعوں میں گہرے شگاف پڑنے لگے۔ لوگ اپنے ماتھوں پر سجے ہوئے قشقے کھرچنے لگے اور گلوں میں پڑے ہوئے زنار توڑ کر پھینکنے لگے۔

حضرت شیخ زنجانیؒ کی خانقاہ کے قریب ایک ہندو کاشتکار رہتا تھا جو عرصۂ دراز سے دمے کے تکلیف دہ مرض میں مبتلا تھا۔ جب اس نے حضرت شیخؒ کی شہرت سنی تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا ہے۔

''میں نے سنا ہے کہ آپ بہت بڑے وید ہیں اور ایسے بیماروں کا بھی علاج کر دیتے ہیں جن پر کوئی دوا اثر انداز نہیں ہوتی۔''

''تم نے غلط سنا ہے۔ میں کوئی طبیب نہیں ہوں۔'' حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے فرمایا۔

ہندو کسان حضرت شیخؒ کے انکار پر حیران رہ گیا۔ پھر اس نے نہایت غمزدہ لہجے میں کہا...... ''لوگ تو یہی کہتے ہیں۔''

بوڑھے بت پرست کو اداس اور دل گرفتہ دیکھ کر حضرت شیخ زنجانیؒ نے فرمایا...... ''تم شفایاب ہو جاؤ گے مگر اس کیلئے تمہیں ایک سخت آزمائش سے گزرنا ہوگا۔''

''میں آپ کی ہر بات ماننے کیلئے تیار ہوں۔'' اپنی زندگی سے بیزار ہندو کاشتکار نے کہا۔

''تمہیں اپنے باپ دادا کا دھرم چھوڑ کر مذہب اسلام قبول کرنا ہوگا۔'' حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے فرمایا۔ ''اس کے بعد تمہیں کوئی بیماری لاحق نہیں ہوگی۔ بجز مرض الموت کے جو ہر جاندار کا مقدر ہے۔''

بوڑھا ہندو کسان کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے دل ہی دل میں ایک منافقانہ فیصلہ کیا کہ وہ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کے سامنے اسلام قبول کر لے گا مگر در پردہ اپنے آبائی مذہب پر عمل پیرا رہے گا۔ اس منافقانہ فیصلے کے بعد بت پرست کاشتکار نے بظاہر نہایت پُر جوش لہجے میں کہا...... ''مجھے بتائیے کہ آپ کے مذہب میں داخل ہونے کا کیا طریقہ ہے؟''

حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے اسے کلمۂ شہادت کی تلقین فرمائی۔ ہندو کسان نے بآواز بلند اللہ اور اس کے آخری رسول ﷺ پر گواہی دی۔

حضرت شیخ زنجانیؒ نے ایک مشرک کا اقرار سن کر تبسم فرمایا۔ ''اب تمہاری صحت تمہاری نیت پر

منحصر ہے۔"

"شیخ! میں آپ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھا۔" نومسلم کسان نے حیران ہو کر کہا۔

"مطلب صاف ہے کہ اگر تم اپنے اقرار میں سچے ہو تو بیماریاں تم سے ہمیشہ دور رہیں گی۔ اور اگر اس ذات پاک کو دھوکا دے رہے ہو جس پر کائنات کے ایک ایک ذرّے کا حال روشن ہے، تو پھر یہ مرض شمشان بھومی تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔"

حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کی زبان مبارک سے یہ انکشاف سن کر بوڑھے کسان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ "شیخ! میری نیت تو میرے دل کی انتہائی گہرائیوں میں پوشیدہ تھی۔ پھر یہ راز آپ پر کس طرح فاش ہو گیا؟"

"حق تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ جسے چاہتا ہے پوشیدہ رکھتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے نقاب کر دیتا ہے۔" حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے فرمایا۔

یہ سنتے ہی بوڑھا کسان اپنے منافقانہ فیصلے سے تائب ہوا اور اس نے کھلے دل سے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ پھر جیسے ہی اس نے دوبارہ کلمۂ شہادت پڑھا، برسوں پرانی دمے کی تکلیف اس طرح ختم ہو گئی کہ جیسے یہ مرض اسے لاحق ہی نہیں ہوا تھا۔

ایمان لانے کے بعد وہ بوڑھا کسان کئی سال تک زندہ رہا۔ اس دوران وہ اظہار عقیدت کے طور پر اپنے کھیتوں کا اناج اور سبزیاں حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا۔ اس کے تین جوان سال بیٹے تھے۔ بوڑھے کسان نے بارہا اپنے بیٹوں کو اسلام کی دعوت دی مگر وہ تینوں گمراہ نوجوان اپنے باپ کا مذاق اڑاتے رہے۔

پھر جب وہ بوڑھا کسان دنیا سے رخصت ہونے لگا تو اس نے تینوں بیٹوں کو وصیت کی......

"میری بات غور سے سنو کہ تمہارے حق میں ایمان لانا ہی بہتر ہے لیکن اگر تم ایسا نہ کر سکو تو کم سے کم اتنا ضرور کرنا کہ حضرت شیخ کی خدمت میں اناج اور سبزیاں بھیجتے رہنا۔ پھر تم دیکھو گے کہ تمہاری زمین تمہارے اندازوں سے زیادہ فصل پیدا کرے گی اور تم خوشحال زندگی بسر کرتے رہو گے۔"

باپ کے مرتے ہی بیٹوں نے اس کی وصیت کو بھلا دیا۔ اگر کسی متعلقہ فرد نے کبھی اس کا ذکر بھی کیا تو وہ تینوں استہزا کرنے لگے...... "ہمارا باپ تو احمق تھا کہ ایک مسلمان کے ہاتھوں اپنا دھرم بھی بیچ گیا اور جب تک زندہ رہا اپنے مال و متاع کا بھی نقصان کرتا رہا مگر ہم کسی کے فریب میں آنے والے نہیں۔"

روز و شب کا قافلہ اپنی مقررہ رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ اس سال فصل بہت شاندار ہوئی تھی۔ دیکھنے والوں نے کہا۔ "یہ سب حضرت شیخؒ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔"

"یہ سب ہماری محنت کا صلہ ہے۔" تینوں بھائیوں نے متکبرانہ لہجے میں جواب دیا۔

پھر جب وہ سو کر اٹھے تو ایک ہی رات میں نقشہ بدل گیا تھا۔ کھیت ویران پڑے تھے اور تمام فصل سوکھ گئی تھی۔ اپنی بربادی کا ہولناک منظر دیکھ کر تینوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کہیں یہ ہمارے اس گناہ کی سزا تو نہیں کہ ہم نے باپ کی وصیت کو فراموش کر دیا۔"

اس خیال کے آتے ہی تینوں بھائیوں کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پھر وہ جھکے ہوئے سروں کے ساتھ حضرت شیخ زنجانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رو رو کر اپنا حال زار بیان کرنے لگے۔

"فقیر کو تمہارے مٹھی بھر اناج کی کوئی حاجت نہیں۔" حضرت شیخ زنجانیؒ نے فرمایا...... "میں تمہارے حق میں اس لئے دعا کروں گا کہ تمہارا باپ مسلمان تھا۔ جاؤ! اللہ ان ویران کھیتوں کو دوبارہ سرسبز و شاداب کر دے گا۔"

پھر جب وہ تینوں اپنے کھیتوں پر پہنچے تو ایک ناقابل یقین منظر ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ فصل والہانہ انداز سے لہلہا رہی تھی اور زمین پر ہر طرف سبزہ ہی سبزہ پھیلا ہوا تھا۔

"ہمارے باپ نے صحیح سودا کیا تھا۔ ہمیں بھی خرید لیجئے کہ آپ سے بہتر کوئی خریدار نہیں۔"

حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کی بارگاہ میں تینوں بھائیوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ بھی اپنے باپ کی طرح ہزاروں دیوتاؤں کی نفی کر کے خدائے واحد کی حقانیت پر گواہی دے رہے تھے۔

حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے چوالیس سال تک اپنے لہو سے اس زمین کی آبیاری کی جسے بُت پرستوں نے پتھر بنا دیا تھا۔ پھر جب یہ مٹی نم ہو گئی تو دنیا سے رخصت ہو گئے کہ حضرت سید علی ہجویریؒ توحید کی نئی فصل بونے کیلئے تشریف لانے والے تھے۔ یہ قدرت کا عجیب راز ہے کہ جس رات اللہ کا ایک ولی رخصت ہوا، اسی رات دوسرا ولی حدود لاہور میں داخل ہوا۔ ماضی میں بھی ہمیں ایک ایسی ہی عجیب مثال نظر آتی ہے کہ جس رات کے ابتدائی حصے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ رخصت ہوئے، اسی رات کے آخری حصے میں حضرت امام شافعیؒ پیدا ہوئے۔

حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کی تدفین کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ نہایت خاموشی کے ساتھ مسجد کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔ اس مسجد کی تعمیر کے وقت علمائے لاہور نے اعتراض کیا کہ قبلے کا جھکاؤ جنوب کی سمت ہے، حضرت علی ہجویریؒ نے علماء کے اعتراض کو بے نیازی کے ساتھ سنا اور اپنے کام میں مشغول رہے۔ پھر خانۂ خدا کی تعمیر کے بعد آپ نے علمائے لاہور کو جمع کیا اور اپنے روحانی تصرف کے ذریعے معترضین کو کھلی آنکھوں سے قبلے کا مشاہدہ کرا دیا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کی اس کرامت کا بہت غلغلہ ہوا اور عقیدت مندوں کا ہجوم آپ کے گرد سمٹ آیا۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے جو مسجد تعمیر کرائی تھی، اسی کو اپنی تمام تبلیغی اور تدریسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ خانۂ خدا سے ملحق ایک مدرسہ تھا جہاں مسلمان طلباء آپ سے عربی سیکھتے تھے اور قرآن کریم کا درس لیا کرتے تھے۔ مدرسے کے برابر ایک حجرہ تھا جس میں آپ آرام فرمایا کرتے تھے۔ گردش ماہ و سال اور مقامی مسلمانوں کی بے پروائی کے سبب یہ مسجد بے نشان ہو گئی مگر اس کے کچھ آثار آج بھی باقی ہیں۔

حضرت سید علی ہجویریؒ کے درس دینے کا انداز بڑا دلنشین تھا۔ آپ اکابرین اسلام کی حیات مبارکہ کے حوالے سے ایسے واقعات بیان فرماتے تھے کہ پتھر سے پتھر دل انسان بھی پگھل جاتا تھا اور

گمراہوں کو نشانِ منزل صاف نظر آنے لگتا تھا۔ ایک بار آپ ایثار اور قربانی کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔

"جب تک اپنی نفسانی خواہشوں کو اپنے بھائیوں کی فلاح کیلئے قربان نہیں کر دیا جاتا، اس وقت تک انسان پر پاکیزہ زندگی کے اسرار نہیں کھلتے اور کثافتیں اس کے وجود کو گھیرے رہتی ہیں۔"

یہ کہہ کر حضرت سید علی ہجویریؒ نے تین بزرگوں کا ایک واقعہ سنایا جسے سن کر آج بھی اہلِ ایمان کا لہو گرما جاتا ہے۔

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کا انتقال 686ھ میں ہوا۔ آپ کے متعلق حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے کہ شیخ نوریؒ کے انتقال سے دنیا کا آدھا علم جاتا رہا۔

دوسرے بزرگ حضرت شیخ رقامؒ تھے جو صاحب علم بھی تھے اور صاحب تقویٰ بھی۔

تیسرے بزرگ حضرت ابوحمزہ بغدادیؒ تھے جنہیں بے خبر لوگوں کے ہاتھوں بڑی اذیتیں برداشت کرنی پڑی تھیں۔

خلیفۂ وقت کا ایک غلام جس کا نام خلیل تھا، ان تینوں بزرگوں کے خلاف اپنے دل میں کدورت رکھتا تھا۔ اس نے ایک دن موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امیر المومنین سے کہا۔ "شیخ نوریؒ، شیخ رقامؒ اور شیخ ابوحمزہؒ کی وجہ سے لوگوں کا دین برباد ہو رہا ہے۔ یہ تینوں گمراہوں کے سردار ہیں۔ اگر ان تینوں کو قتل کرا دیا جائے تو مذہب اسلام خطرات سے محفوظ ہو جائے گا۔"

خلیفۂ وقت نے تحقیق کرائے بغیر ان تینوں کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔ حضرت شیخ نوریؒ حضرت رقامؒ اور حضرت ابوحمزہ بغدادیؒ کو گرفتار کر کے حاکم شہر کے سامنے لایا گیا۔

"تم لوگوں کے عقائد میں خلل ڈالتے ہو اور انہیں گمراہی کے راستے پر بلاتے ہو۔" حاکم شہر نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

"واللہ! ہم اس سے بری الذمہ ہیں۔" حضرت شیخ نوریؒ نے فرمایا۔

"تم موت کے خوف سے جھوٹ بول رہے ہو ورنہ سارا زمانہ تمہاری فتنہ انگیزیوں پر گواہ ہے۔"

حاکم شہر نے تینوں بزرگوں کی کوئی دلیل قبول نہیں کی۔

"ہم سچ کی حقیقت کو پا چکے ہیں۔ اس لئے جھوٹ سے ہمیں کوئی نسبت نہیں۔" حضرت ابوحمزہ بغدادیؒ نے فرمایا۔

حاکم شہر نے اپنی سماعت کے دروازے بند کر لئے۔ یہاں تک کہ تینوں بزرگوں کے ہاتھ باندھ دیئے گئے اور جلاد نے اپنی شمشیر بے نیام کر لی۔

حاضرین کے دل رو رہے تھے مگر رعب اقتدار سے ان کی زبانیں خاموش تھیں۔ آخر جلاد تلوار لہراتا ہوا آگے بڑھا۔ پھر جیسے ہی وہ شیخ رقامؒ کے قریب پہنچا، حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ پوری شدت سے چیخ اٹھے۔

"ادھر آؤ پہلے میرا حق ہے۔"

حضرت شیخ نوریؒ کی آواز میں ایسا جلال تھا کہ جلاد ٹھہر گیا۔

حاکم شہر بھی گھبرا گیا۔ پھر وہ چند قدم آگے بڑھا اور حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کے قریب پہنچ کر بولا۔ "کیوں شور مچاتے ہو؟ کیا تلوار میں ایسی لذت ہے کہ تم پہلے اپنی گردن اس کے نیچے رکھ دینا چاہتے ہو؟"

"ہاں! اس شمشیر خوں آشام میں ایسی ہی لذت ہے۔" حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے بڑے والہانہ انداز میں فرمایا۔

"کیا موت کی دہشت نے تمہارے حواس تو نہیں چھین لئے ہیں؟" حاکم شہر ایک صوفی کے جذبات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

"میں پورے ہوش میں ہوں۔" حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے فرمایا۔ "میرا مذہب ایثار ہے اور ہر انسان کی طرح مجھے بھی اپنی جان سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ چند سانسیں اپنے بھائیوں کی بہتری کیلئے صرف کر دوں۔ دوسری دنیا میں خدمت نہیں، قربت ہوتی ہے۔ ایثار کی لذت اسی دنیا میں ہے۔ پھر یہ لذت کسے نصیب ہوگی۔ اے میرے مہربان حاکم! مجھے اس لذت سے محروم نہ رکھ! بس یہی میری آخری خواہش ہے۔"

حاکم شہر نے حضرت شیخ نوریؒ کی گفتگو سنی تو سناٹے میں آ گیا۔ پھر اس نے جلاد کو اشارہ کیا کہ اپنی شمشیر نیام میں کر لے۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لی کہ کچھ دیر کیلئے یہ ساعت گراں ٹل گئی تھی۔

"انہیں قید خانے میں ڈال دو۔" یہ کہہ کر حاکم شہر چلا گیا اور تینوں بزرگ حوالۂ زنداں کر دیئے گئے۔

پھر حاکم شہر نے خلیفۂ وقت کو طویل خط لکھا۔ "امیر المومنین یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ان لوگوں کے خلاف جو شہادتیں پیش کی گئی ہیں ان میں کہاں تک صداقت ہے؟ میری آنکھوں نے جو رنگ دیکھا ہے، وہ بہت عجیب ہے۔" یہ تحریر کرنے کے بعد حاکم شہر نے حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کے ایثار کا واقعہ بھی تفصیل سے لکھ دیا۔

خلیفۂ وقت نے حاکم شہر کا عریضہ پڑھا تو کچھ دیر کے لئے اس پر بھی سکتہ سا طاری ہو گیا۔ "کیا میری مملکت میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں؟" خلیفہ کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

پھر اس نے ایک برق رفتار قاصد کو یہ حکم دے کر روانہ کیا۔ "تینوں کا قتل موقوف کر دو اور فوری طور پر انہیں دربار میں بھیج دو۔"

حاکم شہر نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ، حضرت شیخ رقامؒ اور حضرت شیخ ابوحمزہؒ کو بغداد روانہ کر دیا۔

پھر یہ تینوں بزرگ اس شان بے نیازی کے ساتھ دربار خلافت میں داخل ہوئے کہ ان کے چہروں پر اطمینان و آسودگی کی گہری جھلک نمایاں تھا۔

خلیفۂ وقت نے بہت غور سے ان صوفیوں کی طرف دیکھا جن کے لباسوں میں پیوند لگے ہوئے تھے، کثرت ریاضت کے سبب جسم لاغر و نحیف تھے مگر پیشانیوں سے عجیب روشنی پھوٹ رہی تھی اور

زرد چہروں سے عجیب شان کا اظہار ہو رہا تھا۔

''کیا تم امیر المومنین سے کوئی حاجت رکھتے ہو؟'' خلیفۂ وقت کی پُر جلال آواز دربار میں گونجی۔

''یقیناً ہم ضرورت مند ہیں۔'' حضرت شیخ رقامؒ نے فرمایا۔ ''اور ایسی حاجت رکھتے ہیں جسے پورا کرنے پر امیر المومنین قادر ہیں۔''

حضرت شیخ رقامؒ کی بات سن کر خلیفۂ وقت کے چہرے پر خوشی کا رنگ اُبھر آیا۔ اسے یقین تھا کہ حضرت رقامؒ اپنے اور اپنے دوستوں کیلئے دربار خلافت سے رحم اور عافیت کا سوال کریں گے۔

''تمہارے بقول اگر میں حاجت روائی پر قادر ہوا تو یقین رکھو کہ تم میرے دربار سے مایوس نہیں لوٹو گے۔''

''تو پھر اے امیر المومنین! اتنی مہربانی کریں کہ ہم درویشوں کو فراموش کر دیں اور دوبارہ دربار میں حاضر ہونے کی زحمت نہ دیں۔'' حضرت شیخ ابوحمزہ بغدادیؒ نے فرمایا۔

عجیب التجا تھی جسے سن کر خلیفۂ وقت حیران رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ فاقہ کش لوگ دربار خلافت سے اس قسم کی درخواست کریں گے۔

ابھی خلیفۂ وقت اسی ذہنی اُلجھن میں مبتلا تھا کہ حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے فرمایا۔ ''اے امیر المومنین جس قدر جلد ہمیں فراموش کر دیں گے، اسی قدر آپ کا احسان زیادہ ہوگا۔''

خلیفۂ وقت نے بہت کوشش کی کہ تینوں بزرگ کوئی عطیہ، کوئی نذر قبول کر لیں...... مگر درویشوں کو دربار خلافت کی حدود سے نکل جانے کی بہت جلدی تھی۔ مجبوراً خلیفہ نے انہیں نہایت عزت و احترام سے رخصت کر دیا۔ پھر جب حضرت شیخ نوریؒ، حضرت شیخ رقامؒ اور حضرت شیخ ابوحمزہ بغدادیؒ دربار خلافت سے چلے گئے تو خلیفہ اپنے غلام خلیل پر برس پڑا۔

''بدنصیب! تو میرے ہاتھوں کو ان برگزیدہ لوگوں کے خون سے آلودہ کرنا چاہتا تھا۔'' یہ کہہ کر خلیفہ نے خلیل کو شہر بدر کر دیا۔

یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''ایثار کی انتہا یہ ہے کہ ایک عابد و زاہد شخص سے ایک خطا سرزد ہو گئی۔ غیب سے صدا آئی کہ آج سے تیرا نام بدبختوں کی فہرست میں لکھ دیا گیا ہے۔''

اس عابد و زاہد شخص نے گریہ و زاری کرتے ہوئے عرض کیا۔ ''اے میرے معبود! اگر تیری مشیت یہی ہے کہ میں دوزخ کا ایندھن بن جاؤں تو پھر تو اس بات پر بھی قادر ہے کہ اپنے دوسرے بندوں کی جگہ صرف مجھے جہنم میں ڈال دے تاکہ میرے انجام سے تیری مخلوق کو فائدہ پہنچے۔''

اس کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ نے فرمایا کہ حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ بھی ہمیشہ یہی دعا مانگا کرتے تھے۔

''بارالٰہا! ہر چیز خواہ وہ بری ہے یا بھلی، تیرے علم، تیری قدرت اور تیرے ارادے سے اس دنیا میں ہے۔ اگر تو ناچار دوزخ کو بھرنا ہی چاہتا ہے تو پھر اس کے سارے طبقوں کو مجھ سے بھر دے

اور اپنے بندوں کو دوزخ کی آگ سے نجات دے دے۔''

حق تعالیٰ کا بھی یہی ارشاد ہے۔ ''تم ہرگز بھلائی کو نہ پہنچو گے، یہاں تک کہ وہ چیز خرچ نہ کرو جس سے تم محبت کرتے ہو۔'' (ترجمہ)

ایک اور موقع پر حضرت سید علی ہجویریؒ تقریر فرما رہے تھے۔ موضوع تھا ایثار۔

''ایک بار دس درویش سفر کر رہے تھے کہ گھنے جنگل میں پہنچ کر راستہ بھول گئے جھلسا دینے والی دھوپ نے ان کے حلق خشک کر دیئے تھے اور پانی کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ زادِ راہ کے طور پر ان درویشوں کے پاس جس قدر پانی موجود تھا، اس سے صرف ایک ہی آدمی کی پیاس بجھ سکتی تھی۔ آخر اس پانی کے استعمال کا وقت آیا تو تمام درویشوں نے ایک دوسرے کے لئے قربانی دی۔ یہاں تک کہ نو درویش مر گئے۔ پھر دسویں درویش نے وہ پانی پی لیا۔ کچھ دن بعد زندہ بچ جانے والے درویش نے ایک شخص سے یہ واقعہ بیان کیا۔

''اگر تم بھی وہ پانی نہ پیتے تو اچھا تھا۔'' اس شخص نے یہ المناک ماجرا سن کر کہا۔

''اگر میں پانی نہ پیتا اور پیاسا مر جاتا تو خودکشی کے مجرم کی حیثیت سے آخرت میں میری گرفت ہوتی۔'' دسویں درویش نے جواب دیا۔

''تو پھر وہ نو درویش بھی خودکشی کے مرتکب ہوئے تھے۔ کیا بروز حشر ان سے باز پرس نہیں ہوگی؟'' اس شخص نے ایک عقلی دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔

دسویں درویش نے جواب دیا۔ ''میرے تمام ساتھی شہید ہوئے ہیں۔''

''وہ کس طرح؟'' اس شخص نے پوچھا۔

''ان لوگوں نے ایک دوسرے کی جان بچانے کے لئے موت قبول کی تھی۔'' دسویں درویش نے کہا۔ ''مگر جب میرے تمام ساتھی ایک دوسرے کی خاطر ایثار ردیتے ہوئے انتقال کر گئے اور میں اکیلا رہ گیا تو شریعت نے مجھ پر واجب کیا کہ میں پانی پی لوں اور اپنے آپ کو دانستہ اور بغیر کسی بھلائی کے ہلاکت میں نہ ڈالوں۔ اگر اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح میں بھی پانی نہ پیتا تو میری موت بھی واقع ہو جاتی۔ چونکہ گیارہواں آدمی موجود نہیں تھا، جس کے لئے میں ایثار کرتا۔ نتیجتاً میری موت حرام ہو جاتی۔''

غزوۂ اُحد کے حوالے سے بھی ایک ایسا ہی واقعہ مشہور ہے کہ ایک مسلم خاتون زخمیوں کو پانی پلا رہی تھی۔ اتفاق سے وہاں سات مسلمان زخمی سپاہی میدان میں پڑے ہوئے تھے۔ خاتون نے ایک سپاہی کو پانی پلانا چاہا تو اس نے اپنے دوسرے ساتھی کی طرف اشارہ کیا کہ وہ مجھ سے زیادہ پیاسا ہے۔ الغرض ایک دوسرے کیلئے ایثار کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ساتوں سپاہی شدید عالم تشنگی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

قرآن کریم میں مسلمانوں کے اسی جذبۂ ایثار کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے۔ ''اور اپنی جانوں کا ایثار کرتے ہیں، اگرچہ انہیں تنگی ہو۔'' (ترجمہ)

یہ اثر انگیز تقریریں سن کر حضرت سید علی ہجویریؒ کے حلقۂ عقیدت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ہزاروں انسان اپنی اپنی ضرورتیں لے کر آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوتے۔ آپ ان کے حق میں دعائے خیر کرتے اور کارساز عالم اپنے بندوں کی مشکل کشائی فرما دیتا۔ کبھی کبھی خاص احباب جمع ہوتے تو آپ نہایت دردانگیز لہجے میں شکایت کرتے۔

"لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہر وقت ناپائیدار دنیا کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ کوئی اولاد کی درخواست کرتا ہے، کوئی مال وزر کی اور کوئی عزت وجاہ کی۔ اگرچہ یہ ساری چیزیں فانی ہیں لیکن بنی نوع آدم نے انہیں مقصد حیات بنا لیا ہے اور اس عہد کو فراموش کر دیا ہے جو ان کی روحوں نے روز الست میں اپنے رب سے کیا تھا۔ کبھی کوئی مجھ سے یہ نہیں کہتا کہ میں اس کی سلامتی ایمان کیلئے دعا کروں...... اور کبھی کوئی اپنا دامن اس لئے نہیں پھیلاتا کہ میں اس میں علم وحکمت کے سکے ڈال دوں۔ سب اس شے کے طالب ہیں جو اپنی فطرت میں بے وفا ہے اور اہل دل کیلئے سخت ضرر رساں ہے۔"

یہی وہ احساسات تھے جن کے سبب حضرت سید علی ہجویریؒ آزردہ رہا کرتے تھے۔ آپ کے مدرسے میں طالب علموں کا ہجوم تھا مگر یہاں بھی وہی بے خبری کارفرما تھی۔ کوئی طالب علم بھی اس لئے تعلیم حاصل نہیں کر رہا تھا کہ وہ جہالت خانۂ ہند میں اسلامی علم کی شمع روشن کرے گا یا بت پرستوں کی صفوں میں کار تبلیغ جاری رکھتے ہوئے راستے کی سختیاں برداشت کرے گا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ نے دین مصطفیٰ ﷺ کی خدمت کیلئے دو بڑی قربانیاں دی تھیں۔ ایک یہ کہ اپنی تہذیب، ثقافت، وطن، حلقۂ احباب اور ہر وہ چیز جو آپ کو محبوب تھی، اس سے رشتہ توڑ لیا تھا...... اور ایک ایسی زمین پر ہمیشہ کیلئے آباد ہو گئے تھے جہاں کا ذرہ ذرہ بے خبر اور بیگانہ تھا۔ دوسرے یہ کہ آپ نے لذت ونشاط کی زندگی کو ترک کر کے مخلوق خدا کی خدمت کو اپنا شعار بنایا تھا۔ واضح رہے کہ جب سید علی ہجویریؒ لاہور تشریف لائے، اس وقت آپ کی عمر مبارک صرف اکیس سال تھی۔ اس زمانۂ شباب میں خواہش نفس سے منہ موڑ لینا بذات خود اتنی بڑی کرامت ہے کہ اسے بطور مثال ساری دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ دوسری قوموں میں بھی ایسے بہت سے لوگ پائے جاتے ہیں جنہوں نے تجرد کی زندگی بسر کی مگر وہ لوگ انسانی ہجوم میں نہیں ٹھہرے۔ تاریک غاروں، ویران جنگلوں اور سنسان دریاؤں کے کنارے پڑے رہے اور ایک دن خاموشی سے کسی گوشۂ گمنامی میں مر گئے۔ یہ ایک مکمل راہبانہ زندگی تھی جس نے ان کی ذات کو تو فائدہ پہنچایا مگر وہ لوگ مخلوق خدا کے کسی کام نہ آ سکے۔ اس کے برعکس حضرت سید علی ہجویریؒ ترک لذات کر کے مخلوق خدا کے ہجوم میں آئے اور اللہ کے بندوں سے اتنا پیار کیا کہ اپنی لذت کی بھی نفی کر دی بقول اقبال۔

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

دراصل یہی اسلام اور رہبانیت کا فرق ہے۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے مسجد اور مدرسے کی تعمیر میں جس قدر تکلیفیں برداشت کی تھیں، اس کا

اندازہ کرنا آسان نہیں۔ کسی تاریخی حوالے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ حضرت سید علی ہجویریؒ نے خانۂ خدا کی تعمیر کے سلسلے میں لاہور یا دوسرے شہروں کے صاحبان ثروت سے مالی تعاون کی درخواست کی ہو یا آپ نے ذاتی خرچ سے مسجد تعمیر کرائی یا پھر آپ کو دست غیب حاصل تھا۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو۔ اس مرد خدا کی قلندری میں کسے کلام ہو سکتا ہے، جس نے تن تنہا ایک عبادت گاہ تعمیر کرائی ہو اور پھر اس عمارت کے ستون کھڑے کئے ہوں جس کے ذرّے ذرّے سے علم کی روشنی پھوٹتی تھی۔ پھر جب خانقاہ و مدرسہ تیار ہو گیا تو اس کی صدائے پُر جلال گونجی۔

"لوگو! آؤ بھلائی کی طرف! مسافرو! آؤ روشنی کی طرف۔"

عقیدت مند ہوں یا معترضین، سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت سید علی ہجویریؒ نے اپنے کسی شاگرد سے علم کی قیمت وصول نہیں کی۔ اگر طلب کرتے تو آپ کا یہ عمل بھی جائز ہوتا کیونکہ حضرت سید علی ہجویریؒ کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا۔ مگر آپ تو قناعت اور توکل کے راستے کے مسافر تھے۔ اہل دنیا کے سامنے دست طلب کیا دراز کرتے...... اور اگر کوئی دیتا تو کیا دیتا کہ وہ جو چیز حاصل کر رہا تھا، اس کی تو کوئی قیمت ہی نہیں تھی۔ علم وعمل کے بادشاہ کو دینے کیلئے اہل لاہور کے پاس کیا تھا۔ وہ تو خود ضرورت مند اور سوالی تھے۔

کچھ دنوں تک اہل طلب نے بڑے جوش اور خلوص کا مظاہرہ کیا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ اپنے شاگردوں سے مطمئن تھے...... مگر ایک دن آپ پر ایک عجیب راز فاش ہوا۔ طالب علم بڑے ذوق و شوق سے اپنے اسباق یاد کر رہے تھے۔ بحث ومباحثہ بھی زور وشور پر تھا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کو محسوس ہوا کہ شاگردوں کے دماغ روشن تھے مگر ان کے دل اور روحیں خالی تھیں۔ یہ بڑا تکلیف دہ مرحلہ تھا کسان نے جس زمین میں اپنا بیج بویا تھا، وہ زرخیز نہیں تھا۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے محسوس کیا کہ ان کے شاگردوں کے دماغ میں بوئے حکومت موجود ہے۔ اس صورتحال کے پیش نظر آپ نے کئی بار اپنے شاگردوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے میرے مرید! یہ دنیا ایک کشتی کے مانند ہے اور پانی پر تیر رہی ہے۔ پس تو غوطہ خور بن نہ کہ غرق آب ہو۔ کسی کا دل تجھ سے رنجیدہ نہ ہو۔ وہ بادشاہ جو ظلم کی بنیاد اکھاڑنے اور رعایا کو فائدہ پہنچانے والا ہو، اس کی تعریف کر! مگر یاد رکھ کہ بادشاہ کی ستائش اس لئے نہ ہو کہ اس میں خود تیری غرض موجود ہو۔ اس نکتے کو فراموش نہ کر کہ طمع میں ہمیشہ خواری ہے۔ مرشد کو اپنا قبلہ سمجھ...... اور دل و جان سے اس کی خدمت کر کہ اسی میں تیری فلاح ہے۔"

حضرت سید علی ہجویریؒ نے کئی بار واضح الفاظ میں اپنے شاگردوں کو تنبیہ کی مگر ان کے دلوں سے دنیا کی بے جا طلب کم نہ ہو سکی۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کے شاگردوں کا انداز فکر یہ تھا کہ وہ علم حاصل کرنے کے بعد بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر پہنچ کر عوام الناس پر حکومت کریں گے۔ یہ سوچ روحانیت کے یکسر خلاف تھی۔ آخر سید علی ہجویریؒ کی تمام جان سوزیاں اور کاوشیں رائیگاں گئیں۔ لاہور کی تاریخ میں وہ دن بہت تاریک تھا جب حضرت سید علی ہجویریؒ نے مایوس ہو کر اپنی درس گاہ بند کر دی۔

"تمہاری یہ حرص و طمع تمہیں جس دروازے پر چاہے لے جائے میں تمہیں نہیں روکوں گا۔"
حضرت سید علی ہجویریؒ نے نہایت افسردہ لہجے میں اپنے شاگردوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "اب میں تم سے کیا شکایت کروں کہ تم نے میرے خلوص کے بدلے میں مجھے کیا دیا؟ جو کچھ کہوں گا اپنے اللہ سے کہوں گا کہ وہی تقدیروں کا بدلنے والا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تمہاری قسمت میں کیا لکھا ہے؟ مگر یہاں سے چلے جاؤ کہ اب میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔"

ایک عام آدمی بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ الفاظ ادا کرتے وقت حضرت سید علی ہجویریؒ کس قدر رنجیدہ خاطر ہوں گے...... مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ایک شاگرد نے بھی اپنے استادِ گرامی کے اذیت کرب کو محسوس نہیں کیا۔ دکان بند ہوئی تو دنیا داروں کی طرح اٹھ کر چلے گئے۔ تاریخ تصوف کے اوراق میں ایسے بے شمار واقعات محفوظ ہیں کہ جب کوئی مرید اپنے پیر و مرشد سے بچھڑتا تھا تو صدمۂ فراق سے بے حال ہو جاتا تھا۔ خود حضرت سید علی ہجویریؒ جب اپنے شیخ حضرت ابوالفضل ختلیؒ سے رخصت ہوئے تھے تو شدتِ غم سے نڈھال تھے...... مگر جب حضرت سید علی ہجویریؒ کے شاگرد اپنے استاد کی درس گاہ سے اُٹھے تو کسی کے چہرے پر عکسِ ملال تک نہیں تھا۔

پھر وہ دروازہ بند ہو گیا جس میں حکمت و عرفان کی مشعلیں جلتی تھیں اور جہاں سے سیاہ بخت لوگ روشنی لے کر اپنی روحوں کے تاریک مکانوں کو سجاتے تھے۔

جو لوگ قوموں کے عروج و زوال پر گہری نظر رکھتے ہیں، ان کے خیال میں یہ تاریخ لاہور کا سب سے بڑا المیہ تھا کہ حضرت سید علی ہجویریؒ نے دل شکستہ ہو کر اپنی درسگاہ بند کر دی اور مقامی طالب علموں کو احساس تک نہیں ہوا کہ وہ کس عظیم نعمت سے محروم ہو گئے ہیں۔

مدرسہ بند کرنے کے حوالے سے ایک اور روایت بھی مشہور ہے کہ ایک دن حضرت سید علی ہجویریؒ درس دے رہے تھے۔ اگلی صف میں بیٹھے ہوئے دو شاگردوں کا دھیان کسی اور طرف تھا اور کبھی کبھی وہ دونوں آپس میں گفتگو بھی کر لیتے تھے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کو اپنے شاگردوں کا یہ عمل سخت ناگوار گزرا۔ آپ نے درس روک دیا اور نہایت پُر جلال لہجے میں ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں تو یہاں موجود ہوں۔ پھر تم کہاں بھٹک رہے ہو؟"

جیسے ہی شاگردوں کی نظریں استادِ گرامی کے چہرۂ مبارک پر پڑیں، دونوں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔

کہنے والے کہتے ہیں اس وقت حضرت سید علی ہجویریؒ حالتِ جلال میں تھے اور ایک مردِ جلال کے جلال کو کوئی دنیادار برداشت نہیں کر سکتا۔ نتیجتاً وہ دونوں شوخ و شریر شاگرد حضرت شیخ کے جلال کی نذر ہو گئے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کو اپنے شاگردوں کی موت کا بڑا قلق تھا۔ آپ زندگی بھر اس واقعے کو فراموش نہ کر سکے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسی المناک حادثے کے رونما ہونے کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ نے تمام طالب علموں کیلئے اپنی درسگاہ کے دروازے بند کر دیئے تھے اور علم کے طلب گاروں سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔ تم اس قابل نہیں کہ اس امانت کا بوجھ برداشت کر سکو۔"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دو شاگردوں کے نذرِ جلال ہونے کا واقعہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہ ایک ایسی روایت ہے جو سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہے۔ اس کے برعکس اس روایت پر تمام محققین کا اتفاق ہے کہ حضرت سید علی ہجویریؒ نے اپنے شاگردوں میں دنیا طلبی کا شدید جذبہ دیکھ کر مدرسہ بند کر دیا تھا۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا عوامل تھے جن کے زیرِ اثر حضرت سید علی ہجویریؒ نے اسے کارِ عظیم کو ترک کر دیا جس کی خاطر آپ نے ازدواجی زندگی سے گریز اختیار کیا اور شوقِ تبلیغ میں اپنا وطن تک چھوڑ دیا۔ اگرچہ ان تمام واقعات پر ماہ و سال کا گہرا پردہ پڑا ہوا ہے اور صدیوں کا کثیف غبار چھایا ہوا ہے لیکن پھر بھی ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ لوگوں نے حضرت سید علی ہجویریؒ کو شدید اذیتیں پہنچائی تھیں جن سے دل برداشتہ ہو کر آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ بند کر دیا تھا۔

درس گاہ کے دروازے بند ہو چکے تھے لیکن کارِ تبلیغ ختم نہیں ہوا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ عام لوگوں کے اجتماعات سے خطاب کرتے اور اپنے پُر اثر وعظ سے گم کردہ راہ انسانوں کو صراطِ مستقیم کی طرف بلاتے۔ پھر جذبۂ عقیدت اس قدر بڑھا کہ لوگ آپ کو "گنج بخش" کہہ کر پکارنے لگے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد مشہور بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ لاہور تشریف لائے اور حضرت سید علی ہجویریؒ کے مزارِ مبارک کے قریب چلہ کش ہوئے اور پھر دہلی جانے سے پہلے آپ نے یہ شعر پڑھا جو شہرتِ دوام حاصل کر چکا ہے۔

گنج بخش ہر دو عالم، مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

"دونوں جہاں کے خزانے دینے والا، نورِ خداوندی کا مظہر،
ناقص لوگوں کیلئے مرشدِ کامل اور کاملوں کیلئے رہنما۔" (ترجمہ)

اکثر تذکرہ نگاروں نے اس شعر کو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرف منسوب کیا ہے مگر "گنج بخش" کا لفظ حضرت سید علی ہجویریؒ کی زندگی میں ہی شہرت پا چکا تھا۔ آپ نے اپنی تصنیف "کشف الاسرار" میں ایک مقام پر فرمایا۔

"اے علی! تجھے خلقت "گنج بخش" کہتی ہے اور تو ایک دانہ بھی پاس نہیں رکھتا اس بات کا اپنے دل میں خیال تک نہ لا...... ورنہ یہ محض دعویٰ اور غرور ہوگا۔ گنج بخش یعنی خزانے بخشنے پر قادر تو صرف اسی کی ایک ذات ہے جو بلاشک و شبہ مالک الملک ہے۔ اس کے ساتھ شرک نہ کر بیٹھنا ورنہ زندگی برباد ہو جائے گی۔ لاریب! وہی اکیلا خدا ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔"

حضرت سید علی ہجویریؒ کی اس تحریر سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ آپ اپنی زندگی ہی میں "گنج بخش" کے لقب سے مشہور ہو چکے تھے۔

بعض محققین کا کہنا ہے کہ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے جوشِ عقیدت میں یہ شعر پڑھا تو "گنج بخش" کا لفظ زبان زدِ خاص و عام ہو گیا اس روایت میں ایک کمی یہ ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے نہایت خاموشی سے چلہ کشی اختیار کی تھی۔ پھر اگر آپ نے اپنی زبان

مبارک سے یہ لفظ ادا فرمایا تو وہاں کتنے لوگ موجود تھے؟ کس نے سنا اور کس نے اس روایت کو دوسروں تک منتقل کیا؟ تاریخ اس سلسلے میں خاموش ہے۔ کچھ مؤرخین اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ مذکورہ شعر کا حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی قسم کے کئی اشعار حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے نام سے منسوب کئے جا چکے ہیں مگر بعد میں آنے والے محققین نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ کسی اور معین الدین کے اشعار ہیں جو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے صدیوں بعد پیدا ہوا تھا۔

اس بحث سے قطع نظر، عام عقیدت مند حضرت سید علی ہجویریؒ کو "گنج بخش" کہہ کر پکارتے تھے آپ ہمیشہ سخت لہجے میں تنبیہہ فرماتے تھے کہ "گنج بخش" صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔"

دوسرا لفظ "داتا" ہے جو اس طرح حضرت سید علی ہجویریؒ کی ذات گرامی کا حصہ بن گیا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت آپ کے حقیقی نام سے ناآشنا ہے۔ یہ لفظ ہندی ہے اور اس کا مطلب ہے "دینے والا" بعض اوقات ہندو لوگ "داتا" کو بھگوان (خدا) کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے مگر براہ راست خدا کے معنی میں۔ اگر آپ "گنج بخش" اور "داتا" کے مفہوم پر غور کریں تو دونوں الفاظ ہم معنی ہیں کوئی نہیں جانتا کہ حضرت سید علی ہجویریؒ کی روحانی عظمت کو ظاہر کرنے کیلئے "داتا" کا لفظ سب سے پہلے کس نے استعمال کیا؟ یہ امر طے شدہ ہے کہ اگر کوئی شخص حضرت سید علی ہجویریؒ کی زندگی میں یہ لفظ استعمال کرتا تو آپ سختی کے ساتھ اس کا منہ بند کر دیتے۔ اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ آپ کے وصال کے بعد عقیدت مندوں نے حضرت سید علی ہجویریؒ کی ذات گرامی کے ساتھ یہ لفظ وابستہ کر دیا...... اور پھر یوں ہوا کہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد علی بن عثمان کو بھول گئی اور انہیں صرف "داتا" یاد رہ گیا جو ہندی زبان سے اخذ کیا گیا ہے اور جس سے ہندوانہ اندازِ فکر کی عکاسی ہوتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب حضرت سید علی ہجویریؒ لاہور تشریف لائے تھے، اس وقت پورے ہندوستان پر بت پرستوں کا غلبہ تھا اور عام آدمی ایک معمولی زمیندار کو بھی "ان داتا" کہتے ہوئے نہیں تھکتا تھا۔ چونکہ حضرت سید علی ہجویریؒ کی ذات گرامی سے فیض و برکات کا دریا جاری تھا، اس لئے نو مسلم عقیدت مندوں نے آپ کو "داتا" کہہ کر پکارنا شروع کر دیا ہو۔ بہرکیف، موجودہ صورتحال یہ ہے کہ اب آپ پاک و ہند کے لوگوں میں داتا گنج بخشؒ کے نام سے شہرت عام رکھتے ہیں۔

☆☆......☆☆......☆☆

مدرسہ بند کرنے کے بعد ایک طویل عرصے تک حضرت سید علی ہجویریؒ پر ایک اضطرابی کیفیت طاری رہی۔ جب یہ بے چینی حد سے بڑھ جاتی تو آپ شیخ حسام الدین لاہوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اس عظیم المرتبت بزرگ کے بارے میں تمام تاریخیں خاموش ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ حضرت شیخ حسام الدین لاہوریؒ کی قبر کا نشان تک نہیں ملتا، حضرت داتا صاحب اپنی تصنیف "کشف المحجوب" میں ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں۔

"جب میں آخری وقت میں حضرت شیخ حسام الدین لاہوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے دیکھ کر آپ نے فرمایا۔ "میری جان! میرے لئے خاتمہ بالخیر کی دعا کر!"

پھر حضرت داتا صاحبؒ نے دیکھا کہ حضرت شیخ بہت آہستہ لہجے میں کچھ کہہ رہے تھے۔ حضرت داتا صاحبؒ نے کان لگا کر سنا۔ حضرت شیخ حسام الدین لاہوریؒ اپنے رب کی بارگاہ میں عرض کر رہے تھے۔ "الٰہی! تو میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں۔"

حضرت داتا صاحبؒ نے عرض کیا۔ "شیخ! میرے لئے بھی تو کچھ دعا کیجئے۔"

حضرت شیخ حسام الدین لاہوریؒ نے فرمایا۔ "اے علی ہجویریؒ! اپنی ذات سے کسی کو رنجیدہ نہ کر! آخر دم تک اس بات کی کوشش کرتے رہنا کہ ہر کوئی تجھ سے خوش رہے۔ جہاں تک ہو سکے لوگوں پر احسان کر! مگر اس کے باوجود کسی کو اپنا دوست نہ سمجھ اور اپنے علم کو برباد نہ کر! مال اور اولاد کو فتنہ (آزمائش) سمجھ جیسا کہ قرآن شریف میں ذکر ہے۔ "اموال اور اولاد تمہارے لئے فتنہ ہیں۔" میری طرف دیکھ کہ میں نزع کے عالم سے گزر رہا ہوں۔ کوئی بیٹا اور کوئی رشتہ دار اس وقت میری مدد نہیں کر سکتا، جو کچھ میں نے کیا ہے وہی میرے سامنے ہے اور وہی میرے آگے آئے گا۔"

☆☆......☆☆......☆☆

بہت سے لوگ حضرت داتا صاحبؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے خواہش مند رہتے تھے مگر آپ یہ کہہ کر انہیں خاموش کر دیا کرتے تھے۔ "تم جس راستے پر چلنا چاہتے ہو، وہ بہت دشوار گزار ہے۔ اگر تم چند قدم چل کر لڑکھڑا گئے تو خود بھی ناکام و نامراد ہو گے اور مجھے بھی شرمندگی میں مبتلا کرو گے۔ بس! حسن نیت کے ساتھ فرائض ادا کرتے رہو۔ یہی تمہاری ولایت ہے۔"

اگر کوئی شخص زیادہ اصرار کرتا تو حضرت داتا صاحبؒ اسے پہلے یہ واقعہ سناتے۔

"ایک بار میں ایک عجیب اُلجھن میں مبتلا ہو گیا۔ ایک روحانی راز تھا جو کسی طرح مجھ پر منکشف نہیں ہوتا تھا۔ اس کے انکشاف کے لئے میں نے بڑی ریاضت کی۔ مگر وہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ اس سے پہلے بس ایک بار میں اس قسم کی اُلجھن میں مبتلا ہو گیا تھا اور میں نے حضرت شیخ ابو یزیدؒ کے مزار مبارک پر چلہ کشی کی تھی اور بحکم خدا میرا وہ مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ بھی جب کوئی صورت نظر نہیں آئی تو میں حضرت شیخ ابو یزیدؒ کے مزار مبارک پر چلہ کشی پر گیا۔ تین مہینے تک ایک سوالی کی طرح حضرت شیخؒ کے آستانے پر پڑا رہا۔ اس دوران میں روزانہ تین مرتبہ غسل اور تیس بار وضو کرتا...... مگر میری مشکل روز اول کی طرح برقرار تھی، نہ کوئی خواب، نہ کوئی اشارہ...... بس محرومی ہی محرومی تھی۔ آخر میں نے مایوس ہو کر خراسان جانے کیلئے رخت سفر باندھا سنت کے طور پر ایک موٹے کپڑے کی گدڑی میرے بدن پر تھی اور اہل ظاہر کے اسباب میں سے صرف ایک عصا اور لوٹا میرے پاس تھا۔ شہر "کش" کے نواح میں ایک گاؤں تھا، جہاں میں نے قیام کیا۔ اتفاق سے یہاں ایک خانقاہ میں صوفیوں کا ایک گروہ مقیم تھا۔ میں وہاں پہنچا تو ان لوگوں نے مجھے دیکھتے ہی بہ آواز بلند کہا۔

"یہ شخص ہم میں سے نہیں ہے۔"

واقعی میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا کہ وہ رسم پرست لوگ تھے۔ ان کے جسم اچھی پوشاکوں سے آراستہ تھے اور میرے بدن پر ایک معمولی کپڑے کی گدڑی تھی اور اسی گدڑی کے سبب ان لوگوں نے مجھے نظر حقارت سے دیکھا تھا۔ آخر شب بسری کیلئے ان صوفیوں نے مجھے نیچے منزل پر جگہ دی اور خود بالائی منزل پر چلے گئے۔ پھر رات کے کھانے کا وقت آیا تو ان لوگوں نے مجھے ایک سوکھی روٹی دی جو بہت دن تک پڑے رہنے کے باعث سبز رنگ کی ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے مالک کا شکر ادا کرتے ہوئے وہی بدمزہ اور مڑی ہوئی روٹی کھالی...... مگر وہ صوفی خود ایسی لذیذ غذائیں کھا رہے تھے کہ جن کی خوشبو نیچے منزل تک آ رہی تھی۔

طعام کے بعد ان صوفیوں نے خربوزے کھانے شروع کر دیئے اور چھلکے میری طرف پھینکتے جاتے تھے۔ ان کا یہ سلوک دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں کہا۔

''اے مولائے کریم! اگر ان لوگوں کا ظاہری حلیہ وہ نہ ہوتا جو تیرے دوستوں کا ہوتا ہے تو میں کسی بھی صورت میں ان کی یہ زیادتی برداشت نہ کرتا۔''

الغرض یہ ظاہر پرست صوفی مجھے طرح طرح سے طنز و ملامت کا ہدف بنا رہے تھے مگر انبیائے پاک علیہم السلام اور اولیائے کرام کی ایک بہت بڑی سنت پر عمل کرنے کی وجہ سے میرے دل کو ناقابل بیان مسرت ہو رہی تھی...... اور لحہ بہ لحہ مجھ پر عجیب و غریب اسرار ظاہر ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ میری مشکل جو حضرت شیخ ابویزیدؒ کے مزار مبارک پر چلہ کش ہونے کے باوجود حل نہیں ہوئی تھی، خود بخود آسان ہوگئی...... اور مجھ پر یہ راز فاش ہوگیا کہ ہمارے بزرگ کس طریقے سے جاہلوں کی محبت سے مستفیض ہوتے تھے اور طنز و ملامت کو برداشت کرنے سے کس طرح روحانی درجات میں اضافہ ہوتا تھا؟''

اپنی زندگی کا اہم ترین واقعہ سنانے کے بعد حضرت داتا صاحبؒ اس شخص سے پوچھتے جو مرید ہونے کی خواہش رکھتا تھا۔ ''کیا تم سلوک کے راستے میں یہ سنگ ملامت برداشت کر سکو گے اور سر سے پاؤں تک زخمی ہونے کے باوجود حرف شکایت زبان پر نہیں لاؤ گے؟''

اگر وہ شخص کہتا کہ طنز و ملامت کے سارے تیر برداشت کرے گا تو حضرت سید علی ہجویریؒ اسے اپنے حلقۂ ارادت میں شامل فرما لیتے...... اور اس کے چہرے سے ذہنی کشمکش کے آثار ظاہر ہوتے تو یہ کہہ کر رخصت کر دیتے۔

''فرض و سنت پر سختی کے ساتھ کاربند رہو۔ جہاں تک ممکن ہو سکے لوگوں کی دل آزاری سے بچو اور مخلوق خدا کی خدمت کو اپنا شعار بناؤ۔ بس یہی تمہارے لئے راہ نجات ہے۔''

☆☆.................☆☆.................☆☆

حضرت داتا گنج بخشؒ سماع کے قائل تھے مگر اپنے مریدوں کو اس قسم کی مجلسوں سے دور رہنے کی تاکید فرماتے تھے۔ آپ کے پیر و مرشد حضرت فتح ابوالفضلؒ کا مشہور قول ہے۔ ''سماع ان لوگوں کا توشہ ہے جو ابھی درمیانی منزل میں ہوں مگر جو منزل رسیدہ ہوں ان کو سماع کی ضرورت نہیں۔''

والی کابل و غزنی کی طرف سے رائے راجو کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا گیا تھا۔ بعض روایتوں کے مطابق یہ شخص سفلی عملیات میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے پنجاب کے لوگ اسے راجو جوگی کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک دن حضرت سید علی ہجویریؒ اپنی درس گاہ کے دروازے پر تشریف فرما تھے کہ ایک ہندو عورت سر پر دودھ کا مٹکا اٹھائے ہوئے سامنے سے گزری۔ آپ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا۔

''خاتون! اگر تم یہ دودھ ہمارے ہاتھ فروخت کر دو گی تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے تمہاری گائیں بہت سارا دودھ دیں گی اور ان کی صحت پر بھی خراب اثر نہیں پڑے گا۔''

''بابا! ہم یہ دودھ رائے راجو کو دینے پر مجبور ہیں۔'' ہندو عورت نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم لوگ رائے راجو کو دودھ نہ دیں تو ہمارے جانوروں کے تھنوں سے دودھ کے بجائے خون نکلنے لگتا ہے۔''

''انشاء اللہ! اب ایسا نہیں ہوگا۔'' حضرت سید علی ہجویریؒ نے فرمایا۔ ''تم تجربہ کر کے دیکھ لو۔''

ہندو عورت حضرت داتا صاحبؒ کی روحانی شخصیت سے کچھ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے دودھ کا مٹکا آپ کے حوالے کر دیا۔ آپ نے دودھ کی قیمت ادا کی۔ پھر تھوڑا سا دودھ پیا اور باقی دریا میں ڈال دیا۔

عورت نے شام کے وقت اپنے جانوروں کو دوہا تو حیرت انگیز طور پر گھر کے سارے برتن بھر گئے اور گایوں کے تھنوں میں دودھ پھر بھی ختم نہیں ہوا۔ پھر یہ خبر آناً فاناً قرب و جوار کے دیہاتوں میں پھیل گئی۔ غریب لوگ دور دراز کے علاقوں سے دودھ لے کر حضرت داتا گنج بخشؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ آپ تھوڑا سا دودھ پی لیتے اور باقی دریا میں پھنکوا دیتے۔ پھر جب وہ دیہاتی دوبارہ اپنے جانوروں کو دوہتے تو ایسا لگتا کہ بھینسوں اور گایوں کے تھنوں سے دودھ کا آبشار اُبل رہا ہے۔ نتیجتاً لاہور کے تمام گوالوں نے رائے راجو کو دودھ دینا بند کر دیا۔

آخر پنجاب کا حکام حضرت سید علی ہجویریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انتہائی ناخوشگوار لہجے میں کہنے لگا۔ ''تم نے میرا دودھ تو بند کرا دیا اب کوئی اور کمال دکھاؤ۔''

حضرت سید علی ہجویریؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''میں کوئی جادوگر نہیں ہوں کہ تمہیں شعبدے دکھاؤں۔''

''پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟'' رائے راجو نے برہم ہو کر پوچھا۔

''میں تو اتنا حقیر و عاجز ہوں کہ اپنے ارادے سے اپنے ہاتھ کو بھی جنبش نہیں دے سکتا۔'' حضرت داتا گنج بخشؒ نے فرمایا۔ ''یہ سب اسی کے حکم سے ہو رہا ہے جو مالک الملک ہے، پرستش کے لائق ہے اور اپنی ذات میں واحد ہے۔ ہاں! اگر تمہیں اپنے ساحرانہ کمالات پر ناز ہے تو شوق سے دکھاؤ۔''

رائے راجو بہت بڑا شعبدہ باز تھا مگر جب اس نے حضرت سید علی ہجویریؒ کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا پورا جسم پتھر کا ہوگیا ہے اور وہ اپنی تمام ساحرانہ

صلاحیتوں سے محروم ہو چکا ہے۔ آخر رائے راجو نے عاجز آ کر حضرت سید علی ہجویریؒ کے سامنے
پر سر رکھ دیا۔

پھر اہل لاہور نے یہ حیرت انگیز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ پنجاب کا حاکم اپنے باپ دادا کے عقائد سے تائب ہو کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کے دست حق پر مسلمان ہونے والا یہ پہلا شخص تھا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کی ذات گرامی سے بے شمار کرامات کا ظہور ہوا مگر سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ آپ نے تصوف کو شریعت اور سنت کا پابند کیا، پتھر دلوں میں ایسی صلاحیت پیدا کی کہ وہ لطافت اور پھولوں کی خوشبو کو محسوس کر سکیں...... اور بنجر زمین کو وہ نم بخشا جس کے اثر سے میں ایمان کی فصل سرسبز و شاداب ہوئی۔

جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے سفر تبلیغ کا آغاز کیا تو پہلے حضرت سید علی کے دربار معرفت میں حاضر ہوئے اور چلہ کشی کے بعد اپنے پیش رو کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

"ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما۔"

حضرت سید علی ہجویریؒ کے بارے میں دنیا پرستوں کی مرتب کردہ تاریخ کیا کہتی ہے، ہمیں سے کوئی غرض نہیں۔ ہمارے پیش نظر صرف سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا قول مبارک ہے جو حضرت داتا گنج بخشؒ کی روحانی عظمتوں پر سب سے بڑی گواہی ہے اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

کسی معتبر تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ حضرت سید علی ہجویریؒ کا خلیفۂ اکبر کون تھا؟ پھر یہ سلسلہ کس طرح جاری ہوا اور موجودہ زمانے میں روحانیت کے اس عظیم خانوادے میں حضرت داتا گنج بخشؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف "کشف المحجوب" ہی آپ کی خلیفۂ اکبر ہے اور قیامت تک اسی کتاب کے ذریعے "سلسلۂ ہجویریہ" جاری رہے گا۔ بڑے بڑے مشائخ اور اولیائے کرام کا قول مبارک ہے کہ

"اگر کسی شخص کو مرشد کامل کی تلاش ہو اور کوتاہی قسمت سے کوئی روحانی رہنما نہ ملتا ہو تو اسے چاہئے ہے کہ وہ خلوص دل کے ساتھ "کشف المحجوب" کا مطالعہ کرے۔ انشاء اللہ ہدایت پا جائے گا۔"

میں ذاتی طور پر گواہ ہوں کہ 1971ء میں "کشف المحجوب" کے مطالعے سے میرے ایک دوست کے نظریات یکسر تبدیل ہو گئے۔ میرا وہ دوست اس وقت جرمنی میں مقیم ہے اور اپنے آپ کو حضرت داتا گنج بخشؒ کا ادنیٰ ترین غلام کہتا ہے۔

علامہ اقبال نے سچ کہا ہے۔

"خاک پنجاب از دم او زندہ گشت۔"

(پنجاب کی زمین اُس کے دم سے زندہ ہوگئی۔)

حضرت سید معین الدین چشتیؒ

ولادت...... 536ھ (سیستان)

وفات...... 633ھ (اجمیر شریف)

اسم گرامی سید معین الدین حسنؒ...... والد محترم کا نام غیاث الدین حسنؒ...... علم کی تلاش میں طویل سفر کیے۔ حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کے دست مبارک پر بیعت کی...... برصغیر پاک و ہند میں سلسلۂ چشتیہ کے بانی...... "سلطان الہند" اور "غریب نوازؒ" القاب۔

اہل حق کی روایتوں کے امیں
کوچۂ وہم میں یقیں ہی یقیں
ظلمت شب میں ایک شمع حرم
دشت وحشت میں اک مسافر دیں
آٹھ صدیوں سے ہند کے سلطاں
خواجۂ خواجگاں معین الدیں

(خان آصف)

سلطان محمود غزنوی سومنات کی جنگ ہار جاتا مگر عین لڑائی کے دوران اسے مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کا بخشا ہوا خرقہ یاد آیا اور پھر سلطان نے اسی خرقے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر دعا کی۔

دشمنوں کی بساط الٹ گئی اور سلطان محمود غزنوی فاتح قرار پایا، پھر تاریخ نے اس کے نام کو ''بت شکن'' کی حیثیت سے محفوظ کرلیا..... مگر سلطان کی اولاد اس ورثے کی حفاظت نہ کرسکی اور ایک بزرگ کی دعاؤں سے حاصل کی ہوئی عظیم الشان سلطنت کو گنوا دیا۔

یہی حال شہاب الدین غوری کا تھا۔ اسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی دعاؤں کے طفیل پرتھوی راج چوہان پر غلبہ حاصل ہوا مگر غوری کے وارث بھی ان دعاؤں کی تاثیرات کو برقرار نہ رکھ سکے۔

شہاب الدین غوری سے لے کر سلطان ابراہیم لودھی تک، مسلمان برصغیر کی قسمت کے مالک رہے..... مگر سلطان شمس الدین التمش اور ناصر الدین محمود کے سوا کوئی تیسرا فرمانروا ایسا نہیں تھا جس نے نظام اسلام کی آبیاری کے لئے اپنا خون صرف کیا ہو۔ ویسے سب مسلمان تھے مگران کی توجہات کا مرکز صرف ان کی اپنی ذات تھی۔ سلطان سکندر لودھی ایک پارسا شخص تھا مگر اس کا بیٹا ابراہیم لودھی ہزاروں برائیوں اور خرابیوں کا مجموعہ۔ اس کے غرور تکبر کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے خونی رشتے داروں کو بھی غلام سمجھتا تھا۔

قدرت نے ابراہیم لودھی کو اس کے اعمال کی سزا دینے کیلئے ایک چھوٹی سی ریاست فرغانہ کے حکمران ظہیر الدین بابر کو دہلی اور آگرہ پر بطور عذاب نازل کیا۔ یہ مغل زادہ برسوں اپنے اس شعر پر عمل کرتا رہا اور خانہ بدوشوں کی طرح مارا مارا پھرتا رہا۔

نوروز و نوبہار و مئے دلربا خوشی است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

مگر جب وہ پانی پت کے میدان میں رانا سانگا کے دو لاکھ راجپوتوں کے مقابل آیا تو اپنا فلسفۂ کیف و نشاط بھول گیا۔ بابر کو احساس ہوا کہ معرکۂ صیاح میں علم نجوم، ساغر و صراحی اور چنگ و رباب اس کے کسی کام نہیں آسکتے۔ مجبوراً اس نے خالق کائنات کے سامنے فرشِ خاک پر سر رکھ دیا اور گریہ وزاری کرنے لگا۔

”اے خدا! مجھے لشکر کفار پر غلبہ عطا فرما! میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد اس حرام شے کو منہ نہیں لگاؤں گا۔“

یہ دعا مانگ کر ظہیر الدین بابر نے علم نجوم کی کتابوں کو آگ لگادی اور شراب کے برتن توڑ ڈالے۔ پھر یوں ہوا کہ ایک طرف راجپوتوں کا خون بہتا رہا اور دوسری طرف نادر و نایاب شرابوں کے ذخیرے۔ دعا دل سے مانگی گئی تھی۔ اس لئے عالم اسباب میں اثر پذیر ہوئی...... اور پھر مغل زادے کو وہ فتح حاصل ہوئی جسے پوری دنیا کی عسکری تاریخ میں ایک کارنامے کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

شہنشاہ ظہیر الدین بابر 49 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوگیا۔ وہ محض ایک سیاسی طالع آزما تھا۔ اس لئے مغل سلطنت کی بنیادیں تو مضبوط کرگیا مگر اس کی فتوحات سے اسلامی نظام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ مغل شہنشاہ خود تو شراب و شباب سے تائب ہوگیا تھا مگر اس کا وارث نصیر الدین ہمایوں عیش و عشرت میں مبتلا رہتا تھا۔ نتیجتاً ایک اور طالع آزما شیر شاہ سوری بساطِ سیاست پر ابھرا اور اس نے ہمایوں سے پنجہ آزمائی کی۔ مغل شہنشاہ کے کمزور بازو تلوار کا بوجھ نہ اٹھا سکے۔ انجام کار اسے ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوکر ایران میں پناہ گزینی کی زندگی گزارنی پڑی۔

شیر شاہ بڑا جفاکش اور عادل حکمران تھا مگر کاتبِ تقدیر نے اس کی عمر اور اقتدار کے خانے میں بہت کم مدت تحریر کی تھی۔ پھر بھی شیر شاہ سوری نے پانچ سال کے مختصر ترین دورِ حکومت میں بڑے حیران کن تعمیری کارنامے انجام دیئے۔ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہ جاتا تو سلطان شمس الدین التمش کے عہدِ رفتہ کی یاد تازہ ہوجاتی...... مگر...... اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

شیر شاہ کا جانشین سلیم شاہ کچھ زیادہ اہل ثابت نہیں ہوا، آخر آپس کی رنجشوں نے سوری خاندان کا خاتمہ کردیا اور یہ جنگجو قبیلہ اقتدار کی دنیا میں ہمیشہ کیلئے راندۂ درگاہ قرار پایا۔

بساطِ سیاست کو غبار آلود پاکر، مغرور شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں نے اپنے حریفوں کی کمزور بنیادوں پر ایک کاری ضرب لگائی اور اپنی فردوسِ گم شدہ کو دوبارہ حاصل کرلیا۔ ہمایوں اپنے کردار اور عقائد کے اعتبار سے ایک بہتر انسان تھا...... مگر کارزارِ ہستی میں وہ بہتر حکمران ثابت نہیں ہوا۔ کثرتِ افیون نوشی نے اس کی ذہنی صلاحیتوں کو مفلوج کردیا تھا۔ آخر ایک دن وہ مرگِ ناگہانی سے دوچار ہوا اور بلند زینے کی سیڑھیوں سے گر کر مر گیا۔

ہمایوں کا بیٹا جلال الدین اکبر باپ کی موت کے وقت بہت کم سن تھا۔ اس لئے مذہبی اور دنیاوی تعلیم سے محروم رہا۔ نتیجتاً فتنہ پردازوں کو اسلام کے خلاف زہر افشانی کا موقع مل گیا۔ شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹے ابوالفضل اور فیضی نے اکبر کے دل و دماغ میں اپنی بدعقیدگی کا زہر اتارنا شروع

کردیا۔ ہندوستان کے برہمن بھی اس کے گرد سمٹ آئے۔ سیاست کی آڑ میں عجیب عجیب چالیں چلی گئیں۔ یہاں تک کہ اس کم عقل حکمران نے اپنا مذہب ”دین الٰہی“ ایجاد کرلیا۔

اکبر کے اس نئے مذہب پر ہندو دھرم کا زیادہ غلبہ تھا۔ بادشاہ کے سامنے آگ روشن کی جاتی تھی اور ایک خوش گلو درباری دلکش آواز میں حمد کے اشعار گاتا تھا۔ اس طرح ”آتش پرستی“ کا جواز پیدا کیا گیا۔

”آشیانہ منزل“ میں بادشاہ سورج کے سامنے سر جھکا کر بیٹھا کرتا تھا۔ یہ آفتاب پرستی کی ابتداء تھی۔

بادشاہ سفر اور قیام دونوں میں گنگا کا پانی استعمال کرتا تھا۔ معتمد ملازموں کی ایک جماعت دریا کے کنارے مامور رہتی تھی جہاں سے سر بمہر کوزوں میں پانی بھر کر لایا جاتا تھا۔ قیام لاہور کے دوران بادشاہ ہندوؤں کے مشہور تیرتھ ہردوار کا پانی پیتا تھا۔ اسی طرح تمام کھانے گنگا جل میں پکائے جاتے تھے۔

آگ سورج کے آگے سر جھکانے اور گنگا جل پینے کے بعد اکبر نے تمام ہندوؤں کو خدائے واحد کا پرستار قرار دیدیا۔ ”یہ راز ہم پر روشن ہوگیا ہے کہ ہندو کسی کو خدا کا شریک نہیں ٹھہراتے۔ اگرچہ ان کی کچھ باتیں قابل اعتراض ہیں لیکن ہمیں ان کی خدا پرستی کا پورا یقین ہے۔“

ہندوؤں کو خوش کرنے کیلئے اکبر نے گائے کا ذبیحہ حرام قرار دیدیا۔ وہ ہر قسم کے گوشت پر پابندی لگانا چاہتا تھا مگر یہ سوچ کر باز رہا کہ اس طرح بہت سے کام ناتمام رہ جائیں گے۔ پھر بھی مغل شہنشاہ نے قصابوں اور ماہی گیروں کیلئے نیا فرمان جاری کردیا کہ ان کے گھروں کو عام آبادی سے علیحدہ کردیا جائے...... اور جو لوگ اس برادری سے رسم و راہ رکھیں ان سے تاوان وصول کیا جائے۔

قرآن نے سور اور اس کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے۔ اس حکم پر اکبر نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر سور کو اس کی بے غیرتی کی وجہ سے حرام قرار دیا گیا ہے تو شیر یا اس طرح کے دوسرے جانوروں کو حلال ہونا چاہئے۔“

پھر اکبر کی گستاخیاں اس حد تک بڑھیں کہ وہ علی الاعلان مذہب اسلام کا مذاق اڑانے لگا۔ ایک دن اس نے اپنے درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ملت اسلامی کا سارا سرمایہ بدعقلی کا مجموعہ ہے۔“ (معاذ اللہ)

دراصل شیخ مبارک، ابوالفضل، فیضی اور عیار برہمنوں نے اکبر کے منہ میں اپنی زبانیں رکھ دی تھیں اور وہ ان ہی ناپاک زبانوں سے مذہب اسلام کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔

دیوان خانے میں کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اعلانیہ نماز ادا کرسکے۔

اسی طرح اکبر نے صاحب نصاب لوگوں پر زکوٰۃ بھی معاف کردی تھی۔ بظاہر وہ اپنی تقریروں میں کہا کرتا تھا کہ زکوٰۃ ختم کرنے سے اس کا مقصد معاشی حالات کو بہتر بنانا ہے...... مگر دراصل وہ اسلام کے اس دوسرے بڑے رکن کو ہندوستان سے ہمیشہ کیلئے ختم کرنا چاہتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اکبر نے ''دین الٰہی'' کی بنیادیں مضبوط کرنے کیلئے سجدۂ تعظیمی کا اجرا کیا۔ بادشاہ کا دیدار کرنے والے کسی جھجک کے بغیر اکبر کو سجدہ ادا کرتے تھے اور یہ جواز پیش کرتے تھے کہ زمانۂ قدیم میں بھی شاہان وقت کیلئے سجدۂ تعظیمی جائز تھا (دین اسلام کے خلاف یہ کھلی بغاوت اور سرکشی تھی۔ اسلام نے ایسے تمام سجدوں اور تعظیمی آداب کو قیامت تک کیلئے حرام قرار دیدیا تھا) اکبر کے مشیروں نے ماضی کی ایک رسم سے فائدہ اٹھایا اور جاہل بادشاہ کو یقین دلا دیا کہ سجدۂ تعظیمی دراصل خدا ہی کو سجدہ کرنا ہے۔

پھر سجدۂ تعظیمی کی رسم نے یہاں تک فروغ پایا کہ سجدہ کرنے والا دستار کو ہاتھ میں لے لیتا اور برہنہ سر بادشاہ کے پائے اقدس پر رکھ دیتا۔ پھر زبان حال سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتا۔

''میں اپنے دل کی توجہ بادشاہ کی اطاعت کی طرف مبذول کرتا ہوں۔''

ملاقات کے وقت ''السلام علیکم'' کی معروف رسم ختم ہو چکی تھی اور ان کی جگہ ایسے کلمات ادا کئے جاتے تھے جن کے ظاہری معانی بڑے دلکش اور خوش کن تھے مگر باطنی طور پر وہ کسی اور کی خدائی کا اعلان کرتے تھے۔ جب کوئی شخص کسی سے ملتا تو باآواز بلند کہتا۔ ''اللہ اکبر۔''

جواب دینے والا بڑی عقیدت سے جواب دیتا۔ ''جل جلالہ......''

آج بھی عام طور پر مسلمان اپنے خدا کی کبریائی بیان کرنے کیلئے یہی الفاظ استعمال کرتے ہیں ......مگر مغل شہنشاہ کے دور اقتدار میں ان کلمات کا مفہوم کچھ اور تھا۔ مغل شہنشاہ کا خاندانی نام جلال الدین تھا اور لقب ''اکبر''۔ جب پکارنے والا ''اللہ اکبر'' کہتا تو اس کے ذہن میں یہی خیال ہوگا کہ وہ خالق کائنات کو پکار رہا ہے...... مگر دین الٰہی کی بنیاد رکھنے والے یہ کلمہ سن کر مطمئن ہو جاتے کہ وہ اکبر کی خدائی کیلئے راستہ ہموار کر رہے ہیں۔ اسی طرح ''جل جلالہ'' بظاہر اللہ کی شان کبریائی کا اظہار ہوتا تھا مگر سلطنت مغلیہ کے فتنہ گر یہی سمجھتے تھے کہ یہ جلال الدین بادشاہ کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ الغرض بڑے فریب کارانہ انداز میں اللہ کے سادہ دل بندوں کو گمراہ کیا جا رہا تھا۔

اکبری دور کے ایک مشہور شاعر ملا شیری نے اپنے شعر میں اسی سنگین حقیقت کی طرف کھلا اشارہ کیا ہے۔

بادشاہ امسال دعوائے نبوت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

(بادشاہ نے اس سال نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو وہ اگلے سال خدا ہو جائے گا)

مختصر یہ کہ دربار اکبر کے فتنہ گر شیخ مبارک، ابوالفضل، فیضی اور دوسرے عیار برہمن مغل شہنشاہ کو خدا بنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے...... اور وہ کم عقل حکمران خود بھی اپنی اس حیثیت سے مطمئن ہو چکا تھا کہ ایک واقعے نے اس کے ہوش اڑا کر رکھ دیئے۔

اکبر نے اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے اور ہندو اکثریت کی حمایت حاصل کرنے کیلئے مشہور راجپوت سردار راجہ مان سنگھ کی بہن رانی جودھا بائی سے شادی کی تھی۔ ملکۂ ہند کی پوجا پاٹ کیلئے قصر شاہی میں ایک چھوٹا سا مندر تعمیر کیا گیا تھا جس کے اندر ہندوؤں کے تمام قابل ذکر دیوتاؤں کی مورتیاں موجود تھیں۔ قلعے میں مؤذن کی صدا بلند ہونے کے بجائے صبح وشام ''کیرتن'' اور ''بھجن'' کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں...... اور گمراہ مصاحب اسے یقین دلاتے رہتے تھے۔

''آپ ہی ''ان داتا'' ہیں اور آپ ہی لوگوں کے ''مشکل کشا''۔ دنیا کے سارے کام آپ ہی کے حکم سے انجام پاتے ہیں اور آپ کے سوا کسی طاقت کا وجود نہیں۔''

دین الٰہی کا موجد جھروکے میں بیٹھ کر رعایا کو درشن دے رہا تھا اور بزعم خود اپنی روحانی طاقت سے لوگوں کے مسائل حل کر رہا تھا...... مگر ایک دن جب اکبر کی نظر اپنے ذاتی مسئلے پر گئی تو وہ لرز اٹھا۔ مغل شہنشاہ کے کئی بیٹے ہوئے مگر چند روز یا چند ماہ زندہ رہ کر مر گئے۔ رانی جودھا بائی نے اپنے دیوتاؤں کے سامنے بڑی گریہ وزاری کی، بڑی منتیں مانیں، بڑی نذریں پیش کیں مگر ملکۂ عالیہ تخت ہندوستان کا وارث پیدا کرنے سے قاصر تھی۔

اکبر بھی تنہائی میں سوچا کرتا تھا کہ وہ کیسا مشکل کشا ہے کہ خود اپنی مشکل دور نہیں کر سکتا۔ پھر بے اولاد ہونے کی یہ خلش اس قدر بڑھی کہ اکبر کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔

آخر کار ایک دن کسی درباری نے ڈرتے ڈرتے اس سے کہا...... ''آپ کا مسیحا یہیں فتح پور سیکری میں موجود ہے۔ اس سے رجوع کریں۔ سارے دکھ درد دور ہو جائیں گے۔''

''کون؟'' مغل شہنشاہ نے حیران ہو کر اپنے درباری کی طرف دیکھا۔

''حضرت شیخ سلیم الدین چشتی۔'' درباری نے مسیحا کی نشاندہی کی۔

''کیا شیخ ہمیں تخت ہندوستان کا وارث دے سکتے ہیں؟'' مغل شہنشاہ کی حیرت برقرار تھی۔ اس کی پراگندہ عقل یہ بات ماننے کیلئے تیار نہیں تھی کہ دعاؤں سے انسانی تقدیر بھی بدل سکتی ہے۔

''آپ وہاں حاضر ہو کر تو دیکھیں۔'' درباری نے عرض کیا۔ ''میری آنکھیں تو بارہا ایسے مناظر دیکھ چکی ہیں کہ مفلس و بدحال انسان اس آستانے پر حاضر ہوئے اور اپنے دامن بھر کر چلے گئے۔''

''ہمیں ایک فقیر کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے؟'' مغل شہنشاہ تذبذب کا شکار تھا۔ ''ہم تو خود ضرورت مندوں کی جھولیاں بھرتے ہیں، اگر ہمارا دامن کسی کے آگے پھیلا تو پھر ہماری روحانی عظمتوں کی بلند ترین عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔''

''ظل الٰہی بہتر سمجھتے ہیں۔'' درباری خاموش ہو گیا مگر اس کی گفتگو نے اکبر کی آرزوؤں کے خرمن میں ایک دہکتا ہوا انگارہ رکھ دیا تھا۔

مغل شہنشاہ کئی دن تک شدید ذہنی کشمکش کا شکار رہا۔ آخر ایک روز اولاد کی سلگتی ہوئی خواہش اسے ایک بوریا نشین درویش کے دروازے تک لے گئی۔

حضرت شیخ سلیم الدینؒ سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے ادائے بے نیازی کے ساتھ فرمانروائے ہند کی طرف دیکھا۔ ''لوگوں کا ان داتا اور مشکل کشا ایک فقیر کے دروازے پر؟''

"شیخ! تمام حکیم وطبیب عاجز آ گئے اور ساری تدبیریں رائیگاں گئیں۔" مغل شہنشاہ نے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے سامنے اپنی ناطاقتی اور بے سروسامانی کا اعتراف کرلیا۔

"پھر میں کیا کروں؟" حضرت شیخؒ نے فرمایا۔

"مجھے تخت ہندوستان کا وارث چاہئے۔" مغل شہنشاہ گریہ وزاری کرنے لگا۔

"واللہ خیر الوارثین (اللہ بہتر وارث دینے والا ہے)" حضرت شیخ سلیم چشتیؒ نے آیت مقدسہ تلاوت فرمائی۔ "مگر تو نے تو اللہ کو فراموش کردیا ہے۔ پھر تجھے تیرا وارث کون دے گا؟"

"شیخ! میں آپ کی دعاؤں کا طلب گار ہوں۔" مغل شہنشاہ بہت دیر تک فریاد کرتا رہا۔

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ استغراق کی حالت میں بیٹھے رہے۔ پھر آنکھیں کھول کر مغل شہنشاہ سے فرمایا۔ "تو بظاہر ہندوستان کا حکمراں ہے مگر حقیقتاً سلطان الہند کوئی اور ہے۔"

اکبر نے شدید حیرت کے عالم میں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی طرف دیکھا۔

"دراصل اقلیم ہند پر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی حکومت ہے۔" حضرت شیخ سلیم چشتیؒ نے فرمایا۔ "اور میں بھی اسی آستانے کا غلام ہوں۔ اب تو اس فقیر کے دروازے تک آ گیا ہے تو میں بس اتنا ہی کرسکتا ہوں کہ تجھے بھی سلطان الہند کے حوالے کردوں۔"

"کچھ بھی کیجئے شیخ!" مغل شہنشاہ نے حضرت سلیم چشتیؒ کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

"حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار اقدس پر حاضری دے اور فقیروں کی طرح اپنا دامن پھیلا دے۔ پھر دیکھ کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تجھے نامراد نہیں لوٹائے گا۔"

مغل شہنشاہ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر واپس چلا گیا۔

پھر دیکھنے والوں نے عجیب منظر دیکھا۔ مغل شہنشاہ اجمیر شریف کی طرف جارہا تھا جہاں سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ آرام فرما ہیں۔

فتنہ گروں کی جماعت میں ہلچل مچ گئی۔ مفسدوں کے اس گروہ نے مغل شہنشاہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"اگر آپ اجمیر تشریف لے گئے تو رعایا کے ذہن منتشر ہوجائیں گے۔ لوگ تو آپ سے مرادیں مانگتے ہیں۔ پھر آپ کس کے دروازے پر ہاتھ پھیلانے جارہے ہیں؟"

"جب ہم اپنے آپ کو کچھ نہیں دے سکتے تو پھر دوسروں کو کیا دیں گے؟" مغل شہنشاہ نے فتنہ گروں کی بات کو جھٹلا دیا۔ "یہ سب فریب ہے، جب ہمارے تخت کا وارث اس دنیا میں نہیں آسکا تو پھر ہم کیسے مشکل کشا ہیں؟"

فتنہ گروں نے مغل شہنشاہ کو باز رکھنے کیلئے آخری دلیل پیش کی...... "جہاں ظل الٰہی تشریف لے جارہے ہیں وہ جگہ اینٹوں اور پتھروں کا ایک ڈھیر ہے۔ ایک بے جان قبر کسی زندہ انسان کو کیا دے سکتی ہے؟"

دربار اکبری کے فتنہ گر پوری طاقت سے منطق کی زبان میں گفتگو کررہے تھے مگر مغل شہنشاہ ان کی دلیل سے متاثر نہیں ہوا۔ اس نے اعلان کردیا کہ وہ فتح پور سیکری سے اجمیر شریف تک پیدل سفر کرے گا۔

فتنہ گر، بادشاہ کا منہ دیکھتے رہ گئے اور "دین الٰہی" کا موجد، رعایا کا ان داتا، مخلوق کا مشکل کشا اور بھکاری اپنی درخواست لے کر اجمیر شریف روانہ ہوگیا۔

مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کا یہ سفر کوئی افسانہ نہیں، ایک زندہ حقیقت ہے۔ کسی اور نے نہیں، خود اکبر کے بیٹے شہنشاہ جہانگیر نے اس تاریخی واقعے پر گواہی دی ہے۔

جہانگیر نے اپنی تزک (خودنوشت) میں واضح طور پر تحریر کیا ہے۔

"میرے والد بزرگوار نے میری ولادت کے لئے فتح پور سے اجمیر تک پیدل سفر کیا تھا۔ یہ فاصلہ ایک سو بیس کوس ہے۔"

جب مغل شہنشاہ اجمیر شریف پہنچا تو اس کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ سفر کے آغاز میں خدمت گاروں نے اکبر کو سمجھایا تھا کہ یہ انتہائی دشوار گزار راستہ ہے۔ اگر ظل الٰہی سواری استعمال فرمائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

"ہم سلطان الہندؒ کے دربار میں حاضر ہورہے ہیں۔ نیازمندی کے اظہار کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ پیادہ پا سفر اختیار کیا جائے۔" اکبر نے واضح جواب دے کر اپنے خدمت گاروں کی زبانیں بند کردی تھیں۔

پھر جب مغل شہنشاہ یہ طویل سفر طے کرکے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہوا تو اس کے پاؤں زخمی تھے اور راستے کے گرد وغبار سے سرخ وسفید چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔

پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جلال الدین اکبر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قدموں میں دست بستہ کھڑا ہے۔ اس نے کسی گداگر کے مانند اپنی دامن مراد پھیلا دیا اور دعا مانگنے لگا۔

"بے شک! آپ سلطان الہند ہیں! اور میں آپ کی عظیم الشان سلطنت کا ایک ادنیٰ کوچہ گرد۔ میری حالت زار پر توجہ فرمائیے۔"

جلال الدین اکبر بہت دیر تک زاروقطار روتا رہا۔ پھر اس نے جوش اضطراب میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار مبارک کی چادر اپنے سر پر ڈال لی۔ مغل شہنشاہ کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کے دل مضطرب کو قرار آ گیا ہو۔

پھر فرمانروائے ہند نے اجمیر شریف کے باشندوں میں زر نقد تقسیم کیا اور واپس لوٹ گیا۔

فتنہ گر مصاحب آپس میں باتیں کرتے اور در پردہ اکبر کا مذاق اڑاتے۔

"ایک قبر سے ہندوستان کا وارث مانگنے گیا تھا۔ پتھروں کے ڈھیر نے کیا دیا اسے؟" فتنہ گر سرگوشیاں کرتے اور خاموشی سے مغل شہنشاہ کی ناکامی ونامرادی کا تماشا دیکھتے۔

آخر ایک دن قصر شاہی خوشی کے شادیانوں اور نقاروں کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ خواصوں نے

مغل شہنشاہ کو ولی عہد سلطنت کی پیدائش کی خبر سنائی۔ دارالحکومت آگرہ کے در و بام چراغوں، قندیلوں سے جگمگا اٹھے۔

اکبر نومود فرزند کو لے کر حضرت سلیم چشتیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''صاحب اقتدار ہوگا اور رہتی دنیا تک اس کے نام کی گونج سنائی دے گی۔'' حضرتؒ نے فرمایا۔

جلال الدین اکبر نے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے اظہار عقیدت کیلئے بیٹے کا نام بھی سلیم رکھ دیا۔ پھر یہی سلیم نورالدین جہانگیر کے لقب سے تخت نشیں ہوا۔

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے جہانگیر کی محبت کا یہ حال تھا کہ ایک بار مقرب درباری نے حضرتؒ کی شان میں نازیبا کلمات ادا کر دیئے تھے وہ شخص ملکۂ نورجہاں کا بہت منہ چڑھا تھا۔ جب جہانگیر کے مخبروں نے اسے یہ خبر دی تو وہ شدت غضب سے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور پھر اس نے فرمان جاری کر دیا۔

''اس بے ادب کی زبان گدی سے کھینچ کر نکالو اور میرے سامنے پیش کرو۔''

حکم شاہی کے مطابق اس شخص کی گردن میں سوراخ کر کے زبان نکالی گئی۔ ہزاروں افراد نے یہ لرزہ خیز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جب اس بے ادب انسان کی زبان جہانگیر کے سامنے لائی گئی تو جہانگیر سر دربار چیخ اٹھا۔

''ہر وہ زبان جو میرے شیخ کی جناب میں گستاخی کی مرتکب ہوگی، اس کا یہی حشر ہوگا۔''

سزا سے پہلے ملکہ نورجہاں نے اس شخص کی پرزور سفارش کی تھی۔ جہانگیر کے حضور عشوہ طرازیاں بھی کی تھیں اور اپنے غمزۂ و ادا سے کام بھی لیا تھا مگر مغل شہنشاہ نہ حسن کی سحر کاریوں سے متاثر ہوا اور نہ ملکۂ ہند کی التجاؤں سے۔ اس نے نورجہاں سے صاف صاف کہہ دیا۔

''اگر میرے شیخ کے سلسلے میں تم بھی مجرم قرار پاتیں تو تمہارا حشر بھی اس شخص سے زیادہ مختلف نہ ہوتا۔''

جہانگیر کی اسی عقیدت نے ہندوستانی مسلمانوں کے عقائد کو بڑے فتنوں سے محفوظ رکھا۔ اگر اسے شیخ سلیم چشتیؒ سے اس قدر والہانہ محبت نہ ہوتی تو خدا ہی جانتا ہے کہ مذہب کے نام پر ہندوستان میں کیا کیا گل کھلائے جاتے۔ دوسرا ''دین الٰہی'' تو ایجاد نہ ہوتا مگر مذہب کے سلسلے میں بڑی ہنگامہ آرائیاں ہوتیں۔ وہ لڑکا جو ایک ہندو عورت کے بطن سے پیدا ہوا اور جس نے اپنے عہد طفولیت میں اپنی ماں کو بتوں کے آگے سر جھکاتے دیکھا ہو، اس سے یہ توقع کس طرح کی جا سکتی ہے کہ وہ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی محبت میں نورجہاں جیسی کافرادا عورت کی سفارشات کو بھی جھٹلا دے گا۔ نفسیات کے عام اصولوں کے مطابق تو جہانگیر پر ہندو دھرم کی گہری چھاپ ہونی چاہئے تھی کہ اس نے ایک ہندو عورت کی آغوش میں تربیت پائی تھی...... مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جہانگیر اپنی پوری زندگی میں ہندو مذہب کی طرف کبھی مائل نہیں ہوا۔ یقیناً یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت سلیم چشتیؒ اور

حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کا فیضان نظر تھا کہ عیش و عشرت اور کیف و مستی کے ہجوم میں بھی اس نے عدل و انصاف سے کام لیا اور مذہبی معاملات میں ہندوستانی مسلمانوں کو بہت بڑی آزمائش سے بچا لیا۔ یہ جہانگیر کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

جہانگیر کے بعد اس کا بیٹا شہاب الدین شاہ جہاں تخت نشیں ہوا۔ شاہ جہاں ایک بلند حوصلہ اور نیک سیرت حکمران تھا مگر اس کے دل و دماغ پر محبت کا غلبہ تھا۔ اپنی ملکہ ممتاز محل سے اس کی محبت پوری دنیا کی تاریخ میں ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی محبت نے تاج محل تعمیر کرایا۔ بے شک! وہ اس زمین پر اپنی محبت کی خوبصورت ترین یادگار چھوڑ گیا مگر سیاسی اعتبار سے وہ مسلمانان ہند کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔

مغل سلطنت شدید انتشار کا شکار تھی۔ شاہ جہاں کی غلط حکمت عملی نے بابر کے عظیم ورثے کو وقت کی نیلام گاہ میں اس مقام تک پہنچا دیا تھا کہ بیک وقت کئی افراد مسلمانوں کے مستقبل کی بولیاں لگا رہے تھے ان خریداروں میں دارا شکوہ سب سے نمایاں تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ باپ کا منظور نظر تھا۔ شجاع اور مراد بھی حکومت کے دعویدار تھے۔ ان دونوں بیٹوں کو کسی نہ کسی عنوان سے باپ کی حمایت حاصل تھی۔ بس ایک اورنگزیب تھا ماں باپ اور بھائیوں کی محبت سے محروم۔ یہ وقت کی چال تھی کہ جو شخص سب سے زیادہ جرأت مند انتظامی امور میں سب سے زیادہ سخت اور حکومت کے لئے سب سے زیادہ بہتر امیدوار تھا، اسی کو سب سے زیادہ نااہل ثابت کرنے کیلئے کوشش کی جا رہی تھی۔ بظاہر اورنگزیب تنہا تھا مگر آسمانوں پر اسے مستقبل کا حکمران لکھا جا چکا تھا اور جب آسمانوں کا فیصلہ زمین پر نازل ہوا تو اہل دنیا کی تدبیریں الٹ گئیں، دارا، شجاع اور مراد اپنے انجام کو پہنچے اور شاہ جہاں کو عزت و احترام کے ساتھ نظر بند کر دیا گیا۔

جب اورنگزیب تخت نشین ہوا تو اس پر بے شمار الزامات تھے۔ غیروں سے تو شکوہ کیا اسے اپنوں نے بھی معاف نہیں کیا۔ مگر وہ مرد قلندر ان تمام اعتراضات سے بے نیاز مسلمانوں کو گمراہی کے تاریک غاروں سے نکالنے کیلئے دنیا کی ہر بلا سے الجھا، ہر طوفان سے نبرد آزما ہوا، ضرورت پڑی تو آتش نمرود میں بھی کودا۔ ملت اسلامیہ کی بھلائی کیلئے دریائے نیل سے بھی گزرا۔ عیش پرستوں نے خلفائے راشدین کے طرز زندگی کو ماضی کے افسانوں سے تعبیر کیا تو خود اس نے ٹوپیاں سی کر اور قرآن کریم کی کتابت کر کے روزی حاصل کی۔ اور اعتراض کرنے والوں کو بتا دیا کہ ہر دور میں اسلامی اصولوں پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے کے سکون کیلئے اپنی نیندیں حرام کر لیں مگر ہوس کے غلاموں کی زبان درازیوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔

کچھ مسلمان مجذوبوں اور ملنگ قسم کے درویشوں نے اسلام میں ہندو جوگیوں اور سادھوؤں کے نظریات شامل کرنا چاہے تھے تو اس کی شمشیر ایک بار پھر بے نیام ہوگئی جس نے شریعت محمد ﷺ میں دخل اندازی کی اس کی گردن شانوں سے جدا کر دی گئی۔ سرمد اپنے تمام تر روحانی کمالات لے کر برہنہ ہوا تو اورنگزیب نے اتمام حجت کیلئے اس سے کہا وہ لباس پہن لے۔ اور اسلام کو بدنام کرنے کی

کوششوں سے باز آ جائے۔ جب سرمد نہیں مانا تو اسے بھی خون میں نہلا دیا گیا۔ پھر جس نے شراب عشق پی کر عریانی کی حالت میں ولایت کا دعویٰ کیا وہ قہر عالمگیری سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اب اورنگزیب صوفیوں اور درویشوں کا دشمن قرار دیا جانے لگا۔

آج اس قسم کی بے شمار روایات مشہور ہیں کہ اورنگزیب نے بزرگان دین کے مزارات منہدم کرا دیا۔ یہ بڑی خوفناک تہمت تھی۔ وہ تو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے خواجہ معصوم کا مرید تھا۔ بات اتنی سی تھی کہ اورنگزیب قبر پرستی کو گناہ عظیم سمجھتا تھا اور عوام کی اکثریت نے اولیائے کرام کے مزارات کو عبادت گاہوں کا درجہ دے دیا تھا۔ بے شمار انسان اپنی عجیب عجیب مرادیں اور خواہشات لے کر مزارات پر جاتے تھے۔ قبروں کو بوسے دیتے تھے اور بے دریغ سجدے کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بزرگان دین کی آرام گاہوں پر بھکاریوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ ہندوستان کے ہر گوشے سے لاتعداد فقیر اولیائے کرام کے مزارات مقدسہ پر جمع ہو گئے تھے۔ ان میں چند بھکاری حقیقتاً معذور ہوتے تھے ورنہ سارے کے سارے صحت مند اور توانا نظر آتے تھے۔ ایک عظیم الشان سلطنت کا مطلق العنان حکمراں جو شدید محنت کے بعد روزی حاصل کرتا وہ کس طرح گوارا کرتا کہ اس کی قوم کے افراد اپنے دست و پا توڑ کر ذلت کی زندگی بسر کریں۔ یہ گداگر بھیک مانگنے کے ساتھ منشیات کے استعمال کی لعنت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تمام چرس، افیون اور بھنگ پینے والوں کا اجتماع ان ہی مقامات مقدسہ پر ہوتا تھا۔ اورنگزیب سے پہلے کسی حکمراں نے مسلمانوں کے اس نازک مسئلے پر غور نہیں کیا تھا مگر جب اسے اقتدار حاصل ہوا تو وہ معاشرے کی ہر بیماری کو دور کرنے کیلئے آگے بڑھا۔ اورنگزیب نے تمام بزرگان دین کے مزارات کو ایسے افراد کی موجودگی سے پاک کیا اور خاص و عام کو اپنے مذہبی پیشواؤں کا احترام کرنا سکھایا۔ یہی وہ معاشرتی اصلاحات تھیں جنہیں غیر مسلم تاریخ نویسوں اور تنگ نظر مسلمانوں نے غلط رنگ میں پیش کیا یہاں تک کہ آج بھی جاہلوں کی ایک بڑی جماعت اورنگزیب کو صوفیوں کا دشمن سمجھتی ہے۔

یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے جب اورنگزیب اسلامی معاشرے کو مسلمان نما سادھوؤں اور جوگیوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اورنگزیب نے تمام بزرگان دین کے مزارات مقدسہ پر جا کر ان فضول رسموں کا جائزہ لیا تھا جن سے گمراہی پھیل رہی تھی اور پھر ایسے احکام جاری کر دیئے تھے جو بدعت کے اس سیلاب کو روکنے میں معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ آخر میں وہ ایک ایسے مزار پر حاضر ہونے والا تھا جہاں ہر وقت بندگان خدا کا ہجوم رہتا تھا۔ شہنشاہ کے استقبال کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ مزار سے میلوں دور تک سپاہی موجود تھے۔ اورنگزیب کی سواری شہر کے نواح میں داخل ہوئی۔ اس نے کوچوان کو حکم دیا تیز رفتار گھوڑوں کی لگامیں کھینچی گئیں اور پھر وہ رک گئے۔ اورنگزیب نیچے اتر آیا۔ وزیر سلطنت کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑی مگر وہ حیران تھے کہ آخر بادشاہ کو کیا ہو گیا ہے۔ اورنگزیب پیدل چلنے لگا شاہراہ کے دونوں جانب کھڑے ہوئے سپاہی بھی اپنے فرمانروا کے اس عمل پر حیرت زدہ تھے۔ وزیر سلطنت اور دوسرے امیر بھی خاموشی سے شہنشاہ کے پیچھے چلتے رہے۔

کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اورنگزیب سے پیدل چلنے کا سبب پوچھ سکے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ جس بزرگ کے مزار پر اورنگزیب کو حاضری دینا ہے وہ یہاں سے کئی میل کے فاصلے پر ہے۔ پھر یہ طویل سفر کس طرح تمام ہو گا؟ تمام امیر و وزیر حیران و پریشان تھے۔ قدم قدم پر آرام دہ شاہی سواریاں استعمال کرنے والوں کو اپنی زندگی عذاب معلوم ہو رہی تھی مگر اورنگزیب کا یہ حال تھا کہ وہ ایک جفاکش سپاہی کی طرح تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ آخر سفر تمام ہوا۔ مزار اقدس کا گنبد نظر آنے لگا۔ زائرین کا ہجوم تھا مگر آج بادشاہ کی آمد کے باعث منتظمین نے لوگوں کو مختلف قطاروں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر طرف تحمل و ضبط کی تصویر دکھائی دے رہی تھی۔ اورنگزیب کے جاہ و جلال نے لوگوں کو ساکت کر دیا تھا ورنہ آج سے پہلے اس مقام مقدس پر بھی کسی بازار کی طرح شور برپا ہوتا تھا۔

اورنگزیب چلتے چلتے اچانک کچھ شکستہ حال لوگوں کے پاس ٹھہر گیا۔ یہ ان انسانوں کی قطار تھی جو ہمیشہ کیلئے آنکھوں سے محروم ہو چکے تھے۔ اورنگزیب نے ان بدنصیب آدم زادوں کو غور سے دیکھا۔ ان کی زبانیں خاموش تھیں مگر ہاتھ بھیک کیلئے پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سکوت بھی اس لئے تھا کہ تمام اندھوں کو پہلے ہی شہنشاہ کی آمد سے مطلع کر دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی انہیں خاموش رہنے کی تنبیہہ بھی کی گئی تھی ورنہ یہ نابینا افراد چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتے تھے۔

یکایک اورنگزیب ایک اندھے سے مخاطب ہوا۔ ”تو یہاں کس لئے آیا ہے؟“

”اپنی آنکھوں کی روشنی مانگنے کیلئے۔“ اندھے نے لرزتے ہوئے کہا۔

”تو کب سے بینائی کے حصول کیلئے دعا مانگ رہا ہے؟“ اورنگزیب نے دوسرا سوال کیا۔

”پانچ سال سے۔“ اندھے کی آواز بدستور کانپ رہی تھی۔

”پھر تجھے اب تک روشنی کیوں نہیں ملی؟“ اورنگزیب کا لہجہ تند و تیز تھا۔

”اللہ کی مرضی۔“ اندھا خوف و دہشت سے سہما ہوا تھا اور اس کی آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

اورنگزیب اندھے کا جواب سن کر آگے بڑھ گیا۔ پھر مغل شہنشاہ نے اسی طرح کے کئی اندھوں سے سوالات کئے۔ سب کے مسائل یکساں تھے اور تمام اندھے روشنی کی دعا مانگنے کیلئے بزرگ کے مزار پر جمع ہوئے تھے۔ کوئی یہاں پانچ سال سے مقیم اور کوئی دس سال سے مگر کسی کی بھی بینائی واپس نہیں آئی تھی۔ اورنگزیب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے سارے اندھوں کو مخاطب کرتے ہوئے غضبناک لہجے میں کہا۔

”میں بزرگ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جا رہا ہوں۔ تم بھی دعا مانگو۔ اگر میری واپسی تک تمہاری آنکھوں کی روشنی بحال نہیں ہوئی تو تم سب کو قتل کرا دوں گا۔“

عجیب آمرانہ حکم تھا۔ اندھے فریاد کرنے لگے مگر اورنگزیب پر ان کی گریہ وزاری کا کوئی اثر نہیں ہوا وہ ادب و احترام کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مزار کے احاطے میں داخل ہو گیا۔

جن لوگوں نے آج سے پہلے اورنگزیب کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہندوستان کے اس باجبروت شہنشاہ

کو دیکھنے کیلئے مزار مبارک کے قریب سمٹ آئے تھے لیکن اورنگزیب کو اپنے گرد و پیش کی خبر نہ تھی۔ وہ ایک غلام کی طرح سر جھکائے صاحب مزار کے قدموں میں کھڑا تھا۔ کچھ سرکاری ملازمین کا بیان ہے کہ اورنگزیب کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے، نگاہیں فرش پر جمی ہوئی تھیں، جلال ... سے چہرے کا رنگ زرد تھا اور ہونٹوں کو آہستہ آہستہ جنبش ہو رہی تھی۔ مغل شہنشاہ بہت دیر تک ... قرآنی کی تلاوت کرتا رہا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ دعا کیلئے بلند ہوئے۔ بزرگ کی روح ... طرح ایصال ثواب کیا کہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ شہنشاہ کو روتا دیکھ کر امرائے سلطنت ... طاری ہوگئی۔ عجیب روح پرور سماں تھا۔ حاضرین چند لمحوں کیلئے دنیا کی تمام ہنگامہ آرائیوں کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ کچھ وقت گزارنے کے بعد اورنگزیب الٹے پاؤں چلتا ہوا مزار مقدس سے باہر آیا۔ اچانک مغل شہنشاہ کی نظر ایک دوسری قبر پر پڑی، یہ قبر بزرگ کے مزار سے چھ گز کے فاصلے پر تعمیر کی گئی تھی۔ اورنگزیب قبر کی زینت و آرائش دیکھ کر چونک پڑا۔ قبر کا طرز تعمیر بھی دلکش تھا اور اس کے ساتھ ہی نہایت ہی قیمتی پتھر بھی استعمال کئے گئے تھے۔ اورنگزیب قبر کے نزدیک پہنچ کر ... پھر وزیر سلطنت سے مخاطب ہوا۔

"یہ کس کی قبر ہے؟" اورنگزیب کے لہجے سے حیرت و استعجاب کی جھلک نمایاں تھی۔

"یہ نظام سقہ کی قبر ہے جس نے حضور کے دادا شہنشاہ ہمایوں کو دریا میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔" وزیر سلطنت نے ادب سے آگے بڑھ کر جواب دیا۔

"شمع پیش آفتاب پرتو نہ دارد۔" (سورج کے سامنے شمع کی کوئی حیثیت نہیں) اورنگزیب نے سخت الفاظ میں کہا۔ "یہ کیسی بے ادبی ہے کہ میرے بزرگوں کو اس کا خیال تک نہ آیا۔" اورنگزیب کا لہجہ مزید تلخ ہوگیا تھا۔ "اس قبر کا نشان مٹا دو اور نظام سقہ کی لاش کو یہاں سے دور لے جا کر دفن کر دو۔" وزیر سلطنت کو یہ حکم دینے کے بعد اورنگزیب مزار کے احاطے سے باہر نکل آیا۔

تمام امیر و وزیر لرزاں تھے اور سپاہی اس خوف سے کانپ رہے تھے کہ اب شہنشاہ بے گناہ اندھوں کو قتل کرا دے گا۔ وہ اورنگزیب کی ضدی طبیعت سے واقف تھے کہ ایک بار حکم دینے کے بعد وہ الفاظ واپس نہیں لیتا تھا۔ مگر جب مغل حکمراں فاتحہ خوانی کے بعد واپس ہوا تو باہر کی فضا ہی بدلی ہوئی تھی۔ ایک عجیب سا شور برپا تھا۔ تمام اندھے دیوانہ وار چیخ رہے تھے۔ انہیں آنکھوں کی گم شدہ روشنی مل چکی تھی اور وہ اورنگزیب کی بلند اقبالی کو دعائیں دے رہے تھے۔ سپاہیوں نے اس انتشار پر قابو پانے کیلئے طاقت کا استعمال کرنا چاہا لیکن اورنگزیب نے انہیں روک دیا۔ اندھے شور مچا کر کچھ دیر تک اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہے۔ وہ بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہے تھے کہ حضور کی آمد ہمارے لئے مبارک ثابت ہوئی اور ہمیں کھوئی ہوئی آنکھیں مل گئیں ورنہ ہم تو برسوں سے تاریک راہوں میں بھٹک رہے تھے۔

"یہ سوال نہیں کہ کسی انسان کی آمد مبارک ہے یا نامبارک۔" اورنگزیب کی آواز گونجی اور پھر ہر طرف سکوت طاری ہوگیا۔ "سوال یہ ہے کہ تم کئی سال سے اس مرد بزرگ کے کوچے میں

پڑے ہوئے تھے مگر تمہاری حالت یہ تھی کہ تم نے گداگری کو پیشہ بنا لیا تھا اور اپنی حالت پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ تم نے ایک بار بھی اپنے خدا کے حضور لرز کر دعائیں نہیں کیں۔ مگر آج جب تمہیں اپنی موت سامنے نظر آنے لگی تو تم خوف و دہشت سے رو پڑے۔ پھر تم نے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی یہاں تک کہ بہتے ہوئے آنسو تمہاری زندگی سنوار گئے۔" یہ کہہ کر اورنگزیب واپس چلا گیا۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ سخت مذہبی انسان ہونے کے باوجود اورنگزیب اس بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ مرنے کے بعد بھی بزرگان دین سے کوئی کرامت سرزد ہو سکتی ہے؟ اور اپنے اس خیال کو آزمانے کیلئے آج وہ ہندوستان کے سب سے بڑے بزرگ کے مزار پر حاضر ہوا اور اپنی آنکھوں سے جب اورنگزیب نے یہ ناقابل یقین منظر دیکھ لیا تو اس کے ذہن میں پرورش پانے والے تمام شکوک و شبہات دور ہوگئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس واقعے کے بعد اورنگزیب کئی بار مزار اقدس پر حاضر ہوا اور اپنی کامیابی کیلئے دعائیں مانگیں بے شمار ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ ایک مرتبہ مغل شہنشاہ آگرہ سے پیدل چل کر یہاں تک پہنچا تھا۔ ایک روایت یوں بھی ہے کہ اپنی زندگی کی خوفناک ترین جنگ لڑنے سے پہلے اورنگزیب ننگے پاؤں بزرگ کے مزار پر حاضر ہوا تھا یہاں تک کہ اس کے پیروں کے چھالے پھوٹ گئے تھے اور ان سے پانی بہہ رہا تھا۔ پھر اس نے بزرگ کا واسطہ دے کر اپنے خدا سے عافیت طلب کی تھی اس کے بعد دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ اورنگزیب کے دشمن ذلت و رسوائی کے ساتھ میدان میں سے فرار ہو رہے تھے اور قدرت کا نادیدہ ہاتھ اس کے کشادہ سینے پر فتح کا ایک اور تمغہ سجا رہا تھا۔

جن کے مزار اقدس پر محی الدین اورنگزیب عالمگیر جیسا باشرع انسان پابرہنہ حاضر ہوتا تھا، وہ بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ تھے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نسلی اعتبار سے صحیح النسب سید تھے۔ آپ کا شجرۂ عالیہ بارہ واسطوں سے امیر المومنین حضرت علیؓ تک پہنچ جاتا ہے۔ حضرت خواجہؒ 14/رجب 536ھ کو جنوبی ایران کے علاقے سیستان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی خواجہ غیاث الدین حسنؒ بہت دولت مند تاجر اور بااثر شخص تھے۔ کثرت مال کو قرآن حکیم میں سب سے بڑا فتنہ قرار دیا گیا ہے مگر خواجہ غیاثؒ، صاحب ثروت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عابد و زاہد انسان بھی تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ایک دولت مند گھرانے میں بڑے ناز و نعم کے ساتھ پرورش پائی مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ عیش و عشرت کی فراوانی کے باوجود حضرت خواجہؒ میں بچپن ہی سے ایک عجیب انداز کی قناعت تھی۔

جس زمانے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ولادت ہوئی وہ بڑا پر آشوب دور تھا۔ سیستان اور خراسان لوٹ مار کی زد میں تھے اور ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ سیاسی انتشار نے انتہائی سنگین صورت اختیار کر لی تھی۔ سرسبز و شاداب علاقوں میں آگ بھڑک رہی تھی اور خوبصورت شہر کھنڈروں میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ ملت اسلامیہ میں کئی فرقے پیدا ہو چکے تھے جو بڑی سفاکی اور بے رحمی سے ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔ "ملاحدہ" اور "باطنیوں" کی جماعت نے پورے ملک

میں قتل وغارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

سلجوقی خاندان کی یادگار سلطان سنجر اس علاقے کا حکمراں تھا۔ اس کی شوکت و... داستانیں دور دراز کے علاقوں تک مشہور تھیں کہ اچانک گردش ایام نے نئی کروٹ لی۔ تاتا... ایک وحشی گروہ جسے "غز" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، پوری طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا... کے جبر وتشدد کو روکنے کیلئے سلطان سنجر اپنی فوجیں لے کر آگے بڑھا مگر اسے تاتاریوں کے ہا... شکست ہوئی۔ سیستان کا حاکم بڑی شجاعت سے لڑا مگر تاتاریوں کے ہاتھوں زندہ گرفتار ہوا... سلطان سنجر کو بڑی بے سروسامانی کے عالم میں فرار ہونا پڑا۔

یہی وہ خوں رنگ اور زہر آلود فضا تھی جس نے خواجہ غیاث الدین حسنؒ کو ترک وطن پر مجبور... آپ اپنی بیوی اور بچے کو لے کر خراسان چلے آئے۔ اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ... مبارک ایک سال کے قریب تھی۔ خواجہ غیاثؒ کا خیال تھا کہ انہیں ارض خراسان میں کوئی نہ کوئی... عافیت ضرور مل جائے گا...... مگر گردش ماہ وسال کے وہی تیور تھے اور جاں گداز فتنے یہاں پر بھی... رہے تھے۔ خواجہ غیاثؒ نے اپنے فرزند کی تعلیم وتربیت کے لئے بڑا اہتمام کیا۔ اس وقت کے... استاد مقرر کئے گئے...... مگر خراسان کی صورتحال روز بروز بگڑتی چلی گئی۔

549ھ میں خونی سیلاب انسانی سروں سے گزر گیا، اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ... شریف تیرہ سال تھی۔

مولانا عبدالحلیم شرر ملت اسلامیہ کے انتشار کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں۔

"549ھ میں سلطان سنجر کو "ترکان غز" کے مقابلے میں دوبارہ شکست ہوئی اور اسے گرفتا... گیا۔ اب ملک کا کوئی حامی ونگراں نہیں رہا اور بے گناہ لوگوں کی قسمت یک بیک وحشی درندوں... بے رحم لٹیروں کے ہاتھوں میں دے دی گئی۔ وہ درشت مزاج اور وحشی فطرت لوگ خراسان... علاقے میں گھس آئے۔ "طوس" اور "نیشاپور" کو بڑی بے رحمی سے لوٹا۔ خواتین کو جہاں پایا... کیا۔ ان کی عصمتیں خراب کیں اور انہیں بے حرمت وبے آبرو کیا۔ عورتوں اور لڑکوں کو پکڑ کر... غلام بنایا۔ تمام مسجدیں برباد کر دیں، مکانات منہدم کر دیئے گئے، نیشاپور میں ظالموں نے ایسا... اور اس قدر خون بہایا کہ اپنے خیال میں انہوں نے ایک شخص کو بھی زندہ نہیں چھوڑا تھا۔ شاذ ونا... کوئی ایسا خوش قسمت تھا جو کہیں چھپ چھپا کر بچ گیا ہو۔ ہر طرف لاشوں کے انبار اور تودے... تھے۔ بہت سے لوگوں نے "جامع مسجد منیعی" میں پناہ لی اور اندر سے دروازے بند کر لئے مگر یہ... اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے، انہوں نے مسجد کے دروازے کلہاڑیوں سے چیر ڈالے اور خانہ... میں جو خداوند ذوالجلال کا دامن عافیت اور دینداروں کے نزدیک دارالامان تھا، گھس کر سب کو... ڈالا۔ یہی حالت وہاں کے عالیشان "بیمارستان" (دارالشفاء) کی ہوئی جس کی عمارت ایک... تھی، بہت سے لوگوں نے اس میں پناہ لی مگر وہ وحشی وہاں بھی داخل ہو گئے اور جو بھی ملا، خواہ وہ... تھا یا مریض، زخمی تھا یا جراح، بلا امتیاز سب کو جام فنا پلا دیا۔"

ایک اور مقام پر مولانا عبدالحلیم شرر ان وحشیوں کی فتنہ انگیزی کے بارے میں اس طرح تحریر کرتے ہیں۔

"نیشاپور کے مظلوموں اور جام شہادت پینے والوں میں سپاہی اور عوام نہ تھے بلکہ بڑے بڑے علماء، فضلاء، اولیاء، ابرار، اتقیا اور احرار بھی تھے، تمام علماء اور شیوخ شہید ہوئے۔ کل صالحین اور متصوفین فنا کر دیئے گئے۔ نیشاپور اس زمانے میں علم وفضل کا مخزن تھا۔ لہٰذا مدت ہائے دراز کے ذوق علم نے جو کچھ سرمایہ علمی وہاں فراہم کیا تھا، وہ سب بھی خاک میں ملا دیا گیا اور کل کتب خانوں میں آگ لگا دی گئی۔"

الغرض مصیبتوں اور آفتوں کے اسی المناک ماحول میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پرورش پائی اور اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کے خون کے دریا بہتے دیکھے۔ کبھی کبھی آپ نہایت رقت آمیز لہجے میں اپنے والد گرامی سے سوال کرتے۔

"بابائے محترم! خون مسلم کی یہ ارزانی کب تک رہے گی۔"

نوعمر فرزند کا یہ سوال سن کر حضرت خواجہ غیاث الدینؒ رونے لگتے۔ "بیٹے! یہ شرربار موسم اور یہ خونی ہوائیں اہل ایمان کیلئے آزمائش ہیں، تمہیں صبر کرنا ہی پڑے گا۔"

پھر ایک دن صبر کی تلقین کرنے والا بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ خواجہ غیاث الدین حسنؒ نے 551ھ میں وفات پائی۔ اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی عمر پندرہ سال تھی۔

آپ نے آنکھیں کھولتے ہی ہر طرف قیامت صغریٰ کے مناظر دیکھے تھے۔ یہ ایک اور قیامت تھی جو پوری شدت کے ساتھ آپ کے قلب حساس پر نازل ہوئی۔ سارا مال واسباب پہلے ہی برباد ہو چکا تھا۔ اب متاع عزیز بھی چھن گئی اور خواجہ معین الدین چشتیؒ ایک شفیق ومہربان باپ کے سائے سے محروم ہو گئے۔

غیاث الدین حسنؒ کی موت نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو اس قدر متاثر کیا کہ آپ ہر وقت اداس اور مغموم رہنے لگے۔ ایسے نازک لمحات میں آپ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی نورؒ نے بڑی استقامت کا ثبوت دیا اور بڑے حوصلے کے ساتھ بیٹے کو سمجھایا۔

"فرزند! زندگی کے سفر میں ہر مسافر کو تنہائی کی اذیتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر تم ابھی سے اپنی تکلیفوں کا ماتم کرنے بیٹھ گئے تو یہ دشوار گزار راستہ کیسے طے کرو گے؟ اٹھو! اور پوری توانائی کے ساتھ اپنا سفر شروع کرو۔ ابھی تمہاری منزل بہت دور ہے۔ یہ والد محترم کی محبت کا ثبوت نہیں کہ تم دن رات ان کی یاد میں آنسو بہاتے رہو۔ اولاد کی محبت یہ ہے کہ وہ بزرگوں کے خواب کی تعبیر پیش کرے...... اور تمہارے باپ کا ایک ہی خواب تھا کہ ان کا بیٹا علم وفضل میں کمال حاصل کرے۔"

مادر گرامی کی تسلیوں سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طبیعت سنبھل گئی اور آپ ذوق وشوق کے ساتھ علم حاصل کرنے لگے...... مگر سکون وفراغت کی یہ مہلت بھی زیادہ طویل نہیں تھی۔ مشکل سے ایک سال گزرا ہوگا کہ حضرت بی بی نورؒ بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ تنہائی کی داستان مکمل ہو گئی،

اب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اس دنیا میں اکیلے تھے۔

والد گرامی کی وفات کے بعد ایک باغ اور ایک چکی آپ کو ورثے میں ملی تھی۔ والدِ محترم کی زندگی میں آپ حصول رزق کی کشمکش سے آزاد تھے مگر جب مادر مہربان بھی دنیا سے رخصت ہو گئیں تو معیشت کا سارا بوجھ آپ کے کاندھوں پر آ پڑا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے باغبانی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ سارے کام آپ خود ہی انجام دیتے، درختوں کو پانی دیتے، زمین کو ہموار کرتے، پودوں کی کانٹ چھانٹ عمل میں لاتے، کھاد وغیرہ کا بندوبست کرتے اور منڈیوں میں جا کر خود ہی پھل فروخت کرتے۔ اس کاروباری کشمکش میں آپ کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو اس کا بڑا قلق تھا لیکن یہ ایک ایسی فطری مجبوری تھی کہ جس کا بظاہر کوئی علاج بھی ممکن نہیں تھا۔ آپ اکثر اوقات اپنی اس محرومی پر غور کرتے اور جب کوئی حل نظر نہ آتا تو شدید مایوسی کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھتے اور رونے لگتے۔ یہ خدا کے حضور بندے کی ایک خاموش دعا تھی۔

☆☆............☆☆............☆☆

ایک دن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے باغ کے درختوں کو پانی دے رہے تھے کہ ادھر سے مشہور بزرگ حضرت ابراہیم قندوزیؒ کا گزر ہوا۔ حضرت خواجہؒ نے بزرگ کو دیکھا، دوڑتے ہوئے گئے اور حضرت ابراہیم قندوزیؒ کے ہاتھوں کو بوسہ دینے لگے۔

بزرگ ایک لڑکے کے اس جوش عقیدت سے بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے حضرت خواجہؒ کے سر پر ہاتھ رکھا، دعائیں دیں اور آگے جانے لگے لیکن آپ نے حضرت ابراہیم قندوزیؒ کا دامن تھام لیا۔ بزرگ نے پلٹ کر پوچھا۔ ''اب کیا چاہتا ہے؟''

حضرت خواجہؒ نے بڑے ادب سے عرض کیا...... ''یہ ایک التجا ہے کہ آپ چند لمحوں کیلئے میرے باغ میں قیام فرمالیں۔ کون جانے پھر یہ نیک ساعت لوٹ کر آتی بھی ہے یا نہیں؟''

حضرت خواجہؒ کا لہجہ اس قدر عقیدت مندانہ تھا کہ حضرت ابراہیم قندوزیؒ انکار نہ کر سکے اور باغ کے اندر چلے آئے۔ حضرت خواجہؒ نے بزرگ کو نہایت احترام سے بٹھایا اور پھر اجازت لے کر باغ کے ایک گوشے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو آپ کے ہاتھوں میں انگوروں سے بھرے ہوئے دو طباق تھے۔ حضرت خواجہؒ نے عاجزی کے ساتھ انگور کے وہ تازہ خوشے حضرت ابراہیم قندوزیؒ کے سامنے رکھ دیئے اور خود دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

''خادم کے پاس آپ کی تواضع کیلئے بس یہی کچھ تھا۔ اگر اسے قبول فرمالیں گے تو میں اپنی خوش قسمتی پر فخر کروں گا۔'' حضرت خواجہؒ نے اس نوعمری میں سعادت مندی کا وہ مظاہرہ کیا تھا کہ حضرت ابراہیم قندوزیؒ بھی حیران تھے۔

بزرگ نے ایک بار پھر حضرت خواجہؒ کو محبت آمیز نظر سے دیکھا اور آپ کی دلجوئی کے لئے دو انگور اٹھا کر منہ میں رکھ لئے۔ حضرت ابراہیم قندوزیؒ کے اس عمل سے حضرت خواجہؒ کے چہرے پر خوشی کا وہ رنگ ابھر آیا جو کسی نعمت عظیم کے حاصل ہونے پر نمایاں ہوتا ہے۔ بزرگ نے آپ کی

کیفیت کا بھی جائزہ لیا۔ پھر فرمایا۔ ''معین الدینؒ بیٹھ جاؤ۔''

حضرت خواجہؒ دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ حضرت ابراہیم قندوزیؒ نے بڑے والہانہ انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''فرزند! تم نے ایک فقیر کی خوب مہمان نوازی کی۔''

بزرگ کے الفاظ سن کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ادب سے سر جھکا لیا۔

''یہ سرسبز و شاداب درخت، یہ لذیذ پھل، یہ ملکیت، یہ جائداد، سب کچھ فنا ہو جانے والا ہے۔'' حضرت ابراہیم قندوزیؒ باغ کی طرف اشارہ کر کے انتہائی جذب کے عالم میں بول رہے تھے۔ ''آج یہاں بہار دن کا دور دورہ ہے، کل اسی مقام پر خزاں کی حکومت ہوگی۔ یہی گردش روز و شب ہے اور یہی نظام قدرت ہے۔ تیرا یہ باغ بھی وقت کی تیز آندھیوں میں اُجڑ جائے گا۔ پھر خدا تجھے ایک باغ اور عطا کرے گا۔ ایسا باغ جس کے درخت قیامت تک گرم ہواؤں سے محفوظ رہیں گے۔ ان درختوں کے پھلوں کا ذائقہ ایک بار جو بھی چکھ لے گا پھر وہ دنیا کی کسی نعمت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔'' اتنا کہنے کے بعد حضرت ابراہیم قندوزیؒ نے اپنے پیرہن کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

حضرت خواجہؒ بزرگ کے اس عمل کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ جب حضرت ابراہیم قندوزیؒ کا ہاتھ جیب سے باہر آیا تو انگلیوں میں دبا ہوا سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا صاف نظر آ رہا تھا۔

''وہ تیری مہمان نوازی تھی، یہ فقیر کی دعوت ہے۔'' اتنا کہہ کر حضرت ابراہیم قندوزیؒ نے روٹی کا ٹکڑا حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے منہ میں ڈال دیا اور پھر تیزی کے ساتھ باغ سے نکل کر کسی طرف چلے گئے۔

روٹی اس قدر خشک تھی کہ اس کا چبانا دشوار تھا۔ مگر حضرت خواجہؒ نے اسے ایک بزرگ کا تحفہ عظیم سمجھ کر کھالیا۔ اس ٹکڑے کا حلق سے اترنا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ آپ کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کائنات کی ہر شے فضول ہے۔

دوسرے دن حضرت خواجہؒ نے اپنا باغ اور چکی فروخت کر دی۔ آپ کے اس فیصلے پر تمام متعلقین حیران تھے۔ ان لوگوں نے حضرت خواجہؒ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر آپ پر اثر نہیں ہوا۔ جائداد کی فروخت کے بعد جس قدر رقم حاصل ہوئی اسے آپ نے کھڑے کھڑے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا۔ حضرت خواجہؒ کا یہ عمل عزیز و اقارب کیلئے اور بھی حیران کن تھا۔ بیشتر افراد کے نزدیک آپ کسی خلل دماغی کا شکار ہو گئے تھے مگر کون جانتا تھا کہ حضرت خواجہؒ کے دل پر کیا گزر رہی ہے اور ذہن کے کس گوشے سے روشنی کی وہ لکیر پھوٹ رہی ہے جس نے دنیا کے تمام اجالوں کو دھندلا کر رکھ دیا تھا۔

☆☆............☆☆............☆☆

حضرت ابراہیم قندوزیؒ سے ملاقات اور پھر اپنا سارا مال و متاع اللہ کی راہ میں لٹانے کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے خراسان سے نکل کر سب سے پہلے مشرق کا سفر اختیار کیا۔ ان دنوں سمرقند و بخارا اسلامی علوم و فنون کے اہم مراکز سمجھے جاتے

تھے۔ یہاں حضرت خواجہؒ نے سب سے پہلے قرآن کریم حفظ کیا۔ پھر تفسیر، فقہ، حدیث اور دیگر علوم ظاہری میں مہارت حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں کون کون بزرگ شامل تھے اس کا علم کسی کو نہیں مگر بعض روایتوں سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ آپ کے استادوں میں مولانا حسام الدین بھی تھے اور انہی بزرگ نے حضرت خواجہؒ کو قرآن کریم حفظ کرایا تھا۔

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ''مرشد کامل'' کی تلاش میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب آپ کا رخ عراق کی طرف تھا۔ راستے میں نیشاپور کا حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ سکونت پذیر تھے۔ بیشتر کتابوں میں خواجہ عثمانؒ کو ''ہارونی'' لکھا گیا ہے جو تحقیقی اعتبار سے غلط ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قدم بے اختیاری کے عالم میں خانقاہ چشتیہ کی طرف کھنچے گئے۔ چشتی کا لفظ سب سے پہلے حضرت خواجہ اسحاق شامیؒ کے نام کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ خواجہ اسحٰق کا وطن شام تھا مگر آپ نے تبلیغ و ہدایت کیلئے موضع چشت کو اپنا مرکز بنا لیا تھا۔ چشت خراسان کے اطراف میں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا مگر اللہ نے اپنے صالحین بندوں کے طفیل اس معروف مقام کو شہرت دوام بخشی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کچھ دن تک ایک عام طالب علم کی حیثیت سے حضرت عثمان ہرونیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے مگر حضرت شیخؒ نے آپ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ حضرت خواجہؒ پر شدید مایوسی کا غلبہ ہوا۔ کئی بار عقل نے فریب دیا کہ یہاں تیرے مقدر کا کچھ نہیں ہے۔ دوسرے آستانے پر جا کر قسمت آزمائی کر۔ خیالات کی یہ سرکشی بڑی خوفناک تھی لیکن آپ نے ہمت سے اس پر قابو پایا اور مسلسل حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کی بارگاہ میں حاضری دیتے رہے۔ ایک دن آپ نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

''میری دلی تمنا ہے کہ حضور مجھے مستقل غلامی کا شرف بخش دیں۔'' حضرت خواجہؒ کا اشارہ ... کی طرف تھا۔

حضرت عثمان ہرونیؒ نے آپ کی اس خواہش کے جواب میں فرمایا۔ ''فرزند! مجھ سے اپنا بار نہیں اُٹھتا تو پھر تمہارا بار گراں کیسے اٹھاؤں گا؟''

حضرت عثمان ہرونیؒ آپ کو ٹالنا چاہتے تھے مگر حضرت خواجہؒ اصرار کرتے رہے۔ ''جہاں آپ کے سیکڑوں خادم ہیں وہاں ایک غلام کے اضافے سے کیا فرق پڑے گا؟''

''یہ سب کے سب خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔'' حضرت عثمان ہرونیؒ نے پھر اپنا دامن بچانے کی کوشش کی۔ ''یہ لوگ مجھے مرشد کامل سمجھتے ہیں مگر ان نادانوں کو کیا خبر کہ ان کا پیر خود منزل کی تلاش میں ہے۔''

''ان لوگوں کی طرح میں بھی آپ سے حسن ظن رکھتا ہوں۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس طرح اظہار عقیدت کیا کہ حضرت عثمان ہرونیؒ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور پھر شیخ نے آپ کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں تقریباً ڈھائی سال تک حاضر رہے۔ شیخ جہاں بھی جاتے آپ غلاموں کی طرح ساتھ رہتے...... ساری ساری رات محض اس خیال سے جاگتے کہ کہیں پیر و مرشد کو کسی چیز کی ضرورت نہ پیش آ جائے۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے آپ کے جذبۂ خدمت گزاری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مشہور روایت ہے کہ حضرت عثمان ہرونیؒ نے انسانی ہجوم سے بچنے کیلئے قصداً اپنے ظاہری کمالات پر پردہ ڈال دیا تھا۔ لوگ آپ کا نام سن کر دور دراز مقامات سے چلے آتے تھے مگر جب شیخ سے کسی کشف و کرامت کا اظہار نہ ہوتا تو مایوس ہو کر لوٹ جاتے۔ پھر یہ قصے عام ہوئے کہ حضرت عثمان ہرونیؒ ایک دنیادار شیخ ہیں۔ ان کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ خود حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بھی اپنے پیر و مرشد کے شب و روز کا بغور مشاہدہ کرتے رہتے تھے اور عجیب اتفاق تھا کہ آپ نے اس طویل عرصے میں شیخ کی کوئی کرامت اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی تھی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حضرت عثمان ہرونیؒ کے بہت سے مرید اس بات پر خفا ہو کر چلے گئے کہ انہیں ابھی تک دست غیب حاصل نہیں ہوا تھا۔ ان مریدوں کے خیال میں شیخ ظاہری علم رکھتے تھے اور انہیں باطنی علم سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ کہنے والے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے بھی کہا کرتے تھے کہ کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہو؟ یہاں کچھ نہیں ہے، کوئی اور دروازہ دیکھو۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بدگمانوں کے اس گروہ کو سخت ترین جواب دیتے اور اسی ذوق و شوق سے خدمت شیخ میں مشغول رہتے۔

ایک بار حضرت عثمان ہرونیؒ نیشاپور سے باہر تشریف لے گئے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا معمول تھا کہ آپ ہمہ وقت پیر و مرشد کے ساتھ رہتے۔ اس مرتبہ بھی سفر کے دوران آپ اس طرح شیخ کے پیچھے چل رہے تھے کہ جیسے کوئی غلام اپنے آقا کے ہمراہ ہو۔ حضرت عثمان ہرونیؒ کا تمام سامان خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سر پر تھا اور آپ اس سعادت پر اس قدر نازاں تھے کہ جیسے دولت کونین ہاتھ آ گئی ہو۔ شیخ نے ایک غیر آباد علاقے میں قیام کیا۔ پھر بڑے عجیب سے لہجے میں حضرت خواجہؒ سے فرمایا۔

''معین الدینؒ! ساری دنیا چلی گئی۔ اب تم بھی چلے جاؤ۔ اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا تو لوگ اس طرح خالی ہاتھ کیوں لوٹ جاتے؟'' آج حضرت عثمان ہرونیؒ کا انداز کلام ہی کچھ اور تھا۔ ''تم کئی سال سے ناکام و نامراد بھٹک رہے ہو، آخر تم نے کیا پایا؟''

''شیخ! اب میں کہاں جاؤں گا۔ آپ کے سوا دنیا میں میرا کون ہے؟'' یہ کہتے ہوئے خواجہ معین الدین چشتیؒ رو پڑے۔ ''میں تو ایک کا ہو چکا۔ اب مجھے دوسرے کے در پر صدا دیتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

حضرت خواجہؒ کا یہ جواب سن کر حضرت عثمان ہرونیؒ بے قرار ہو گئے اور آپ کو سینے سے لگا کر انتہائی رقت آمیز لہجے میں دعا فرمائی۔ ''اے خدائے ذوالجلال! معین الدین کو قبول فرما لے اس نے میری بے سر و سامانی کے باوجود مجھے نہیں چھوڑا تو بھی اسے زمین پر تنہا نہ چھوڑ۔'' ابھی دعا کے الفاظ ختم بھی

نہیں ہوئے تھے کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ بارشِ نور میں نہا گئے۔ ایک تیز شعاع دل و دماغ کو
کرتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آپ کی آنکھوں کے سامنے سے تمام حجابات اٹھ گئے۔

"معین الدینؒ! اب کیا نظر آتا ہے؟" حضرت عثمان ہرونیؒ نے آپ کو علیحدہ کرتے ہوئے پو

"شیخ کے صدقے میں عرش سے تحت الثریٰ تک دیکھ رہا ہوں۔" حضرت خواجہؒ نے زار و
روتے ہوئے کہا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ تم سیراب ہو گئے ورنہ عشق کے صحرا میں لوگ ایک بوند کو بھی ترس جاتے ہیں"
شیخ نے فرمایا اور سفر کا ارادہ ترک کر کے واپس نیشاپور لوٹ آئے۔

درحقیقت یہ حضرت خواجہؒ کی طویل آزمائش تھی جو کم و بیش ڈھائی سال جاری رہی۔ اس کے
حضرت عثمان ہرونیؒ سے بے شمار کرامات ظاہر ہوئیں۔ ظاہر پرستوں کا ہجوم دوبارہ لوٹ آیا۔ بہ
سے انسانوں نے شیخ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ ہزاروں افراد نے ایک نگاہ کرم کی بھیک
مگر حضرت عثمان ہرونیؒ یہی فرماتے رہے۔

"جو کچھ میرے پاس تھا میں نے معین الدینؒ کے حوالے کر دیا۔"

اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان ہرونیؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ
لے کر مکہ معظمہ حاضر ہوئے تھے اور خانہ کعبہ کا طواف کرنے کے بعد شیخ نے بلند آواز میں فرمایا

"الٰہی! معین الدین حاضر ہے۔ اپنے اس عاجز بندے کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔"

جواب میں ندائے غیبی سنائی دی۔ "ہم نے اسے قبول کیا۔ بے شک! یہ معین الدین ہے۔"

مکہ معظمہ کے قیام کے بعد شیخ دربارِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے۔ پھر جیسے ہی سرورِ کونین
کی قربت حاصل ہوئی عثمان ہرونیؒ نے خواجہ معین الدین چشتیؒ کو حکم دیا۔ "معین الدین! آقائے
کائنات کے حضور سلام پیش کرو۔"

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے گداز قلب کے ساتھ لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "السلام علیکم
سید المرسلین ﷺ۔"

وہاں موجود تمام لوگوں نے سنا۔ روضۂ رسول ﷺ سے جواب آیا۔ "وعلیکم السلام یا سلطان الہند"
اس کے بعد شیخ نے حضرت خواجہؒ کو مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا۔ "معین الدین! تم خو
نصیب ہو کہ تمہیں دونوں مقامات پر قبولیت کی سند عطا ہوئی۔ آئندہ بت خانۂ ہند تمہاری سرگرمیوں
کا مرکز ہوگا۔ اگرچہ وہاں کفر کی گہری تاریکی پھیلی ہوئی ہے لیکن بالآخر تم وہاں اسلام کی شمع روشن
کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے اور اس طویل و عریض ملک میں تم ہی سلطان کہلاؤ گے۔ جسے دربارِ
رسول ﷺ سے تاجِ سلطانی بخشا گیا ہو وہ ہند کے تمام بادشاہوں پر غالب آ کر رہے گا۔"

فرمودۂ شیخ سن کر حضرت خواجہؒ نے خاکِ مدینہ کو بوسہ دیا اور روضۂ رسول ﷺ کی جالیاں پکڑ کر
رونے لگے۔ جوشِ گریہ اس حد تک بڑھا کہ آپ کی ہچکیاں بندھ گئیں اور اسی آہ و زاری کے درمیان
حضرت خواجہؒ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"غلام توام زیں سبب تاجدارم۔" (تیرا غلام ہوں اسی لئے شہنشاہ کہلاتا ہوں۔)

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی سوانح لکھنے والے تمام تذکرہ نگاروں نے ان دونوں روایتوں کو پورے اعتماد کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ جس سے یہی تاثر ملتا ہے کہ یہ دونوں روایات مستند ہیں مگر تصوف کو افیون سمجھنے والے مسلمانوں کے نزدیک ایسے سارے واقعات انتہائی نامعتبر قرار پاتے ہیں۔ یہاں اس طویل بحث میں الجھنے کی گنجائش نہیں پھر بھی اس قدر وضاحت ضروری ہے کہ روحانیت انسان کا ذاتی تجربہ ہے۔ شدید ریاضت کے بعد جب اس پر کائنات کے کچھ اسرار منکشف ہوتے ہیں اور پھر وہ عام لوگوں کے سامنے اپنے مشاہدات بیان کرتا ہے تو سطحی ذہن اور علم رکھنے والے انسان اس مردِ خدا رسیدہ کو "ہونقوں" کی طرح دیکھنے لگتے ہیں اور اپنی ناتجربہ کاری کی بنیاد پر چیخنے لگتے ہیں کہ وہ شخص فریبِ نظر کا شکار ہے اور اس کا مشاہدہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ آرٹ کا کوئی پروفیسر محض اپنی بے خبری کے سبب جدید ترین سائنسی ایجادات کو جھٹلا دے اور جب کھلی آنکھ سے ان ایجادات کا مشاہدہ کرے تو حیران رہ جائے۔ اولیاء کی کرامات پر بھی یہی مثال صادق آتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے وابستہ واقعات کا معاملہ انتہائی نازک اور حساس ہے میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی مسلمان سرورِ کونین ﷺ کے حوالے سے کوئی غلط بات منسوب کرے اور پھر حضرت عثمان ہرونیؒ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تو بہت باخبر اور ذمہ دار مسلمان تھے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض جھوٹے اور پیشہ ور صوفی اپنی ناتواں اور کھوکھلی ذات کو بااثر بنانے کیلئے گستاخی اور بے ادبی کی اس منزل تک بھی پہنچ گئے ہوں مگر حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کو اللہ نے سب کچھ عطا کر دیا تھا۔ پھر وہ اپنے آقا کی ذاتِ پاک سے ایسی بات کیوں منسوب کرتے کہ جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا۔ یہ تو بڑا سنگین جرم ہوتا کہ وہ ذاتی مفاد کیلئے رسالت مآب ﷺ کا نام لے کر اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ جھوٹ تو آخر جھوٹ ہی ہوتا ہے، خواہ مذاق کے طور پر ہی کیوں نہ بولا جائے اور ایک جھوٹا شخص سب کچھ ہوسکتا ہے، اللہ کا دوست نہیں ہوسکتا۔

البتہ ان روایات کا ایک پہلو بہت زیادہ غور طلب یہ ہے کہ خانہ کعبہ اور روضۂ اطہر سے بلند آواز میں جواب آنا اور سیکڑوں انسانوں کا اس آواز کو سننا قدرتِ خداوندی کے خلاف تو نہیں مگر اس سے شریعتِ خداوندی میں خلل پڑتا ہے! رسالت کا احترام بھی متاثر ہوتا ہے۔ دراصل روضۂ اطہر سے سلام کا جواب آنا، انسانی محسوسات کا ایک خاص عمل ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بھی تائیدِ غیبی کے باعث احساس کے اسی عمل سے گزر رہے تھے۔ پھر جب آپ نے کسی موقع پر اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا ہوگا تو مریدین نے خوش عقیدگی کے سبب روایتوں میں اتنا اضافہ کر دیا ہوگا کہ روضۂ اقدس سے آنے والا جواب حاضرین نے بھی سنا۔ اس کے بعد صدیوں کے سفر میں یہ روایت اتنی معتبر ٹھہری کہ اہلِ نظر حضرات نے تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس سلسلے میں مجھ بے علم اور ناچیز انسان نے بصد انکسار اپنی رائے پیش کر دی ہے ورنہ اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا؟

☆☆..............☆☆..............☆☆

حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہونے کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے طویل عرصے تک شدید ریاضتیں کیں۔ ان ریاضتوں کے بارے میں حضرت خواجہؒ کے خلیفہ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ فرماتے ہیں۔

"میرے پیرو مرشد نے اپنی ریاضتوں کے ابتدائی ایام میں ایسے طریقے سے جہاد نفس کیا دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے۔ آپ نے ریاضت کا جو طریقہ اختیار کیا تھا، عارفان حق کے گروہ میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ مسلسل سات سات دن تک روزہ رکھتے اور پانچ مثقال ٹکیہ سے افطار فرماتے۔ صرف ایک چادر اوڑھا کرتے۔ اگر وہ پھٹ جاتی تو اسے اپنے ہاتھ سے سی لیتے۔"

ریاضتوں اور مجاہدوں کی منزل سے گزرنے کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پیرومرشد کی اجازت سے دوبارہ سفر شروع کیا۔ آپ سب سے پہلے دمشق کے راستے سے ہوتے ہوئے مقدس پہنچے۔ حج کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد روضۂ رسول ﷺ پر حاضری دینے کیلئے منورہ حاضر ہوئے۔ پھر اہل اللہ کی زیارت کیلئے مختلف ممالک کا سفر اختیار کیا۔

سفر بغداد کے دوران حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ملاقات حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ ہوئی۔ اولیائے کرام کی جماعت میں حضرت شیخؒ کا مقام بہت بلند ہے۔ اس وقت حضرت نجم الدین کبریٰؒ "سنجار" میں قیام فرما تھے۔ سنجار، موصل کے قریب ایک پہاڑی مقام ہے۔

حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ وہی مشہور بزرگ ہیں جو بیک وقت گوشہ نشیں صوفی بھی تھے اور جانباز بھی، جب محمد خوارزم تاتاریوں کے حملے کی تاب نہ لاکر میدان جنگ سے فرار ہوگیا تو ہلاکو خان اپنے لشکر جرار کے ساتھ اس کے تعاقب میں آگے بڑھا۔ تاتاری حکمران کو اس کے جاسوسوں نے کہ سلطان "خوارزم" کے علاقے میں موجود ہے۔ ہلاکو خان نے شدید قہر و غضب کے عالم میں حکم کہ شہر خوارزم کا وجود تک مٹا دیا جائے۔

اتفاق سے اس وقت حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ بھی خوارزم میں سکونت پذیر تھے۔ ہلاکو خان امیر لشکر برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھا۔ خوارزم کے باشندے گریہ وزاری کرتے ہوئے حضرت نجم الدین کبریٰؒ کی خانقاہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت حضرت شیخؒ اپنے مریدوں اور دوسرے طالب علموں کو درس دے رہے تھے۔

"حضرت! وقت دعا ہے۔ تاتاری درندے شہر کے گرد و نواح میں پہنچ چکے ہیں۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہونے والا ہے۔"

حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ نے خوارزم کے باشندوں کی فریاد سنی۔ کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر اپنے قریب رکھے ہوئے مٹی کے پیالے کو چٹائی پر اوندھا کر دیا۔ یہ وہ پیالہ تھا جس میں حضرت پانی پیا کرتے تھے۔

"اب تم لوگ جاؤ! خدا نے چاہا تو تاتاریوں کے شر سے محفوظ رہو گے۔" حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ نے فرمایا۔

خوارزم کے باشندوں کا ہجوم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گیا اور ہلاکو خان کا امیر لشکر ناکامی کی حالت میں ادھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ پھر جب وہ اپنے خیمے میں واپس پہنچا تو اس کے چہرے سے شکستگی کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔

"خوارزم کے باشندے تہہ تیغ کر دیئے گئے اور ان کے مکانوں کو آگ لگا دی گئی؟" ہلاکو خان نے انتہائی غضبناک لہجے میں اپنے امیر لشکر سے پوچھا۔

"نہیں شہنشاہ! آپ کا یہ غلام کچھ بھی نہ کر سکا۔" امیر لشکر ہلاکو خان کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گیا۔

"اس کی وجہ؟" ہلاکو خان کی قہر آلود آواز کچھ اور بلند ہوگئی تھی۔

"شہنشاہ میری بات پر یقین نہیں کریں گے مگر میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ حرف بہ حرف سچ ہے۔" امیر لشکر نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب تاتاری لشکر خوارزم کے قریب پہنچا تو چند لمحوں کیلئے ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا۔ پھر جب یہ تاریکی دور ہوئی تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ تاحد نظر ایک لق و دق صحرا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم بہت دیر تک اپنے ہدف کی تلاش میں بھٹکتے رہے مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے خوارزم کی پوری آبادی کو زمین نگل گئی ہو۔"

ہلاکو خان نے بڑی حیرت کے ساتھ اپنے امیر لشکر کی گفتگو سنی اور نیا فرمان جاری کرتے ہوئے کہا۔ "کل صبح پھر حملہ کرو۔ میں یہی تو چاہتا ہوں کہ خوارزم شہر صحرا میں تبدیل ہو جائے۔"

دوسرے دن نماز فجر کے بعد حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ نے اسی مٹی کے پیالے سے پانی پیا اور اسے دوبارہ چٹائی پر الٹ دیا۔

تاتاری لشکر ایک بار پھر جوش و خروش کے ساتھ خوارزم کی طرف بڑھا مگر جب شہری حدود میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ وہی واقعہ پیش آیا۔ دور تک انسانی آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ تاتاری لشکر ناکام و نامراد واپس لوٹ گیا۔

ہلاکو خان نے دوبارہ یہ ماجرا سنا تو اپنے امیر لشکر پر برہم ہوگیا۔ "تو جھوٹا ہے یا پھر تیری آنکھوں کی روشنی زائل ہو چکی ہے۔"

"شہنشاہ! میں جھوٹ بھی نہیں بولتا اور میری بینائی بھی برقرار ہے۔" تاتاری امیر لشکر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا مگر خوف و دہشت سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ہلاکو خان کا غصہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب ہزاروں سپاہیوں نے اپنی مذہبی رسم کے مطابق قسمیں کھا کر اس واقعے پر گواہی دی۔ پھر اس نے اپنے سپہ سالار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے ایک موقع اور دیتا ہوں۔ اگر تو پھر بھی ناکام رہا تو میں خود لشکر تاتاری قیادت کروں گا۔"

تیسرے دن بھی وہی صورتحال پیش آئی۔ تاتاریوں کی آنکھوں کے سامنے ایک طویل و عریض

صحرا کے سوا کچھ نہیں تھا۔

چوتھے دن ہلاکو خان بہ نفسِ نفیس ایک لشکر جرار لے کر خوارزم کی طرف بڑھا۔

حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ نماز فجر کے بعد اپنا عمل دہرانا چاہتے تھے کہ یکایک خانقاہ کے ایک گوشے سے مردِ غیب کی آواز سنائی دی۔ "بس شیخ! بہت ہو چکا۔ اللہ نے تین دن تو تمہاری لاج رکھ لی۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟"

حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ نے اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ فرمایا۔ "آخر مشیت الٰہی کیا ہے؟"

"مشیت الٰہی یہ ہے کہ فتنۂ تاتار تمہاری دعاؤں سے نہیں ٹلے گا۔" مردِ غیب نے کہا۔ "اور تمہیں بھی خبر ہونا چاہئے کہ تم اسی فتنے کے دوران جام شہادت نوش کرو گے۔"

"سبحان اللہ! سبحان اللہ!" حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ کے ہونٹوں کا تبسم گہرا ہو گیا۔ پھر آپ نے اسی مٹی کے پیالے سے پانی پیا اور اسے چٹائی پر سیدھا رکھ دیا۔ اس کے بعد حضرت شیخؒ نے اپنے مریدوں کو طلب کر کے فرمایا۔

"یہ فتنۂ تاتار بہت خوفناک اور جان لیوا ہے۔ اس لئے تم سب لوگ اپنے اپنے علاقوں کو واپس لوٹ جاؤ۔ خدا تمہیں انسان نما درندوں کی خوراک بننے سے محفوظ رکھے۔"

بعض مریدوں نے عرض کیا۔ "ابھی تک آپ کی دعاؤں کے طفیل یہ شہر فتنہ گروں کی یورش سے محفوظ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کی مزید دعاؤں سے یہ ہنگامۂ دار و گیر مستقل طور پر ختم ہو جائے گا۔"

"ہرگز نہیں!" حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ "اس مہلت کو غنیمت جانو اور خفیہ راستوں کے ذریعے اس شہر سے نکل جاؤ۔"

حضرت شیخؒ کا جواب سن کر مریدوں نے اپنی اپنی سواریاں تیار کیں اور پھر پیر و مرشد سے درخواست کی کہ وہ بھی ہمارے ساتھ تشریف لے چلیں۔

حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ کچھ دیر تک خاموش رہے پھر مسکراتے ہوئے فرمانے لگے۔ "بہتر یہی ہے کہ تم لوگ میری بات مان لو اور عافیت کے سائبان کی طرف چلے جاؤ۔ میرا خیال چھوڑ دو کہ تمہارے شیخؒ کو یہاں سے جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

آخر آپ کے تمام مرید خانقاہ سے رخصت ہو گئے۔ بس چند جانثار خادم رہ گئے تھے جو اپنے شیخ کو تنہا چھوڑ کر جانے پر رضامند نہیں تھے۔ حضرت نجم الدین کبریٰؒ نے اپنے ان خدمت گاروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "کل تک ہمارے لئے گوشہ نشینی جائز تھی مگر آج حرام ہے۔ اللہ کا نام لے کر اٹھو اور کافروں سے جہاد کرو۔ بہت سماع سن چکے، اب شمشیروں کی جھنکار سنو۔ بہت درود کر چکے، اب سب سے بڑا اور آخری وظیفہ پڑھو۔"

یہ کہہ کر حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ اپنا خرقہ پہنا، کمر باندھی اور تلوار لے کر خانقاہ سے باہر نکل آئے۔ پھر اتنی بہادری سے لڑے کہ کئی تاتاریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ خانقاہ کے ایک گوشے

میں بیٹھ کر ضرب لا الٰہ سے نفس کے بتوں کو قتل کرنے والا صوفی جب میدان کارزار میں اترا تو ایک پُر عزم مجاہد بن گیا اور اس نے کئی کافروں کے سر قلم کر دیئے۔ یہ خونی معرکہ بہت دیر تک جاری رہا۔ ابھی حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ کے بازوؤں کی توانائی باقی تھی کہ ناگہاں ایک تاتاری کا زہر آلود تیر آپ کے سینۂ مبارک میں پیوست ہو گیا۔ حضرت شیخؒ نے اپنے ہاتھ سے اس تیر کو کھینچ کر نکال دیا مگر وہ خون بہہ جانے کے باعث جانبر نہ ہو سکے اور سرخ کفن پہن کر خالق حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔

حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ سماع سے بہت رغبت رکھتے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ڈھائی ماہ تک حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر رہے اور ایک عظیم جانباز صوفی کی صحبتوں سے فیضیاب ہوئے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

اس کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بغداد تشریف لے گئے اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اندازاً 553ھ میں حصول علم کیلئے طویل سفر اختیار کیا تھا۔ اس وقت حضرت خواجہؒ کی عمر مبارک 17 سال تھی۔ غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے 561ھ میں وفات پائی۔ اگر ماہ و سال اور اعداد و شمار کے آئینے میں واقعات کا جائزہ لیا جائے تو حضرت غوث اعظمؒ کے وصال کے وقت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنی عمر کے پچیسویں سال سے گزر رہے تھے۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت خواجہؒ نے صرف سات سال کے مختصر عرصے میں تمام مذہبی اور دنیوی علوم میں مہارت حاصل کی۔ یہ قدرت خداوندی کا ایک کرشمہ بھی ہے اور اس مرد مومن کی تربیت کا اہتمام بھی جسے مستقبل قریب میں مملکت ہند کی سلطانی کے عہدے پر فائز کیا جانے والا تھا۔

غوث اعظمؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آئے اور بڑی محبت سے اپنا مہمان بنایا۔ اسی زمانے میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ روایت ہے کہ ایک دن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اداس بیٹھے تھے۔ غوث اعظمؒ کے مریدوں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا اور تمام صورتحال اپنے مرشد کے گوش گزار کر دی۔

جواب میں غوث اعظمؒ نے فرمایا۔ "مجھے خواجہ چشتیؒ کی اداسی کا سبب معلوم ہے۔ بے شک! تم لوگ ان کے جسم کی تواضع کر رہے ہو مگر خواجہؒ کی روح بھوکی ہے۔ جب تک انہیں روحانی غذا نہیں ملے گی اس وقت تک وہ اسی طرح مغموم رہیں گے۔"

غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا اشارہ محفل سماع کی طرف تھا۔ سلسلۂ چشتیہ کے بیشتر بزرگ نہایت ذوق و شوق سے سماع سنتے تھے۔ اس کے برعکس غوث اعظمؒ کے قادریہ سلسلے میں محفل سماع سے گریز کیا جاتا تھا۔ بڑی عجیب صورتحال تھی لیکن حضرت غوث اعظمؒ نے صرف حضرت خواجہؒ کی خاطر محفل سماع آراستہ کرنے کا حکم دیا۔ بغداد کے انتہائی متقی اور پرہیزگار لوگوں میں سے ایسے افراد کا انتخاب کیا گیا جو نہایت خوش گلو تھے۔ پھر ایک علیحدہ مکان کا انتظام کیا گیا جس میں یہ محفل سماع منعقد

ہونے والی تھی۔ اس کے بعد حضرت غوث اعظمؒ نے حاضرین سے فرمایا۔

''اگر کوئی اور شخص بھی سماع کی خواہش رکھتا ہو تو اسے بھی اطلاع کر دو۔'' یہ کہہ کر آپ اپنے مریدوں کے ساتھ خانقاہ میں تشریف لے گئے۔

ایک طرف حضرت عبدالقادر جیلانیؒ درس دے رہے تھے اور دوسری طرف حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی محفل سماع جاری تھی۔ وعظ کہتے کہتے اچانک حضرت غوث اعظمؒ خاموش ہو گئے مریدوں نے حیرت سے اپنے پیر و مرشد کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے قریب رکھا ہوا اپنا عصا اٹھایا اور اس طرح زمین پر ٹیک دیا جیسے آپ کسی چیز کو دبا رہے ہوں۔ مجلس وعظ پر گہرا سکوت طاری تھی۔ حاضرین نے اپنی زندگی میں پہلی بار حضرت غوث اعظمؒ کو اس حالت میں دیکھا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے چہرہ مبارک کی رنگت بدلتی جا رہی تھی۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ حضرت غوث اعظمؒ اپنے عصا پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ ہر ذہن پریشان تھا اور ہر آنکھ حیران تھی۔ یہاں تک کہ حضرت غوث اعظمؒ کا چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا۔ عقیدت مند لرز اُٹھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ پر بہت دیر یہ کیفیت طاری رہی۔ پھر آہستہ آہستہ آپ معمول پر آ گئے۔ حضرت غوث اعظمؒ نے اپنا عصا ایک طرف رکھ دیا اور اہل مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

''خواجہ معین الدین چشتیؒ حالت وجد میں تھے۔ اس عاشق جانباز کو روکنا بہت مشکل تھا۔ اگر میں مداخلت نہ کرتا اور ان کے جذب کی یہی کیفیت برقرار رہتی تو اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں زمین بغداد ہی نہ اُلٹ جائے۔''

اکثر تذکرہ نگاروں نے غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حوالے سے اس واقعے کو بڑے جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔ شاید اس طرح وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی روحانی عظمتوں کا اظہار کرنا چاہتے تھے مگر جوش عقیدت میں ان لوگوں نے موقع اور محل کی نزاکتوں کو فراموش کر دیا۔ انہیں یہ بھی احساس نہیں رہا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کسی مرد بزرگ کے مہمان تھے اور جس سرزمین پر یہ محفل سماع منعقد ہوئی تھی، اس کی روحانی حیثیت کیا ہے؟

حضرت خواجہؒ کے وجد و حال کے اثر سے سرزمین بغداد کا اُلٹ جانا، جذب و مستی کا تاثر تو ہو سکتا ہے مگر ہوش کی دنیا میں اس واقعے کی کوئی حیثیت نہیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ جس شہر یا خطے میں قیام فرما تھے، وہاں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جیسے عظیم بزرگ نہ صرف موجود تھے بلکہ حضرت خواجہؒ کے میزبان بھی تھے۔ اس صورتحال میں یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین بے حال ہو جاتے اور سرزمین بغداد ڈگمگانے لگتی۔

دوسرے یہ کہ بغداد میں بڑے بڑے آئمہ اور مجتہد آسودۂ خاک ہیں۔ ان ہی عظیم الشان ہستیوں میں امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ بھی شامل ہیں۔ مسلک کے اعتبار سے حضرت خواجہ معین الدین ''فقہ حنفی'' پر عمل کرتے تھے۔ اب صورتحال کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ حضرت

ظاہری طور پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مہمان تھے اور روحانی طور پر اپنے امام حضرت ابوحنیفہؒ کے۔ یہ تو عین مقام ہوش تھا مگر افسوس! خوش عقیدہ حضرات نے سرزمین بغداد کے احترام کو ملحوظ نہیں رکھا اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ذات سے جذب و مستی کا ایک ایسا واقعہ منسوب کر دیا جس کی یہاں کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ بغداد سے رخصت ہوتے وقت غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو اپنا خرقہ بھی مرحمت فرمایا تھا۔ سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی نے بھی اپنی کتاب ''لطائف اشرفی'' میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے مگر بعض مؤرخین نے اس واقعے کی صحت سے انکار کیا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ محض جوش عقیدت ہے ورنہ تاریخ کے آئینے میں یہ دونوں روایتیں بہت کمزور مجہول نظر آتی ہیں۔ جب یہ بات تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ حضرت غوث اعظمؒ سماع سے کوئی شغف نہیں رکھتے تھے تو پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنے مہمان کیلئے ایک ناپسندیدہ شے کا اہتمام کرتے اور پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ جیسے مرد کامل سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی ایک ایسی خواہش کی تکمیل کیلئے جس کا کوئی یقینی شرعی جواز موجود نہیں، حضرت غوث الاعظمؒ جیسے قطب الاقطاب کو اپنی روش تبدیل کرنے پر مجبور کر دیتے۔ واضح رہے کہ ایک دوسرے کا احترام کرنا بھی تصوف کی اعلیٰ ترین روایت ہے۔ بالفرض اگر حضرت غوث اعظمؒ رسم میزبانی کی خاطر اور اپنی عادت کے خلاف مجلس سماع کے انعقاد کا حکم بھی جاری کر دیتے تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا فوری ردعمل یہ ہوتا کہ آپ اس طرح اپنی ''روحانی غذا'' حاصل کرنے سے انکار کر دیتے۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار حضرت ابوحنیفہؒ سفر میں تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ اتفاق سے آپ جس مسجد میں تشریف لے گئے وہاں کے لوگ حضرت امام مالکؒ کے فقہ کے زیر اثر تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کسی پس و پیش کے بغیر مقتدیوں کی صف میں کھڑے ہو گئے اور پیش امام کی اتباع میں حضرت امام مالکؒ کے طریقے سے نماز ادا کی۔

نماز کے بعد جب حاضرین مسجد نے حضرت امام ابوحنیفہؒ سے دریافت کیا کہ اپنا علیحدہ مسلک رکھتے ہوئے آپ نے فقہ مالکیؒ کے مطابق نماز کیوں ادا کی، تو جواب میں امام اعظمؒ نے فرمایا۔

''مجھ پر مالک بن انسؒ کا اتنا احترام تو واجب ہے کہ میں ان کی مملکت میں انہی کے قوانین پر عمل کروں۔''

اس واقعے کی روشنی میں ہمیں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے بھی اسی حسن عمل کی توقع رکھنی چاہئے تھی۔

بغداد کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ''تبریز'' تشریف لے گئے۔ ان دنوں وہاں مشہور بزرگ حضرت خواجہ ابوسعید تبریزیؒ قیام فرما تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء انہیں خراج عقیدت پیش

کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''حضرت شیخ ابوسعید تبریزیؒ بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ان کے فیوض وبرکات کا یہ عالم تھا
ہزاروں مرید تھے مگر ستر مرید ایسے تھے کہ جن میں سے ہر ایک کو ولایت کا درجہ حاصل تھا۔ان
مریدوں میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ بھی شامل تھے جنہیں تصوف کی دنیا میں ہمہ گیر شہرت
حاصل ہے۔''

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے حضرت شیخ ابوسعید تبریزیؒ کی خدمت میں بہت کم وقت گزارا
مگر چند دنوں کی یہ صحبت بھی اپنی تاثیر میں اکسیر کا درجہ رکھتی تھی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تبریز سے اصفہان تشریف لائے۔وہاں اس وقت مشہور بزرگ
حضرت شیخ محمود اصفہانیؒ موجود تھے۔حضرت خواجہؒ کچھ دنوں تک حضرت شیخ محمودؒ کی صحبتوں سے
فیضیاب ہوئے ان ہی دنوں آپ نے ایک نوعمر لڑکے کو دیکھا جو درویشوں سے نہایت عقیدت رکھتا
تھا۔حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آمد سے پہلے وہ لڑکا حضرت شیخ محمود اصفہانیؒ کی ذات سے
بہت متاثر تھا۔اس کی خواہش تھی کہ وہ حضرت شیخ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو جائے۔مگر جب اس
نے حضرت خواجہؒ کو دیکھا تو ارادہ بدل لیا۔یہاں تک کہ جب آپ اصفہان سے رخصت ہوئے تو
لڑکا بھی ساتھ ساتھ ہو لیا۔

''صاحبزادے! آخر تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟'' ایک دن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے
اس لڑکے سے پوچھا۔

''آپ کی قربت کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔'' لڑکے نے عرض کیا۔

''میں تو خود درویشوں کا خدمت گزار ہوں۔تمہیں کیا دے سکتا ہوں؟'' حضرت خواجہ معین الدین
چشتیؒ نے لڑکے کو ٹالنے کیلئے فرمایا۔

''کچھ بھی سہی مگر مجھے اپنی خدمت کا موقع دیجئے۔'' لڑکے کا لہجہ عقیدت سے سرشار تھا۔''کون ہے؟ یہ اللہ جانے مگر میرے مخدوم تو آپ ہیں۔''

لڑکے کی وارفتگی کا یہ عالم دیکھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ انکار نہ کر سکے اور اسے اپنے دامن
محبت میں چھپا لیا۔

بعد میں یہی لڑکا اولیائے ہند کا تاجدار بنا اور آج ساری دنیا اسے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ
کے نام سے جانتی ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

اصفہان کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ خرقان تشریف لے گئے۔یہاں دو سال تک
آپ نے وعظ فرمایا اور ہزاروں انسانوں کو راہ راست پر گامزن کیا۔پھر آپ یہاں سے ایران کے
ایک شہر استرآباد چلے گئے۔ان دنوں استرآباد میں ایک مرد کامل حضرت شیخ ناصر الدینؒ قیام فرما تھے
جن کا سلسلہ دو واسطوں سے مشہور صوفی حضرت بایزید بسطامیؒ تک پہنچتا ہے۔حضرت شیخ ناصر الدینؒ

کی عمر 122 سال تھی۔حضرت خواجہ چشتیؒ نے ان بزرگ کے بڑے بڑے کمالات دیکھے۔ان ہی
کمالات سے متاثر ہو کر آپ کئی ماہ تک استرآباد میں قیام پذیر رہے اور حضرت شیخ ناصر الدینؒ سے
فیض روحانی حاصل کرتے رہے۔

استرآباد کے بعد ہرات تشریف لائے۔ہرات افغانستان کا ایک شہر ہے جو ایران کی سرحد کے
قریب واقع ہے۔حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ دن بھر شہر میں گھومتے اور رات ہوتے ہی مشہور
بزرگ حضرت خواجہ عبداللہ انصاریؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہو جاتے۔یہاں ساری رات ذکر و
عبادت میں مشغول رہتے اور عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کرتے۔

کچھ دن بعد آپ کے ذوق ریاضت کے چرچے پورے شہر میں سنائی دینے لگے۔نتیجتاً مقامی
باشندوں کا ایک ہجوم حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے گرد سمٹ آیا۔ہزاروں ضرورت مند انسان
اپنی عجیب عجیب درخواستیں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔مخلوق خدا کی کثرت سے
حضرت خواجہؒ کی عبادت میں خلل پڑنے لگا۔مجبوراً آپ ہرات سے سبزوار تشریف لے گئے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

ابھی سبزوار میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قیام کو چند دن بھی نہیں گزرے تھے کہ مقامی
باشندوں کی ایک جماعت بطور خاص آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔پھر ان ستم رسیدہ لوگوں نے
بڑے دردناک لہجے میں اپنے حالات بیان کئے۔

''شیخ! ہم اہل شہر کی جانب سے آپ کے حضور ایک درخواست لے کر آئے ہیں۔یہاں کا گورنر
یادگار محمد ایک ظالم حکمراں ہے۔اس کے جابرانہ رویے سے مخلوق خدا تنگ ہے۔لوگ رحم کی بھیک
مانگتے مانگتے قبروں میں سو گئے مگر اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔اب تو ہر گزرنے والے دن کے ساتھ اس
کے ظلم و تشدد کی لے تیز ہوتی چلی جاتی ہے۔آپ اس کے حق میں دعائے خیر فرمائیں کہ وہ ہدایت
پا جائے۔یا پھر بددعا کر دیں کہ اس کی ہلاکت سے اس اہل شہر کو نجات مل جائے۔''

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سبزوار کے باشندوں کی فریاد سنی اور انہیں یقین دلایا کہ خداوند
ذوالجلال بہت جلد اس شہر کے رہنے والوں پر اپنے کرم کی بارش کرے گا۔

دوسرے دن حضرت خواجہؒ گورنر یارگار محمد کے دربار میں تشریف لے گئے۔محل کے دروازے پر
پہنچ کر آپ نے دربان سے کہا۔

''اپنے حاکم کو خبر کرو کہ اس سے درویش معین الدین ملنا چاہتا ہے۔''

دربان نے حاکم سبزوار کو اطلاع دی لیکن یادگار محمد کا غرور انتہا کو پہنچ چکا تھا۔اس نے غضب ناک
لہجے میں دربان کو جواب دیا۔

''میرے پاس کسی ننگے بھوکے فقیر سے ملنے کا وقت نہیں ہے۔''

دربان واپس آیا اور جیسے ہی اس نے یادگار محمد کے الفاظ دہرانے کی کوشش کی، اس کی زبان گنگ
ہو گئی۔دربان نے گھبرا کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھا، اس کی

روح کانپنے لگی، ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور زمین پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کسی اجازت کے بغیر محل کے دروازے میں داخل ہو دوسرے دربان کی نظر پڑی تو وہ آپ کو روکنے کیلئے آگے بڑھا مگر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے کا ہوا تھا۔ پھر محل میں ایک شور سا برپا ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ یادگار محمد صورتحال کو سمجھنے کی کوشش حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اس کے کمرے میں داخل ہوگئے جہاں بیٹھ کر وہ سنگ دل حاکم تقدیروں کے فیصلے کرتا تھا۔ دربار میں ہلچل سی مچ گئی۔ حضرت خواجہؒ کے جلال معرفت کا یہ کہ جس پر نظر پڑتی، اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا۔ یادگار محمد نے آپ کو دیکھا تو خوف و دہشت کانپنے لگا۔

''میں وہی بھوکا ننگا فقیر ہوں جس سے تو نے ملنا بھی گوارہ نہیں کیا۔'' گورنر کے دربار میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کی بارعب آواز گونجی۔ ''میں یہاں اس لئے نہیں آیا ہوں کہ تو مجھے بندگان کی خون میں ڈوبی ہوئی چند روٹیوں کی بھیک دے دے یا مخلوق خدا کے جسموں کو برہنہ کر کے ریشمی کپڑا میرے حوالے کردے۔ میں تو اس لئے آیا ہوں کہ حجت تمام ہوجائے۔ اس سے پہلے تیرے جسم اور تیرے اقتدار کو زمین نگل لے، حق کی نافرمانیوں سے باز آجا۔ تو جن پر ستم ڈھا رہا انہیں ان کی ماؤں نے آزاد پیدا کیا تھا۔ بساط ہستی پر تیری حیثیت ہی کیا ہے؟ تجھ سے پہلے بڑے ستم گر یہاں اپنی طاقت آزما چکے ہیں، انہیں تلاش کر کہ وہ کہاں سے آئے تھے اور کدھر گئے''

گورنر سبزوار کے دربار پر کسی قبرستان کا سا گمان ہو رہا تھا۔ حاضرین مردوں کی طرح ساکت اور یادگار محمد اپنی زرنگار کرسی سے اتر کر نیچے آنا چاہتا تھا مگر اس کا جسم مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ جابر حاکم کے سامنے کلمات حق ادا کر کے واپس جا چکے تھے آپ کے الفاظ کی گونج ابھی تک باقی تھے۔

دوسرے دن سبزوار کے باشندوں نے اپنی آنکھوں سے یہ ناقابل یقین منظر دیکھا۔ یادگار ندامت سے سر جھکائے ہوئے حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رو رو کر اپنے گناہوں معافی مانگنے لگا۔ آپ نے اس کے حق میں دعائے خیر کی اور اللہ کی زمین پر عدل و انصاف قائم کی ہدایت فرمائی۔ اس کے ساتھ ہی گورنر سبزوار بہت سے تحائف لے کر آیا تھا مگر آپ نے قبول نہیں کی۔ تمام قیمتی سامان اور زرنقد ان محتاجوں میں تقسیم کرادیا جو یادگار محمد کے ظلم و تشدد کا نشانہ چکے تھے۔

حامد بن فضل اللہ جمالی سولہویں صدی عیسوی میں ایک نامور سیاح، ادیب، شاعر اور گزرے ہیں۔ جمالی نے اپنی مشہور کتاب ''سیر العارفین'' میں مذکورہ بالا واقعے کو مختصر انداز میں کیا ہے، جو بہرحال زیادہ معتبر ہے۔ جمالی، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قیام سبزوار کا کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہاں کا حاکم یادگار محمد ایک فاسق و فاجر انسان تھا۔ اس کی درشت مزاجی کی یہ کیفیت تھی کہ

معمولی باتوں پر غضبناک ہو کر بے گناہ انسانوں کو سخت سزائیں دیتا تھا۔ دل و دماغ پر گمراہی اور نفاق کے اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ روح اس قدر کثیف اور غلیظ تھی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض و عداوت رکھتا تھا اور ان مقدس ہستیوں کی شان میں توہین آمیز الفاظ استعمال کر کے محل قہقہے لگاتا تھا۔ انتہا یہ تھی کہ جن لوگوں کے نام صحابہ کرامؓ کے ناموں پر رکھے گئے تھے، انہیں مستقل اذیتیں پہنچاتا رہتا تھا۔ قلب کی یہی سیاہی یادگار محمد کو اس مقام تک کھینچ لائی تھی جہاں پہنچ کر انسانی جسم میں شیطان حلول کر جاتا ہے۔

اس نے شہر کے باہر ایک باغ لگایا تھا جسے وہ جنت کہہ کر پکارتا تھا۔ یہاں اکثر رقص و سرور کی محفلیں گرم ہوتیں۔ خوبصورت کنیزیں اسے شراب پلاتیں اور ساری رات ہنگامہ ناؤنوش برپا رہتا۔

جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ پہلے دن شہر سبزوار میں داخل ہوئے تو آپ نے اسی باغ کا رخ کیا تھا۔ اتفاق سے اس وقت کوئی بھی دربان موجود نہیں تھا۔ حضرت خواجہؒ باغ میں تشریف لے گئے اور یادگار محمد کی بنائی ہوئی حوض میں غسل فرمایا۔ حوض کا پانی خوشبوؤں میں بسا ہوا تھا۔ غسل کے بعد آپ نے دو رکعت نماز ادا کی اور تلاوت کلام پاک میں مشغول ہوگئے۔

ناگہاں ایک نیک دل شخص کی نظر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ پر پڑی۔ وہ تیزی سے آپ کے قریب آیا اور کانپتے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ ''یہ ایک جابر و سفاک انسان کی تفریح گاہ ہے۔ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ اگر وہ ادھر آگیا تو قیامت ٹوٹ پڑے گی۔'' دراصل اجنبی شخص حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مقام سے ناواقف تھا۔ اس لئے از راہ ہمدردی آگاہ کرنے چلا آیا تھا تاکہ آپ یادگار محمد کے ظلم و ستم سے محفوظ رہیں۔

حضرت خواجہؒ نے اس کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا بلکہ فرمایا۔ ''تم بھی اس درخت کے سائے کے نیچے بیٹھ جاؤ جو حوض کے نزدیک ہے۔'' اجنبی شخص آپ کی بات سن کر گھبرا گیا۔ ابھی وہ صورتحال کو سمجھنے بھی نہیں پایا تھا کہ اتنے میں یادگار محمد کے کچھ ملازم نظر آئے۔ اجنبی شخص کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ حضرت خواجہ چشتیؒ نے اسے تسلی دی اور اپنے قریب بٹھالیا۔ خادموں نے حضرت خواجہؒ کو دیکھا اور پوچھنا چاہا کہ وہ بغیر اجازت باغ میں کیسے داخل ہوگئے؟ مگر آپ کے جلال کا یہ عالم تھا کہ ان کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔ چپ چاپ حوض کے کنارے قالینیں بچھائیں اور ان پر شراب کی صراحیاں رکھنے لگے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ کچھ دیر بعد یادگار محمد اپنی محفل نشاط آراستہ کرنے کیلئے باغ میں آنے والا ہے۔ اور پھر وہ بدکردار حاکم اپنے مصاحبوں کے ہمراہ باغ میں آپہنچا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو دیکھتے ہی ملازمین پر برس پڑا۔ ''یہ کون ہے اور ہمارے عشرت کدے میں کس کی اجازت سے داخل ہوا ہے؟''

ملازمین بدستور خاموش تھے مگر خوف و دہشت سے ان کے جسم لرز رہے تھے اور انہیں اپنا بھیانک انجام بہت قریب نظر آرہا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ملازمین کی بے چارگی دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھے اور یادگار محمد کے

قریب پہنچ کر فرمانے لگے۔''فقیر اپنی مرضی سے یہاں آیا ہے، اسے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔''

یادگار محمد نے ایک عارف کا کلام سنا مگر جیسے ہی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے نظریں چار ہوئیں اپنی قوت گویائی کھو بیٹھا۔اس کے مصاحب بھی پتھروں کی طرح ساکت ہوکر رہ گئے تھے۔

''یہ مجبور انسان بے قصور ہیں۔یہ تیرے سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔'' اتنا کہہ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے یادگار محمد کو نگاہ کرم سے دیکھا۔چند لمحوں کی بات تھی۔وہ لڑکھڑایا اور اس طرح گر پڑا جیسے کوئی بت ضرب لا الہ سے زمین بوس ہو جائے۔یادگار محمد کے بے ہوش ہوتے ہی اس کے تمام مصاحبوں اور خادموں نے بھی زمین پر اپنے سر رکھ دیئے۔

حضرت خواجہؒ نے اجنبی شخص سے فرمایا۔''حوض کا پانی لے کر اس کے منہ پر چھڑکو۔'' آپ کا اشارہ یادگار محمد کی طرف تھا۔

اجنبی نے آپ کی ہدایت کے مطابق عمل کیا۔چہرے پر پانی کی چھینٹیں پڑتے ہی یادگار محمد کو ہوش آ گیا۔اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔بالآخر مجبور ہو کر حضرت خواجہؒ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔

''کیا تو اپنے گناہوں سے تائب ہو گیا؟'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بلند آواز میں فرمایا۔

''واللہ! میں اپنی تمام سیاہ کاریوں سے تائب ہو گیا۔'' یادگار محمد کی آواز لرز رہی تھی۔

''اب تیرے عقائد کا کیا حال ہے؟'' حضرت خواجہؒ نے دوبارہ فرمایا۔

''آپ کے طفیل میرا سینہ روشن ہو گیا۔'' اب یادگار محمد ہچکیوں سے رونے لگا۔''خدا کی قسم! تمام اصحاب رسول ﷺ بزرگ و محترم ہیں۔ان کے قدموں سے لپٹی ہوئی خاک بھی میرے لئے اکسیر سے بڑھ کر ہے۔'' یادگار محمد بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں صحابہ کرامؓ کی عظمت کا اعتراف کر رہا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ آگے بڑھے اور اپنا دست مبارک اس کی پشت پر رکھ دیا۔سبزوار کا جابر و سفاک شخص کسی ضعیف و ناتواں انسان کی طرح کھڑا ہو گیا۔اس کی نظریں فرط ندامت سے جھکی ہوئی تھیں۔حضرت خواجہؒ نے اسے وضو کرنے کا حکم دیا اور پھر دو رکعت نماز ادا کرنے کی ہدایت کی اب وہ ایک بدلا ہوا انسان تھا۔

جب باغ سے رخصت ہونے لگے تو یادگار محمد نے آپ کا دامن تھام لیا اور درخواست کی کہ اسے ہمیشہ کیلئے شرف غلامی بخشا جائے۔حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اسے بیعت سے سرفراز فرمایا۔جیسے ہی آپ نے یادگار محمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اس کی دنیا ہی بدل گئی۔یہاں تک کہ جس قدر دولت تھی پیر و مرشد کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔حضرت خواجہؒ نے جواباً فرمایا۔''سیم و زر کے انبار کو ان لوگوں میں تقسیم کر دو جو اب تک تیرے ظلم و تشدد کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔'' یادگار محمد نے ایسا ہی کیا۔کھڑے کھڑے سب کچھ لٹا دیا۔اس کے ساتھ ہی تمام کنیزوں اور غلاموں کو بھی آزاد کر دیا۔

دنیا سے اس قدر بیزار ہو گیا کہ اپنی دونوں بیویوں کو بھی طلاق دے دی۔

کچھ دن بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سبزوار سے ''حصار شاداں'' تشریف لائے تو یادگار محمد بھی آپ کے ہمراہ تھا۔اس کی خواہش تھی کہ وہ پوری زندگی پیر و مرشد کی خدمت میں بسر کرے مگر حضرت خواجہؒ نے یادگار محمد کو اسی مقام پر لوگوں کی رشد و ہدایت کیلئے مقرر کیا۔یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جو کل تک خود گمراہ تھا، آج وہی شخص بندگان خدا کو آوازیں دے کر بلا رہا تھا۔

''حی علی الفلاح (آؤ بھلائی کی طرف)''

اور لوگ اس کی صدا سن کر دوڑے چلے آ رہے تھے۔

یادگار محمد کا مزار آج بھی حصار شاداں میں موجود ہے۔

کوئی انداز کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

☆☆..........☆☆..........☆☆

حصار شاداں سے رخصت ہو کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بلخ تشریف لائے اور حضرت شیخ احمد خضرویہؒ کی خانقاہ میں قیام فرمایا۔اس تاریخی شہر کے نواح میں مولانا حکیم ضیاء الدین بلخی ایک عالم و فاضل شخص تھے۔اسی مقام پر ان کا مدرسہ تھا اور یہیں وہ اپنے سینکڑوں شاگردوں کو درس دیتے تھے۔حکیم ضیاء الدین ظاہری علوم میں درجہ کمال رکھتے تھے مگر انہیں تصوف پر اعتقاد نہیں تھا۔اکثر اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے۔

''تصوف ایک ہذیان ہے جو تیز بخار میں مبتلا لوگ بکا کرتے ہیں۔یہ دیوانوں کی باتیں ہیں جن کا کوئی مفہوم نہیں۔''

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہمیشہ سفر میں تیر کمان ساتھ رکھتے تھے۔ساتھ میں ایک خادم ہوتا تھا۔آپ جب بھی آبادی سے جنگل کی طرف جاتے شکار کرتے اور اسی گوشت سے روزہ افطار فرماتے۔ایک دن بلخ میں بھی حضرت خواجہؒ نے ایک کلنگ کا شکار کیا اور اپنے خادم کو کباب بنانے کا حکم دے کر خود نماز میں مشغول ہو گئے جب تک آپ نماز سے فارغ ہوئے خدام کھانا تیار کر چکا تھا۔اتفاق سے اسی وقت حکیم ضیاء الدین ادھر سے سلام کرتے ہوئے گزرے۔حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے انہیں بھی کھانے کی دعوت دی۔حکیم صاحب بہت بھوکے تھے اس لئے انکار نہ کر سکے اور ایک فقیر کے دسترخوان پر بیٹھ گئے۔

حضرت خواجہؒ نے بڑی محبت سے کلنگ کی ایک ران حکیم ضیاء الدین کے سامنے رکھی اور دوسری خود کھانے لگے۔جیسے ہی حکیم ضیاء الدین نے بسم اللہ کہہ کر اس پرندے کا گوشت منہ میں رکھا ان کی حالت غیر ہو گئی۔دل و دماغ کے سارے اندھیرے دور ہو گئے اور جب روح کی گہرائیوں میں تیز روشنی اتری تو حکیم ضیاء الدین اسے برداشت نہ کر سکے۔اس سے پہلے کہ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھتے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے آگے سے گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھا کر حکیم صاحب کے منہ میں

ڈال دیا۔ چند لمحوں میں ان کی حالت سنبھل گئی اور پھر بہت دیر تک حضرت خواجہؒ کے چہرۂ مبارک دیکھتے رہ گئے محویت کا یہ عالم تھا کہ ایک ساعت کیلئے بھی ان کی نظریں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے رخ روشن سے نہیں ہٹتی تھیں۔

حضرت خواجہؒ نے تبسم فرماتے ہوئے پوچھا۔ ''مولانا کیا دیکھ رہے ہو؟''

''یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم نے میرے علم کا سارا سرمایہ لوٹ لیا اور میں کچھ بھی نہ کرسکا۔'' حکیم ضیاء الدین بلخی نے بڑے اثر انگیز لہجے میں کہا اور پھر نہایت عقیدت سے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بھی جواباً شدید محبت کا اظہار کیا اور حکیم صاحب کی درخواست قبول کرلی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی بیعت سے مشرف ہونے کے بعد حکیم ضیاء الدین نے سارا کتب خانہ دریا میں ڈال دیا اور ان کی یہ حالت ہوگئی۔

نمی دانم کہ آخر چوں دم دیداری رقصم
مگر نازم بہ ایں ذوقے کہ پیش یاری رقصم

(میں اس راز کو نہیں جانتا کہ آخر دیدار کے وقت کیوں رقص کرنے لگتا ہوں مگر پھر بھی مجھے اس پر ناز ہے کہ میں اپنے دوست کے سامنے رقص کرتا ہوں)

☆☆.................☆☆.................☆☆

بلخ کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے غزنی میں کچھ عرصے تک قیام فرمایا۔ یہاں بھی آپ ہدایت غیبی کے منتظر تھے۔ بالآخر آپ کی زندگی کی مبارک ترین ساعت آئی جب ایک رات آپ نے سرور کائنات حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ رسول کریم ﷺ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو اپنی دعاؤں سے سرفراز کیا اور ہندوستان جانے کی ہدایت فرمائی۔ آپ کو دربار رسالت ﷺ سے سلطان الہند کا خطاب پہلے ہی حاصل ہو چکا تھا لیکن اذن سفر اب ملا تھا۔ آقا ﷺ کی اجازت پاتے ہی 586ھ میں لاہور تشریف لائے۔

برصغیر کے اس تاریخی شہر میں پہنچتے ہی سب سے پہلے مشہور بزرگ حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ) کے مزار اقدس پر حاضر ہوئے۔ یہاں آپ نے چلہ کشی کی۔ (یہ چلہ گاہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار مبارک کے نزدیک آج بھی موجود ہے۔ اس متبرک مقام کو ایک بند کمرے کی صورت میں محفوظ کر دیا گیا ہے) حضرت سید علی ہجویریؒ سے فیض روحانی حاصل کر کے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ملتان تشریف لے گئے۔

ملتان اس زمانے میں مشرقی علوم وفنون کا مرکز تھا۔ یہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پانچ سال تک قیام فرمایا اور سنسکرت زبان سیکھی، آپ کیلئے اس زبان کی تعلیم نہایت ضروری تھی۔ حضرت خواجہؒ عنقریب ہندو قوم کے سامنے اسلامی تعلیمات پیش کرنے والے تھے۔ اس لئے مقامی زبان سے آگاہ ہونا ناگزیر تھا۔ ملتان سے آپ دہلی تشریف لے گئے۔ دہلی میں مختصر قیام کے بعد حضرت خواجہؒ اجمیر شریف روانہ ہوگئے اور اسی خطۂ زمین کو آپ نے اپنی تبلیغ کا مستقل مرکز بنایا۔

☆☆.................☆☆.................☆☆

اجمیر کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ یہ شہر آگرہ کے مغرب میں تارہ گڑھ کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ پہاڑی کی چوٹی پر مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کا بنایا ہوا قلعہ ہے جس کے گرد فصیل موجود ہے۔

اجمیر ہندوستان کا ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ اس شہر کی بنیاد دوسری صدی عیسوی میں راجا اجے پال نے رکھی تھی۔ آج جہاں یہ شہر آباد ہے، ماضی بعید میں اس مقام پر نہ تھا بلکہ جنوب میں پہاڑوں کے اندر بسایا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آثار قدیمہ کے شائقین جب بھی اس تاریخی بستی کو دیکھنے جاتے ہیں تو انہیں قدیم اجمیر کے کھنڈرات نظر آتے ہیں۔ ایک زمانے میں کچھ لوگوں نے یہاں کھدائی بھی کی تھی جس کے نتیجے میں بعض نادر و نایاب اشیاء دستیاب ہوئی تھیں۔ انجام کار یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ فی الواقع اس جگہ کوئی شہر آباد تھا۔ پھر ماہرین نے اسی شہر کو اجمیر کہہ کر پکارا تھا۔ محکمۂ آثار قدیمہ کے مطابق انسانی آبادی بتدریج اپنی اصلی جگہ سے ہٹتے ہٹتے بہت دور چلی گئی۔ چنانچہ اجمیر سے نو دس میل کے فاصلے پر مغرب اور شمال میں ''اجیر آباد'' نام کی ایک بستی آج بھی موجود ہے۔ یہی بستی زمانہ قدیم میں ایک بڑے شہر کا درجہ رکھتی تھی بعض تاریخی کتابوں میں اجمیر کو دیگر ناموں سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً جانگیر، جیراگ، جیمیر، آدمیر اور جلوپور وغیرہ۔

راجا اجے پال نے کوہ اراولی کے دامن میں اجمیر کی بستی بسائی تھی اور اسے اپنا پایۂ تخت قرار دے کر ایک مستقل سلطنت قائم کی تھی جب سن قوم نے وسط ایشیا سے حملہ کر کے سرزمین ہند کو پامال کرنا شروع کیا اور پھر یہ لوگ تمام پنجاب اور راجپوتانہ پر چھا گئے تو اجمیر کے راجہ نے بھی اطاعت قبول کرلی۔ اس کے ساتھ ہی وقت گزرتا رہا۔ آخر ساتویں صدی عیسوی میں اجمیر پر چوہان راجپوتوں کا قبضہ ہوگیا۔ اگرچہ راجپوت حکمراں گوجروں کے زیر اثر تھے لیکن پھر بھی اجمیر ایک آزاد ریاست تھی۔

دسویں صدی عیسوی میں تاریخ ہندوستان نے نیا رخ بدلا اور سلطان سبکتگین بت پرستوں کے علاقوں پر حملہ آور ہوا۔ بظاہر مسلمانوں کی یلغار اتنی شدید نہیں تھی مگر درپردہ وہ ایک خوفناک طوفان پرورش پا رہا تھا۔ آخر سلطان محمود غزنوی مشرکین پر قہر بن کر نازل ہوا۔ اس نے پتھر کے پجاریوں کو ایک لمحے کیلئے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا جب بھی بے شمار دیوتاؤں کے ماننے والے اپنی زندگی کیلئے سکون کی چند سانسیں فراہم کرتے تھے، محمود غزنوی کسی برق سوزاں کی طرح لپکتا تھا اور ان کے آسائش کدوں کو جلا کر خاک کر دیتا تھا۔ 1001ء میں سلطان نے اجے پال کو ذلت آمیز شکست دی۔ ہندو راجا مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ اجے پال کی زندگی کا یہ تلخ ترین تجربہ تھا پھر اسے بیڑیاں پہنا کر سلطان محمود غزنوی کے سامنے لایا گیا تو وہ ندامت کے پسینے میں نہایا ہوا تھا اور کسی مجرم کی طرح اس کی گردن خم تھی، اجے پال زیادہ دن تک طوق رسوائی کا بار نہ اٹھا سکا۔ آخر ایک روز اس نے غلامانہ زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کرلی۔ اجے پال کے بعد اس کا بیٹا آنند پال تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے باپ کا بدلہ لینے کیلئے اجین، گوالیار، کالنجر، قنوج، دہلی اور اجمیر کے منتشر حکمرانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے مسلمانوں سے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

گیارہویں صدی میں بیسل دیو اجمیر کا راجہ تھا۔ (اسی راجہ کے نام پر آج بھی اجمیر میں بیسلا موجود ہے) بیسل دیو کے عہد حکومت میں اجمیر ایک طاقتور ریاست بن کر ابھری تھی۔ 1024ء عیسوی میں سلطان محمود غزنوی نے سومنات پر حملہ کیا۔ فیصلہ کن جنگ سے پہلے اجمیر کے مقام پر بیسل دیو سے بھی سلطان کی فوجوں کا مقابلہ ہوا تھا۔ محمود غزنوی جو پورے ہندوستان کو فتح کرنے کا ارادہ لے کر گھر سے نکلا تھا، ایک معمولی راجہ اس کے حملے کی تاب کس طرح لا سکتا تھا؟ آخر ایک بڑی سی خوں ریزی کے بعد بیسل دیو کو شکست ہوئی۔ پھر جب یہ ہندو حکمراں اسیری کی حالت میں محمود غزنوی کے سامنے لایا گیا تو اس کی ذہنی کیفیت تبدیل ہو گئی۔ بیسل دیو کو یقین ہو چلا تھا کہ اب سلطان کی سیلابی قوت کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس لئے وہ اپنے آبائی مذہب سے منحرف ہو کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو گیا تھا۔ محمود غزنوی نے بیسل دیو کو مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا اگرچہ کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ مل چکی تھی لیکن بیسل دیو زندگی کے ہنگاموں سے اتنا بے زار ہو گیا تھا کہ اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ مجبوراً محمود غزنوی نے سالار ساہو کو اجمیر کا حاکم بنا دیا۔ اس واقعے کے بیس سال بعد راجپوتوں نے دوبارہ قوت پکڑ لی جس کے نتیجے میں مسلمان حاکم کو قتل کر دیا گیا۔ آزادی کی فضا میں بیسل دیو کے چھوٹے بھائی انادیو کو اجمیر کا حکمراں بنا دیا گیا۔ (آج بھی اجمیر میں تالاب اناساگر اسی راجہ کے نام سے موسوم ہے)

انادیو کے بعد پرتھوی راج چوہان تخت نشین ہوا۔ اسی راجہ کے عہد میں اجمیر نے غیر معمولی ترقی کی۔ پرتھوی راج ہی نے قلعہ تارہ گڑھ کی نا تمام عمارت کو مکمل کیا۔ اس قلعے کی بنیاد راجہ اجے پال نے رکھی تھی اور بالآخر پرتھوی راج نے اسے سنگ سرخ سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ قلعہ اپنی مضبوطی کے اعتبار سے پورے ہندوستان میں منفرد تھا۔ جنگی نقطۂ نظر سے بھی یہ قلعہ دیار ہند میں مضبوط ترین سمجھا جاتا تھا اور پورے علاقے میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں تھی۔ آج بھی قلعے کے باقی ماندہ کھنڈرات اس دعوے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

اجمیر اس زمانے میں برصغیر کے سب سے طاقتور ہندو حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ اس علاقے میں ہندوستان کی سب سے زیادہ بہادر جنگجو اور غیرت مند قوم راجپوت آباد تھی۔ راجپوتوں کی تعریف یہ ہے کہ اس قوم کے افراد مر جانا پسند کرتے تھے لیکن انہیں کسی کے آگے سر جھکانا گوارا نہ تھا۔ وقت پڑنے پر راجپوتوں کی عورتیں خود کو بھڑکتی ہوئی آگ کے حوالے کر دیا کرتی تھیں تاکہ ان کے شوہر پیچھے مڑ کر اپنے گھروں کی طرف نہ دیکھیں اور دشمن سے جنگ کرتے ہوئے ہلاک ہو جائیں۔ یہ تھا اس بت پرست قوم کا مزاج جسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ عنقریب خدا کی وحدانیت کا پیغام سنانے والے تھے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

اس وقت دہلی اور اجمیر پر پرتھوی راجہ چوہان کی حکومت تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اجمیر کے نواح میں اپنی خانقاہ تعمیر کی۔ یہ خانقاہ کیا تھی گھاس پھونس کی ایک مختصر سی جھونپڑی تھی

میں حضرت سلطان الہندؒ قیام فرما تھے۔ نماز کا مصلیٰ، پانی کا برتن اور ایک جوڑا لباس۔ یہ تھا شہنشاہ معرفت کا کل سامان۔ کچھ دن تک مقامی راجپوتوں نے آپ کے قیام کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ شروع میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو بھی ایک ایسا جوگی اور سادھو سمجھا گیا جو مکتی (نجات) حاصل کرنے کیلئے دنیا کے ہنگاموں سے دور جنگل میں آ پڑا تھا مگر جب کچھ لوگوں نے حضرت خواجہؒ کی جھونپڑی میں آ کر آپ کو قریب سے دیکھا تو یہ راز فاش ہوا کہ اس شخص کی وضع قطع ہندو سنیاسیوں سے بالکل مختلف ہے۔ پھر چہ میگوئیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ راجپوت، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو دیکھنے آتے اور دیکھتے ہی رہ جاتے۔ آپ کے نورانی چہرے میں ایک ایسی کشش تھی کہ جسے مقامی ہندو کوئی نام نہیں دے پا رہے تھے لیکن ان کے دل خود بخود اس بزرگ ہستی کی طرف کھنچے چلے جا رہے تھے۔ راجپوتوں کو یہ اندازہ تو ہو چکا تھا کہ حضرت خواجہؒ ہندو مذہب کی مختلف شاخوں میں سے کسی پر عمل کرنے والے نہیں تھے مگر چونکہ انہوں نے آج تک راجھستان کے علاقے میں کسی مسلمان کو عبادت کرتے نہیں دیکھا تھا اس لئے حضرت خواجہؒ کے مذہب کی حقیقت جاننے سے قاصر تھے۔

پھر ایک دن کچھ راجپوت آپ کی جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ذکر الٰہی میں مشغول تھے۔ راجپوت خاموشی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت خواجہؒ اپنے اوراد و وظائف سے فارغ ہو گئے۔

''تم لوگ یہاں کیسے آئے ہو؟'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے راجپوتوں سے ان ہی کی زبان میں گفتگو کی۔ راجپوت ایک غیر مقامی شخص کے لب و لہجے پر حیرت زدہ رہ گئے۔

''ہم کچھ دنوں سے یہاں جنگل میں تمہیں تنہا دیکھ رہے ہیں۔'' ایک راجپوت نے تیز لہجے میں کہا۔ اس کی آواز میں فطری سختی تھی۔ ''آج سوچا کہ تمہاری آمد کا سبب دریافت کریں۔ آخر تم کون ہو اور یہاں کس لئے آئے ہو؟''

''کیا میری وجہ سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے؟'' حضرت خواجہؒ کی آواز نرم و شیریں تھی۔

''نہیں! تم ہمیں کیا نقصان پہنچا سکتے ہو؟'' دوسرے راجپوت نے کہا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے قومی غرور و اقتدار کی جھلک نمایاں تھی۔ ''پھر بھی ہم جاننا چاہتے ہیں کہ تمہارا کس قوم سے تعلق ہے اور تم اجمیر کیوں آئے ہو؟''

''میں مسلمان ہوں اور تمہیں اپنے اللہ کا پیغام پہنچانے آیا ہوں۔'' اب کی بار حضرت خواجہؒ کے لہجے سے جلال روحانی ظاہر ہو رہا تھا۔

مسلمان کا نام سن کر راجپوت چونک پڑے۔ ان کے ذہنوں میں بے شمار پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ ''کیا تم شہاب الدین غوری کی قوم سے تعلق رکھتے ہو؟'' ایک راجپوت نے نہایت تند و تیز لہجے میں پوچھا۔ اس کے الفاظ میں ساری دنیا کی حقارتیں اور نفرتیں سمٹ آئی تھیں۔

''ہاں! وہ بھی میرا دینی بھائی ہے۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ راجپوتوں کے اس طرز

گفتگو سے سمجھ چکے تھے کہ آئندہ چند لمحوں میں کیا پیش آنے والا ہے۔ اسی لئے آپ نے بھی آواز کو بلند رکھا۔

"وہ بھی تمہارے اللہ کا پیغام لے کر یہاں آیا تھا۔" دوسرے راجپوت نے جواباً کہا۔ اس کا انداز گفتگو تحقیر آمیز تھا۔ "ہم نے غوری کو ذلت آمیز شکست دے کر وہ پیغام بھی غیر راجپوتوں کی زمین پر دفن کردیا۔"

"اللہ کا پیغام کبھی دفن نہیں ہوتا۔" حضرت خواجہؒ کے جلال میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ "تم سے پہلے یہاں کتنی قومیں آباد تھیں۔ آج تم ان کے نشان بھی تلاش نہیں کرسکتے۔ اگر ساری دنیا بھی ... ہوجائے تو خدا کی خدائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ غوری تو اپنے ہمراہ ایک لشکر جرار لے کر آیا تھا مگر ... تمہارے درمیان تنہا ہوں پھر بھی خدا کا پیغام سناؤں گا اور تمہیں وہ پیغام سننا ہوگا اگر تم اپنے کان ... کرلو گے تو تمہاری سماعتوں میں شگاف پڑ جائیں گے۔ چاہے اس کشمکش میں پورا ہندوستان زیر ... ہوجائے لیکن وہ پیغام تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر کر رہے گا۔ جاؤ اپنے دروازے بند کرلو ... دماغ پر پہرے بٹھالو مگر وہ روشنی کی لکیر آہنی دروازوں سے گزر کر بھی تم تک پہنچ جائے گی۔"

یہ ایک بڑا دعویٰ تھا اور ایک ایسے انسان کی طرف سے کیا گیا تھا جو ایک سرکش قوم کے حلقے میں ... تھا۔ راجپوتوں کو حضرت خواجہؒ کی یہ بے باکی ناگوار گزری تھی۔ "ہم اپنی زمین پر یہ سب کچھ برداشت نہیں کرسکتے۔" ایک راجپوت نے اپنے روایتی غرور کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

"یہ زمین اللہ کی ہے۔ اگر کسی انسان کی ملکیت ہوتی تو تمہارے باپ دادا موت کا ذائقہ نہ چکھتے اور اس زمین کو بھی اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتے۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا لہجہ جلالی مگر گفتگو منطقی تھی۔ "ہم سب اس زمین پر اللہ کے کرایہ دار ہیں اور عنقریب ایک ایک کرکے اس کی بارگاہ میں حاضر ہونے والے ہیں۔"

"ہم کسی اللہ کو نہیں جانتے۔" دوسرے راجپوت نے بگڑ کر کہا۔ "زمین و آسمان پر ہمارے دیوتاؤں کی حکومت ہے۔ اگر تم یہاں مزید رہنا چاہتے ہو تو تمہارے قیام کی ایک ہی صورت ہوگی ... آئندہ اپنی زبان پر اللہ کا نام نہیں لاؤ گے۔" حق کے اظہار پر یہ پہلی پابندی لگائی گئی تھی۔

"میرے لئے تو اللہ ہی سب کچھ ہے۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے چہرۂ مبارک پر ایک عجیب رنگ اُبھر آیا اور دل اپنے خالق کی بارگاہ میں جھک گیا۔ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جسے راجپوتوں کے سیاہ قلب محسوس نہیں کرسکتے تھے۔ اور اندھی آنکھیں معرفت کے اس رنگ کو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

"میں اسی کے نام سے زندہ ہوں اور تمہیں بھی اسی کے نام کی برکت سے زندہ کرنے آیا ہوں۔"

حضرت خواجہؒ کے اس جواب پر راجپوت خفا ہونے کے بجائے ہنس پڑے۔ "تمہیں اپنی زندگی کیلئے نہ اچھی غذا میسر ہے، نہ لباس، نہ مکان، پہلے خود کو تو زندہ کرلو۔" ایک راجپوت نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے تمسخر کرتے ہوئے کہا۔

"میری زندگی کیلئے ایک جوڑا لباس، چار گز زمین اور جنگلی پھل کافی ہیں۔ تم اپنی فکر کرو ...

شان و شوکت کے باوجود آنے والا وقت تمہاری سانسیں غصب کرلے گا۔ پھر تم اس دنیا میں داخل ہو جاؤ گے جہاں آگ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔" حضرت خواجہؒ نے در پردہ اپنے خدا کے پیغام کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کردی تھی مگر ابھی یہ پیغام مبہم تھا۔

"آخر تم کس اللہ کی بات کرتے ہو؟" ایک راجپوت نے کہا جو حضرت خواجہؒ کی مستقل بے باکی دیکھ کر جھنجلا گیا تھا۔ "تمہارے اللہ کا وہ کون سا پیغام ہے جو تم ہمیں سنانا چاہتے ہو؟"

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہونٹوں پر ایک دلنواز تبسم اُبھر آیا تھا۔ "اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ ہر شے سے بے نیاز ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ اس کا کوئی باپ ہے۔" حضرت خواجہؒ نے سنسکرت زبان میں سورۂ اخلاص کا ترجمہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "اللہ کو سب سے زیادہ یہ بات ناپسند ہے کہ انسان اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کی پوجا کرے۔ جن بتوں کو تم اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو وہ کس طرح عبادت کے لائق ہوسکتے ہیں؟ یہ پتھر کی مورتیاں جو اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کرسکتیں، تم کس اُمید پر ان کے آگے اپنا دامنِ مراد پھیلاتے ہو۔ یہ تو خود تمہاری محتاج ہیں کہ تم انہیں ایک مقام سے اُٹھا کر دوسرے مقام پر رکھتے ہو۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بت خانۂ اجمیر میں پہلی اذان دی تھی۔

راجپوت کی سماعتیں اس آواز سے ناآشنا تھیں۔ ایک درویش بے مایہ نے ان کے آباؤ اجداد کی رسموں کو پامال کرڈالا تھا۔ راجپوت جوش غضب میں کھڑے ہوگئے اور ان کی تلواریں بے نیام ہوگئیں۔ وہ اس مسلمان فقیر کو تہہ تیغ کردینا چاہتے تھے جو ان کے روبرو ان کے دیوتاؤں کی نفی کررہا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پہلی بار بت پرستوں کو نگاہ کرم سے دیکھا۔ ایک برق سی لہرائی۔ دیوتاؤں کی طرح راجپوتوں کی شجاعت کے افسانے بھی باطل ثابت ہوئے۔ ان کے جسموں پر لرزہ طاری ہوگیا۔ شمشیریں ہاتھ سے چھوٹ گئیں اور پھر وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے جنہوں نے آج تک میدان جنگ میں بھی کسی کو اپنی پشت نہیں دکھائی تھی۔

عجیب منظر تھا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے راجھستان کے صحراؤں میں، پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانوں میں، ہند کے قدیم بت خانوں میں اور گمراہ فرمارواؤں کے شاہی ایوانوں میں ایک ہی پیغام گونج رہا ہے۔

"حق آیا، باطل فرار ہوگیا اور باطل تو فرار ہونے ہی کیلئے ہے۔"

وہ راجپوت جو کچھ دیر پہلے تک اپنی روایتی غیرت و شجاعت کے افسانے بیان کررہے تھے، حضرت خواجہؒ کی ایک نگاہ کرم کی بھی تاب نہ لاسکے اور اس طرح فرار ہوگئے جیسے کوئی طاقتور دشمن ان کے تعاقب میں ہو۔ راجپوت سپاہیوں میں کچھ دن تک اس واقعے کا ذکر سرگوشیوں میں ہوتا رہا۔ پھر راجپوتوں کی وہی جماعت جو ایک بار پہلے بھی حضرت خواجہؒ کے جلال روحانی کی جھلک دیکھ چکی تھی۔ دوبارہ اس مرد درویش کی جھونپڑی کی طرف روانہ ہوئی۔ کچھ ساتھیوں نے انہیں مسلمان درویش کی طرف جانے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ یہ کہتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے تھے کہ اس فقیر نے

ہمارے دیوتاؤں کی توہین کی ہے، ہمارے آباواجداد کی رسموں کو برا کہا ہے، ہم اس سے انتقام لیں گے۔

راجپوت اپنے جسموں پر تلواریں سجائے اور دلوں میں نفرت وحسد کا غبار لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ اس وقت آپ نماز ظہر ادا کر رہے تھے اور سجدہ کی حالت میں تھے۔ راجپوت سرگوشیاں کرنے لگے کہ اسی بے خبری کے عالم میں حضرت خواجہؒ کا کام تمام کر دیا جائے۔ بت پرستوں نے اپنی شمشیروں کے قبضے پر ہاتھ رکھ دیئے مگر اس سے پہلے کہ وہ تلواروں کو بے نیام کرتے، حضرت خواجہؒ نے سجدے سے سر اٹھایا اور حالت قیام میں چلے گئے۔ راجپوت ایک مسلمان کے طرز عبادت کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ یہ کیسی پرستش تھی کہ پرستش کرنے والے کے سامنے نہ کوئی بت تھا اور نہ کسی طرف سے گھنٹیوں کی پرشور آواز بلند ہو رہی تھی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ باندھے اس طرح کھڑا تھا جیسے اس کا جسم ساکت ہو گیا ہو بس ہونٹوں کو ہلکی ہلکی جنبش ہو رہی تھی جیسے وہ زیرلب کسی سے باتیں کر رہا ہو۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ قیام سے رکوع میں چلے گئے۔ راجپوت اپنی اپنی جگہ مستعد کھڑے تھے پھر جیسے ہی حضرت خواجہؒ نے سجدہ ادا کرنے کیلئے زمین پر سر رکھا، تمام صنم پرستوں نے تلواریں کھینچنا چاہیں مگر وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہے۔ پوری طاقت استعمال کرنے کے بعد بھی شمشیریں بے نیام نہ ہو سکیں۔ بے چارگی کا عجیب عالم تھا۔ ایک بار پھر نامعلوم سی خوف و دہشت راجپوتوں کے دل و دماغ پر اپنا تسلط جمانے لگی۔ کچھ دیر بعد حضرت خواجہؒ نے سلام پھیرا، دعا کیلئے دونوں ہاتھ اٹھائے اور رسم بندگی سے فراغت پا کر راجپوتوں کی طرف دیکھا۔

''تمہاری مہمان نوازی کیلئے فقیر کے پاس جنگلی پھلوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اسی تبسم دلنواز کے ساتھ فرمایا جو آپ کی عادت ثانیہ بن چکا تھا۔ راجپوت پتھر کے مجسمے کے مانند خاموش کھڑے تھے۔ ''بیٹھ جاؤ! اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو اطمینان سے جمع کرو پھر جس ارادے سے آئے ہو اس پر عمل کرو۔ فقیر تو خدا کی راہ میں سربکف گھر سے نکلا ہے۔ جب چاہو خنجر آزمائی کر دیکھو۔ درویشوں کے قتل کیلئے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے کشف نے راجپوتوں کے سفاک جذبوں کا راز اس طرح فاش کر دیا تھا کہ ان کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ فرار ہوتے وقت تمام بت پرست چیخ رہے تھے۔

''یہ جادوگر ہے، بڑا جادوگر۔'' راجپوتوں کے خیال میں ایک جادوگر ہی ان کے دل کا حال جان سکتا تھا۔

اس کے بعد راجپوتوں کی وہی جماعت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خدمت میں تیسری بار حاضر ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بت پرستوں کے پیروں میں ایک زنجیر ہے اور وہ دور تک بھاگنے کے باوجود ایک فقیر کے پاس واپس آنے کیلئے مجبور ہیں۔ دراصل حضرت خواجہؒ کے اخلاق

زنجیر تھی جس نے انتہائی سرکش قوم کو اپنے حلقوں میں جکڑ رکھا تھا۔ آخر سفیر اسلام کے پیغام کو چند نافرمانوں نے سنا اور پھر اپنی آبائی رسموں کو چھوڑ کر ایک ایسے مذہب میں داخل ہو گئے جہاں دنیا کی طرح نہ کوئی بندہ تھا اور نہ کوئی بندہ نواز، جس کی نگاہ میں اچھوت، چھتری، شودر، راجپوت اور برہمن سب برابر تھے۔

کفر کے قلعے میں پہلا شگاف پڑ گیا، مذہبی اجارہ داروں کی پیشانی پر گہری لکیریں ابھر آئیں۔ نجومیوں اور کاہنوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ستاروں کی گردش میں ایک عجیب سا انتشار برپا تھا۔ پراسرار علوم کے جاننے والے حیرت زدہ تھے اور آسمان کے بروج میں کسی خوفناک انقلاب کی تصویر صاف نمایاں تھی۔

☆☆.................☆☆.................☆☆

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قیام اجمیر کے سلسلے میں ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ جب آپ اس تاریخی مقام پر تشریف لائے تو شہر سے باہر ایک طویل وعریض میدان میں درخت کے نیچے قیام کیا۔ حضرت خواجہؒ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ یہ راجہ پرتھوی راج چوہان کے اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ آپ کچھ دیر تک آرام فرماتے رہے اچانک ساربانوں کی نظر ایک ایسے درویش پر پڑی جو اپنے ظاہری حلیے کے اعتبار سے تمام جوگیوں اور سادھوؤں سے مختلف تھا۔ ساربان تیزی سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قریب آئے اور انتہائی تلخ لہجے میں کہنے لگے۔

''اے شخص! تو کون ہے اور یہاں کس لئے آیا ہے؟''

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ساربانوں کی تلخ کلامی کو نظرانداز کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میں اللہ کا ایک بندہ ہوں اور اس پیڑ کے سائے میں کچھ دیر آرام کرنے کیلئے ٹھہر گیا ہوں۔''

''یہ راجہ کے اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ یہاں کوئی دوسرا قیام نہیں کر سکتا۔'' ساربانوں کے دلوں پر آپ کی شیریں کلامی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

''یہ تو بہت بڑا میدان ہے۔ راجہ کے اونٹ بھی بیٹھ جائیں گے اور میں بھی ایک گوشے میں سما جاؤں گا۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے لہجے میں اسلام کی وہی روایتی مٹھاس تھی مگر ساربان نہیں مانے۔ ان کی غیرمہذبانہ گفتگو اب گستاخی اور بے ادبی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ حضرت خواجہؒ نے اپنا مختصرترین سامان اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

''خیر! یہ درویش تو یہاں سے اُٹھ جاتا ہے مگر اس کے بعد جو بھی یہاں آ کر بیٹھے گا، پھر اسے کوئی نہیں اُٹھا سکے گا۔''

ساربانوں نے خوب تمسخر کیا، قہقہے لگائے مگر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ان تمام باتوں سے بے نیاز ''اناساگر'' کی طرف چلے گئے۔ (یہ اجمیر کے نواح میں ایک قدیم تالاب تھا جس میں اعلیٰ ذات کے ہندو غسل کیا کرتے تھے۔ حضرت خواجہؒ کی تحریک کی کامیابی کے بعد یہ تالاب مسلمانوں کے استعمال میں آنے لگا۔ اناساگر حضرت خواجہؒ کے مزار مبارک سے چار پانچ میل کے فاصلے پر واقع

ہے۔ عرس مبارک کے دنوں میں اس پختہ تالاب کے کنارے کنارے ہزاروں مسلمان وضو کر
آتے ہیں۔ ماضی کے حکمرانوں نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ ان کی جاگیر اتنی آسانی سے مسلمانوں
قبضے میں چلی جائے گی۔)

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے تشریف لے جانے کے بعد شام کے قریب پرتھوی
چوہان کے اونٹ گھاس چرتے ہوئے میدان میں داخل ہوئے اور رات گزارنے کیلئے زمین
گئے صبح ہوئی تو حسب معمول ساربان آئے اور جب انہوں نے اونٹوں کو اٹھایا تو وہ اپنی جگہ
بھی نہ کر سکے۔ ساربانوں نے دوبارہ کوشش کی مگر ناکام رہے۔ پھر تو بے گناہ جانوروں پر کوڑے
برسنے لگے یہاں تک کہ بعض اونٹ لہولہان ہو گئے لیکن زمین سے نہ اٹھ سکے۔ معصوم اور بے زبان
حیوانوں پر تشدد کے تمام حربے آزمانے کے بعد ساربانوں کو مسلمان درویش کے الفاظ یاد آئے
انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ اسی فقیر کی بددعا کا نتیجہ ہے اس احساس کے ساتھ ہی ساربانوں
کے ہوش اڑ گئے پھر ان لوگوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سمراٹ پرتھوی راج چوہان کو تمام حالات
سے آگاہ کر دیا جائے۔

جب ساربانوں نے دہلی اور اجمیر کے حاکم کو یہ واقعہ سنایا تو وہ سوچ میں پڑ گیا، پھر اس نے
خدمت گاروں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''یقیناً تم لوگوں نے کوئی زیادتی کی ہوگی ورنہ یہ سادھو سنت تو بہت رحم دل ہوتے ہیں۔ اب
اونٹ اسی کی دعا سے اٹھیں گے، جس کی بددعا سے زمین نے انہیں پکڑ لیا ہے، جاؤ! اس سادھو
معافی مانگو!''

پرتھوی راج چوہان کا حکم سنتے ہی ساربان، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی تلاش میں نکلے
دیر بعد ان لوگوں نے دیکھا کہ آپ ''انا ساگر'' کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھے
ساربانوں نے قریب جا کر دست بستہ معافی مانگی حضرت خواجہؒ نے فرمایا۔

''اچھا جاؤ! زمین تمہارے اونٹوں کو چھوڑ دے گی۔''

ساربان اپنی مذہبی رسم کے مطابق حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پاؤں چھو کر واپس آ
ان کے اُونٹ میدان میں اِدھر اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔

یہ سرزمین اجمیر پر حضرت خواجہؒ کی دوسری کرامت تھی۔ جب ساربانوں نے اپنے ہم مذہب
کے سامنے اس واقعے کو دہرایا تو مقامی باشندوں میں سنسنی پھیل گئی۔ اس وقت سارا ہندوستان
پرستی اور جادوگری کے دام میں اسیر تھا۔ بیشتر لوگوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اس کرامت
کا ذکر سن کر کہا۔

''وہ بڑا ساحر ہے۔ آؤ چل کر اس کے ساحرانہ کمالات دیکھیں۔''

اجمیر کے باشندے قطار در قطار حضرت خواجہؒ کو دیکھنے کیلئے آنے لگے مگر وہاں نہ کوئی جادوگری
نہ شعبدہ بازی، بس ایک شگفتہ مسکراہٹ تھی جس نے آگ میں پھول کھلا دیئے تھے۔ ایک

دیکھ کر پتھروں کے دل پانی ہوئے جاتے تھے۔ اس ہجوم میں وہ راجپوت بھی شامل تھے جو
تما جسے دیکھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قتل کی منصوبہ سازی کرتے کرتے فرار ہو گئے تھے مگر اب ان کیلئے
تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ مجبوراً انہوں نے حضرت خواجہ کے قدموں پر اپنے سر رکھ دیئے اور ایک
فقیر بے سروساماں کا چہرہ دیکھ کر باپ دادا کے عقائد کی جمع کردہ تمام دولت لٹا دی۔ اجمیر کے ہزاروں
باشندوں نے اپنی آنکھوں سے یہ عجیب منظر دیکھا کہ صدیوں کے بت پرست چند لمحوں میں ایک
نادیدہ ہستی کی وحدانیت پر ایمان لے آئے تھے۔ اگرچہ اس وقت ایمان لانے والوں کی تعداد
انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ کفر کی سنگی دیواریں چٹخنے لگی تھیں اور ان میں
ایک ہلکا سا شگاف نظر آنے لگا تھا۔

پتھر کے پجاریوں کے لئے یہ بڑی لرزہ خیز خبر تھی۔ ہندوؤں کے لاکھوں معبود مل کر بھی ایک ان
دیکھے خدا کے پرستار کو نہ روک سکے۔ پروہتوں کے چہروں پر نفرتوں کی سرخی اُبھر آئی، برہمن غضب
ناک ہو گئے اور دیوتاؤں کے نام لیوا پیچ و تاب کھانے لگے۔ ہر طرف ایک حشر برپا تھا۔ ہندو دھرم
کے رکھوالے مندروں میں جمع ہوئے، نیا مذہب قبول کرنے والوں کو طلب کیا گیا۔

''آخر تمہیں اس اجنبی کے پیغام میں کیا کشش محسوس ہوئی؟'' ...... یہ حضرت خواجہ معین الدین
چشتیؒ کی طرف اشارہ تھا...... ''تم نے اس کے خدا کو دیکھا ہے؟ ...... یہ برہما، یہ وشنو، یہ شنکر، تمہیں کوئی
بھی نہ روک سکا۔ کیا تمہارے آبا و اجداد دیوانے تھے؟''

''ہم کچھ نہیں جانتے!'' مسلمان ہونے والے راجپوتوں نے بیک زبان کہا...... ''ہمارے دل
نے گواہی دی کہ وہ سچ بولتا ہے، بس ہم اپنے دل سے مجبور ہو گئے۔'' یہ ایک مختصر سا جواب تھا، مگر
برہمنوں کی منطق کے دفتروں پر بھاری تھا۔

پجاریوں نے ان سے مزید بحث نہیں کی۔ دنیا کے ہر جابرانہ نظام کی طرح نومسلم راجپوتوں کو بھی
پیشکش کی گئی کہ اگر وہ اپنے گمراہ کن اور باغیانہ خیالات سے باز آ جائیں تو ان پر سیم و زر کی بارش کی
جا سکتی ہے، مگر وہ مکمل باغی تھے، اس لئے برہمنوں کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ پھر ان سے کہا گیا کہ اگر وہ
اپنے مذہب میں دوبارہ داخل نہیں ہوئے تو زندگی کی ساری رعایتیں چھین لی جائیں گی اور ان پر
راجستھان کی زمین تنگ کر دی جائے گی...... مگر باغی راجپوت ان دھمکیوں سے بھی متاثر نہیں ہوئے۔
بالآخر انہیں برادری سے خارج کر دیا گیا۔

کچھ عاقبت نااندیشوں نے راجہ پرتھوی راج چوہان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ باغیوں کی اس
مختصر تعداد کو قتل کر کے ہمیشہ کے لئے اسلام کے خطرے سے نجات حاصل کر لی جائے۔ پرتھوی راج
فطری طور پر ایک ذہین اور مدبر حکمراں تھا۔ اس نے مشیروں کی یہ تجویز قبول نہیں کی۔ اس علاقے میں
تمام راجپوت کسی نہ کسی عنوان سے ایک دوسرے سے تعلق رکھتے تھے، ان کی آپس میں رشتہ داریاں
تھیں۔ اگر باغی راجپوتوں کو قبول اسلام کے جرم پر تہہ تیغ کر دیا جاتا تو یہ ایک انتہائی سزا ہوتی جس
کے نتیجے میں قتل ہونے والوں کے رشتہ داروں پر برے اثرات مرتب ہوتے اور پھر اس طرح متحد

راجپوتوں کی صف میں شگاف پڑ سکتا تھا۔ اس مصلحت کے پیش نظر پرتھوی راج نے باغیوں سے گریز کیا اوران پر معاشی پابندیاں عائد کردیں۔

اب خدائے واحد کے نام لیوا اپنے معاشرے کیلئے اجنبی ہوکر حضرت خواجہ معین الدین کے قدموں میں آ پڑے تھے۔ جب کبھی انہیں اپنے گھروں کے آزاد ماحول کی یاد آتی تو وہ ہوجاتے۔ حضرت خواجہؒ اپنے ہم مذہبوں کی یہ حالت دیکھ کر فرماتے۔

"تم لوگوں کا یہ اضطراب محض عارضی ہے جو اللہ کی راہ میں گھر سے بے گھر ہو گئے وہ عنقریب عظیم الشان فتح سے ہمکنار ہوں گے۔ ذلت آمیز شکست تمہارے دشمنوں کا مقدر ہے۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ آسمان کا فیصلہ زمین پر نازل ہونے ہی والا ہے۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی یہ اثر انگیز تقریر سن کر راجپوتوں کے بے قرار دل ٹھہر جاتے اور وہ خدا لاشریک کا نام لے کر ایک ایسی لذت کا احساس کرنے لگتے جس سے وہ کل تک آشنا نہیں تھے۔

پرتھوی راج چوہان اور دیگر امرائے سلطنت کے سخت احکام کی بنیاد پر مسلمان ہوجانے والے راجپوتوں کیلئے معاشی زندگی کا دائرہ تنگ کردیا گیا تھا۔ حکومت اور برسراقتدار طبقے کا خیال تھا کہ راجپوتوں کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک کرنے کے بعد وہ ان لوگوں کو خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے جو حضرت خواجہؒ کی کرامت سے بہت زیادہ متاثر نظر نہیں آرہے تھے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ جسموں پر پابندیاں لگیں تو دل پہلے سے زیادہ آزاد ہوگئے، زبانوں پر مہریں لگائی گئیں تو ذہن کچھ زیادہ سرکش ہوگئے۔

جاسوسوں نے پرتھوی راج کو خبر دی کہ معتوب راجپوت نیا مذہب قبول کرنے کے بعد بہت زیادہ خوش نظر آتے ہیں۔

"پابندیاں مزید سخت کردی جائیں۔" پرتھوی راج چوہان نے دوسرا حکم جاری کیا۔

اس دوران حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے چند خادم ملتان اور لاہور چھوڑ کر اجمیر چلے آئے تھے۔ نتیجتاً خدا پرستوں کی تبلیغ نے نیا رنگ اختیار کرلیا تھا۔ پرتھوی راج کی طرف سے اجازت ملتے ہی وزیر مملکت نے نئی منصوبہ سازی کی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا ایک خادم اپنے پیرومرشد کے وضو کیلئے اناساگر سے پانی لینے گیا تو وہاں خلاف معمول راجپوت سپاہیوں کی بھیڑ نظر آرہی تھی۔ حضرت خواجہؒ کے خدمت گار نے ان لوگوں کو یکسر نظر انداز کرکے تالاب سے پانی بھرنا چاہا، لیکن پرتھوی راج کے سپاہیوں نے اسے کہہ کر روک دیا۔

"اب تم اچھوت لوگ اس تالاب کو اپنے گندے ہاتھوں سے ناپاک نہیں کرسکتے۔ اگر پانی چاہیے ہو تو کوئی اور جگہ تلاش کرو۔"

"پانی تو جانوروں پر بھی بند نہیں کیا جاتا۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خادم نے نہایت شائستہ لہجے میں کہا۔

"ہاں!......ہم لوگ جانوروں پر پانی بند نہیں کرتے، مگر تم حیوانوں سے بھی بدتر ہو۔" پرتھوی راج چوہان کے سپاہیوں نے انتہائی نفرت آمیز لہجے میں حضرت خواجہؒ کے خدمت گار کو جواب دیا۔

اتمام حجت کے طور پر آپ کے خادم نے راجپوت سپاہیوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی، مگر وہ طاقت اور اکثریت کے نشے سے سرشار تھے اس لئے انسانیت اور تہذیب کی زبان سے نکلنے والا کوئی لفظ بھی ان کے دماغوں پر اثر انداز نہیں ہورہا تھا۔ خادم مجبوراً واپس چلا گیا اور اپنے پیرومرشد سے تمام واقعہ بیان کیا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے خادم کی گفتگو غور سے سنی اور کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ مسلمانوں کی یہ مختصری جماعت اپنے شیخ کی خاموشی پر دم بخود تھی، انہیں بھی اس بات سے شدید اذیت پہنچی تھی کہ پرتھوی راج پست حرکتوں پر اتر آیا تھا اور جس کے نتیجے میں ان کے پیرومرشد وضو کے پانی سے بھی محروم ہوگئے تھے۔ راجپوت مسلمان اپنی ناطاقتی اور بے سروسامانی پر پیچ وتاب کھا کر رہ گئے۔

حضرت خواجہؒ نے اپنے عقیدت مندوں کو صبر کی تلقین فرمائی، پھر اسی خادم کو جو کچھ دیر پہلے پانی لینے جاچکا تھا، اپنے استعمال کا برتن دیتے ہوئے کہا۔

"راجہ کے سپاہیوں سے کہنا کہ آج اس مختصر سے برتن میں پانی بھر لینے دیں، اس کے بعد ہم کوئی دوسرا انتظام کرلیں گے۔"

خادم حکم پاتے ہی دوبارہ "اناساگر" کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب راجپوت سپاہیوں نے اسے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو وحشیوں کی مانند قہقہے لگانے لگے۔ خادم نے قریب پہنچ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے الفاظ دُہرا دیئے۔ خادم کا لہجہ ایک درخواست گزار کا لہجہ تھا اس لئے راجپوت کچھ دیر تک مسلمان کی بے چارگی اور اپنی برتری کے احساس سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پھر ایک سپاہی نے بڑی حقارت سے کہا۔

"جا......! آج تو تجھے ہم نے پانی کے چند قطرے بخش دیئے، مگر کل اِدھر کا رخ نہ کرنا۔"

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا خادم بڑے سکون سے تالاب کے کنارے پہنچا اور اس نے اپنے پیرومرشد کے استعمال کا برتن پانی سے بھرلیا۔ چند لمحوں کی بات تھی۔ راجپوت سپاہیوں کے ساتھ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خادم پر بھی حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ "اناساگر" کا پانی ایک چھوٹے سے برتن میں سمٹ آیا تھا۔ کچھ دیر پہلے جس پانی پر طاقت کے ذریعے پابندیاں لگائی جارہی تھیں، اس کی حقیقت ظاہر ہوچکی تھی۔ راجپوت سپاہی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس تالاب کو دیکھ رہے تھے جس سے کل تک پورا علاقہ سیراب ہورہا تھا اور اب اس میں پانی کا ایک قطرہ بھی موجود نہیں تھا۔ راجپوتوں کے بقول یہ جادوگری کا ایک عظیم الشان مظاہرہ تھا۔ اگرچہ راجھستان کی پوری سرزمین ساحروں سے بھری ہوئی تھی، لیکن پھر بھی ہندو ساحروں کے بقول مسلمان فقیر کا جادو ان سب پر حاوی تھا۔ یہ ناقابل منظر دیکھ کر پرتھوی راج کے سپاہیوں پر اس قدر دہشت طاری ہوئی کہ وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ خود حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا خادم بھی لرزتے قدموں سے واپس

آیا اور کانپتے لہجے میں تمام واقعہ سنانے لگا۔ آج اسے پہلی بار اپنے پیرومرشد کی روحانی اندازہ ہوا تھا۔

''وہ کیسی ناپائیدار چیز پر جھگڑا کر رہے تھے۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے انتہائی لہجے میں خدا پرستوں کی اس مختصر سی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''جس تالاب قدرت خداوندی سے اس فقیر کے کوزے میں سمٹ آیا ہے، وہ خشک بھی ہو سکتا تھا۔ اگر اس کا خالق سمندر کو بھی سوکھ جانے کا حکم دے تو اسے اس کے ارادے سے کون باز رکھ سکتا ہے؟''

حضرت خواجہؒ کی ایمان افروز گفتگو سن کر مسلمان راجپوتوں کے افسردہ چہرے شاداب ہو ہونٹوں کی گم شدہ مسکراہٹ لوٹ آئی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انہوں نے پرتھوی راج طاقتور فوجوں سے اپنی شکست کا انتقام لیا ہو۔

پورے اجمیر میں ہنگامہ برپا تھا جس نے بھی ''اناساگر'' کے خشک ہونے کی خبر سنی حیران کوئی بھی اس محیر العقول واقعہ پر یقین کرنے کیلئے آمادہ نہیں تھا، لیکن جب شہر کے باشندے کے کنارے جمع ہوئے تو انہیں اس خبر پر اعتبار کرنا پڑا کہ صدیوں پرانا ذخیرۂ آب ختم ہو چکا ہے۔ سپاہیوں نے اپنی آنکھوں سے ''اناساگر'' کو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے کوزے میں سمٹتے تھا، وہ وحشت زدہ سے پرتھوی راج کے سامنے کھڑے تھے اور گریہ وزاری کے انداز میں اپنے حکم سے کہہ رہے تھے۔

''مہاراج! ہم شرمندہ ہیں کہ آپ کے حکم کی تعمیل نہ کرسکے، لیکن اس کوتاہی میں ہمارے ارادے کوئی دخل نہیں تھا، وہ سادھو اتنا بڑا جادوگر ہے کہ ہماری شمشیریں تک بے نیام نہ ہو سکیں، ہمارے ہوش وحواس، دست و بازو، جوش وخروش، عزم وشجاعت سب اس کے طلسم کے زیر اثر تھے۔ ہم جگہ سے جنبش تک نہ کر سکے۔ اے راجپوتوں کے عظیم سردار! ہمیں معاف کر دیجئے کہ ہم بے ہیں۔'' راجپوتوں کی آواز خوف و دہشت سے لرز رہی تھی۔

خود پرتھوی راج بھی یہ اطلاع پا کر سراسیمہ ہو گیا تھا، مگر وہ ان سپاہیوں کی موجودگی میں اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کچھ دیر خاموش رہا...... پھر اناساگر پر متعین فوجیوں کو سست کہہ کر دربار سے رخصت کر دیا اور دوسرے ہی لمحے اپنے چند راز دار مشیروں کو لے کر خلوت چلا گیا۔ پرتھوی راج ایک مسلمان فقیر کے بڑھتے ہوئے اثرات سے خائف تھا۔ اس نے فوری اس مشکل کا حل تلاش کرنا چاہا، لیکن مشیروں نے اسے صبر وضبط کی تلقین کی۔ ان کے خیال میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کا مقابلہ صرف ہندوستان کے بڑے جادوگر ہی کر سکتے تھے اور اس واقعہ چشم پوشی کرنی چاہئے تھی تاکہ مسلمان فقیر اپنی روحانی طاقت کے سلسلے میں حد سے زیادہ خود اعتما شکار ہو جائے اور پھر عالم بے خبری میں ساحروں کے ذریعے اس کا کام تمام کر دیا جائے۔ پرتھوی کو اپنے مشیروں کی یہ تجویز پسند آئی اور اس نے فوری طور پر حضرت خواجہؒ کی خدمت میں معزز ایک وفد روانہ کر دیا۔

اجمیر کے چند سربرآوردہ افراد نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے سپاہیوں کے گستاخانہ رویے پر معافی مانگی اور اس کے ساتھ درخواست کی کہ اناساگر کی سابقہ حالت بحال کر دی جائے ورنہ بہت سے انسان پیاسے مر جائیں گے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کافروں کی اس شرارت سے باخبر تھے، مگر آپؒ نے اسلام کی رواداری اور صلۂ رحمی کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''یہ تو حق کے نافرمانوں کیلئے ایک ہلکی سی تنبیہہ تھی ورنہ ہمارا مذہب تو کسی کتے کو بھی پیاس سے تڑپتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔'' یہ کہہ کر آپؒ نے خدام کو حکم دیا ''برتن کا پانی تالاب میں واپس ڈال دیا جائے۔''

خادم اپنے پیرومرشد کے حکم کی تعمیل کیلئے اناساگر کی طرف روانہ ہوا اور آپؒ نے راجپوت قوم کے نمائندوں سے دوبارہ فرمایا۔ ''قدرت بار بار سرکشوں کو مہلت نہیں دیتی، اس سے پہلے کہ تمہارے آباؤ اجداد کی زمین تم پر تنگ ہو جائے، بت پرستی کو چھوڑ کر خدائے واحد پر ایمان لے آؤ ورنہ آگ دوزخ کی بھڑکتی ہے سزا کے واسطے۔''

راجپوتوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ یہ کوئی احساس ندامت نہیں تھا، دراصل وہ حضرت خواجہ چشتیؒ سے نظر ملاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ بھی اپنے دوسرے ہم مذہبوں کی طرح مسلمان فقیر کے جادو کا شکار نہ ہو جائیں۔ حضرت خواجہؒ اپنا فرض پورا کر چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی زمین پر فساد برپا کرنے والوں نے محبت کا یہ پیغام سنا، مگر ان کی نفرتیں کچھ اور شدید ہو گئیں۔ پھر وہ اپنے سینوں میں سازش و انتقام کی آگ روشن کئے ہوئے چلے گئے۔

☆☆..............☆☆..............☆☆

پھر جب وہ لوگ واپسی میں اناساگر کے قریب سے گزرے تو پہلے کی طرح پورا تالاب پانی سے بھرا ہوا تھا۔ بت پرستوں کے ذہن جلنے لگے اور وہ اسی حالت میں پرتھوی راج کے سامنے حاضر ہوئے اور اپنے حکمران کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔ دوبارہ تنہائی میں مشورے ہونے لگے۔ پھر بہت غور وفکر کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے مقابلے کیلئے شادی دیو کا انتخاب کیا گیا۔ شادی نام کا ایک دراز قامت اور تنومند جادوگر اجمیر کے سب سے بڑے مندر کا پجاری تھا۔ اپنے طاقتور جسم اور ساحرانہ کمالات کے باعث ایک دیو کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ آس پاس کے علاقوں میں شادی دیو کے نام سے مشہور ہو گیا۔ پرتھوی راج نے اس نازک مرحلے پر شادی دیو کو طلب کر کے ہندو مذہب کو درپیش خطرات کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اس سے درخواست کی کہ وہ اپنے جادو کی بے پناہ طاقت کے سہارے دیوتاؤں کی بستی کو مسلمانوں کے وجود سے پاک کر دے۔

شادی دیو نے اپنے سفلی علوم کے ذریعے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا روحانی مقام جاننے کی کوشش کی۔ کئی دن کی محنت کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمان فقیر کو آسانی سے شکست نہیں دی جا سکتی۔ شادی دیو نے اپنے تابع شیاطین کو طلب کیا۔ ایک شیطان نے اس سے سرگوشی کی۔ شادی دیو کے چہرے پر مسرت وشادمانی کے گہرے سائے رقص کرنے لگے اس نے پرتھوی راج کو خوشخبری

سنائی کہ بالآخر وہ مسلمان درویش پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ حکومت نے چین کی سانس
اور شادی دیو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

شادی دیو نے مختصر سے عرصے میں اپنے چیلوں کو نئے منتر سکھائے اور پھر ساحروں کی فوج لے کر اس طرف بڑھا جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ قیام فرما تھے، جیسے ہی وہ جادوگروں کی یہ جماعت حق پرستوں کے قریب پہنچی تو وہ راجپوت جو نئے نئے حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے کچھ گھبرا گئے۔ ان لوگوں نے ڈرتے ڈرتے حضرت خواجہؒ سے کہا۔ "وہ آ رہے ہیں، انہیں روکیے۔"

"وہ پہلے بھی آئے تھے اور ناکام ہو کر چلے گئے تھے۔ اب ان کی دوبارہ آمد سے ہمارے کاموں میں کیا خلل پڑے گا؟" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اطمینان سے فرمایا اور نماز میں مشغول ہو گئے۔

شادی دیو نے اپنا جنگی منصوبہ اس طرح ترتیب دیا تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی بہت دور سے ظلم پڑھتے ہوئے حضرت خواجہؒ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک خاص فاصلے پر تمام جادوگر ٹھہر گئے۔ شادی دیو نے ان سے آگے بڑھنے کیلئے کہا مگر اس کے چیلے یہ کہہ رہے تھے کہ یہاں سے آگے جانے کی ان میں طاقت نہیں ہے۔ دراصل وہ یہ چاہتے تھے کہ شادی دیو مسلمانوں پر حملہ آور ہو اور وہ اس کی مدد کیلئے پچھلی صف میں رہ کر اپنے جادو کا استعمال کرتے رہیں۔ شادی دیو اپنی ساحرانہ قوت کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا اس لئے وہ بے اختیار آگے بڑھا اور ساتھ ہی اپنے پیروکاروں کو ہدایت کرتا گیا کہ وہ مسلسل منتروں کا ورد کرتے رہیں۔ اس طرح جو مسلمان اس کے حملے سے فرار ہو کر اس طرف آئے گا جل کر راکھ ہو جائے گا۔ عجیب منصوبے تھے اور عجیب خوش فہمیاں تھیں۔

من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال
(میں کس خیال میں اُلجھا ہوا ہوں اور آسمان کیا سوچ رہا ہے)

شادی دیو حالت قہر میں اپنے ساحرانہ کمالات کا مظاہرہ کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں اور منہ سے بھڑکتے ہوئے شعلے نکل رہے تھے۔ یہ ایک پُر ہول منظر تھا اور اس کی ہولناکی میں شادی دیو کی گرجدار آواز نے مزید اضافہ کر دیا تھا۔

"مسلمان سن لیں کہ ان کی موت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ جب تک میں خاموش رہا، تم عافیت میں رہے..... مگر آج میں نیند سے جاگ گیا ہوں اور میری یہ بیداری دیوتاؤں کے دشمنوں کو ہلاک کر ڈالے گی۔" شادی دیو اس قسم کی لاف زنی کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا لیکن ابھی اس نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ وہ اچانک رک گیا۔ اس کے منہ اور آنکھوں سے نکلنے والے شعلے یکا یک بجھ گئے۔ شادی دیو چند لمحوں تک حیرت زدہ کھڑا رہا۔ پھر اس نے چیختے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر اپنے جسم کو جنبش تک نہ دے سکا۔ دوسری بار چیخنا چاہا تو زبان بھی ساکن ہو گئی۔ شادی دیو کے ساتھی جادوگر اپنے گرو کی اس خاموشی کو کسی نئی حکمت عملی سے تعبیر کر رہے تھے اور خود زور زور سے ان منتروں کو پڑھ رہے تھے جن کی انہیں ایک طویل عرصے تک مشق کرائی گئی تھی۔

اس دوران حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ جب مریدوں نے شادی دیو اور اس کے ساتھیوں کے حملے کی اطلاع دی تو آپ اپنی خانقاہ سے باہر تشریف لائے۔ کچھ فاصلے پر شادی دیو ساکت و جامد کھڑا تھا۔ حضرت خواجہؒ نے اسے ایک نگاہ جلال سے دیکھا۔ شادی دیو کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ بلند آواز میں "رحیم رحیم" پکارنے لگا۔ صدیوں سے "رام رام" کرنے والی بت پرست جماعت کا ایک باکمال فرد اپنی آبائی زبان بھول گیا تھا اور ایک ایسے کلمے کو بار بار دہرا رہا تھا جس سے کچھ دیر پہلے تک اس کے ہونٹ نا آشنا تھے۔

جب شادی دیو کے شاگردوں نے اپنے استاد کا یہ حال دیکھا تو غصے سے بے قابو ہو گئے اور شدید وحشت کے عالم میں ہذیان بکنے لگے۔ پھر انہیں جس قدر نازیبا الفاظ یاد تھے وہ سب کے سب شادی دیو کے نام کے ساتھ چسپاں کر دیئے۔ شادی دیو بہر حال اپنی قوم کا معزز ترین فرد تھا۔ اس لئے دشنام طرازی برداشت نہ کر سکا۔ آگے بڑھنے کے بجائے وہ پیچھے کی طرف پلٹا اور جو لکڑی اور پتھر اس کے سامنے آیا وہ اپنے شاگرد جادوگروں پر برسانے لگا۔ یہ بڑی خوفناک تبدیلی تھی۔ اہل باطل کی ساری تدبیریں خود انہی پر اُلٹ دی گئی تھیں۔ شادی دیو نے اپنے کئی ساتھیوں کو ہلاک کر ڈالا اور جو باقی بچے تھے وہ فرار ہو گئے۔

شادی دیو کا جنون بڑھتا جا رہا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس کی بگڑتی ہوئی کیفیت دیکھی تو اپنے ایک خدام کے ہاتھ پانی کا ایک پیالہ بھر کر بھیجا۔ جیسے ہی شادی دیو نے وہ پانی پیا کفر کی ساری تاریکیاں دل و دماغ سے مٹ گئیں اور وہ بڑے عقیدت مندانہ انداز میں حضرت خواجہؒ کی قدم بوسی سے سرفراز ہوا۔ خدا پرستوں کی صف میں ایک اور کلمہ گو کا اضافہ ہو گیا تھا۔ دوسری طرف کفر کے قلعے میں ایک اور گہرا شگاف پڑ گیا تھا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

جب پرتھوی راج چوہان نے ہندو دھرم کے رکھوالوں کی تازہ شکست کا احوال سنا تو اس کے ماتھے پر بے شمار شکنیں اُبھر آئیں اور وہ قہر آلود لہجے میں اپنے مشیروں سے کہنے لگا۔ "میں آخر کب تک اس آفت ناگہانی کو برداشت کرتا رہوں گا۔ اگر پہلے ہی میری تجویز پر عمل کر لیا گیا ہوتا تو آج ذلت و رُسوائی کے یہ مناظر سامنے نہ آتے۔ بس اب میرے صبر و ضبط کی انتہا ہو چکی ہے۔ اسی وقت فوج کو حکم دو کہ ان مٹھی بھر بھکاریوں کا نام و نشان مٹا کر راجپوتوں کی دھرتی کو پاک کر دے۔" پرتھوی راج اس طرح بول رہا تھا جیسے میدان جنگ میں اعلیٰ نسل گھوڑا زخمی ہو کر بے لگام ہو جائے۔

مشیروں نے بڑے تدبر سے، پہلے اپنے حکمراں کا غصہ ٹھنڈا کیا اور پھر مسلمانوں سے نجات پانے کیلئے نئی تجویز پیش کی۔ "شادی دیو کے ذریعے ہم نے اپنی جنگ کا آغاز کیا تھا۔ ابھی یہ معرکہ اپنے انجام کو نہیں پہنچا ہے۔ ابھی ہمارے ترکش میں کئی زہریلے تیر باقی ہیں۔ جب تک جوگی جے پال زندہ ہے، ہمیں اپنی فتح سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔"

جوگی جے پال کا نام سنتے ہی پرتھوی راج کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ جوش غضب میں

اس عظیم جادوگر کو بھول گیا تھا جس سے خود اسے بھی بڑی عقیدت تھی۔ پرتھوی راج نے فوری طور جے پال سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور کچھ دیر بعد ہی چند تیز رفتار سپاہی اپنی اُمید کے آخری کی طرف دوڑ رہے تھے۔ جوگی جے پال اجمیر کے مضافاتی علاقے میں رہتا تھا اسے سحر و طلسم مہارت حاصل تھی کہ پورے ہندوستان میں جے پال کا کوئی دوسرا حریف موجود نہیں تھا۔ ہزار جادوگر اس کے شاگرد تھے۔

جوگی جے پال جیسے ہی پرتھوی راج کے کمرے میں داخل ہوا، اجمیر کا حکمران اپنی نشست کر اس کے قدم چومنے کیلئے آگے بڑھا۔ جے پال نے جواب میں پرتھوی راج کو صحت و زند مسرت و کامرانی کا آشیرواد دیا۔ پھر اس نے بے وقت طلبی کا سبب پوچھا۔ پرتھوی راج نے حض خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آمد سے شادی دیو کی شکست تک کے واقعات تفصیل سے سنا دیئے۔ جے پال کو حضرت خواجہؒ کی روحانی عظمت کا اندازہ نہیں تھا اس لئے نہایت کبر و غرور کے انداز کہنے لگا۔

''پورے ہندوستان میں میرے علم کی حکومت ہے۔ میں یہاں بیٹھے بیٹھے جسے چاہوں ا عہدے سے معزول کر دوں اور جسے چاہوں اقتدار سونپ دوں۔ مجھے خود اپنی غفلت پر افسوس ہے میں گرد و پیش سے بے خبر رہا اور ایک مسلمان فقیر نے میری مملکت میں اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا؟'' کہتے کہتے جوگی جے پال جوش غضب سے کانپنے لگا۔ ''آج مسلمانوں کا اس زمین پر آخری دن ہے میں انہیں ایسا سبق دوں گا کہ پھر کبھی کوئی اچھوت اس پوتر استھان (مقدس مقام) کا رخ نہیں کر گا۔'' جوگی جے پال کا تکبر اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ وہ پرتھوی راج کے خلوت کدے سے اس طرح جیسے واقعتاً پورا ہندوستان اس کے زیر نگیں ہو اور وہ ایک نافرمان غلام کو سخت ترین سزا دینے جا رہا ہو۔

جوگی جے پال نے پہلے اپنے شاگردان خاص کو حکم دیا کہ وہ مسلمان فقیر اور اس کے خدمت گاروں کا کام تمام کر ڈالیں۔ اس ہدایت کے ملتے ہی تقریباً پانچ سو جادوگروں نے بیک وقت ساحرانہ کمالات کا آغاز کیا۔ ناگہاں باشندگان اجمیر نے دیکھا کہ پہاڑیوں سے آگ کے شعلے ہوئے اور یہ شعلے تیزی سے اس طرف سفر کرنے لگے جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تھے۔ پرتھوی راج اور اس کے درباری، جادوگروں کی اس شعبدہ بازی سے مطمئن نظر آ رہے انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ یہ آگ حضرت خواجہؒ تک پہنچتے سے پہلے ہی بجھ جاتی تھی۔ اپنے اس ناکامی کے بعد جوگی جے پال کے چیلوں نے لاکھوں سانپ پیدا کر دیئے جو پھن اٹھائے ہوئے طرح بڑھے جیسے مسلمانوں کے جسموں میں اپنا زہر داخل کر کے انہیں ہلاک کر ڈالیں گے لیکن کے ذریعے پیدا ہونے والے ان سانپوں کا بھی وہی حشر ہوا جو کچھ دیر پہلے بھڑکتی ہوئی آگ کا تھا۔ تمام سانپ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قریب پہنچ کر سر پٹکتے تھے اور دوسرے غائب ہو جاتے تھے۔ جادو کے دونوں خوفناک ترین مظاہروں کی ناکامی کے بعد شاگردوں نے کے سامنے اعتراف شکست کر لیا۔

جوگی جے پال کو آج تک نامرادی اور بے چارگی سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اس لئے شدید حالت غضب میں اپنے چیلوں کو برا بھلا کہتا ہوا حضرت خواجہؒ کی طرف بڑھا۔ اس وقت وہ اکیلا تھا۔ جب مسلمان راجپوتوں نے جے پال کو آتے ہوئے دیکھا تو پیر و مرشد سے عرض کرنے لگے۔

''یہ تمام ساحروں کا گرو اور پرتھوی راج کی اُمیدوں کا آخری سہارا ہے۔''

جواب میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ ''جس خدا نے دوسرے جادوگروں کو تحقیر آمیز شکست دی ہے وہی جے پال کو بھی ذلیل و رسوا کرے گا۔'' ابھی آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے کلمات کی گونج باقی تھی کہ جے پال نزدیک آ گیا۔

''میں جوگی جے پال ہوں۔'' اس نے آتے ہی اپنا تعارف کرایا اور بلند بانگ دعوے شروع کر دیئے۔ ''ہندوستان کے تمام دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں اور شہروں پر میری حکومت ہے۔ اس سے پہلے کہ میں تم بے یار و مددگار لوگوں پر آسمانی قہر کی طرح نازل ہو جاؤں۔ بہتر ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہیں فرار کیلئے راستہ دے دوں گا اور اب تک تم اس زمین پر جس قدر ہنگامے برپا کر چکے ہو ان کا حساب طلب نہیں کروں گا۔''

''ہم یہاں سے جانے کیلئے نہیں آئے ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آسمانی قہر کس پر نازل ہو گا؟ بس ایک اسی کا دعویٰ سچا ہے، باقی تمام وہم و گمان ہے۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے اللہ کی کبریائی بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

جوگی جے پال ایک خدا پرست کی بے نیازی پر بھڑک اُٹھا۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ کو فضا میں جنبش دی۔ یکایک لوگوں نے دیکھا کہ ایک رسی برآمد ہوئی جس کا ایک سرا زمین پر تھا اور دوسرا تا حد نظر آسمان کی وسعتوں میں گم تھا۔ جے پال نے اس رسی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہندوستان کا سب سے بڑا جادوگر حضرت خواجہؒ سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ''میں آسمان کی طرف جا رہا ہوں وہاں سے برق کی شکل میں میرا عذاب نازل ہو گا۔'' یہ کہہ کر جے پال اوپر چڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ فلک نیلگوں نے اسے نگل لیا۔ رسی بدستور موجود تھی مگر جے پال غائب تھا۔

جوگی کے روپوش ہوتے ہی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے جوتوں کو حکم دیا کہ اس ساحر اعظم کو تلاش کر کے زمین پر لاؤ جو مسلمانوں کو تباہ کرنے کیلئے آسمان پر گیا ہے۔ وہ بڑا عجیب منظر تھا۔ کچھ دیر بعد ہی اجمیر کے رہنے والوں نے دیکھا کہ جوگی جے پال چیختا ہوا زمین کی طرف آ رہا ہے اور حضرت خواجہؒ کے نعلین اس کے سر پر کسی آہنی گرز کی طرح برس رہے ہیں۔ یہاں تک کہ جے پال اپنے ساحرانہ کمالات کے باوجود بڑی ذلت و رسوائی کے ساتھ واپس آیا اور کھلے الفاظ میں اپنی شکست تسلیم کرنے لگا۔ پھر اس نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پائے مبارک پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

''جس شخص کو سارے ہندوستان کے جادوگر تلاش نہیں کر سکتے تھے اسے ایک مسلمان کے جوتوں نے زمین کی پستیوں میں دھکیل دیا۔ میری ساری عمر کی یہ ریاضت تھی جو چند لمحوں میں برباد ہو گئی۔'' اتنا کہہ کر جے پال رونے لگا۔ فرطِ ندامت سے اس کا سر نہیں اُٹھتا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اسے تسلی دینے کیلئے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔"جو چیز کوئی حقیقت ہی نہیں اس کی بربادی پر انسان کو غمزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ دنیا میں صرف خدا کی بات حق ہے اور بالآخر حق کو ساری کائنات پر غلبہ حاصل ہو کر رہے گا۔" آپ کے ان فرمودات کے بعد جے پال کے دل و دماغ کی تاریکی دور ہوگئی اور اس نے با آواز بلند کلمۂ طیبہ پڑھ کر اپنے اجداد کی صدیوں پرانی رسم کو پامال کر ڈالا۔

قبول اسلام کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے جوگی جے پال کا نام عبداللہ صحرائی رکھ دیا۔ آج بھی پاک و ہند کے بے شمار خوش عقیدہ لوگ اس روایت پر اعتبار کرتے ہیں کہ جے پال نے حضرت خواجہؒ کی خصوصی دعا کے طفیل حیات دوام حاصل کی تھی۔ وہ اس وقت بھی زندہ ہے لیکن کسی کو ظاہری آنکھ سے نظر نہیں آتا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عرس مبارک میں ہر سال لاکھوں انسان شریک ہوتے ہیں اور جب ان میں سے کوئی شخص تارا گڑھ کی پہاڑیوں کے پر پیچ راستوں میں بھٹک جاتا ہے تو جے پال (عبداللہ صحرائی) اس گم کردہ راہ زائر کی رہنمائی کرتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ ایک متنازع مسئلہ ہے۔ ہم بھی اس پر کوئی بحث نہیں کرتے کہ جے پال مر گیا یا زندہ ہے؟ خدا علیم و خبیر ہے، وہی اپنے رازوں کو بہتر سمجھ سکتا ہے۔ اس واقعے کو بیان کرنے سے ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہندوستان کی جو طاغوتی قوتیں بظاہر ناقابل شکست نظر آتی تھیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ایک جنبش چشم نے انہیں مسخر کر لیا تھا اور پھر وہ مغلوب ہو کر حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئی تھیں۔ بڑے سے بڑا تنگ نظر اور متعصب ہندو تاریخ داں بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سامنے جوگی جے پال کی تمام ساحرانہ صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں اور وہ خدائے واحد کی قدرت لازوال پر ایمان لے آیا تھا۔ بس یہی نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب ایک مرد حق پرست نے بت خانۂ ہند میں اذان دی تھی تو سارے قوی الجثہ اصنام ......منہ کے بل گر کے "ھو اللہ احد" کہتے تھے۔

☆☆..............☆☆..............☆☆

پہلے شادی دیو اور پھر جوگی جے پال کی شکست فاش نے پرتھوی راج کے ایوان حکومت پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ تمام مشیران سیاست اس خوفناک انقلاب کو بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ ان کے خیال میں مذہبی تبدیلی کا اگر یہی عمل جاری رہتا تو پھر وہ دن زیادہ دور نہیں تھا جب کسی جنگ کے بغیر اجمیر کے تمام باشندے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو جاتے اور راجپوت محافظوں کی بے نیام شمشیریں پرتھوی راج کی گردن کی طرف لپکنے لگتیں۔ انہی وسوسوں اور اندیشوں نے پرتھوی راج کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ بالآخر اس نے حضرت خواجہؒ اور مسلمانوں کی مختصر جماعت پر عام فوجی یلغار کا فیصلہ کر لیا۔ اس مخصوص نشست میں اجمیر کے تمام امرا اور دانشور موجود تھے۔ ان میں سے کسی ایک شخص نے بھی پرتھوی راج کے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا جادوگروں کے عبرت ناک انجام کے بعد بڑے سے بڑا جنگجو دہشت زدہ رہنے لگا تھا۔ اسی مجلس میں

گفتگو کے دوران ایک بوڑھے مذہبی پیشوا نے پرتھوی راج کو اس کی ماں کی نصیحت یاد دلائی جو اپنے وقت کی بڑی ماہر نجوم تھی۔ بعض تاریخوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک کاہنہ تھی۔ پرتھوی راج کی ماں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آمد سے پہلے ایک خواب دیکھا تھا جس کے ذریعے اسے ایک مرد بزرگ کے بارے میں خبر دی گئی تھی۔ پھر جب وہ بوڑھی عورت خواب سے بیدار ہوئی تھی تو اس نے پرتھوی راج کو قریب بلا کر بڑی محبت سے کہا تھا۔

"اے میرے شجاع بیٹے! تجھ سے دنیا میں راجپوتوں کی آن قائم ہے مگر عنقریب اس علاقے میں ایک بزرگ ہستی داخل ہوگی جس کی ریاضت سے متاثر ہو کر بے شمار لوگ اپنے باپ دادا کے دھرم کو چھوڑ کر نیا مذہب اختیار کر لیں گے۔ تو بھی اس سادھو سنت کی باتوں کو غور سے سننا۔ اگر تیرے دل و دماغ آمادہ ہو جائیں تو نئے پیغام کو قبول کر لینا اور ایسا نہ ہو تو کم سے کم خاموش رہنا اور کسی عنوان بھی آنے والے کی مخالفت نہ کرنا۔ اگر اقتدار کے نشے میں تجھ سے یہ حرکت سرزد ہوگئی تو پھر اس غلطی کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔"

پرتھوی راج نے اس وقت اپنی ماں کے اس خواب کو محض ایک واہمہ سمجھ کر کوئی تاثر قبول نہیں کیا تھا۔ بیٹے کی اس بے رغبتی کو دیکھ کر بوڑھی ماں آزردہ ہوگئی تھی اور اس نے شدید کرب ناک لہجے میں پرتھوی راج سے کہا تھا۔"میں سمجھتی ہوں کہ تیرا جوش جوانی تجھے ایک ضعیف عورت کی نصیحت سننے سے روک رہا ہے مگر یہ انداز بے نیازی بڑا خوفناک ہے۔ اگر تیرے نزدیک میرا خواب کوئی خیال پریشان ہے تو پھر نجوم کی آواز کو غور سے سن۔ ستارے بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ آنے والا آ کر رہے گا۔"

پرتھوی راج نے ماں کی خاطر اس پیش گوئی کو بظاہر تسلیم کر لیا تھا لیکن دل سے کسی ایسی بزرگ ہستی کی آمد کا قائل نہیں تھا جو تن تنہا مضبوط ترین راجپوت حکومت کی بساط الٹ دے۔

پرتھوی راج کی ماں بیٹے کے جبری اقرار سے خوش نہیں ہوئی بلکہ مزید وحشت و اضطراب میں مبتلا ہوگئی۔ اس نے راجپوت حکمراں کے سرکش ذہن کو اچھی طرح پڑھ لیا تھا لیکن وہاں نافرمانی اور بے خبری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بوڑھی کاہنہ مجبوراً خاموش ہوگئی اور تقدیر کی کرشمہ سازیوں کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے کئی بار نجوم کے ذریعے بزرگ کی آمد کا وقت معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ بارہ بروج میں سات ستاروں کی گردش بوڑھی کاہنہ کے سوال کا جواب دینے سے قاصر تھی۔ (اس وقت ماہرین فلکیات نے سات ستارے ہی دریافت کئے تھے۔ اب ان کی تعداد دس ہے) جب ستاروں کی طرف سے کوئی پیغام موصول نہ ہو سکا تو پرتھوی راج کی ماں نے رازداری کے ساتھ کچھ پنڈتوں سے بھی رجوع کیا مگر ان کا علم بھی اس وقت خاص کی نشاندہی کرنے سے عاجز رہا۔

بوڑھی کاہنہ اپنی اس بے چارگی پر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی اور وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ پرتھوی راج کی ماں کا خیال تھا کہ اگر وہ سادھو سنت اس کی موجودگی میں تشریف لے آئے تو وہ اپنے بیٹے کو ان کی مخالفت کرنے سے باز رکھے گی اور اس طرح راج گھرانے کے سر سے یہ خطرہ ٹل جائے گا۔ یہ محض

ایک انسانی خواہش تھی جس کی تکمیل بہرحال نہ ہو سکی اور پرتھوی راج کی ماں مختصر سی علالت کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئی۔ مرنے سے پہلے اس نے حکومت کے چند وفادار مشیروں سے کہا تھا۔

''اگر میرے بعد وہ بزرگ آجائیں تو ان کے ساتھ ادب و احترام سے پیش آنا۔''

آج راجستھان کی قدیم تاریخ اسی نازک ترین مسئلے سے دوچار تھی۔ آنے والا آچکا تھا اور جھٹلانے والے مسلسل جھٹلا رہے تھے۔ جب شادی دیو اور جوگی جے پال بھی شکست کھا کر حضرت خواجہ چشتیؒ کے سامنے خم ہو گئے تو پرتھوی راج نے گنتی کے چند مسلمانوں کے خلاف بھرپور فوجی کارروائی کا فیصلہ کیا لیکن اسی وقت ایک مشیر نے اجمیر کے حکمراں کو اس کی آنجہانی ماں کے گم گشتہ الفاظ یاد دلائے۔

کچھ دیر کیلئے ماں کی پیش گوئی کا ذکر سن کر پرتھوی راج سناٹے میں آ گیا مگر پھر آہستہ آہستہ اس کے ذہن پر مذہبی عقائد، خاندانی عظمت اور اقتدار کا نشہ مسلط ہو گیا۔ وہ حالات کے ایک ایسے موڑ پر تھا جہاں سے نکلنے والے تمام راستے ذلت اور تباہی کی طرف جاتے تھے۔ اگر وہ ماں کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے مسلمان درویش کی سرگرمیوں سے چشم پوشی کر لیتا تو چند برسوں میں اجمیر کی پوری آبادی حلقۂ اسلام میں داخل ہو جاتی اور پھر اس کی حکومت کا کوئی وجود باقی نہ رہتا۔ اگر خود کلمہ پڑھ لیتا تو بندہ و آقا کا فرق مٹ جاتا کیونکہ معین الدین چشتیؒ کا خدا محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح پرتھوی راج چوہان کے نسلی غرور اور جاہ و جلال کو کہاں پناہ ملتی؟ وہ طبقاتی کشمکش کا شکار اور اندھی روایات کے ہاتھوں کا کھلونا تھا۔ اس لئے نفسیاتی خواہشوں کے اشاروں پر رقص کرتا رہا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر پہرے بٹھا دیئے اور ماں کی پیش گوئی کی طرف سے کان بند کر لئے۔ پھر بھی مشیروں کی بات کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ پرتھوی راج نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے پیروکاروں کے خلاف طاقت کے استعمال کا ارادہ ملتوی کر دیا...... مگر جہاں تک بغض و نفاق کا تعلق تھا، وہ پہلے سے زیادہ شدید ہو گیا تھا۔

اب تمام بت پرست ایک نئے انداز سے سوچ رہے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے براہ راست تصادم پورے علاقے کی ہلاکت کا سبب بن جاتا۔ اس لئے طے کیا گیا کہ امام کو چھوڑ کر مقتدیوں پر مشق ستم کی جائے۔ اس کے علاوہ یہ منصوبہ بھی تیار کر لیا گیا کہ ہندو مذہب کے روحانی پیشوا عام انسانوں کو دیوتاؤں کے عذاب سے ڈرائیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتائیں کہ آئندہ جو مسلمانوں سے تعلق رکھے گا اس پر زندگی کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ پرتھوی راج اور اس کے مشیروں کو اس حکمت عملی کے مثبت نتائج برآمد ہونے کی توقع تھی۔ ان کے خیالوں میں یہ سختیاں مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روک دیں گی اور کمزور اعصاب کے ہندو دہشت زدہ ہو کر اپنے مذہبی حصار سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اس منصوبہ سازی کا فوری ردعمل یہ ہوا کہ مسلمان اشیائے خورد و نوش لینے کیلئے بستی یا شہر کی طرف آئے تو مقامی باشندوں نے نہایت سختی سے آنکھیں پھیر لیں۔

ایک خدا کے نام لیوا ضروریات زندگی سے بھی محروم ہو گئے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

راجپوتوں کی اس نئی روش سے آگاہ کیا گیا تو آپ نے اپنے ساتھیوں کے روبرو انتہائی خوش الحانی سے یہ آیت مقدسہ تلاوت فرمائی۔

''تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک خدا کی راہ میں اپنی سب سے زیادہ پسندیدہ شے قربان نہ کر دو۔'' (ترجمہ)

کلام الٰہی سنتے ہی مسلمانوں کے ڈوبتے ہوئے دل ٹھہر گئے۔ لذیذ غذاؤں کے بجائے ابلی ہوئی سبزیوں سے شکم کی آگ بجھائی جانے لگی۔ مگر قافلۂ ایمان کی سبک رفتاری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مسلمانوں کے اس مجاہدانہ طرز عمل سے کافروں پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ انہیں یقین تھا کہ زندگی کی راہیں مسدود ہونے کے بعد یہ مفلوک الحال مسافر اپنے میر کارواں سے بچھڑ جائیں گے لیکن جب مسلمانوں کے پایۂ استقامت میں ہلکی سی بھی لرزش پیدا نہ ہوئی تو پتھر کے پجاری عالم وحشت میں اپنا گریبان چاک کرنے لگے۔ اتفاق سے اسی دوران ایک واقعہ پیش آیا۔ حضرت خواجہؒ کے ایک خادم سید روشن علیؒ تھے۔ ایک دن وہ صبح کے وقت بستی کے قریب ٹہل رہے تھے کہ انہیں ایک گوالن سر پر دودھ رکھے نظر آئی۔ وہ بہت تیزی سے شہر کی طرف جا رہی تھی۔ سید روشن علیؒ نے اسے آواز دی۔ گوالن ٹھہر گئی تو انہوں نے دریافت کیا کہ وہ دودھ لے کر کہاں جا رہی ہے؟ گوالن نے جواباً کہا کہ وہ روزانہ مہاراجہ کیلئے دودھ فراہم کرتی ہے۔ سید روشن علیؒ نے دودھ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تاکہ اگر چیز خالص ہو تو وہ آئندہ اسی گوالن سے خرید سکیں۔ دودھ فروخت کرنے والی عورت نے سید روشن علیؒ کے سامنے برتن رکھ دیا۔ حضرت خواجہؒ کے خادم نے بے ارادہ دودھ کو انگلی پر لے کر دیکھا۔ وہ نہایت عمدہ تھا۔ اس لئے سید روشن علیؒ نے چاہا کہ گوالن تھوڑا سا دودھ انہیں بھی دے دے۔ ابھی وہ اپنی بات مکمل کرنے بھی نہ پائے تھے کہ دودھ فروش عورت چیخنے لگی۔

''تم نے مہاراجہ کے استعمال میں آنے والے دودھ کو ناپاک کر دیا۔ میں ابھی جا کر تمہاری شکایت کرتی ہوں۔'' گوالن اس طرح چیخ رہی تھی کہ جیسے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ سید روشن علیؒ نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ ایک مسلمان کے چھو لینے سے کوئی شے ناپاک نہیں ہوتی مگر گوالن نے ان کی ایک نہ سنی اور وہ مسلسل شور مچاتی ہوئی شہر کی طرف چلی گئی۔

جب وہ دودھ فروش قدرے تاخیر سے پہنچی تو پرتھوی راج کے ملازموں نے دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا۔ گوالن نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے محل کے خادموں کو تمام واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ یہ دودھ مہاراج کے قابل نہیں رہا۔ ملازمین نے فوری طور پر اجمیر کے حکمراں کو خبر دی۔ پرتھوی راج کے دل میں پہلے ہی مسلمانوں کی طرف سے غبار موجود تھا۔ اس واقعے نے کدورت میں مزید اضافہ کر دیا۔

''اب ان کی شرارتیں یہاں تک پہنچ گئی ہیں؟'' شدت غضب سے پرتھوی راج کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''اس گستاخ اور بے ادب بھکاری کو ہمارے حضور پیش کرو۔''

یہ حکم پاتے ہی چند مسلح سپاہی گوالن کے بتائے ہوئے راستے کی جانب دوڑ پڑے۔ سید روشن علیؒ

نے اس واقعے کی سنگینی کو ذرا بھی محسوس نہیں کیا تھا اور وہ گوالن کے جانے کے بعد نہایت اطمینان و سکون سے چہل قدمی کر رہے تھے۔ اچانک انہیں کچھ فاصلے پر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر فضا میں دھول اڑنے لگی۔ جب گرد و غبار صاف ہوا تو پرتھوی راج کے سپاہی سید روشن علیؒ کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ وہ تیزی کے ساتھ گھوڑوں سے اترے اور حضرت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خادم سے گوالن کے بارے میں پوچھنے لگے۔ سید روشن علیؒ نے انتہائی جرأت و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ بات تسلیم کر لی کہ انہوں نے دودھ کو انگلی پر لے کر دیکھا تھا۔ پرتھوی راج کے سپاہیوں نے اس عمل کو سنگین جرم قرار دیا اور سید روشن علیؒ کو گرفتار کر کے اپنے حکمران کے سامنے پیش کر دیا۔

پورے دربار پر سکوت مرگ طاری تھا۔ آج پہلی مرتبہ مغرور راجپوت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ایک خادم کو اتنے قریب سے دیکھ رہے تھے۔ پرتھوی راج نے بڑے تلخ اور غضب ناک لہجے میں سید روشن علیؒ سے مسلسل سوالات کئے مگر وہ ایک فرماں رواں کے جاہ و جلال سے متاثر ہوئے بغیر جواب دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرد مومن نے بھرے دربار میں ہندو فلسفے کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں اور ''پاکی و ناپاکی'' کے موضوع پر اس طرح بولے کہ راجپوتوں کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون جمنے لگا۔

آخر پرتھوی راج سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے ایک ظالمانہ حکم جاری کر دیا۔ ''جس انگلی نے ہمارے دودھ کو ناپاک کیا ہے اسے کاٹ دو۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے اور یہی انصاف۔''

سید روشن علیؒ کی انگلی کاٹ دی گئی۔ خون کی ایک تیز دھار بہہ نکلی۔ اس سے راجپوتوں نے نیک شگون لیا۔ ان کی زمین پر دشمن کا لہو بہہ رہا تھا اور یہ ایک اچھی علامت تھی۔ کچھ دیر بعد سید روشن علیؒ اپنی کٹی ہوئی انگلی اٹھائی اور شہر اجمیر سے نکل کر جنگل کی طرف چلے گئے جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے دوسرے ساتھی سکونت پذیر تھے۔ جب سید روشن علیؒ بارگاہ شیخ میں حاضر ہوئے تو آپ بظاہر پُرسکون تھے لیکن خون بہہ جانے کی وجہ سے چہرے پر نقاہت نمایاں ہونے لگی تھی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ان کا زرد چہرہ دیکھ کر فرمایا۔ ''روشن علیؒ! تم کچھ بیمار نظر آ رہے ہو؟''

''نہیں پیر و مرشد میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' سید روشن علیؒ نے ادب سے عرض کیا۔ ''بس آج ایک عجیب سا واقعہ رونما ہو گیا۔'' یہ کہہ کر سید روشن علی نے اپنی کٹی ہوئی انگلی شیخ کے سامنے رکھ دی۔ سید روشن علیؒ کے دوسرے ساتھی یہ منظر دیکھ کر جذباتی ہو گئے مگر حضرت خواجہؒ نے انہیں پُرسکون رکھنے کے لئے قرآن کریم کی چند آیات تلاوت فرمائیں۔ جن کا مفہوم کچھ اس طرح ہے۔

''عنقریب ہم تمہیں جان و مال اور اولاد کے خسارے سے آزمائیں گے اور پھر جو اس راستے میں ثابت قدم رہے گا وہی اپنے رب کا پسندیدہ بندہ قرار پائے گا۔''

کلام الٰہی سن کر بھڑکتے ہوئے جذبات اعتدال پر آ گئے مگر چہرے گہری اداسیوں کے غماز

تھے۔ ظلم کے خلاف ایک خاموش احتجاج، ایک بے زبان شکایت، ایک بے آواز خواہش انتقام۔

''ہر چیز اپنے خدا کی طرف لوٹ کر جانے والی ہے۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ایسے لہجے میں فرمایا جو معرفت کے جلال سے لبریز تھا۔ ''روشن علیؒ! تم اپنی انگلی زیر زمین دفن کر دو اور اس کے ساتھ ہی پرتھوی راج کی حکومت پر بھی خاک ڈال دو۔''

اجمیر کے حکمراں نے ایک مسلمان درویش کو قصداً یہ اذیت ناک سزا دی تھی۔ دراصل وہ سید روشن علیؒ کی انگلی کاٹنے کے بعد حضرت خواجہؒ کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے خیال میں اگر حضرت خواجہؒ نے کسی روحانی طاقت کا مظاہرہ کیا تو وہ کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑا لے گا اور مسلمانوں کی صف میں خاموشی رہی تو آئندہ بھی اسی قسم کی سزائیں جاری رکھے گا۔ پرتھوی راج اپنی اس سنگدلانہ حرکت کے نتائج کا انتظار کر رہا تھا لیکن جب حضرت خواجہؒ نے مکمل سکوت اختیار کیا تو حاکم اجمیر کے حوصلے بڑھ گئے۔ مسلمانوں کی اس خاموشی کو پست ہمتی سے تعبیر کیا گیا۔

☆☆..............☆☆..............☆☆

اسی دوران ایک اور ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔ پرتھوی راج کا ایک معزز درباری حکومت کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور اسے حضرت خواجہؒ سے نادیدہ عقیدت تھی۔ کٹر ہندو ہوتے ہوئے بھی وہ حضرت خواجہؒ کے متعلق راج دربار میں ہونے والی گفتگو کو بہت غور سے سنتا تھا۔ اگرچہ تمام درباری حضرت خواجہؒ کی شان میں بے دریغ نازیبا کلمات ادا کرتے تھے لیکن اس راجپوت عہدیدار نے آج تک اپنی زبان کو آلودہ نہیں کیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک نامعلوم کشش کے زیر اثر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حلقۂ ارادت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اتفاق سے اس دن بھی پرتھوی راج کے دربار میں مسلمان درویش کو دشنام طرازی کا ہدف بنایا جا رہا تھا۔ راجپوت سردار کچھ دیر تک تو اپنے اوپر جبر کر کے یہ غلیظ و کثیف گفتگو سنتا رہا مگر پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ اس کی زبان لڑکھڑا گئی اور وہ حضرت خواجہؒ کی تعریف کرنے لگا۔ ابھی راجپوت سردار کے الفاظ کی گونج ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ پرتھوی راج کسی شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔

''مجھے کیا معلوم تھا کہ میں اپنی آستین میں بھی کچھ سانپوں کی پرورش کر رہا ہوں۔'' پرتھوی راج اس طرح بول رہا تھا جیسے نفرت و قہر کا دہانہ کھل گیا ہو۔ پھر اس نے عالم طیش میں راجپوت سردار کو معزول کرتے ہوئے نیا حکم جاری کیا۔ ''زندگی کی ساری آسائشیں چھین کر اسے بھی بدبخت فاقہ کشوں کی قطار میں شامل کر دو۔'' پرتھوی راج اس سردار کو بھی قتل کرا سکتا تھا لیکن راجپوتوں کی صفوں میں انتشار پھیل جانے کے خوف سے صرف معزولی پر اکتفا کیا گیا۔

دوسرے ہی دن راجپوت سردار کو تمام سرکاری اعزازات سے محروم کر کے اس طرح نکالا جا رہا تھا جیسے وہ بھی کوئی اچھوت ہو۔ راجپوت سردار نے ایک نظر اپنی چھن جانے والی کرسی کی طرف دیکھا اور پھر گردن اٹھائے ہوئے دربار سے نکل کر چلا گیا۔ پرتھوی راج کا خیال تھا کہ اتنے بڑے عہدے سے معزول ہو جانے کا تصور اس کو بدحواس کر دے گا اور وہ معافی مانگ کر دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کی

کوشش کرے گا مگر وہاں تو سارا نقشہ ہی الٹ گیا تھا۔ عہدے کی بھیک مانگنا تو کجا، راجپوت مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ حکومت کے ایک معزز فرد کا اس بے نیازی کے ساتھ چلے جانا بظاہر پرتھوی راج کی شکست پر منتج ہوتا تھا لیکن اسے یہ طمانیت حاصل تھی کہ اس نے ایک پوشیدہ دشمن کو وقت سے پہلے ہلاک کر ڈالا تھا۔

یہ معزز راجپوت دربار سے نکل کر اسی طرف روانہ ہو گیا جہاں چند فاقہ کش درویش قیام پذیر تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سردار کا والہانہ استقبال کیا اور جب اس نے مکمل روداد سنانی چاہی تو آپ نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا۔ "خدا کے حکم سے فقیر کو سب کچھ معلوم ہے۔ تم دوبارہ دربار میں دوبارہ جاؤ گے مگر نئے انداز سے۔"

پھر راجپوت سردار نے کلمۂ توحید پڑھا اور اپنے ماضی سے تمام رشتے توڑ لئے۔

وقت کی گردش تیز ہو گئی تھی اور زمین کی طنابیں کھینچی جانے والی تھیں۔ دوسرے دن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے راجپوت سردار سے فرمایا۔ "اب وہ ساعت آ گئی ہے کہ باطل پرستوں کی ساری غلط فہمیاں دور کر دی جائیں۔ تم ان سے جا کر کہو کہ وہ گمراہی کے تاریک غار سے نکل آئیں۔ آسمانوں پر فیصلے ہو چکے اور پتھر کے پجاریوں کو جتنی چھوٹ ملنی تھی مل چکی۔ اللہ کا ہمیشہ سے یہ قانون ہے کہ وہ کسی فرد یا قوم کو بے خبری کے عالم میں نہیں پکڑتا۔ اجمیر کے حکمراں اور تمام باشندوں کو آخری بار تنبیہہ کی جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی دل آزاری سے باز آ جائیں اور جس قدر جلد ممکن ہو اپنی گردنوں سے دیوتاؤں کی غلامی کا طوق اتار پھینکیں۔ فرشتۂ اجل ان کے سروں پر کھڑا ہے۔ چند دن کی مہلت کے سوا لوح محفوظ پر اور کچھ تحریر نہیں ہے۔ اگر وہ خدا کی وحدانیت کا اقرار کر لیں گے تو انہیں دنیا و آخرت دونوں کی نعمتوں سے نوازا جائے گا ورنہ ایک عبرتناک انجام، ایک لرزہ خیز موت بہت جلد ان کی منتظر ہے۔"

راجپوت سردار نے اپنے امام کے فرمودات کو حرف بہ حرف ذہن نشین کیا اور اس دربار کی طرف جانے لگا جہاں سے ایک دن پہلے اسے ذلت و رسوائی کے ساتھ نکال دیا گیا تھا۔ چلتے چلتے راجپوت سردار کو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے آخری نصیحت فرمائی۔

"اب تم اسلام کے سفیر ہو۔ تمہاری گزشتہ پہچان مٹ چکی۔ اب صرف اللہ اور رسول ﷺ تمہارا حوالہ ہیں۔ بے شک! یہ حوالہ بت پرستوں کی تمام شناختوں پر بھاری رہے گا۔ جاؤ! اور اپنے اللہ کی اس طرح گواہی دو کہ پرتھوی راج کے ایوان اقتدار میں زلزلہ آ جائے۔"

راجپوت سردار نے ایسا ہی کیا۔ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔" اجمیر کے ایوان سلطنت میں بہت دیر تک یہ آشنا آواز گونجتی رہی۔ پرتھوی راج چوہان اور حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں پر سکتہ طاری تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انہیں پیغام حق اتنے قریب سے سنایا جائے گا۔ راجپوت سردار نے اسلام کی سفارت کا حق ادا کر دیا۔ کچھ دیر بعد حکمراں طبقہ حیرت و استعجاب کے حصار سے باہر نکلا اور آداب سفارت پامال کر دیئے گئے۔ پرتھوی راج کے خیال میں

وقت بھرپور طاقت کا مظاہرہ ضروری تھا۔ پہلے راجپوت سردار کو فحش ترین الفاظ سے نوازا گیا، پھر اسے بری طرح زدوکوب کیا گیا اور دربار سے نکال دیا گیا۔ جب وہ اپنے لباس پر زخموں کے تمغات سجائے رخصت ہو رہا تھا تو پرتھوی راج کی قہر آلود آواز اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اجمیر کا حکمراں کہہ رہا تھا۔

"اس سے پہلے کہ ان پر میرا غضب نازل ہو، تمام مسلمان اجمیر کی حدود سے نکل جائیں۔ بس یہ آخری مہلت ہے۔ اس کے بعد میں انہیں کوئی رعایت نہیں دوں گا۔"

راجپوت سردار نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حضور پہنچ کر پرتھوی راج کے الفاظ دُہرا دیئے۔ باقی جو حالات پیش آئے تھے، ان کی شہادت مسلمان راجپوت کے پیرہن سے مل گئی تھی۔

"بے شک! تو جسے گمراہ کر دے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے خود کلامی کے انداز میں فرمایا، پھر آپ کا چہرۂ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا۔ آج تک کسی مرید یا خادم نے آپ کو اس قدر حالت غیظ میں نہیں دیکھا تھا۔ ایک آتشیں جلال تھی جو باطل کے تمام خس و خاشاک کو پھونک دینا چاہتی تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ الہامی انداز میں فرما رہے تھے۔

"من تُرا زندہ بدست لشکر اسلام بسپردم۔"

(میں نے تجھے زندہ حالت میں لشکر اسلام کے حوالے کیا۔)

پھر یہ خبر اُڑتے اُڑتے اجمیر کے حکمراں تک پہنچ گئی۔ خوشامدی درباریوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا مذاق اڑاتے ہوئے پرتھوی راج سے کہا۔

"جس فقیر کو ایک وقت کی روٹی میسر نہیں، وہ چوہان سمراٹ کو زندہ گرفتار کر کے لشکر اسلام کے حوالے کرنا چاہتا ہے؟"

کہنے والے نے ابھی اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ دربار میں بے ہنگم قہقہوں کا شور بلند ہوا۔ وہی استہزائیہ قہقہے تھے جو ہر دور میں اہل ایمان کا مقدر بنتے رہے ہیں۔ آج وہی رسم اجمیر کی سنگلاخ زمین پر دہرائی جا رہی تھی۔ زمین کی طرح پتھر کے پجاریوں کے دل بھی سخت ہو گئے تھے۔ ہدایت کا آبشار ان کے سینوں پر گر رہا تھا مگر سنگ و آہن کے بنے ہوئے قلب کوئی تاثر قبول نہیں کر رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بظاہر کھلی ہوئی تھیں مگر وہ نوشتۂ دیوار پڑھنے کی صلاحیت سے محروم تھے۔

"مجھے گرفتار کرنے کیلئے لشکر اسلام کہاں سے آئے گا؟" پرتھوی راج کی ہنسی بھی اپنے درباریوں کے قہقہوں میں شامل ہو گئی تھی۔ "غوری گزشتہ سال راجپوتوں کی شجاعت کو آزما چکا ہے۔ کیا وہ اس قدر جلد اپنی شکست کو فراموش کر کے دوبارہ اِدھر کا رخ کرے گا؟ کیا ساری دنیا نے میدان جنگ سے اس کی ذلت آمیز فرار کا منظر نہیں دیکھا تھا؟" دربار میں بہت سی تائیدی آوازوں کا شور بلند ہوا۔

"اب کیا راجپوتوں کا مقابلہ کرنے کیلئے مسلمانوں کی فوج آسمان سے اترے گی؟" پرتھوی راج چوہان نے غرور و تکبر کی ایک خاص ادا کے ساتھ اہل دربار کی طرف دیکھا۔ اپنے فرمانروا کی ہم نوائی میں مصاحبوں نے بھی شہاب الدین غوری کی شکست خوردہ شخصیت کو دشنام طرازی کا ہدف بنانا شروع کر دیا اور پھر طنز و اعتراض کا یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔

پرتھوی راج سید روشن علی کی انگلی کاٹ کر اور اسلام کا پیغام لانے والے قاصد کو اپنے ملک سے نکال کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا مگر جب مسلمان درویش کی جانب سے کسی روحانی طاقت کا مظاہرہ نہیں ہوا تو چوہان سمراٹ مطمئن ہو گیا۔ اس کے خیال میں حضرت صرف ہندو جادوگروں کی ساحرانہ کرشمہ سازیوں کو زائل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور انہیں کمال حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی روحانیت کے ذریعے راجہ کے لشکروں پر حملہ آور ہو سکیں۔ اگر اپنے کانوں سے اونٹوں کے جسموں کے مفلوج ہونے اور اناساگر کے ایک کوزے میں سمٹ جانے کی سن چکا تھا۔ اس کی عبرت کیلئے یہ مناظر کافی تھے لیکن حکومت کا گہرا نشہ پرتھوی راج کو ہوش میں ہی نہیں دیتا تھا۔ ماں کی پیش گوئی اور نصیحت بھی بے اثر ہو چکی تھی۔ دراصل پرتھوی راج چوہان دوسرے سرکشوں اور نافرمانوں کی طرح یہ سوچتا تھا کہ اگر مسلمانوں کا خدا موجود ہے تو زلزلہ کیوں آجاتا۔ آسمان سروں پر ٹوٹ کر اہل اجمیر کو تباہ کیوں نہیں کر دیتا۔ یہ وہی مطالبات تھے جو ہر دور بت پرست مردان حق سے کرتے رہتے تھے۔ خود پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں بھی بعض کفاران قریش ایسے ہی عذاب کے منتظر رہتے تھے۔ آج صدیوں بعد سرور کونین ﷺ کا ایک اپنے آقا ﷺ کا پیغام لے کر اجمیر کی حدود میں داخل ہوا تو منکرین حق اس سے بھی وہی مطالبہ کر رہے تھے۔ جہل اور کفر کی تاریکیوں کے باعث وہ اس راز سے بے خبر تھے کہ لوح محفوظ میں کچھ موجود ہے...... اور وقت معلوم سے پہلے کوئی فیصلہ زمین پر نازل نہیں ہوتا۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

قدرت کی طرف سے دی جانے والی اس مہلت نے پرتھوی راج کو اور سرکش بنا دیا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خاموشی اسے مزید کج روی پر اکسا رہی تھی اور اجمیر کا حکمران مسلمان درویش اور اس کے چند ساتھیوں کی شہر بدری کا حکم جاری کر رہا تھا۔ عجیب صورت تھی۔ ایک طرف باطل کا رقص جاری تھا اور دوسری طرف شہاب الدین غوری اپنے خون آلود پیرہن کو دیکھ رہا تھا۔

587ھ میں شہاب الدین غوری نے ایک خوفناک مقابلے کے بعد پرتھوی راج سے شکست کھائی تھی اور افغانوں کی مختصر سی فوج راجپوتوں کی یلغار کو نہ روک سکی تھی۔ یہاں تک کہ مسلمان سپہ سالار شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ شہاب الدین غوری گھوڑے کی پشت سے علیحدہ ہو کر زمین پر جا تا اور راجپوت سپاہیوں کے تیز رفتار گھوڑے اس کے جسم کو روند ڈالتے، وفادار غلام قطب الدین ایک اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے آگے بڑھا اور شہاب الدین غوری کو میدان جنگ سے نکال کر محفوظ مقام تک لے گیا۔ ایک خادم نے آقا کی نمک خواری کا حق ادا کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی تاریخ کو ایک نئی زندگی مل گئی تھی۔

شہاب الدین غوری اپنے لہو میں نہایا ہوا غزنی پہنچا۔ طبیبوں کی بہترین دواؤں اور خدمت گاروں کی سخت تیمارداری نے غوری کے جسم کے زخم تو بھر دیئے تھے لیکن اس کے دل و دماغ اور روح کے اب بھی خون رس رہا تھا۔ وہ اکثر گوشۂ تنہائی میں پڑا رہتا اور کبھی کبھی اپنی شکست کے مناظر کو یاد کر کے

آبدیدہ ہو جاتا۔ تمام اراکین سلطنت نے عجیب عجیب انداز سے اسے تسلیاں دیں مگر وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے اذیت ناک واقعہ کو فراموش نہ کر سکا۔ خوشی کے کئی موسم آئے اور گزر گئے مگر شہاب الدین غوری نے کسی پرمسرت تقریب میں شرکت نہیں کی۔ انتہا یہ ہے کہ اس نے وہ جنگی لباس بھی تبدیل نہیں کیا جو شکست کے وقت جسم پر آراستہ تھا۔ دوسرے اراکین سلطنت کی تو حیثیت ہی کیا، خود اس کے بڑے بھائی غیاث الدین غوری نے کئی بار سمجھایا مگر وہ ہر مرتبہ یہی کہتا رہا۔

''میں اس خون رنگ قبا کو اس وقت تک اپنے جسم سے الگ نہیں کر سکتا جب تک پرتھوی راج وہاں آہنی بیڑیوں میں جکڑا ہوا میرے سامنے حاضر نہیں ہو جاتا۔ اگر گردش تقدیر کے باعث ایسا نہ ہو سکا تو پھر یہی لباس میرا کفن بن جائے گا۔''

کچھ لوگوں نے اس واقعے کو شہاب الدین غوری کی جذباتیت سے تعبیر کیا ہے لیکن غیور انسانوں کے جینے کی ادا ایسی ہی انوکھی ہوتی ہے کہ عام لوگوں کو ان روایتوں پر یقین نہیں آتا۔ اس سلسلے میں عوام الناس کا انداز فکر کچھ بھی ہو مگر چشم اعتبار گواہ ہے کہ شہاب الدین غوری اپنے روز و شب کے بیشتر لمحات میں اس لباس کو بہت غور سے دیکھتا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غلیظ و کثیف ہوتا جا رہا تھا۔

ابتدائی چند ماہ میں شہاب الدین غوری کے اعصاب پر حسرت و یاس کی شدید کیفیت طاری رہی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ نا امیدی کے حصار سے باہر نکلا اور نہایت زور و شور سے اپنی شکستہ صفوں کو درست کرنے لگا۔ یہ فوجی تیاریاں کم و بیش ایک سال تک جاری رہیں۔ آخر وہ ساعت معلوم آپہنچی جس کا مسلمانوں کو بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔

جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے ساتھیوں سے فرما رہے تھے۔ ''میں نے اسے زندہ حالت میں گرفتار کر کے لشکر اسلام کے حوالے کیا۔'' اور جواب میں پرتھوی راج چوہان ایک مسلمان درویش کے الہامی کلمات کا مذاق اڑا رہا تھا، اسی وقت شہاب الدین غوری نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ کوئی بزرگ افغان سپہ سالار سے فرما رہے ہیں۔

''مایوسیوں کے دائرے سے نکل اور اجمیر پر حملہ کر۔ اس بار خدا تجھے فتح عظیم سے سرفراز کرے گا۔''

بعض تاریخی کتابوں میں شہاب الدین غوری کا یہ خواب اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

''ایک مجلس نور آراستہ ہے۔ در و دیوار سے تیز روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے خدام دست بستہ قطار در قطار کھڑے ہیں۔ شہاب الدین غوری بھی اس انسانی ہجوم میں موجود ہے۔ سامنے تخت زرنگار پر ایک روشن چہرہ بزرگ جلوہ افروز ہیں۔ ان کے جاہ و جلال کا یہ عالم ہے کہ حاضرین کی نگاہیں دم بھر کیلئے اٹھتی ہیں اور فرش پر جم جاتی ہیں۔ پوری محفل پر گہرا سکوت طاری ہے۔ شہاب الدین غوری حیرت زدہ ہے کہ ایک ایک خادم کی شکل دیکھ رہا ہے مگر اسے یہ دریافت کرنے کی جرأت نہیں ہوتی کہ یہ بزرگ کون ہیں؟ یہ دربار کیسا ہے؟ اور اسے یہاں کس مقصد کیلئے لایا گیا ہے۔ ابھی غوری کے ذہن میں اسی قسم کے خیالات گردش کر رہے ہیں کہ دفعتاً ایک خادم جو زرنگار تخت کے قریب کھڑا ہے، غوری کی طرف بڑھتا ہے پھر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ہجوم سے گزرتا ہوا

بزرگ کے قریب پہنچ جاتا ہے...... ''شہاب الدین غوری حاضر ہے۔'' خادم نہایت ادب سے جھکتے ہوئے عرض کرتا ہے۔ بزرگ غوری کی طرف نہایت محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ''خدا نے تجھے کافروں پر غلبہ عطا کر دیا اور ہندوستان کی عظیم سلطنت بخش دی۔'' بزرگ کا لہجہ نرم تھا مگر الفاظ میں ایک ایسا جلال پوشیدہ تھا کہ غوری کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور فوراً ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

افغان سپہ سالار رات بھر ایک عجیب و غریب کیفیت سے دوچار رہا۔ صبح ہوتے ہی شہاب الدین غوری نے مصاحبین خاص سے اپنا خواب بیان کیا۔ سب نے بظاہر ایک ہی تعبیر دی کہ اس کی زندگی میں کوئی خوشگوار لمحہ آنے والا ہے...... مگر حقیقت سے کوئی بھی آشنا نہیں تھا۔ خواب کی تعبیر کا علم مشکل ترین علم ہے جو سیکھنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ علم تو خدا کی طرف سے کچھ مخصوص بندوں کو عطا کیا جاتا ہے۔ اس لئے شہاب الدین کا خواب بھی کچھ دن تک تشنۂ تعبیر رہا۔ جب اس سلسلے میں غزنی کے اہل دانش سے رجوع کیا گیا تو ان لوگوں نے بیک زبان کہا کہ یہ اس کے ذاتی خیالات ہیں جو ذہن کے کسی گوشے میں نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔ جب ان خیالات کو عملی شکل اختیار کرنے کا موقع نہیں ملتا تو یہ خواب کی حالت میں نظر آنے لگتے ہیں۔ غزنی کے دانشور کھل کر تو اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکے مگر در پردہ وہ سب کچھ کہہ گئے تھے۔ ان کا اشارہ گزشتہ جنگ کی طرف تھا جس میں شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج سے شکست کھائی تھی...... اور اب شکست کا یہی احساس مختلف رنگوں میں اُبھر کر مٹتا رہتا تھا۔ غزنی کے دانشوروں نے مبہم الفاظ میں اس سے یہی بات کہی تھی کہ جو میدان کارزار میں راجپوت حکمراں کو شکست نہ دے سکا تو خوابوں کی دنیا میں تخت ہندوستان پر قابض ہو گیا۔

اہل علم سے اپنے خواب کی یہ تعبیر سن کر غوری کے دل و دماغ پر ایک بار پھر گہری اداسیاں طاری ہو گئیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد وہ مایوسیوں کے حصار سے باہر آیا تھا اور پھر رات کے خواب نے اسے ایک گونہ مسرت بخشی تھی لیکن جب غزنی کے دانشوروں نے مہذب لہجے میں اس کی خواہشات کا مذاق اڑایا تو وہ دوبارہ مغموم اور دل گرفتہ نظر آنے لگا۔ شہاب الدین غوری قطعی طور پر اپنے خواب کی توجیہہ سے مطمئن ہو گیا تھا مگر وہ ایک لمحے کیلئے بھی روشن چہرہ بزرگ اور ان کے دربار کو فراموش نہیں کر سکا تھا۔ تمام ہوش و خرد کے جاننے والے اسے مشورہ دیتے تھے کہ یہ فتح اب محض ایک ناآسودہ تمنا ہے جس کا حقیقی دنیا میں کوئی وجود نہیں۔

شہاب الدین غوری اپنے خیالات میں الجھ کر رہ گیا تھا اور قطعی طور پر اس کی فوجی منصوبہ بندی تعطل کا شکار ہو گئی تھی۔ بالآخر ایک مختصر سے وقفے کے بعد افغان سپہ سالار نے ان ہی بزرگ کو خواب میں دیکھا۔ اس بار وہ بزرگ انتہائی پُرجلال لہجے میں فرما رہے تھے۔

''اے اسلام کے جانباز فرزند! خیالات کے طلسم سے نکل اور اپنی آنکھوں سے قدرت کی کارسازیوں کا تماشا دیکھ! خدا مایوس ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اس خواب نے شہاب الدین غوری کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اب کی مرتبہ وہ بزرگ اس طرح آئے تھے کہ ان کے روشن چہرے پر ناگواری کے اثرات نمایاں تھے۔ افغان سپہ سالار نے اپنے مخصوص دوستوں سے مشورہ کیا اور اہل دانش کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

شہاب الدین غوری کے دوست خواب کی تعبیر تو نہ دے سکے مگر وہ اس نتیجے پر ضرور پہنچ گئے کہ یہ مستقبل کے بارے میں ایک غیر معمولی تنبیہہ ہے۔ انجام کار ایک ایسے شخص کی تلاش کی جو واقعتاً تعبیر پر علم رکھتا ہو ورنہ قیاس آرائیوں سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ پھر کئی دن کی جستجو کے بعد افغان سپہ سالار کو اس ہستی کا نشان مل گیا جسے شہری رونقوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ایک تارک الدنیا بزرگ تھے جو غزنی کے نواح میں کسی ویران مقام پر خاموش زندگی بسر کر رہے تھے۔ شہاب الدین غوری نے خود ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا خواب بیان کیا۔

بزرگ نے خواب کی تعبیر دیتے ہوئے کہا...... ''تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں بہت جلد اس عظیم انسان کی زیارت کا شرف حاصل ہو گا جسے دیکھنے کے انتظار میں نہ جانے کتنی آنکھیں بجھ گئیں اور نہ جانے کتنے لوگ زیر خاک سو گئے۔ قلت افواج اور کثرت وسائل کے وسوسوں میں مبتلا نہ ہو کہ خدا ہر شے پر قادر ہے۔ تم ان ہی مرد جلیل کے کہنے پر عمل کرو جو دو بار عالم خواب میں تمہیں اپنی زیارت سے شرف یاب کر چکے ہیں۔''

بزرگ نے شہاب الدین کے خواب کی تعبیر بیان کر دی تھی اور اپنی صلاحیت کشف کے ذریعے ان کے ان اندیشوں کو بھی بے نقاب کر دیا تھا جو فوجیوں کی قلیل تعداد کے باعث افغان سپہ سالار کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ غوری نے اپنی تسکین کیلئے خواب میں نظر آنے والی مبارک ہستی کا نام پوچھنا چاہا تو بزرگ نے صاف انکار کر دیا کہ یہ ایک راز ہے جو وقت آنے پر خود بخود ظاہر ہو جائے گا۔

غوری ان تارک الدنیا بزرگ سے ملاقات کر کے واپس آ گیا اور پھر نئے عزائم کے ساتھ اپنے منتشر سپاہیوں کی صف بندی کرنے لگا۔ اس کے قریبی حلقے میں اکثر لوگ پرتھوی راج پر دوبارہ لشکر کشی کے مخالف تھے۔ ان کی بنیادی دلیل یہ تھی کہ افغان سپاہی شکست کھا کر بکھر چکے ہیں۔ انہیں سمیٹنے کیلئے ایک طویل عرصہ درکار ہو گا۔ دوسرے یہ کہ پرتھوی راج چوہان کو پہلا سبق یاد ہے، اس لئے وہ اپنی سرحدوں کو کھلا نہیں چھوڑے گا اور اب تک اپنی سپاہ میں کئی گنا اضافہ کر چکا ہو گا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت تھی۔ مادی وسائل کی جنگ میں شہاب الدین غوری اور پرتھوی راج چوہان کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ کچھ دیر کیلئے اپنی فوجی ماہرین کے مضبوط دلائل سن کر غوری پر بھی مایوسی طاری ہو گئی تھی مگر پھر فوراً ہی اسے ان بزرگ کے الفاظ یاد آئے۔ ''خدا مایوس ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' اس کے بعد غوری کے ذہن میں مسلسل یہی الفاظ گونجتے رہے۔ یہاں تک کہ سوتے جاگتے یہی چند الفاظ اس کے تعاقب میں رہتے تھے۔ آخر افغان سپہ سالار کا ذہنی اضطراب ختم ہو گا اور ایک طویل مدت کی بے قراری سے اسے نجات مل گئی۔ غوری نے اپنے بدن پر چپکے ہوئے خون اور غلیظ و کثیف پیرہن کو دیکھا۔ پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔

"ہاں! میرا خدا اس بات پر قادر ہے کہ وہ اپنے ایک گناہ گار بندے کے جسم سے ذلت
کے فرسودہ لباس کو اتار کر فتح کی خلعت زرنگار پہنائے۔" شہاب الدین غوری کے یہ الفاظ پر
راج چوہان کے خلاف کھلا ہوا اعلان جنگ تھے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

بالآخر 588ھ میں شہاب الدین غوری ایک لاکھ سات ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر لے کر غزنی
روانہ ہوا۔ اس بار غوری نے اپنے تمام نامور فوجی سرداروں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ وہی خلجی
افغانی سردار تھے جو ترائن کی پہلی جنگ میں اسے تنہا چھوڑ کر میدان جنگ سے فرار ہو گئے
شہاب الدین غوری نے مفرور سرداروں کو سخت سزائیں دے کر ان کی جانیں تو بخش دی تھیں مگر
ہی یہ احکام بھی جاری کر دیئے تھے کہ یہ لوگ اس کے سامنے نہ آئیں۔ یہ بڑی اذیت ناک سزا
کئی سرداروں نے اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شہاب الدین غوری کے سامنے آ
کوشش کی تو اس نے یہ کہتے ہوئے منہ پھیر لیا۔

"تم میری نظر میں دنیا کے سب سے زیادہ بدصورت لوگ ہو۔ اس لئے میں نہیں چاہتا
تمہارے مکروہ ترین چہرے دیکھ کر اپنی آنکھوں کو اذیت پہنچاؤں۔"

ان معتوب سرداروں کا خیال تھا کہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ شہاب الدین غوری
غصے کی آگ بھی سرد ہو جائے گی...... اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر فوجی ضرورتیں غوری کو ان سرداروں
تعاون حاصل کرنے پر مجبور کر دیں گی۔ الغرض اسی کشمکش میں ایک سال گزر گیا۔ شہاب الدین غو
کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پھر جب ان معتوب سرداروں نے سنا کہ غوری اجمیر پر حملہ کر
کیلئے غزنی سے روانہ ہونے والا ہے تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ شہاب الدین غوری نے اپنے لشکر کے
نئے سردار منتخب کئے تھے اور انہیں ایسے فوجی لباس عطا کئے تھے جنہیں دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ وہ
مملکت کے بادشاہ ہیں۔

جب مسلمانوں کا یہ لشکر پشاور کے قریب پہنچا تو ایک بوڑھا امیر شہاب الدین غوری کی خدمت
میں حاضر ہوا۔ غوری اس بوڑھے امیر کی بہت عزت کرتا تھا۔

"جاں نثاروں کو اب تک یہ علم نہیں ہو سکا کہ جہاں پناہ کا ارادہ کیا ہے اور کس دشمن کی تباہی
بربادی کیلئے اتنا عظیم الشان لشکر لے کر سفر کی زحمت گوارا فرمائی ہے؟" بوڑھے امیر نے بڑی عاجزی
سے عرض کیا۔

شہاب الدین غوری نے انتہائی تلخ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا...... "کیا تجھے معلوم نہیں
جس دن سے میں نے پرتھوی راج سے شکست کھائی ہے، اس روز سے نہ اپنی بیوی کا منہ دیکھا ہے
نہ یہ خون آلود لباس تبدیل کیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں میرے سلطان۔" یہ کہتے کہتے بوڑھے امیر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"تو کچھ نہیں جانتا۔" شہاب الدین غوری اپنے ماضی کو یاد کر کے بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔

"بس میرا خدا جانتا ہے کہ یہ پورا سال میں نے انتہائی رنج و غم میں بسر کیا ہے۔ جن غوری اور خلجی
سرداروں نے میری خدمت کو نظر انداز کر کے مجھے تنہا میدان جنگ میں چھوڑ دیا تھا، میں نے ان سے
سلام دعا تک کو روا نہیں رکھا۔ مجھے ان نمک حرام امیروں سے کوئی اُمید نہیں ہے مگر خداوند تعالیٰ کے
بھروسے پر میں اس لشکر کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کرنے جا رہا ہوں۔"

"خداوند ذوالجلال آپ کو کامیاب و کامران اور دشمنوں کو ناکام و نامراد کرے......" بوڑھے امیر
نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "مجھے اُمید ہے کہ یہ معتوب امیر اس بار آپ کو مایوس نہیں کریں گے بلکہ
پچھلی تمام کوتاہیوں اور غفلت شعاریوں کی تلافی کر دیں گے آپ یقین کیجئے کہ وہ لوگ اپنے گناہ پر
سخت ندامت محسوس کرتے ہیں۔ براہ کرم انہیں موقع دیجئے کہ وہ اپنے دامن پر لگے ہوئے بزدلی کے
داغوں کو اپنے خون سے دھو ڈالیں۔"

بوڑھے امیر کی درخواست بڑی اثر انگیز تھی۔ اس کے لفظوں کی حرارت سے شہاب الدین غوری
پگھل گیا اور اس نے اسی وقت دربار عام منعقد کیا۔ معتوب امیر پیش کئے گئے۔ غوری نے اپنے
مفرور سرداروں کا قصور معاف کر دیا اور انہیں قیمتی خلعت اور مرصع خنجر عطا کئے۔ سرداروں نے اس
عنایت خسروانہ کے جواب میں حلف اٹھایا کہ اس بار وہ اپنے امیر کو مایوس نہیں کریں گے اور اہل کفر
کیلئے ان ہی کی زمین کو تنگ کر دیں گے۔

دوسرے دن شہاب الدین غوری نے پشاور کو خیر باد کہا اور آگے بڑھا۔ پھر مسلمانوں کا یہ لشکر منزل
بہ منزل سفر کرتا ہوا ملتان پہنچا۔ یہاں پہنچ کر شہاب الدین غوری نے ان امیروں کو گراں بہا انعامات
سے نوازا جنہوں نے اس کی غیر موجودگی میں خیر خواہی اور نمک حلالی کا دامن نہیں چھوڑا تھا اور اس
ہنگامہ خیز زمانے میں بھی لاہور کے مسلمان حاکم کی مدد کرتے رہے تھے تاکہ وہ گرد و پیش کے ہندو
راجاؤں کا مقابلہ کر سکے۔

پھر لاہور پہنچ کر شہاب الدین غوری نے اپنے ایک معتمد امیر رکن الدین حمزہ کو اجمیر روانہ کیا اور
اس کے ذریعے پرتھوی راج اور عام ہندوؤں کو اسلام کی دعوت دی۔

رکن الدین حمزہ نے اجمیر کے راج دربار میں باآواز بلند شہاب الدین غوری کا پیغام پڑھ کر سنایا۔

"مسلمانوں کا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ کفر کی بستیوں کا رخ کرتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے
اللہ اور رسول ﷺ کا پیغام سناتے ہیں تاکہ بے خبر اور نافرمان لوگوں کیلئے حجت قائم ہو جائے۔
اگرچہ پچھلی بار میرا جنگ کا ارادہ نہیں تھا لیکن تو نے مجھے دھوکا دیا اور لشکر اسلام پر پیچھے سے وار کیا۔ پھر
بھی میں تیرے اس قصور کو معاف کرتا ہوں۔ اگر تو اسلام قبول کر لے تو پھر میرے اور تیرے درمیان
کوئی جھگڑا باقی نہیں رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اجمیر اور دہلی پر تیرا اقتدار بھی
قائم رہے اور تجھے آخرت کی نعمتیں بھی میسر آ جائیں۔"

پرتھوی راج نے مسلمان امیر رکن الدین حمزہ کی زبانی اسلام کا پیغام سنا اور بھڑک اٹھا۔ "مجھے
حیرت ہے کہ تیرا سردار شہاب الدین غوری اتنی جلد اپنی شکست اور فرار کو بھول کر مجھے مذہب اسلام کی

لوریاں سنا رہا ہے۔ اس سے کہہ دینا کہ میں اول و آخر راجپوت ہوں۔ اور ایک راجپوت تلوار کی جھنکار کے سوا کوئی آواز نہیں سنتا۔"

اس کے بعد پرتھوی راج نے شہاب الدین غوری کو انتہائی غیر مہذب اور ناشائستہ الفاظ میں جواب دیا اور سفیر اسلام رکن الدین حمزہ کو ذلیل کر کے اپنے دربار سے نکال دیا۔

رکن الدین حمزہ کے جاتے ہی پرتھوی راج چوہان نے ہندو دھرم کی حفاظت کے نام پر اپنے ہم مذہب حکمرانوں کو خطوط لکھے اور ان سے فوری طور پر مدد طلب کی۔ پرتھوی راج کے مراسلوں کے جواب میں ڈیڑھ سو راجا اپنی اپنی فوج کے ہمراہ ترائن کے مقام پر جمع ہوئے۔ بعض تاریخ نویسوں نے پرتھوی راج کے اجتماعی لشکر کی تعداد سات لاکھ تک تحریر کی ہے۔ اگر ہم اسے ایک مبالغہ آمیز روایت قرار دیں، تب بھی پرتھوی راج کی فوجی طاقت شہاب الدین غوری سے چار گنا زیادہ تھی۔ تمام مسلمان اور ہندو مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ پرتھوی راج تقریباً چار لاکھ سپاہی لے کر مسلمان سپہ سالار کے مقابل آیا تھا۔ پرتھوی راج کو کثرت سپاہ کے ساتھ یہ رعایت بھی حاصل تھی کہ وہ اپنے علاقے میں جنگ کر رہا تھا۔ یہاں اسے نہ سامان رسد کی فکر تھی اور نہ دشوار گزار راستوں کا خوف تھا۔ اس کی فوجیں اپنا آشنا زمین پر موسم کی خوشگواریوں کے ساتھ جمع ہوئی تھیں...... اور اس کا حریف ناسازگار موسم میں بہت دور سے آیا تھا۔

جنگی نقطۂ نظر سے پرتھوی راج کو شہاب الدین غوری پر ہر طرح برتری حاصل تھی...... مگر جب قدرت کسی کو رسوا کرنا چاہتی ہے تو پھر کوئی حجت کام نہیں آتی۔

اس میں اب کیا کوئی دلیل کرے
جس کو چاہے خدا ذلیل کرے

آخر آسمانی فیصلہ زمین پر نازل ہوا۔ پرتھوی راج چوہان کی ٹڈی دل فوج اپنے مورچوں سے باہر نکلی مگر خلاف توقع بہت جلد رزق خاک ہو گئی۔ راجپوتوں کی روایتی شجاعت ماضی کا ایک فراموش کردہ افسانہ ٹھہری۔ شہاب الدین غوری کی سپاہ تعداد میں بہت کم تھی لیکن اللہ نے مجاہدین اسلام کے دلوں کو تھام لیا تھا۔ یہاں تک کہ پرتھوی راج کی زندگی کے باب میں ذلت و بربادی کی آخری سطر تحریر کر دی گئی۔ بت پرستوں کی لاشیں خود ان کے گھوڑوں کے سموں سے پامال ہو رہی تھیں، تمام دعوے باطل قرار پائے اور پھر دیکھنے والوں نے پرتھوی راج کو میدان جنگ سے فرار ہوتے دیکھا۔ بساط مکمل طور پر اُلٹ چکی تھی، وہ دیوتاؤں سے ایفائے عہد نہ کر سکے اور جان بچانے کیلئے ہندوؤں کے سب سے مضبوط مرکز اجمیر کو کسی ویرانے کی طرح لاوارث چھوڑ گئے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

پرتھوی راج چوہان اس ارادے سے بھاگ رہا تھا کہ وہ شہاب الدین غوری کے دست قہر سے بچ گیا تو دہلی پہنچ کر ایک بار پھر راجپوتوں کی بکھری ہوئی قوت کو سمیٹنے کی کوشش کرے گا...... لیکن یہ اس کا خیال خام تھا۔ جب مقررہ مہلت ختم ہو جاتی ہے تو سارے جن و انس مل کر بھی اس "وقت معلوم" میں

کوئی کمی یا اضافہ نہیں کر سکتے۔ پرتھوی راج نے اپنے چند وفاداروں کے ساتھ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ شہاب الدین غوری کے ایک فوجی دستے نے "دریائے سرستی" کے کنارے اسے جا لیا اور ایک معمولی سی مزاحمت کے بعد "فخر راجپوت" زندہ گرفتار ہو گیا۔

جب پرتھوی راج کو زنجیریں پہنا کر شہاب الدین غوری کے سامنے لایا گیا تو برصغیر کی ایک نئی تاریخ رقم ہو رہی تھی۔ کثرت افواج کا فلسفہ غلط ٹھہرا تھا اور جذبہ و عقائد کی برتری ثابت ہو گئی تھی......

غوری نے چوہان کو اپنے خیمے میں بے دست و پا دیکھ کر کہا تھا۔

"بے شک! زمین و آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ خدا کیلئے ہے۔ اگر وہ کسی کو سر بلند کرنا چاہے تو پھر اس کائنات کی تمام طاقتیں مل کر بھی اسے پست نہیں کر سکتیں۔" آج غوری کے ہونٹوں پر کسی مغرور فاتح کی طرح نغمۂ لاف زنی نہیں تھا۔ ایک اقرار احسان شناسی تھا، ایک حرف عجز و انکسار تھا۔

پھر اس نے بتوں کی قدیم سرزمین پر سجدۂ شکر ادا کیا اور اپنے رب کی تسبیح بیان کی۔ اسی دوران کچھ سپاہیوں نے شہاب الدین غوری کو خبر دی کہ یہاں ایک مسلمان درویش بھی گوشہ نشین ہیں، افغان سپہ سالار کیلئے اجمیر میں کسی کلمہ گو بزرگ کی موجودگی بڑی حیران کن تھی۔ وہ بے قرار سا ہو گیا۔ پھر اس کے مضطرب قدم اپنے چند معتمد سرداروں کے ہمراہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی بارگاہ جلال کی طرف بڑھ رہے تھے۔

فاتح ہند نے اس درویش بے سروساماں کے روئے مبارک کی طرف دیکھا جو بہت دنوں سے صحرائے باطل میں تنہا اذان دے رہا تھا۔ غوری کی آنکھیں جمال معرفت کی تاب نہ لا سکیں اور بے اختیار سجدہ ریز ہو گئیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن میں ایک برق سی لہر آئی۔ دماغ کے بعید ترین گوشے روشن ہو گئے۔ کئی ماہ قبل دیکھے جانے والے خوابوں کا ایک ایک عکس تازہ ہو گیا۔ جس ہستی محترم نے عالم خواب میں نمودار ہو کر شہاب الدین غوری کو اجمیر پر حملے کا حکم دیا تھا وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تھے۔ غوری کی نگاہوں کے سامنے سے تمام حجابات اُٹھ گئے۔ افغان سپہ سالار جوش عقیدت میں بے تابانہ آگے بڑھا اور اپنی دستار فضیلت حضرت خواجہؒ کے قدموں میں ڈال دی۔

کلاہ خسروی، جس کے حصول کیلئے انسانی خون کے دریا بہائے جاتے ہیں آج وہی کلاہ اقتدار ایک مرد درویش کے پائے مبارک پر رکھی ہوئی تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے غوری کی دستار اُٹھائی اور دوبارہ اس کے سر پر باندھتے ہوئے فرمایا۔ "تمہارے دشمن قوی اور بالادست تھے مگر خداوند ذوالجلال نے انہیں اپنی قدرت سے پست کر دیا۔ اب لازم ہے کہ تم بھی حکومت الٰہیہ کے سلسلے میں اپنی کوششیں تیز تر کر دو۔ عدل و احسان کو اپنا شعار بناؤ اور بھٹکے ہوئے مسافروں کو ان کے مرکز کی طرف بلاؤ۔" اس کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنی دعاؤں کے سائے میں شہاب الدین غوری کو رخصت کیا۔

روایت ہے کہ غزنی پہنچ کر شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج چوہان کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ یہاں تک کہ مفتوح حکمراں کی آنکھیں نکال کر غوری نے اپنے قہر و نفرت کا اظہار کیا۔ افغان سپہ سالار

کی طرف سے تشدد کے اس مظاہرے کا پس منظر پرتھوی راج کی وہ بزدلانہ سازش تھی جس کی پہلی جنگ میں شہاب الدین غوری کو نہ صرف شکست سے دوچار کیا تھا بلکہ افغان مجاہد کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ آج جب پرتھوی راج بیڑیوں میں جکڑا ہوا غوری کے سامنے آیا تو تمام زخم ہرے ہو گئے اور پھر وہ جوش جذبات میں حد سے گزر گیا۔ جس وقت پرتھوی آنکھیں حلقوں سے باہر نکالی جا رہی تھیں، اس ساعت سنگین میں ''فخر راجپوت'' کو اپنی کی وہ نصیحت یاد آ رہی تھی، جس میں اس نے اپنے مغرور بیٹے کو مسلمان درویش کا احترام ہدایت کی تھی ...... مگر قدرت جن کی سماعتوں پر پہرے بٹھا دیتی ہے وہ ایک حرف سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اور جب شمشیر ازل پرتھوی راج کی شہ رگ کے قریب پہنچی تو اسے حضرت خواجہ معین الدین کے وہ الہامی الفاظ یاد آئے۔

''میں نے اسے بہ حکم خدا زندہ گرفتار کر کے لشکر اسلام کے حوالے کیا۔''

یقیناً اس موقع پر راجپوت حکمراں کے سینے میں بہت سی حسرتیں مچل کر رہ گئی ہوں گی لیکن وقت گزر چکا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے پرتھوی راج کے کاندھوں سے گردن کا بوجھ ہلکا کر دیا گیا۔

☆☆.................☆☆.................☆☆

اس عظیم الشان فتح کے بعد شہاب الدین غوری نے مفتوحہ علاقوں کا انتظام اپنے وفادار غلام قطب الدین ایبک کے سپرد کر دیا۔ ایبک نے سید حسن مشہدیؒ کو اجمیر کا داروغہ مقرر کیا اور ان کی زیر نگرانی پرتھوی راج کے بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا۔ بظاہر وہ راجہ کہلاتا تھا مگر ایک ماتحت سے زیادہ اس کی اہمیت نہیں تھی۔ تمام امور مملکت کے نگراں حضرت سید حسن مشہدیؒ تھے۔ آپ کو عام طور سے خنگ (سفید گھوڑا) سوار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت حسن مشہدیؒ ایک نہایت پارسا بزرگ تھے۔ عقائد کے اختلاف کے باوجود آپ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ مسلمانوں کی فتح کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اہل ہنود اسلامی حکومت کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو گئے۔ پھر ایک خفیہ سازش کے ذریعے پرتھوی راج کے بیٹے پر حملہ کیا گیا۔ عام ہندوؤں کی نظر میں وہ مسلمانوں کا غلام تھا اس لئے اجمیر اور گردونواح کے بت پرست اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ بالآخر پرتھوی راج کے ایک دور کے رشتہ دار بھیم راج کو آگے بڑھایا گیا۔ بھیم راج نے منتشر راجپوتوں کو جمع کیا اور پھر پوری طاقت کے ساتھ اجمیر پر حملہ آور ہوا۔ پرتھوی راج کا بیٹا ایک اس اچانک حملے سے بے خبر تھا اور دوسرے یہ کہ اس کی فوجی طاقت بہت مختصر تھی۔ نتیجتاً اسے شکست ہوئی اور بھیم راج اجمیر پر قابض ہو گیا۔ پتھر کے پجاری اس فتح سے بہت خوش تھے کہ انہوں نے راجپوتوں کی سرزمین پر دوبارہ ہندو پرچم لہرا دیا تھا...... اس جنگ کا سب سے المناک پہلو یہ تھا کہ دکھ مسلمانوں کے ساتھ حضرت سید حسن مشہدیؒ بھی کافروں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (آج بھی تاراگڑھ کی سب سے بلند چوٹی پر آپ کا مزار اہل دل کیلئے مرکز نظر ہے)

جب قطب الدین ایبک کو یہ روح فرسا خبر ملی تو وہ کچھ دن کیلئے اداس و غمگین نظر آنے لگا۔ عام سپاہیوں کا خیال تھا کہ وہ اس سلسلے میں فوری طور پر اپنے ردعمل کا اظہار کرے گا مگر ایک بڑی خاموشی سے اس حادثے کو برداشت کر گیا۔ بھیم راج نے قطب الدین ایبک کے سکوت کو اس کی کم ہمتی پر محمول کیا اور پھر یہ ہندو حکمراں اور زیادہ بے باک ہو گیا۔ دراصل واقعہ یہ تھا کہ ایک دوسری جنگی مہمات میں الجھا ہوا تھا۔ اس لئے وہ فی الوقت اجمیر کی شکست کو نظرانداز کر رہا تھا۔ بھیم راج نے اس مصلحت کو غلط مفہوم پہنایا اور قطب الدین ایبک کے لشکروں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ ایبک نے اس موقع پر بھی تغافل سے کام لیا مگر جب بھیم راج کی شرانگیزیاں حد سے بڑھ گئیں تو 591ھ میں مسلمان حکمراں پلٹ پڑا۔ قطب الدین ایبک کا انداز ایسا ہی تھا جیسے جنگلی جانور کسی شیر کو بوڑھا سمجھ کر اس کے گرد اچھل کود کر رہے ہوں ...... اور جب وہ شیر جاگا تو جنگل پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اگرچہ اس عرصے میں بھیم راج نے مذہب کے نام پر ایک بڑی فوج تیار کر لی تھی لیکن وہ زیادہ دیر تک ایبک کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ابتدائی مرحلے میں دونوں فریقوں کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ مگر ایبک نے اپنی حکمت عملی سے دشمن پر قابو پا لیا۔ دوسرے معرکے میں راجپوتوں کے قدم اکھڑ گئے۔ یہاں تک کہ ان کا سربراہ بھیم راج میدان جنگ سے فرار ہوتے ہوئے ذلت و رسوائی کے ساتھ مارا گیا۔ اب اجمیر پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا اور یہ پتھریلی زمین تمام ناپسندیدہ عناصر سے پاک ہو گئی تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ شدید ناسازگار موسم میں بھی پیغام حق سنا رہے تھے لیکن مسلمانوں کی دوسری فتح نے فضا کو نہایت خوشگوار بنا دیا تھا جس کے نتیجے میں تبلیغ اسلام کا دائرہ لحظہ بہ لحظہ وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ لوگ قطار در قطار حضرت خواجہؒ کی بارگاہ عالیہ میں داخل ہو رہے تھے اور سیکڑوں دیوتاؤں کی بستی نغمۂ توحید سے گونج رہی تھی۔

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں اور محمد مصطفیٰ ﷺ اس کے رسول اور بندے ہیں۔''

جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ رسالت مآب ﷺ کے حکم سے ہندوستان تشریف لائے تھے تو اس وقت آپ کے خلیفۂ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ آپ نے حضرت قطبؒ کو مخلوق خدا کی ہدایت کیلئے دہلی مقرر فرمایا تھا اور خود اجمیر تشریف لے آئے تھے۔ ہندوستان کے دونوں اہم مراکز پر تبلیغ اسلام زور و شور سے جاری رہی۔ اگرچہ شروع میں بت پرستوں نے بہت زیادہ رخنہ اندازی کی لیکن خدا نے جلد ہی اہل باطل کو نیست و نابود کر دیا اور شہاب الدین غوری کے بعد قطب الدین ایبک نے دور تک اسلامی پرچم لہرا کر ان لوگوں کیلئے آسانیاں پیدا کر دیں جو خدائے واحد کا پیغام پہنچانے کیلئے اپنے وطن، اپنی زمین اور اپنے عزیزوں سے آشنائی کے تمام رشتے توڑ آئے تھے۔ اب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی تحریک اسلامی میں خلل ڈالنے والی کوئی آمرانہ طاقت موجود نہیں تھی۔ راجھستان کے سرکش راجپوت گردنیں جھکائے ہوئے بارگاہ خواجہؒ میں داخل ہو رہے تھے اور صدیوں کی بنجر زمین میں ایک ایسی فصل بوئی جا رہی تھی جس کی جڑیں آخرت

تک پھیلی ہوئی تھیں۔ معتبر روایتوں کے مطابق ایک لاکھ سے زیادہ راجپوت حضرت خواجہؒ کے حق پرست پر ایمان لائے اور جو لوگ اس دولت لازوال سے محروم رہے ان کا بھی یہ حال تھا کہ اپنی آخری سانس تک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا احترام کرتے رہے۔ انتہا یہ ہے کہ دیوتاؤں کے ماننے والے کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے تو حضرت خواجہؒ کے آستانے پر دیتے اور اپنے مسائل بیان کرتے۔ آپ ان بت پرستوں کے ساتھ بھی خوش خلقی سے پیش آتے ان کے حق میں دعائے خیر کرتے۔ بے شمار ہندو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی دعاؤں فیضیاب ہوئے۔ اس جذباتی موقع پر کبھی کبھی کچھ مسلمان آپ سے عرض کرتے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، آپ بھی ان سے منہ موڑ لیجئے۔

حضرت خواجہؒ ان مسلمانوں کو جواب دیتے ہوئے فرماتے۔ "میں رحمت اللعالمین ﷺ کا ہوں اور ایک غلام کا فرض ہے کہ اپنے آقا کے احکام پر پوری دیانت داری کے ساتھ عمل کرے۔ سورج کی روشنی مومن و کافر میں امتیاز نہیں کرتی۔ برسات کا بادل سب انسانوں پر یکساں برستا ہے۔ دنیا میں مسلمان کی حیثیت سورج کی کرن اور بارش کے پانی کے مانند ہے۔ اسلام میں جبر و اکراہ نہیں۔ جس کا جی چاہے اپنا رخ کعبے کی طرف کر لے اور جس کا دل چاہے اپنا چہرہ بت کدے کی جانب کر لے۔ ہر شخص اپنے اعمال کا جواب دہ ہے۔ آج خدا نے مسلمانوں کو اپنے فضل سے اقتدار عطا کیا ہے۔ کل تک جو ضعیف و ناتواں تھے اب وہ بھرپور طاقت رکھتے ہیں مگر ہم مسلمان، غیر مذہب لوگوں پر اپنے عقائد مسلط نہیں کر سکتے۔ جبر و تشدد سے لوگوں کے راستے بدلے جا سکتے ہیں لیکن اس عمل کو پسند نہیں کرتا۔ اسلام امن و آشتی ہے، اسلام محبت و راستی ہے، مسلمان بیمار روحوں کا ہے اور مریض جسموں کا بھی معالج۔"

حضرت خواجہؒ کا یہی فراخدلانہ طرز عمل تھا جس نے راجپوتوں کے صنم خانۂ دل کو مسمار کر دیا تھا اور وہ اپنے آبا و اجداد کے مذہب کو چھوڑ کر اس دین کے حصار میں داخل ہو گئے تھے جس کی آواز فاران کی چوٹیوں پر گونجی تھی۔ اُحد اور تاراگڑھ کی پہاڑیوں میں بظاہر بہت فاصلہ تھا مگر برحق ﷺ کے نام لیواؤں نے تمام فاصلے مٹا دیئے تھے۔ اگر حضرت خواجہؒ، شہاب الدین غوری قطب الدین ایبک کو ہلکا سا اشارہ بھی کر دیتے تو مقامی ہندوؤں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا اور راجپوتوں کی عبرتناک ہلاکت پر مرثیہ پڑھنے والے بھی دور دور تک نظر نہیں آتے۔ حضرت خواجہ الدین چشتیؒ اسلام دشمنوں سے خوفناک انتقام لینے پر قادر تھے لیکن آپ نے شر پسند شہریوں پر خراش بھی نہ آنے دی۔ انہیں ہر طرح غوری اور ایبک کے قہر و غضب سے محفوظ رکھا۔ آپ اسلامی اخلاق کے عظیم الشان مظاہرے سے بت پرستوں کے دل جیتے، جگر مراد آبادی کے بقول

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

بے شک! حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ فاتح ہند تھے۔ آپ نے تیز شمشیروں کے بجائے عمل کے نرم و نازک ہتھیاروں سے یہ تاریخی جنگ لڑی۔ اگر حضرت خواجہؒ اسلامی تلوار کے

استعمال کی اجازت دے دیتے تو پھر اس قدر طویل و عریض ملک میں اہل ہنود کا وجود کہاں باقی رہ جاتا؟ جن متعصب اور تنگ نظر لوگوں کو مسلمانوں کے قتال و جدال سے شکوہ ہے وہ اس زندہ حقیقت پر غور کریں۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ کے قیام کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ پورے انہماک سے انسانی روح کی بیماریوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کی تعلیمات میں اسلام کی فطری سادگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھی، اس لئے پتھروں، جانوروں اور درختوں کے پجاری دیوانہ وار کھنچے چلے آ رہے تھے۔ حضرت خواجہؒ کی مجلس نورانی میں اعلیٰ ذات کے برہمن اور حقیر نسل کے اچھوت دونوں برابر تھے۔ صدیوں کی زخم خوردہ تہذیب پہلی بار اپنی جراحتوں کا مرہم تلاش کر رہی تھی۔ طریقت کے تمام سلسلوں میں سلسلۂ چشتیہ سب سے زیادہ رواداری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نتیجتاً ہندوستان کے لوگ اس سلسلے سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

خاندان چشتیہ کے کچھ بزرگ "سماع" سے شغف رکھتے تھے۔ خود حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بھی عارفانہ کلام کو روح کی غذا سمجھتے تھے۔ آپ کے اس طرز عمل کے بارے میں کچھ تنگ نظر مخالفین کا خیال ہے کہ حضرت خواجہؒ کا ذوق سماع بھی ہندو موسیقی کے جواب میں تھا۔ اس گروہ کا دعویٰ ہے کہ اہل ہنود زمانہ قدیم سے موسیقی کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ اس لئے انہیں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سماع میں روحانی طور پر بہت زیادہ کشش محسوس ہوتی تھی۔ اسلام کے دشمن اور سلسلۂ چشتیہ کے مخالفین اس دلیل کے سہارے یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہندوؤں کے موسیقی آشنا دل و دماغ کو اپنی طرف موڑنے کیلئے حضرت خواجہؒ نے ہندوستان میں "سماع" کو فروغ دیا تھا۔ یہ ایک متنازع موضوع ہے جو آئندہ صفحات میں زیر بحث آئے گا۔ مختصراً عرض ہے کہ سلسلۂ چشتیہ کی محفل سماع کو ہندوؤں کی بزم موسیقی سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ ہندوؤں کے یہاں قدم قدم پر سازوں کا بکثرت استعمال ہوتا تھا جو کئی ہزار سال گزر جانے کے بعد آج بھی موجود ہے جبکہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ آلات موسیقی سے مکمل اجتناب فرماتے تھے (اب یہ علیحدہ بات ہے کہ بعد میں آنے والے صوفیوں نے احتیاط نہیں برتی اور سماع میں چنگ و رباب تک شامل کر دیئے گئے۔ بہرحال ان حضرات کا عمل باخبر مسلمانوں کیلئے حجت نہیں) جب سماع کی شکل بگڑتے بگڑتے قوالی تک پہنچ گئی تو پراگندہ ذہن لوگ برملا کہنے لگے کہ ہندوستان میں اسلام یا تو بزور شمشیر پھیلایا گیا ہے یا پھر موسیقی کے ذریعے عوام کو نئے مذہب کی رغبت دلائی گئی ہے۔ دراصل مفسدین کی یہ الزام تراشیاں محض اس لئے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے تاریخ ساز مشن کی اہمیت کو کم کیا جائے مگر یہ ساری تگ و دو ایک احمقانہ کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے نزدیک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ برصغیر پاک و ہند کی سب سے زیادہ بااثر اور دلنواز شخصیت ہیں کہ جنہوں نے انسانی خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اپنے ورثے میں کم و بیش پچاس کروڑ مسلمان چھوڑے ہیں۔ آپ سراپا محبت و

جمال تھے۔ اس ادائے خاص کو دیکھ کر تمام ہندو اور مسلمان حضرت خواجہؒ کو "غریب نواز" سمجھتے تھے۔ آج بھی بے شمار انسان آپ کے حقیقی نام سے واقف نہیں...... "غریب نواز"...... اور وہ اس لقب کے سوا کچھ جاننا بھی نہیں چاہتے۔ ہندوستان کی پوری تاریخ میں غریبوں سے اتنی محبت کرنے والا شاید ہی کوئی دوسرا انسان گزرا ہو...... اور یہ اسلام کی بخشی ہوئی محبت ہی تھی کہ جس کے ذریعے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے دشمنوں کے دل بھی مسخر کر لئے تھے۔

☆☆.................☆☆.................☆☆

اجمیر پر مسلمانوں کے مکمل اقتدار کے بعد بظاہر کافروں کی سرکشی ختم ہو گئی تھی مگر در پردہ سازشیں اب بھی جاری تھیں، بیشتر ہندو اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی مخالفت سے باز آ چکے تھے۔ تاہم کسی کسی دل پر کفر کی چھاپ اتنی گہری تھی کہ وہ غریب نوازؒ کی موجودگی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے ایک دن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے کہ خادم نے ایک اجنبی شخص کے آنے کی اطلاع دی۔ آپ نے نووارد کو فوراً ہی طلب کر لیا۔ اجنبی شخص نے آتے ہی بڑے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا اور پھر بیٹھتے ہی غریب نوازؒ کی شان میں قصیدہ پڑھنے لگا۔

"میری دیرینہ آرزو تھی کہ آپ کی قدم بوسی سے شرف یاب ہو جاؤں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج اس نے مجھ گناہ گار و مفلس کی دعا سن لی۔ یہ میری زندگی کا سب سے قیمتی لمحہ ہے کہ میں آپ کا چہرۂ مبارک دیکھ رہا ہوں۔"

اجنبی شخص کا انکسار اور عقیدت مندانہ لہجہ دیکھ کر حاضرین مجلس بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ حضرت خواجہؒ کے ہونٹوں پر بھی ایک جاں فزا تبسم نمایاں تھا۔ جب وہ شخص اپنی گفتگو تمام کر چکا تو غریب نوازؒ نے اس سے فرمایا۔

"آدمی کو فضول باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ وقت بہت قیمتی شے ہے۔ اے بندۂ خدا! میری جھوٹی تعریفیں چھوڑ اور اس کام کی تکمیل کر جس کیلئے تجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔"

آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی وہ اجنبی شخص دہشت زدہ ہو کر کانپنے لگا۔ حاضرین مجلس اس کے جسم کی لرزش دیکھ کر حیران تھے۔ کچھ دیر تک اسے اپنے ہوش و حواس پر قابو نہ رہا...... پھر جب اعصاب کسی قدر پُرسکون ہوئے تو اس نے اپنے پیرہن کی جیب سے ایک تیز خنجر نکال کر فرش پر ڈال دیا اور خود حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قدموں سے لپٹ گیا۔

"غریب نواز! میں آپ سے بے حد عقیدت رکھتا ہوں مگر میرے نفس نے مجھے دھوکا دیا۔ سیم و زر کی خواہش بڑی ہلاکت خیز شے ہے۔ اجمیر کا ایک مالدار ہندو مجھے بہت دنوں سے دولت کثیر کا لالچ دے کر ورغلا رہا تھا۔ میں نے اپنے جذبۂ ناپاک کو دبانے کی انتہائی کوشش کی لیکن حرص و ہوس کی یلغار نے میرے دل و دماغ کو تباہ کر ڈالا۔ بہتر ہے کہ آپ بھی میرے قتل کا حکم جاری فرما دیں تاکہ اس طرح میرے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے۔" اجنبی حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے پائے مبارک پر سر رکھے زار و قطار رو رہا تھا۔

"اس شخص کا نام ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے جواباً فرمایا۔ "میں اس شخص کو معاف کرتا ہوں جس نے تجھے میرے قتل کیلئے خنجر فراہم کیا...... اور تجھ پر بھی کوئی الزام نہیں کہ تو اپنے نفس سے مجبور تھا۔ مسلمان نفرت کے بدلے نفرت فروخت نہیں کرتا۔"

حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے اس اجنبی کو معاف کر دیا تھا مگر وہ بدستور آپ کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا...... "جب تک آپ میرے حق میں دعائے خیر نہیں فرمائیں گے، میں اس وقت تک آستانہ عالیہ سے سر نہیں اٹھاؤں گا۔" اجنبی کی عجیب و غریب ضد تھی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خادم اور عقیدت مند اسے سخت سزا دینے کا مطالبہ کر رہے تھے مگر آپ نے اس پر اپنی محبتوں کے خزانے لٹا دیئے، جو شخص قتل کرنے آیا تھا، وہ خود حضرت خواجہؒ کی بارگاہ جلال میں پہنچ کر قتل ہو گیا۔ پھر اللہ نے اسے نئی زندگی بخشی۔ یہاں تک کہ وہ فسق و فجور سے تائب ہوا اور اس کے نفس کی ساری کثافتیں دور ہو گئیں۔ اس نے پاکباز زندگی بسر کی اور کئی بار حج کی سعادت حاصل کی۔ پھر طواف کے دوران ہی اپنے خالق سے جا ملا۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا یہ خادم "مجاوران مکہ" کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہے۔

ہے رشک اک جہان کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

نگاہ مرد مومن سے انسانی تقدیر کا بدل جانا کوئی طلسمی داستان نہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی حیات پاک میں ایسے بے شمار مرحلے آئے کہ جب آپ نے ایک گناہ گار کو نظر بھر کے دیکھا اور اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ مشہور حدیث ہے۔

"مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔"

بے شک! حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ وہی مرد مومن تھے جن کی ایک جنبش چشم سے روحوں کے خرابے آباد ہو جاتے تھے۔ صوفی حمید الدین ایک بڑے تارک الدین بزرگ گزرے ہیں۔ ان کا شمار حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے خلفاء میں ہوتا ہے۔ اجمیر سے چند میل کے فاصلے پر شہر ناگور آباد ہے۔ صوفی حمید الدینؒ اسی کے ایک موضع سوالی کے رہنے والے تھے۔ ان کے بارے میں یہ مشہور روایت ہے کہ وہ اپنے آغاز شباب میں ایک گم کردہ راہ انسان تھے۔ مالی حالت اس قدر خراب تھی کہ گزر اوقات بھی مشکل سے ہوتی تھی لیکن اس مفلسی کے باوجود صوفی حمید الدینؒ کو خدا نے غیر معمولی حسن و جمال سے نوازا تھا۔ ان کے عشق میں مبتلا ہو کر بہت سی عورتیں اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھیں۔ صنف نازک کی اس وارفتگی نے خود ان کے دل و دماغ کو بھی متاثر کیا تھا۔ یہاں تک کہ صوفی حمید الدینؒ اور ان کے کچھ احباب بے راہ روی کی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ ایک طویل عرصے تک یہ شغل دنیا جاری رہا۔ پھر انہیں خدا نے ہدایت بخشی۔

جب صوفی حمید الدین ناگوریؒ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روحانی کمالات کی شہرت

سنی تو ایک روز سلطان الہندؒ کے دربار معرفت میں حاضر ہوئے۔ جیسے ہی حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے چہرۂ مبارک پر نظر پڑی، ہوش و خرد سے بیگانہ ہوگئے۔ پھر جب کچھ دیر بعد طبیعت بحال ہوئی تو تاجدار روحانیت سے کہنے لگے۔

"مجھے غلامی کی سند عطا کیجئے۔" صوفی حمید الدین کا لہجہ بڑا عاجزانہ تھا۔

"پہلے اپنے صنم خانۂ دل کی تو خبر لو۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ "جہاں بت سجائے جاتے ہوں وہاں عشق الٰہی کا گزر نہیں ہوتا۔ ایک کو پانے کیلئے ہزاروں سے ترک تعلق کرنا پڑتا ہے۔"

"خدا کی قسم! میں تمام اصنام خیالی کو ریزہ ریزہ کردوں گا۔" صوفی حمید الدینؒ رقت قلب کے ساتھ التجا کررہے تھے۔ "اب اس کے سوا میرے دل ویراں میں کوئی نہیں آئے گا۔" ان کی بے اختیاری دیکھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بہت متاثر ہوئے اور پھر صوفی حمید الدینؒ کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل فرمالیا۔

گناہوں سے تائب ہونے کے بعد جب پرانے ہم مشرب دوستوں نے انہیں کھوئی ہوئی راہوں کی جانب بلایا تو صوفی حمید الدینؒ بڑے جذب کے عالم میں کہنے لگے۔

"میں دنیا کی طرف جانے والے تمام راستے بھول گیا۔ اب اگر بہشت کی حوریں بھی میرے سامنے آجائیں تو پتا نہیں کہ میں انہیں دیکھوں گا یا نظر انداز کردوں گا۔"

کیف و نشاط میں ڈوبے ہوئے لوگ اپنے دیرینہ ساتھی کا جواب سن کر حیران رہ گئے۔ وہ نا آشنا راہوں کو چھوڑ کر اتنی دور نکل آئے تھے کہ حرص و ہوس کی کوئی آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ پھر صوفی حمید الدین ناگوریؒ کی طبیعت کا انقلاب ہندوستان کی روحانی تاریخ میں ایک حیثیت اختیار کرگیا۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ جیسے بزرگ انہیں "شیخ المشائخ" اور "سلطان التارکین" کے نام سے یاد کرتے تھے اور یہ سب کچھ حضرت غریب نوازؒ کا فیضان نظر تھا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سراپا جمال و محبت تھے۔ کیسا بھی خوشگوار موسم ہوتا مگر دیکھنے والوں کو آپ کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک دل نواز تبسم نظر آتا۔ سرزمین ہند کا ایک ایک گوشہ جاہلوں اور بے دینوں سے بھرا ہوا تھا۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے دربار معرفت میں کبھی کبھی نہایت بے ہودہ اور لوگ آتے تھے لیکن آپ ان کے سامنے بھی اسلام کی بے مثال رواداری اور محبت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی سنگدلی نرمی میں تبدیل ہوجاتی اور وہ تائب ہو کر پارساؤں جیسی زندگی بسر کرنے لگتے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنی پوری زندگی میں نہ کسی کو بددعا دی اور نہ کسی نے آپ کو حالت غضب میں دیکھا۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے طویل دور حیات میں بس دو مواقع ایسے آئے تھے کہ جب آپ کا چہرۂ مبارک غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔ ایک وہ لمحہ تھا جب پرتھوی راج کے ظلم و ستم سے خلق خدا تنگ تھی اور آپ نے مجبور ہو کر راجپوت حکمراں کی ہلاکت کیلئے ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔ اگر اس واقعے کی حقیقت پر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ ان کیفیات کا حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ستم رسیدہ انسانوں کی نجات کیلئے حضرت خواجہؒ کی ایک کوشش تھی جسے اللہ نے فتح و نصرت سے ہمکنار کیا...... دوسرا لمحہ وہ تھا جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ایک مرید کو ایک سود خور شخص نے ذلیل کرنا چاہا تو آپ اپنے خدمت گار کی یہ رسوائی برداشت نہ کرسکے اور لوگوں نے دیکھا کہ اس وقت آپ کی شان جلالی کا اظہار ہو رہا تھا مگر یہاں بھی یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا غصہ اپنے نفس کی خاطر نہیں تھا۔

اس واقعہ کے راوی آپ کے خلیفۂ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ہیں۔ حضرت قطبؒ فرماتے ہیں...... "میں عرصۂ دراز تک اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر رہا ہوں مگر میں نے کبھی آپ کو غصے کی حالت میں نہیں دیکھا۔ سوائے ایک بار کے، جب غریب نوازؒ اپنے مرید شیخ علیؒ کے ساتھ حجرے میں قیام فرما تھے۔ اچانک ایک اجنبی شخص خانقاہ میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی شیخ علیؒ کا گریبان پکڑ کر کھینچنا شروع کردیا اور اپنی زبان سے نہایت نازیبا کلمات ادا کرنے لگا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ صورتحال سے بے خبر تھے۔ اس لئے آپ نے بدتہذیبی کے مظاہرے کی وجہ دریافت کی۔ اجنبی نے غضبناک لہجے میں بتایا کہ شیخ علیؒ اس کا قرضدار ہے اور مسلسل وعدے کرنے کے باوجود رقم کی ادائیگی نہیں کررہا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اجنبی شخص سے رقم کی تعداد پوچھی تو صرف چند پیسوں کی بات تھی۔ آپ نے قرض خواہ کو محبت آمیز لہجے میں سمجھایا کہ جہاں اس نے اتنا انتظار کیا ہے، وہاں کچھ دن اور صبر کرلے۔ اس وقت کوئی بھی شریف النفس انسان ہوتا تو حضرت خواجہؒ کی گفتگو کا مقصد آسانی سے سمجھ لیتا...... مگر وہ سود خور اپنی حد سے گزر گیا تھا اور اس نے تمام آداب و اخلاق کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اس کی بس ایک ہی ضد تھی کہ وہ اسی وقت شیخ علیؒ سے اپنے پیسے لے کر جائے گا ورنہ تشدد کے ذرائع استعمال کرے گا۔ یہ ایک بڑا جارحانہ عمل تھا۔ پھر بھی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اتمام حجت کے طور پر اسے آخری وقت تک سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب وہ مصالحت کا ایک لفظ بھی سننے کو آمادہ نہیں ہوا تو آپ نے اپنی چادر زمین پر بچھا دی۔ یہ وہی چادر تھی جسے حضرت خواجہ غریب نوازؒ اپنے دوش مبارک پر ڈالے رہتے تھے۔

اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا چہرۂ مبارک غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ پھر آپ نے غضبناک لہجے میں اس اجنبی شخص سے فرمایا۔ "علی کا گریبان چھوڑ دے اور اپنی رقم زمین پر سے اٹھالے۔"

ابھی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے الفاظ کی گونج ختم نہیں ہوئی تھی کہ پوری چادر نقرئی سکوں سے بھر گئی۔ اجنبی بدحواس ہوگیا اور شیخ علیؒ کا گریبان چھوڑ کر دولت کے اتنے بڑے ذخیرے کو دیکھنے لگا۔ اسے سکتہ سا ہوگیا تھا۔ آخر کچھ دیر بعد اس کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو سکوں کے ڈھیر سے اپنی مطلوبہ رقم اٹھانے لگا۔ سود خور نے اپنی پوری زندگی میں دولت کا اتنا بڑا انبار نہیں دیکھا تھا۔ کثرت

مال نے اسے بددیانتی پر اکسایا چند لمحوں میں نیت بگڑ گئی اور پھر اجنبی شخص نے اپنی رقم سے کچھ سکے اٹھا کر جیب میں ڈال لئے۔ اس کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس سے پوچھا کہ اب تو شیخ علی کی طرف تیرا کوئی مطالبہ نہیں رہا؟ سود خور نے اثبات میں جواب دیا اور تیزی کے ساتھ خانقاہ سے نکل کر چلا گیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو اس چوری کی خبر نہ ہو جائے مگر آپ ان تمام چیزوں سے بے نیاز تھے اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی قصداً انجان بن گئے تھے۔

جب سود خور چلا گیا تو حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے اپنے مرید شیخ علیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا...... "یہ تو اس ذات سے بے نیاز کی دستگیری ہے کہ وہ اپنے عاجز بندوں کی مشکل کشائی فرماتا ہے انہیں اہل دنیا کے سامنے رسوا ہونے سے بچا لیتا ہے...... مگر بندگی کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ درویش کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی انسان سے حاجت روائی کی امید رکھے۔ قرض اور درویشی کی کوئی نسبت نہیں۔"

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ فرماتے ہیں...... کچھ دن بعد میں نے اس اجنبی سود خور کو حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی خانقاہ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا لیکن اس بار وہ بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے وہ برسوں سے بیمار ہے۔ سارا غرور و تکبر رخصت ہو چکا تھا۔ اب وہ بھکاری کے مانند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پائے مبارک پر سر رکھے رو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا ایک ہاتھ بالکل خشک ہو چکا ہے اور کسی درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح لٹک رہا ہے۔ حضرت سلطان الہندؒ نے دریافت کیا کہ اب کیا تکلیف ہے؟ اجنبی نے گریہ وزاری کرتے ہوئے بتایا کہ جس دن وہ اپنی رقم لے کر گھر گیا، اسی روز اس کے دائیں ہاتھ میں شدید درد اُٹھا۔ شہر کے تمام طبیبوں سے رجوع کیا مگر وہ درد نا قابل علاج ٹھہرا۔ پھر کچھ دن بعد دوسری آفت ناگہانی نازل ہوئی۔ درد تو تھم گیا لیکن ہاتھ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ یہ کہہ کر اجنبی نے اپنا بے حس و حرکت ہاتھ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سامنے پیش کر دیا۔

سلطان الہندؒ نے جواباً فرمایا...... "میں کوئی طبیب نہیں ہوں۔ کسی اچھے معالج کو دکھاؤ۔"

سود خور دوبارہ زار و قطار رونے لگا اور پھر اس نے اپنے گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ وہ حضرت خواجہؒ کا مجرم ہے۔ اس نے شیخ علیؒ کے قرض کی ادائیگی کے دن اپنے مطالبے سے زیادہ سکے اُٹھا لئے تھے۔ پھر یہی چوری اس کیلئے عذاب جاں بن گئی۔ اب وہ اپنے جذبات حرص و ہوس پر نادم ہے۔ اگر حضرت خواجہؒ نے اسے معاف نہیں کیا تو وہ تمام عمر اسی طرح زمانے کی ٹھوکریں کھاتا رہے گا۔

اجنبی کا لہجہ اس قدر رقت آمیز تھا کہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کو اس پر رحم آ گیا۔ تاہم آپ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا...... "اے شخص! تو میرا مجرم نہیں۔ سکوں کا وہ انبار تو اللہ کے خزانے میں سے ایک حقیر خزانہ تھا۔ اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ کوئی بندہ چوری کر کے اپنا رزق حاصل کرے۔

اسے حلال روزی کی جستجو ہوتی ہے؟ ہر انسان مقررہ وقت پر اپنا نامۂ اعمال دیکھ لے گا۔ تیرے ہاتھ کا اس طرح سوکھ جانا چوری کے باعث نہیں، شیخ علی کی دل آزاری کا سبب ہے۔ اگر وہ تجھے معاف کر دے گا تو پھر میں بھی تیری صحت یابی کیلئے بارگاہ خداوندی میں عرض کر دوں گا۔"

وہ شخص بے قراری کے عالم میں اٹھا اور اس درخت کے قریب پہنچا جہاں شیخ علیؒ اپنے پیر و مرشد کیلئے کھانا پکا رہے تھے۔ اگرچہ شیخ علیؒ اس شخص کی طرف سے بہت آزردہ خاطر تھے لیکن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی بنیادی تعلیم ہی یہی تھی کہ دشمنوں کو بھی معاف کر دو۔ شیخ علیؒ نے پیر و مرشد کی تربیت کے زیر اثر اس شخص کو دل کی گہرائی سے معاف کر دیا۔ پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے نماز ادا کرنے کے بعد اجنبی کے حق میں دعائے خیر فرمائی اور اپنا دست مبارک اس کے مفلوج ہاتھ پر تین مرتبہ پھیرا۔ اجنبی کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کے خون کی گردش اچانک تیز ہو گئی ہو۔ زندگی کی حرارت سے محروم ہاتھ آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگا۔ یہاں تک کہ چند روز بعد وہ شخص مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا۔

یہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی ایک بڑی کرامت تھی کہ خدا نے آپ کو ایک خاص انداز مسیحائی بخشا تھا جس کے اثر سے اجنبی کا جسمانی عارضہ ختم ہو گیا تھا مگر اس کرامت کا زیادہ روشن پہلو یہ تھا کہ وہ سود خور مریض صحت یاب ہو کر اپنے گھر واپس نہیں گیا۔ ایک بار آپ کے آستانے پر حاضر ہوا تو پھر اسی در کا پابند ہو کر رہ گیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کل تک جو شخص حرص و ہوس کا غلام تھا، آج اس کے قلب کی تمام کثافتیں دور ہو گئی تھیں۔ پھر لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اپنا سارا مال و زر خدا کی راہ میں لٹا رہا تھا۔ روح پر برسوں کے چھائے ہوئے گہرے بادل چھٹ رہے تھے اور قلب کی تاریکیوں سے تیز روشنی کی ایک کرن پھوٹ رہی تھی۔

لوگوں نے اس کی طبیعت کا یہ انقلاب دیکھ کر پوچھا...... "تو نے اپنی متاع حیات اتنی آسانی سے لٹا دی۔ اب کس کے سہارے زندہ رہے گا؟"

اس نے سرِ بازار نعرۂ مستانہ بلند کیا اور دنیا والوں سے چیخ کر کہا...... "میں انسانی خون میں ڈوبی ہوئی دولت تمہیں واپس کرتا ہوں۔ مجھے غریب نوازؒ کی ایک نظر کافی ہے۔"

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی چشم کرم نے اجمیر کے باشندوں کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ بت پرست اپنے صنم خانوں کو توڑ کر مسجدیں تعمیر کر رہے تھے۔ سود خوری جن کا آبائی مذہب تھا، وہ اپنی زندگی کا تمام سرمایہ اللہ کی راہ میں بے دریغ لٹا رہا تھا۔ جن کے بازار ہوس میں نسوانی عزت و آبرو کی بولیاں لگائی جاتی تھیں، وہ ناموس زن کے محافظ بن گئے تھے، جن کی راتیں شراب سرخ سے روشن ہوتی تھیں، وہ ہمیشہ کیلئے کوچۂ لذت و خمار سے نکل آئے تھے، جو قمار خانۂ وقت میں اپنی عورتوں تک کو ہار جاتے تھے، وہ زندگی کی بساط پر محنت و جفاکشی کی بازی کھیل رہے تھے۔ پیپل کے درختوں، زہریلے سانپوں، اڑتے پرندوں، گھاس چرتے جانوروں اور بہتے دریاؤں کو خدا ماننے والے اب ایک معبود

کے آگے سجدہ ریز تھے اور یہ سب کچھ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا فیضان نظر تھا۔

ایک طرف اہل اجمیر اپنی ناخوش بختی پر ناز کر رہے تھے اور دوسری طرف حضرت خواجہ غر
کے بعض عقیدت مندوں کو آتش فراق نے جلا ڈالا تھا۔ ان سوختہ جانوں میں سر فہرست آپ
اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ تھے۔ جب سلطان الہندؒ تبلیغ اسلام کیلئے اجمیر تشریف
تھے۔ اس وقت آپ نے اپنے جانشین کی حیثیت سے حضرت قطبؒ کو دہلی میں متعین فرما دیا
آپ بت پرستوں سے جنگ کرنے میں اس قدر مصروف ہو گئے تھے کہ کسی چیز کا ہوش ہی نہیں
اس دوران حضرت قطبؒ دہلی سے مسلسل خطوط لکھتے رہے۔ ہر عریضے میں ایک ہی التجا ہو
کہ پیر و مرشد چند دنوں کیلئے دہلی تشریف لا کر اس شہر کے باشندوں کو بھی قدم بوسی کی دولت
سرفراز فرمائیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو حضرت قطبؒ کی بے قراریوں کا شدید احسا
مگر آپ نے اپنی زندگی کے جس عظیم مقصد کی خاطر ترک وطن پر مجبور ہوئے تھے، ابھی اس کی تکم
وقت نہیں آیا تھا۔ بالآخر جب ایک طویل کشمکش کے بعد حق کو باطل پر فتح حاصل ہو گئی اور اجمیر
کے بت پرست قطار در قطار حلقۂ اسلام میں داخل ہونے لگے تو سلطان الہندؒ نے دہلی جانے کا ا
فرمایا۔ اجمیر کے باشندوں کو غریب نوازؒ کے عزم سفر کی اطلاع ہوئی تو مسلم عقیدت مندوں کا ا
ہجوم، خانقاہ کے سامنے رو رو کر فریاد کرنے لگا۔

''اب ہماری حیات و موت آپ کے دامن سے وابستہ ہے۔ ابھی تو ہم نے نئی زندگی کے آدا
بھی نہیں سیکھے ہیں۔ پھر آپ ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟'' اجمیر میں ایک حشر سا برپا ہ
''انا ساگر تو آپ ہیں۔ جب پانی ہی خشک ہو جائے گا تو تشنۂ لب کیسے جئیں گے؟'' فطرتاً ن
ہونے کی وجہ سے راجپوتوں کی عقیدت و محبت بھی شدید تھی۔ اس لئے حضرت خواجہؒ بھی ان
جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ پھر ان لوگوں کی دلجوئی بھی ضروری تھی جو اپنے آبائی مذہب
چھوڑ کر نئے عقائد کی پناہ میں آئے تھے۔ غرض ان تمام باتوں کے پیش نظر حضرت خواجہ معین الد
چشتیؒ نے سفر کا ارادہ تبدیل کر دیا۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ حضرت خواجہؒ کی اصلاحی تحریک فروغ پاتی رہی اور اس کے ساتھ
آپ کی مصروفیات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حضرت قطبؒ کے حسرت و یاس میں ڈوبے ہ
خطوط پیہم آتے رہے اور آپ مرید باصفا کو ہر بار ان الفاظ میں تسلی دیتے رہے۔

''فرزند! اللہ پر بھروسا رکھ۔ میں بہت جلد تم سے آملوں گا لیکن وصال و فراق کے اس مسئلے کو
اہمیت نہ دو۔ انسان کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ صرف اللہ کیلئے رشتے قائم کرے اور اسی کی خاطر توڑ
بے نیاز ہو جائے۔''

جب اس قسم کے خطوط دہلی پہنچے تو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ آبدیدہ ہو گئے۔ آپ
مرشد کے مزاج سے واقف تھے، اس لئے زیادہ اصرار نہ کر سکے۔ تاہم کچھ دن بعد ایک
سے خط تحریر کیا۔

''شیخ محترم! یہ امر واقع ہے کہ میری طرف سے مسلسل خود غرضی کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ نگاہ شوق صبح و شام سرمہ گزار بھٹکتی رہتی ہے اور ناکام و نامراد لوٹ آتی ہے۔ روز بزم انتظار آراستہ کرتا ہوں مگر میں نے ایک لمحے کیلئے بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ آپ کس قدر سنگین محاذ پر طاغوتی قوتوں سے برسرپیکار ہیں۔ خادم نے اپنی اس کمزوری پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اب غلام کیلئے فراق کی ایک ساعت بھی گراں ہے۔ خطوط میں آپ کے فرمودات مقدسہ پڑھ کر دماغ تو اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے لیکن دیدہ و دل روز اول کی طرح پیاسے ہیں۔ آنکھیں انسانی ہجوم میں آپ کے چہرۂ مبارک کو تلاش کرتی رہتی ہیں۔ انہیں اس کے سوا کوئی کام نہیں۔ دل اسی بزم نور کو ڈھونڈتا ہے جہاں اس نے زندگی حاصل کی تھی۔ میری حیثیت ایک بیمار کی سی ہے۔ اگر آپ نے جلد مسیحائی نہ کی تو مرض کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے نہایت پُرسوز انداز میں اپنی قلبی کیفیات کا اظہار کیا تھا۔ آخر میں اس طرح درخواست کی گئی تھی...... ''میں خواجۂ خواجگاں کی ایک نگاہ کرم کا طالب ہوں۔ سفر کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ بس سلطان الہندؒ کے حکم کا انتظار ہے۔ مجھے اپنی غلامانہ نسبت پر یقین ہے کہ غریب نوازؒ اس گدا کو قدم بوسی کی اجازت مرحمت فرما دیں گے۔''

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے یہ سوچ کر خط تحریر کیا تھا کہ یا تو پیر و مرشد انہیں اجمیر حاضر ہونے کی اجازت دیدیں گے یا پھر از راہ کرم نوازی خود دہلی تشریف لے آئیں گے۔ قارئین کو یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے کسی مصلحت سے کام لیتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ آپ احترام مرشد میں اپنی دلی کیفیات کو صحیح طور پر بیان ہی نہ کر سکے۔ ورنہ حضرت قطبؒ تو وہ جاں نثار تھے کہ آپ تیرہ سال کی عمر میں ماں باپ، عزیز و اقارب، احباب و غمگسار اور وطن کو چھوڑ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہمراہ ہندوستان چلے آئے تھے۔ اس کم سنی میں خون اور زمین کے نازک رشتوں کو توڑ دینا یقیناً محبت کی اعلیٰ ترین مثال تھی۔ پھر اس کے بعد حضرت قطبؒ ایک اور آزمائش سے گزرے۔ آپ کو والدین کی یاد بھی آئی، ہوائے وطن نے سرگوشیوں میں دوستوں کے پیغام بھی سنائے، دیار غیر میں آشنا مٹی کی خوشبو بھی مہکی، بچپن کے شناسا در و دیوار نے صدائیں بھی دیں مگر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے ایک لمحے کیلئے بھی مڑ کر نہیں دیکھا اور حضرت خواجہؒ کی محبت میں تمام حوالوں کو فراموش کر دیا۔ اور آج اسی جاں نثار مرید نے مرشد کے روبرو اپنے دل کا درد بیان کیا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے یہ خط پڑھا تو بے قرار ہو گئے۔ آپ نے فوراً حضرت قطبؒ کو جواب تحریر کرتے ہوئے فرمایا۔ ''فرزند! تمہارا یہ اضطراب درویشی کی نگاہ میں لائق ستائش ہے۔ میں کسی بھی حالت میں تمہارے جذبات سے بے خبر نہیں رہا۔ یہاں کے لوگ ابھی اسلامی معاشرت کے آداب سے ناواقف ہیں۔ ان کی اصلاح حال کیلئے اجمیر میں میرا قیام بے حد ضروری تھا۔ خداوند ذوالجلال نے تحریک اسلامی کو عظیم الشان کامیابی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ اب میں کسی حد تک مطمئن ہوں۔ تم نے قدم بوسی کی اجازت طلب کی ہے؟ تمہیں کیا معلوم کہ میں تم سے ملنے کیلئے کتنا بے چین

ہوں۔ دہلی میں تمہاری ہمہ وقت موجودگی ناگزیر ہے۔ بھٹکے ہوئے مسافروں کو مسلسل دعوت حق
رہو۔ وہ کسی نہ کسی دن اپنی حقیقی منزل کی طرف پلٹ ہی آئیں گے۔ کفر کے بہت سے
لا الہ سے مسمار ہو چکے ہیں۔ بس اب ہندوستان کے گوشے گوشے میں پرچم حق لہرانے
باطل ذلت آمیز شکست کھا کر کارزار ہستی سے فرار ہو چکا ہے اور حق تو یہ ہے کہ باطل فرار ہونے
ہے۔ تمہیں اجمیر آنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود تمہاری قربتوں کی سعادت حاصل کرنے
عنقریب دہلی پہنچنے والا ہوں۔ میرا انتظار کرو۔"

یہ خط ارسال کرنے کے کچھ عرصے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے مریدوں، عقیدت
مندوں اور اجمیر کے دیگر شہریوں سے فرمایا...... "میں نے اپنی زندگی تم لوگوں کیلئے وقف کر دی
اجمیر سے باہر بھی کچھ اہل دل آباد ہیں۔ زمانہ ہو گیا کہ وہ مجھ سے اپنے حقوق طلب کر رہے ہیں
یہ کیسی عجیب بات ہے کہ میں آج تک اپنے اس فرض کی ادائیگی نہ کر سکا۔" حاضرین مجلس حضرت خواجہ
کی گفتگو کا مفہوم سمجھ رہے تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب غریب نوازؒ دہلی تشریف لے جانا چاہتے
ہیں۔ ایک بار پہلے بھی جب حضرت خواجہؒ نے سفر کا ارادہ کیا تھا تو لوگوں کے آنسو دیکھ کر آپ
رک گئے تھے۔ اب وہی صورتحال دوبارہ ظاہر ہوئی تو حسب سابق عقیدت مندوں کے حلقے میں
اضطراب پھیل گیا اور لوگ بے اختیار رونے لگے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اہل اجمیر کی گریہ وزاری سے متاثر ہو کر فرمایا۔ "جب تک تم
لوگ مجھے اجازت نہیں دو گے، اس وقت تک میں دہلی نہیں جاؤں گا۔" یہ حسن اخلاق اور عجز و انکسار
ایک ایسا نمونہ تھا کہ جسے دیکھ کر اہل مجلس حیران رہ گئے۔ حضرت خواجہؒ کی اجازت طلبی ایسی ہی تھی جیسے
کوئی شہنشاہ اپنے غلاموں سے کچھ مانگ رہا ہو، وہ لوگ جو کچھ دیر پہلے زار و قطار رو رہے تھے، اچانک
ان کی آنکھیں خشک ہو گئیں اور چہرے سوال بن کر رہ گئے۔

پھر ایک راجپوت سردار ہمت کر کے کھڑا ہوا اور ادب سے سر جھکا کر عرض کرنے لگا۔ "ہم تو آپ
ہی کی صورت دیکھ کر زندہ رہتے ہیں۔ اگر یہ روشن چہرہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو ہماری دنیا
تاریک ہو کر رہ جائے گی۔"

جیسے ہی اس شخص نے اپنی بات مکمل کی دوسرا راجپوت گردن خم کئے ہوئے اپنی جگہ ایستادہ ہو گیا
......"ہماری نظر میں آپ دنیا کے ہر شہنشاہ سے زیادہ بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ہم نے آپ کے ذریعے
ہدایت حاصل کی ہے، اس لئے آپ ہی ہمارے سردار ہیں۔" راجپوت جوش جذبات میں بول رہا تھا
......"ہم آپ کے احسانات کا قرض اپنی جانیں دے کر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم
کوئی عمل بے ادبی میں شمار ہوتا ہو؟ بے شک! ہم اس احترام کا مظاہرہ نہیں کر سکے جو آپ کے شایان
شان تھا۔" راجپوت سردار، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عزم سفر کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ شاید
آپ اس غیر مہذب قوم کی کسی گستاخی سے دلبرداشتہ ہو گئے ہیں اور اس علاقے کو چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے
دہلی تشریف لے جا رہے ہیں۔

آخر میں وہ راجپوت دست بستہ آگے بڑھا جو پرتھوی راج چوہان کے دربار میں اعلیٰ عہدے پر
قائز تھا اور جس نے شہاب الدین غوری کے حملے سے پہلے تمام سرکاری اعزاز ٹھکرا کر اسلام قبول کر لیا
تھا...... "کیا اجمیر کی سرزمین دوبارہ ان مبارک قدموں کو چھونے کی سعادت حاصل نہ کر سکے گی؟ اگر
حضور دہلی جانے کا فیصلہ کر ہی چکے ہیں تو پھر ہمیں بھی اپنے ہمراہ لے چلئے کہ آپ کے سوا ہمارا یہاں
کون ہے؟ یہ گھر تو آپ ہی کے دم سے آباد ہیں جن مکانوں پر شیخ کا عکس نہ ہو وہ مردہ روحوں کا مسکن
ہیں۔" راجپوت سردار نے اپنے جذبوں کو پوری سچائی کے ساتھ بیان کر دیا تھا۔

اس کے بعد دوسرے عقیدت مندوں نے بھی اپنی بے قراریوں کا اظہار کیا۔ حضرت خواجہ غریب
نوازؒ بہت دیر تک ان لوگوں کے اضطراب کا حال سنتے رہے۔ پھر آپ نے محبت آمیز لہجے میں فرمایا
......"نہ تم نے کوئی گستاخی کی ہے اور نہ کسی بے ادبی کے مرتکب ہوئے ہو۔ اگر تم سے یہ جرم بھی سرزد
ہو جاتا تو میں تمہیں معاف کر دیتا۔ میرا اور تمہارا رشتہ ناقابل شکست ہے۔ اسلام کے زیر سایہ آنے
کے بعد ہم سب برابر ہیں۔ اب اگر کوئی فرق باقی رہے گا تو وہ صرف عبادت اور پرہیزگاری کے سبب
ہوگا۔ تم اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ مجھے تمہاری ہدایت کیلئے کتنے دور دراز مقام سے یہاں بھیجا گیا
ہے؟ میں تمہیں چھوڑ کر اور کہیں نہیں جاؤں گا۔ ہاں اگر مالک کائنات یہی چاہتا ہے تو پھر انسان کو ہر
حال میں راضی بہ رضا رہنا چاہئے۔ تمہارے لئے اللہ اور رسول ﷺ کی گواہی کافی ہے۔ بس اسی
ایک کلمہ مقدسہ کو بقا ہے اور دنیا میں جو کچھ ہے وہ فنا ہو جانے والا ہے۔ اسلام میں شخصیت پرستی حرام
ہے اگر میں تمہارے درمیان سے اُٹھ جاؤں تو اپنے گریبان چاک نہ کرنا۔ میں بحکم خدا واپس آؤں
گا۔" یہ کہہ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ایک خادم کو اپنے ہمراہ لیا اور دہلی کی طرف روانہ
ہو گئے۔ ہزاروں لوگ اداس چہروں اور نمناک آنکھوں کے ساتھ آپ کو رخصت کرنے کیلئے دور تک آئے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت سلطان الہندؒ اپنی زندگی میں دوسری بار دہلی تشریف لائے تھے۔ پہلی مرتبہ اس وقت آپ
کا گزر ہوا تھا جب اس تاریخی شہر پر سمراٹ پرتھوی راج چوہان کی حکومت تھی...... مگر آج اس علاقے
کا نقشہ بدل چکا تھا۔ شہاب الدین غوری کے غلام قطب الدین ایبک نے اسلامی سلطنت کی سرحدیں
دور دور تک پھیلا دی تھیں۔ دہلی کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے نماز
شکر ادا کی اور پھر اپنے خلیفۂ اکبر قطب الدین بختیار کاکیؒ سے فرمایا جو آپ کے استقبال کیلئے حاضر
ہوئے تھے۔

"کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہم غریب الوطن لوگ اپنی زندگی میں فتح و نصرت کا ایسا یادگار لمحہ بھی
دیکھیں گے۔ ہر طرف کلمۂ توحید کی گونج ہے، اذانوں کا نور ہے اور بلند عمارتوں پر لہراتا ہوا اسلامی
پرچم ہے۔ بے شک! تمام تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں۔ جو عالموں کا پالنے والا ہے۔"

حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے دہلی میں کئی ماہ تک قیام فرمایا۔ جیسے جیسے آپ کی آمد کی خبر عام ہوتی
گئی، لوگ سلطان الہند کی خانقاہ کے دروازے پر جمع ہونے لگے۔ آنے والوں میں ہندو بھی تھے،

مسلمان بھی، غریب بھی تھے اور امرائے وقت بھی۔ کوئی برسوں سے بیمار تھا اور کوئی بے اولاد۔ حضر[ت] خواجہ معین الدین چشتیؒ نے امتیاز مذہب و ملت کے بغیر سب کیلئے دعائیں کیں۔ اللہ نے بیماروں [...] بخشی اور بنجر زمینوں کو فصل مراد سے سرسبز و شاداب کر دیا۔ تذکرہ نویسوں نے مستند حوالوں سے [...] ہے کہ اس مختصر سے عرصے میں حضرت خواجہؒ کی ذات گرامی سے اس قدر کرامتوں کا ظہور ہوا [...] میں ہلچل سی مچ گئی۔ جن بت پرستوں کو قطب الدین ایبک کی شمشیر اقتدار بھی مسلمان نہیں کر سکی [...] وہ حضرت سلطان الہند کا چہرۂ مبارک دیکھتے ہی ایمان لے آئے۔ ایک روایت کے مطابق [...] منکرین حق نے خدائے واحد کے آگے سر جھکا دیا اور صدہا پتھر کے پجاریوں نے اپنے اصنام خیالی [...] ریزہ ریزہ کر کے عقائد کا نیا شہر بسا لیا۔ ایسا شہر جس کے در و دیوار شمع حرم سے فروزاں تھے۔

اس موقع پر بعض تنگ نظر لوگوں نے کم ظرفی کے مظاہرے بھی کئے۔ یہ مسلمانوں کا وہ گروہ تھا [...] مذہب کے نام پر سیم و زر کی تجارت کر رہا تھا۔ اس جماعت کے افراد بظاہر متقی اور پرہیزگار نظر آتے تھے لیکن در پردہ آسائش دنیا کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ان لوگوں نے شریعت کی آڑ لے کر ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ مسند علم پر بیٹھنے والے، سلطان قطب الدین ایبک کے دربار میں بڑا اثر و رسوخ رکھتے تھے اور اپنی اسی قربت و رسائی سے فائدہ اٹھا کر فرمانروائے ہند کے کان بھرنے لگے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ذوق سماع پر اعتراض کیا گیا کہ درویشی کی یہ رسم مذہب کے خلاف ہے۔ اس سے عام مسلمانوں میں گمراہی پھیل رہی ہے۔ اگر معین الدین چشتیؒ اس عمل سے باز نہیں رکھا گیا تو بڑے فتنے پیدا ہو جائیں گے۔ بعض علماء نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ حضرت خواجہؒ کو دہلی کی حدود سے دور کر دیا جائے۔

سلطان قطب الدین ایبک ایک ایک مرد حق پرست کے خلاف الزام تراشیوں کے افسانے سنتا رہا۔ مخالف علماء اپنے سرکاری عہدوں کے نشے میں اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے گرد سازشوں کا حصار کھینچنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن جب نتائج سامنے آئے تو انہیں شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ سلطان قطب الدین ایبک نے اس گروہ کے نمائندوں کو تلخ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تم جانتے بھی ہو کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کون بزرگ ہیں؟" ایبک کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ میں گہرا طنز پوشیدہ تھا مگر علماء کی جماعت جوش حسد میں سلطان کی گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھ سکی۔

ایک درباری عالم جن کے لباس سے شان امارت جھلکتی تھی، تضحیک آمیز لہجے میں بولے......" [...] ہے کہ وہ درویشی کا خرقہ پہن کر سیستان کی طرف سے آئے ہیں۔ اب ان کا یہی مشغلہ ہے کہ ایک گوشے میں بیٹھ کر سماع سنتے رہیں۔ ان کی خانقاہ کے دروازے پر ہر وقت بے عمل لوگوں کی بھیڑ رہتی ہے اور دنیا والے ایسی گوشہ نشینی کو اسلام سمجھ بیٹھے ہیں۔"

ابھی ان عالم موصوف کی گفتگو مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ دوسرے عالم درمیان میں بول پڑے

"کیسی عجیب بات ہے کہ کم نظروں نے زرد و سبز لباس کو مذہب کی علامت سمجھ لیا ہے......اور وہ لوگ جو شب و روز مخلوق خدا کی خدمت میں مصروف ہیں، اسلام کا عملی نمونہ پیش کر رہے ہیں ان کا کوئی پرسان حال ہی نہیں۔ افسوس! رہبانیت کا درس دینے والوں کے گرد انسانوں کا ہجوم ہے اور زندگی کے ہر محاذ پر جہاد کرنے والے اس طرح تنہا کھڑے ہیں کہ کوئی ان کی بات سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔" درباری عالم کا اشارہ اپنی ذات کی طرف تھا اور وہ اپنی زندگی کو اسلامی عمل کا بہترین نمونہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ابھی تیسرے درباری عالم، لب کشائی کرنے والے تھے کہ سلطان قطب ایبک نے ان کی تقریر کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ "بس آپ حضرات خاموش ہو جائیں۔ میں تمام دلائل سن کر ان کی حقیقت کو سمجھ چکا۔" سلطان کے لہجے میں شدید ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا...... "تم اس شخص کو رہبانیت کا طعنہ دیتے ہو جو اللہ کا پیغام سنانے کیلئے اپنی نسل اور زمین کے تمام رشتے توڑ کر دیار غیر میں چلا آیا۔ اب اس کا یہ حال ہے کہ وہ توحید و رسالت کی دعوت لے کر صحراؤں، میدانوں، پہاڑوں اور دریاؤں میں تنہا بھٹک رہا ہے۔ تم ایسے شخص کو راہب کہتے ہو؟ تمہیں خدا سے ڈر نہیں لگتا؟ اقتدار خود جس کے دروازے پر شاہانہ مراعات لے کر حاضر ہوا، جس نے دنیا کی ہر آسائش سے منہ موڑ لیا، تم اس پر بے عملی کا الزام عائد کرتے ہو؟ تم لوگ قطعاً نہیں جانتے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کون ہیں؟ حضرت خواجہؒ تو وہ ہیں کہ جن کے در پر میرے آقا شہاب الدین غوری حاضر ہوئے تھے اور ان کی دعاؤں سے اللہ نے لشکر اسلام کو عظیم الشان فتح بخشی تھی۔" سلطان قطب الدین ایبک نے جس طرح حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی شان میں قصیدہ پڑھا، اسے سن کر تمام درباری علماء کے چہرے اتر گئے۔ دراصل وہ اس راز سے بے خبر تھے کہ شہاب الدین غوری، پرتھوی راج چوہان کو شکست دے کر بارگاہ سلطان الہندؒ میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت قطب الدین ایبک بھی ایک غلام کی حیثیت سے افغان سپہ سالار کے ہمراہ تھا......اور آج جب کئی سال بعد علمائے ظاہری نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ذات گرامی پر تنقید کی تھی تو ایبک نے اپنی عقیدت کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ اس کے بعد مخالفین مزید کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکے تھے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

ان ہی دنوں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، قطب الدین بختیار کاکیؒ اور دوسرے فقرائے دہلی کے ساتھ جنگل کی سیر میں مصروف تھے کہ اچانک ایک نوجوان شہسوار سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس کا گھوڑا برق رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن جیسے ہی وہ نوجوان قریب آیا اور اس کی نظر بزرگان دین پر پڑی، وہ گھوڑے سے اتر گیا۔ شہسوار کے کاندھے پر کمان لٹک رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شکار کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ نوجوان اپنے گھوڑے کی لگام پکڑ کر آگے بڑھا اور جب نزدیک آ گیا تو اس نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور دوسرے بزرگوں کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ پھر کچھ دور تک اسی طرح پیدل چلتا رہا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے

کے بعد وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور کسی آندھی کی طرح جنگل میں داخل ہوکر روپوش ہوگیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ یکایک ٹھہر گئے اور بہت دیر تک اس راستے کو دیکھتے رہے جدھر سے نوجوان گزرا تھا۔ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے پیرومرشد کی اس بدلی ہوئی کیفیت کو فوراً ہی محسوس کرلیا۔

''شیخ محترم! کیا کوئی عجیب شے پیش نظر ہے؟'' حضرت قطبؒ نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں قطب! میں اس نوجوان کی شکل میں قدرت خداوندی کی جھلک دیکھ رہا تھا۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اثرانگیز لہجے میں فرمایا...... آپ کی بات سن کر دوسرے بزرگ بھی حیرت زدہ ہوگئے تھے...... ''یہ فقیر دوست نوجوان ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ وہ ہم لوگوں کے احترام میں گھوڑے سے نیچے اتر آیا تھا اور اس وقت تک دوبارہ سواری کی پشت پر نہیں بیٹھا، جب تک ہمارے اور اس کے درمیان کچھ فاصلہ حائل نہیں ہوگیا۔ یہ ادب اور انکسار کی روشن علامت ہے۔''

''وہ ایک عام سا نوجوان ہے۔'' دوسرے بزرگ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی بات کے جواب میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ''اگر وہ کوئی امیر ہوتا تو ہم نوجوان کے اس عمل کو انکسار کا نام دے سکتے تھے۔''

''انکسار ہر حال میں انکسار اور ادب بہر صورت ادب ہے۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا...... ''نوجوان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ درویشوں کی صحبت پسند کرتا ہے۔ اس کا یہ عمل دونوں جہان میں سعادت کا سبب بنے گا۔ وہ بزرگان دین کے حلقۂ اثر میں ہے خدا اسے اس وقت تک زمین سے نہیں اٹھائے گا، جب تک وہ تاج شاہی نہیں پہن لے گا۔'' حضرت خواجہ غریب نوازؒ عالم جذب میں فرما رہے تھے۔ ''اقبال اس پر سایہ فگن ہے۔ تخت ہندوستان اس کا انتظار کر رہا ہے کہ وہ آئے اور عدل وانصاف کے ساتھ لوگوں پر حکومت کرے۔''

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے الہامی کلمات سن کر تمام بزرگ حیران رہ گئے مگر حضرت قطبؒ کو اس پیش گوئی پر ذرا بھی حیرت نہیں تھی کیونکہ آپ اپنے پیرومرشد کے عارفانہ مقام سے واقف تھے۔

اس طرح وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ دہلی کے باشندے خوش نصیب تھے کہ انہیں ہندوستان کے سب سے بڑے ولی اللہ کی صحبت حاصل تھی۔ اس مختصر سے عرصے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے بے شمار بندگان خدا کا جسمانی اور روحانی علاج کیا۔ جانگداز ساعت قریب آپہنچی جب آپ نے اپنا سامان سفر باندھنا شروع کیا۔ یہ تو اردو زبان کا ایک محاورہ ہے جو کسی شخص کی روانگی کے وقت استعمال کیا جاتا ہے ورنہ حضرت سلطان الہندؒ کا سامان سفر ہی کیا تھا۔ معتبر تاریخی کتابوں میں درج ہے کہ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوستان تشریف لائے تھے تو آپ کا کل اثاثہ ایک جوڑ کپڑوں، ایک جاء نماز اور پانی کے ایک برتن پر مشتمل تھا، آپ نے اسی حالت میں صرف ایک خادم کے ساتھ سرزمین دہلی پر قدم رکھے۔ دہلی میں معاشی اعتبار سے فارغ البال لوگوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ اکثر حضرات نے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کیلئے قیمتی تحائف بطور نذر پیش کئے۔ حضرت خواجہ

غریب نوازؒ نے ان لوگوں کو خوش کرنے کیلئے تمام نذریں قبول کرلیں مگر فوراً ہی ان اشیاء کو درویشوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کردیا۔ امرائے شہر نے بھی ایک بڑی رقم خدمت عالیہ میں پیش کی۔ حضرت خواجہؒ نے اس ڈھیر کو بھی محتاجوں کے درمیان کھڑے کھڑے لٹا دیا اور پھر دہلی سے رخصت ہوئے تو آپ کی ظاہری حالت روز اوّل سے مختلف نہیں تھی۔ دہلی کے بے شمار باشندے آپ کو الوداع کہنے کیلئے بہت دور تک ساتھ ساتھ آئے تھے۔ آپ انہیں بار بار منع فرما رہے تھے۔

''لوگو! تمہاری محبت اپنی جگہ لیکن عقیدت کا یہ مظاہرہ ایک کار عبث ہے۔ جس انسان کو ساری دنیا سے بچھڑ کر اکیلا ہی جانا ہے، اس کیلئے اتنا اہتمام فضول ہے۔''

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی مسلسل تلقین کے باوجود انسانی ہجوم دہلی سے نکل کر کئی میل تک اپنے مسیحا کو رخصت کرنے گیا تھا۔ عام لوگوں کے چہروں پر گہری اداسیوں کی جھلک تھی کچھ بزرگان دین بھی مغموم نظر آرہے تھے...... اور ان لوگوں کی خوشی کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا تھا جن کے علم کی دکانیں حضرت خواجہؒ کی موجودگی کے باعث بند ہوگئی تھیں۔ غرض بندگان خدا کے اس ہجوم میں اگر کوئی شخص سب سے زیادہ دل گرفتہ تھا تو وہ قطب الدین بختیار کاکیؒ تھے۔ پیرومرشد سے آپ کی محبت ایک مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ اگر ہم اس محبت کو ثابت کرنے کیلئے ''باپ اور بیٹے'' کا حوالہ بھی پیش کریں تو یہ بھی ناکافی ٹھہرے گا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اپنے شیخ کو رخصت کرتے وقت اس طرح رو رہے تھے کہ جیسے کسی شخص کا سرمایۂ حیات لٹ رہا ہو۔

حضرت خواجہؒ نے اپنے اس عظیم مرید وشاگرد کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا...... ''فرزند! ہمارا ملنا اور بچھڑنا سب اللہ کیلئے ہے۔ زندگی نے وفا کی تو میں بہت جلد تم سے دوبارہ آملوں گا۔'' یہ آخری الفاظ تھے جو حضرت سلطان الہندؒ کی زبان مبارک سے دہلی کی سرزمین پر ادا ہوئے تھے۔ پھر آپ اس تاریخی شہر سے رخصت ہوگئے۔

دوبارہ اجمیر پہنچنے کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے مقصد عظیم کی تکمیل میں مصروف ہوگئے۔ اجمیر کے باشندے آپ کی واپسی پر اتنے خوش تھے کہ گلی گلی جشن جیسا سماں تھا اور گھر گھر چراغ روشن کئے گئے تھے۔ اس زمانے میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس نے سلطان الہندؒ کی معاشرتی ذمہ داریوں میں اضافہ کردیا۔ اب تک آپ تنہا زندگی بسر کر رہے تھے۔ روایت ہے کہ ایک دن کسی شخص نے حضرت خواجہ نوازؒ کی مجردانہ زندگی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

''معین الدین چشتیؒ ہر طرح پابند شریعت ہیں مگر آپ کی ذات میں نمایاں کمی یہ ہے کہ شادی شدہ نہیں ہیں۔'' کہنے والے نے رسالت مآب ﷺ کی حیات پاک کی مثال دیتے ہوئے کہا۔ ''پیغمبر اسلام ﷺ نے شادی کو نہ صرف پسند فرمایا ہے بلکہ فارغ البالی کی صورت میں اسے لازمی قرار دیا ہے۔''

جب ایک خادم نے یہ بات گوش گزار کی تو آپ نے فرمایا۔ ''وہ سچ کہتا ہے۔ مجھ میں یہ کمی ہے لیکن اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ اپنے بندے کی تمام کوتاہیوں کا ازالہ کردے۔'' اس کے بعد

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بزرگانِ خدا کو سنت رسول ﷺ کا عملی سبق دینے کیلئے شادی کی۔ شادی کے سلسلے میں دوسری روایت یہ ہے کہ آپ نے ایک رات رسول اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ رسالت مآب ﷺ فرما رہے تھے۔ ''معین الدین! تم پر لازم ہے کہ ہماری ایک ایک سنت زندہ کرو۔''

حضرت خواجہؒ کی آنکھ کھلی تو آپ پر لرزہ طاری تھا۔ سلطان الہندؒ کو خواب کے ذریعے تجرد ترک کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ آپ کئی دن تک آزردہ خاطر رہے اور اپنے ایک ایک عمل کا محاسبہ کرتے رہے۔ حضرت خواجہؒ مسلسل غور و فکر میں ڈوب گئے تھے اور ہر لحظہ یہی سوچ رہے تھے کہ آپ سے کون سی سنت ترک ہوئی ہے؟ اچانک ایک روز آپ کو اپنی غیر شادی شدہ زندگی کا خیال آیا اور اس طرح ضمیر و ذہن نے خواب کی تعبیر تک رسائی حاصل کر لی۔

یہ عجیب و غریب راز ہے کہ جس رات حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے رسالت مآب ﷺ کو خواب میں دیکھا تھا، اس رات قلعہ ''پٹلی'' کے حاکم ملک خطاب نے لشکر کفار پر حملہ کیا۔ فریقین میں بہت دیر تک خونی معرکہ گرم رہا۔ اہل ہنود نے بڑی شجاعت کے ساتھ جم کر مقابلہ کیا مگر بالآخر ملک خطاب کو فتح حاصل ہوئی۔ ہندو راجہ گرفتار ہو کر قتل ہوا یا کسی خفیہ راستے سے فرار ہو گیا، تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا مگر یہ طے شدہ امر ہے کہ کفار کو ہولناک تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ راجہ کی جوان لڑکی قید ہوئی اور پھر مسلمان سپاہیوں نے اسے حاکم پٹلی کے سامنے پیش کر دیا۔ دوسرے دن ملک خطاب اس لڑکی کو لے کر سلطان الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنے کے بعد عرض کرنے لگا۔

''یہ لڑکی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے میری خواہش ہے کہ آپ اسے ایک کنیز کی حیثیت سے قبول فرما لیں۔''

''میں کسی کنیز یا خادمہ کی حاجت نہیں رکھتا۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ملک خطاب کی درخواست مسترد کرتے ہوئے فرمایا۔ ''درویش کو یہ آسائشیں زیب نہیں دیتیں۔ اگر یہ لڑکی اپنی خوشی سے اسلام قبول کر لے تو اپنی فوج کے کسی اعلیٰ عہدیدار سے اس کی شادی کر دو۔ اسلام میں جبر و اکراہ جائز نہیں۔ اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دو۔ یہ ایک بے کس و مجبور عورت ہے۔ یہ جہاں جانا چاہے اسے جانے دو۔ اگر شکست خوردہ افراد دوبارہ سرکشی پر آمادہ نہ ہوں تو انہیں بھی پناہ دیدو۔ کفار کے ساتھ محبت سے پیش آؤ تا کہ وہ اپنے لوگوں کے سامنے اسلام کے حسن سلوک کا ذکر کر سکیں۔''

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ واضح الفاظ میں انکار کر چکے تھے لیکن ملک خطاب مسلسل اصرار کرتا رہا۔ وہ اس طرح سلطان الہندؒ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مجبوراً آپ کو سخت لہجہ اختیار کرنا پڑا۔

''یہ تمہاری قیدی ضرور ہے مگر تمہیں اس پر اپنی مرضی مسلط کرنی نہیں چاہئے۔ نسوانی مجبوری کا احساس کرو اور اسے آزاد چھوڑ دو۔ یہ خود جس طرف چاہے گی چلی جائے گی۔''

حاکم پٹلی لاجواب ہو گیا اور شکستہ دلی کے ساتھ بارگاہ سلطان الہندؒ سے اٹھا۔ اس نے معذرت کی اور

کماری کو چلنے کا اشارہ کیا مگر اہل مجلس اس وقت حیران رہ گئے جب لڑکی نے ملک خطاب کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اسے سمجھایا لیکن لڑکی نے ایک عجیب دلیل کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ ہی کا تو فرمان ہے کہ مجھے میری مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ اب میں چاہتی ہوں کہ مسلمان ہو کر اپنی باقی زندگی آپ کے قدموں میں بسر کروں۔'' لڑکی کی خواہش اتنی شدید تھی کہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ انکار نہ کر سکے۔ ملک خطاب تو دل سے یہی چاہتا تھا۔ قدرت نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

کچھ دن بعد اس ہندو لڑکی نے اپنا آبائی مذہب ترک کر کے دین اسلام قبول کر لیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس کا نام امتہ اللہ رکھا اور پھر آپ نے اسی لڑکی سے شادی کر لی۔

بی بی امتہ اللہ ایک نہایت پارسا خاتون تھیں۔ آپ کے کردار نے غیر مسلم عورتوں کو بہت زیادہ متاثر کیا اور اس طرح تحریک اسلامی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ بی بی امتہ اللہ کے بطن سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی صاحبزادی بی بی حافظہ جمالؒ پیدا ہوئیں جن کا ہندوستان کی پاکباز عورتوں میں بلند ترین مقام ہے۔ سلطان الہندؒ کے پائنتی میں آپ کا مزار مبارک ہے۔

☆☆..............☆☆..............☆☆

مستند تاریخی کتابوں سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی دوسری شادی کا بھی پتا چلتا ہے۔ اس شادی کی تفصیل ''سیر الاقطاب'' کے مصنف شیخ الہندؒ نے اس طرح بیان کی ہے کہ سلطان قطب الدین ایبک نے سید حسن مشہدیؒ کی شہادت کے بعد سید وجیہہ الدین چشتیؒ کو اجمیر کا حاکم مقرر کیا تھا۔ ان کی ایک صاحبزادی تھی جن کا نام بی بی عصمت تھا۔ جب سید وجیہہ الدین بیٹی کی شادی کے سلسلے میں پریشان رہنے لگے تو ایک دن آپ نے حضرت امام جعفر صادقؒ کو خواب میں دیکھا۔ امام فرما رہے تھے۔

''فرزند تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ رسالت مآب ﷺ کا حکم ہے کہ اپنی لڑکی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زوجیت میں دے دو۔''

صبح بیدار ہونے کے بعد سید وجیہہ الدین مشہدیؒ، حضرت سلطان الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خواب بیان کیا۔ اگرچہ حضرت خواجہؒ شادی شدہ تھے لیکن سرور کونین ﷺ کا حکم سنتے ہی آپ عقد کیلئے تیار ہو گئے۔

بی بی عصمتؒ سے آپ کے تین صاحبزادے خواجہ فخر الدین، خواجہ ضیاء الدین اور خواجہ حسام الدینؒ پیدا ہوئے۔ خواجہ فخر الدینؒ بڑے باجبروت اور جلالی بزرگ تھے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی اسلام کی خدمت کیلئے وقف کر دی تھی۔ رسول عربی ﷺ کے پیغام کی سربلندی کیلئے ہر وقت میدان جہاد میں سربکف رہتے تھے۔ بالآخر کفار کے ساتھ ایک معرکے میں شہید ہوئے۔ حضرت خواجہ فخر الدینؒ کا مزار مبارک ریاست کشن گڑھ کے قصبے ''سروار'' میں ہے۔ یہ جگہ اجمیر سے تیس

چالیس میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ آپ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے وصال کے بعد کئی سال تک زندہ رہے۔

حضرت خواجہ فخر الدین چشتیؒ کے جلال کا یہ عالم تھا کہ اکثر جذب کے حالت میں فرمایا کرتے تھے۔ "جسے باپ کے دروازے سے کچھ نہ ملے وہ بیٹے کے یہاں چلا آئے۔ خدا اس کی مراد پوری کرے گا۔"

حضرت خواجہ فخر الدین چشتیؒ کے اس فرمان کا مفہوم یہ تھا کہ جو لوگ والد محترم (حضرت خواجہ) کے مزار مبارک پر حاضر ہوتے ہیں اور ان کی دعا قبول نہیں ہوتی، وہ بیٹے (فخر الدینؒ) کے آستانے پر چلے آئیں۔ اللہ ان کے خالی دامن بھر دے گا۔ یہ محض ایک روایت نہیں۔ آج بھی ہندوستان میں ایسے بے شمار لوگ نظر آتے ہیں جنہیں ذاتی طور پر حضرت خواجہ فخر الدین چشتیؒ کے اس قول کا تجربہ ہو چکا ہے۔ آخر یہ کیا راز ہے؟ اسے آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا۔ قدرت جس طرح چاہے زمین پر اپنی نشانیاں ظاہر کرے۔ مختصر یہ کہ حضرت خواجہ فخر الدینؒ وہ بزرگ ہیں کہ جن کے ذریعے خالق کائنات نے حضرت سلطان الہندؒ کی نسل کو فروغ دیا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

شادی کے کئی سال بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ایک بار پھر دہلی تشریف لے گئے۔ اس وقت سلطان قطب الدین کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ شمس الدین التمش ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو ایک بار تیر کمان لئے ہوئے حضرت سلطان الہندؒ کے سامنے سے گزرا تھا اور جسے دیکھ کر آپ نے فرمایا تھا کہ خدا اس نوجوان کو اس وقت تک دنیا سے نہیں اٹھائے گا، جب تک تاج و تخت اس کا مقدر نہ بن جائیں۔ پھر گردش ماہ و سال نے کروٹ لی۔ التمش فوج کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوا۔ کئی جنگیں لڑیں اور میدان کارزار میں کئی کارنامے انجام دیئے۔ سلطان قطب الدین ایبک کی محبت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے التمش سے اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ پھر جب 607ھ میں ایبک دنیا سے رخصت ہوا تو التمش، سلطان شمس الدین کے نام سے ہندوستان کا خود مختار حکمراں بن گیا۔ جو لوگ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی پیش گوئی سے باخبر تھے، انہیں ایک عارف کی مستقبل بینی پر کوئی حیرت نہیں تھی۔ مگر جب یہ خبر دہلی میں عام ہوئی تو اہل شہر کو اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ ایک انسان کی آنکھیں دس بارہ سال بعد وقت کے پردے پر اُبھرنے والے مناظر کو کس طرح دیکھ سکتی ہیں؟ پھر یہ خبر اُڑتے اُڑتے سلطان شمس الدین التمش کے کانوں تک بھی پہنچ گئی کہ دہلی میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نام کے ایک بزرگ گوشہ نشین ہیں اور ان کے پیر و مرشد نے اس کے اقتدار میں آنے کی پیشگوئی بہت پہلے کر دی تھی۔ التمش کو اس واقعہ نے شدید حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بالآخر وہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملنے کیلئے آپ کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ التمش پہلی ہی ملاقات میں حضرت قطبؒ سے اس قدر متاثر ہوا کہ پھر ہمیشہ کیلئے اس در کا غلام ہو کر رہ گیا۔ اس طرح حضرت خواجہؒ کی یہ پیشگوئی بھی درست ثابت ہوئی کہ التمش ایک

فقیر دوست انسان ہے۔ تاریخی کتابوں میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش نہ صرف درویشوں کو پسند کرتا تھا بلکہ اپنے کردار کے اعتبار سے وہ خود بھی درویش تھا۔ التمش نے حضرت خواجہؒ قدم بوسی کا اعزاز حاصل کیا اور نہایت عقیدتمندانہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔

"خواجۂ خواجگاں! ہند کے حقیقی سلطان آپ ہیں۔ میری حیثیت تو محض ایک غلام کی سی ہے۔"

التمش کا لہجہ پُرسوز تھا اور ایک ایک لفظ سے صداقت جھلک رہی تھی۔ "میں آپ ہی کی دعاؤں سے اس درجے تک پہنچا ہوں۔"

"جس کا نام کاتب تقدیر نے سلطانوں کی فہرست میں لکھا ہو، وہ سلطان ہو کر رہے گا۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سلطان شمس الدین التمش کی بات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ "ہم درویشوں کو سلطانوں سے کیا غرض؟ وہ تو قدرت کا ایک فیصلہ تھا جو اس عاجز پر ظاہر ہو گیا تھا ورنہ ساری کائنات مل کر خدا کے کاموں کو متاثر نہیں کر سکتی۔ وہ جب کسی کو دینا چاہتا ہے تو اپنی بخشش و عطا کا جواز تلاش نہیں کرتا۔ سننے پر آتا ہے تو گناہ گاروں کی سن لیتا ہے۔ نہیں سننا چاہتا تو پارساؤں کی گریہ وزاری بھی اسے متوجہ نہیں کرتی۔ جب دولت و اقتدار کے مظاہرے دیکھ کر تمہارا نفس سرکشی پر آمادہ ہونے لگے تو اپنے دور غلامی کو یاد کر لینا۔ اگر تم نے سچائی کے ساتھ اپنی حقیقت پر غور کیا تو فریب دنیا میں مبتلا نہیں ہو گے۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس قدر اثر انگیز لہجے میں انسانی عروج و زوال کی نقشہ کشی کی تھی کہ سلطان شمس الدین التمش رو پڑا اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کا ایک ایک گوشہ روشن ہو گیا۔

التمش نسلی طور پر غلام نہیں تھا۔ وہ ترکوں کے البری قبیلے کے سردار ایلم خان کا بیٹا تھا۔ وہ صورت و سیرت کے اعتبار سے اپنے تمام بھائیوں میں ممتاز نظر آتا تھا۔ آخر التمش کی صفات اس کی دشمن جاں بن گئیں۔ حقیقی بھائیوں اور دیگر رشتے داروں نے التمش کو باپ سے جدا کر کے ایک سوداگر کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ کچھ دن تک وہ طوق غلامی پہن کر آقا کی جنبش چشم کا منتظر رہا۔ پھر ایک دوسرے تاجر حاجی بخاری نے اسے خرید لیا۔ پھر بخاری نے التمش کو حاجی جمال الدین کے حوالے کیا۔ غلام ایک ہی تھا مگر آقا بدلتے جا رہے تھے۔ حاجی جمال الدین اسے لے کر غزنی پہنچا۔ اہل غزنی نے اس وقت التمش جیسا خوبصورت ترکی غلام نہیں دیکھا تھا۔ پورے غزنی میں شور سا مچ گیا۔ پھر یہ خبر شہاب الدین غوری تک پہنچی۔ غوری نے حاجی جمال کو اس کے غلام کے ساتھ دربار سلطانی میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ حاجی جمال کے پاس التمش کے علاوہ ایک اور غلام بھی تھا۔ شہاب الدین غوری نے دونوں غلاموں کی قیمت دو ہزار دینار لگائی جو اس زمانے کے مطابق بہت بڑی رقم شمار کی جاتی تھی۔ حاجی جمال الدین نے اس قیمت پر اپنے غلاموں کو فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ شہاب الدین غوری نے تاجر کے جواب کو گستاخی سمجھ کر حکم دیا کہ افغانستان کا کوئی شخص ان غلاموں کو خریدنے کی کوشش نہ کرے۔ فرمان شاہی سے سرتابی کرنے کی جرأت کس میں تھی؟ نتیجتاً حاجی جمال ایک سال تک غزنی میں مقیم رہا لیکن

کسی نے اس کے غلاموں کی قیمت لگانے کی ہمت نہیں کی۔ اگرچہ التمش کا حسن ظاہری دیکھ کر خریدار اس کے گرد سمٹ آئے تھے۔ ہر سرمایہ دار اپنی دولت کی بنیاد پر اس ترکی غلام کو حاصل کرنا چاہتا تھا مگر شہاب الدین غوری کے خوف سے کوئی آگے بڑھ کر التمش کی بولی لگانے کیلئے تیار نہیں تھا۔ حاجی جمال ناکام و نامراد ہو کر واپس بخارا چلا گیا۔ پھر کچھ دن بعد وہ دوبارہ غزنی آیا۔ التمش کیلئے ایک بار پھر لوگوں کی بھیڑ لگ گئی لیکن کوئی بھی دولت مند شہاب الدین غوری کے خوف سے خواہش کا اظہار نہ کرسکا۔

حاجی جمال بھی اپنے اس نقصان کی وجہ سے سخت پریشان تھا کہ اچانک التمش کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ اسی زمانے میں قطب الدین ایبک، راجہ نہر والا کو شکست دے کر غزنی پہنچا۔ شہاب الدین غوری ایبک کے اس کارنامے سے بہت خوش تھا۔ اتفاقاً قطب الدین ایبک نے لوگوں کی زبانی التمش کے حسن کا شہرہ سنا۔ پھر جب ایبک نے اس ترکی غلام کو دیکھا تو بے قرار ہو گیا۔ موقع غنیمت تھا۔ غوری کے ذہن پر ایبک کی عظیم الشان فتح کے اثرات مرتب ہو چکے تھے۔ اس لئے قطب الدین ایبک نے وقت سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اپنے آقا شہاب الدین غوری سے التمش کو خریدنے کی اجازت طلب کی۔ غوری نے ایبک کی وفاداریوں کے سبب اپنی ناپسندیدگی کا اظہار تو نہیں کیا، پھر بھی اتنا ضرور کہا۔

''میں ایک بار لوگوں کو اس غلام کے خریدنے سے منع کر چکا ہوں۔ اس لئے اب یہ مناسب نہیں ہے کہ میں دوبارہ اسے غزنی کے بازار میں فروخت ہونے کی اجازت دوں۔ اگر تم اسے خریدنا چاہتے ہو تو وہ سوداگر تمہارے پاس دہلی پہنچ کر اپنے غلام کو بیچ سکتا ہے۔''

شہاب الدین غوری کی طرف سے اجازت ملنے کے بعد قطب الدین ایبک نے کچھ دنوں غزنی میں قیام کیا۔ پھر اپنے وزیر نظام الدین کو چند اہم ذمہ داریاں سونپ کر دہلی چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی نظام الدین کو ہدایت بھی کر گیا کہ کام ختم ہوتے ہی غلاموں کے تاجر حاجی جمال کو اپنے ساتھ لے کر خود بھی دہلی پہنچ جائے۔ گردش روز و شب کا عمل جاری رہا۔ انجام کار حاجی جمال، التمش کو لے کر ایبک کے دربار میں حاضر ہوا۔ قطب الدین ایبک نے دونوں غلاموں کو ایک لاکھ چیتل (سکۂ رائج الوقت) میں خرید لیا۔ ایبک ہی نے اس کا نام التمش رکھا تھا۔ وہ ایبک کو اس قدر پسند تھا کہ حاکم وقت سے سودا طے پاتے ہی اس نے التمش کو بیٹا بنا کر درباریوں میں داخل کر لیا۔ پھر اس ترکی غلام نے میدان کارزار میں کئی معرکے سر کئے۔ آخر لوگوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ سلطان قطب الدین ایبک کی فوج میں التمش سے زیادہ شجاع کوئی دوسرا سپاہی موجود نہیں تھا۔ التمش کی ان ہی صفات سے متاثر ہو کر سلطان ایبک نے اپنی ایک بیٹی بھی اس کے نکاح میں دے دی۔ یہاں تک کہ 607ھ میں سلطان قطب الدین ایبک کا انتقال ہوا تو ہندوستان کا تخت التمش کا منتظر تھا۔ یہ ہے ایک غلام کی مختصر داستان حیات۔ التمش ایک سازش کے ذریعے اپنے قبیلے سے بچھڑ کر غلامی کی لعنت میں مبتلا کیا گیا۔ کون جانتا تھا کہ ایک عام سردار کا بیٹا مختلف آزمائشوں سے گزر کر ہندوستان کی نئی تاریخ رقم کرے گا۔ آج وہی غلام سلطان شمس الدین کی حیثیت سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قدموں میں

بیٹھا ہوا تھا اور جب سلطان الہندؒ نے التمش کو اس کا دور غلامی یاد دلایا تھا تو ایک مطلق العنان حکمراں کے ماتھے پر ہلکی سی شکن بھی نمودار نہیں ہوئی بلکہ عجز و انکسار کے باعث اس کا سر جھک گیا تھا اور آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے تھے۔ پھر سلطان شمس الدین التمش نے رقت آمیز لہجے میں سلطان الہندؒ سے عرض کیا تھا۔

''اے معرفت کے تاجدار! یہ غلام آزمائش کے اس راستے پر تنہا کھڑا ہے کہ جہاں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے بکھرے ہیں۔ دعا کیجئے کہ میں اس راہ سے سلامتی کے ساتھ گزر جاؤں...... اور یہ بھی دعا فرمایئے کہ جس ذات پاک نے میری غلامی کی زنجیریں کاٹ کر مجھے تاج شاہی پہنایا ہے میں اس کی مرضی کو زمین پر نافذ کرسکوں...... اور یہ بھی دعا فرمایئے کہ میں اپنے نفس کے شر سے محفوظ رہوں اور بندگان خدا میرے شر سے محفوظ رہیں۔'' حاضرین مجلس یہ سوچ کر حیرت زدہ تھے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک آزاد حکمراں کو اس قدر عاجزانہ لہجے میں بولتے ہوئے دیکھا تھا مگر جو اہل نظر تھے وہ اس راز کو جانتے تھے کہ یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے جلال کا اثر تھا۔

''سلطان! تم شروع ہی سے بزرگان دین کی دعاؤں کے زیر اثر ہو۔ قدرت کی آزمائش کے عجیب انداز ہیں۔ کسی سے تاج شاہی چھین کر آزمایا جاتا ہے اور کسی کو مسند اقتدار پر بٹھا کر امتحان کی بھٹی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ کامیاب وہی ہے جو شعلوں کے درمیان رہ کر بھی اپنے دامن کو محفوظ رکھے۔ یہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ پھر اس فقیر کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ ہی تمہارا دستگیر ہے اور اللہ ہی مشکل کشا۔ عدل و انصاف کو قائم رکھو کہ اللہ بھی بادشاہ عادل کو محبوب رکھتا ہے۔'' حضرت خواجہؒ نے سلطان پر اپنی دعاؤں کی بارش کر دی اور التمش، سلطان الہندؒ کے ہاتھ کو بوسہ دے کر رخصت ہو گیا۔

جب سلطان شمس الدین التمش بارگاہ غریب نوازؒ سے اٹھ کر جا رہا تھا تو لوگوں نے سنا۔ والیٔ ہندوستان انتہائی جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ ''میں اپنی سلطانی پر شمشیر و سنان کی گواہی قبول نہیں کرتا۔ مجھے سلطان الہندؒ نے اپنی زبان مبارک سے سلطان فرما دیا، اس لئے میں سلطان ہوں۔'' اگر لوگ شمس الدین التمش کی بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی بزرگی کو بہترین خراج عقیدت ہے۔

واقعات کے اسی پس منظر میں سلطان شمس الدین کے حوالے سے ایک اور واقعہ بھی بہت زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ اکبر مشہور بزرگ حضرت حمید الدین ناگوریؒ بغداد سے دہلی تشریف لائے ہوئے تھے۔ قاضی صاحبؒ کو سماع سے بہت زیادہ شغف تھا۔ مقامی درویشوں نے جن میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی شامل تھے۔ حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے اعزاز میں سماع کی مجلسیں منعقد کیں۔ دہلی کے علماء سماع کے سخت مخالف تھے۔ اس لئے انہیں قاضی صاحبؒ اور دوسرے صوفیاء سے پرخاش ہو گئی۔ خصوصاً مولانا رکن الدین سمرقندی جو اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے، درویشوں کی مخالفت میں سرگرم عمل ہو گئے۔

ایک بار سلطان شمس الدین التمش کے محل کے قریب مجلس سماع منعقد ہوئی جس میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ بھی شریک تھے۔ مولانا رکن الدین کو خبر ملی تو وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچے تاکہ مجلس سماع کو روک سکیں۔ جب قاضی صاحب کو معلوم ہوا کہ مولانا رکن الدین آئے ہیں تو آپ نے صاحب خانہ سے فرمایا۔ "تم کہیں چھپ جاؤ تاکہ جب مولانا رکن الدین آئیں اور تم سے اندر آنے کی اجازت طلب کریں تو تمہیں غیر موجود پا کر واپس چلے جائیں......اور اگر تمہاری اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہوں تو اس فعل کو خلاف شرع قرار دے کر ان کا مواخذہ کیا جائے۔"

صاحب خانہ نے ایسا ہی کیا۔ مولانا رکن الدین سمرقندی آئے مگر مالک مکان کو موجود نہ پا کر واپس چلے گئے۔ اس طرح یہ معاملہ ٹل گیا مگر دوسرے علماء بھی سماع کے خلاف تھے۔ نتیجتاً حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور دوسرے صوفیاء کے خلاف علماء کی تحریک شروع ہو گئی۔ التمش کے دربار کے دو مشہور عالم ملاّ عماد الدین اور ملاّ جلال الدین، قاضی صاحبؒ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ مختصر یہ کہ ان دونوں علماء نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے التمش کو مجبور کیا کہ وہ حکم شاہی کے ذریعے سماع کی محفلوں پر پابندی عائد کر دے۔ والئ ہندوستان نے ایک خصوصی مجلس میں حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ کو دعوت دی کہ وہ علماء کے اعتراضات کا جواب دیں۔

ملاّ عماد الدین اور ملاّ جلال الدین نے بیک وقت حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ سے سوال کیا۔ "شرع میں سماع حلال ہے یا حرام؟"

قاضی صاحبؒ نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ "سماع اہل حال کیلئے حلال ہے اور اہل قال کیلئے حرام۔"

علماء کے سوال کا جواب دینے کے فوراً بعد حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ سلطان شمس الدین التمش سے مخاطب ہوئے۔ "آپ کو اپنے بچپن کا وہ واقعہ تو یاد ہوگا جب آپ غلام تھے اور آپ کے آقا کے گھر میں محفل سماع منعقد تھی۔ آپ اس محفل میں رات بھر شمع لے کر کھڑے رہے تھے۔ ان اللہ والے فقیروں کو آپ کی یہ خدمت بہت پسند آئی تھی اور ان ہی فقیروں کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بادشاہت کے منصب تک پہنچایا۔"

حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ کی بات سن کر سلطان شمس الدین التمش کی نظروں کے سامنے پورا ماضی روشن ہو گیا اور پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ والئ ہندوستان نے بڑی عزت و تکریم کے ساتھ قاضی صاحب کو رخصت کیا اور خود بھی سماع کی محفلوں میں شریک ہونے لگا۔ پھر یہ ذوق اس قدر بڑھا کہ سلطان شمس الدین التمش حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

اسی زمانے میں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا جو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی عظمتوں پر دلالت کرتا

ہے۔ سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت قطبؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو چکے تھے اور اپنی روحانی تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرنے کیلئے ملتان سے دہلی تشریف لائے ہوئے تھے۔ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سرزمین دہلی پر قدم رکھا تھا، اس سے چند روز پہلے ہی بابا فریدؒ نے اپنی چلہ کشی شروع کی تھی اور ایک علیحدہ کمرے میں بند ہو کر سخت ریاضت کر رہے تھے۔ اچانک ایک دن حضرت سلطان الہندؒ نے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے پوچھا۔

"اب تو بڑے بڑے شہسوار تمہارے لشکر معرفت میں شامل ہو کر نفس کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔"

"یہ سب پیر و مرشد کی نگاہ کرم کا اثر ہے۔" حضرت قطبؒ نے نہایت عاجزی سے عرض کیا۔ "میں تو خود آپ کے لشکر کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔"

"سنا ہے کہ ملتان کا رہنے والا کوئی مجاہد تمہارے زیر تربیت ہے۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا اشارہ بابا فریدؒ کی طرف تھا۔

"شیخ تو ضرور اس بات سے واقف ہیں۔" حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے عرض کیا۔

"قطب! ہمیں بھی دکھاؤ اس نو وارد کوچۂ عشق کو۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی نواؤں میں بڑا سوز ہے۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے عجیب انداز میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

حضرت قطبؒ پیر و مرشد کی اس کریمانہ فرمائش پر فرط عقیدت سے رونے لگے پھر حضرت خواجہؒ کو لے کر اس کمرے کی طرف گئے جہاں بابا فریدؒ ساری دنیا سے کٹ کر ایک گوشۂ تنہائی میں مصروف ریاضت تھے۔ (تصوف کی اصطلاح میں چلہ کشی اوراد و وظائف کے اس طریقے کو کہتے ہیں جس میں عامل دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر ایک مخصوص جگہ پر کم سے کم چالیس دن تک ریاضت کرتا رہتا ہے۔ بعض عملیات میں یہ شرط بھی ہوتی ہے کہ عامل کسی انسان کا چہرہ نہ دیکھے، یہاں تک کہ اسے کھلا آسمان بھی نظر نہ آئے۔ اس وقت بابا فریدؒ بھی اسی انداز کی چلہ کشی کر رہے تھے۔ دن بھر روزہ رکھتے تھے۔ افطار کے وقت حضرت قطبؒ کا ایک خادم دروازہ کھول کر جو کی روٹی اور نمک کا پانی اس طرح اندر رکھ دیتا تھا کہ وہ بابا فریدؒ کو نہ دیکھ سکے...... مگر جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بابا فریدؒ کو دیکھنا چاہا تو چلہ کشی کے تمام آداب بالائے طاق رکھ دیئے گئے اور عمل کی ساری شرائط ختم کر دی گئیں کیونکہ اس سرزمین پر حضرت سلطان الہندؒ تو خود سب سے بڑے عامل تھے)

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے دروازہ کھولا اور پھر پیر و مرشد سے اندر چلنے کی درخواست کی۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ اس طرح کمرے میں داخل ہوئے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ آپ کے پیچھے پیچھے تھے۔ سلطان الہندؒ نے ایک خاص نگاہ کرم سے معرفت کی منزل کے نوجوان مسافر کو دیکھا۔ بابا فریدؒ آنکھیں بند کئے استغراق کے عالم میں ایک چٹائی پر بیٹھے تھے اور ان کے ہونٹوں کو آہستہ آہستہ جنبش ہو رہی تھی۔ وہ کوئی اسم الٰہی تھا یا قرآن کریم کی کوئی آیت مقدسہ تھی جس کا بابا فریدؒ ورد کر رہے تھے۔ "فرید! آنکھیں کھولو!" حضرت قطب الدین بختیار

کاکیؒ نے اپنے نوجوان مرید کو بڑی محبت سے پکارا...... ”دیکھو تو کون آیا ہے؟“

حضرت بابا فریدؒ پیرومرشد کی آواز سن کر لرز گئے۔ کئی دنوں کا سکوت زائل ہو گیا اور آپ نے سر اٹھا کر آنکھیں کھول دیں۔ بابا فریدؒ اس بات پر سخت حیران تھے کہ پیرومرشد نے چلہ کشی کی مدت پوری ہونے سے پہلے آپ کو کیوں پکارا تھا؟ پھر کچھ دیر بعد جب بابا فریدؒ حیرت واستعجاب کے حصار سے باہر نکلے تو اپنے سامنے ایک روشن چہرہ بزرگ کو کھڑے ہوئے پایا۔

”فرید! اپنی خوش بختی پر ناز کرو کہ جس کے روئے مبارک کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے ہزاروں انسان سالہا سال سے ترس رہے ہیں، وہ خود چل کر تمہیں دیکھنے کیلئے آیا ہے۔“ بابا فریدؒ نے سراسیمگی کے عالم میں حضرت خواجہؒ کی طرف دیکھا اور پھر آپ کا جسم کانپنے لگا۔

”تم آفتاب چشتیہ کو نہیں پہچانتے؟“ حضرت قطبؒ نے بابا فرید کو حیران دیکھ کر کہا۔ ”یہ تمہارے پیرومرشد کے شیخ محترم خواجۂ خواجگاں، سلطان الہند، حضرت معین الدین چشتیؒ ہیں۔“

یہ سنتے ہی بابا فریدؒ کے جسم کی لرزش میں مزید اضافہ ہو گیا۔ آپ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے احترام میں کھڑا ہونا چاہا مگر اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکے۔ دوبارہ کوشش کی، پھر بھی ناکام رہے۔ بابا فریدؒ نے یہ عمل کئی بار دہرایا لیکن آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر یہ نوجوان سالک اپنی بے بسی پر رو پڑا۔ حضرت سلطان الہندؒ نے بابا فریدؒ کی یہ حالت دیکھی تو خود آگے بڑھے اور قریب پہنچ کر فرمایا۔ ”فرزند اٹھو!“

بابا فریدؒ نے اپنے جسم کی پوری طاقت کو بروئے کار لا کر اٹھنے کی کوشش کی مگر ناتوانی کا غلبہ برقرار رہا۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے خود اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب میں نے دہلی کی خانقاہ کے ایک حجرے میں پہلی بار حضرت سلطان الہندؒ کو دیکھا تو مجھ پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ میں کانپنے لگا۔ احتراماً اٹھنا چاہا تو ایسا محسوس ہوا جیسے جسم وروح کی تمام قوتیں سلب ہو کر رہ گئی ہیں۔

آخر حضرت خواجہ غریب نوازؒ قدرے خم ہوئے اور پھر آپ نے اپنا دست مبارک بابا فریدؒ کے شانے پر رکھ دیا۔ ملتان کے نوجوان درویش کی ساری گمشدہ طاقتیں لوٹ آئیں۔ بابا فریدؒ لرزتے قدموں سے کھڑے ہوئے اور کانپتے لہجے میں حضرت سلطان الہندؒ کو سلام عقیدت پیش کیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے نہایت شفقت ومحبت سے آپ کو گلے لگا لیا پھر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔

”قطب! تم ایسے شاہین کو زیر دام لائے ہو جس کی پرواز آسمانوں کی بلند ترین فضاؤں میں ہے۔“

اپنی اس ملاقات کے بارے میں حضرت بابا فریدؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ میں زندگی بھر اس لمحے کو فراموش نہیں کر سکتا، جب سلطان الہندؒ نے مجھے گلے لگا کر میرے سینے کو روشن کر دیا تھا۔ وہ ایک لمحہ اس فقیر کو سب کچھ دے گیا جو سالوں کی ریاضت اور مجاہدے کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عارفانہ مقام کی یہ ایک ہلکی سی جھلک ہے کہ بابا فریدؒ جیسے صوفی آپ کے جلال روحانی کے سامنے بے دست وپا ہو کر رہ گئے تھے اور علم وفضل کے باوجود

زبان میں ایک لفظ ادا کرنے کی بھی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی حضرت خواجہؒ کی فراست نظر بھی ایک عجیب کرامت تھی کہ آپ کی روشن آنکھیں ماہ وسال کی گہری نقاب میں پوشیدہ واقعات کو بھی آسانی سے دیکھ لیا کرتی تھیں۔ حضرت خواجہؒ نے پرتھوی راج چوہان اور سلطان شمس الدین التمش کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا وہ حرف بہ حرف پورا ہو کر رہا۔ یہ پیش گوئیاں اس وقت کی گئی تھیں جب شہاب الدین غوری کے مقابلے میں کم سے کم چار گنا فوجی طاقت کا مالک تھا اور شمس الدین التمش کی پیشانی پر غلامی کے کئی داغ روشن تھے۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ پرتھوی راج چوہان اس قدر ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو گا اور التمش اتنی آسانی سے قبائے غلامی اتار کر خلعت شاہی پہن لے گا۔ حالات وشواہد کے پیش نظر مادہ پرست قیاس آرائیوں سے کام لیتے ہیں اور کبھی کبھی ان کے اندیشے بھی درست ثابت ہو جاتے ہیں مگر ہم اسے فراست نظر کا نام نہیں دے سکتے۔ فراست نظر صرف اہل ایمان کا ورثہ ہے۔ جب کوئی مرد حق آگاہ مستقبل کی طرف دیکھتا ہے تو قدرت اس پر ایک ایک ذرّے کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ بلاشبہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آنکھ بھی پس دیوار دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور اپنی اسی صفت کے باعث سلطان الہندؒ پورے ہندوستان میں بے مثال تھے۔ یہی وہ فراست نظر تھی جس کے ذریعے حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے بابا فریدؒ کو مقام بلند کی بشارت دی تھی۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ ملتان کے ایک یتیم بچے کے دروازے پر شاہان وقت بھی سر جھکائے کھڑے رہتے تھے۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ اور دیگر عقیدت مندوں میں علم وعرفان کی دولت تقسیم کرنے کے بعد حضرت سلطان الہندؒ ایک بار پھر اجمیر تشریف لے گئے۔ اگرچہ اہل دل پر یہ سانحہ گراں گزرتا تھا لیکن وہ مرضی شیخ کے آگے مجبور تھے۔ حضرت خواجہؒ نے اہل دہلی پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ سرزمین اجمیر ہی آپ کی تبلیغ کا مرکز رہے گی اور اسی ریگزار میں آپ ساری زندگی بسر کریں گے۔ دہلی کے باشندے حضرت خواجہؒ کے مستقل قیام سے مایوس ہو چکے تھے، لیکن آپ نے انہیں اپنی رفاقتوں سے محروم نہیں کیا تھا۔ معتبر تاریخی کتابوں میں درج ہے کہ سلطان الہندؒ ایک بار قطب الدین ایبک کے دور اقتدار میں اور دو بار شمس الدین التمش کے عہد حکومت میں دہلی تشریف لائے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا آخری سفر بظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا مگر ایک اذیت ناک واقعے نے ضعف وناتوانی کے باوجود آپ کو دہلی آنے کیلئے مجبور کر دیا تھا۔

یہ 633ھ کا زمانہ تھا۔ اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنی عمر کے چھیانوے سال پورے کر چکے تھے۔ فطرت کا عمل جاری تھا اور سلطان الہندؒ کی حیات مبارک آخری مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔ طویل عبادت و ریاضت اور مسلسل نفس کشی نے آپ کو حد سے زیادہ لاغر بنا دیا تھا۔ ان ہی دنوں ایک ایسا دردانگیز واقعہ پیش آیا کہ حضرت خواجہؒ جیسے صابر وشاکر انسان بھی مصروف آہ وفغاں ہو گئے۔ دہلی میں حضرت قطبؒ کے گرد ان کے مخالفین نے سازش کا آہنی حصار کھینچ دیا تھا اور سلطان الہندؒ کا خلیفۂ اکبر اپنی زندگی کے نازک ترین موڑ پر تنہا کھڑا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے

ایک رات خواب میں حضرت قطبؒ کو دیکھا جو بہت زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے۔

جب سلطان الہندؒ نے اس پریشانی کا سبب پوچھا تو عرض کرنے لگے۔ "شیخ محترم! آپ کا یہ خادم سخت اذیت میں مبتلا ہے۔ مجھ پر ایک ایسی تہمت لگائی جا رہی ہے جسے سننے کے بعد شہر حیران رہ گئے ہیں۔ میں اپنی صفائی میں تمام دلائل پیش کر چکا ہوں مگر دشمنوں نے دولت کے ذریعے انسان کا دل، ضمیر، دماغ، یہاں تک کہ ایمان بھی خرید لیا ہے۔ لوگ خدا سے نہیں ڈرتے۔ میں خوشی میں بھی اور مصیبت میں بھی اپنے خدا ہی کو پکارتا ہوں۔ وہی میرا دستگیر ہے، وہی مشکل کشا۔ میں نے دہلی کے باشندوں پر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ آپ کی جدائی بھی گوارا کر لی لیکن آج مجھے میری قربانیوں کا یہ صلہ دیا گیا ہے کہ میں وقت کی عدالت میں ایک مجرم کی حیثیت سے کھڑا ہوں۔ آپ میرے حق میں دعا فرمایئے کہ خاندان چشت کے اس غلام کی آبرو برقرار رہے اور یہ سنگین گھڑی سلامتی کے ساتھ گزر جائے۔" اتنا کہہ کر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ رو پڑے تھے۔

پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے عالم خواب ہی میں اس جانباز طریقت کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا تھا۔ "قطب! صبر کرو۔ زمانے کو کتنا ہی ناگوار گزرے مگر اہل یقین ہر حال میں غالب رہیں گے۔ شکست تمہارے دشمنوں کا مقدر بن چکی ہے۔ انہیں اپنی تمام قوتیں آزما لینے دو۔ عنقریب ان کی گردنیں طوق رسوائی کے بوجھ سے جھک جائیں گی۔ خاندان چشت کیلئے اللہ کافی ہے۔ خدا کی قسم وہ اپنی کوششوں میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ سلطان التمش سے کہو کہ اس مقدمے کو میری آمد تک ملتوی کر دیا جائے۔" خواب ختم ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آنکھ کھل گئی۔ آپ کی روح پر ایک بار گراں تھا جس کے اثرات سے ساری رات سو نہ سکے۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو گئی۔

نماز ادا کرتے ہی حضرت سلطان الہندؒ نے اہل خانہ کو اپنے عزم سفر سے آگاہ کیا۔ خدام کو ضروری ہدایات دیں اور دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ شریک حیات اور چند قریبی افراد نے اچانک روانگی کا سبب پوچھا تو بس اتنا فرمایا۔ "قطب مجھ سے زیادہ ناتواں ہو گیا ہے۔ اسے میری تیمارداری کی شدید ضرورت ہے۔" اس کے بعد کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس عالم میں اپنے سفر کا آغاز کیا کہ ایک عام انسان چند میل چلنے کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

دہلی میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ حضرت قطبؒ کے مخالفین جوش مسرت میں آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے اور عقیدت مندوں کے حلقے میں شدید اضطراب نمایاں تھے۔ بعض مرید اور خادم تو روتے روتے بے حال ہو گئے تھے۔ سلطان شمس الدین التمش حیران تھا اور پھر یہ حیرت لحظہ بہ لحظہ وحشت و دہشت میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

وہ بڑا سنگین وقت تھا جب ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی نے سر دربار سلطان شمس الدین التمش سے انصاف مانگتے ہوئے کہا تھا۔ "شہنشاہ! اس بدنصیب بچے کی طرف دیکھئے جو اپنے باپ کی زندگی

میں یتیم ہو چکا ہے۔" عورت کی دردناک آواز پورے دربار میں گونج رہی تھی۔ "اور اس مظلوم بیوی کی طرف دیکھئے جس نے شوہر کی موجودگی میں بیوگی کا لباس پہن لیا ہے۔"

"اس بچے کا باپ کون ہے؟" التمش بھی عورت کی فریاد سے متاثر ہو گیا تھا۔ "تمہیں ہمارے عدل پر بھروسا کرنا چاہئے۔"

"مجھے اندیشہ ہے کہ سلطان اس شخص کا نام سننا گوارا نہیں کریں گے۔" کسی نامعلوم خوف سے عورت کی آواز کانپ رہی تھی۔

"اگر وہ کوئی وزیر سلطنت یا امیر شہر بھی ہے تو التمش کے دائرۂ انصاف سے باہر نہیں۔" والیٔ ہندوستان یکایک غضب ناک ہو گیا تھا۔

"مجھے میرے بچے کے ساتھ جاں بخشی کا یقین دلایا جائے۔" اب عورت ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔

"ظالم کی گردن اور ہماری شمشیر عدل میں زیادہ فاصلہ نہیں۔ وقار سلطانی تمہیں ہر قسم کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔" سلطان شمس الدین التمش نے عورت کو پناہ دے دی تھی۔

وہ بہت دیر تک خاموش کھڑی رہی اور پھر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولی۔ "اس بچے کے باپ قطب الدین بختیار کاکیؒ ہیں۔"

اہل دربار کی سانسیں رک گئیں اور والیٔ ہند سر سے پاؤں تک ایک سوال بن کر رہ گیا۔ حاضرین کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر عورت مسلسل گریہ وزاری کر رہی تھی اور بار بار سلطان شمس الدین التمش کے انصاف کو آواز دے رہی تھی۔

آخر التمش کو اپنی زندگی کا سب سے ناگوار فرض انجام دینا پڑا۔ حضرت قطبؒ کو بھرے دربار میں طلب کیا گیا۔ سلطان الہندؒ کے خلیفۂ اکبر پر ایک عجیب الزام تھا۔

"میں نے اس خاتون کو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے عورت کے بیان کردہ رشتے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

"میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ حضرت قطبؒ ہی اس بچے کے باپ ہیں۔" عورت مسلسل قسمیں کھا رہی تھی۔ خدا کو درمیان میں لانے کے بعد اور کیا باقی رہ گیا تھا؟

حضرت قطبؒ کے ہونٹوں پر مہر خاموشی تھی اور اہل دربار اس عظیم الشان قصر ولایت کی دیواروں کو لرزتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ عورت سے کہا گیا کہ الزام غلط ہونے کی صورت میں اسے سخت ترین سزا بھی دی جا سکتی ہے لیکن وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو کر اپنے دعوے پر اصرار کرتی رہی۔

عدالت برخاست ہو گئی۔ اسی رات حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اپنے پیر و مرشد کو خواب میں دیکھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ فرما رہے تھے...... "سلطان سے کہو کہ میری آمد تک اس مقدمے کی کارروائی کو ملتوی کر دیا جائے۔"

دوسرے دن حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے سلطان شمس الدین التمش کو حضرت خواجہ معین

الدین چشتیؒ کا پیغام پہنچا دیا اور پھر سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا کہ سلطان الہندؒ کے تشریف لانے کے بعد از سر نو عورت کی روداد غم سنی جائے گی اور پھر حقائق کی روشنی میں کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ حضرت قطبؒ کے عام عقیدت منداور مرید اس اعلان کے بعد مطمئن ہو گئے تھے کہ اس طرح کچھ دن کیلئے خوفناک طوفان تھم گیا تھا مگر بعض بااثر درباریوں کا اصرار تھا کہ مقدمے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ان کے خیال میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ مجرم ثابت ہو گئے تھے کیونکہ عورت کو نہ پہچاننے کی بات کوئی وزن نہیں رکھتی تھی۔ کچھ لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ ایک شریف عورت بھرے دربار میں اپنے خود کو بے عزت نہیں کر سکتی تھی۔ اس گروہ کو یقین تھا کہ اس عورت کا دعویٰ درست ہے اور سلطان محض اس لئے حضرت قطبؒ کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ ان کا مرید ہے۔

سلطان شمس الدین التمش نے انتہائی سخت الفاظ میں اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے اس قدر حسن ظن رکھتا ہوں کہ اگر عدالت جرم ثابت بھی کر دے تو میں اپنی آخری سانس تک انہیں بے گناہ سمجھتا رہوں گا۔ بہت غور و فکر کے بعد میں نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مقدمہ نہایت پیچیدہ ہے، اس لئے ہمیں کچھ دن انتظار کر کے حقائق کو تلاش کرنا پڑے گا۔''

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے مقدمے کے التواء کے بارے میں فرمایا تھا۔ ''میں سلطان کے تعاون سے روپوش ہو کر دہلی نہیں چھوڑوں گا۔ اس شہر میں میرا قیام اس وقت تک رہے گا جب تک عدالت میری بے گناہی ثابت نہ کر دے یا پھر مجھے مجرم قرار دے دیا جائے۔ میں اپنے مقدمے کی پیروی کرنے سے قاصر ہوں۔ اس لئے میں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو اپنا وکیل مقرر کیا ہے۔ اب وہی دہلی تشریف لا کر اس کارروائی کو آگے بڑھائیں گے۔''

''حضرت خواجہؒ کا اس مقدمے سے کیا تعلق ہے؟'' ایک بااثر درباری نے سوال کیا۔ ''وہ اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟'' درباری سردار کے لہجے میں طنز پوشیدہ تھا۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''مجھے پیر و مرشد نے یہی حکم دیا ہے کہ میں اس حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔''

بات ختم ہو گئی تھی مگر سرگوشیاں اب بھی جاری تھیں۔ امرائے دہلی میں سے جو لوگ حضرت قطب کے غیر معمولی اثرات کو ناپسند کرتے تھے انہیں یہ التواء سخت ناگوار تھا۔ ان کے خیال میں مقدمے کی شکل بگاڑنے کیلئے حضرت قطبؒ کو یہ مہلت دی گئی تھی۔ مخالفین کے نزدیک مہلت خطرناک تھی۔ اس لئے ان لوگوں نے دوبارہ اس مظلوم عورت کو شمس الدین التمش کے دربار میں پیش کیا۔

''مجھے سلطان کے عدل و انصاف پر پورا یقین ہے مگر اس طویل عرصے میں میری اور بچے کی گزر بسر کس طرح ہو گی؟'' عورت نے اپنے غربت و افلاس کا ماتم کرتے ہوئے والیٔ ہندوستان کے سامنے دامن پھیلا دیا تھا۔

''تمہیں ساری مراعات بخشی جائیں گی۔'' سلطان شمس الدین التمش نے بمشکل اپنے غصے کو ضبط

کرتے ہوئے کہا اور پھر عورت کو سرکاری مہمان خانے میں داخل کرنے کا حکم دیدیا۔

اس کے بعد سلطان نے کئی بار عورت کو تنہائی میں طلب کیا۔ اسے حضرت قطبؒ کی روحانی عظمت کے بارے میں بتایا، سازش کے امکانات پر روشنی ڈالی مگر وہ اپنی بات پر قائم رہی۔ عورت تسلسل کے ساتھ ایک ہی بیان دے رہی تھی۔ ''قطب الدین بختیار کاکیؒ اس بچے کے باپ ہیں اور میں ان کی غیر شرعی بیوی۔''

سلطان التمش لرز کر رہ گیا اگرچہ وہ بھرے دربار میں حضرت قطب کی بے گناہی کا اقرار کر چکا تھا لیکن کبھی کبھی شیطانی وسوسے اس کے ذہن کو تہہ و بالا کر دیتے تھے کبھی وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا تھا کہ خدا عنقریب اس سازش کا پردہ چاک کر دے گا اور کبھی وہ خیالوں میں حضرت قطبؒ کے کردار کی بلند ترین عمارت کو ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ فرمانروائے ہند کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں اور وہ ناقابل بیان اذیت میں مبتلا تھا۔ اکثر اس کی نم آلود آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ جاتیں اور وہ زیر لب خدا کو پکارنے لگتا۔

دہلی کے در و دیوار پر وحشت خیز سناٹا تھا۔ شہر کے بیشتر لوگ اداس تھے کہ ان کا روحانی پیشوا تہمت کی خوفناک آندھیوں کی زد میں تھا...... اور خود حضرت قطبؒ کی یہ حالت تھی کہ آپ کی بے چین نگاہیں اس شاہراہ پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے گزر کر سلطان الہندؒ دہلی پہنچنے والے تھے...... مگر ابھی اہل یقین کیلئے اذیت و کرب کے طویل لمحات باقی تھے اور اجمیر سے دہلی بہت دور تھا۔

راہوں سے غبار اٹھتا رہا، ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے مسافر آتے رہے مگر ان میں وہ ذات گرامی شامل نہیں تھی جس کا حضرت قطبؒ کو شدید انتظار تھا۔ دہلی کی شاہراہ خاص کو تکتے تکتے اہل دل کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں مگر آنے والا ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ایک بار پھر مخالفین کی شورش نے سر اٹھایا۔ دبی زبان میں سلطان شمس الدین کو جانبدار کہا گیا سرگوشیوں میں فرمانروائے ہند پر اس طرح نکتہ چینی کی گئی کہ اب اس مقدمے کا فیصلہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔ یہاں تک کہ دہلی کے باشندے اپنے روز و شب کے ہنگاموں میں الجھ کر سب کچھ بھول جائیں گے۔ یہ سلطان شمس الدین التمش جیسے عادل بادشاہ پر بڑی جارحانہ تنقید تھی۔ خود مختار حکمران لرز کر رہ گیا۔ کئی بار اس کے دل میں آیا کہ فتنہ و شر پھیلانے والوں کی لمبی زبانیں کاٹ دے مگر وہ دستور دل سے مجبور تھا خوف خدا نے التمش کو طاقت کے استعمال سے باز رکھا ورنہ ایک لمحے میں تہمتوں اور افواہوں کا یہ سلسلہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو جاتا پھر کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ اگر مقدمہ عدالت میں لایا گیا تو دولت شاہی کے ذریعے قاضی کا ضمیر خرید لیا جائے گا۔ دریدہ دہن لوگوں کو کسی طرح بھی قرار نہیں تھا۔ سلطان کے جاسوس اسے یہ اذیت ناک خبریں مسلسل پہنچا رہے تھے۔ آخر التمش سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ حضرت قطبؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔

''سیدی!'' سلطان شمس الدین کا لہجہ افسردہ تھا۔ ''میں اس گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ دوبارہ الزام تراشیوں کا ذکر کر کے شیخ محترم کو اضطراب میں مبتلا کروں۔ مجھے عمر بھر اذیت میں رکھنے

کیلئے یہی احساس کافی ہے کہ میرے دور حکومت میں آپ کے لباس مبارک کو داغدار کیا گیا۔ مخالفین کو یہ شکایت ہے کہ میں انصاف سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ میں عدالت میں پیش ہونے کیلئے پہلے بھی تیار تھا اور اس وقت بھی آمادہ ہوں۔ معاذ اللہ! میں نے اپنے آپ کو بچانے کیلئے بہانہ سازی سے کام نہیں لیا ہے۔ پیر و مرشد کا یہی حکم ہے کہ وہ جب تک تشریف نہ لے آئیں اس وقت تک کیلئے ساری کارروائیاں ملتوی کر دی جائیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ پیر و مرشد ایسا کیوں چاہتے ہیں؟ بہرحال اہل شہر کچھ دن اور صبر کریں۔ شاہی عدالتیں زیادہ عرصے تک زحمت کش انتظار نہیں رہیں گی۔ سلطان الہندؒ دہلی پہنچنے ہی والے ہیں۔'' انتہائی ضبط کے باوجود حضرت قطبؒ کے دل کا درد لفظوں میں جھلکنے لگا تھا۔

''عام لوگوں کا خیال ہے کہ سلطان الہندؒ بہت زیادہ ضعیف ہو چکے ہیں۔ جسم کی یہ ناتوانی اس طویل سفر میں رکاوٹ بھی بن سکتی ہے۔'' شمس الدین التمش نے حضرت قطبؒ کے روبرو ان اندیشوں کا اظہار کیا جن کی بازگشت دہلی کی ایک ایک گلی میں سنائی دے رہی تھی۔

''انسانی عقل ایک محدود دائرے میں گردش کر سکتی ہے۔'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا۔ ''بے شک! سلطان الہندؒ بہت کمزور ہو چکے ہیں۔ تقاضائے فطرت تو یہی ہے کہ اس عمر میں انہیں طویل سفر سے گریز کرنا چاہئے مگر ان حضرات کی کرم فرمائیوں کو کیا کہوں کہ جنہوں نے پیر و مرشد کو دہلی آنے کیلئے مجبور کر دیا ہے۔ سلطان الہندؒ صرف میری خاطر یہ تکلیف برداشت کر رہے ہیں۔ آخر اہل دنیا کو اس بات پر فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے کہ حضرت خواجہؒ یہاں کس طرح پہنچیں گے؟ میں جس خدا کی پرستش کرتا ہوں اور جس کی کارسازی پر یقین رکھنا ایمان کی شرط اول ہے، وہ خدا اس بات پر بھی قادر ہے کہ وہ اپنے بندوں کیلئے زمین کے فاصلوں کو سمیٹ دے اور برسوں کے سفر کو لمحوں میں طے کرا دے۔'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اس طرح بول رہے تھے جیسے آپ اپنی آنکھوں سے قدرت خداوندی کو زمین پر نازل ہوتے دیکھ رہے ہوں۔

سلطان شمس الدین التمش کچھ دیر تک بارگاہ شیخ میں باادب بیٹھا رہا اور پھر اجازت لے کر چلا گیا۔

فتنہ پردازوں نے دوبارہ سلطان کے رویے پر تنقید کی تو فرمانروائے کا پیمانۂ صبر چھلک اٹھا۔ اس نے غضب ناک لہجے میں اہل دربار کو مخاطب کر کے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ یہ شرپسند کون ہیں مگر خدا عنقریب ان لوگوں کو بے نقاب کر دے گا۔ میں اب تک اس بات کا انتظار کرتا رہا کہ شاید مفسد اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں لیکن وہ قہر خداوندی سے نہیں ڈرتے۔ جس مرد خدا کی مسیحائی سے بے شمار مریضوں نے شفا پائی ہزاروں مفلسوں کو تنگدستی سے نجات ملی، لاتعداد گمراہوں نے ہدایت حاصل کی آج وہی ذات گرامی خوفناک تہمتوں کا ہدف بن کر رہ گئی ہے۔ کیا اہل شہر حضرت قطب کی خدمات کا صلہ اس طرح دینا چاہتے ہیں؟ میں اس مرد بزرگ سے شرمسار ہوں کہ میرے دور اقتدار میں اذیت ناک واقعہ پیش آیا۔ اگرچہ کسی دلیل کے بغیر کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا لیکن مجھے یقین ہے کہ بعض دنیاداروں نے حضرت قطبؒ کے خلاف یہ شرمناک سازش کی ہے وہ اس بات پر مطمئن ہیں۔

ان کا منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہو جائے گا۔ کیا انہیں قدرت کے مزاج کا اندازہ نہیں؟ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ خدا اپنے نام لیواؤں کو زمین پر تنہا چھوڑ دیتا ہے؟ ایسا ہرگز نہیں یہ تو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر ایک آزمائشی لمحہ ہے۔ جو بہرحال سلامتی سے گزر جائے گا۔ لوگ میری خاموشی پر معترض ہیں اور عدالت عالیہ کو مستقل بدنام کیا جا رہا ہے کیا انہیں اس بات کا علم نہیں کہ اللہ نے اپنے بندے شمس الدین التمش کو اس ملک میں بے پناہ اختیارات عطا کئے ہیں اگر میں جانبدار ہوتا اور حضرت قطبؒ کو بچانے کی کوشش کرتا تو پھر یہ مقدمہ عدالت میں کس طرح پیش کیا جا سکتا تھا؟ جو لوگ میری نرم دلی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ آئندہ اس قسم کی سرگوشیاں برداشت نہیں کی جائیں گی۔ میں سر دربار اعلان کر چکا ہوں کہ حضرت سلطان الہندؒ کی آمد کے بعد اس مقدمے کے فیصلے کا اعلان کیا جائے گا جب اس عورت نے بھرے مجمع میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر الزام تراشی کی ہے تو پھر قانونی کارروائی بھی برسر عام ہوگی۔'' سلطان شمس الدین التمش نے انصاف کے نام پر فتنہ و فساد پھیلانے والوں کو در پردہ سخت تنبیہہ کی تھی۔ پھر اہل شہر نے دیکھا کہ حکومت پر تنقید ختم ہو گئی تھی لیکن اشاروں میں گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ لوگوں کے سیاہ قلب اور پراگندہ ذہن اب بھی خوف خدا کے احساس سے عاری تھے۔

بظاہر افواہوں اور نکتہ چینیوں کا سلسلہ رک گیا تھا مگر حضرت قطبؒ کی بے قراریوں کا وہی عالم تھا آپ کی مضطرب نگاہیں مستقل اس راستے پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے گزر کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ دہلی پہنچنے والے تھے۔ یہ انتظار کسی عام انسان کا نہیں تھا یہ ایک ایسے مرد پاکباز کا انتظار تھا جو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے وکیل کی راہ تک رہا تھا۔ ایسا وکیل جس کی موجودگی مقدمے کی نوعیت کو یکسر بدل دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

آخر کشمکش انتظار ختم ہوئی۔ اہل دل جن کی نبض ڈوبی جاتی تھیں، اب انہیں نئی زندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ طویل مسافت طے کرنے کے بعد دہلی تشریف لے آئے تھے۔ اس سے پہلے بھی سلطان الہندؒ نے اس تاریخی شہر میں دو بار قیام فرمایا تھا مگر آج آپ کی آمد کے باعث دہلی کے مسلمان باشندے ہیجان انگیز خوشی سے سرشار تھے۔ انسانی ہجوم گھروں سے نکل کر ''مہرولی'' کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اپنی نئی خانقاہ تعمیر کی تھی۔

جب حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ دہلی تشریف لائے تھے تو آپ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حکم سے ''کیلوکھڑی'' میں سکونت اختیار کی تھی۔ کیلوکھڑی دہلی کا مضافاتی علاقہ تھا اور یہ جگہ مرکزی شہر سے بہت دور واقع تھی۔ حضرت قطبؒ فطری طور پر شہر کے ہنگاموں اور شور و غل سے دور رہنا پسند کرتے تھے مگر جب سلطان شمس الدین التمش آپ کا مرید ہوا تو آپ کیلوکھڑی کو چھوڑ کر مہرولی تشریف لے آئے۔ اس نقل مکانی کی وجہ یہ تھی کہ سلطان امور سلطنت سے فارغ ہونے کے بعد روزانہ حضرت قطب کی قدم بوسی کو حاضر ہوتا تھا۔ محلات شاہی اور کیلوکھڑی کے درمیان زیادہ

فاصلہ ہونے کے سبب شمس الدین التمش کو واپسی میں بہت دیر ہو جاتی تھی، آخر ایک دن اس نے حضرت کے روبرو اپنی مجبوریاں بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ وہ فرائض منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ بارگاہ شیخ میں روزانہ حاضری دینا چاہتا ہے۔ حضرت قطب سلطان کی گفتگو کا مفہوم سمجھ گئے تھے، اس لئے آپ نے محض اس کے جذبۂ عقیدت سے مجبور ہو کر مہرولی میں قیام فرمایا۔ اس وقت حضرت سلطان الہندؒ مہرولی کی خانقاہ میں مقیم تھے۔ لوگ قطار در قطار آتے گئے اور خانقاہ کے باہر جمع ہوتے رہے۔ عقیدت مندوں کی بھیڑ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے بے قرار تھی۔ آخر غریب نواز بندگان خدا کی دلجوئی کیلئے خانقاہ کے دروازے پر تشریف لائے۔ لوگوں نے دیکھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بہت ضعیف ہو چکے تھے آپ کے چہرۂ مبارک سے نقاہت ظاہر ہو رہی تھی۔ پھر بھی ہونٹوں پر وہی جاں فزا تبسم موجود تھا۔ آپ کی یہ شان جمالی دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ حضرت سلطان الہندؒ کو اپنے درمیان پا کر ہجوم کے جذبات بے قابو ہو گئے کچھ لوگ ادب و احترام سے سر جھکائے ہوئے آگے بڑھے اور پھر حرف شکایت ان کی زبان پر آ گیا۔

”آپ ان فتنہ پردازوں کے حق میں بددعا کر دیجئے جو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر الزام تراشی کر رہے ہیں۔ اب ہم لوگوں سے یہ اذیت ناک صورتحال برداشت نہیں ہوتی۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے انسانی ہجوم کو دیکھا ہر آنکھ میں رنج و الم کا دھواں تھا اور چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ ”میں خوش ہوں کہ تم نے اس آزمائش کی گھڑی میں اہل ہوس کا ساتھ نہیں دیا۔ اللہ تم پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔“ حضرت سلطان الہندؒ نے اہل شہر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا...... ”میں اس بات پر بھی خوش ہوں کہ تم نے قطبؒ کے غم کو اپنا غم سمجھا۔ قطبؒ کو میں نے دہلی میں متعین کیا تھا۔ اس لئے قطبؒ کی ذات میری ذات ہے۔ دوالزام تراشیاں قطبؒ پر نہیں، براہ راست میں ان کا ہدف ہوں۔“ یہ کہتے کہتے حضرت سلطان الہندؒ کے چہرۂ مبارک پر ہلکا سا عکس جلال اُبھر آیا تھا۔ آپ نے دوبارہ مجمع کی طرف دیکھا اور پُرجوش لہجے میں فرمانے لگے۔

”ہم سب رحمت اللعالمین ﷺ کی اُمت ہیں، اگر تم بھول گئے ہو تو میں تمہیں یاد دلا دوں کہ دشمنوں کو دعا دینا آقا کی ممتاز ترین سنت ہے جو لوگ آقا کی غلامی کا دم بھرتے ہیں انہیں ہر حال میں صبر کرنا چاہئے۔ اپنے کاموں کو اللہ کے سپرد کر کے کسی دوسری طرف دیکھنا شرک ہے اللہ کی کارسازی پر یقین رکھو اور انتظار کرو کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہونے والا ہے؟“ یہ کہہ کر آپ خانقاہ میں تشریف لے گئے اور انسانی ہجوم اس طرح منتشر ہو گیا کہ ہر شخص اپنی جگہ مسرور و مطمئن نظر آ رہا تھا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس بھیڑ میں چند ایسے لوگ بھی موجود تھے جنہیں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی باتوں سے دلی تکلیف پہنچی تھی۔ وہ ہر حال میں حضرت خواجہؒ کو شرمسار اور حضرت قطبؒ کو گناہ گار دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی پست فطرتیں مسلسل اس بات کا تقاضا کر رہی تھیں کہ

قطب الدین بختیار کاکیؒ اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکیں اور یہ مرد حق اہل شہر کے نزدیک معتوب و مجرم قرار پائے۔

جیسے ہی سلطان شمس الدین التمش کو حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی آمد کی خبر ہوئی، وہ فوراً قدم بوسی کیلئے حاضر ہوا آپ کے روبرو پہنچ کر سلطان کی حالت بھی غیر ہو گئی وہ رقت آمیز لہجے میں عرض کرنے لگا۔ ”خواجۂ خواجگاں میرے حال زار پر کرم فرمائیے کہ اب دنیا داروں کا رویہ ناقابل برداشت ہو چکا ہے۔“

”سلطان! دنیا نے تو اہل ایمان کے ساتھ ہمیشہ یہی سلوک کیا ہے۔ آئندہ بھی تم اس کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے شمس الدین التمش کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ ”تمہارا منصب بڑا ہے، اس لئے تمہیں زیادہ صابر ہونا چاہئے۔“

”شیخ محترم! یہ معاملہ اس ذات گرامی کا ہے جو ہمارے لئے مثالی حیثیت رکھتی ہے۔“ جوش جذبات میں فرماں روائے ہند کی آواز لرز رہی تھی۔ ”جسے دیکھ کر اہل ایمان روشنی حاصل کرتے ہیں اگر اس کی شخصیت ہی تہمتوں کی زد میں آ جائے تو پھر جہل و گمراہی کی سیاہ رات کہاں جا کر ٹھہرے گی؟“ سلطان شمس الدین التمش کی باتوں سے شدید کرب نمایاں تھا۔

”سلطان! خدا تمہیں حسن نیت کا صلہ دے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بڑی محبت سے فرمایا۔ ”تم نے جس طرح قطب کی عزت و توقیر کی ہے اللہ بھی تمہیں دونوں جہان میں سربلند کرے گا۔“

”میں جب تک زندہ رہوں گا، دل کی یہ خلش بھی برقرار رہے گی کہ میرے دور حکومت میں حضرت قطبؒ کے پاکیزہ لباس کو داغدار کرنے کی کوشش کی گئی۔“ یہ کہتے کہتے سلطان التمش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ”خواجۂ خواجگاں! میں بھی دوسروں کی طرح آپ کا اور حضرت قطبؒ کا مجرم ہوں۔“

”سلطان! خالق کائنات تمہارے دل کی اس سوزش کو ہمیشہ قائم رکھے کہ یہ گداز ہی بندے کو اللہ تک پہنچاتا ہے اور یہ عجز و انکسار ہی میزان عدل قائم کرتا ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ فرماں روائے ہند کے جذبۂ عقیدت سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ ”دنیا اپنا کام کر رہی ہے، تم انصاف کے تقاضے پورے کرو۔ قطبؒ پر سر دربار الزام لگایا گیا تھا اس لئے یہ مقدمہ سر دربار ہی طے ہوگا۔ اہل شہر کو بتا دو کہ کل عدالت آراستہ ہوگی پھر خدا جسے چاہے گا رسوا کرے گا اور جسے چاہے گا عزت و تکریم بخشے گا۔“

سلطان التمش بارگاہ خواجہؒ سے اُلٹے پاؤں رخصت ہوا اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی پورا دہلی ایک ایسے اعلان سے گونجنے لگا جس کی دھمک لوگوں کو اپنے دل کے قریب محسوس ہو رہی تھی۔

وہ دن تاریخ ہندوستان کا ایک یادگار دن تھا۔ لوگ اپنے کاروبار معطل کر کے دربار شاہی کی طرف جا رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اہل شہر کو اس مقدمے کا فیصلہ سننے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ مسلمان تو مسلمان مقامی ہندوؤں کی بھی ایک بڑی تعداد قلعے کے چاروں طرف رواں دواں

تھی۔ پتھر کے پجاری دل میں بہت خوش تھے۔ جن مسلمانوں نے ان کے ہاتھوں سے تخت چھینا تھا آج اسی قوم کا روحانی پیشوا ایک ملزم کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہونے والا تھا۔ اللہ کے منکر میدان جنگ میں شکست کھانے کے بعد ہر مقام پر مسلمانوں کو رسوا دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ایک دلچسپ تماشا تھا۔ خود مسلمانوں میں بھی علماء کا ایک گروہ حضرت قطبؒ کی بدنامی پر بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اس کے برعکس حضرت قطبؒ کے عقیدت مند اداس نظر آرہے تھے۔ ان کی زبانیں خاموش تھیں مگر دل مصروف دعا تھے۔ یہ ہجوم قلعے کے دروازے پر جا کر ٹھہر گیا تھا۔ انسانوں کو دربار میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے خلیفۂ اکبر حضرت قطبؒ کے ہمراہ تشریف لائے۔ قلعے کے باہر کھڑے ہوئے بے شمار انسانوں کے سر عقیدت سے جھک گئے۔ سپاہی جو پہرے پر موجود تھے انہیں پہلی بار اندازہ ہوا کہ حقیقی بادشاہت اسے کہتے ہیں۔ سلطان التمش حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو شاہی اعزاز واحترام کے ساتھ دربار تک لانا چاہتا تھا مگر آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اس خاطر مدارات سے سلطان کی جانبداری ظاہر ہوگی اور عدالت کا وقار مجروح ہو جائے گا۔

جیسے ہی سلطان الہندؒ اور حضرت قطبؒ دربار میں داخل ہوئے بام و در پر لرزہ طاری ہو گیا۔ سلطان شمس الدین التمش احتراماً اپنی نشست سے اٹھا اور اس کے ساتھ ہی تمام امرائے دربار بھی کھڑے ہو گئے۔ یہاں تک کہ قاضی عدالت کو بھی اپنے فرماں رواں کی تقلید کرنی پڑی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے دربار کا یہ رنگ دیکھا تو بلند آواز میں فرمایا۔

”آج احترام کا یہ مظاہرہ جائز نہیں۔“ پھر آپ نے قاضی سے پوچھا۔ ”کیا مدعی عورت اور اس کا بچہ عدالت میں حاضر ہو چکے ہیں؟“

”جی ہاں! عورت اپنے بچے کے ہمراہ دربار میں موجود ہے۔“ قاضی نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ ”عورت کا دعویٰ ہے......“

اس سے پہلے کہ قاضی صاحب کی بات مکمل ہوتی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے فرمایا۔ ”جس دعوے کی زمانے میں تشہیر ہو چکی اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف عورت اور اس کے بچے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

قاضی عدالت نے سپاہی کو اشارہ کیا۔ چند لمحوں بعد ایک عورت اس طرح دربار سلطانی میں داخل ہوئی کہ سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور اس کی گود میں تقریباً دو ماہ کا شیر خوار بچہ تھا۔ عورت آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی قاضی کے سامنے آ کے ٹھہر گئی۔ سلطان شمس الدین التمش سے لے کر دربار کے پہرے دار تک اپنی اپنی جگہ ساکت تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت قطبؒ کے عارفانہ جلال نے لوگوں کے دلوں پر ہیبت طاری کر دی تھی۔ آخر سلطان الہندؒ آگے بڑھے اور انتہائی نرم لہجے میں عورت سے مخاطب ہوئے۔

”خاتون! یہ کیسی قیامت ہے کہ تم جیسی خانہ دار عورت کو بھرے دربار میں اپنا حق طلب کرنے کیلئے آنا پڑا۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں اور چہرۂ مبارک سرخ ہو رہا تھا۔ دراصل آپ کو اس حیا سوز واقعہ سے شدید تکلیف پہنچی تھی۔ اس لئے عورت سے گفتگو کرتے وقت حضرت سلطان الہندؒ کو ناقابل بیان اذیت کا احساس ہو رہا تھا۔

”میں خود اپنا گھر چھوڑ کر یہاں تک نہیں آئی ہوں۔“ عورت نے سوگوار لہجے میں کہا۔ ”میری رسوائی کا سبب ان سے پوچھئے۔“ عورت نے حضرت قطبؒ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا چہرہ بدستور چادر میں چھپا ہوا تھا۔

”معزز خاتون! تم اس شخص کو اچھی طرح جانتی ہو؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے انتہائی قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عورت سے حضرت قطبؒ کے بارے میں سوال کیا۔

”دنیا میں مجھ سے زیادہ ان کے متعلق کون جان سکتا ہے؟“ یہ کہتے کہتے عورت رونے لگی تھی۔ ”یہ میرے غیر شرعی شوہر ہیں انہوں نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا مگر بعد میں نظریں پھیر لیں اور اپنے ہر وعدے کو فراموش کر دیا۔ اب میں ایک بے سہارا عورت اپنے جسم پر تہمتوں کے داغ سجائے ہوئے دربدر بھٹک رہی ہوں۔“ عورت بڑے دردناک لہجے میں فریاد کر رہی تھی۔

”یہ تمہارا غیر شرعی شوہر ہے؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا آپ کو قطعاً یہ اُمید نہیں تھی کہ عورت اس بے باکی کے ساتھ حضرت قطبؒ پر الزام تراشی کرے گی۔

”یہ شخص جو کمسنی کے عالم میں اپنا گھر چھوڑ کر بندگان خدا کو ہدایت دینے کیلئے نکلا تھا، جسے میں نے اپنے بچے کی طرح پرورش کیا ہے، جس کے کردار کی بلندی کو سارا عالم جانتا ہے، وہ اتنا عہد شکن اور سیاہ کار بھی ہو سکتا ہے؟“ انتہائی برداشت کے باوجود سلطان الہندؒ کی آواز سے رقت جھلکنے لگی تھی۔

”کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتیں؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بڑے جذباتی انداز میں عورت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اگر کوئی بھٹکا ہوا مسافر منزل کی طرف لوٹ آئے تو اسے گم کردہ راہ نہیں کہہ سکتے۔ ابھی وقت ہے کہ تم رجوع کر لو۔ کوئی گناہ ایسا نہیں کہ اگر بندہ تائب ہو جائے تو اللہ اسے معاف نہ کرے۔“

”جب میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تو کس بات سے توبہ کروں۔“ عورت غمزدہ ہونے کے باوجود بہت بے باکی سے بول رہی تھی۔ ”خوف خدا تو انہیں نہیں آتا جو دوسروں کی زندگی سے کھیلتے ہیں۔“

”اہل دربار تم گواہ رہنا کہ حجت پوری ہو چکی۔“ یکایک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے لہجے میں تبدیلی آگئی تھی اور ان کے الفاظ سے جلال روحانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر ایوان شاہی کے در و بام ساکت ہو گئے۔ ”میں نے تجھے دوزخ کی اس نادیدہ آگ سے بچانا چاہا جسے تیری بیمار آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں مگر انسان کی کیا طاقت ہے کہ وہ کسی کو عذاب آسمانی سے محفوظ رکھ سکے، جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔“ حضرت سلطان الہندؒ اس عورت سے مخاطب تھے جو بہت دیر سے اپنے آپ کو مظلوم ثابت کر رہی تھی۔ ”تو نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا ہے۔ کاش! تجھے کوئی بتاتا کہ کسی معصوم انسان پر تہمت طرازی کتنا بڑا گناہ ہے؟“

”عدالت میں وعظ و نصیحت کی کوئی گنجائش نہیں۔“ قاضی نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”دنیا میں کسی بھی انسان سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ عورت کے بیانات کو صرف اس لئے رد نہیں کیا جا سکتا کہ ملزم خانقاہ میں بیٹھنے والا ایک بڑا خرقہ پوش ہے۔“

قاضی عدالت دہلی کے ممتاز علماء کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس پورے گروہ کو سلطان شمس الدین التمش کے دربار میں بڑے بڑے عہدے حاصل تھے۔ یہ علمائے ظاہر نظام خانقاہیت کو ناپسند کرتے تھے۔ ان تمام حضرات کو صوفیوں کے مسلک سے خاص عداوت تھی۔ یہ لوگ خانقاہ کے گوشے میں بیٹھنے والے درویشوں کو بے عمل سمجھ کر ان کے طرز زندگی پر کڑی نکتہ چینی کرتے تھے۔ قاضی عدالت اپنے اسی فطری تعصب کا مظاہرہ کر رہا تھا تا کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور ان کے تمام عقیدت مند سلطان شمس الدین التمش کی نگاہ میں بے وقعت ہو جائیں۔

”قاضی محترم! آپ کا یہ قول درست ہے کہ کوئی بھی انسان گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اس طرح بول رہے تھے کہ آپ پر شیریں سخنی ختم ہو چکی تھی۔ ”خانقاہ کے گوشے میں چھپ کر بیٹھنے والے بھی مجرم ہو سکتے ہیں۔ مگر کیا یہ شخص قطب الدین بختیار کاکیؒ آپ کی نظر میں گناہ گار ہے؟“ حضرت سلطان الہندؒ نے قاضی عدالت سے ایک عجیب سوال کر ڈالا تھا۔

قاضی چند لمحوں کیلئے حیران رہ گیا پھر اپنی سراسیمگی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”اس مقدمے کا تعلق میری ذات سے نہیں۔ اگر میں قطب الدین بختیار کاکیؒ کو بے گناہ سمجھ بھی لوں تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ یہ کرسی عدالت ہے جس پر مجھے حضرت سلطان کے حکم سے بٹھایا گیا ہے، اس کرسی پر بیٹھنے والا ملزم سے ثبوت طلب کرتا ہے۔ مجھے قطب الدینؒ سے کوئی پرخاش نہیں۔ وہ اپنی بے گناہی کا ثبوت فراہم کریں اور باعزت طور پر اپنی خانقاہ کی طرف لوٹ جائیں۔“ قاضی عدالت بظاہر نہایت معقول لہجے میں گفتگو کر رہا تھا لیکن اہل نظر جانتے تھے کہ اس کی نیت صاف نہیں تھی۔ وہ حضرت قطبؒ کی عوامی شہرت اور روحانیت کے بلند درجات سے حسد رکھتا تھا۔ بغض و کینہ کی اس آگ نے قاضی کو یہاں تک جلایا تھا کہ اس کے دل و دماغ سیاہ ہو کر رہ گئے تھے اور اب اس کثافت کے باعث حضرت قطبؒ کو سر دربار رسوا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیا اللہ کی راہ میں قطبؒ کا یہ طویل ترین سفر اس کی بے گناہی کیلئے کافی نہیں؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے قاضی عدالت کی مخاصمانہ گفتگو سن کر سوال کیا۔

”عدالت کی نگاہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں کہ ایک شخص دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات بھر جاگ کر عبادت کرتا ہے۔“ قاضی عدالت کا لہجہ تلخ تو نہیں تھا مگر اس سے بے مروتی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ ”زہد و تقویٰ اپنی جگہ ہے اور ایک عورت کا دعویٰ اپنی جگہ۔ قطب الدین کی عبادت و ریاضت محض خدا کیلئے ہے۔ وہ اپنے اس فعل کیلئے اللہ کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ہم ان سے اس سلسلے میں باز پرس کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ عدالت میں ایک عورت نے اپنی حق تلفی کا دعویٰ دائر کیا ہے۔ اسی دعوے کی روشنی میں قطب الدینؒ سے ان کی بے گناہی کا ثبوت مانگتے ہیں۔ اس ذیل میں یہ

دلیل قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ ایک شخص کتنا متقی اور پرہیز گار ہے؟“

”پھر کس طرح بے گناہی کا ثبوت پیش کیا جائے؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا ”قطب بارہا اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ مدعی عورت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ عدالت اس اعلان کو کیوں کافی نہیں سمجھتی؟“

”اپنے بارے میں ملزم کی اپنی گواہی قانونی اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔“ قاضی عدالت نے اعتراض کیا۔ ”عدالت کی نظر میں اس بات کی اہمیت ہے کہ ملزم کی بے گناہی پر غیر متعلق افراد کس انداز میں شہادت پیش کرتے ہیں؟“

”اگر آپ کا معیار شہادت یہی ہے تو پھر پورا ہندوستان قطب کی معصومیت پر گواہی دے رہا ہے مگر بدقسمتی سے آپ ان آوازوں کو سننے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے انتہائی تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

”یہ تمام لوگ قطب الدینؒ کے عقیدت مند ہیں اور عقیدت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔“ قاضی عدالت نے دوسرا اعتراض اٹھایا۔ ”عقیدت میں انسان بہرا بھی ہو جاتا ہے۔ اس میں اپنے ممدوح کے خلاف کوئی بات سننے کی ہمت باقی نہیں رہتی۔ گواہیاں ان لوگوں کی قبول کی جاتی ہیں جو غیر جانبدار ہوتے ہیں۔“

”آپ کا یہ نقطۂ نظر مجہول ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے قاضی عدالت کو سمجھاتے ہوئے فرمایا۔

”شہادت کے پیش ہوتے وقت صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ گواہ صادق القول ہے یا کاذب؟ سود خور ہے یا رزق حلال کھانے والا؟ صراط مستقیم پر چلنے والا ہے یا گم کردہ راہ؟ اپنے دل میں خوف خدا رکھتا ہے یا دنیا کی ہوس؟ بدمعاملہ ہے یا امانت دار؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اسلامی عدالت میں پیش ہونے والے ایک گواہ کی صفات اس طرح بیان فرما رہے تھے کہ پورے دربار پر سناٹا طاری تھا۔

ایک مرد کامل کی جرأت گفتار دیکھ کر قاضی عدالت کے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا تھا اس نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اہل دربار کی نظروں میں اپنا بھرم قائم رکھنے کیلئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی باتوں کو جھٹلانے لگا۔ ”میں فقہ کا عالم ہوں اور اسلامی قانون کی باریکیوں کی خانقاہ کے گوشے میں بیٹھنے والے درویش سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔“ علم ظاہری کے خمار نے قاضی عدالت کے ہوش و حواس چھین لئے تھے اور وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو ایک عام خرقہ پوش انسان سمجھ کر گفتگو کر رہا تھا اور اس کی لاف زنی کو دیکھ کر سلطان شمس الدین التمش اور بیشتر درباریوں کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے تھے مگر عدالت کے احترام میں کسی ایک شخص نے بھی اپنے ہونٹوں کو جنبش نہیں دی تھی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تو اس مزاج کے انسان ہی نہیں تھے آپ نے قاضی عدالت کی تلخ بیانی کو ایک دلنواز تبسم کے ساتھ نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔ ”بے شک! آپ اسلامی قانون کا بہت

زیادہ علم رکھتے ہیں۔ اگر آپ میں قانون دانی کی یہ غیر معمولی صفت موجود نہیں ہوتی تو آپ عدالت پر کس طرح جلوہ افروز ہوتے؟'' یہ کہہ کر حضرت سلطان الہندؒ نے قاضی عدالت کی طرف سے دیکھا مگر اس کے چہرے پر شرمساری کی ہلکی سی علامت بھی نمایاں نہیں تھی۔ منصب نے عہدے پر فائز ہونے کے احساس نے اس کے سر کو کچھ اور بلند کر دیا تھا۔

''اگر آپ قطبؒ کی گواہی کو اہمیت نہیں دیتے تو پھر عورت کی طرف سے چار گواہ پیش کریں جو کو خانقاہ کے ایک گوشے میں بیٹھنے والے خرقہ پوش کی غیر شرعی بیوی ثابت کر سکیں۔'' حضرت معین الدین چشتیؒ نے قاضی عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''جب آپ کی عدالت قطب انکار کو تسلیم نہیں کرتی تو پھر عدالت کے تنہا اقرار کو مقدمے کی بنیاد کیوں بنایا جا رہا ہے؟'' حضرت سلطان الہندؒ نے ایک عقلی اور مذہبی دلیل پیش کی جسے سن کر اہل دربار حیران رہ گئے اور قاضی سراسیمگی کا شکار نظر آنے لگا۔

''عورت کے گواہ عدالت میں موجود ہیں۔'' قاضی نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''پھر انہیں تمام حاضرین کے سامنے پیش کیا جائے۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اصرار کیا۔

''جب تم لوگوں نے ایک مرد خدا کو تماشا بنا ہی دیا ہے تو پھر ضروری ہے کہ اس شہر کے دو پارسا بھی بے نقاب ہو جائیں۔'' اب حضرت سلطان الہندؒ کے لہجے میں جلال ظاہر ہونے لگا تھا۔

''عورت کے دعوے کی صحت پر گواہی دینے عدالت کے سامنے حاضر ہوں۔'' قاضی نے دربار کی پچھلی صفوں پر نظر ڈالتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

دوسرے ہی لمحے صدر دروازے کے قریب سے چار تنومند افراد اٹھے اور دبے قدموں سے چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ اہل دربار نے ان لوگوں کو دیکھا۔ وہ اپنے لباس کے درمیانی طبقے کے لوگ آتے تھے مگر ان کے چہروں پر سختی اور بے رحمی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ چاروں قاضی عدالت کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

ابھی قاضی ان سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ گواہوں سے مخاطب ہوئے۔ ''تم یہ بات کس طرح کہتے ہو کہ مدعی عورت قطبؒ کی غیر شرعی بیوی ہے اور یہ بچہ اس کی قانونی اولاد؟'' حضرت سلطان الہندؒ کی آواز سن کر ایک بار پھر دربار پر سناٹا طاری ہو گیا۔

مقدمہ تیزی سے اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا تھا اور حاضرین اس الزام تراشی کا منطقی نتیجہ دیکھنے کیلئے بے قرار تھے۔ چاروں گواہوں نے بیک وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھا۔ پھر یکایک ان کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا۔

''بتاؤ کہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے اس عورت کا کیا رشتہ ہے؟'' قاضی عدالت نے گواہوں سے سخت لہجے میں کہا۔

گواہوں کی مایوس نگاہیں پلٹیں اور چاروں آدمی قاضی کو اس طرح دیکھنے لگے جیسے وہ ان کا

اجنبی ہو یا پھر اس کی بات ان کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔

''تم بولتے کیوں نہیں؟'' قاضی عدالت کا لہجہ مزید سخت ہو گیا تھا۔

گواہوں کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ کبھی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور کبھی قاضی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان سے بیان دینے کے سلسلے میں مسلسل کہا جا رہا تھا لیکن وہ اب تک اپنی زبانوں سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکے تھے۔ اہل دربار نے دیکھا کہ گواہوں کے ہونٹ کانپ کر رہ جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ان کی قوت گویائی سلب کر لی گئی ہو۔ سلطان شمس الدین سے لے کر ایک ایک درباری تک، سب کے سب حیران تھے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جن لوگوں کو اس قدر طمطراق اور یقین کے ساتھ بطور گواہ پیش کیا گیا تھا ان کی زبانیں اس طرح گنگ ہو جائیں گی۔

''بولو! میری مجبوریوں پر گواہی دو۔'' ناگہاں وہ عورت سر دربار چیخنے لگی۔ ''عدالت کو بتاؤ کہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اس مظلوم بچے کے باپ ہیں۔'' عورت ان گواہوں کو مخاطب کر کے دردناک لہجے میں فریاد کر رہی تھی۔ ''تم تو سارے حالات سے آشنا ہو، پھر تمہیں کیوں چپ لگ گئی ہے؟ کیا اس دنیا میں ایک ستم رسیدہ عورت کا کوئی پُرسان حال نہیں؟ کیا ایک شخص کے تقدس کا بھرم قائم رکھنے کیلئے انصاف کے تمام تقاضوں کو پامال کر دیا جائے گا؟'' گواہوں کو خاموش دیکھ کر عورت پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور اس کی گریہ وزاری سے پورا دربار گونجنے لگا تھا۔

''خاتون!'' دفعتاً دربار میں سلطان شمس الدین التمش کی آواز اُبھری۔ ''ہم نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے دعوے سے ہندوستان کی ایک عظیم مذہبی شخصیت شدید بدنامیوں کی زد میں آ جائے گی، تمہیں انصاف فراہم کرنے کی پوری کوشش کی مگر آج صورتحال یہ ہے کہ تمہاری مظلومیت پر گواہی دینے کیلئے ایک شخص بھی موجود نہیں۔'' یہ کہتے کہتے سلطان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

''ظلِ الٰہی!'' عورت خوف سے کانپنے لگی۔ ''یہ لوگ جو کل تک چیخ چیخ کر میرے حق میں گواہیاں دے رہے تھے، آج رعب شاہی نے ان کی زبانوں پر مہر لگا دی ہے۔'' عورت کے بہتے ہوئے آنسو رک گئے تھے اور اب وہ نئے انداز میں اپنی وکالت کر رہی تھی۔ ''گواہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سلطان کو قطب الدین بختیار کاکیؒ سے کیا نسبت ہے؟ اسی نسبت نے ان کی قوت گویائی چھین لی ہے۔ وہ ظلِ الٰہی کے پیر و مرشد کے خلاف کس طرح گواہی دے سکتے ہیں؟ انہیں اپنے انجام سے ڈر لگتا ہے۔ اگر قاضی عدالت ان سے تنہائی میں بیان لیں تو یہ سب کچھ بتا دیں گے۔'' عورت نے اپنی ذہانت سے مقدمے کو نیا رخ دینے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں ظلِ الٰہی! میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ جلال شاہی نے انہیں خوفزدہ کر دیا ہے۔'' جیسے ہی عورت کی گفتگو ختم ہوئی قاضی عدالت بول پڑا۔ اہل دربار ایک منصف کی اس حرکت پر چونک اٹھے۔ اب بیشتر لوگوں کو محسوس ہونے لگا تھا کہ قاضی عدالت اس مقدمے میں جانبداری سے کام لے رہا ہے۔

''سچائی کسی سے خوفزدہ نہیں ہوتی۔'' سلطان شمس الدین التمش غضب ناک ہو گیا۔ ''اگر فرماں روائے وقت بھی کوئی جرم کرتا ہے تو لوگوں کو پوری صداقت کے ساتھ گواہی دینی چاہئے جب ایک

معزز ترین انسان پر سر دربار اتنا گھناؤنا الزام عائد کیا گیا ہے تو مقدمے کی کارروائی بھی سامنے ہوگی۔ اگر یہ چاروں گواہ جھوٹے ثابت ہوئے تو انہیں تہمت طرازی کے جرم میں سزا سے گزرنا ہوگا۔" یہ کہہ کر سلطان شمس الدین التمش خاموش ہوگیا۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ التمش کا یہ اعلان سنتے ہی تمام گواہوں کے چہرے اس طرح زرد تھے جیسے وہ اپنے عقب میں موت کے بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ سن رہے ہوں۔ ایک بار چاروں نے پوری توانائی کے ساتھ بولنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ابھی یہ اذیت جاری تھی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو ان بدنصیب انسانوں پر رحم آگیا۔ "سلطان! یہ غلام مجبور ہیں۔ ان کی زبانوں نے ہمیشہ کیلئے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔"

"سیدی! پھر یہ مسئلہ کس طرح طے ہوگا؟" سلطان شمس الدین التمش نے نہایت ادب کے ساتھ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے عرض کیا۔

"جس ذات بے نیاز نے اپنے عاجز بندے معین الدین کو اس ضعیفی کے عالم میں اجمیر تک پہنچایا ہے، وہی اس نازک مقام پر بھی دستگیری کرے گا۔" سلطان التمش کے سوال کا جواب دے کر حضرت خواجہ غریب نوازؒ قاضی عدالت سے مخاطب ہوئے۔ "بے شک آپ کا علم وسیع ہے مگر دماغ کشادہ نہیں ہیں۔ اسلامی قانون کے مطابق منصف کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ مقدمے کے آخری لمحے تک غیر جانبدار رہے۔ میں اس کا گلہ نہیں کرتا کہ آپ نے قطبؒ سے حسن ظن نہیں رکھا۔ مجھے شکایت ہے کہ آپ نے ایک مرد حق سے بدگمانی کی۔ ثبوت طلب کرنا یقیناً انصاف کا تقاضا ہے، الزام تراشی کرنے والوں کو سہارا دینا عدل کا خون ہے۔"

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی حقیقت بیانی سے قاضی عدالت کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس سے پہلے وہ کہ اپنے دفاع میں کسی بہانہ سازی سے کام لیتا، حضرت سلطان الہندؒ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے فرمایا۔ "اب ساری وضاحتوں کا وقت گزر چکا۔ عدالت کا فرض اولین تھا کہ وہ اپنے ذرائع سے دونوں فریقوں کے بارے میں تحقیقات کراتی۔ اسے اس بات کا احساس ہونا چاہئے تھا کہ الزام تراشی کرنے والی عورت کون ہے اور جس پر الزام عائد کیا گیا ہے وہ کس کردار کا مالک ہے؟ مقدمے کی کارروائی سے پہلے اس حقیقت کا ادراک ضروری تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ لوگ اپنے انجام سے اس قدر بے پروا ہوگئے ہیں کہ پارساؤں کے لباس کو داغدار کرتے وقت انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ میں یہاں کچھ ایسے چہرے بھی دیکھ رہا ہوں جو قطب کی رسوائی پر مطمئن نظر آتے ہیں لیکن اہل دنیا کا یہ اطمینان بہت عارضی ہے، انہیں کیا معلوم کہ آنے والے لمحے ان کے سکون کو غارت کرکے رکھ دیں گے۔ لوگ اس بات پر خوش ہیں کہ قطب کی بے گناہی ثابت کرنے سے قاصر ہے۔ افسوس! وہ یہ راز نہیں جانتے کہ میرا خدا قطبؒ کو کسی کی گواہی کا محتاج نہیں کرے گا۔" یہ کہہ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس عورت کی طرف دیکھا جو بے کسی کا مجسمہ بنی ہوئی سر دربار کھڑی تھی۔

حضرت سلطان الہندؒ نے مدعی عورت سے فرمایا۔ "خاتون! اس بچے کے چہرے سے چادر ہٹا دو۔ تمہارا بچہ خود اہل دربار کو بتا دے گا کہ اس کا باپ کون ہے؟ تمہیں اب مزید انتظار کی زحمت برداشت نہیں کرنی پڑے گی۔" جیسے ہی حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، پورے دربار پر سکوت مرگ طاری ہوگیا۔ ہر شخص حیرت زدہ تھا اور اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ خود عورت بھی چند لمحوں کیلئے کسی پتھر کی طرح ساکت ہوکر رہ گئی تھی۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ڈرتے ڈرتے کہنے لگی۔ "یہ دو ماہ کا شیر خوار بچہ کس طرح بولے گا؟" کسی نامعلوم خوف کے اثر سے عورت کی آواز کانپ رہی تھی۔

"آج اس کے بولنے کا دن ہے۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے جواباً فرمایا اور پھر قاضی عدالت سے مخاطب ہوکر کہا۔ "آپ کی عدالت میں یہ معصوم گواہ موجود ہے۔ کیا قانون اس کی شہادت قبول کرلے گا؟" حضرت سلطان الہندؒ کا سوال بڑا عجیب تھا۔

"شہادت تو بہت دور کی بات ہے، یہ بچہ بولے گا کس طرح؟" قاضی کی زبان میں لکنت صاف محسوس ہورہی تھی۔

"جس نے بچے کو پیدا کیا ہے وہی اپنے ایک بندے کی خاطر اسے قوت گویائی بھی عطا کرے گا۔" آج اجمیر کا ایک خرقہ پوش اس طرح بول رہا تھا کہ علمائے ظاہری کی عقل ٹھوکریں کھا رہی تھی اور فرط حیرت سے آنکھوں کی پتلیاں کانپ رہی تھیں۔

"مگر یہ سب کچھ خلاف فطرت ہے۔" اب قاضی عدالت کی آواز کی لرزش پہلے سے زیادہ نمایاں ہوگئی تھی۔

"اللہ ہر شے پر قادر ہے۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ "فطرت بھی اس کے حکم کی تابع ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے اپنا حکم نافذ کرتا ہے۔ آپ قدرت کے رازوں کو سمجھنے کی بجائے اس بچے سے اس کے باپ کا نام ونشان دریافت کریں۔"

اب قاضی عدالت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ کرسی انصاف سے نیچے اتر آئے اور اپنی زندگی کے ایک ناقابل بیان مرحلے سے گزرنے کی کوشش کرے۔ ابھی وہ ذہنی کشمکش کا شکار تھا کہ اچانک سلطان شمس الدین التمش بول پڑا۔

"آپ سلطان الہندؒ کی بات پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ انصاف کی تلاش میں منصف کو تو جان لیوا راستوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ پھر یہ تو ایک آسان مرحلہ ہے۔"

والئ ہندوستان کی مداخلت نے قاضی کو کرسی چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ وہ ناگوار انداز میں انصاف کی مسند سے نیچے اترا اور پھر آہستہ آہستہ عورت کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے کہنے پر عورت نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے بچے کا منہ کھولا۔ وہ ایک خوبصورت بچہ تھا جو بہت دیر سے اپنی ماں کی آغوش میں سو رہا تھا اور اسے اس بات کی خبر بھی نہیں تھی کہ اس کی پیدائش کے سبب دہلی میں کتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہوگیا ہے۔ جیسے ہی دربار کی روشنی

بچے کے چہرے پر پڑی اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور رونے لگا۔

"یہ رونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔" قاضی عدالت کا لہجہ تمسخر آمیز تھا۔

"آپ اس سے اس کے باپ کا نام پوچھیں۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے قاضی کے تضحیک آمیز رویئے کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔

قاضی بادل ناخواستہ بچے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے جبراً تیز آواز میں پکار کر کہا۔ "بچے! تو اپنے باپ کا نام جانتا ہے؟"

اہل دربار اپنی اپنی نشستوں پر ساکت ہو گئے تھے اور ان کی سماعتیں بچے کا جواب سننے کی منتظر تھیں...... مگر بچے پر قاضی کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور روتا رہا۔ قاضی نے دوسری بار اور پھر تیسری بار اپنا سوال دہرایا لیکن جواب میں بچے کی ہلکی ہلکی چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ قاضی عدالت جو چند لمحوں کیلئے وحشت زدہ ہو گیا تھا، مطمئن نظر آنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تحقیر آمیز ہنسی تھی اور وہ بار بار حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے سلطان الہندؒ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہہ رہا ہو کہ اتنے کم سن بچے بات نہیں کرتے۔ چاہے کوئی شخص اپنی کرامت کا سہارا لے مگر یہ ممکن نہیں ہے۔ بچہ مسلسل رو رہا تھا۔ اب عورت کی وحشت بھی ختم ہو گئی تھی اور وہ حسب سابق بے باک لہجے میں سلطان شمس الدین التمش سے کہہ رہی تھی۔

"ظل الٰہی! کب تک ایک مجبور عورت کا اس طرح مذاق اڑایا جائے گا؟ میں پہلے ہی بہت تماشا بن چکی ہوں۔ اب اس جان حزیں پر کرم کیجئے اور عدالت کو حکم دیجئے کہ وہ مجھے مزید تماشا نہ بنائے۔" عورت نے ایک بار پھر اپنے دردناک لہجے سے عدالت کو متاثر کرنے کی کوشش کی تھی۔

مگر اس سے پہلے کہ سلطان شمس الدین التمش عورت کی فریاد کا کوئی جواب دیتا، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی پُر جلال آواز اُبھری۔ "بچے! خاموش ہو جاؤ۔"

کچھ دیر پہلے دربار میں جو ہلچل سی پیدا ہوئی تھی، وہ اچانک ختم ہو گئی۔ پھر اہل دربار نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ بچہ جو اپنی ماں کی آواز سن کر بھی خاموش نہیں ہوا تھا، وہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے پکارتے ہی چپ ہو گیا۔

"اے بدنصیب روح! تیرے ماں باپ نے تیری معصوم جان پر بڑا ظلم کیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ آنے والا وقت تجھے کس نام سے یاد کرے گا؟" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے وہ شیر خوار بچہ آپ کی گفتگو کا مفہوم سمجھ رہا ہو۔ پھر سلطان الہندؒ نے قاضی عدالت اور فریادی عورت کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ایک بار پھر پریشان نظر آنے لگے۔ اچانک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے دربار کی چھت پر نظر ڈالی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے آپ آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوں مگر درمیان میں سرخ پتھر حائل تھے۔

"خدایا! تو اپنے بندوں کی گناہوں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ یہ اذیت ناک حقیقت دنیا پر ظاہر نہ ہو مگر تو علیم و خبیر ہے کہ کچھ عاقبت نا اندیش لوگوں نے میرے

لئے کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑا۔ خداوند! تیرا یہ عاجز بندہ معین الدین، تجھ سے رحم اور قطبؒ کیلئے عافیت کا طالب ہے۔"

حضرت سلطان الہندؒ نے یہ مختصر سی دعا مانگی اور پھر بچے کے بہت نزدیک آ گئے۔ اہل دربار کی سانسیں رکی ہوئی تھیں۔ جو لوگ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مقام روحانی سے ذرا بھی واقف تھے، ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اب چند لمحوں بعد ہی کوئی عجیب و غریب واقعہ پیش آنے والا ہے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ حضرت سلطان الہندؒ نے اپنا دایاں ہاتھ بچے کے ہونٹوں پر رکھ دیا، پھر نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

"اے جان معصوم! تو بے قصور ہے، ہر شخص کو اپنے گناہوں کا بوجھ خود اُٹھانا پڑے گا۔ میں تجھے تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا مگر تیرے ماں باپ نے ایک ایسے شخص پر تہمت لگائی ہے جو مجھے روئے زمین پر سب سے زیادہ عزیز ہے۔ تجھے کیا پتا کہ میں کتنی راتوں سے بے خواب ہوں۔ میری بے قراریوں کی طرف دیکھ...... اور قاضی عدالت کو...... اہل دربار کو اور ان لوگوں کو جو قطبؒ کی رسوائیوں پر جشن مسرت منا رہے ہیں، اپنے باپ کا نام بتا دے۔"

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی پُر جلال آواز اُبھری اور لوگوں کے دلوں میں اترتی چلی گئی۔ لوگوں کی آنکھیں گردش کرنا بھول گئی تھیں۔ ہونٹ ساکت تھے اور چہروں پر حیرت کے سائے لرز رہے تھے۔

"السلام علیکم سلطان الہندؒ!" دفعتاً دربار میں بچے کی باریک سی آواز سنائی دی۔ لوگ شدید اضطراب میں اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر یہ زندہ حقیقت تھی کہ دو ماہ کا بچہ نہایت صاف لہجے میں بول رہا تھا۔

"بچے تم پر بھی اللہ کی سلامتی ہو۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس جان معصوم کو دعا دیتے ہوئے فرمایا۔ "اہل دربار کو اپنے باپ کا نام بتاؤ۔"

ایک ثانئے کیلئے دربار پر گہرا سکوت چھا گیا مگر دوسرے ہی لمحے بچے کی آواز سنا دے رہی تھی۔ "میرا باپ سلطان شمس الدین التمش کے دربار کا ایک معزز سردار ہے۔" یہ کہہ کر بچے نے اس شخص کا نام بتا دیا اور خاموش ہو گیا۔

اس انکشاف کے بعد دربار شاہی میں ایک زلزلہ سا آ گیا۔ عورت پر اس قدر لرزہ طاری ہوا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ اس سے پہلے کہ وہ چکرا کر فرش پر گرتی، حضرت خواجہؒ کے دست کرم نے اسے سہارا دیا اور وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک دربار میں موجود لوگوں کو وحشت زدہ انداز میں دیکھتی رہی اور پھر بے ہوش ہو گئی۔

پھر لوگوں نے حضرت قطبؒ کی طرف دیکھا جو بہت دیر سے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ جب قدرت نے آپ کی بے گناہی کیلئے غیب سے ایک عجیب و غریب ثبوت فراہم کر دیا تو بے اختیار پیر و مرشد کے سینے سے لگ گئے اور اتنا روئے کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ بڑا

رقت آمیز سماں تھا۔ تمام اہل دربار رو رہے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ آبدیدہ ہوگئے۔ پھر سلطان الہندؒ نے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

''فرزند! یہ آزمائشیں تو ہمیشہ سے اہل ایمان کا مقدر رہی ہیں۔ تم خوش نصیب ہو کہ دنیا کی عدالت میں معصوم ٹھہرے مگر یہاں کچھ جاں سوختہ عشق ایسے بھی گزرے ہیں جو دنیا کی تہمتوں کو اپنے کفن میں سجا کر زمانے سے رخصت ہوگئے۔ اب ان کے مقدمات کا فیصلہ میدان حشر میں ہوگا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہارا مجرم اسی دربار میں موجود ہے...... ورنہ تم اس سیاہ کار دنیا سے انصاف مانگتے جاتے۔'' یہ کہہ کر سلطان الہندؒ نے حضرت قطبؒ کو علیحدہ کیا اور پُر جلال لہجے میں دوبارہ فرمایا۔ ''فرزند! انتظار کرو۔ ابھی خدا کچھ اور چہروں کو بھی بے نقاب کرے گا۔''

اب لوگوں کی نظریں اس معزز سردار کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جو قیمتی خلعت پہنے ہوئے دربار کی سب سے اگلی صف میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ احساس جرم کے پسینے میں تر تھا۔ اس سے پہلے کہ سلطان شمس الدین التمش اس سے کوئی جواب طلبی کرتا، وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور عجیب مجذوبانہ انداز میں بڑبڑاتا ہوا، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرف بڑھا۔

''دنیا مجھے وادیٔ اجل میں لے گئی، ہوس نے میری سانسیں غصب کرلیں، پھر میرے نفس نے مجھے ہلاک کردیا۔ آنکھیں بھی ظلمت اسیر، دل میں بھی اندھیرا، اے روشنی! میں تجھے کہاں ڈھونڈوں؟''

لوگ سمجھ رہے تھے کہ سردار ہوش میں نہیں ہے مگر حقیقتاً وہ بہت باہوش تھا۔ لرزتے قدموں سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے نزدیک پہنچا اور پھر آپ کے پائے مبارک پر سر رکھ کر رونے لگا۔

''شاہا! میری روشنی تیرے پیروں سے اُٹھنے والے گردوغبار میں پوشیدہ ہے۔ مجھے کچھ دیر اپنے قدموں میں پڑا رہنے دے کہ شاید اس گداگر کو سورج کی چند کرنیں بھیک میں مل جائیں۔'' سردار کی آواز بہت اثر انگیز تھی۔ مجرم ہونے کے باوجود اس کا طرز گفتار اہل دربار کو متاثر کررہا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سردار کو محبت آمیز نظروں سے دیکھا اور پھر اپنے نحیف ہاتھوں سے سہارا دے کر اسے زمین سے اٹھایا۔

''اہل دل پر قیامت نازل کرنے کے بعد، روشنی کی تلاش میں گھر سے نکلا ہے؟'' حضرت خواجہ کے ارشاد سے قبل ہی سلطان شمس الدین التمش بول پڑا۔ لوگوں نے دیکھا کہ فرمانروائے ہند کا پورا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ ''تجھے معلوم ہے کہ تیری تہمت طرازی سے اہل دِلی کا کیا نقصان ہوا ہے؟ لوگ عظیم الشان مذہبی شخصیات کے بارے میں بھی اعتبار کھونے لگے ہیں۔ اس زیاں کا حساب کون دے گا؟''

''اہل دہلی کبھی خسارے میں نہیں رہے۔'' سردار نے سلطان التمش کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔ ''اے ذات والاحشم! یہ میرا ہی گناہ ہے کہ جس نے لوگوں کو مزید دولت یقین بخشی ہے۔ اگر مجھ سے اس جرم کا ارتکاب نہ ہوتا تو حضرت خواجہؒ کی یہ کرامت بھی ظاہر نہ ہوتی۔ اکثر لوگ معرفت کے سمندر کی کچھ گہرائیوں سے ناواقف ہی رہ جاتے۔'' سلطان التمش کے غضب ناک ہونے کے باوجود سردار کے چہرے پر خوف وہراس کا ہلکا سا نشان بھی نہیں تھا۔

''کیا حضرت خواجہؒ کی تعریف وتوصیف اس لئے ہے کہ تجھے اپنے سر پر موت سایہ فگن نظر آرہی ہے؟'' والی ہندوستان کے لہجے سے بدستور قہر ونفرت کی آگ برس رہی تھی۔'' اس سے پہلے تیری زبان کیوں مفلوج ہوگئی تھی؟ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی تو ان ہی کے خلیفہ اکبر ہیں۔ جب ایک مردِ حق کی برگزیدہ شخصیت تہمتوں کی آندھیوں کی لپیٹ میں تھی، اس وقت تو نے اقرار جرم کیوں نہیں کیا؟'' سلطان التمش کی قہر آلود آواز سے پورا دربار گونج رہا تھا۔

''سلطان ذی جاہ! میں موت سے نہیں ڈرتا۔'' سردار نے انتہائی بے باک لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے درباری علماء نے کہا تھا کہ خانقاہوں میں بیٹھنے والے یہ درویش عملی زندگی سے دور ہوتے ہیں۔ یہ خرقہ پوش پہلے جاہل اور توہم پرست انسانوں کے کمزور دماغوں کو متاثر کرتے ہیں۔ پھر ان ہی بے نظر لوگوں کی عقیدت کے سہارے یہ اپنی مسندوں کو آراستہ کرلیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ضرورت مند دنیا ان کے گرد جمع ہونے لگتی ہے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی ایک ایسے ہی بے عمل درویش ہیں جن کے نظام خانقاہی سے اسلام کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ سلطان معظم صوفیوں کے حلقۂ اثر میں آچکے ہیں اور اب درپردہ ہندوستان پر ان ہی خرقہ پوشوں کی حکومت ہوگی جس کے نتیجے میں حضرت قطبؒ سے نظریاتی اختلافات رکھنے والے اپنے اپنے عہدوں سے محروم کردیئے جائیں گے۔ یہ اہل اقتدار کیلئے ایک بھیانک خبر تھی۔ میں اپنے جہل کے باعث ان باتوں کی حقیقت کو نہ سمجھ سکا۔ دولت واقتدار کے نشے نے مجھے یہ توفیق بھی نہیں بخشی کہ میں خود حضرت قطبؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوکر ان افواہوں کی تصدیق کرتا۔ آخر میرے نفس نے مجھے کھلا فریب دیدیا اور میں ہوس کی آندھیوں میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ پھر حضرت قطبؒ کی بے داغ شخصیت کو آلودہ کرنے کیلئے ایک ناپاک منصوبہ تیار کرلیا گیا۔ اس سازش میں کچھ علمائے وقت اور کچھ ارباب اختیار شامل تھے لیکن میں اس منصوبے میں نمایاں کردار ادا کررہا تھا۔ سلطان ذی حشم کے دربار میں ایک بااثر شخص ہونے کی وجہ سے مجھے پورا یقین تھا کہ میرے خلاف کوئی ایک زبان بھی جنبش نہیں کرسکے گی ...... اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے درویشوں کے عقیدت مندوں سے یہ بھی سنا تھا کہ خانقاہوں میں بیٹھنے والے روشن ضمیر ہوتے ہیں۔ مجھے اس غیر فطری بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ ایک انسان پس دیوار کس طرح دیکھ سکتا ہے؟ جب حضرت قطبؒ پر الزام تراشی کی گئی تھی اور وہ بہت دن تک اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش نہیں کرسکے تو درویشوں کی روشن ضمیری سے میرا اعتبار اُٹھ گیا اور پھر اس منصوبے کے تمام شرکاء یہ سوچ کر مطمئن ہوگئے کہ حضرت قطبؒ کی روحانی عظمتوں کا مینار ہمیشہ کیلئے منہدم ہوچکا ہے۔ مگر حضرت خواجہؒ کی چشم گرہ کشا نے گناہ گار عقل کے تمام طلسمات کو تارتار کردیا۔ اب روشن ضمیری کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے؟''

یہ کہہ کر سردار، حضرت قطبؒ کی طرف مڑا۔

''میں آپ کا مجرم ہوں۔ اسلامی شریعت نے تہمت طرازیوں کیلئے جو سزا مقرر کی ہے مجھے اس

سے زیادہ سخت سزا دی جائے تاکہ میرے بعد آنے والے عبرت حاصل کر سکیں۔" سردار کی آواز میں کسی قسم کی دہشت نمایاں نہیں تھی۔ پھر بھی اس کا لہجہ اثر انگیز تھا۔ "میں اپنے جرم کی سزا بھگتنے سے پہلے شہنشاہ معرفت سے درخواست کروں گا کہ مجھے اپنے دست مبارک کو بوسہ دینے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ میرا جرم تو اتنا سنگین ہے کہ مجھے اس میں رعایت اور معافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب میرے لئے یہ امر باعث تسکین ہوگا کہ ایک مرد خدا کے جسم کو چھولوں اور اگر زندہ رہوں تو تمام عمر اس اعزاز پر فخر کروں۔" یہ کہہ کر سردار نے درخواست گزار نظروں سے حضرت قطبؒ کی طرف دیکھا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ جو کچھ دیر پہلے بہت اداس نظر آرہے تھے، اب آپ کے ہونٹوں پر وہی جاں فزا تبسم لوٹ آیا تھا۔

اہل دربار نے دیکھا کہ اچانک حضرت قطبؒ نے اپنا ہاتھ سردار کی طرف بڑھا دیا اور پھر بڑے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ "درویش کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ احترام کی اس رسم کو فروغ دے۔ یہ ایک گمراہ کر دینے والی رسم ہے جس سے انسانی نفس بڑے فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ فقیر بھی اپنے عقیدت مندوں کیلئے عزت و احترام کے اس مظاہرے کو روا نہیں رکھتا مگر آج تجھے اجازت ہے۔"

جیسے ہی حضرت قطبؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، سردار نے بے قرار ہو کر حضرت قطبؒ کے ہاتھ پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور پھر حاضرین دربار نے اسے ہچکیوں کے ساتھ روتے دیکھا۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک سنگدل انسان تھا مگر آج رویا تو اس طرح کہ اس کی آنکھوں سے اشکوں کی بارش ہو رہی تھی۔ انسانی فطرت کے اس انقلاب پر تمام اہل دربار حیران تھے۔ جب اس کے دل کا غبار دھل گیا تو وہ سیدھا کھڑا ہوا اور پھر فوراً ہی حضرت قطبؒ کے قدموں سے لپٹ گیا۔ حضرت قطبؒ نے سردار کو اُٹھایا اور پھر نہایت پُرسوز لہجے میں فرمانے لگے۔

"لوگ اپنا کام کر چکے، جسے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا اور خدا کو جو کچھ ظاہر کرنا تھا، ظاہر کر چکا۔" یہ کہہ کر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے سلطان شمس الدین التمش کی طرف دیکھا۔ "سلطان! آپ نے اس بوریا نشیں سے حسن ظن رکھا، خدا آپ کو جزائے خیر دے...... اور جن لوگوں نے مجھے بے گناہ سمجھا، انہیں بھی خدا حسن نیت کا صلہ دے۔ میں نے اس عورت کو بھی معاف کیا جو خوف خدا سے بے نیاز ہو کر مجھے بدنام کرتی رہی۔ دربار شاہی کا یہ معزز سردار بھی میری نظر میں بے قصور ہے۔ اگر یہ اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہے تو میں اس کی تالیف قلب کیلئے اسے بھی معاف کرتا ہوں۔ قاضی عدالت کی جانبداری کے باوجود میری طرف سے ان پر بھی کوئی الزام نہیں۔ وہ محترم افراد جو اس درویش کی موجودگی کو اپنے اقتدار کیلئے خطرہ سمجھتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایک خرقہ پوش دنیاداری کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرتا۔ اسے اپنی ہی ذات کے محاسب سے فرصت نہیں ہے، پھر یہ فقیر کسی دوسرے کے حال پر کیا نظر رکھے گا؟ خدا رحیم و کریم ہے، وہ اپنے عاجز بندے قطب الدین کے گناہوں کو بھی معاف کرے اور انہیں بھی اپنی بے مثال رحمت کے صدقے میں بخش دے جو اپنے عہدہ و منصب کو دائمی سمجھ کر روز حساب کو بھول گئے ہیں۔"

تمام دربار پر گہرا سکوت طاری تھا۔ پھر حضرت قطبؒ نے درباری سردار سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "عورت اور بچے کو ان کے جائز حقوق دے دو۔ بس تم سے میری یہی درخواست ہے۔"

حضرت قطبؒ کی شان کریمانہ دیکھ کر سردار پر ایک بار پھر گریہ طاری ہو گیا۔

اس کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت سلطان الہندؒ کے پیچھے پیچھے اس طرح دربار سے تشریف لے گئے کہ شمس الدین التمش کے ساتھ تمام حاضرین احتراماً کھڑے ہوئے تھے۔ جب یہ دونوں مردان حق شاہی محل سے باہر آئے تو دور تک راستے کے دونوں جانب بے شمار انسانوں کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم میں حضرت سلطان الہندؒ اور حضرت قطبؒ کے عقیدت مند بھی تھے اور وہ تماشائی بھی جو ایک مرد بزرگ کی رسوائیوں کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے...... مگر بدخواہوں کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ خدا نے حضرت قطبؒ کی پارسائی کو اہل دنیا پر اس طرح ظاہر کیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ تو اس مجرم سردار کو معاف کر کے چلے گئے تھے لیکن بعض بااثر درباریوں نے اسے سنگین سزا دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ خود سردار بھی اپنے جرم کے احساس سے بار بار چیختا تھا۔

"مجھے عبرت ناک سزا دو تاکہ آئندہ کوئی بدکار شخص کسی پارسا کی طرف اُنگلی نہ اُٹھا سکے۔ میرے ہاتھ کاٹ دو، زبان قطع کر دو اور منہ کالا کر کے اطراف دہلی میں پھراؤ، کوچہ کوچہ اعلان کراؤ کہ یہ حضرت قطبؒ کا مجرم ہے اور اس کی یہی سزا ہونی چاہئے تھی۔" احساس جرم کی شدت نے سردار کو بہت زیادہ جذباتی بنا دیا تھا۔

سلطان شمس الدین التمش پر لوگوں کا دباؤ بڑھتا رہا لیکن فرمانروائے ہندوستان نے یہ کہہ کر سزا دینے سے انکار کر دیا کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اپنے مجرم کو معاف کر چکے ہیں۔

پھر ایک دن حضرت قطبؒ کی خانقاہ کے باہر جمع ہونے والے بہت سے لوگوں نے ایک عورت و مرد کو دیکھا۔ عورت برقعے میں روپوش تھی اور مرد اپنی ظاہری حالت سے انتہائی شکستہ حال نظر آرہا تھا۔ اس کی داڑھی وحشیوں کی مانند بڑھی ہوئی تھی اور سر کے منتشر بال اس کی ذہنی پراگندگی کو ظاہر کر رہے تھے۔ عام لوگ اسے کوئی دیوانہ سمجھ رہے تھے مگر واقف حال لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ سلطان شمس الدین التمش کے دربار کا وہی معزز سردار تھا جس نے حضرت قطبؒ کے خلاف سازش کا ایک ناپاک منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس وقت سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ خانقاہ کے اندر موجود تھے۔ دروازے پر خادموں کا پہرہ تھا جو اجازت کے بغیر کسی کو اندر جانے نہیں دیتے تھے۔ وہ اجنبی شخص عورت کا ہاتھ پکڑے ہوئے دروازے تک آیا اور اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ لوگوں نے اسے سمجھایا کہ حضرت سلطان الہندؒ کے دربار عالیہ میں جانے کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔

"لوگو! میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہوں۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔" سردار کا لہجہ بڑا دردناک تھا۔

مگر خانقاہ کے خادم آداب کے پابند تھے۔ اس لئے ایک شخص نے آگے بڑھ کر ناگوار لہجے میں

کہا۔ "یہ کوئی بازار ہے کہ جب جس کا جی چاہے، منہ اٹھائے ہوئے چلا آئے۔ ابھی کچھ معززین موجود ہیں۔ وہ رخصت ہو جائیں تو حضرت قطبؒ کے ایماء پر تجھے بھی اجازت مل جائے گی۔"

"جب تک تو میری روح بھی خاکستر ہو جائے گی۔ شاہ کو خبر کرو کہ ایک سوختہ جاں غلام آیا ہے" سردار ہذیانی انداز میں بول رہا تھا۔ خادم اسے خاموش کرنے کی کوشش کر رہے تھے..... مگر وہ ہر بات سے بے نیاز تھا۔ یہاں تک کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اس کی آواز سن لی اور پھر اسے فوراً ہی اندر طلب کر لیا گیا۔

وہ برقع پوش خاتون کے ساتھ خانقاہ کے اندر داخل ہوا۔ جہاں حضرت قطب الدین سلطان الہندؒ اور دوسرے بزرگوں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اندر پہنچتے ہی عورت بے نقاب ہو گئی۔ یہ وہی عورت تھی جس نے اپنے بچے کے حوالے سے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر الزام تراشی کی تھی۔ عورت زار و قطار رو رہی تھی۔ اس نے حضرت قطبؒ اور حضرت سلطان الہندؒ کے قدموں کو چھونا چاہا مگر حضرت قطبؒ نے عورت کو یہ کہہ کر روک دیا۔

"خاتون! اسلام میں ایک نامحرم عورت کو کسی محرم مرد کے جسم کو چھونا قطعاً حرام ہے۔ چاہے وہ کوئی مذہبی بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے تم دونوں کو اسی وقت معاف کر دیا تھا۔ پھر تم لوگوں نے یہاں تک آنے کی زحمت کیوں کی؟"

"شاہ! یہ آپ کے جلال سے ڈرتی تھی مگر میں اسے خدمت عالیہ میں لے کر آیا ہوں۔" سردار نے انتہائی وارفتگی کے عالم میں کہا۔ "یہ آپ کے دست حق پرست پر مسلمان ہونا چاہتی ہے۔"

دراصل واقعہ یہ تھا کہ وہ دہلی کے بدنام طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک خوبصورت ہندو دوشیزہ تھی جسے رقص و موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ ایک بار سلطان شمس الدین التمش کے سردار نے کیف و سرور کے عالم میں اسے دیکھا تو دیوانہ ہو گیا۔ پھر اقتدار کے طاقت کے ذریعے اس نے ہندو دوشیزہ کو داشتہ بنالیا۔ آج وہ گمراہ اور فتنہ گر عورت حضرت قطبؒ کے آستانے پر کسی بھکاری کی مانند پڑی تھی۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے یہ درخواست قبول کر لی اور پھر وہ عورت کفر و گناہ کے دائرے سے نکل کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئی۔ اس کے بعد سردار نے خواہش ظاہر کی۔

"شاہا! اس غلام کو ہمیشہ کیلئے اس در پر پڑا رہنے دیا جائے تا کہ وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکے۔"

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے جواباً فرمایا۔ "خانقاہ کے بجائے شاہی دربار کو تمہاری ضرورت ہے۔ وہاں رہ کر پرہیزگاری کی زندگی بسر کرو۔ لوگوں کو نیکی کی دعوت دو، کمزوروں کا سہارا بنو اور بندگان خدا کے ساتھ انصاف کرو، یہی تمہارے گناہوں کا کفارہ ہے، یہی تمہاری عبادت اور یہی تمہاری ریاضت ہے۔" یہ کہہ کر آپ نے اپنے ایک خادم کو فرمانروائے ہندوستان سلطان التمش کے نام ایک مکتوب تحریر کرنے کا حکم دیا۔

حضرت قطبؒ نے التمش کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "یہ شخص اپنے گناہوں سے تائب ہو چکا ہے اور میں نے اسے معاف کر دیا ہے۔ آپ بھی اپنے دل میں اس سے کسی قسم کی رنجش نہ رکھیں۔ ہو سکے تو حسن سلوک کے ساتھ پیش آئیں۔ خدا معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" یہ ایک اور اعزاز تھا جو حضرت قطبؒ کی طرف سے مجرم سردار کو بخشا گیا تھا۔

آخر کچھ دیر بعد وہ بادل نخواستہ حضرت قطبؒ کی بارگاہ سے اُٹھا۔ عورت اس کے ہمراہ تھی۔ خانقاہ کے خادموں اور دوسرے لوگوں نے سنا۔ عورت بڑے والہانہ انداز میں کہتی جا رہی تھی۔ "میں کیسی خوش نصیب ہوں کہ مجھے حضرت قطبؒ کے ذریعے دولت ایمان عطا ہوئی ہے۔"

پھر دہلی اور اس کے گرد و نواح میں اس واقعے نے اتنی شہرت پائی کہ حلقہ کفار میں لرزہ پڑ گیا۔ جو لوگ صدیوں سے پتھر کے دیوتاؤں سے بدظن تھے، اب انہیں حقیقی زندگی کی روشنی نظر آ گئی تھی، شکوک و شبہات کی بلند ترین عمارتیں مسلسل گر رہی تھیں اور ان کی جگہ یقین کے سادہ مکانوں کی بنیادیں اٹھائی جا رہی تھیں۔ بڑے بڑے کٹر برہمن، بددماغ راجپوت اور چھوٹی چھوٹی ذاتوں کے ہندو قطار در قطار حضرت کی خانقاہ کی طرف آ رہے تھے۔ ہندو مذہب کے پرستاروں کیلئے یہ بڑی عجیب خبر تھی کہ دو ماہ کا بچہ نہ صرف گفتگو کر سکتا ہے بلکہ وہ کئے ہوئے سوالات کا جواب بھی دے سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ایک ایسی ناقابل فراموش کرامت تھی جس نے جادو اور منتروں کے پجاریوں کو اسلام کی حقانیت کے اعتراف پر مجبور کر دیا تھا۔ نتیجتاً ہزاروں ہندو کلمۂ طیبہ پڑھ کر حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ علمائے ظاہری کی ایک بڑی جماعت جو عرصۂ دراز سے حضرت قطبؒ کی مخالفت میں سرگرم عمل تھی، یہ منظر دیکھ کر شرم و ندامت کے پسینے میں ڈوب گئی۔ سازش کے بچھائے ہوئے جال خود ان ہی کو جکڑنے لگے اور حضرت قطبؒ کا مرتبہ کم ہونے کے بجائے ان کے تصور سے بھی زیادہ بلند ہو گیا۔

☆☆..............☆☆..............☆☆

اہل دربار کا خیال تھا کہ اب حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلاف کسی دل میں بغض و کینہ کا غبار باقی نہیں ہو گا..... مگر یہ ایک خوش فہمی تھی۔ کوئی بھی زمانہ حسد کرنے والوں سے خالی نہیں رہا ہے۔ جب اس سازش کا غبار چھٹ گیا تو ایک اور عجیب واقعہ رونما ہوا جس سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دل کو شدید تکلیف پہنچی۔ حضرت خواجہؒ کی دہلی آمد سے پہلے شیخ الاسلام جمال الدین بسطامیؒ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہندوستان کی اسلامی حکومت میں یہ سب سے بڑا عہدہ تھا۔ حضرت جمال بسطامیؒ کی وفات کے بعد سلطان شمس الدین التمش حضرت قطبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے درخواست کی کہ آپ شیخ الاسلام کے منصب کو قبول فرمالیں مگر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

"درویش، دنیا کے ہنگاموں سے یکسر دور رہنا چاہتا ہے۔ یہ ایک بڑی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کی فقیر صلاحیت نہیں رکھتا۔ بہتر ہے کہ اس اہم ترین منصب پر کسی لائق شخص کا تقرر کیا جائے۔"

سلطان شمس الدین التمش اچھی طرح جانتا تھا کہ حضرت قطبؒ جان بوجھ کر اپنا دامن بچا رہے ورنہ شیخ الاسلام کے عہدے کیلئے آپ سے بہتر کوئی شخص کم سے کم دہلی میں موجود نہیں تھا۔ صریح انکار کے بعد بھی شمس الدین التمش مسلسل کئی دن تک درخواست کرتا رہا مگر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ آخر شیخ نجم الدین صغریٰ کو اس عہدے پر مامور کر دیا گیا۔

شیخ نجم الدین صغریٰ حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کے خلیفہ تھے۔ اس اعتبار سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور شیخ نجم الدین صغریٰ میں ایک خاص روحانی رشتہ تھا۔ شیخ کا شمار اپنے وقت کے مشہور بزرگوں میں ہوتا تھا۔ ان کے اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد وہ اذیت ناک واقعہ پیش آیا جب حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر سنگین الزام عائد کیا جا رہا تھا۔ اس وقت کچھ لوگوں نے شیخ نجم الدین صغریٰؒ کے پاس جا کر کہا تھا...... ”آپ کا حضرت قطبؒ سے ایک خاص تعلق ہے۔ پھر آپ اس مردِ حق کے مقدمے میں گواہی کیوں نہیں دیتے؟“

لوگوں کے اس سوال پر شیخ نجم الدین صغریٰ نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”قطب سے میرا یہی تعلق تو مجھے گواہی دینے سے باز رکھے ہوئے ہے۔ اگر میں عدالت میں کچھ کہوں گا تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ آپس کے رشتوں کو نبھایا جا رہا ہے۔ اس طرح مجھ پر جانبداری کا الزام آ جائے گا۔“ شیخ نجم الدین صغریٰؒ کا جواب سن کر لوگ حیران رہ گئے تھے۔ انہیں صاف اندازہ ہو گیا تھا کہ شیخ مصلحت، سیاست سے کام لے رہے ہیں۔ آخر وہ ساعت گراں گزر گئی اور حضرت قطبؒ کے عظمت و تقدس میں مزید اضافہ ہو گیا۔

جب حالات پُرسکون ہو گئے تو تمام معززین شہر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے شرف نیاز حاصل کرنے کیلئے حضرت قطبؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ آنے والوں کو اپنی دعاؤں سے سرفراز کرتے اور انہیں مختصراً عبادات الٰہی کے رموز و نکات بھی سمجھاتے۔ اس دوران حضرت قطبؒ کے خدمت گاروں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ سلطان الہندؒ کی نگاہیں انسانی ہجوم میں کسی کو مسلسل تلاش کرتی رہتی ہیں۔ جب یہ عمل کئی دن تک جاری رہا تو ایک روز خادموں نے حضرت خواجہ کی اس کیفیت کو حضرت قطبؒ کے روبرو بیان کر دیا۔ حضرت قطبؒ نے بھی خاموشی کے ساتھ اپنے پیر و مرشد کی اس کیفیت کا بغور جائزہ لیا اور پھر اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ واقعتاً سلطان الہندؒ کو کسی ایسے شخص کی تلاش ہے جو اس محفل میں موجود نہیں ہے۔

جب رات کو تنہائی میسر آئی تو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے سلطان الہندؒ کی بارگاہ میں دست بستہ عرض کیا۔ ”غلام کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پیر و مرشد کسی خاص شخص کے منتظر ہیں۔“

”ہاں قطب! تمہارا اندازہ درست ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے کسی قدر افسردہ لہجے میں فرمایا۔ ”جب اپنے کسی محبوب عزیز سے ملاقات نہ ہو تو انسان اداس ہو ہی جاتا ہے۔ تم نے دیکھا کہ ساری دنیا آ گئی مگر شیخ نجم الدین صغریٰ اب تک ملاقات کیلئے نہیں آئے۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ جب بھی درویش دہلی آیا، شیخ بھی ملنے ضرور آئے۔ اب انہیں کیا ہو گیا ہے؟“

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پیر و مرشد کی بات سن کر بظاہر خاموش ہو گئے لیکن آپ نے فوراً ہی ایک خادم کے ذریعے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰؒ کو یہ پیغام پہنچا دیا کہ سلطان الہندؒ ان سے ملاقات کے خواہشمند ہیں۔

جواب میں شیخ الاسلام نے کہا کہ وہ امور سلطنت اور اپنی ذمہ داریوں کے باعث عدیم الفرصت ہیں۔ اگر وقت ملا تو حاضر ہو جائیں گے۔

شیخ نجم الدین صغریٰ کا جواب سن کر حضرت قطبؒ کو سخت اذیت محسوس ہوئی۔ آپ شیخ الاسلام کے جواب کا مفہوم اچھی طرح سمجھتے تھے۔ نجم الدین صغریٰ اپنی مصروفیت کا بہانہ کر کے سلطان الہندؒ کی بارگاہ میں آنے سے گریز کر رہے تھے۔ یہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور دوسرے بزرگوں کیلئے ایک تکلیف دہ سلوک تھا۔ حضرت قطبؒ تو پیر و مرشد کے ادب کے باعث خاموش رہے لیکن دیگر حضرات نے شیخ نجم الدین صغریٰ کے اس طرز عمل پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا۔

”شیخ الاسلام ہونے کے بعد وہ بہت مغرور ہو گئے ہیں۔ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے شیخ نجم الدین صغریٰ کے رویے پر تنقید کرنے والے حضرات کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”وہ میرے پیر و مرشد کی نشانی ہیں۔ ان کا میرے ساتھ کچھ بھی سلوک ہو مگر میں انہیں فراموش نہیں کر سکتا“ حضرت سلطان الہندؒ نے شیخ الاسلام کا دفاع اس طرح کیا کہ اہل مجلس حیرت زدہ رہ گئے۔ ”اگر شیخ نجم الدین یہاں تشریف نہیں لائے تو میں خود ان کے پاس جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے حضرت قطبؒ کو اپنے ساتھ لیا اور شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔

شیخ الاسلام اس اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہونے کے بعد آسودہ حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ جس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ شیخ الاسلام کے یہاں پہنچے تو وہ اپنا نیا مکان تعمیر کرا رہے تھے۔ جیسے ہی ان کی نظر دونوں بزرگوں پر پڑی وہ مزدوروں کے ساتھ مصروف گفتگو ہو گئے۔ حضرت قطبؒ کو اُمید تھی کہ شیخ الاسلام والہانہ انداز میں سلطان الہندؒ کے استقبال کیلئے آگے بڑھیں گے اور اپنے سارے کام ترک کر دیں گے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ حضرت خواجہؒ کو دیکھ کر وہ کچھ اور مصروف نظر آنے لگے تھے۔ سلطان الہندؒ نے نجم الدین صغریٰ کے طرز عمل کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نظر انداز کر دیا اور قریب پہنچ کر اپنے برادر روحانی کو سلام کیا۔

شیخ الاسلام نے رسم زمانہ نبھانے کے لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سلام کا جواب تو دے دیا مگر فوراً ہی مزدوروں کی طرف متوجہ ہو گئے اور انہیں مختلف کاموں کے بارے میں ہدایت دینے لگے۔

حضرت سلطان الہندؒ کچھ دیر تک انتظار کرتے رہے لیکن نجم الدین صغریٰ مسلسل مزدوروں سے بات چیت کرتے رہے تو حضرت خواجہؒ نے بلند آواز میں فرمایا۔ ”نجم الدین! آخر تم پر کیا افتاد نازل ہوئی ہے کہ تم درویشی کی بنیادی رسم بھی بھول گئے ہو۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے لہجے میں

بڑی خلش تھی۔

''میں بالکل نہیں بدلا ہوں۔'' شیخ نجم الدین صغریٰ نے اس طرح جواب دیا کہ ان کی آواز جذبے سے عاری تھی۔ ''میں درویشی کے آداب سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے شیخ الاسلام کے چہرے پر ایک خاص رنگ اُبھر آیا تھا۔ جیسے انہیں اپنی علمیت پر بہت ناز ہو۔

''میرے بھائی درویشی تو بڑی چیز ہے، ایک عام آدمی بھی اپنے گھر آنے والے مہمانوں کو اس طرح نظرانداز نہیں کرتا۔'' اگرچہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ انتہائی برداشت کا مظاہرہ کر رہے تھے لیکن پھر بھی آپ کے لہجے سے ہلکی سی تلخی نمایاں ہو چلی تھی۔ ''کیا تمہیں سرکاری عہدے نے اس قدر مغرور بنا دیا ہے کہ اب تمہاری نظروں میں اخلاقی قدروں کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہی؟ کیا شیخ الاسلام کے لقب کو بقائے دوام حاصل ہے؟ کیا خاندان چشتیہ کی روایتوں کے امین اس قدر ظاہر پرست ہوتے ہیں؟ کیا پیر و مرشد کی نصیحت یہی تھی کہ درویش اپنی عزت و جاہ کی مسند آراستہ کر کے مخلوق خدا کو فراموش کر دے؟'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی گرم گفتاری کا یہ عالم تھا کہ شیخ نجم الدین صغریٰ کے غرور کا پیرہن جل کر خاک ہو گیا۔

اب شیخ الاسلام کے چہرے پر ندامت کے آثار نمایاں تھے اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سامنے ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ''میں کل بھی آپ سے مخلص تھا اور آج بھی میرے دل میں وہی جذبات موجود ہیں مگر اس شخص نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔'' شیخ نجم الدین صغریٰ نے حضرت قطبؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے اس مرید خاص کی وجہ سے میری طرف کوئی توجہ ہی نہیں ہوتا۔ ساری دنیا اس کی خانقاہ کی طرف کھنچتی چلی جاتی ہے جیسے اس شہر میں میرا کوئی مقام ہی نہیں۔'' آخر شیخ الاسلام کے دل کی بات ان کی زبان پر آ گئی تھی۔

چند لمحوں کیلئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ یہ سوچ کر حیران رہ گئے کہ اتنا بڑا بزرگ بھی حضرت قطبؒ سے حسد رکھتا ہے مگر کچھ دیر بعد ہی آپ کے ہونٹوں پر تبسم اُبھر آیا۔

''نجم الدین! اب تمہاری بے اعتنائی اور ناراضگی کی وجہ سمجھ میں آئی۔'' حضرت سلطان الہندؒ نے شان بے نیازی سے فرمایا۔ ''یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں کہی۔ اگر تم مجھے آگاہ کر دیتے تو تمہیں اس دن یہ اذیت برداشت نہ کرنی پڑتی۔ بہرحال مطمئن رہو جس شہر کے اہل علم اتنے تنگ نظر ہوں وہاں قطبؒ کو قیام نہیں کرنا چاہئے۔'' یہ کہہ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ واپس جانے لگے۔ شیخ نجم الدین صغریٰ نے کچھ دیر بیٹھنے اور کھانا کھانے کی درخواست کی مگر سلطان الہندؒ نے صاف انکار کر دیا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

چند روز بعد اہل شہر ایک انتہائی کربناک صورتحال سے دوچار ہو گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر واپس جا رہے تھے لیکن اس بار خلاف توقع حضرت قطب الدین کاکیؒ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ جیسے جیسے یہ خبر عام ہوتی گئی، لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر دیوانہ وار شاہراہ پر نکل آئے۔ سلطان شمس الدین التمش کو اطلاع ملی تو وہ بھی گھبرا کر چلا آیا اس نے سلطان الہندؒ سے عاجزانہ درخواست کی کہ حضرت قطبؒ کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں مگر حضرت خواجہ غریب نوازؒ یہی فرماتے رہے کہ جہاں علم و تقویٰ بغض و حسد کا شکار ہو جائے وہاں قطبؒ نہیں ٹھہر سکتا۔ فرمانروائے ہندوستان احتراماً خاموش ہو گیا مگر حضرت خواجہؒ کے ہمراہ پیادہ پا چلتا رہا۔

جب سلطان الہندؒ حضرت قطبؒ کو لے کر شہر کی حدود سے باہر نکلے تو انسانی ہجوم نے گریہ وزاری شروع کر دی۔ سیرالعارفین کے مصنف حامد بن فضل اللہ جمالی نے اس جانگداز منظر کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت قطبؒ کے قدم جہاں پڑتے تھے، لوگ وہاں کی خاک اُٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگا لیتے تھے یا چہرے پر مل لیتے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کچھ دیر تک لوگوں کی اس جذباتی کیفیت کا مشاہدہ کرتے رہے۔ پھر انسانی جوش عقیدت پر آپ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ یکایک سلطان الہندؒ ٹھہر گئے اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے فرمانے لگے۔

''فرزند! تم دہلی میں قیام کرو، مجھے اندیشہ ہے کہ تمہاری جدائی میں کہیں اہل شہر برباد نہ ہو جائیں۔''

جیسے ہی حضرت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، انسانی ہجوم میں بے پایاں مسرت کی لہر دوڑ گئی...... مگر اہل شہر کی یہ خوشی بہت عارضی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اُنہیں ایک ایسے صدمۂ عظیم سے دوچار ہونا پڑا کہ جس کا ازالہ رہتی دنیا تک ممکن نہیں تھا۔ حضرت سلطان الہندؒ مختصر قیام کے بعد دہلی سے اجمیر تشریف لے جا رہے تھے۔ فضا سوگوار تھی اور فرط غم سے لوگوں کے دل ڈوبے جا رہے تھے۔ انسانی ہجوم بہت دُور تک حضرت غریب نوازؒ کو رخصت کرنے آیا لیکن منزل فراق آخر منزلِ فراق ہے۔

سلطان الہندؒ نے حضرت قطبؒ کو گلے لگایا اور پھر گلوگیر آواز میں فرمایا۔ ''فرزند! الوداع! اب اگر خدا کو منظور ہوگا تو میدان حشر میں ملاقات ہوگی۔'' یہ ایک واضح اشارہ تھا جس کے مفہوم پر اہلِ دل نے غور کیا تو ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

راہوں سے غبار اُٹھنے لگا پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور مشاقان دید کے درمیان فاصلے حائل ہو گئے۔ اہل درد بے قرار تھے۔ شام فراق نے دل کی دنیا کا اس طرح حصار کر لیا تھا کہ ہجوم عاشق کو وسیع و عریض کائنات میں کوئی دلکشی محسوس نہیں ہو رہی تھی جذبے سرنگوں، تمنائیں بے جان اور سانسیں منتشر تھیں۔ آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں تھے اور چہروں پر ناکام حسرتوں کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ہونٹ پیہم مصروف فغاں تھے اور سرزمین دہلی کا ایک ایک ذرہ فریاد کر رہا تھا۔ اگرچہ جانے والے نے دم رخصت سختی سے تنبیہہ کی تھی کہ اس کی یاد میں اشک ریزی نہ کی جائے لیکن ہوش کسے تھا؟ جن کی متاع حیات لٹ گئی ہو ان کے جذبات دائرۂ اختیار میں کس طرح رہتے؟ صبر و ضبط برقرار رکھنے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ لوگ جانے والے کو دیوانہ وار پکار رہے تھے۔

''اے روشنی! ہم سیاہ بختوں کے شہر میں کچھ دیر اور قیام کر ہمیں اپنی تاریک بستیوں کو سجانے دے اور دل و دماغ کے بے نور گوشوں کو اپنی معرفت کی ضیاباریوں سے منور کرنے دے۔'' مگر جانے والا

بہت دور جا چکا تھا۔ اس نے جانے سے پہلے اہل ایمان کو واضح طور پر سمجھا دیا تھا۔

''خبردار! دنیا کی کسی روشنی کے فریب میں نہ آ جانا تمہارے لئے وہی ایک روشنی کافی خضرا سے نکل کر زمین و آسمان کے بعید ترین گوشوں کو روشن کر رہی ہے ہمیشہ اسی روشنی پر نظر رکھو تمہارے دل تاریک ہوں گے نہ مکان۔''

لوگوں کی سماعتوں میں ابھی تک وہ صدائے دلنواز گونج رہی تھی لیکن ان کی آنکھیں اس تھیں کہ وہ گنبد خضرا سے طلوع ہونے والی روشنی کو دیکھ سکتے ان کی نظریں تو اجمیر کی روشنی اور اسی روشنی کو وہ کسی حد تک برداشت کرسکتے تھے۔ آخر جب آفتاب چشتیہ کی یہی روشنی شوق کی آنکھوں سے اوجھل ہوئی تو وہ جوش جذبات میں چیخنے لگے ہر مضطرب اور پیاسی نگاہ دامن کش ہوئی مگر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو جانا تھا، اس لئے آپ تشریف لے گئے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت سلطان الہندؒ کے جانے کے بعد بہت دن تک دہلی کے در و بام آپ کی اس کرامت ذکر سے گونجتے رہے جس نے حضرت قطبؒ کو عجیب و غریب انداز سے بے گناہ ثابت کیا تھا سے متاثر ہو کر ہندوؤں نے اپنے ماتھوں پر سجے ہوئے صدیوں پرانے قشقے کھرچ دیئے زُنار کو توڑ کر اس طرح پھینک دیا تھا کہ اب اس کافرانہ رسم کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی تھی۔ ہزاروں اہل ہنود حلقۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ بت پرستوں کے بڑے پجاری اور پروہت وحشت زدہ تھے۔ انہیں اپنے صنم خانوں کی بلند دیواریں زمین بوس نظر آ رہی تھیں۔ سیکڑوں سال سے فرضی خداؤں کا سہارا لے کر ان گنت بندگان خدا پر اس طرح حکومت کی جا رہی تھی کہ ان کے دل، دماغ اور روحیں اور جسم برہمنوں کے پاس رہن رکھے ہوئے آج اسی حکومت کی بنیادیں لرز رہی تھیں اور نیم برہنہ پجاری اپنے بدن پر باطل عقائد کی راکھ ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے۔

''لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کہاں جا رہے ہو؟ دیوی کے پرستارو! دیوتاؤں کے پجاریو! ایک مسلمان جادوگر نے گمراہ کر دیا ہے۔ ٹھہرو! تمہاری منزل تمہیں پکار رہی ہے۔ آکاش کی طرف دیکھو! تم پر قہر نازل ہونے والا ہے برہما تم سے روٹھ گئے ہیں، وشنو اور شنکر خفا ہیں کرشن اور رام نے سے منہ موڑ لیا ہے۔ اب تمہارا زمین پر کوئی سہارا باقی نہیں لوٹ آؤ کہ ابھی وقت ہے۔ ہم تمہاری معافی کیلئے دیوتاؤں سے سفارش کریں گے۔'' پروہت مسلسل چیخ رہے تھے۔ پجاری اور جوگی مسلمان ہو جانے والے ہندوؤں کو پیہم عذاب کی خبریں دے رہے تھے مگر جو ایک بار دیوتاؤں کے حلقے سے نکل گیا پلٹ کر نہیں آیا۔ دوسرے ہندو بھی اپنے سابقہ ہم مذہبوں کی تقلید میں حضرت قطبؒ کی خانقاہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔

اہل ہنود کی صفوں میں عجیب و غریب افراتفری کا عالم تھا۔ عیار برہمنوں نے اسلامی نظریات کو ثابت کرنے کیلئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو جادوگر کہہ کر پکارا تھا۔ بت پرستوں کا خیال

کہ اس الزام تراشی سے جاہل مخلوق اپنے مرکز کی طرف پلٹ آئے گی لیکن جانے والوں نے اپنے روحانی پیشواؤں کی ایک بھی نہیں سنی۔ ہندو معبدوں میں ناقوس زیادہ زور و شور سے بجتے رہے مگر اب لوگ مؤذن کی صداؤں کے منتظر تھے پھر بھی کچھ جذباتی پجاریوں نے جانے والوں کا راستہ روک کر کہا۔

''مسلمان جادوگروں نے تمہارے ہوش و حواس چھین لئے ہیں۔''

جواب میں کہنے والوں نے کہا۔ ''تم بھی جادوگری کی کوئی ایسی مثال پیش کر کے ہمارے ہوش و حواس چھین لو۔'' بڑا جارحانہ جواب تھا۔ برہمن پجاری اپنے ہم قوموں کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اس عظیم الشان کرامت کو جادوگری کا نام دینے والے عاجز و قاصر تھے۔ ہندوؤں کے یہاں جادو، ٹونے اور منتر کی رسم عام تھی مگر وہ حضرت سلطان الہندؒ کے اس مفروضہ جادو کا جواب نہ دے سکے اور شدید بے چارگی کے عالم میں ہندو مذہب کا شیرازہ منتشر ہوتے ہوئے دیکھتے رہے۔

دہلی کے رہنے والے عام مسلمانوں کا خیال تھا کہ اس روشن دلیل کے بعد حضرت قطبؒ کے مخالفین اپنے دلوں کی کثافت دُور کر کے ایک مرد حق کی عظمتوں کو تسلیم کر لیں گے مگر یہ محض خوش گمانی تھی کچھ لوگ یقیناً شرارتوں سے باز آ گئے تھے لیکن اب بھی چند افراد اپنے فطری حسد کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ دراصل یہ علماء کی وہ مخصوص جماعت تھی جو خوشامد کے راستے سے اقتدار کی منزل تک پہنچ گئی تھی۔ پھر ان لوگوں نے برہمن پجاریوں اور عیسائی پادریوں کی طرح اپنی اپنی مسندیں آراستہ کرالی تھیں اور اب چاہتے تھے کہ خلق خدا مذہبی معاملات میں ان کی محتاج رہے۔

جس روز حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر روانہ ہوئے اسی دن مخالفین کے حلقوں میں نئے انداز کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں بعض تنگ دل علماء تو جوش اختلاف میں حد سے گزر گئے تھے۔ حضرت خواجہؒ کی روحانی قوتوں کے مظاہرے پر کہنے والوں نے یہاں تک کہا۔

''(معاذ اللہ) یہ شعبدہ بازی ہے۔ پہلے لوگوں کے ہوش و حواس سلب کر لئے اور پھر حاضرین دربار سمجھنے لگے کہ دو ماہ کا بچہ گفتگو کر رہا ہے۔ یہ خلاف عقل بات کس طرح ممکن ہے۔ اسلام میں ایسے روحانی کمالات کی کوئی حیثیت نہیں، یہ مظاہرے تو ہندو جوگی بھی کر سکتے ہیں پھر مسلمانوں کے دین اور کافروں کے مذہب میں کیا فرق باقی رہ گیا؟''

یہ عجیب اذیت ناک صورتحال تھی کہ حضرت قطبؒ کے مخالف علماء کرامت کی حیثیت کو تسلیم کرتے تھے مگر جب یہی کرامت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ظاہر ہوئی تو تنگ نظر عالموں نے اسے شعبدہ بازی کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کچھ دنوں تک مخالف علماء کی ان فتنہ پردازیوں کو برداشت کرتے رہے پھر ایک دن آپ نے اپنے حلقۂ درس میں موجود ہزاروں انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"لوگو! تم نے مجھ پر الزام تراشیاں کیں۔ میں خاموش رہا۔ پھر تمہاری زبانیں بے لگام ہو گئیں، خوف خدا سے بے نیاز ہو کر مجھے ذلیل و رسوا کرنے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرتے ہو گئے۔ میں نے تمہیں شدید عالم کرب میں پکارا۔ اپنے روز و شب کے حوالے دیئے۔ تمہارے گزارے ہوئے لمحوں کی گواہی پیش کی مگر تم نے میری ایک نہیں سنی۔ آخر جب اللہ نے مجھے ... ثابت کر دیا تو تم دوسرے انداز سے میری دل آزاری پر کمربستہ ہو گئے۔ پہلے مجھے مجرم قرار د... تھا اور اب کہا جا رہا ہے کہ شیر خوار بچے کی گفتگو حضرت سلطان الہندؒ کی شعبدہ بازی کا نتیجہ ... میرے پیر و مرشد کی عظیم الشان کرامت کو ہندو جوگیوں کی غیر اسلامی حرکتوں کے مماثل قرار د... اے بے خبر انسانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تمہاری محدود عقل اللہ کی بے پناہ قوتوں کو ایک دائرے ... محصور کرنا چاہتی ہے، اللہ تو وہ ہے کہ جس کا ایک اشارہ پتھروں کو بھی گویائی کی صلاحیتیں دے ... ہے۔ پھر وہ تو گوشت پوست کا حرکت کرنے والا ایک آدم زاد تھا۔ اس نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سامنے گفتگو کی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ یہ سلطان الہندؒ کا کمال نہیں، قادر مطلق خلاق کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے سرخرو کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہمیشہ کیلئے ذلت ... تاریک غاروں میں دھکیل دیتا ہے۔ اللہ کو سلطان الہندؒ کی عزت و تکریم منظور تھی، اس لئے ... ظاہری سبب بنا دیا گیا۔ بے شک! وہ سرزمین ہند پر اللہ کے محبوب ترین بندے ہیں۔ اللہ ان ... دعاؤں کو ہم سب سے زیادہ سنتا ہے وہ اس بت خانے میں پرچم حق لے کر داخل ہوئے ہیں۔ انہیں اللہ نے ایسے روحانی کمالات سے سرفراز فرمایا ہے کہ جن کا ادراک ہمارے ہوش و خرد سے باہر ہے ... ایک بچے کو موضوع بنا کر سلطان الہندؒ کی عظمتوں سے انکار کر رہے ہو اور ان کی عارفانہ بلندیوں کو ... کے پجاریوں کی شعبدہ کے ہم منصب قرار دے رہے ہو؟ یہ کیسا ظلم ہے اور کیسی تہمت ہے۔ ... اجمیر کے کھنڈرات نہیں دیکھے؟ وہ سونے اور چاندی کے دیوتا، وہ آگ کے پرستار جادوگر، وہ سانپ ... کا زہر پینے والے پجاری، وہ بدن پر راکھ مل کر جنگلوں کی خاک چھاننے والے سادھو کہاں گئے ... اُنہیں تلاش کیوں نہیں کرتے؟ ان کی بوسیدہ ہڈیوں سے پوچھو کہ تمہارا یہ حشر کیوں کر ہوا؟ اللہ ... سب طاغوتی قوتوں کو حضرت سلطان الہندؒ کی دعاؤں سے ہلاک و برباد کیا ہے۔ قادر مطلق کی ... روحانیت کے بڑے مظاہرے ہیں، بڑی کرامات ہیں۔ تم ایک ایسے شخص کے احسانات سے منکر ہو ... تمہارے تاریک مکانوں کو جگمگانے کیلئے دیار مدینہ سے روشنی مانگ کر لایا۔ افسوس! تم نے مجھے ... مایوس کیا ہے، بڑا آزار پہنچایا ہے۔ کاش! سلطان الہندؒ مجھے اپنے ہمراہ لے جاتے اور میں ایسی ... ناک باتیں سننے کیلئے یہاں موجود نہ رہتا۔" یہ کہتے کہتے حضرت قطبؒ آبدیدہ ہو گئے۔

مجلس پر ایک المناک سناٹا طاری تھا۔ حضرت قطبؒ کے عقیدت مندوں میں شدید اضطراب ... پھیل گیا۔ پھر دہلی کا ایک وارفتۂ شوق لوگوں کے درمیان سے اٹھا اور حضرت قطبؒ سے مخاطب ... عرض کرنے لگا۔ "شیخ محترم! یہ چند ہوس پرست ہیں جو بندگان خدا کو گمراہ کرنے کیلئے چیخ رہے ... مگر ان کا شور آسمانی فیصلوں کو نہیں بدل سکتا۔ آسمان نے تو آپ کو اور سلطان الہندؒ کو محترم ...

ہے۔ اب اہل دنیا کو کتنا بھی ناگوار گزرے۔ کیا آپ ان نفس کے غلاموں کیلئے اپنے بے شمار جاں نثاروں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے؟ بے شک! ہم سلطان الہندؒ اور آپ کے مقام معرفت سے واقف نہیں لیکن خدمت گار تو ہیں۔ عشق کی بنیادی رسم سے تو آشنا ہیں۔ حکم دیں تو اپنی جانیں نذر کر دیں۔ الزام تراشنے والی زبانیں کاٹ کر خدمت عالیہ میں حاضر کر دیں۔ اگر عاجز رہیں تو اپنی جانیں گنوا دیں۔ بس یہی ہے آپ کے غلاموں کی متاع۔ جب بھی حضرت کا اشارہ ہوگا سرمایۂ حیات لٹا دیں گے لیکن یہ گوارہ نہیں کریں گے کہ آپ چند زمانہ سازوں کی باتوں سے بددل ہو کر اپنی محبتوں اور نوازشوں کا مرکز بدل دیں۔ ہم صرف آپ کے ہیں، ہمیں ہمارے گھروں میں قیام کرنے کی اجازت دیں یا اپنے ہمراہ کسی صحرا کی جانب لے چلیں ہمارے لئے دونوں صورتیں یکساں ہیں۔" اس جاں سوختہ عشق کی تقریر عجیب تھی۔ ایک ایک لفظ سوز محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اہل مجلس رونے لگے۔ خود حضرت قطبؒ کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔

"میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔" حضرت قطبؒ نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے فرمایا۔ "میں اگر جانا بھی چاہوں تو نہیں جا سکتا پیر و مرشد کا یہی حکم ہے کہ تمہارے درمیان رہوں پھر جب وقت رخصت آئے تو تم مجھے اپنے ہاتھوں سے اسی زمین میں دفن کرو۔ اللہ نے ہر شے کا وقت طے کر دیا ہے۔ کوئی اس کے کھینچے ہوئے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔" حضرت قطبؒ نے اہل دہلی کی تسکین کیلئے چند کلمات ادا کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں اپنی ذات کیلئے کسی سے یہ نہیں کہتا کہ وہ میرے احترام میں گردن جھکائے بیٹھا رہے میں اللہ کا ایک عاجز و گناہ گار بندہ ہوں اور اسی حالت میں اپنے رب کے حضور چلا جانا چاہتا ہوں۔ اس کا شکوہ نہیں کہ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں اس کا غم ہے کہ لوگ حضرت سلطان الہندؒ کے مقام سے واقف نہیں۔ اگر بے خبری کا یہ مظاہرہ اہل ہنود کرتے تو مجھے بھی کوئی شکوہ نہیں ہوتا لیکن یہ سب کچھ ان لوگوں کی طرف سے ہو رہا ہے جو مسند علم پر جلوہ افروز ہیں۔ وہ سلطان الہندؒ کے روحانی درجات سے تو آگاہ نہیں مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس مرد جلیل نے اسلام کی کیا خدمات انجام دی ہیں؟" یہ کہہ کر حضرت قطب بختیار کاکیؒ کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئے پھر آپ نے انتہائی جذب کے عالم میں فرمایا۔ "خدا نے سلطان الہندؒ کو تمہاری شہادتوں کا محتاج نہیں کیا ہے۔ خواجۂ خواجگاں تو وہ ہیں کہ جن کے کار عظیم پر آنے والی صدیاں گواہی دیں گی اور اپنی پشت پر کتابوں کا بوجھ لادے ہوئے علم کے یہ تاجر اس طرح بے نشان ہو جائیں گے کہ ان کا کوئی حوالہ باقی نہیں رہے گا لوگ حضرت خواجہؒ کی ایک کرامت پر سر بگریباں ہیں یا دیوانوں کی طرح چیخ رہے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ حضرت سلطان الہندؒ کی پوری زندگی ہی کرامت ہے۔"

☆☆..................☆☆..................☆☆

پھر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زندگی میں پیش آنے والے ایک ایسے واقعے کا ذکر کیا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس قدر عجیب ہے کہ عہد جدید کا کوئی مادہ پرست اس پر مشکل ہی سے یقین کرے گا۔ "سیر الاقطاب" کے مصنف نے حضرت خواجہؒ کی اس

کرامت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے مگر یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا زمانہ تھا اور یہ واقعہ کس مقام پر پیش آیا تھا؟ اس واقعہ سے جو کردار وابستہ ہیں ان کے ناموں کا بھی سراغ نہیں ملتا ان تمام کوتاہیوں کے باوجود تذکرۂ خواجگان چشت کے سلسلے میں "سیر الاقطاب" ایک معتبر اور مستند کتاب ہے۔ اس کتاب کے مصنف حضرت شیخ الہندؒ خود بھی بہت بڑے بزرگ اور نامور صوفی تھے اس لئے کوئی بھی باہوش انسان شیخ الہندؒ کی بیان کردہ روایات پر شک نہیں کرسکتا۔ سیر الاقطاب آج سے تقریباً چار سو سال پہلے تصنیف کی گئی تھی۔ سیر الاولیاء کے بعد صوفیائے چشت کی سیرت پر یہ دوسری مستند کتاب ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے سن اور مقام کے حوالے تو پیش نہیں کئے ہیں تاہم قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت رونما ہوا ہوگا جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سبزوار میں قیام فرما تھے۔ اس قیاس کی بنیاد حاکم سبزوار یادگار محمد کا وہ ظلم وتشدد ہے جو اپنی انتہا کو پہنچ کر تاریخی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ یادگار محمد کی یہ عام عادت تھی کہ وہ معمولی سی بات پر بے گناہ لوگوں کو قتل کرا دیا کرتا تھا۔ غالباً یہ اسی سفاک حاکم کے دور حکومت کا واقعہ ہے۔

ایک دن ایک پریشان حال بوڑھی عورت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خانقاہ میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ظاہری حالت سے وہ بہت زیادہ شکستہ نظر آرہی تھی۔ اس وقت حضرت خواجہؒ ظہر کی نماز کیلئے وضو فرما رہے تھے جیسے ہی عورت نے خانقاہ کے دروازے میں قدم رکھا ایک خادم نے آگے بڑھ کر اسے روکتے ہوئے پوچھا۔ "خاتون! تم کون ہو اور کس سے ملنا چاہتی ہو؟"

"میں صرف ایک غمزدہ ماں ہوں اور مجھے کچھ یاد نہیں۔" شدت غم سے عورت کی آواز کانپ رہی تھی۔ "وہ کہاں ہے؟" عورت نے حضرت خواجہؒ کے خادم سے ایک اُلجھا ہوا سوال کر ڈالا تھا۔

"کون؟" حضرت خواجہؒ کا خادم ایک اجنبی عورت کے مبہم طرز گفتگو سے اُلجھ کر رہ گیا۔

"وہ فقیر جو لوگوں کی مرادیں پوری کرتا ہے مجھے اس کے پاس لے چلو۔"

"خاتون! یہ ایک مرد خدا کی خانقاہ ہے۔ یہاں ادب واحتیاط کا مظاہرہ کرو۔" حضرت خواجہؒ کے خادم کو اس عورت کا گستاخانہ طرز کلام بہت گراں گزر رہا تھا۔

"مجھے کیا معلوم ادب کسے کہتے ہیں؟" عورت کے چہرے پر پھیلے ہوئے رنج والم کے سائے مزید گہرے ہوگئے تھے اور وحشت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ خادم کو اس کی ذہنی حالت پر پاگل پن کا گمان ہونے لگا تھا۔ "میں اپنے بیٹے کے سوا کسی کو نہیں جانتی۔"

"پھر یہاں کیوں آئی ہو؟" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خادم کو بھی عورت کی بدحواسی پر غصہ آگیا تھا۔

"میں اپنے بیٹے کو لینے آئی ہوں۔" یہ کہتے کہتے عورت کے صبر وضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

"واپس جاؤ! یہاں تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہے۔" خادم نے بوڑھی عورت کو جھڑک دیا۔ اب اس

اجنبی خاتون کی دیوانگی کا یقین ہو چلا تھا۔

"اے شخص! تو کہاں ہے؟" اچانک عورت چیخنے لگی۔ وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا نام نہیں جانتی تھی۔ اس لئے آپ کو عجیب انداز میں پکار رہی تھی۔ "تیرے آدمی کتنے سنگدل ہیں کہ ایک غم رسیدہ ماں کو آگے جانے کا راستہ نہیں دیتے۔" عورت دل کے زور سے چیخ رہی تھی۔ اس کی آواز اس قدر پرشور تھی کہ خانقاہ کا گوشہ گوشہ گونجنے لگا تھا۔ حضرت خواجہؒ کے مریدوں اور خدمت گاروں کے علاوہ جتنے بھی حاضرین موجود تھے وہ سب کے سب عورت کی دلخراش چیخیں سن کر چونک پڑے تھے۔ ان میں سے بعض خدام صورتحال کو سمجھنے کیلئے خانقاہ کے دروازے کی طرف جارہے تھے۔ خود حضرت خواجہؒ بھی حیرت زدہ تھے۔

"جا کر دیکھو یہ کیسا شور ہے؟" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس خادم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا جو آپ کو وضو کرا رہا تھا۔ "یہ عورت کون ہے اور اس پر کیا افتاد پڑی ہے؟"

"حضور پہلے وضو فرمالیں۔" خادم نے نہایت ادب سے عرض کیا اس کے نزدیک عورت کی چیخوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور وہ اپنے اس فعل میں حق بجانب بھی تھا کیونکہ ایک خادم کی زندگی کا مقصد ہی مخدوم کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ دنیا کی ہر شے سے بے نیاز ہوکر حضرت خواجہؒ کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن سلطان الہندؒ جس انداز کے مخدوم تھے ان سے یہ بعید تھا کہ عورت چیختی رہتی اور وہ اپنے کام میں مشغول رہتے۔ اپنی اس عادت کریمانہ کے سبب حضرت خواجہؒ نے خادم سے دوبارہ فرمایا۔

"پہلے تم اس عورت کی خبر لو۔" سلطان الہندؒ بے قرار سے نظر آنے لگے تھے۔ "میں خود وضو کرلوں گا۔" یہ کہہ کر حضرت خواجہؒ نے خادم کے ہاتھ سے پانی کا برتن لے لیا۔ خادم تیز تیز قدموں سے خانقاہ کے دروازے کی طرف چلا گیا اور سلطان الہندؒ وضو کرنے لگے۔ عورت کی پُر درد آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔

"انہیں منع کیوں نہیں کرتا یہ مجھے تیرے پاس آنے سے روک رہے ہیں۔"

کچھ دیر بعد خادم نے واپس آکر حضرت خواجہؒ کو بتایا کہ ایک پاگل عورت اپنے بیٹے کو تلاش کرتی ہوئی خانقاہ میں گھس آئی ہے۔

"کیا اس کا بیٹا یہاں موجود نہیں ہے؟" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے خادم سے پوچھا۔ "خانقاہ میں تو بے شمار انسان آتے ہیں ممکن ہے کہ ان میں اس کا بیٹا بھی شامل ہو۔"

"اس کے بیٹے کا خانقاہ سے کوئی تعلق نہیں۔" خادم نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

"پھر بھی اسے اپنے بیٹے کو تلاش کر لینے دو۔" حضرت خواجہؒ نے خادم کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ "اس کی جستجو سے کسی کو کیا نقصان پہنچتا ہے؟"

"حضرت وہ عورت دیوانی ہے۔" خادم نے دست بستہ ہوکر اس طرح کہا جیسے سلطان الہندؒ اس کی بات نہ سمجھ سکے ہوں۔

''اگر وہ دیوانی یہاں نہیں آئے تو پھر کہاں جائے؟'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے قدرے ناگوار لہجے میں فرمایا۔ ''یہاں بے شمار دیوانے آتے ہیں ایک اس کے آنے سے کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی؟'' حضرت خواجہؒ نے اشارات و کنایات میں بہت کچھ کہہ دیا تھا مگر خادم عرفان کے ان رموز کو کیا سمجھتا۔ وہ تو حضرت خواجہؒ کے متغیر چہرے کو دیکھ کر گھبرا سا گیا تھا پھر اسی سراسیمگی کے عالم میں دوڑتا ہوا خانقاہ کے دروازے تک پہنچا اور دوسرے ساتھی کو حضرت خواجہؒ کا حکم سنا دیا۔

خانقاہ کا خدمت گار بوڑھی عورت کے راستے سے ہٹ گیا۔ ایک مخبوط الحواس خاتون کو حضرت خواجہؒ کی خانقاہ میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی تھی اب اس کی چیخیں بند ہو چکی تھیں اور وہ اپنے قریب کھڑے لوگوں کے چہروں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

پھر ایک خادم اس عورت کو حضرت سلطان الہندؒ کے پاس لے گیا۔ حضرت خواجہؒ کو دیکھتے ہی مضطرب حال عورت آپ کے قدموں سے لپٹ گئی اور گریہ وزاری کرنے لگی۔

''میں تیرے پاس اپنا بیٹا لینے آئی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ تیری دعاؤں سے مجھے میرا کھویا ہوا بیٹا مل جائے گا۔''

''کہاں ہے تمہارا بیٹا؟'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بوڑھی عورت کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

''میرے بیٹے کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔'' عورت ہچکیوں سے رونے لگی۔ ''حاکم شہر کے حکم سے اس بے گناہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔''

''تو پھر یومِ جزا کا انتظار کرو۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اداس لہجے میں فرمایا۔ ''اس دن جب ساری ناہمواریاں دور کر دی جائیں گی۔ ظالموں اور سرکشوں کو پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر خدا کے روبرو لایا جائے گا۔ پھر کسی کی سفارش، کسی کا اقتدار باقی نہیں رہے گا، ناانصافی کا شکار ہونے والے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ کرسی کیا ہے، عدالت کیا ہے اور انصاف کیا ہے؟ جو اس جہانِ فانی میں محروم رہے، وہ اس دنیا میں بامراد ہوں گے، وقت معلوم کا انتظار کرو۔ وہ عادل حقیقی تمہارے بیٹے کے ساتھ بھی انصاف کرے گا۔''

''وہ دن بہت دور ہے۔'' اس سنگین حادثے نے عورت کا صبر و قرار چھین لیا تھا۔ ''میں تیرے پاس فریاد لے کر آئی ہوں مجھے اس زمین پر انصاف چاہیے۔''

''خاتون! میں ایک مسافر ہوں جو خود برسوں سے خدا کی تلاش میں دردر بھٹک رہا ہے میں اس شہر کا حاکم نہیں کہ کسی کی فریاد سنوں۔'' حضرت خواجہؒ نے آہستہ سے فرمایا۔ ''اور پھر جانے والا تو چلا گیا اس کی رخصت سے پہلے خبر ہو جاتی تو یہ عاجز اپنے اللہ سے دعا کرتا کتاب زیست مکمل ہو گئی، دفترِ ہستی بند ہو چکا اب کیا ہو سکتا ہے؟ اول بھی صبر، آخر بھی صبر۔ یہی درد کا درماں، یہی غم کا علاج۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

''میں واپس جانے کیلئے نہیں آئی ہوں۔'' یکایک عورت کی ہذیانی کیفیت میں اضافہ ہو گیا۔ ''میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر جاؤں گی اگر مُردے زندہ نہیں ہوتے تو پھر میں بھی یہیں تیرے قدموں میں مر جاؤں گی اپنے بچے کے بغیر یہ زندگی ایک بوجھ ہے اگر وہ واپس نہیں آ سکتا تو پھر میری موت کیلئے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا دے، خدا تیری یہ دعا تو سن لے گا۔'' بوڑھی عورت اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی وہ دیوانہ وار آگے بڑھی اور اس نے حضرت خواجہؒ کا دامن پکڑ لیا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کچھ دیر تک گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر آپ نے دلنواز لہجے میں مخاطب ہو کر فرمایا۔ ''اچھا میرا دامن چھوڑ و۔ نماز کا وقت تنگ ہوا جا رہا ہے۔ میں نماز ادا کر لوں۔ اس کے بعد تمہاری روداد غم سنوں گا۔''

عورت نے حضرت غریب نوازؒ کا دامن چھوڑ دیا۔

پھر آپ نے نماز کی امامت کی اور اس کے بعد بوڑھی عورت کی طرف متوجہ ہوئے۔

بوڑھی خاتون ہچکیوں کے درمیان اپنی داستان الم سنانے لگی۔ ''میں ایک غریب بیوہ عورت ہوں۔ شوہر نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت دوسالہ شیر خوار بچہ چھوڑا تھا۔ میں نے محنت مزدوری کر کے اس کی پرورش کی۔ پھر جب وہ جوان ہوا تو اسے حاکم شہر کا اندھا قانون کھا گیا۔ ایک رئیس زادے نے ایک غریب نوجوان کا قتل کر دیا۔ مقتول میرے بچے کا دوست تھا، چشم دید گواہوں نے قتل کا الزام میرے بیٹے کے سر ڈال دیا۔ میں نے عدالت میں جا کر انصاف چاہا مگر قانون بھی بہرا تھا اور منصف بھی۔ آخر اس رئیس زادے کو بچانے کیلئے میرے بیٹے کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ میں اس کی لاش مقتل میں چھوڑ کر تیرے پاس چلی آئی ہوں۔ لوگوں نے مجھے تیرا پتا بتاتے ہوئے کہا تھا کہ اللہ تیری دعائیں سب سے زیادہ سنتا ہے۔ یہ کہہ کر عورت نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھا۔ ایک تو عورت کا غم انگیز بیان دوسرے اس کی سادگی اور حضرت خواجہؒ کا حسن ظن۔ سلطان الہندؒ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور پھر آپ کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکلی۔

''خدایا! اپنے بندے معین الدین پر رحم فرما تو اس کی حقیقت کو بہتر جانتا ہے۔'' عورت نے حضرت خواجہؒ کو شدید کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ آپ سے ایک ایسی دعا کی طالب تھی جس کا کسی درویش کی زبان پر آنا بظاہر ناممکن تھا۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مخالفین نے اس عورت کو یقین دلا دیا تھا کہ آپ کی دعاؤں سے مُردے بھی زندہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک شرارت تھی جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ غم زدہ ماں آپ کے پاس فریاد لے کر جائے گی اور پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ذات ایک تماشا بن کر رہ جائے گی۔ یہ دل آزاری کا بڑا عجیب انداز تھا۔

حضرت سلطان الہندؒ بہت دیر تک آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے۔ آپ کے چہرۂ مبارک پر اذیت و کرب کے آثار صاف نمایاں تھے۔ پھر آپ نے آنکھیں کھول کر بوڑھی عورت کی طرف دیکھا اور اداس لہجے میں فرمایا۔

''خاتون! تم نے مجھے بہت آزار پہنچایا ہے۔ کاش! تمہیں یا کسی دوسرے شخص کو میری ذات سے

یہ حسن ظن نہ ہوتا لوگ یہ کہہ دیتے کہ معین الدین اس شہر میں سب سے زیادہ گناہ گار ہے اور خواجہ کی کوئی دعا نہیں سنتا۔"

مریدوں اور خادموں نے آج تک اپنے پیرو مرشد کی ایسی گفتگو نہ سنی تھی۔ سب کے سب شدید حیرت کے عالم میں اس بات کے منتظر تھے کہ اب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے۔

یکا یک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اُٹھے اور بوڑھی عورت سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔

"مجھے اپنے بیٹے کے پاس لے چلو میں اس کیلئے اللہ سے انصاف طلب کروں گا۔"

عورت بھی کھڑی ہوگئی۔ "اب میرا بیٹا مجھے مل جائے گا۔" فرطِ مسرت سے غمزدہ ماں کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ "خدا ان لوگوں کا بھلا کرے جنہوں نے مجھے تیرا پتا بتایا۔"

بوڑھی عورت کی باتیں سن کر ایک بار پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے چہرۂ مبارک پر شدید اذیت کے آثار نظر آنے لگے قریبی خدمت گار اور مریدان خاص جو کسی حد تک سلطان الہندؒ کے مزاج شناس تھے، آج آپ کی بار بار بدلتی ہوئی اس کیفیت سے سخت پریشان تھے۔ حضرت خواجہؒ نے اپنا عصا ہاتھ میں لیا اور خانقاہ کے دروازے تک آئے۔ تمام مرید، خدام اور حاضرین آپ کی تقلید میں پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ حضرت خواجہؒ ایک لمحے کیلئے ٹھہرے، چند مریدین کو اپنے ہمراہ لیا اور باقی لوگوں کو خانقاہ کے اندر رہنے کا حکم دے کر اس طرف روانہ ہوگئے، جدھر بوڑھی عورت نشاندہی کر رہی تھی۔

حضرت سلطان الہندؒ طویل فاصلہ طے کر کے بوڑھی عورت اور چند مریدوں کے ہمراہ مقتل پہنچے۔ حکومت کے کارندے بہت دیر پہلے لڑکے کو پھانسی دے کر جا چکے تھے۔ بس ایک مقتل کا محافظ تھا جو دروازے پر کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ تماشائیوں کی ایک بھیڑ تھی جو دروازے کے اندر جھانک جھانک کر مقتول کی لاوارث لاش کو دیکھ رہی تھی۔ بوڑھی عورت ان لوگوں کے درمیان راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ آخر وہ مقتل کے دروازے تک پہنچ گئی اور دیوانہ وار چیختی ہوئی بولی۔

"وہ ہے میرے جواں مرگ بیٹے کی لاش جسے اس شہر کا اندھا قانون کھا گیا۔" عورت دراصل حضرت خواجہؒ سے مخاطب تھی جو آہستہ روی کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے مگر انسانی ہجوم نے یہی سمجھا کہ غم زدہ ماں لوگوں کے سامنے فریاد کر رہی ہے۔

اچانک ایک کرخت آواز گونجی۔ "کیا تو نے اپنے ہوش و حواس کھو دیئے ہیں؟" مقتل کا محافظ بڑے سنگدلانہ انداز میں عورت کو ڈانٹ رہا تھا۔ "تو حاکم شہر کے انصاف پر اعتراض کرتی ہے؟ یہ گستاخی تجھے بھی پھانسی کے پھندے تک لے جا سکتی ہے اپنے بدکردار بیٹے کو مظلوم کہتی ہے؟ تجھ پر حاکم وقت کا احسان ہے کہ تیرے بیٹے کو گور و کفن میسر آجائے گا ورنہ اس کی لاش کو کتے کھا جاتے۔"

اسی دوران حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ انسانی ہجوم سے نکل کر مقتل کے دروازے پر نمودار ہوئے اور پہرے دار کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔ "اگر تم اس عورت سے عملی ہمدردی نہیں کر سکتے تو

اپنی زبان سے چند شیریں کلمات ادا کر کے شریک غم ہو جاؤ آج اس خاتون پر جو آفت ٹوٹی ہے وہی مصیبت کل کسی دوسرے انسان پر بھی نازل ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ تماشا کرنے والے خود تماشا بن جائیں۔ انہیں اپنا محاسبہ کر لینا چاہئے۔" حضرت خواجہؒ کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ میں عجیب تاثیر تھی کہ سننے والے مبہوت ہو کر رہ گئے تھے۔ مقتل کا جابر و سفاک محافظ بھی پتھر کی طرح ساکت ہو گیا تھا۔

"ہم اس لڑکے کو لے جانے ہی کیلئے آئے ہیں۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے مقتل کے محافظ کو دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اب تمہیں مزید زحمت برداشت نہیں کرنا پڑے گی۔ حاکم شہر کی ناانصافیوں کا بیان کرنے والی یہ غمزدہ عورت بھی کچھ دیر بعد یہاں سے چلی جائے گی پھر تم بھی آزاد ہوگے، تمہارا حاکم بھی اور تمہارا قانون بھی۔" یہ کہہ کر حضرت سلطان الہندؒ مقتل میں داخل ہوگئے۔

عورت اور چند خدام بھی آپ کی تقلید میں پیچھے پیچھے تھے۔ تماشائی تو پہلے ہی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو دیکھ کر پتھر کے مجسموں کی طرح ساکت ہو چکے تھے۔ رہا محافظ تو اس کی حالت بھی انسانی ہجوم سے مختلف نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے ایک ایسے اجنبی شخص کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا جس کے آگے اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اجنبی نے چار لفظوں میں اس کے حاکم اور قانون کی درندگی کو بے نقاب کر دیا تھا مگر وہ انتہائی کوشش کے باوجود کسی بات کا جواب نہیں دے سکا تھا۔ مقتل کے محافظ نے اپنے جابر حاکم کا رعب و جلال بھی دیکھا تھا مگر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے جبروت کے سامنے اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی تھی۔ محافظ مسلسل سوچ رہا تھا کہ آخر یہ سادہ کپڑوں میں ملبوس شخص کون ہے جس کی ہیبت سے اس کی روح تک لرز رہی ہے۔

ہر طرف ایک سکوت مرگ سا طاری تھا اور تمام بے چین نگاہیں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا تعاقب کر رہی تھیں پھر لوگوں نے دیکھا کہ سلطان الہندؒ مقتول کی لاش کے قریب جا کر ٹھہر گئے۔ خدام آپ کے پیچھے کھڑے تھے غمزدہ عورت اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور وہ بے اختیار بیٹے کے مردہ جسم سے لپٹ گئی۔ پورا مقتل اس کے شور ماتم سے گونج رہا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کچھ دیر تک بہت غور سے مرنے والے نوجوان کے چہرے کو دیکھتے رہے پھر چیختی ہوئی عورت سے فرمایا۔ "خدا سے انصاف مانگنے والے بین نہیں کرتے۔"

حضرت خواجہؒ کی آواز سنتے ہی عورت نے اپنی چیخوں کو ضبط کرنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی ہلکی ہلکی سسکیاں اُبھرتی رہیں۔ سلطان الہندؒ نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے خدام سے فرمایا۔ "عصر کا وقت ہو گیا ہے، نماز ادا کر لی جائے۔"

پیرو مرشد کا حکم پاتے ہی مریدوں نے زمین پر اپنے اپنے رومال بچھا دیئے۔ سلطان الہندؒ امامت کیلئے آگے بڑھے، ایک خادم نے تکبیر کہی اور چند مسلمانوں پر مشتمل ایک مختصر سی جماعت نے نیت باندھ لی۔ مقتل میں نماز ادا کی جا رہی تھی۔ یہ وہی نماز تھی جو میدان کارزار میں پڑھی گئی،

گھوڑوں کی پشت پر پڑھی گئی، خندقوں کے اندر اور دریاؤں کے کنارے، پڑھی گئی، جسم بے کار ہو گئے تو اشاروں سے پڑھی گئی، یہاں تک کہ زیر شمشیر پڑھی گئی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سلام پھیرا اور دعا کیلئے اپنے دونوں ہاتھ دراز کر دیئے۔ ''اے علیم و خبیر! تو بہتر جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟ لوگ کہتے ہیں کہ مجھے تجھ سے نسبت ہے ...... پھر تیری بارگاہ میں مجھے یہ شرف حاصل ہو جائے ...... اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تو سب سے زیادہ میری دعائیں سنتا ہے۔ تیرے عزت و جلال کی قسم! میں نے ان سے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔ یہ جوش عقیدت میں حد سے گزر گئے ہیں میں تو تیرا وہی معین الدین ہوں جسے دنیا میں تیرے نام کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ میں اپنی حقیقت سے واقف ہوں مگر یہ غمزدہ ماں مجھے تیرا واسطہ دے کر یہاں تک لے آئی ہے۔ اس کے حسن ظن کو برقرار رکھ۔ مقتل بھی تیرے حکم سے آباد ہوتے ہیں اور بزم حیات بھی تیرے اشارے سے سجائی جاتی ہے تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب۔''

خدام نے سلطان الہندؒ کی یہ مختصر سی دعا سنی تو ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ انہوں نے آج تک کسی مانگنے والے کی آواز میں ایسا سوز و گداز محسوس نہیں کیا تھا۔

دعا مانگ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اُٹھے اور مقتول کی لاش کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر تک اس بے حس و حرکت نوجوان کو دیکھتے رہے پھر اپنے عصا سے مقتول کی گردن کو چھوتے ہوئے فرمانے لگے۔ ''اگر تو مظلوم ہے تو خدا کے حکم سے زندہ ہو جا۔''

ابھی فضاؤں میں سلطان الہندؒ کے الفاظ کی بازگشت باقی تھی کہ مقتول کے جسم میں ہلکی سی لرزش ہوئی اور پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ دونوں ماں بیٹے حضرت سلطان الہندؒ کے قدموں سے لپٹے ہوئے تھے۔

''جاؤ! بس انصاف ہو گیا۔ مجھ گناہ گار کی ذات کو تماشا نہ بناؤ اور ساری زندگی اس خدا کا شکر ادا کرتے رہو جو ہر شے پر قادر ہے۔'' یہ کہہ کر آپ تیز رفتاری کے ساتھ مقتل سے باہر تشریف لائے اور اپنی خانقاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

انسانی ہجوم یہ ناقابل یقین منظر دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور مقتل کے محافظ کی تو یہ حالت ہو گئی کہ کس نامعلوم دہشت کے سبب اس کا پورا جسم کانپنے لگا۔ وہ اس محیر العقول واقعہ کو دیکھ کر چیخنا چاہتا تھا مگر اس کی زبان سے چند ہی الفاظ ادا ہو سکے۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔'' پھر اس کی زبان بند ہو گئی جیسے کسی غیر مرئی قوت نے گویائی کی ساری صلاحیتیں سلب کر لی ہوں۔ اس کے پراگندہ ذہن میں مختلف خیالات ابھر ابھر کر ڈوب رہے تھے۔ اب اسے حاکم شہر کے ظلم و تشدد کا احساس ہو رہا تھا اور اپنی سنگدلی کے بے شمار مظاہرے بھی یاد آ رہے تھے۔

''جس شخص کی دعا سے ایک مقتول نئی زندگی پا سکتا ہے تو کیا اس کی بددعا سے حاکم شہر پر بھی عذاب آسمانی نازل ہو سکتا ہے؟ پھر کیا وہ لوگ بھی اس عذاب کی لپیٹ میں آ جائیں گے جو ان ناانصافیوں میں شریک رہے ہیں؟'' مقتل کے محافظ نے ڈوبتے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا۔ پھر

یوں محسوس ہوا کہ جیسے قہر کے فرشتے اس کی طرف بڑھ رہے ہوں۔ شدت خوف سے وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ مقتل کے دروازے پر جو دوسرے لوگ موجود تھے، ان کی دماغی کیفیت بھی بڑی عجیب تھی وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حضور خراج عقیدت پیش کرنا چاہتے تھے مگر آپ کے جلال معرفت نے انہیں پتھروں کی طرح ساکت کر دیا تھا۔ خدام بھی بظاہر خاموش تھے مگر ان کے چہروں پر سارے عالم کی خوشیاں سایہ فگن تھیں۔ خدا نے ان کے پیر و مرشد کو اس طرح سرفراز کیا تھا کہ گویا کر کے عقل انسانی حشر تک سرگرداں رہے گی۔

راستے میں شام ہو چکی تھی اس لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ایک مقام پر ٹھہر کر نماز مغرب ادا کی اور جب خانقاہ واپس پہنچے تو ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ تمام لوگ سلطان الہندؒ کے منتظر تھے مگر آپ اس طرح خانقاہ میں داخل ہوئے کہ کسی سے بات تک نہ کی اور سیدھے اپنے حجرے میں تشریف لے گئے۔ جو خدام آپ کے ہمراہ مقتل گئے تھے۔ انہوں نے اپنے دیگر ساتھیوں کو اس عجیب و غریب واقعے کی تفصیلات سنا دیں۔ حاضرین، سلطان الہندؒ کی زبان مبارک سے قدرت کی اس کرشمہ سازی کی تشریح سننا چاہتے تھے مگر حجرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا کچھ دیر بعد حضرت خواجہؒ عشاء کی نماز میں شریک ہونے کیلئے باہر آئے اور پھر فرض ادا کرتے ہی دوبارہ حجرے میں تشریف لے گئے۔ دروازہ حسب سابق بند ہو گیا۔

خانقاہ میں موجود ہر شخص پر اضطراب طاری تھا اس سے پہلے بھی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے حجرے میں بند رہ کر رات رات بھر ریاضت کرتے رہتے تھے مگر اس وقت خدمت گاروں اور مریدوں کو پیر و مرشد کی مصروفیات کا علم ہوتا تھا۔ ایک طویل عرصے کے دوران یہ پہلی رات تھی جب حضرت خواجہؒ نے واپسی کے بعد کسی سے بات نہیں کی تھی اور وقت مقررہ پر کھانا تک طلب نہیں کیا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی مگر کوئی خادم بھی اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پا رہا تھا کہ دروازے پر دستک دے کر حضرت سلطان الہندؒ سے اس مکمل سکوت کا سبب دریافت کر سکے۔

آخر رات آہستہ آہستہ گزرنے لگی۔ خدام میں سے کوئی شخص ایک لمحے کیلئے بھی نہ سو سکا۔ شب کی تاریکی میں لوگ حضرت خواجہؒ کی اس روشن کرامت کا ذکر کرتے رہے جو مقتل میں ظاہر ہوئی تھی۔ یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عقیدت مندوں کیلئے مقام شکر تھا کہ جو مخالفین اس موقع پر سلطان الہندؒ کی عاجزی کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ خدا نے انہیں مایوس کر دیا تھا...... مگر اس کے ساتھ ہی حضرت خواجہؒ سے محبت کرنے والوں کی روحوں پر ایک بار گراں تھا وہ اپنے مخدوم کی خاموشی کا سبب جاننے کیلئے بے چین تھے اور ایسی اذیت ناک کشمکش میں ان لوگوں نے پوری رات جاگتے ہوئے گزار دی تھی۔ پھر خادموں اور عقیدت مندوں کی یہ جماعت اس وقت چونک اٹھی جب شہروں کی مسجدوں سے خوش الحان مؤذنوں کی آوازیں ابھرنے لگیں پوری فضا ''اللہ اکبر'' کی صداؤں سے گونج رہی تھی۔ نماز فجر کا وقت ہو چکا تھا۔ ایک خادم نے حسب دستور خانقاہ میں اذان دینا شروع کی...... اور جیسے ہی اس نے پکارا...... ''آؤ نماز کی طرف......'' حجرے کا دروازہ کھلا اور

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نمودار ہوئے۔ عقیدت مندوں اور خادموں کی صفوں میں ایک مسرت انگیز لہر دوڑ گئی۔

کچھ دیر بعد آپ نے نماز فجر کی امامت کی اور پھر ذکر الٰہی میں مشغول ہوگئے۔ یہاں تک کہ چاروں طرف دن کی روشنی پھیل گئی پھر آپ نے معمول کے مطابق ان لوگوں کو طویل درس دیا جو شہر کے مختلف گوشوں سے آ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خانقاہ میں جمع ہوتے تھے۔ اس دوران تمام لوگوں کی نظریں سلطان الہندؒ کے چہرۂ مبارک پر مرکوز تھیں ہر شخص آپ کی ظاہری حالت میں فرق محسوس کر رہا تھا۔ حضرت خواجہؒ کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے سے شدید تھکن کا اظہار ہو رہا تھا۔ درس میں سیکڑوں انسان موجود تھے مگر یہ راز صرف چند لوگوں کو معلوم تھا کہ سلطان الہندؒ رات بھر اپنے اللہ کے حضور روتے رہے ہیں۔

درس کے بعد آپ دوبارہ حجرے میں تشریف لے گئے۔ شہر میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ مقتول نوجوان کے زندہ ہو جانے کی خبر اس تیزی سے پھیلی تھی کہ سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ ہزاروں انسان قطار در قطار اس باغ کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے جہاں ایک درویش نے اپنی خانقاہ تعمیر کی تھی اور وہ نہایت خاموشی کے ساتھ لوگوں کے دلوں کی سیاہی دھونے کا کام کر رہا تھا۔ آج بے شمار آنکھیں اسی مرد خدا کو دیکھنے کیلئے بے قرار تھیں۔ نماز ظہر سے پہلے حضرت خواجہؒ بیدار ہوئے اور جب آپ حجرے سے باہر تشریف لائے تو بندگان خدا کی بھیڑ کو اپنا منتظر پایا خدمت گاروں نے مشاقان دید کے جمع ہونے کا سبب بیان کیا۔ حضرت سلطان الہندؒ ہجوم کی طرف آئے اور بلند آواز میں فرمایا۔

''خبردار! کسی فریب میں مبتلا نہ ہو جانا یہ اسی قدرت کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا اور ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا کیا۔ وہ ہر شے پر قادر ہے اور جب چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے۔ اہل زمین پر اپنی نشانیاں ظاہر کر دیتا ہے۔'' یہ کہہ کر حضرت سلطان الہندؒ کچھ دیر کیلئے خاموش ہوگئے پھر انتہائی رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''ایک بندے کا اپنے مالک سے اتنا تعلق تو ضرور ہونا چاہئے کہ بندہ جو درخواست کرے اللہ اسے قبول فرمالے۔''

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اہل مجلس کی طرف دیکھا حاضرین زار و قطار رو رہے تھے۔ خود حضرت قطبؒ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر تھی۔

کچھ دیر بعد اشکوں کا سیلاب تھم گیا اور حاضرین کے بے قرار دل ٹھہر گئے تو حضرت قطب الدینؒ بختیار کاکیؒ دوبارہ اہل مجلس سے مخاطب ہوئے۔ ''حضرت سلطان الہندؒ کے مقام معرفت کو کون سمجھ سکتا ہے؟ خدا نے میرے پیر و مرشد کو اس زمین پر شرف خاص بخشا ہے، حاسدین کچھ بھی کر لیں مگر آسمانی فیصلہ خاک ہند پر نازل ہو کر رہے گا۔ لوگ ایک زندہ بچے کی گفتگو پر حیران ہیں اور حضرت

خواجہؒ کی عظیم الشان کرامت کو شعبدہ بازی قرار دے رہے ہیں؟ انہیں کیا معلوم کہ سلطان الہندؒ کی دعاؤں کے طفیل اللہ نے اس نوجوان کی سانسیں بھی لوٹا دی تھیں جس کا تن مردہ صبح سے شام تک مقتل میں پڑا رہا تھا۔ معاذ اللہ! کیا لوگ اسے بھی شعبدہ بازی قرار دیں گے؟ اور پھر جو بات بھی ان کی عقل سے بالاتر ہوگی اسے شعبدہ بازیوں کی فہرست میں شامل کر دیا جائے گا؟ جو حقیقتاً شعبدہ باز تھے وہ حضرت خواجہؒ کے سامنے اپنے تمام تر شیطانی کمالات کے باوجود خم ہوگئے...... اور جو کلمہ گو حضرت سلطان الہندؒ کے روحانی مظاہروں کو بت پرستوں کی جادوگری کے مماثل قرار دے رہے ہیں۔ یہ کیسا نفاق ہے اور کیسا حسد ہے؟ کیا انہیں نہیں معلوم کہ اس مرد حق پرست کی آمد کے بعد رسم جادوگری ہندوستان سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو چکی ہے۔ بڑے بڑے کاہن، جوگی، پروہت اور سنیاسی منہ چھپائے پھر رہے ہیں۔ آج ان کیلئے خدا کی زمین پر کوئی پناہ گاہ نہیں حضرت خواجہؒ کی ضرب لا الٰہ سے پورا بت خانۂ ہند کانپ رہا ہے اور تنگ نظر مسلمان شعبدہ بازی کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آفتاب چشتیہ طلوع ہوا تو اندھیرے فنا ہونے لگے اور عقائد باطلہ مقام عافیت کی تلاش میں اپنے ٹھکانے چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔'' یہ کہہ کر حضرت قطبؒ نے اپنی خانقاہ میں موجود انسانی ہجوم پر نظر ڈالی۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ ساکت تھا۔

''لوگ اعتراف کیوں نہیں کرتے کہ ہندوستان کا ایک ایک گوشہ سلطان الہندؒ کی باجبروت شخصیت کی زد میں ہے۔'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے دوبارہ حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہاں صرف معین الدین چشتیؒ کی آواز ہے جو صدیوں سے گمراہی کی نیند سونے والے پجاریوں کو ان کے گھروں سے کھینچ کر باہر لا رہی ہے۔ خدا کی قسم! یہ آواز انسانی سماعتوں پر محیط ہو جائے گی۔ کوئی ایمان لائے یا نہ لائے مگر اس کا سر پُر غرور حضرت خواجہؒ کی بارگاہ جلال میں جھکا رہے گا۔ سلطان الہندؒ کی ذات گرامی تو ایک مطلع انوار ہے جب اس سے کوئی کرن پھوٹتی ہے تو خود بخود ایک کرامت بن جاتی ہے جسے دیکھ کر لوگوں کی زنگ آلود عقل ٹھوکریں کھانے لگتی ہے۔ انسان کسی کرامت کے اظہار میں عاجز رہ جاتا ہے تو دوسروں کی روحانی سربلندیوں کو ''ساحری اور شعبدہ بازی'' کہہ کر پکارنے لگتا ہے۔ شمس و قمر کا کام مختلف اوقات میں روشنی تقسیم کرنا...... نسیم سحری اور باد صبا کا کار فطری انسانی دل و دماغ پر خوشگوار اثرات چھوڑنا...... اور تریاق کا عمل زہر کی ہلاکت آفرینی کو ختم کرنا ہے۔ اسی طرح کرامت بھی زہد اور تقوے کا رد عمل ہے جب بندے کو خداوند ذوالجلال کی بارگاہ سے ولایت کی سند عطا ہو جاتی ہے تو پھر کشف و کرامت کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ تو مرد مومن کی دھندلی سی نشانیاں ہیں...... اور مرد مومن ان نشانیوں کے بغیر بھی خدا کا دوست ہے۔'' یہ کہہ کر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے حضرت سلطان الہندؒ کی ایک اور کرامت بیان فرمائی۔

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوستان تشریف نہیں لائے تھے بلکہ بغداد میں قیام فرما تھے اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو یہ حضرت خواجہؒ کا وہ دور تھا جب آپ سخت

ریاضت ومجاہدات کررہے تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں یہاں سات آتش پرست بھی رہتے تھے۔ شہر کی آبادی سے دور ایک سنسان مقام پر دریا کے کنارے یہ آگ کا پجاری اس طرح زمین میں دھنس جاتا تھا کہ صرف اس کی گردن نظر آتی رہتی تھی اور وہ کئی کئی ماہ تک اسی حالت میں مذہبی کلمات کی گردان کرتا رہتا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی تین چار دن بعد حلق میں پانی کی چند بوندیں ٹپکا دیا کرتے تھے اور دو تین ماہ بعد روٹی کے کچھ نوالے اس کی غذا بن جاتے تھے۔

کوئی پجاری اس طرح اپنے روحانی کمالات کا مظاہرہ کرتا کہ سر کے بل زمین میں اتر جاتا یہاں تک کہ صرف اس کے ٹخنے نظر آتے رہتے تھے۔ عام تماشائی اسے روحانیت کا ایک ارفع مظاہرہ سمجھتے تھے۔ اس ذیل میں ان کا دعویٰ یہ تھا کہ اگر وہ آتش پرست روحانیت کے کسی بلند درجے پر فائز نہ ہوتا تو آٹھ آٹھ دن تک زیر زمین کس طرح زندہ رہتا؟ سادہ لوح انسانوں کو اس حقیقت کی خبر نہیں تھی کہ وہ آتش پرست حبس دم کے ماہر تھے۔ ایک ایک ہفتے زمین کے اندر رہ کر اپنی سانس روک لیا کرتے تھے اور کم عقل لوگ اس کرشمہ سازی کو روحانیت کا ایک عظیم الشان مظاہرہ سمجھ کر دل ہی دل میں متاثر ہوتے چلے جاتے تھے۔ ان آتش پرستوں میں بعض اتنے سخت جاں تھے کہ سال میں دو بار روٹی کا ایک لقمہ کھا کر مقامی آبادی کو حیران کر دیتے تھے۔

ریاضت مذہبی ہو یا دنیاوی، اس کا ایک خاص اصول یہ ہے کہ اگر کوئی انسانی ظاہری لذتیں ترک کر دے اور مسلسل فاقہ کشی کرتا رہے تو اس کی خفیہ حسیات بیدار ہو جاتی ہیں اور وہ کبھی کبھی انسان کے دل کی بات بھی سمجھ لیتا ہے جب کچھ احمق و نادان لوگ اس آتش پرست جماعت کو دیکھنے کیلئے دریا کے کنارے جمع ہوتے تھے تو ان میں سے کوئی پجاری کسی ایک شخص کے دل کی بات بتا دیا کرتا تھا جس سے تماشائیوں کے مجمع میں ہلچل سی مچ جاتی تھی اور لوگ قطار در قطار دریا کی طرف جانا شروع کر دیتے تھے۔ جہاں آتش پرستوں نے ایک طویل وعریض دائرے میں آگ روشن کر رکھی تھی اور جس کے شعلے مسلسل بھڑکتے رہتے تھے۔

جب آتش پرستوں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہونے لگا تو اہل بغداد کو تشویش ہوئی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خدام نے بھی ایک دن اپنے پیر و مرشد سے عرض کیا۔ "شیخ محترم! دریا کے کنارے سات آتش پرستوں کی ایک جماعت نے برسوں سے ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ وہ آگ کے پجاری ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے روحانی کرشمے دکھا کر بندگان خدا کو متاثر کر رہے ہیں۔ اگر آتش پرستوں کی یہی حرکات کچھ دن اور جاری رہیں تو پھر کسی بڑے ہنگامے کا خطرہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ضعیف الاعتقاد لوگوں کے ایمانوں میں خلل نہ پڑ جائے۔"

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بہت دیر تک اپنے خدمت گاروں کی زبانی آتش پرستوں کی روداد سنتے رہے۔ پھر آپ نے حاضرین سے فرمایا۔ "انسان اپنے فیصلوں میں آزاد ہے۔ آتش پرست بھی آزاد ہیں انہیں آگ کو پوجنے دو آتش پرستوں کا روحانیت سے کیا تعلق؟ وہ تو ایک ادنیٰ درجے کی جادوگری ہے اگر کوئی قیامت تک بھی آگ کی پرستش کرے تو یہ بھڑکتے ہوئے شعلے اسے معاف نہیں کریں گے۔"

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا جواب سن کر تمام خدام مطمئن ہو گئے اور وقت اپنی مقررہ رفتار سے گزرتا رہا۔ آتش پرستوں کی سرگرمیاں کم ہونے کے بجائے مزید بڑھنے لگیں وہ ساتوں پجاری تماشائیوں کے سامنے ایسے ایسے کمالات کا مظاہرہ کرتے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی بغداد میں ایک شور سا مچ گیا۔ آتش پرستوں کے حلقۂ عقیدت میں دم بہ دم اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور پھر یہی عقیدت گمراہی میں تبدیل ہو جانے والی تھی کہ خدام نے دوبارہ حضرت خواجہؒ سے عرض کیا۔

"شیخ محترم! وہ آتش پرست اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ معصوم بندگان خدا کے ذہن بھٹکنے لگے ہیں۔ اگر آتش پرستوں کے خلاف کوئی سخت کارروائی نہیں کی گئی تو وہ اسی طرح مسلمانوں کے عقائد میں انتشار پھیلاتے رہیں گے۔"

"کیا اہل ایمان کے دلوں کو ابھی قرار نہیں آیا کہ وہ سکون قلب کی خاطر آتش پرستوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے خدّام سے دریافت کیا۔

"اہل ایمان کو تو آگ کے پجاریوں سے کوئی خطرہ نہیں۔" ایک خدّام نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

"تو پھر تم لوگ اتنے فکرمند کیوں نظر آتے ہو؟" حضرت خواجہؒ نے فرمایا۔

"پیر و مرشد! اس خرابے میں تمام لوگوں کو یقین کی دولت حاصل نہیں۔ یہاں بہت سے لوگ مسلمان ہیں مگر ان کے ذہنوں میں انتشار برپا ہے۔ آتش پرستوں کی کرشمہ سازیاں دیکھ کر ان کی عقل ٹھوکریں کھانے لگتی ہیں اور قلب ضعیف لرزنے لگتا ہے اگر آپ نے فوری طور پر اس طرف توجہ نہیں فرمائی تو اس آگ میں کچھ نادانوں کے عقائد جل کر خاک ہو جائیں گے۔ خدا کیلئے اہل بغداد پر نظر کرم کیجئے اور اس آگ کو بجھا دیجئے جس کے سرخ شعلے مسلمانوں کے گھروں کی طرف لپک رہے ہیں۔"

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ آپ خاموشی کے ساتھ مصلّے سے اُٹھے اور خدّام سے فرمانے لگے۔ "مجھے ان آتش پرستوں کے پاس لے چلو میں خود اپنی آنکھوں سے اس آگ کو دیکھنا چاہتا ہوں جسے کچھ انسانوں نے خدا کا درجہ دیدیا ہے۔"

خدام نے پیر و مرشد کا حکم سن کر سر جھکا دیا۔

کچھ دیر بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ دریا کی طرف جا رہے تھے جہاں آتش پرستوں کا ڈیرا تھا جیسے ہی آتش پرستوں نے مسلمانوں کی ایک مختصر سی جماعت کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو سب کے سب آتشیں دائرے کے قریب سمٹ آئے اور بلند آواز میں کچھ پڑھنے لگے شاید ان کا کوئی منتر تھا جس کے ذریعے وہ مسلمانوں کو مرعوب کرنا چاہتے تھے۔

"تم لوگ کیا کر رہے ہو؟" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بھڑکتی ہوئی آگ کے قریب پہنچ کر آگ کے پجاریوں سے دریافت کیا۔

"ہم اپنے خدا کی عبادت کر رہے ہیں۔" ایک آتش پرست نے اپنا منتر ترک کرتے ہوئے مسلمان درویش کو جواب دیا۔

"کیا تم آگ کو خدا سمجھتے ہو؟" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے انتہائی تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"بے شک! ہم آگ کو خدا کا درجہ دیتے ہیں۔" اس آتش پرست نے پُرغرور لہجے میں جواب دیا۔ "آگ دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور ہے وہ ہر شے کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک آگ ہی معبود ہے، آگ ہی خدا ہے۔"

"اگر دریا کی کوئی موج ان بھڑکتے ہوئے شعلوں پر آپڑے تو کیا تمہارا خدا بجھنے سے محفوظ رہے گا؟" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے آتش پرستوں کے دعوے کے جواب میں عجیب و غریب منطقی دلیل پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

کچھ دیر کیلئے ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا۔ تمام آتش پرست لاجواب ہو کر رہ گئے تھے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ دوبارہ آگ کے پجاریوں سے مخاطب ہوئے۔ "موجِ دریا کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کوئی بھی شخص ذرا سا پانی لے کر ان بھڑکتے ہوئے شعلوں پر ڈال دے تو یہ آن کی آن میں بجھ جائیں گے۔ اس طرح ثابت ہوا کہ پانی آگ سے زیادہ طاقتور ہے۔ اگر تمہارے خیال میں یہی ظاہری طاقت خدا ہے تو پھر تم پر بھی لازم ہے کہ آگ کو چھوڑ کر دریا کی عبادت کرو۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے چند الفاظ نے آتش پرستوں کے فلسفۂ قوت کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دی تھیں۔

جب کسی سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تو ان ساتوں میں سے جو شخص سب سے زیادہ بوڑھا نظر آ رہا تھا اپنی جگہ سے اٹھا اور حضرت خواجہؒ کے قریب آ کر بولا۔ "دراصل یہ روشن آگ ہمارا خدا نہیں ہے۔" بوڑھے آتش پرست کی زبان سے الفاظ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ "پانی کے مقابلے میں آگ کا عذاب زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔ اس لئے ہم آگ کی پرستش کرتے ہیں تاکہ ہمارے جسم بھڑکتے ہوئے شعلوں سے محفوظ رہ سکیں۔"

"تم لوگ کب سے اس شعلۂ سوزاں کی پوجا کر رہے ہو؟" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بوڑھے آتش پرست سے نیا سوال کیا۔

"پوری زندگی بیت گئی۔" بوڑھے آتش پرست نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "عمرِ عزیز کا ایک ایک لمحہ اس آگ کی نذر کر دیا۔"

"تو پھر تم لوگ یقین کی منزل تک بھی پہنچ گئے ہوگے؟" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔

"کیسا یقین؟" بوڑھے آتش پرست کے چہرے پر سوالیہ نشان اُبھر آیا۔ "ہمیں یقین حاصل نہیں ہوتا تو آگ کی عبادت ہی کیوں کرتے؟" آتش پرست کے لہجے میں وہی غرور شامل تھا جو عام طور پر سطحی انسانوں کی علامت ہوتی ہے۔

"اس بات کا یقین کہ اس قدر طویل عبادت کے بعد یہ آگ تمہارے جسموں کو نہیں جلائے گی۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم اُبھر آیا تھا۔

"آگ اپنے پجاریوں کو کبھی نہیں جلا سکتی۔" آتش پرست کے دعوے سے یقین کم اور لاف زنی زیادہ نمایاں تھی۔ اس کا چہرہ جوشِ جذبات سے سرخ ہو گیا تھا۔

"پھر تم لوگوں میں ایسا کون ہے جو اپنے دعوے کی سچائی ثابت کرنے کیلئے آگے بڑھے؟" حضرت سلطان الہندؒ نے نہایت اطمینان سے فرمایا اور آتش پرستوں کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

مسلمان درویش کے اس غیر متوقع سوال نے آگ کے پجاریوں کو سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ آج ان شعبدہ بازیوں کا امتحان تھا جن کے ذریعے وہ بے عقل انسانوں کو حیران کر دیا کرتے تھے۔ اب تک آتش پرستوں کی زندگی میں ایسا کوئی شخص نہیں آیا تھا جو اتنی جرأت، بے باکی کے ساتھ ان کے طریقۂ عبادت پر گفتگو کر سکتا۔ نتیجتاً وہ دم بخود تھے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

جب خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ان سے دوبارہ مخاطب ہوئے۔ "دعویٰ ثبوت کا پابند ہے۔ تمہاری ریاضتیں تمہارے مجاہدے برحق ہیں تو آگ سے گزر جاؤ، پھر ساری دنیا دیکھ لے گی کہ تم جل کر خاک ہو گئے ہو یا آگ نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔"

"ابھی ہم اس منزل تک نہیں پہنچے ہیں۔" آخر بوڑھے آتش پرست نے زبان کھولی۔ وہ اپنے لہجے پر قابو پانے کی پوری کوشش کر رہا تھا مگر اس کی آواز سے لرزش صاف نمایاں تھی۔ "ہم اسی دن کی جستجو میں اپنی جانوں پر یہ آزار جھیل رہے ہیں، جب آگ ہماری عبادتوں سے خوش ہو کر ہمیں بخش دے گی۔"

"یہ قیامت تک بھی ممکن نہیں۔" حضرت سلطان الہندؒ نے جواباً فرمایا۔ "تم جب بھی اس آگ سے گزرو گے یہ تمہیں پھونک ڈالے گی۔ یہ خدا نہیں، خدا کی قدرت کا ادنیٰ ترین کرشمہ ہے۔ منکروں اور نافرمانوں کیلئے قہر و غضب کا آلۂ کار ہے، آگ کی اپنی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ خدائے واحد کے حکم کی تابع ہے اس کی سوزش اور ضرر سے وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو زبان و دل سے گواہی دیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد مصطفیٰ ﷺ اس کے آخری رسول ہیں۔ بس یہی لوگ آگ سے نجات پانے والے ہوں گے، باقی تمام گمراہی ہے۔"

"تم تو اس خدا کے ماننے والے ہو جو تمہارے خیال میں تنہا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں۔" بوڑھے آتش پرست نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے استہزا کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! یہ میرے خدا کا کرم ہے کہ میں اس کی خدائی میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔" حضرت خواجہؒ نے نہایت عاجزی سے فرمایا۔

"تو پھر تم ہی اس آگ سے گزر جاؤ۔" یکایک آتش پرست گستاخانہ انداز میں ہنسنے لگا تھا۔ "ہم بھی دیکھیں کہ ایک خدا کو ماننے والے شعلۂ سوزاں سے کس طرح محفوظ رہتے ہیں؟"

''اس آگ کا کام اشیائے ظاہری کو جلانا ہے۔'' حضرت خواجہؒ نے نہایت تحمل کے ساتھ
''خدا نے مادی دنیا میں آگ کو یہی ذمہ داری سونپی ہے کہ جو چیز بھی اس کے درمیان سے
اسے جلا کر خاکستر کر دے یہی آگ کی فطرت ہے اور فطرت کے خلاف عمل کرنا ہمارے مذہب
جائز نہیں ہے۔''

''جب تم بھی اس آگ سے ڈرتے ہو تو پھر ہماری آزمائش کیوں؟'' بوڑھا آتش
حضرت خواجہؒ کی عارفانہ گفتگو سمجھنے سے قاصر تھا اسلئے مزید گمراہی کی باتیں کر رہا تھا۔

''مسلمان خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔'' حضرت سلطان الہندؒ نے اسی شگفتگی کے ساتھ
جس کیلئے آپ مشہور تھے۔ ''میں تو تمہیں اس آگ کی خبر دے رہا ہوں جو دوسری دنیا کی آگ
جب تمام انسانوں کی شکستہ ہڈیاں جوڑی جائیں گی خاکی پیکر اپنے رب کے حضور گردنیں جھکا
کھڑے ہوں گے، پھر جو راندۂ درگاہ ٹھہریں گے انہیں اس آگ کے حوالے کر دیا جائے گا
تصور انسانی عقل سے ماورا ہے۔ میں تو اس آگ کی نشانیاں بتا رہا ہوں جس کا ایندھن درخت
پتھر نہیں، سرکش انسان ہیں۔ وہ آگ بولنے والی آگ جو پکار پکار کر اپنے خالق سے کہے گی
اور کوئی تیرے جھٹلانے والوں میں سے؟ اسے بھی بھیج دے کہ میرا شکم خالی ہے۔'' میں تو اس آگ
حوالہ دے رہا ہوں جس کی بھوک کبھی ختم نہیں ہوگی۔ یہ آگ جسے تم نے اپنے ہاتھوں سے بھڑکایا
اس آگ کا دھندلا سا عکس بھی نہیں۔''

''ہم بھی اسی آگ سے بچنے کیلئے ان شعلوں کی عبادت کر رہے ہیں۔'' آتش پرست
سرکشی اپنی جگہ برقرار تھی۔ ''جب تم اس آگ سے سلامتی کے ساتھ نہیں گزر سکتے تو پھر
پرستش میں کیوں خلل ڈالتے ہو؟'' یہ کہتے ہوئے بوڑھے پجاری کے چہرے پر ناگواری کا
نمایاں ہو گیا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ان ساتوں شعبدہ بازوں کی اصلاح سے مایوس ہو چکے تھے
آپ نے اپنے خدام کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''پیغام حق سنایا جا چکا ہے۔ اب اگر کوئی اپنے کانوں
کر لیتا ہے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ خدا بے نیاز ہے۔ نہ وہ کسی کی بندگی کا محتاج ہے اور نہ اسے
کی عبادت کی ضرورت ہے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ یہ جس آگ کی پرستش کر رہے ہیں
دن اسی کی خوراک بن جائیں گے۔''

یہ کہہ کر آپ واپس جانا چاہتے تھے مگر ایک خادم درخواست گزار ہوا۔ ''سیدی! ان گمراہوں
تعداد کل سات ہے۔ مگر ان کی شعبدہ بازیوں سے متاثر ہونے والے بے شمار ہیں۔ اگر خدانخواستہ
آپ بھی ان کے طلسم کو نہ توڑ سکے تو یہ بات سارے شہر میں پھیل جائے گی اور پھر ان کی بے باکی
میں اضافہ ہو جائے گا۔ آپ اللہ سے دعا کیجئے کہ یہ آگ ان ہی پر الٹ جائے۔'' خدام کی آواز میں
دل کی تڑپ شامل تھی۔

حضرت سلطان الہندؒ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''اے مشرق و مغرب کے خدا! اے

آگ اور پانی کے خدا! تو بہتر جانتا ہے کہ تیرا گناہ گار بندہ معین الدین کتنا مجبور ہے۔
اے خدا! تجھ پر یہ بھی روشن ہے کہ میں تیری بخشی ہوئی نعمتوں کو تماشا بنانا نہیں چاہتا۔ میں نے تیرے عطا کردہ
علم سے ان کے بھٹکے ہوئے ذہنوں کو منزل کی طرف موڑنا چاہا مگر یہ اپنی گمراہی پر خوش ہیں، اپنے جہل
پر اصرار کر رہے ہیں۔ بے شک! تو جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے وادیٔ گناہ میں بھٹکنے کیلئے
تنہا چھوڑ دے۔'' یہ کہہ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے دونوں جوتے اُتار دیئے۔

حضرت سلطان الہندؒ کے اس عمل سے آپ کے خدام بھی حیران تھے اور آتش پرست بھی، کوئی
نہیں جانتا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کیا کرنے والے ہیں؟ آپ ننگے پاؤں آگے
بڑھے اور آگ کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے۔ پھر آپ نے اپنے ایک خادم کو مخاطب کرتے ہوئے
فرمایا۔ ''میرے جوتے اُٹھا کر لاؤ اور اس بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دو۔''

خادم نے حضرت خواجہؒ کے حکم پر عمل کیا اور اپنے پیر و مرشد کے نعلین بھڑکتے ہوئے شعلوں کے
سپرد کر دیئے۔

حضرت سلطان الہندؒ آتش پرستوں سے مخاطب ہوئے۔ ''میں نے آج تک جس خدا کی عبادت
کی اس نے مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا۔ میں نے اسے جب بھی پکارا، اس نے میری دستگیری کی۔ اس
آگ کی حیثیت ہی کیا؟ وہ تو آتش نمرود کو بھی گلزار بنانے کی قدرت رکھتا ہے یہ تو اس کی بے نیازی
ہے کہ وہ تم جیسے حقیر و ناتواں انسانوں کو چند ساعتوں کی مہلت بخش دیتا ہے ورنہ کس میں اتنی طاقت
ہے کہ اس کے حکم کے بغیر کوئی ایک سانس بھی لے سکے۔ خدا نے مجھے اپنے کرم خاص سے یہ
صلاحیت عطا کی ہے کہ اگر میں آگ کے درمیان سے گزر جاؤں تو اس کے شعلے میرے پیرہن کو بھی
نہ چھو سکیں۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ فطرتاً نہایت شیریں سخن تھے مگر اس وقت آپ کی زبان
مبارک سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ جلال روحانی کی حرارت سے دہک رہا تھا۔ ''وہ سچا اس کا
کلام سچا۔ اس نے اپنے نام لیواؤں سے وعدہ کیا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو پھر ہر معاملے میں تم ہی
غالب رہو گے۔ اپنے رب کی ایسی تائید کا سہارا لے کر میں خود بھی آگ کے شعلوں سے گزر سکتا تھا
اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ تمہارے معبود نے میرے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا مگر میں نے
اپنے معبود سے التجا کی ہے کہ وہ سرکشوں کو اس طرح عاجز کرے کہ ان کیلئے کوئی راہ فرار باقی نہ
رہے۔ تمہیں ابھی اندازہ ہو جائے گا کہ تمہارا معبود کتنا کمزور ہے؟''

آتش پرستوں پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ شعلے مسلسل بھڑک رہے تھے مگر سلطان الہندؒ
کے جوتے اسی طرح محفوظ تھے جیسے وہ آگ کے بجائے زمین کے کسی خشک حصے پر رکھے ہوں۔

خدام کے چہرے ناقابل بیان مسرت سے روشن تھے اور آتش پرستوں کے چہروں پر مایوسیوں
کا دھواں پھیلتا جا رہا تھا۔ ''تم نے دیکھ لیا کہ تمہارا معبود کتنا ضعیف ہے؟'' حضرت سلطان الہندؒ
آتش پرستوں سے مخاطب ہوئے۔ ''تم نے جس کیلئے سال ہا سال تک شدید جسمانی اذیتیں
برداشت کیں آج اس نے تمہیں اس طرح بے سہارا چھوڑ دیا کہ تمہاری گردنیں شرم سے جھکی ہوئی

ہیں اور چہرے مسخ ہوئے جا رہے ہیں۔ کیا تم اب بھی حق و باطل کے فرق کو محسوس نہیں کر رہے؟ میری طرف غور سے دیکھو میں نے جس ذات واحد کی عبادت کی تھی اس نے مجھے یہ شرف بخشا کہ میرے جوتوں کو بھی معتبر کر دیا۔"

آگ پیہم بھڑکتی رہی اور اس کے پجاری پتھر کے مجسموں کی مانند حضرت خواجہؒ کے جوتوں کو دیکھتے رہے جو ابھی تک نہ صرف سالم و ثابت تھے بلکہ ان پر آگ کا ہلکا سا اثر بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ "اب تم کس بات کے منتظر ہو؟" حضرت خواجہ نے آتش پرستوں سے سوال کیا مگر کسی کے ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوئی۔ "کیا تمہیں اب بھی اُمید ہے کہ تمہارا معبود غضب میں آ کر ایک مسلمان کے جوتوں کو راکھ کر دے گا؟ کب تک اپنے آپ کو فریب دیتے رہو گے؟ اگر تمہاری آنے والی نسلیں قیامت تک اس آگ کو روشن رکھیں تب بھی ایک مومن کی یہ نشانی خاکستر نہیں ہو گی۔" یہ کہہ کر حضرت سلطان الہندؒ نے اسی خادم کو دوبارہ حکم دیا۔ "جوتے آگ سے نکال لو۔"

ایک بار پھر آتش پرستوں پر وحشت طاری ہو گئی۔ اب وہ اپنی آنکھوں سے حضرت خواجہؒ کے خادم کو آگ کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ جس آگ کے خوف سے پجاری لرزہ براندام رہتے تھے اسی آگ کی سوزش کو سلطان الہندؒ کے خادم نے یکسر نظرانداز کر دیا تھا۔ وہ اس طرح بڑھتے ہوئے شعلوں کے درمیان چلا گیا جیسے کسی فرش گل پر محوخرام ہو پھر اس طرح اپنے پیر و مرشد کی نشانی واپس لے کر آ گیا کہ اس کے لباس تک کو آگ نہیں چھو سکی تھی۔

"کیا ہمیں بھی تمہارا خدا معاف کر دے گا۔" یہ منظر دیکھ کر آگ کے پجاری رونے لگے۔

"یہ اسی کی شان ہے کہ وہ سرکشوں کیلئے بھی آخری سانس تک اپنا دروازہ کھلا رکھتا ہے۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے آتش پرستوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

"پھر ہمیں بھی اس پناہ گاہ تک لے چلو۔" تمام آتش پرست حضرت سلطان الہندؒ کے قدموں سے لپٹ گئے۔ "ہمیں اس آگ کے شعلوں سے بچا لو۔"

"اس آگ کی کیا حقیقت ہے تمہیں کلمۂ توحید آتش دوزخ سے بھی بچا لے گا۔" یہ کہہ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ان ساتوں آتش پرستوں کو دولت ایمان سے شرف یاب کیا۔ پھر اہل بغداد نے اپنی آنکھوں سے ایک عجیب منظر دیکھا۔ آگ کے پجاری باآواز بلند کہہ رہے تھے۔

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد مصطفیٰ ﷺ اس کے رسول ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی وہ دریا سے پانی بھر بھر کر آگ پر ڈالتے جا رہے تھے۔ کیسا عجیب انقلاب تھا؟ انسان کو جب روشنی ملی تو وہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے معبودوں کو مٹانے لگا۔ شعلے بجھتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ آخری شعلہ بھی بجھ گیا۔ پھر آدم زادوں کے خیالی معبود کی خاک بھی ہوا میں منتشر ہو گئی۔

آتش پرستوں کے قبول اسلام کا واقعہ سنانے کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اہل مجلس کی طرف دیکھا۔ حاضرین مجلس کا عجیب حال تھا۔ بیشتر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

چہروں پر جذبات و احساسات کا عجیب امتزاج نظر آ رہا تھا ہر چند کہ اس مجلس کے آداب بہت سخت تھے لیکن حضرت قطبؒ کے کچھ عقیدت مندان قوانین کی پابندی نہ کر سکے اور برسرِ محفل پکار اٹھے۔

"بے شک! ہمارے سلطان الہندؒ ایسے ہی ہیں ہندوستانوں کے عارفوں میں کون ان کا ہمسر ہو سکتا ہے؟ وہ تمام اولیاء کے سردار ہیں۔" عقیدت مندوں نے وہی لہجہ اختیار کیا تھا جو عام انسانی فطرت ہے۔

"حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہماری تعریف و توصیف کے محتاج نہیں۔" حضرت قطبؒ نے اپنے عقیدت مندوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "ہم اپنی زبان سے نہیں کہتے کہ ہمارے شیخ محترم دوسرے سلسلے کے بزرگوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ یہ درجہ بندی ان لوگوں کا کام ہے جو فروعات میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ جہاں جہاں بھی بندگان خدا پیغام توحید و رسالت سنا رہے ہیں ہمارے نزدیک وہ سب کے سب محترم ہیں۔" حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اس اختلافی بحث کا دروازہ بند کر دیا جس سے اکثر خانقاہیں آباد تھیں۔ (اور آج بھی ہیں)

"میں گناہ گار حضرت سلطان الہندؒ کے مقام معرفت کا کیا پتا دے سکتا ہوں؟ میں تو خود ان کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور ایک خادم اپنے آقا کے مقام ذات کو کیا سمجھ سکتا ہے؟ میں تو صرف اپنے شیخ کے چند روحانی کمالات کا ذکر کر رہا ہوں تا کہ اس شہر میں بسنے والے تنگ نظر حضرات اس مردِ حق کی دل آزاری سے باز آ جائیں جس نے ہندوستان کی بنجر اور سنگلاخ زمین میں ایمان کے درخت اُگائے اور پھر ان درختوں کو سرسبز و شاداب کرنے کیلئے اپنے خون کا ایک ایک قطرہ صرف کر دیا۔"

حضرت قطبؒ کا لہجہ نہایت پُرسوز تھا۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ آپ کے الفاظ میں دل کا درد شامل ہے۔ "میں تو دہلی کے بے خبروں کو یہ خبر دینا چاہتا ہوں کہ حضرت خواجہؒ کے روحانی کرشموں کے سامنے دنیا بھر کے شعبدہ باز عاجز رہتے تھے۔ بغداد کا وہ آتش کدہ جسے اس کے پجاریوں نے اپنی جانوں کی بازی لگا کر روشن کیا تھا، حضرت سلطان الہندؒ کی نعلین کا بھی متحمل نہ ہو سکا تمام عمر آگ کی پوجا کرنے والے اب کلمۂ طیبہ کا ورد کر رہے ہیں۔ معاذ اللہ! کیا یہ شعبدہ بازی ہے؟ خدا نے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کو اپنی قدرت خاص سے عصا بخشا تھا اور پھر اسی عصائے کلیمی نے سامری کے تمام اژدھوں اور ساحرانہ کمالات کو اس طرح نگل لیا تھا کہ ان کا اس دنیا میں وجود تک باقی نہیں رہا۔ بے شک! حضرت خواجہ کلیمؑ نہیں ہیں مگر کلیمؑ کے غلام تو ہیں، کلیمؑ پر ایمان تو رکھتے ہیں۔ اس لئے خدا نے انہیں ضرب کلیمی سے شرف یاب کر کے بت خانہ ہند کی جانب بھیجا ہے۔ اب اگر جادوگروں، کاہنوں اور شعبدہ بازوں کی بساطیں اُلٹ گئی ہیں تو لوگوں کو حیرت کیوں ہے؟" حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اپنے پیر و مرشد کی صفات عالیہ اس طرح بیان فرما رہے تھے کہ اہل مجلس دم بخود تھے۔ اب انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مردِ جلیل جو نہایت سادگی کے ساتھ ان کے درمیان رہ کر چلا گیا تھا معرفت کے کس مقام پر فائز تھا؟

☆☆......☆☆......☆☆

اس کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے حضرت سلطان الہندؒ کی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ سنایا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے طویل سفر کے اختتام پر ہندوستان تشریف لائے تھے اور پھر دہلی، ملتان اور لاہور سے گزر کر اجمیر میں قیام پذیر ہو چکے تھے۔ یہ حضرت سلطان الہندؒ کی تبلیغ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اجمیر کے بت پرست ہندو مسلمان کو خاموشی سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے تھے پھر مقامی لوگوں کے ذہنوں میں آہستہ آہستہ ایک خاص تبدیلی رونما ہونے لگی۔ پتھر کے پجاری حضرت خواجہؒ کے قریب ٹھہر کر آپ کا طریقۂ عبادت دیکھنے لگے پھر کافروں کی یہ دلچسپیاں اس حد تک بڑھیں کہ بعض منکرین اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اجمیر کے حکمراں پرتھوی راج نے شروع میں اسے ایک معمولی واقعہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا مگر جب مذہب تبدیل کرنے والے راجپوتوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو پرتھوی راج کو فکر لاحق ہوئی اس نے اپنے قریبی درباریوں سے مشورہ کیا۔ آخر طویل غور و فکر کے بعد ایک منصوبہ بنایا گیا۔ منصوبے کی تفصیل اس طرح تھی کہ پرتھوی راج نے اپنے ایک درباری امیر کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مسلمان درویش کی خدمت میں ادب کے ساتھ حاضر ہو گا اور پھر ظاہری طور پر اسلام قبول کر کے حالات کا جائزہ لیتا رہے گا۔ دراصل اس راجپوت سردار کی حیثیت ایک جاسوس کی تھی۔ اسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی بارگاہ میں اس لئے بھیجا جا رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کی سرگرمیوں سے پرتھوی راج چوہان کو مطلع کرتا رہے کہ اسلام کے بڑھتے ہوئے اثرات کا بروقت مقابلہ کیا جا سکے۔

پھر ایک دن وہی درباری امیر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔

"تم کون ہو اور یہاں کس لئے آئے ہو؟" حضرت سلطان الہندؒ نے نہایت نرم لہجے میں راجپوت سردار سے پوچھا۔

"میں سمراٹ پرتھوی راج چوہان کا درباری امیر ہوں۔" آنے والے نے سر جھکا کر کہا۔ "آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ اب نیا مذہب اختیار کرنا چاہتا ہوں۔" راجپوت سردار نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"باپ دادا کے مذہب سے کیوں بیزار ہو؟" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے راجپوت سردار سے نیا سوال کیا۔ "تمہارے آباؤ اجداد تو صدیوں تک اس مذہب پر عمل پیرا رہے اب تم میں اچانک یہ تبدیلی کیوں آئی ہے؟"

"مجھے لاکھوں دیوتاؤں اور ہزاروں دیویوں کا مذہب پسند نہیں۔" راجپوت سردار نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ مسلمانوں کا خدا ایک ہے اس لئے میں بھی بے شمار خداؤں کو چھوڑ کر صرف اس کی پوجا کرنا چاہتا ہوں۔"

"بے شک! ہمارا خدا ایک ہے۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ "مگر ایک خدا کی عبادت کرنا آسان نہیں اس راستے میں دنیا کا تو ذکر ہی کیا، خود اپنی ذات کی بھی نفی کرنی پڑتی ہے۔"

"میں اس ذمہ داری کو قبول کرنے کیلئے تیار ہوں۔" پرتھوی راج کے درباری امیر کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ "میں ایک خدا کے سوا تمام طاقتوں سے انکار کروں گا۔"

"تم یہ انکار نہیں کر سکو گے۔" حضرت سلطان الہندؒ نے راجپوت سردار کے دعوے کو مسترد کرتے ہوئے فرمایا۔

"آپ یہ بات کس طرح کہہ رہے ہیں؟" راجپوت سردار کی باتوں سے حیرت کا رنگ نمایاں تھا۔

"تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتے۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے مختصراً فرمایا۔

"میں اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتا۔" راجپوت سردار کا لہجہ بدستور عاجزانہ تھا۔ "میں تو صرف اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے اپنے مذہب میں شامل کر لیں۔"

"میری کیا طاقت ہے کہ میں کسی کو مسلمان کر سکوں۔" حضرت سلطان الہندؒ نے فرمایا۔ "کسی انسان کو ہدایت دینا محض اللہ کے فضل و کرم پر منحصر ہے۔ اگر وہ ایک شخص کو ہدایت دینا نہیں چاہتا تو پھر سارے جن و انس مل کر بھی کسی گمراہ کو ہدایت یافتہ نہیں بنا سکتے۔"

اس کے بعد راجپوت سردار بہت دیر تک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حضور درخواست کرتا رہا مگر آپ نے اسے دولت ایمان سے سرفراز نہیں کیا۔ یہاں تک کہ وہ ناکام و نامراد لوٹ گیا۔ اس وقت حضرت سلطان الہندؒ کے چند خدام بھی موجود تھے۔ ان لوگوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار یہ منظر دیکھا تھا جب کسی غیر مسلم نے قبول اسلام کی درخواست کی ہو اور حضرت خواجہؒ نے جواب میں انکار فرما دیا ہو۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا جس پر خدام آپس میں بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے مگر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ کوئی حضرت سلطان الہندؒ سے اس انکار کا سبب دریافت کر سکے۔

پھر حالات نے نئی کروٹ لی۔ دوسرے دن چند خدام نے چند ایسے افراد کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا جو ظاہری شکل و صورت سے راجپوت نظر آ رہے تھے مگر جب وہ لوگ قریب آ گئے تو خدمت گاروں کو اندازہ ہوا کہ ان کا تعلق پرتھوی راج کے دربار سے ہے۔ آتے ہی ان لوگوں نے حضرت خواجہؒ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ خدام نے سلطان الہندؒ کو اطلاع دی آپ نے فوراً ہی آنے والوں کو خانقاہ کے اندر طلب کر لیا (اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خانقاہ ایک جھونپڑی پر مشتمل تھی۔) راجپوتوں کی اس مختصر سی جماعت میں وہ سردار بھی شامل تھا جسے حضرت خواجہؒ نے مسلمان بنانے سے انکار کر دیا تھا۔

"ہم آپ سے ایک خاص مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔" آنے والوں میں سے ایک سردار نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔

"آپ حضرات کو جو کچھ کہنا ہے بلا جھجھک کہیں۔" حضرت سلطان الہندؒ نے نہایت شگفتہ لہجے میں فرمایا۔ "درویش تو یہاں آیا ہی اس لئے ہے کہ اپنی بات کہے اور دوسروں کی سنے۔"

"یہ شخص کل آپ کے پاس قبول اسلام کیلئے حاضر ہوا تھا۔" آنے والوں میں سے ایک شخص نے راجپوت سردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مگر آپ نے اسے اپنے مذہب میں شامل کرنے

سے انکار کر دیا آخر ایسا کیوں؟ کیا آپ کے یہاں بھی انسانوں کی درجہ بندی ہے؟"

"اسلام میں کوئی تفریق نہیں۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا لہجہ اچانک بدل گیا تھا۔ آپ کے الفاظ سے جلال روحانی کا اظہار ہونے لگا تھا۔ "اللہ کے دین کا دروازہ سب کیلئے کھلا ہے۔ وہاں کسی منافق......"

"آپ اس شخص کو منافق کس طرح کہہ سکتے ہیں جو اپنی مرضی سے یہاں آیا تھا۔" دوسرے راجپوت سردار نے جرح کے انداز میں کہا۔

"اگر یہ اپنی مرضی سے یہاں آتا تو ذات واحد کی قسم! اس فقیر کو اپنے تصور سے زیادہ کشادہ دل پاتا۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے راجپوت سردار کے دعوے کی نفی کرتے ہوئے فرمایا۔ "یہ منافق ہی نہیں، جاسوس بھی ہے۔"

"جاسوس؟" حضرت خواجہؒ کے انکشاف نے راجپوتوں کے ہوش اُڑا دیئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا منصوبہ اس طرح بے نقاب ہو جائے گا۔ حضرت سلطان الہندؒ کی قوت کشف نے راجپوتوں کو حیران کر دیا تھا پھر بھی ان لوگوں نے اپنی خفت مٹانے کیلئے اس طرح کہا جیسے وہ اس راز سے بے خبر ہوں۔ "یہ کس کا جاسوس ہے؟"

"یہ اسی سے دریافت کرو۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ "میں نے اسے کلمہ طیبہ کی تلقین اس لئے نہیں کی کہ یہ اپنی عملی زندگی میں بہت زیادہ گناہ گار ہے۔ اس نے بے گناہ انسانوں پر مظالم ڈھائے ہیں اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ دوسرے یہ کہ اسے اپنے حکمراں کو سجدہ کرنے کی عادت ہے...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی قسمت میں ہدایت نہیں ہے۔ میں نے اللہ کے فضل سے لوحِ محفوظ پر دیکھا ہے کہ یہ دنیا سے ایمان کے ساتھ رخصت نہیں ہوگا۔ سارا اجمیر دیکھے گا کہ اس کی موت بڑی بے کسی کی موت ہوگی۔" یہ کہتے ہوئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا چہرۂ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا۔ "اسلام میں منافقوں اور جاسوسوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ عنقریب یہ لوگ اپنا حشر دیکھ لیں گے۔"

منصوبہ سازوں کا یہ گروہ حضرت سلطان الہندؒ کے جلال کی تاب نہ لا سکا اور لرزتے ہوئے قدموں سے واپس چلا گیا۔ راجپوت سرداروں نے تمام حالات پرتھوی راج چوہان کے گوش گزار کر دیئے۔ اجمیر کا حکمراں ایک درویش کی ایک بے باکانہ گفتگو کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے اپنے چند سپاہیوں کے ذریعے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو یہ گستاخانہ حکم دیا۔

"اگر عافیت چاہتے ہو تو فوراً اجمیر کی حدود سے بہت دور چلے جاؤ ورنہ ایسی دردناک سزا دوں گا کہ آنے والی نسلیں تمہارے حال سے عبرت حاصل کریں گی۔"

اس حکم کے جواب میں حضرت سلطان الہندؒ نے فرمایا تھا۔ "یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ اجمیر کی حدود سے کون نکلے گا اور زمانہ کس کے حال سے عبرت پکڑے گا؟"

ابھی واقعے کو تین دن بھی نہیں گزرے تھے کہ شہاب الدین غوری نے اجمیر پر حملہ کر دیا۔ ایک

خونی معرکہ آرائی کے بعد پرتھوی راج چوہان نے ذلت آمیز شکست کھائی اور افغان سپہ سالار کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ اس تاریخی واقعے میں اہل نظر کے لئے جہاں بے شمار سبق ہیں وہاں یہ پہلو بھی عجیب ہے کہ جس راجپوت سردار کے بارے میں حضرت سلطان الہندؒ نے پیش گوئی کی تھی وہ حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ جب آگ اور خون کا کھیل ختم ہو گیا تو مسلمانوں کو دریا میں ایک سڑی ہوئی لاش نظر آئی یہ لاش اسی سردار کی تھی جس کے بارے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا تھا۔

"میں نے اللہ کے فضل سے لوح محفوظ پر دیکھا ہے کہ یہ دنیا سے ایمان کے ساتھ رخصت نہیں ہوگا۔ اور اس کی موت بڑی بے کسی کی موت ہوگی۔"

☆☆..................☆☆..................☆☆

یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئے۔ پھر ایک مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد آپ دوبارہ حاضرین سے مخاطب ہوئے مگر اشارہ ان درباری علماء کی طرف تھا جو خانقاہوں میں بیٹھنے والے درویشوں کو بے عمل کہتے تھے۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ مسجدوں کے امام، زندگی کے دشت الم میں نماز ادا نہیں کر سکتے۔ یہ تقریر کے ماہرین زیر شمشیر اپنے ایمان کی شہادت نہیں دے سکتے۔ یہ فقہ کی باتیں کرنے والے، یہ راز نہیں جانتے کہ خدا ہر شے سے بے نیاز ہے۔ یہ حقوق العباد کا ذکر کرنے والے اس بات سے بے خبر ہیں کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ سب اللہ کا دیا ہوا ہے۔ قدم قدم پر سود و زیاں کا حساب کرنے والے اس حقیقت سے نا آشنا ہیں کہ خدا چاہے تو زیاں بھی سود ہے...... اور اگر خدا نہ چاہے تو پھر ہر سود، زیاں ہے، نقصان ہے، خسارہ ہے۔ یہ شرع کی آگ لے کر اپنے شکم بھرنے والے نہیں جانتے کہ رسالت مآب ﷺ کے گھر سے چالیس چالیس دن دھواں نہیں اٹھتا تھا۔ یہ سنت رسول ﷺ اہل علم کو یاد نہیں۔ پانچ وقت کی نمازیں ادا کر کے دوسروں کو بے عمل کہنے والے گریۂ نیم شب کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ وہ کیوں اس واقعہ عظیم کو فراموش کر دیتے ہیں سرور کونین ﷺ رات رات بھر اپنے رب کے حضور کسی عمارت کے ستون کی مانند کھڑے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے پائے اقدس پر ورم آ جاتا تھا۔ یہ لمحاتی سجدہ کرنے والے اس سجدۂ طویل کو کیوں یاد نہیں کرتے جب حضور اکرم ﷺ کو سجدے کی حالت میں صبح ہو جاتی تھی اور پھر دیکھنے والے دیکھتے تھے کہ پتھروں پر سجدہ کرنے کے سبب کبھی کبھی پیشانی رسالت مآب ﷺ سے خون کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ یہ بھی تو مزاج شریعت ہے۔ آخر یہ علمائے ظاہر اس سنت کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟ یہ زندگی کا مشکل ترین عمل ہے۔ محفلیں آراستہ کرنے والے، اپنے لباسوں اور عماموں کو خوشبوؤں میں بسانے والے اس راستے سے نہیں گزر سکتے۔ اگرچہ یہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ رسالت مآب ﷺ وادی طائف میں لہولہان بھی ہوئے ہیں۔ کارزار حیات میں ایک عظیم سپاہی کی حیثیت سے شمشیر بکف بھی اترے تھے۔ شعب ابی طالب نے بھوک اور پیاس کی ناقابل بیان تکلیف بھی برداشت کی ہے۔ یہ سنت

کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیں۔ صحیح مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے والے اس راہ سے کیوں نہیں گزرتے وہ تو شبنم اور سبزہ زاروں پر محوِ خرام ہونے والے ہیں۔ آقا علیہ ﷺ کی سنت سے تو ہم غلاموں کو... ہے۔ ہماری صفوں سے کوئی قلندر اُٹھتا ہے اور بادشاہوں کے درباروں میں پہنچ کر ان کے اقتدار... حکومت کی نفی کر دیتا ہے...... اور پھر تہہ تیغ ہو جاتا ہے۔ یہ خوش بیان واعظ مقرر مزاج شاہ کا اندازہ کر کے تقریر شروع کرتے ہیں اور اس برسرِ اقتدار انسان کی لغزشوں پر مسلسل پردہ ڈالتے رہتے ہیں۔ ہماری جماعت کا ایک درویش شاہوں کے دربار کو حقارت سے دیکھتا ہوا گزر جاتا ہے... مقامات کا رخ کرتا ہے جہاں برہمنوں اور ٹھاکروں کا ہجوم ہے۔ وہ ان کے خداؤں کو جھٹلاتا ہے... حق کا پیغام سناتا ہے۔ اہلِ ہنود اس درویش پر زندگی کے دروازے بند کر دیتے ہیں مگر وہ اپنے ارادوں سے باز نہیں آتا۔ یہاں تک کہ بت پرستوں کی صدیوں پرانی تاریخ تباہ ہو جاتی ہے۔ ... جہاں مندروں میں ناقوس کی آوازیں گونجتی تھیں آج وہاں "اللہ اکبر" کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ یہ جبہ و دستار کے طالب اپنی قباؤں کی نفاست ہی پر غور کرتے رہتے ہیں اور ایک فقیر بے نوا دریدہ لباس، خالی شکم، کسی درخت کے نیچے سے اٹھ کر کفار کے عقائد کی بساط اُلٹ دیتا ہے۔ یہ ... کے وارث اپنے مذہبی فرائض ادا کر کے نرم و گداز بستروں پر گہری نیند سو جاتے ہیں...... اور ایک جان سوختہ عشقِ الٰہی رات بھر اپنے خالق کے آگے سجدہ ریز رہ کر گریہ وزاری کرتا ہے۔ درویش قدرت کے ایک مبہم سے اشارے پر اپنی جان سے گزر جاتا ہے اور یہ دانشمند لوگ اپنی زندگی بچانے کیلئے جواز تلاش کرتے رہتے ہیں۔ یہ علمائے ظاہری ہر وقت سربگریباں رہتے ہیں اور درویش ... بکف پھر دونوں میں کیا تقابل ہے کیا نسبت ہے؟ جن کے دل گداز سے خالی ہیں سوز سے محروم ہیں۔ جاں فروشی کے جذبے سے عاری ہیں وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مقامِ روحانیت کیا سمجھ سکتے ہیں؟ انہیں کیونکر اندازہ ہوگا کہ سلطان الہندؒ کے روبرو ایک شیر خوار بچہ کس طرح گفتگو کرتا ہے؟ ایک مقتول کس طرح حیات نو پاتا ہے؟ آگ کے پجاری کس طرح وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے آتش کدوں کو اپنے ہاتھوں سے بجھا دیتے ہیں، کس طرح لوحِ محفوظ کا فیصلہ زمین پر نازل ہوتا ہے اور کس طرح لاکھوں راجپوت سپاہیوں کے حصار میں پرتھوی راج چوہان کا جسم ٹکڑوں میں تبدیل ہو جاتا ہے؟ یہ سب کچھ کیا ہے، اس کا ادراک درباری علماء کو نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام چیزیں ان کی عقل سے ماورا ہیں جو اللہ کے پسندیدہ بندوں پر الزام تراشی کرتے ہیں اور انہیں سیاہ کار ثابت کرنے کیلئے جھوٹی گواہیاں لاتے ہیں...... مگر وہ کچھ بھی کر لیں۔ اللہ کے کسی محبوب کے چہرے پر سیاہی نہیں مل جا سکتی اس کے نام لیواؤں کے چہرے بھی روشن رہیں گے اور قبریں بھی۔ سلطان الہندؒ آخر سلطان الہندؒ ہیں۔ اس وقت جتنے بھی لوگ سرزمینِ ہند پر بستے ہیں، وہ میرے سلطان کی رعایا ہیں۔ میرا سلطانؒ تاج و تخت نہیں رکھتا اس کے دروازے پر مسلح افواج کا پہرہ نہیں... بے شک! وہ ایک بوریا نشیں ہے مگر انسانوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے...... اور یہی حکومت حقیقی پائیدار ہے۔ میرے سلطانؒ کا اقتدار چند سانسوں پر محیط نہیں کہ انسان کی آنکھ بند ہوئی اور سب ...

...خاک میں مل گیا۔ میرا سلطان تو وہ ہے جو دنیا سے گزر جانے کے بعد بھی اہلِ دل پر حکومت کرے گا۔ قیامت تک جو لوگ ہندوستان میں پیدا ہوں گے، وہ سب کے سب سلطان الہندؒ کی رعایا میں شامل ہوں گے۔" یہ کہتے کہتے حضرت قطبؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جوشِ جذبات سے آپ کی آواز لرز رہی تھی اور خود سامعین کا یہ حال تھا کہ روتے روتے ان کے دامن بھیگ گئے تھے۔ پہلی بار اہلِ شہر کو اندازہ ہوا تھا کہ ساعتِ فراق کسے کہتے ہیں اور حضرت سلطان الہندؒ کے اجمیر تشریف سے جانے سے بے قرار روحوں پر کیا قیامت گزر رہی ہے؟

☆☆..................☆☆..................☆☆

ایک اور مجلس میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی روحانی عظمتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

"یہ اسی زمانے کی بات ہے جب پرتھوی راج کو شکست ہوئی تھی۔ راجپوت حکمران کو گرفتار کرنے کے بعد شہاب الدین غوری، حضرت خواجہؒ کی قدم بوسی کو حاضر ہوا۔ سلطان الہندؒ نے اسے مزید فتح و نصرت کی دعائیں دیں جب افغان سپہ سالار رخصت ہونے لگا تو اس نے نذر کے طور پر حضرت سلطان الہندؒ کی خدمت میں زرِ نقد اور قیمتی تحائف پیش کئے مگر آپ نے انہیں قبول نہیں کیا البتہ تنا فرمایا کہ ان تمام اشیاء کو اجمیر کے ضرورت مند مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ شہاب الدین غوری نے سلطان الہندؒ کے حکم کے مطابق ساری چیزیں مقامی مسلمانوں میں بانٹ دیں اور پھر درخواست گزار لہجے میں عرض کرنے لگا۔

"میں تو مخدوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

"خدا تمہیں اجرِ عظیم دے کہ تم نے فقیر کا اس قدر لحاظ رکھا۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ "دولت اس دنیا کا فتنہ عظیم ہے اگر یہ کوئی اچھی چیز ہوتی تب بھی میں اس کی طلب نہیں رکھتا زمین پر صرف اللہ میرا کفیل ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح میری ضرورتوں کی تکمیل کر دیتا ہے۔"

شہاب الدین غوری کے قتل کے بعد قطب الدین ایبک نے ہندوستان کی عنانِ حکومت سنبھالی۔ غلام خاندان کے اس پہلے حکمران نے حضرت سلطان الہندؒ کی خدمتِ عالیہ میں گراں بہا نذریں پیش کیں مگر آپ نے حسبِ عادت سختی سے انکار فرما دیا۔ ایبک کے بعد سلطان شمس الدین التمش نے تخت ہندوستان پر قدم رکھا۔ یہ درویش صفت شہنشاہ حضرت خواجہؒ سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا لیکن تحائف قبول کرنے کے سلسلے میں وہ بھی حضرت سلطان الہندؒ کو مجبور نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ اجمیر کے حاکم بھی حضرت خواجہؒ کے آستانے پر حاضری دیتے رہتے تھے مگر سلطان الہندؒ کو ان کے قیمتی عطیات سے کوئی سروکار نہ تھا آپ ہر بار شانِ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے یہاں تک کہ اہلِ ثروت اپنے مقصد میں ناکام ہو کر لوٹ جاتے۔

جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے حلقۂ اسلام وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ اجمیر جغرافیائی اعتبار سے ایک ایسا خطہ زمین ہے کہ جہاں ماضی میں آمدنی کے ذرائع محدود تھے اس لئے شہر اجمیر کے تمام

غریب سمٹ کر حضرت سلطان الہندؒ کی خانقاہ میں جمع ہو گئے تھے۔ کچھ تاریخی روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ ایسے مفلس اور ضرورت مند افراد کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ آپ ان لوگوں کی روحانی تربیت بھی کرتے اور لباس و غذا کا بھی انتظام فرماتے۔ نتیجتاً حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خانقاہ سے ایک بڑا لنگر خانہ قائم ہو گیا تھا جہاں بے شمار بھوکے دونوں وقت کا کھانا کھاتے تھے۔ ہندوستان میں کچھ اور بھی بزرگانِ دین ایسے گزرے ہیں جن کے یہاں بھوکے اور پریشان حال انسانوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی اور روز و شب لنگر جاری رہتا تھا...... لیکن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور دوسرے بزرگوں کے انتظامات میں بڑا فرق تھا۔ دوسرے بزرگوں کے خانقاہوں میں بادشاہوں، وزیروں، امیروں اور دیگر اہل ثروت کی جانب سے بے شمار نذریں آتی تھیں۔ جنہیں وہ خدا رسیدہ لوگ غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ایک لنگر خانہ قائم کر دیا جاتا تھا جس سے بھوکوں کو رزق حاصل ہوتا رہتا تھا اس کے برعکس حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا دستور یہ تھا کہ آپ کسی شہنشاہ یا کسی امیر و وزیر کی کوئی نذر قبول نہیں فرماتے تھے مگر پھر بھی آپ کے لنگر خانے سے صبح و شام ہزاروں انسان اپنے شکم کی آگ بجھاتے تھے۔ اہل شہر کو حضرت سلطان الہندؒ کے اس عمل پر شدید حیرت ہوتی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے بڑے لنگر خانے کے اخراجات کس طرح پورے ہوتے ہیں؟ بعض تجسس پسند افراد بہت دن تک اس جستجو میں رہے کہ کسی نہ کسی طرح حضرت سلطان الہندؒ کے ذریعۂ آمدنی کا پتا چل جائے مگر وہ سب کے سب اپنی کوششوں میں ناکام رہے۔ اُنہیں اس بات کی ہوا بھی نہ لگ سکی کہ غریبوں کے طعام کیلئے پیسہ کہاں سے آتا ہے؟

اس صورتحال نے تنگ نظر لوگوں کو حسد میں مبتلا کر دیا تھا اور جو عقیدت مند تھے انہیں ہر وقت یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ حضرت خواجہؒ اخراجات کا یہ بارِ گراں کس طرح برداشت کرتے ہوں گے۔ اپنے اسی جذبے سے مجبور ہو کر حاکم اجمیر یا کوئی صاحب ثروت حضرت سلطان الہندؒ کے روبرو حاضر ہو کر درخواست کرتا۔

''ہم اپنے آپ میں یہ جرأت اظہار نہیں پاتے کہ لنگر خانے کے اخراجات کی ذمہ داریاں ہمیں منتقل کر دی جائیں۔ یہ ہم گناہ گاروں کیلئے بڑا شرف ہوگا کہ آپ کی کوئی خدمت انجام دے سکیں۔''

''تم جانتے ہو کہ یہ لوگ کون ہیں؟'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا اشارہ ان ضرورت مند انسانوں کی طرف تھا جو ہر وقت آپ کی خانقاہ میں موجود رہتے تھے۔ ''انہیں اللہ نے میرے پاس بھیجا ہے۔ یہ میرے مہمان ہیں اب تم چاہتے ہو کہ میں اپنے مہمانوں کو تمہارے حوالے کر دوں؟ یہ کیسی عجیب بات ہے؟ کون غیرت مند انسان برداشت کرے گا کہ اس کے مہمان دوسرے کے در پر جا پڑیں۔ اگر یہ عام مہمان ہوتے تو شاید میں گوارہ کر لیتا کہ تم ان لوگوں کی میزبانی کرو...... لیکن یہ وہ مہمان خصوصی ہیں جنہیں خالق کائنات نے میرے سپرد کیا ہے۔ یہ بہت معزز لوگ ہیں۔ خود ان کی عزت بھی گوارہ نہیں کرے گی کہ یہ ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر منتقل ہو جائیں۔ انہیں میرے پاس ہی رہنے دو۔ یہ بہت نازک مزاج ہیں۔ ان کے دلوں کا شیشہ تحقیر کی ہلکی سی

ضرب بھی برداشت نہیں کر سکے گا۔ یہ میری اولاد کے مانند ہیں۔ میرے سوا کوئی شخص ان کی ناز برداری نہیں کر سکتا۔ پھر تم کیا سمجھتے ہو کہ میں انہیں اپنی جاگیر کی آمدنی سے کھلاتا ہوں؟ میری اس زمین پر کوئی جاگیر نہیں۔ یہ زمین خدائے واحد کی ملکیت ہے۔ اس لئے سارے خزانوں کا بھی وہی مالک ہے۔ معین الدین کا سرمایۂ حیات تو بس اتنا ہے کہ اسے ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہیں۔ وہ شاہ و امیر ہوں یا محتاج و گداگر، ان سب کو وہ خلاق عالم ہی رزق پہنچاتا ہے مگر اکثر لوگ اس کا شعور نہیں رکھتے۔''

حضرت سلطان الہندؒ نے اپنے مہمانوں کی شخصیت کو اس طرح بیان کیا کہ اجمیر کے آسودہ حال لوگ رو پڑے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں انسانی اعلیٰ ظرفی اور انکسار کا ایسا عظیم الشان مظاہرہ نہیں دیکھا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ان محتاجوں کو جس طرح اپنے سینے سے لگائے ہوتے تھے اس کی مثال ایک نہایت دردمند باپ ہی فراہم کر سکتا ہے...... مگر صرف اپنی اولاد کی حد تک سلطان الہندؒ کی یہ نوازشات تو ان لوگوں پر عام تھیں جن سے آپ کا کوئی خونی یا نسبی رشتہ نہیں تھا۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے اس فقیر کی ضروریات کا اتنا لحاظ رکھا مگر آئندہ ان باتوں سے مجھے اذیت پہنچے گی۔'' حضرت سلطان الہندؒ نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد دوبارہ فرمایا۔ ''ان کی میزبانی میرا فرض ہے۔ سرِ محشر مجھ سے اس سلسلے میں سخت باز پرس ہوگی کہ معین الدین! ہم نے تمہارے پاس کچھ مہمان بھیجے تھے تم نے انہیں دوسروں کے کاندھوں کا بوجھ بنا دیا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں مالک روزِ جزا کے سامنے سر جھکائے ہوئے آؤں اور ایک ایسے مجرم کی طرح کھڑا ہوں جس نے اپنے آپ کو رزاق سمجھ لیا تھا۔'' حضرت سلطان الہندؒ نے در پردہ نہایت مہذب الفاظ میں اہل سرمایہ پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ دولت کے انبار بھی محض خدا کے فضل و کرم سے ہیں اور اگر خدا نہ چاہے تو ایک انسان تنہا اپنی کفالت بھی نہیں کر سکتا۔

حضرت سلطان الہندؒ کی گفتگو سن کر وہ مالکان سیم و زر، وہ صاحبان اقتدار ندامت کے پسینے میں نہائے ہوئے واپس چلے گئے ایک درویش نے، زمین جس کا بستر تھی اور آسمان جس کا سائبان تھا دنیا کے تمام وسائل و اسباب کی نفی کر دی تھی۔ اس کے بعد پھر کسی اہل کرم نے حضرت خواجہؒ کے مہمانوں کا ذکر نہیں چھیڑا اور سلطان الہندؒ کا لنگر خانہ روز بروز کشادگی اختیار کرتا چلا گیا۔

بھوکے آتے تھے اور حضرت سلطان الہندؒ کے قلندرانہ دربار میں اس طرح کھانا کھاتے تھے جیسے وہ اپنے ذاتی دسترخوان پر موجود ہوں۔ شکستہ حال اپنے لباسوں کی دھجیاں لے کر آتے تھے اور ان کے جسموں پر نئی قبائیں سجا دی جاتی تھیں۔ یہاں کوئی کسی سے شرمندہ نہیں تھا۔ سب برابر تھے اور یہ عظمت انہیں اس شخص نے عطا کی تھی جو ہندوستان میں سب سے زیادہ محترم تھا۔

حاجت مندوں کی ضرورت کی تکمیل کیلئے حضرت سلطان الہندؒ نے کئی خدمت گاروں کو متعین فرما دیا تھا کوئی بازار سے اشیائے خوردنی لاتا اور کوئی کھانا پکانے کا انتظام کرتا۔ اس تمام خدمت گاروں میں ایک خصوصی خادم تھا جو حضرت خواجہؒ سے بہت زیادہ عقیدت رکھتا تھا۔ چیزوں کی خریداری کے

سلسلے میں یہی خادم دوسرے لوگوں کو رقم فراہم کرتا تھا۔

ایک دن اجمیر کے ایک مالدار شخص نے حضرت خواجہؒ کے خادم خاص سے کہا۔ "سنا ہے کہ شہنشاہ ہندوستان اور دیگر امراء خفیہ طور پر حضرت خواجہؒ کو قیمتی تحائف بھیجتے ہیں جس سے اتنے بڑے لنگر خانے کا خرچ چلتا ہے۔" کہنے والے نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور یہ خبر درست بھی ہوسکتی ہے کہ اس کے بغیر یہ سارے اخراجات کس طرح ممکن ہیں؟"

یہ ایک شدید جذباتی ضرب تھی جسے سلطان الہندؒ کا خادم برداشت نہ کرسکا۔ "ہندوستان کا شہنشاہ میرے سلطان کو کیا دے سکتا ہے؟ خود اس کی حکومت حضرت خواجہؒ کی دعاؤں کا صدقہ ہے۔" سلطان الہندؒ کے خادم کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا تھا اور وہ بڑی وارفتگی کے عالم میں بول رہا تھا۔ "میرے پیر و مرشد کو تو وہ غیب کے خزانوں سے دیتا ہے جو زمین و آسمان کا مالک ہے۔ اس کائنات کا حقیقی شہنشاہ ہے۔ میرے شیخ کے مُصلّے کے نیچے دولت کا سمندر اُبلتا ہے۔ ہندوستان کے تمام امیروں کا سرمایہ اس کے چند قطروں کے برابر بھی نہیں۔ یہ وہ دولت ہے جو اللہ نے حضرت خواجہؒ کو بطور انعام بخشی ہے۔ یہ ایسی پاک اور صاف ہے کہ تم اس کا ادراک بھی نہیں کرسکتے۔ دنیا میں جہاں جہاں سیم و زر کے ذخائر موجود ہیں ان میں سے بیشتر میں کسی نہ کسی طرح بندگان خدا کا خون شامل ہے مگر میرے مرشد کے خزانے کو اللہ نے نہ صرف اس عیب سے محفوظ رکھا ہے بلکہ وہ ایک عطائے خاص ہے جس کا ادراک اہل دنیا کو نہیں ہوسکتا۔" سلطان الہندؒ کے خادم نے جوش جذبات میں ایک ایسا راز فاش کردیا تھا جس سے اہل اجمیر آج تک بے خبر تھے۔

"تم ایک بار ہمیں وہ خزانہ دکھا دو۔" مالدار شخص نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "میں حضرت خواجہؒ کی اس کرامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"معاذ اللہ! کیا سلطان الہندؒ کی کرامت کوئی تماشا ہے؟" حضرت خواجہؒ کے خادم خاص کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ "پیر و مرشد میرے اس گناہ کو معاف کریں کہ میں اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا۔" یکایک خادم کی آواز لرزنے لگی اور وہ کانپتے قدموں سے واپس چلا گیا۔

پھر وہ اسی حالت میں سلطان الہندؒ کے حضور پہنچا اور حضرت خواجہؒ کے قدموں سے لپٹ کر گریہ وزاری کرنے لگا۔ "سیّدی! میں اپنے دل سے مجبور تھا مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوسکا کہ کوئی میرے آقا پر طعنہ زنی کرے، میرے جذبات نے مجھے ہلاک کر ڈالا۔ میں رازداری کے قابل نہیں ہوں۔ میرے اس گناہ عظیم کو معاف کردیجئے۔ اگر میں سلطان الہندؒ کی بارگاہ سے اُٹھ گیا تو پھر دنیا اور آخرت میں میرے لئے کوئی پناہ گاہ باقی نہیں رہے گی۔" خادم کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب جاری تھا۔

"درویش وہ ہے جو سمندر پی جائے مگر تم تو چند قطروں ہی میں چھلک گئے۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے خادم سے فرمارہے تھے۔ "وہ لوگ کچھ بھی کہتے رہتے مگر تمہیں لب کشائی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اللہ نے تمہارے مرشد پر یہ احسان عظیم کیا ہے کہ تم اپنی ضروریات زندگی میں کسی امیر وزیر کے محتاج نہیں۔ تم تو وہ ہو جنہیں اللہ بے سبب دیتا ہے۔"

خادم نے معافی مانگنے کیلئے دوبارہ زبان کھولنی چاہی مگر حضرت سلطان الہندؒ نے اس کے سر پر اپنا دست محبت رکھ دیا۔ "تم یقیناً رازداری کے قابل ہو مگر تمہیں اپنے پیر و مرشد کی محبت نے بے قرار کردیا تھا۔ نگاہِ عشق میں یہ سرمستی جائز ہے مگر وہ تو ایک امانت تھی جو تمہیں منتقل کی گئی تھی۔ امانت کا بوجھ اٹھانا ہر حال میں لازم ہے، چاہے اس سلسلے میں امین کو اپنی جان سے بھی گزر جانا پڑے۔ آئندہ احتیاط رکھو، کوئی دشنام ہی کیوں نہ دے، فقیر کو اس سے بے نیاز ہونا چاہئے۔"

اس واقعے کو مختلف تذکرہ نگاروں نے مختلف انداز سے بیان کیا ہے...... مگر اس اختلاف کے باوجود یہ روایت معتبر ہے اور اسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی کرامات کے ہجوم میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ نامور بزرگ حضرت شیخ الہدیہؒ نے اپنی مشہور تصنیف "سیر الاقطاب" میں اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مطبخ (لنگر خانے) میں اس قدر کھانا پکتا تھا کہ شہر کے تمام مساکین اور غرباء شکم سیر ہو کر کھاتے تھے۔ جس خادم کے ذمے یہ خدمت تھی وہ روزانہ خرچ کیلئے نقد رقم لینے حاضر ہوتا تو سلطان الہندؒ اپنے مصلے کا ایک کونا اٹھا دیتے اور بے شمار خزانہ ظاہر ہوجاتا۔ حضرت خواجہؒ اس خادم سے فرماتے کہ آج کی ضرورت کے مطابق رقم لے لو اور اسے بندگان خدا پر خرچ کر ڈالو۔ پھر خادم کا یہ معمول تھا کہ حاجت مندوں کی خوراک اور لباس پر جو رقم خرچ ہوتی، خادم حضرت سلطان الہندؒ کے مُصلّے کے نیچے سے لے لیتا۔ روزانہ یہ منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی تھیں۔ خادم کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ایک درویش کے قدموں کے نیچے دولت کا دریا بہہ رہا ہو۔ ایسا دریا کہ کثرت استعمال کے باوجود اس کے پانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔ بڑے بڑے دریا گرم موسم میں خشک ہوجاتے ہیں لیکن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی فتوحات میں ہمیشہ طغیانی رہتی تھی۔

یہ تاریخ ساز واقعہ سنانے کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اہلِ مجلس کی طرف دیکھا۔ حاضرین اپنی نشستوں پر ساکت و جامد بیٹھے تھے۔

"ہمیں بھی سلطان اور دیگر امراء نذر بھیجتے ہیں اور ہم ان سارے تحائف کو ضرورت مندوں میں تقسیم کردیتے ہیں۔" حضرت قطبؒ نے اپنی ذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "ہمارے دوسرے صوفی دوستوں کا بھی یہی طریقہ ہے۔ تحائف آتے ہیں اور محتاجوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں لیکن سلطان الہندؒ کی خانقاہ کا دستور سب سے جداگانہ ہے۔ حضرت خواجہؒ کسی شہنشاہ یا امیر کی نذر قبول نہیں کرتے مگر پھر بھی میرے مرشد کے روزانہ اخراجات سب سے زیادہ ہیں۔ ہم غرباء اور مساکین کی ضرورتیں پوری کرنے کیلئے اس انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ اہل ثروت نذر بھیجیں اور ہم بندگان خدا کی حاجت روائی کریں۔ اس سلسلے میں بھی اللہ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو ہندوستان کے تمام اولیاء میں فضیلت بخشی ہے۔ سلطان الہندؒ کسی اہل سرمایہ کی نذر کا انتظار نہیں کرتے۔ اللہ آپ کو اپنے دست غیب سے دیتا ہے اور بے حساب دیتا ہے۔ میں اپنے مرشد کی کن کن صفات کا ذکر کروں؟ اگر میں سلطان الہندؒ کی مکمل شخصیت کے بارے میں بیان کرنے لگوں تو اس کارِ عظیم میں تمام

زندگی ختم ہو جائے گی۔ پھر بھی مجھ سے آفتاب چشتیہ کی تعریف کا حق ادا نہیں ہو سکے گا......اور تم لوگ جن کے ذہن و دل پر قدرت نے اپنا کوئی راز منکشف نہیں کیا ہے، میری باتوں کو سمجھ بھی نہیں سکو گے بس اتنا سمجھ لو کہ سلطان الہندؒ کے قدموں سے جو غبار اٹھتا ہے، اگر اس کا ایک ذرہ بھی کسی کے لباس پر پڑ جائے تو اس کی ساری کثافتیں دور ہو جائیں گی۔"

ان واقعات کو مسلسل بیان کرنے سے مخالف گروہوں پر عجیب ردعمل ظاہر ہوا۔ علماء ظاہری نے اپنی تقریروں میں سلطان الہندؒ کی شخصیت کو داغدار کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ بری طرح ناکام ہو گئی تھی۔ درباری علماء تو اپنے خول سے باہر نہیں نکلے۔ وہ اسی طرح حضرت خواجہؒ کی ذات مبارک کو تنقید کا نشانہ بناتے رہے...... مگر ان کے ماننے والوں کی ایک کثیر تعداد اپنے گناہوں سے تائب ہو گئی۔ وہ لوگ جو کل تک حضرت سلطان الہندؒ کے صوفیانہ عمل میں عیب تلاش کرتے پھرتے تھے، آج ان کی یہ حالت تھی کہ وہ سر جھکائے ہوئے حضرت قطبؒ کی خانقاہ کی طرف جا رہے تھے......اور پھر اہل شہر نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ بیشتر نکتہ چیں، حضرت قطبؒ کے قدموں سے لپٹے ہوئے معافی طلب کر رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی درخواست کر رہے تھے کہ انہیں بھی سلسلۂ چشتیہ میں بیعت کر لیا جائے۔ یہ ایسا ہی تھا کہ جیسے کوئی شخص کسی کو ہلاک کرنے کے ارادے سے اس کے گھر جائے مگر جب واپس آئے تو قتل کرنے کے بجائے اس کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لے۔ یہ حضرت سلطان الہندؒ کی ایک اور بڑی کرامت تھی۔ اگرچہ کئی روز پہلے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر روانہ ہو چکے تھے لیکن اس طویل فاصلے کے باوجود لوگوں کے دلوں پر آپ کا ہیبت و جلال طاری تھا...... اور اسی جلال معرفت نے دلوں کا زنگ دھو کر انہیں صاف و شفاف کر دیا تھا۔ جن کی زبانیں سلطان الہندؒ کی برائی کرتے نہیں تھکتی تھیں، اب وہی لوگ بلند آواز میں یہ منقبت پڑھ رہے تھے۔

خواجۂ خواجگاں معین الدین

☆☆..............☆☆..............☆☆

ایک دوسری مجلس میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے حضرت سلطان الہندؒ کی ایک اور کرامت بیان فرمائی۔

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب پرتھوی راج چوہان کو شکست ہو گئی تھی اور اجمیر و دہلی پر مسلمانوں کو مکمل غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ حالات پُرسکون تھے اور بے شمار کافر حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے تھے لیکن پھر بھی ہندو راجپوتوں کی ایک کثیر تعداد تھی جو اب بھی اپنے آبائی مذہب پر سختی سے قائم تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ مسلسل اہل ہنود کو اسلام کا پیغام سنا رہے تھے۔ دین حق میں کوئی جبر نہیں ہے۔ اس لئے سلطان الہندؒ نے تلوار کے بجائے اپنے حسین عمل کا سہارا لیا اور غیر مسلموں کے سفینۂ حیات کو اسلام کے ساحل کی طرف موڑنے کی کوشش کرتے رہے۔

ایک دن حضرت خواجہؒ اپنے مریدوں اور مقامی عقیدت مندوں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ آپ کے سامنے سے ایک دولت مند ہندو گزرا۔ یہ شخص نسلاً راجپوت تھا۔ چلتے وقت اس کے قدم لڑکھڑا

رہے تھے۔ اگرچہ حضرت خواجہؒ اور اس کے درمیان کافی فاصلہ تھا لیکن وہ جاتے جاتے اچانک رک گیا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک سر جھکائے کھڑا رہا۔ عام لوگ تو اس کی اس حرکت کو نشے کے اثرات سے تعبیر کر رہے تھے مگر کچھ اہل نظر سمجھ گئے تھے کہ وہ حضرت سلطان الہندؒ کے سامنے ادب و احترام کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ پھر یکایک وہ سیدھا ہوا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"خواجہؒ! اس گناہ گار کا سلام قبول کرو۔ تمہارے قریب آنا چاہتا ہوں مگر اپنی بداعمالی سے شرم آتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اسے جاتا دیکھ کر حضرت سلطان الہندؒ نے اپنے حلقے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے فرمایا۔ "اس شخص کو غور سے دیکھ لو۔ اللہ کا دوست جا رہا ہے۔"

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے الفاظ سن کر تمام لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

حاضرین میں سے اکثر افراد جانتے تھے کہ سلطان الہندؒ نے جس کافر راجپوت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ذاتی طور پر ایک نہایت بدکردار انسان ہے۔ دولت مند ہونے کے باعث کئی خرابیاں اس کی فطرت میں شامل ہو گئی تھیں۔ وہ دن رات شراب کے نشے میں غرق رہتا تھا۔ راتوں کو رقص و سرور کی محفلیں سجاتا تھا اور پھر شب کی تاریکی میں دوسرے ہنگامے برپا رہتے تھے۔ یہاں تک کہ صبح کے وقت تھک کر سو جاتا تھا۔ اس کی زندگی کے معمولات دیکھ کر کوئی ایک شخص بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ انسان کہلانے کا مستحق ہے...... مگر جب حضرت سلطان الہندؒ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ "اللہ کا دوست جا رہا ہے۔" تو سننے والے حیران رہ گئے۔ کچھ لوگ حضرت خواجہؒ کو اس آدمی کی حقیقت بتانا چاہتے تھے لیکن ادب کے پیش نظر لب کشائی کی جرأت نہ کر سکے۔

کچھ دن بعد پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ وہ ہندو راجپوت اسی طرح لڑکھڑاتے قدموں سے آیا۔ کچھ دیر تک کسی غلام کے مانند سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر اسی انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "خواجہؒ! میرا سلام قبول کرو۔ میں اِدھر سے گزرنا نہیں چاہتا مگر نہ جانے کون میرے ناپاک قدموں کو تمہارے مقدس دربار کی طرف موڑ دیتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ حسب سابق جھومتا ہوا چلا گیا۔

حضرت سلطان الہندؒ نے اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو مخاطب کرتے ہوئے دوبارہ فرمایا۔ "اس شخص کو غور سے دیکھ لو۔ اللہ کا دوست جا رہا ہے۔ وہ بڑا صاحب نعمت ہے۔"

حاضرین پھر حیرت میں ڈوب گئے۔ اب کی بار حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس شرابی اور بدکار انسان کو "ولی" کے ساتھ "صاحب نعمت" بھی کہا تھا۔ کچھ لوگوں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی کہ سلطان الہندؒ کو اس شخص کے کردار کے متعلق بتائیں مگر حضرت خواجہؒ کے جلال معرفت کے آگے ان کی زبانیں گنگ تھیں۔

پھر تیسری بار یہی واقعہ پیش آیا۔ ہندو راجپوت نے اسی انداز میں سلام کیا اور بڑے دردناک لہجے میں کہنے لگا۔ "خواجہؒ! پھر مجھے یہاں کوئی کھینچ لایا۔ میں اپنی روسیاہی کو کدھر لے جاؤں؟" یہ کہہ کر وہ حسب دستور چلا گیا۔

عجیب شخص تھا۔ حاضرین منتظر تھے کہ سلطان الہندؒ پھر اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ فرمائیں آخر وہی ہوا حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اسی محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''لوگوں کو کتنا ہی گزرے مگر میں یہی کہتا رہوں گا کہ وہ اللہ کا دوست ہے۔ اگر وہ دن میں ہزار بار بھی ادھر آئے میں ہر مرتبہ اسے صاحب نعمت کہہ کر پکاروں گا۔'' یہ در پردہ ان لوگوں کی طرف اشارہ تھا جو سلطان الہندؒ کے فرمودات کو اس شخص کے کردار کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

آخر ایک شخص برسر مجلس کھڑا ہوا اور دست بستہ عرض کرنے لگا۔ ''سیدی! آپ بہتر جانتے ہیں ہمارے پراگندہ ذہن مستقل شکوک وشبہات کا شکار ہیں۔ جس شخص کو آپ نے اللہ کا دوست کہہ کر پکارا ہے، وہ بلانوش شرابی ہے۔ دن رات اُم الخبائث کے نشے میں ڈوبا رہتا ہے۔''

''ہاں! وہ شرابی ہے۔'' حضرت سلطان الہندؒ نے نہایت تحمل سے فرمایا۔ ''اس میں کی بلانوشی سے باخبر ہوں مگر تم اللہ کی شان کرم سے واقف نہیں۔''

''وہ رقص وسرور کا رسیا ہے، بت پرست ہے، ہوس کار ہے۔'' وہ شخص عقل کی روشنی میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے گفتگو کر رہا تھا۔

''مجھے یہ بھی پتا ہے۔'' حضرت سلطان الہندؒ کے ہونٹوں پر وہی دلنواز تبسم اُبھر آیا جو آپ کی شخصیت کی عادت بن چکا تھا۔ ''بے شک! وہ بندۂ ہوس ہے مگر اللہ ہر شے سے بے نیاز ہے۔ جب وہ کسی کو نوازتا ہے تو بے سبب دیتا ہے۔ عنقریب اللہ اس پر اپنے کرم کی بارش اس طرح کرے گا کہ لوگوں کا ہجوم اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔''

لوگ بظاہر خاموش ہو گئے لیکن کچھ بدگمانوں کے دلوں میں اب بھی شکوک وشبہات پرورش پا رہے تھے۔ ان کے پریشان ذہنوں میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ایک معصیت آلود انسان کس طرح اللہ کی دوستی کے درجے تک پہنچ سکتا ہے؟ پھر کچھ لوگوں نے رازداری کے ساتھ اس ہندو راجپوت کے مشاغل جاننے کی کوشش کی تو عجیب وغریب انکشاف ہوئے۔ اس مالدار شخص کے ماں باپ مر چکے تھے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ سرمائے کی کثرت اور تنہائی کی شدت نے اسے شرابی بنا دیا...... اور پھر شراب اسے رقص وسرور کی محفلوں تک لے گئی۔ بوڑھے ملازم نے ان لوگوں کو بتایا کہ وہ نصف شب تک خوبصورت عورتوں کے رقص سے دل بہلاتا ہے۔ پھر ان سب کو نفرت وحقارت کے ساتھ اپنے کمرے سے باہر نکال دیتا ہے۔ اس کے بعد پھر شراب پیتا ہے اور عالم بے خودی میں اس وقت تک چیختا رہتا ہے جب تک کہ بے جان ہو کر نہیں گر جاتا۔

''میں کدھر جاؤں؟ میری منزل کہاں ہے؟''

سننے والے حیران رہ گئے۔ ملازم نے بتایا کہ جب تک وہ ہوش میں رہتا ہے کسی سے کوئی بات نہیں کرتا...... مگر جیسے ہی اس کے اعصاب پر شدید خمار کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو بڑے دردناک لہجے میں چیخنے لگتا ہے۔ ''میری منزل کہاں ہے؟ میں کدھر جاؤں؟''

پھر ایک دن اسے منزل بھی مل گئی۔ وہ سر جھکائے ہوئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خانقاہ میں داخل ہو رہا تھا۔ آج خلاف معمول اس کے قدموں میں ہلکی سی لرزش بھی نہیں تھی۔ تمام لوگ حیرت میں مبتلا تھے۔ ہندو راجپوت نے اپنا دستور بدل ڈالا تھا۔ ہر شخص کی نظریں اس سیاہ کار شرابی پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک اہلِ مجلس نے سلطان الہندؒ کی آواز سنی۔

''دیکھو! اللہ کا دوست آ رہا ہے۔''

پھر وہ راجپوت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔ ''شاہا! تیرے سوا اس غلام کی کوئی منزل نہیں ہے۔ میں نے تیری مملکت کی حدود سے نکل جانا چاہا مگر جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ہر مقام تیری رہ گزر میں ہے۔ میرے شب وروز پر، میرے ہوش وحواس پر یہاں تک کہ میرے خوابوں پر بھی تیرا قبضہ ہے۔ میں تیرے در کے سوا کہیں نہیں جا سکتا مجھے اپنے گھر کی دربانی بخش دے کہ یہی میرا شرف ہے۔ میرے سر کو اپنے قدموں سے پامال کر دے کہ یہی میری کلاہ خسروی ہے، یہی میرا تاج شاہی ہے۔'' اس کی آواز اتنی رقت آمیز تھی کہ اہل مجلس بھی رو پڑے۔

''اے جان بے قرار! تجھے خوشخبری ہو کہ تو اللہ کے دوستوں میں شامل ہے۔'' حضرت سلطان الہندؒ نے ہندو راجپوت کو اپنے قدموں سے اُٹھا کر گلے سے لگا لیا اور فضاؤں میں وہی کلمہ گونجنے لگا جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

پھر شراب کے برتن توڑ دیئے گئے، رقص وسرور کی محفلیں اجاڑ دی گئیں اور اس شخص نے یہ کہہ کر اپنا سارا سرمایہ بندگان خدا کے درمیان لٹا دیا کہ سلطان الہندؒ کے در کی گدائی میرے لئے کافی ہے۔

ہندو راجپوت کے قبول اسلام نے پورے اجمیر میں ہلچل مچا دی تھی۔ خود حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے تمام مرید اور عقیدت مند حیران تھے۔ حضرت سلطان الہندؒ کی پیش گوئی کا ایک حصہ درست ثابت ہو چکا تھا اب لوگوں کو اس بات کا انتظار تھا کہ حضرت خواجہؒ کے باقی فرمودات عالم اسباب میں کس طرح ظہور پذیر ہوتے ہیں؟ یعنی وہ نومسلم کس طرح ولایت کے درجے تک پہنچتا ہے اور کس انداز میں صاحب نعمت کے منصب پر جلوہ افروز ہوتا ہے؟

ہندو راجپوت ایمان لایا تو کلمۂ طیبہ کا ایک ایک حرف اس کی زبان اور دل سے گزر کر روح میں اُتر گیا۔ حضرت سلطان الہندؒ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو درس دیتے تو وہ اس طرح باادب ہو کر بیٹھتا جیسے پتھر کا کوئی ستون ہے۔ اپنے پیر ومرشد کے ارشادات کو اس طرح سنتا جیسے دنیا میں کوئی دوسری بات سماعت کے قابل ہی نہیں ہے۔

سبھی کو تھے ملحوظ آداب محفل
مگر ہم نے تیرے اشاروں کو دیکھا

اس کی کیفیت اس عاشق جاں سوختہ کی تھی جو اپنی زندگی بارگاہ جاناں کیلئے وقف کر چکا ہو۔ وہ ہمیشہ حضرت سلطان الہندؒ کی جنبش چشم کو دیکھتا۔ اس شدت احساس نے نومسلم راجپوت کو عقیدت و

محبت کی ایک ایسی منزل تک پہنچا دیا تھا جو اکثر انسانوں کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ وہ سلطان الہندؒ کے خدمت گاروں کا بھی اس قدر احترام کرتا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔ انتہا یہ ہے کہ وہ ان کی باتوں کو بھی حکم کا درجہ دیتا۔ اگر وہ لوگ اس سے کسی کام کا کہہ دیتے تو ہنسی خوشی انجام دیتا۔ خانقاہ کا کوئی دوسرا خدمت گار اسے ٹوکتا تو وہ بے اختیار کہہ اُٹھتا۔

”میرے پیر و مرشد کا ایک ایک خادم میری نظر میں مخدوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے لئے خانقاہ میں آنے والا ایک ایک فرد محترم ہے۔ اس کوچے کا ایک ایک ذرہ آفتاب ہے جس نے میری سیاہ راتوں کو روشن کیا۔“

جب سلطان الہندؒ کے روبرو کوئی شخص نومسلم راجپوت کی باتیں بیان کرتا تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بڑی محبت سے فرماتے۔ ”تم نے دیکھ لیا کہ عشق کیا ہوتا ہے؟ بے شک! وہ عاشق جانباز ہے اور یہی عشق اسے ایک دن اللہ کا دوست بنا دے گا۔“

جب ساری دنیا سو جاتی تھی تو وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حضور ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا۔

”آخر تمہاری جان پر بھی تمہارا حق ہے۔“ حضرت سلطان الہندؒ فرماتے۔

”شاہا! میرے گناہ گار پیروں کا حق یہ ہے کہ وہ سلطان الہندؒ کی بارگاہ میں کھڑے رہیں۔ آنکھوں کا حق یہ ہے کہ وہ سلطان معرفت کے چہرے کو دیکھتے دیکھتے پتھرا جائیں...... اور جان بے قرار کا حق یہ ہے کہ غلام اپنے شاہ کے قدموں پر جان دے دے۔“ یہ کہتے کہتے شدت گریہ سے نومسلم راجپوت کی آواز ڈوبنے لگی۔

حضرت خواجہؒ کا دست کرم بلند ہوا۔ نومسلم راجپوت آگے بڑھ کر سلطان الہندؒ کے قدموں سے لپٹ گیا۔

نصف شب کا عالم تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے دونوں ہاتھ دراز کر دیئے۔ وہ اپنے خادم کیلئے خداوند ذوالجلال سے سلامتی مانگ رہے تھے۔ ”اے خلاق عالم! تیرا یہ گناہ گار بندہ اپنے واجداد کی مشرکانہ روایتوں کو چھوڑ کر کوچۂ وحدانیت کی طرف آیا ہے۔ اس کے مضطرب قدموں کو راہ میں جما دے، اس کے ڈوبتے ہوئے دل کو اپنے دست قدرت سے تھام لے، اس کے دل و دامان کو کشادہ کر دے اور اس کے گناہوں کو معاف کر دے۔“

پھر یوں ہوا کہ نومسلم راجپوت جو کل تک پتھروں کا پجاری تھا اور خود بھی پتھر تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی دعاؤں سے اکسیر بن گیا۔ جس پتھر کو چھو لیتا اسے سونا بنا دیتا۔ اہل اجمیر نے اپنی آنکھوں سے ایک بت پرست سیاہ کار کو ”ولی“ اور ”صاحب نعمت“ ہوتے ہوئے دیکھا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے حضرت سلطان الہندؒ کی یہ کرامت بیان فرمائی تو مخالفین کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

پھر مخالفین میں سے ایک شخص نے اپنی نشست سے اُٹھ کر کہا۔ ”شیخ محترم! ہمیں معلوم ہے کہ

سلطان الہندؒ اس دنیا میں آپ کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ آپ ہمارے حق میں دعا فرمائیے کہ ہم نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ذات گرامی کے متعلق اپنے ذہنوں میں جن بدگمانیوں کو پرورش کیا ہے، خدا انہیں معاف فرما دے۔ ہم اپنے طور پر تو تائب ہو چکے مگر یہ گناہ براہِ راست خدا کی نافرمانی نہیں۔ ہم نے خدا کے ایک دوست کی دل آزاری کی ہے۔ جب تک وہی مرد بزرگ ہمارے اس گناہ کو معاف نہیں کرے گا، اس وقت تک اللہ کی بارگاہ میں ہماری دعاؤں کی کوئی حیثیت نہیں۔ خدا کیلئے ہمارے سکون قلب کی خاطر آپ دعا فرمائیے۔“ کہنے والے کی آواز لرز رہی تھی اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”لوگو! یہ تمہارا حسن ظن ہے۔“ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اس شخص کی بات سن کر فرمایا۔ ”میرے لئے یہی شرف کافی ہے کہ میں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سلطان الہندؒ کا خادم ہی کہلاؤں۔ یہ تو حضرت خواجہؒ کی چشم کرم ہے جو خادموں کے ساتھ بھی دوستوں جیسا سلوک کرتی ہے۔ اگر تمہارے دل اسی طرح قرار پاتے ہیں تو میں دعا کیلئے ہاتھ اُٹھاتا ہوں۔ تم بھی اپنے دامن پھیلا دو کہ اللہ تمہارے اندازوں سے زیادہ دینے والا ہے۔“

عجیب جاں گداز منظر تھا۔ حضرت قطب کی رقت انگیز آواز سے فضائیں تک نم آلود ہو گئی تھیں۔

”اے مالک ارض و سما! اس کائنات میں وہ کون ہے جو تیرے جلال کے روبرو ہو سکے۔ مخلوق پر تیرا یہ احسان عظیم ہے کہ تیرے بے پناہ فضل و کرم نے ہر شے کو محیط کر لیا۔ ہم گناہ گار بھی تیرے کرم ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ اگر گناہوں کے صحرا میں ہمارے سروں پر تیری رحمت کا ابر سایہ فگن نہ ہو تو یہ ناتواں جسم جل کر خاکستر ہو جائیں۔ ہم اس زمین پر بے اماں تھے، تو نے ہمیں اپنے کرم کا سائبان بخشا۔ ہم گم کردہ راہ تھے، تو نے ہمیں منزل کا نشان دیا۔ ہمارے دل وسوسوں اور اندیشوں کی آماجگاہ تھے، تو نے ہمیں سرمایۂ ایمان دیا۔ ہم اس وطن میں بے وطن تھے مگر تو نے ہجرت رسول ﷺ کے صدقے میں دنیا کے ہر خطۂ زمین کو ہمارا وطن بنا دیا۔ تو نے اجمیر و دہلی کی سنگلاخ بستیوں سے چشمۂ ہدایت جاری کیا۔ تو نے اپنی لامحدود نوازشات سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو سلطان الہندؒ بنا دیا۔ پھر تو نے ہمیں سلطان الہندؒ کی رعایا ہونے کا شرف بخشا۔ آج اسی رعایا کے کچھ لوگ جو راستہ بھول گئے تھے، اپنی منزل کی طرف لوٹنے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کے مضطرب قدموں کو استقامت بخش دے۔ یہ سلطان الہندؒ کے گناہ گار ہیں، سلطان الہندؒ ہی کے صدقے میں تو انہیں معاف فرما دے۔“ پھر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر اس قدر رقت طاری ہو گئی کہ آپ کی زبان مبارک سے مزید الفاظ ادا نہ ہو سکے...... اور اہل مجلس کا تو یہ حال تھا کہ شور گریہ سے ایک حشر سا برپا تھا۔ حضرت قطبؒ کی خانقاہ پر کسی ماتم کدے کا گمان ہوتا تھا۔ در و دیوار تک آہ و زاری کرتے محسوس ہو رہے تھے۔

پھر حاضرین مجلس نے ایک عجیب و غریب بات محسوس کی۔ حضرت قطبؒ کی خانقاہ میں ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کی خوشبو سلگتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی عود و عنبر سے پوری مجلس مہکی ہوئی تھی۔ لوگ اس خوشبو

سے آشنا تھے مگر اچانک حاضرین نے محسوس کیا کہ ایک نئی خوشبو نے پوری خانقاہ کا احاطہ کر لیا ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو اس خوشبو میں نہایا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ سمجھنے والوں نے سمجھ لیا کہ یہ نئی خوشبو قدرت کی ایک نشانی ہے جو حضرت قطبؒ کی قبولیت کی دعا کا مظہر ہے۔ پھر مضطرب جذبوں کو طمانیت حاصل ہوگئی اور بے قرار دل سکون پا گئے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

اہلِ دل بظاہر مطمئن ہوگئے تھے مگر اُنہیں کیا معلوم تھا کہ ایک اور قیامت ان کی منتظر ہے۔ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ جانے والا اس طرح چلا جائے گا۔ شہر دہلی جو صرف اس کے دم سے آباد تھا اچانک مقبرہ بن جائے گا کسی شخص کو گمان بھی نہیں تھا کہ دہلی کے باشندوں سے یہ حضرت قطبؒ کی آخری ملاقات ہے۔ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ آخری بار دہلی سے اجمیر روانہ ہوئے تھے اس وقت حضرت قطبؒ کی عمر پچاس سال تھی۔ آج سے آٹھ سو سال پہلے عام انسانی زندگی کا اوسط نوے اور سو سال کے درمیان تھا۔ اس اعتبار سے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو جوان کہا جا سکتا تھا ......مگر زندگی اور موت کے سلسلے میں قدرت کا اپنا ایک نظام ہے۔ آگے جانے والے پیچھے رہ جاتے ہیں اور بعد میں آنے والے بہت پہلے منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ حضرت قطبؒ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ آپ ظاہری اعتبار سے مکمل طور پر صحت مند نظر آتے تھے لیکن کسے معلوم تھا کہ زندگی کی آگ کے گرد گہرا دھواں پوشیدہ ہے اور اس توانائی کے پس پردہ ایسی ناتوانی موجود ہے کہ انسان اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا۔

12 ربیع الاول 633ھ کی رات کا واقعہ ہے کہ شیخ علی سجستانیؒ کی خانقاہ میں محفل سماع منعقد تھی۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی اس محفل عرفان میں موجود تھے۔ ایک بزرگ قوال جو خود بھی نہایت پرہیزگار انسان تھا، حضرت شیخ احمد جامؒ کا قصیدہ پڑھ رہا تھا۔ اس محفل سماع میں حضرت قطبؒ کے علاوہ دہلی کے دیگر مشائخ بھی موجود تھے۔ ایک تو حضرت شیخ احمد جامؒ جیسے عظیم صوفی شاعر کا عارفانہ کلام، دوسرے پڑھنے والے کی پُرسوز آواز۔ غرض اہل مجلس کا عجیب حال تھا۔ دل پھٹے جا رہے تھے اور جانیں حرف و آہنگ کی جراحت سے ناقابل بیان اضطراب میں مبتلا تھیں بس کچھ ایسی ہی کیفیت تھی جیسی حضرت امیر خسروؒ نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے ؎

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بہت دیر سے شیخ احمد جامؒ کا طویل قصیدہ سن رہے تھے اور ایک شعر سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر جب قوال نے یہ شعر پڑھا تو بے اختیار ہوگئے عشق کی تمام احتیاطیں ختم ہوگئیں اور تکلفات کی ساری حدیں ٹوٹ گئیں ؎

کشتگان خنجر تسلیم را !
ہر زماں از غیب جان دیگر است

(جو لوگ تسلیم و رضا کے خنجر سے قتل ہوئے ہیں انہیں ہر زمانے میں غیب سے نئی زندگی دی جاتی ہے)

محفلِ سماع میں موجود دوسرے بزرگوں نے بھی یہ شعر سنا لیکن حضرت قطبؒ کی طرح کوئی اس کی گہرائی اور اثر آفرینی کو نہیں پہنچ سکا۔ بقول علامہ اقبال ؎

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکساں
ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ شیخ احمد جامؒ کے اس شعر سے اتنے متاثر ہوئے کہ آپ پر وجد طاری ہوگیا اور پھر سر محفل ماہئ بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ اس سے پہلے بھی سماع کے دوران حضرت قطبؒ کی حالت غیر ہو جاتی تھی مگر اس بار تو رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی شخص مقتل کی زمین پر لیٹا ہوا ہے اور اسے کسی تیز خنجر سے ذبح کیا جا رہا ہے۔ جب دوسرے مشائخ نے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا یہ حال دیکھا تو قوّال کو اشارہ کر دیا کہ وہ اسی شعر کو بار بار پڑھتا رہے۔ ان بزرگوں کا خیال تھا کہ جب کسی شعر سے انسانی قلب پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو اس کو بار بار دُہرانے سے ایک مقام وہ آ جاتا ہے کہ ناآسودہ جذبے سکون پانے لگتے ہیں اور مضطرب دل کو آہستہ آہستہ قرار مل جاتا ہے ......مگر یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی جیسے جیسے قوّال کی آواز بلند ہوتی جاتی تھی، حضرت قطبؒ کے اضطراب میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ایک ناقابل فہم اذیت سے دوچار تھے۔ ایسی اذیت جو کم ہونے کے بجائے لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ اور مولانا بدر الدین غزنویؒ، حضرت قطبؒ کو شیخ علی سجستانیؒ کی خانقاہ سے اُٹھا کر ان کے گھر لے گئے۔

رات بھر حضرت قطبؒ کی یہی کیفیت رہی مگر جب موذن نے فجر کی اذان دی تو حیرت انگیز طور پر حضرت قطبؒ کو ہوش آ گیا۔ آپ نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ نماز ادا کی۔ تمام مشائخ، مرید اور عقیدت مند سمجھے کہ جذب کی وہ حالت ختم ہوگئی ہے اور اب حضرت قطبؒ مکمل طور پر پُرسکون ہیں ......لیکن اس وقت سب لوگ حیران رہ گئے جب نماز فجر ادا کرتے ہی دوبارہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر بے خودی کی وہی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس حالت جذب سے پہلے حضرت قطبؒ نے شیخ احمد جامؒ کا وہی شعر پڑھا تھا اور پھر آپ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ قاضی حمید الدین ناگوریؒ جو آپ کے دوست تھے اور مولانا بدر الدین غزنویؒ جو آپ کے مشہور خلفاء میں سے تھے، حضرت قطبؒ کی اس کیفیت سے سخت مضطرب تھے۔ پھر ظہر کی نماز کا وقت آیا تو حیرت انگیز طور پر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ہوش میں آ گئے۔ آپ نے باقاعدہ وضو کیا اور نہایت خضوع و خشوع سے نماز ادا کی۔ اس بار بھی خانقاہ میں موجود لوگوں نے یہی سوچا تھا کہ حضرت قطبؒ کی کیفیت جذب ختم ہو چکی ہے ......مگر نماز ادا کرتے ہی قلب مضطرب کا وہی عالم ہوگیا۔ ذہن بیدار نے ایک بار پھر ہوش کی دنیا

سے تمام رشتے توڑ لئے۔

حضرت قطبؒ کا یہ عرصۂ ہوش و بے خودی تین دن اور تین راتوں پر محیط تھا۔ اس دوران آپ نے ساری نمازیں ادا کیں۔ یہ اس امر کی روشن دلیل ہے کہ دنیا کا کوئی بھی باہوش بزرگ کسی بھی حال میں نماز ترک نہیں کرسکتا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بلاشبہ ان صوفیائے کرام میں سے تھے جو سانس تک فرض و سنت کی تکمیل کیلئے پوری قوت کے ساتھ جدوجہد کرتے رہے۔ بالآخر 14 ربیع الاول کو آپ ہوش میں آئے اور اپنے ایمان کی گواہی دی۔

"اے اللہ! تو علیم و خبیر بھی ہے اور بصیر بھی کہ میں نے تیرے سوا کسی کی پرستش نہیں کی۔ تو جانتا ہے کہ میں تیرا بندۂ حقیر ہوں اور تیرے حبیب رسالت مآب ﷺ کا ادنیٰ ترین غلام۔ یہی نسبت میرا سرمایۂ آخرت ہے۔ اسی نسبت کے صدقے میں قطب الدین کے گناہوں کو بخش دے کہ تیری رحمت عالم پناہ ہے۔" یہ کہتے کہتے حضرت قطبؒ دنیا سے رخصت ہوگئے۔

دہلی ہندوستان کا ایک تاریخی شہر ہے جو کئی بار اُجڑا ہے اور کئی بار آباد ہوا۔ اس زمین نے بڑے بڑے مہاراجوں، سلطانوں اور شہنشاہوں کا دور دیکھا ہے...... اپنے سینے پر نادر روزگار عمارتوں کا بوجھ برداشت کیا ہے...... مگر آج اس کا حقیقی معمار اپنے کام کی تکمیل کرکے بہت دور جاچکا تھا۔ دیوار و در اُداس تھے، گلی کوچوں میں وحشت برس رہی تھی اور مکانوں سے شور و فغاں کی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔ ٹھکرائے ہوئے انسانوں کا پُرسان حال، حاجت مندوں کا کفیل اور بیماروں کا مسیحا اپنے آخری سفر پر روانہ ہوچکا تھا۔

کسی نے پکار کر کہا۔ "اے خاکِ دلی! قطب کا ماتم کر! اب کے تو ایسی اُجڑی ہے کہ پھر اس شان کا بسانے والا کوئی دوسرا نہیں آئے گا۔"

بے شک! یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دہلی کی خاک میں بڑے بڑے صوفی، قلندر اور درویش محو خواب ہیں مگر ان میں کوئی بھی حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے درجے کو نہیں پہنچتا۔

633ھ کا سال ہندوستانی مسلمانوں کیلئے بڑا گراں ثابت ہوا تھا۔ (اسی سال درویش منش حکمراں سلطان شمس الدین التمش بھی اپنے خالق حقیقی سے جاملا) حضرت قطبؒ کی موت سے صرف اہلِ ایمان ہی دل گرفتہ نہ تھے، اہلِ ہنود بھی اسی طرح اداس نظر آتے تھے جیسے ان کا کوئی قریبی عزیز بچھڑ گیا ہو۔ جس طرف بھی نظر جاتی تھی نظام روز و شب درہم برہم نظر آتا تھا۔ بس وہ درباری "علماء" خوش تھے جنہوں نے دنیاوی جاہ و حشم کے بدلے اپنی آخرت فروخت کردی تھی۔

☆☆......☆☆......☆☆

حضرت قطبؒ کے انتقال کے بعد سلطان الہندؒ بہت زیادہ اُداس رہنے لگے تھے مگر آپ نے اپنے اس غم کو دوسرے لوگوں پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ زندگی کے تمام معمولات پُرسکون انداز میں جاری رہتے تھے مگر جب آپ خلوت میں جاتے تھے تو حضرت قطبؒ کو یاد کرکے بے قرار ہوجاتے تھے۔ بعض خدمت گاروں نے آپ کو تنہائی میں روتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ یہ ایک ولی کا دوسرے ولی سے

تعلق خاص تھا جو اکثر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو اس طرح رُلایا کرتا تھا کہ عام لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔

پانچ ماہ تک حضرت سلطان الہندؒ کی یہی کیفیت رہی۔ آپ نے اپنے تمام فرائض بحسن و خوبی انجام دیئے۔ آخر 6/رجب 633ھ کا سورج طلوع ہوا۔ اہلِ اجمیر سمجھ رہے تھے کہ آج آسمان بہت زیادہ صاف اور نیلا ہے، دھوپ بھی تیز اور روشن ہے...... مگر اُنہیں کیا معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد اسی نیلے آسمان پر گہری دُھند چھا جائے گی اور سورج کی تیز کرنیں سیاہی کی قبا پہن لیں گی۔ پورا دن حسب معمول گزرا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے تمام نمازیں باجماعت ادا کیں۔ مجلسِ درس آراستہ ہوئی اور تمام مریدوں کو اسلام کے ارکان پر سختی سے عمل کرنے کی ہدایت کی۔ حضرت سلطان الہندؒ کا یہ عمل بھی حسب دستور تھا مگر درس کے دوران ایک بات خاص طور پر نمایاں تھی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بار بار ایک ہی بات پر زور دیتے تھے۔

"خواب ہستی بہت مختصر ہے۔ انسان کو ہر وقت اس کیلئے تیار رہنا چاہئے کہ زندگی کا یہ طلسم ٹوٹ جائے گا اور بندے کو اس حقیقت ازلی کا سامنا کرنا پڑے گا جس کا اس سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔"

حاضرین مجلس سلطان الہندؒ کی اس نصیحت کو بھی عام درس کا ایک حصہ سمجھ رہے تھے مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ آج حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ کسی اور ہی سانحے کی طرف اشارہ کررہا ہے۔

آخر سورج غروب ہوگیا۔ حضرت سلطان الہندؒ نے مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کیں۔ پھر اپنے حجرے میں تشریف لے گئے اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ حضرت خواجہؒ کا یہ عمل بھی حسب سابق تھا۔ خدمت گاروں کو یہ احساس تک نہیں ہوا کہ آج رات کیسا اندوہناک واقعہ پیش آنے والا ہے۔ تمام مرید و عقیدت منداپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور کچھ لوگ سونے کی تیاریاں کررہے تھے۔ اچانک حاضرین کو حضرت خواجہؒ کی خلوت خاص سے ایک بارعب صدا بلند ہوتی محسوس ہوئی۔ تمام لوگ ہمہ تن گوش ہوگئے۔ جو لوگ سلطان الہندؒ کے حجرے سے دور تھے وہ بھی اس آواز کو سن کر قریب آگئے۔ اگرچہ حضرت خواجہؒ گزشتہ پچاس سال سے رات بھر ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے لیکن اس طرح کہ آپ کا قلب جاری رہتا تھا اور زبان مکمل طور پر ساکت رہتی تھی۔ یا کبھی بہت زیادہ پُرجوش ہوئے تو ہلکی ہلکی آواز اُبھرنے لگتی تھی۔ وہ بھی اس انداز میں کہ جو خدمت گار حجرے کے دروازے پر کھڑا ہوتا تھا وہی اس آواز کو سن سکتا تھا۔ باقی لوگ جو کچھ فاصلے پر موجود ہوتے تھے انہیں پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ سلطان الہندؒ کس طرح ذکر کرتے ہیں؟ لیکن آج نصف صدی کے معمول میں اتنا نمایاں فرق آگیا تھا کہ خانقاہ میں موجود تمام لوگ اپنی اپنی جگہ چونک اُٹھے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بلند آواز میں ذکر الٰہی کررہے تھے۔ آپ کی آواز کیا تھی، ہیبت و جلال کا ایک ایسا آہنگ تھا کہ جس کے اثر سے خانقاہ کے در و دیوار کانپ رہے تھے۔ خدّام کی یہ حالت تھی کہ ان کے جسم پر لرزہ طاری تھا اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا محسوس ہورہا تھا۔ عام انسانی دل کی کیا حیثیت ہے، حضرت سلطان

الہندؒ کی ضرب ''لا الہ الا اللہ'' سے اجمیر کے پہاڑوں میں بھی شگاف پڑ گئے تھے۔ تمام خدمت گار اور مریدوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو پہلی بار اس رنگ میں دیکھا تھا ورنہ آپ ہمیشہ دنیا سے صورت جمال ہی میں ملتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ خدام و مریدین نے سلطان الہند کی پُرجلال آواز سنی تھی۔ اگر وہ اپنے پیر و مرشد کو لباس جلال میں دیکھ لیتے تو اللہ ہی جانتا ہے کہ دیکھنے والوں کا کیا حال ہوتا؟ عشق کی آتش سوزاں کو یہ خس و خاشاک کس طرح برداشت کرتے؟ جل کر خاک ہی ہو جاتے۔

وقت آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ حضرت خواجہؒ کے ذکر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک حق کی آواز اسی طرح اُبھر رہی تھی۔ وہ آواز جس میں خدائے واحد اور اس کے احکام کے سوا ہر شے کی نفی پوشیدہ تھی۔ اچانک سننے والوں کو احساس ہوا کہ اب حضرت سلطان الہندؒ حالت وجد میں چلے گئے ہیں۔ ذکر کی آواز وقفے وقفے سے سنائی دینے لگی تھی مگر اس کے ساتھ فضا پر مزید ہیبت طاری ہو گئی تھی۔ ہر شخص خوف سے اس طرح لرزہ براندام تھا کہ اسے اپنی سانس تک رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تمام خدمت گار سہمے ہوئے تھے۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے ہونٹوں کو جنبش دے سکے اور حضرت خواجہؒ کی اس کیفیت جذب کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے کوئی سوال کر سکے۔

وقت اپنی مقررہ رفتار سے گزرتا رہا۔ رات کے ستارے بزم فلک سے رخصت ہوئے اور ستارۂ سحری اپنی پوری تابناکی کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس وقت خدمت گاروں نے محسوس کیا کہ اب فضا پر مکمل سکوت طاری ہے اور حضرت خواجہؒ کے حجرے سے آوازیں آنا بند ہو گئی ہیں۔ حاضرین خانقاہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ حضرت سلطان الہندؒ کی کیفیت جلال ختم ہو چکی ہے اور آپ حالت جمال میں دوبارہ واپس آ گئے ہیں۔

کچھ دیر بعد فجر کی اذان ہوئی۔ خدمت گاروں کو یقین تھا کہ اذان کی آواز سنتے ہی سلطان الہندؒ حجرے سے باہر تشریف لائیں گے اور پھر نماز فجر ادا کریں گے۔ وہ خادم جو آپ کو صبح کے وقت وضو کرایا کرتا تھا بڑی مستعدی کے ساتھ دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ خانقاہ میں موجود دیگر افراد وضو کر کے سنت مؤکدہ ادا کرنے لگے۔ وقت کچھ اور آگے بڑھ گیا مگر حجرے کا دروازہ نہیں کھلا۔ اب دوسرے خدمت گار بھی ایک ایک کر کے دروازے پر جمع ہونے لگے تھے اور ہر شخص کے چہرے پر تشویش کی علامت ظاہر ہونے لگی تھی۔ طویل عرصے تک خدمت گزاری کے باوجود کسی مرید یا عقیدت مند کے علم میں ایسا کوئی واقعہ نہیں آیا تھا کہ حضرت خواجہؒ کی کوئی نماز فجر قضا ہوئی ہو۔ تاریخ میں تو بعض روایات ایسی بھی ملتی ہیں کہ شادی سے قبل سلطان الہندؒ نے مسلسل پچاس سال تک عشاء کے وضو سے نماز فجر ادا کی ہے۔ پھر ایسا نماز گزار انسان افضل ترین عبادت سے کس طرح بے نیاز ہو سکتا تھا۔ لوگوں کے اضطراب میں مزید اضافہ ہو گیا، وقت تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ آخر تمام خدمت گار اور مرید اس نتیجے پر پہنچے کہ شب بیداری کے باعث آپ کی آنکھ لگ گئی ہوگی ورنہ آپ اب تک تشریف لا چکے ہوتے۔

پھر آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ سلطان الہندؒ کو آرام کرنے دیا جائے اور دروازے پر دستک دے کر آپ کے آرام میں خلل نہ ڈالا جائے۔ اس کے بعد تمام لوگوں نے نماز فجر ادا کی مگر محسوس ایسا ہوتا تھا کہ ہر شخص اپنی جگہ بے سکون ہے اور حضرت خواجہؒ کی نماز میں عدم شرکت کے باعث ہر ذہن میں مختلف قسم کے اندیشے پیدا ہو رہے ہیں۔

آخر سورج طلوع ہوا اور تیز دھوپ اجمیر کی پہاڑیوں سے اُتر کر میدانوں میں پھیل گئی۔ کچھ خدمت گاروں نے آگے بڑھ کر دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔ دروازہ بدستور بند تھا۔ پھر کچھ خاص مریدوں نے دروازے پر کان لگا دیئے کہ شاید حضرت خواجہؒ ذکر میں مصروف ہوں اور آپ کی ہلکی ہلکی آواز اُبھر رہی ہو۔ مگر لوگ کوئی آہٹ، کوئی صدا سننے میں ناکام ہو گئے۔ اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی عمر ستانوے سال ہو گئی تھی۔ کچھ لوگوں کو خیال گزرا کہ کہیں ضعف پیری کے سبب آپ کو کوئی عارضہ نہ لاحق ہو گیا ہو۔ جس قدر وقت گزر جاتا تھا لوگوں کے اندیشے بڑھتے جاتے تھے اور جب عقیدت مندوں کی یہ بے چینی برداشت سے باہر ہو گئی تو دروازے پر مسلسل دستک دی گئی۔ جواب میں وہی خاموشی طاری رہی۔ انجام کار ایک بار پھر مشورہ کیا گیا۔ جو لوگ روحانی اعتبار سے حضرت خواجہؒ کے زیادہ قریب تھے، ان کی رائے کو ترجیح دی گئی اور پھر دروازے کو توڑ دیا گیا۔

دروازہ کھلتے ہی ایک عجیب و غریب خوشبو کی لہر آئی جو قریب کھڑے ہوئے لوگوں کو نہلاتی ہوئی گزر گئی۔ اندر جانے والے خدام گھبرا کر رک گئے۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سلطان الہندؒ اپنے زمینی بستر پر لیٹے ہوئے ہیں اور آپ کا منہ کعبے کی طرف ہے۔ پہلی نظر میں دیکھنے والوں کو ناقابل بیان خوشی کا احساس ہوا کہ حضرت خواجہؒ محوِ خواب ہیں اور شب بیداری کے سبب گہری نیند سو رہے ہیں...... مگر جب لوگوں نے جسم مبارک کو غور سے دیکھا تو ان کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ حضرت سلطان الہندؒ کی سانسوں کا رشتہ بحال نہیں تھا۔ چند خدام جو حجرے میں داخل ہو چکے تھے، انہوں نے اس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ ان کی آنکھوں کی پتلیاں کانپ رہی تھیں اور چہروں پر اذیت ناک وحشت برس رہی تھی۔ حجرے کے اندر موجود لوگوں کو بظاہر یقین ہو چکا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ عالم فانی سے رخصت ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں...... مگر ان کے دل اس حقیقت کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھے کہ سلطان الہندؒ اس قدر جلد آخری سفر پر روانہ ہو سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں عشاء کی نماز تک حضرت خواجہؒ بالکل صحت مند تھے۔ آپ کے چہرۂ مبارک پر کسی بیماری کی ہلکی سی علامت بھی نہیں تھی ساری رات بآواز بلند ذکر الٰہی کرتے رہے۔ پھر اچانک یہ کیا ہو گیا کہ آپ نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ یہ جذبات کی ایک ہیجانی کیفیت تھی جو کسی عزیز ہستی کی موت کے وقت اکثر انسانوں پر طاری ہو جاتی ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مرید، عقیدت مند اور خدام اسی شدت جذبات کے زیر اثر تھے پھر کچھ دیر بعد جذبات کا یہ سیلاب گزر گیا تو حاضرین خانقاہ اور حضرت خواجہؒ کے اہل خانہ کو یقین آ گیا کہ ہندوستان کی اقلیم معرفت کا تاجدار اپنی عظیم الشان روحانی سلطنت کو چھوڑ کر دنیا سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گیا ہے۔

جب خدمت گاروں نے حضرت سلطان الہندؒ کا چہرۂ مبارک دیکھا تو ہونٹوں پر ایک عجیب غریب تبسم موجود تھا۔ ایسا تبسم جو کسی حسین اور محبوب چیز کو دیکھنے کے بعد لبوں پر نمودار ہوتا ہے۔ بے شک! اس وقت حضرت سلطان الہندؒ موت کا چہرہ دیکھ رہے تھے جو اہلِ حق کو بہت دلکش نظر آتا ہے...... اور دنیا پرستوں کو نہایت ہولناک ولرزہ خیز۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر گناہ گار لوگوں کے چہرے مرتے وقت مسخ ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنی زندگی مرضیٔ حق کے مطابق گزارتے ہیں۔ ان کے نزدیک موت کا تصور خوشگوار رہتا ہے اور وہ اس ازلی حقیقت سے فرار ہونے کے بجائے خوش دلی کے ساتھ موت کا استقبال کرتے ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تو خدا کے دوست تھے اور ایک دوست اپنے دوست کے حکم پر کس طرح عمل کرتا ہے۔ اس کا اندازہ تمام انسان نہیں کرسکتے بس دیکھنے والوں نے سلطان الہندؒ کے ہونٹوں پر ایک مخصوص تبسم دیکھا جو مردِ مومن کی ایک مخصوص نشانی ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے ایک فارسی شعر میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

نشان مرد مومن با تو گویم

چو مرگ آمد تبسم بر لب اوست

(میں تجھے مردِ مومن کی پہچان بتاتا ہوں کہ جب موت آتی ہے تو اس کے ہونٹوں پر تبسم نمایاں ہوتا ہے)

پھر خدمت گاروں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آنکھوں کی طرف دیکھا جو ستانوے سال تک خدا کے نور سے دیکھتی رہی تھیں اس سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کی ایک مشہور حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ یہ وہی آنکھیں تھیں جو تقریباً ایک صدی تک اللہ کے نور سے دیکھنے کے بعد 6 رجب 633ھ کو بے جان ہوگئی تھیں مگر اس طرح کے دیکھنے والوں کو اب بھی ان کی روشنی کا احساس ہوتا تھا۔ حضرت سلطان الہندؒ کی نیم وا آنکھوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ کسی آنے والے کا انتظار کرتے کرتے تھک کر لیٹ گئے ہیں مگر انتظار ابھی باقی ہے۔

اب واقعتاً خدام کو یقین آگیا تھا کہ حضرت خواجہؒ دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں اور اس احساس کے ساتھ ہی لوگوں کو اپنے جذبات پر قابو نہ رہا، شدتِ غم بڑھی تو بے اختیار عقیدت مندوں کی چیخیں نکل گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے خانقاہ میں کہرام برپا ہوگیا۔ درویشوں کی یہ جماعت جو زندگی بھر دوسرے لوگوں کو صبر وضبط کی تلقین کرتی رہی تھی آج اپنے ہی پیغام کی نفی کررہی تھی۔ بہت سے خدمت گار ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے اور جو ہوش میں تھے ان کی آنکھوں سے بھی سیل اشک جاری تھا۔ جوش گریہ سے دامن تک بھیگ چکے تھے پھر کسی پکارنے والے نے بلند آواز میں حاضرین خانقاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اے سلطان الہندؒ کے گداگرو! کیا تمہیں اپنے سلطان کی نصیحت یاد نہیں رہی؟ غور کرو کہ حضرت خواجہؒ نے کل تم سے کیا کہا تھا؟ کیا تم نے سلطان الہندؒ کی خانقاہ کو ماتم کدہ بنادیا ہے؟ کیا تم پیر و مرشد

کے حکم سے سرتابی نہیں کررہے ہو؟ لوگو! اپنے ہوش وحواس برقرار رکھو اور مخدومؒ کی روح کو آزار نہ پہنچاؤ۔'' اگرچہ وہ شخص اپنے ساتھیوں کی وحشت کو اعتدال میں رکھنے کی کوشش کررہا تھا لیکن خود اس کا حال تھا کہ زبان سے ایک ایک لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہورہا تھا۔ فرط جذبات سے آواز ڈوبتی جارہی تھی اور پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

لوگوں نے اس شخص کی باتوں کو تحمل سے سنا۔ کچھ دیر کیلئے خانقاہ کے در و دیوار پر سناٹا چھا گیا۔ پھر عقیدت مندوں کی صف سے نکل کر ایک جاں سوختۂ عشق آگے آیا اور اس شخص کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا۔ ''تم اسے صبر کی تلقین کرتے ہو جس کی کائنات ہی لُٹ گئی۔ اسے پیغام تعزیت دیتے ہو جس کا سرمایۂ حیات چھن گیا میرے سینے کی طرف دیکھو! اس میں جو کچھ تھا جل کر خاکستر ہوگیا۔ تم جانتے ہو کہ آج تمہارے درمیان سے کون اُٹھ کر چلا گیا؟ نہیں! تم نہیں جانتے۔ اگر تم اس حقیقت کو جان لو تو تمہارے دماغوں سے دھواں اُٹھنے لگے اور تمہارے دل شق ہوجائیں۔ ایک رشتہ خاک میں مل جاتا تو لوگ دوسرا رشتہ تلاش کرلیتے ہیں۔ ایک صورت زیر زمین چلی جاتی ہے تو لوگ دوسری شکل ڈھونڈ لیتے ہیں...... مگر ہم اسے کہاں تلاش کریں، کہاں ڈھونڈیں؟ اس جیسا یہاں کون ہے؟ خدا کی قسم! کوئی نہیں۔ اس کے قدموں سے اُٹھنے والے غبار کے برابر بھی کوئی نہیں۔ وہ گداگروں کا سلطان تھا، مانگنے والوں کی جھولیاں بھر دیتا تھا۔ وہ راستے میں کھو جانے والوں کا رہنما تھا۔ ایسا رہنما کہ اس نے اپنے پیچھے چلنے والوں کو راہ میں بھٹکنے کیلئے نہیں چھوڑا۔ وہ زندگی کے صحرا میں ابرِ کرم تھا، دل کے تاریک گوشوں میں معرفت کا آفتاب تھا اور سیکڑوں کیلئے حق کی روشن دلیل تھا۔ وہ میرا ساتھی بھی تھا، میرا آقا بھی...... وہ میرا ہم نشیں بھی تھا، میرا سلطان بھی...... وہ میری عقل بھی تھا، میرا دل بھی...... وہ میری روح بھی تھا، میرا محبوب بھی...... لوگو! میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کیا تھا؟ صد حیف! کہ اس کا روئے تابناک بجھ گیا اور میری آنکھوں کی بینائی باقی ہے واحسرتا! کہ شاہ نے اپنے غلام کو خدمت سے سبکدوش کردیا اب یہ غلام کدھر جائے؟ دیارِ ہند میں ایسا دوسرا شاہ کون ہے؟ اے خالق کون ومکاں! اب مجھے بھی اس زمین پر زندہ نہ چھوڑ کہ سلطان کے بغیر غلام کا سر دوش ہستی پر ایک بارِ گراں ہے۔ اے خدا! میرے اس بوجھ کو ہلکا کردے۔ اے عزیز وجلیل! اس آتش فراق کو بجھا دے کہ اب یہ جاں سوختہ مزید جلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔'' یہ کہہ کر اس مرد قلندر نے اپنا گریبان چاک کرڈالا اور ہجوم سے گزرتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ لوگ اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ وہ بار بار آسمان کی طرف رخ کرکے چیختا تھا۔ ''اے خدا! تیری پناہ۔ اے خدا! تیری پناہ۔'' یہ قلندر ومجذوب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا مرید بھی تھا اور جاں نثار بھی۔ وہ سلطان الہندؒ کی محبت میں اس قدر غرق ہوچکا تھا کہ اسے گرد وپیش تو کیا اپنی جان کی بھی خبر نہیں تھی۔ آج جب اسے یہ جاں گداز اطلاع ملی تو وہ گریہ وزاری کرتا ہوا خانقاہ تک آیا اور اپنی محبتوں کا مرثیہ پڑھ کر چلا گیا۔

قلندر کا حضرت سلطان الہندؒ کی ذات سے اظہار عقیدت اتنا پُر سوز تھا کہ وہ لوگ بھی ہچکیوں کے ساتھ رونے لگے جو اب تک نہایت صبر وضبط کا مظاہرہ کررہے تھے۔ پھر اس سیل جذبات کا شور کچھ کم

ہوا تو مریدانِ خاص آگے بڑھے اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے جسم مبارک پر وہ چادر ہٹانی چاہی جسے آپ اکثر استعمال فرماتے تھے۔ اچانک ایک خدمت گار کی نظر سلطان الہندؒ کی پیشانی پر پڑ گئی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور اس نے ڈرتے ڈرتے دوسرے خادم کو اس طرف متوجہ کیا۔ دوسرے خدمت گار نے بھی حضرت خواجہؒ کے ماتھے کی طرف دیکھا اور وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر جتنے بھی خدام حجرے میں موجود تھے، سب نے حضرت سلطان الہندؒ کی پیشانی مبارک کو دیکھا اور پھر ایک ہی کیفیت سے دوچار ہوا تمام خدمت گار اپنی جگہ ساکت تھے اور حضرت خواجہؒ کے جاہ و جلال سے ان کے چہرے زرد ہو گئے تھے۔ زندگی میں بھی کسی انسان کی یہ جرأت نہیں تھی کہ سلطان الہندؒ کو آنکھ بھر کے دیکھ سکے...... اور اب وصال کے بعد بھی لوگوں کی نگاہیں اس مردِ حق کے رعب و جلال سے جھکی جاتی تھیں......مگر جس چیز نے خدمت گاروں کو اپنی اپنی جگہ ساکت کر دیا تھا وہ سلطان الہندؒ کی پیشانی مبارک پر لکھی ہوئی تحریر تھی۔

جب خدمت گار دروازہ توڑ کر حجرے میں داخل ہوئے تھے، اس وقت شدتِ غم کے سبب کسی کو ہوش نہیں رہا تھا اور وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ماتھے پر لکھی ہوئی روشن عبارت کو نہیں پڑھ سکے تھے۔ اب جو ہیجانی کیفیت کچھ کم ہوئی تو دیکھنے والوں نے قدرت کی یہ عجیب و غریب نشانی دیکھی۔ حضرت سلطان الہندؒ کی پیشانی مبارک پر واضح حروف میں تحریر تھا۔

"حبیب اللہ مات فی حب اللہ"

(اللہ کے دوست نے اللہ کی محبت میں وفات پائی)

بعض مؤرخین کی روایت ہے کہ یہ عبارت سنہری حروف میں تحریر تھی کچھ تاریخ نویسوں کا بیان ہے کہ عبارت کا رنگ گہرا سبز تھا۔ صدیوں کے فرق سے روایتوں میں بھی تبدیلی آسکتی ہے اور پھر طرح رنگوں میں بھی اختلاف پیدا ہو سکتا ہے......مگر تمام معتبر راوی اس بات پر متفق ہیں کہ وصال کے بعد جب لوگوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا چہرۂ مبارک دیکھا تھا تو آپ کی پیشانی پر یہ تحریر موجود تھی۔

نامور صوفی امیر خوردؒ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے۔ موصوف نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے وفات کے ایک سو پچیس سال بعد اپنی مشہور کتاب "سیدالاولیاء" تصنیف کی ہندوستان میں تصوف کے موضوع پر پہلی مستند اور جامع کتاب ہے۔ "سیدالاولیاء" میں مشائخ چشت کے حالات زندگی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ امیر خوردؒ جیسے معتبر بزرگ نے بھی اس تذکرۂ صوفیا میں یہی روایت بیان کی ہے کہ انتقال کے بعد حضرت سلطان الہندؒ کی کشادہ پیشانی پر یہ عبارت تحریر تھی۔

"اللہ کے دوست نے اللہ کی محبت میں وفات پائی۔"

مغل شہزادے داراشکوہ نے بھی اپنی مشہور تصنیف "سفینۃ الاولیاء" میں حرف بہ حرف یہی عبارت درج کی ہے۔ اس کے بعد سے آج تک جتنے بھی مستند تذکرہ نگار گزرے ہیں۔ ان سب نے

روایت کو معتبر قرار دیا ہے۔ کچھ بزرگوں کا کہنا ہے کہ حضرت سلطان الہندؒ کے وصال کے بعد آپ کی پیشانی پر اس عبارت کا روشن ہونا قدرتِ خداوندی کی ایک دلیل ہے یہ ان لوگوں کیلئے بھی ایک سبق تھا جو سلطان الہندؒ کی شان میں گستاخیاں کرتے تھے۔ قدرت نہیں چاہتی تھی کہ اس کا دوست عام انداز میں دنیا سے رخصت ہو۔ انجام کار جب یہ نشانی ظاہر ہوئی تو وہ علماء جو اپنے رسمی علم کے نشے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ولایت کو جھٹلا رہے تھے، حیران رہ گئے مجبوراً انہیں بھی اعتراف کرنا پڑا۔ "حضرت خواجہ اجمیریؒ اللہ کے دوست تھے۔"

بعض حضرات جوشِ عقیدت میں اس واقعے کو سلطان الہندؒ کی سب سے بڑی کرامت قرار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ اندازِ فکر درست نہیں۔ کرامت اسے کہتے ہیں جو کسی مردِ خدا کے عمل سے ظاہر ہو جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ دنیا سے رُخصت ہو گئے تو آپ کا ظاہری عمل بھی ختم ہو گیا۔ اب یہ قدرت کی کرشمہ سازی تھی کہ اس نے حضرت خواجہؒ کی پیشانی پر ایک خاص علامت کو اُبھار دیا......اور اہلِ دنیا پر ظاہر کر دیا کہ ابھی ہمارا جو بندہ تمہارے درمیان سے اُٹھ گیا ہے، وہ عام انسان نہیں ہے، ہمارا دوست ہے اس نے ساری زندگی ہم سے محبت کی۔ یہاں تک کہ ہماری محبت میں اسے موت آ گئی۔ دراصل یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی کرامت نہیں بلکہ آپ کی بزرگانہ عظمت پر اللہ کی گواہی تھی۔ یہاں ہم دوسرے ممالک کے صوفیائے کرام کے بارے میں کچھ نہیں کہتے کہ ان کی موت کے بعد کیا کیا خاص واقعات پیش آئے لیکن جہاں تک برصغیر پاک و ہند کا تعلق ہے، ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زندگی منفرد تھی اسی طرح آپ کی موت بھی دوسرے بزرگوں سے جداگانہ تھی۔

"اللہ کے دوست کو اللہ کی محبت میں موت آ گئی۔" یہ بہت بڑی بات ہے اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

"سیدالاولیاء" میں امیر خوردؒ ہی کی روایت ہے کہ جس رات حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ وفات پانے والے تھے، اسی شب چند بزرگوں نے حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا آپ ﷺ فرما رہے تھے۔

"اللہ کا دوست معین الدین آ رہا ہے۔ ہم اسی کے استقبال کیلئے آئے ہیں۔"

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ کوئی ذمہ دار مسلمان اپنے خواب کو غلط طور پر سرور کونین ﷺ سے منسوب کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں سرکار دوعالم ﷺ کا یہ قول مقدس مشہور ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا، فی الحقیقت مجھے ہی دیکھا۔ شیطان ہرگز میری شکل اختیار نہیں کر سکتا۔" اس حدیث کی روشنی میں جن بزرگوں نے سرور کونین ﷺ کو خواب میں دیکھا تھا، وہ ایک زندہ حقیقت تھی۔ کوئی وسوسہ، کوئی اندیشہ یا کوئی خیال پریشان نہیں تھا۔ پھر ساری دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جو کچھ رسول عربی ﷺ نے فرمایا تھا وہی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی پیشانی پر روشن تھا۔

جب اہل اجمیر کو سلطان الہندؒ کے انتقال کی خبر ہوئی تو پورے شہر میں صف ماتم بچھ گئی۔ زندگی معطل ہو کر رہ گیا۔ ہر شخص اس طرح اُداس تھا جیسے اس کا قریب ترین عزیز بچھڑ گیا ہو۔ مسلمانوں کے غم کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت خواجہؒ کے وصال کی خبر نے اہل ہنود کو بھی سوگوار بنا دیا تھا۔ بت پرست ہونے کے باوجود وہ سلطان الہندؒ کے اخلاق عالیہ سے اس قدر متاثر تھے کہ جب انہیں حضرت خواجہؒ کے دنیا سے گزر جانے کی اطلاع ملی تو بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے پھر سلطان الہندؒ کی باتیں یاد آئیں تو پتھر کے پجاریوں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اب وہ قطار در قطار حضرت خواجہؒ کی خانقاہ کی طرف بڑھ رہے تھے تا کہ اس مردِ جلیل کا آخری دیدار کر سکیں۔

بعض روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی پیشانی مبارک پر جو تحریر ابھر آئی تھی، اس سے ہندو راجپوتوں نے عجیب تاثر قبول کیا تھا۔ نتیجتاً جو لوگ سلطان الہندؒ کی زندگی میں مسلمان نہیں ہو سکے تھے ان میں سے بے شمار افراد نے آپ کی وفات کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔

آخر اہلِ دل کیلئے وہ سنگین ساعت آ پہنچی، جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو کفن پہنایا گیا۔ تمام مریدوں، خدمت گاروں، عقیدت مندوں اور اہل اجمیر کا بُرا حال تھا جس ذات گرامی نے پچاس سال تک گمراہوں کی رہنمائی کی، تاریک دلوں کو ایمان و عقائد کی روشنی بخشی، بیمار روحوں کی مسیحائی کی، مفلسوں کو تونگری کا درس دیا محتاجوں کو فقر و قناعت اور غیرت و خودی کی تعلیم دی، آج وہ عظیم و جلیل شخصیت دنیا سے رخصت ہو رہی تھی۔ جب سلطان الہندؒ کو قبر میں اُتارا جا رہا تھا تو لوگوں کے جذبات ایک بار پھر بے قابو ہو گئے۔ جو آنکھیں روتے روتے خشک ہو گئی تھیں، ان میں ایک بار پھر سیلاب سا آ گیا۔ حضرت خواجہؒ کے بعض مرید اور عقیدت مند جو اس کرب ناک فضا میں صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ گریہ وزاری کرنے والوں کو سمجھاتے رہے لیکن آج کوئی ہوش میں نہیں تھا۔ اچانک انسانی ہجوم سے گزرتا ہوا وہی جاں سوختۂ عشق پھر نمودار ہوا۔

''لوگو! ٹھہر جاؤ! یہ غلام تو اپنے شاہ کا چہرہ دیکھ لے۔'' اس مرد قلندر کی آواز بڑی پُر سوز تھی پورا مجمع ساکت ہو کر رہ گیا۔ ''میرے سلطان کو کہاں لے جا رہے ہو؟ کیا اس کے بعد یہ سلطنت تباہ نہیں ہو جائے گی؟ اگر تم آفتاب معرفت کو زیر خاک اتار دو گے تو کیا تمہارے مکان تاریک نہیں ہو جائیں گے؟'' قلندر ہوش و خرد کے تمام آداب سے بظاہر بیگانہ نظر آتا تھا مگر اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ بڑا معنی خیز تھا اس کی باتیں سن کر ہجوم کی کیفیت اور بھی دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ رسم فنا تو اسی کا نام ہے۔ بڑے بڑے انبیائے کرام بھی اسی راستے سے گزر گئے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو بھی خاک کے بستر پر لٹا دیا گیا تھا پھر اسی مرد قلندر کی خواہش پر سلطان الہندؒ کے چہرے سے کفن ہٹایا گیا جو لوگ قبر مبارک کے گرد جمع تھے انہوں نے حضرت خواجہؒ کے چہرے سے کفن ہٹتے ہی ایک ایسی تیز روشنی دیکھی جس سے پوری قبر میں اُجالا پھیل گیا تھا۔ قلندر نے بھی سلطان کا آخری دیدار کیا۔ چند لمحوں تک بڑے صبر و سکون کے ساتھ اپنے شاہ کا چہرہ دیکھتا رہا پھر

چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر قبر کے قریب ہی زمین پر گر گیا۔ کچھ لوگوں نے قلندر کو اُٹھا کر ایک طرف لٹا دیا اور پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی قبر کو لکڑی کے تختوں سے ڈھانپ دیا گیا۔ مہر منیر اندھیروں میں روپوش ہو گیا اور پورا قبرستان اس آیت قرآنی سے گونجنے لگا۔

''خاک سے پیدا کئے گئے، خاک میں ملا دیئے گئے اور پھر
خاک ہی سے اُٹھائے جائیں گے۔'' (ترجمہ)

کئی ماہ تک پورے اجمیر پر گورستان کا سا سناٹا طاری رہا۔ کیا مسلمان، کیا کافر، ہر شخص کے اُداس چہرے کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی عزیز ترین شے گم ہو گئی ہو اور وہ اسے دیوانہ وار ڈھونڈتا پھر رہا ہو۔ بہت دن تک قبر مبارک پر عقیدت مندوں کا ہجوم رہا۔ اجمیر کے گرد و نواح اور دوسرے شہروں سے طویل مسافت طے کر کے لوگ آتے رہے۔ دعاؤں اور آنسوؤں کی صورت میں اپنے سلطان کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے رہے پھر زندگی معمول پر آ گئی۔ لوگوں کے چہرے تو اب بھی اُداس تھے مگر جذبات غم میں پہلی جیسی شدت باقی نہیں رہی تھی۔

مگر وہ مرد قلندر آج بھی اسی طرح سوگوار تھا۔ جب بھی کوئی خدمت گار یا عقیدت مند فاتحہ خوانی کیلئے حضرت خواجہؒ کی قبر مبارک پر جاتا وہ قلندر وہاں موجود ہوتا۔ نہ اسے طوفانی بارش متاثر کرتی، نہ تپتی ہوئی دھوپ اور نہ خون کو منجمد کرنے والی طوفانی ہوائیں۔ وہ موسم کی ہر سختی سے بے نیاز، حضرت سلطان الہندؒ کے مرقد پر بیٹھا رہتا۔ لوگ حیرت سے اسے دیکھتے اور چلے جاتے جو واقف حال تھے۔ انہیں قلندر کے مزاج کی تبدیلی پر شدید حیرت تھی۔ وہ اس طرح خاموش ہو گیا تھا جیسے اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی ہو۔ یہ سلطان الہندؒ سے عشق کی انتہا تھی کہ قلندر ایک بار اپنے آقا کی قبر پر آ کر بیٹھا تو پھر مر کر ہی اُٹھا۔

☆☆..............☆☆..............☆☆

جن لوگوں نے فلسفہ، منطق اور سائنس کے نامعتبر حوالوں سے اپنے دماغوں کو سجا رکھا ہے انہیں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اجمیر میں آمد اور ''فتح مبین'' تک تمام واقعات پر فراخ دلی سے غور کرنا چاہئے پھر انہیں خدا کے وجود پر بھی یقین آ جائے گا اور حضرت خواجہؒ کے سلطان الہند ہونے میں بھی کوئی شک باقی نہیں رہے گا۔ قرآن حکیم نے اکثر مقامات پر یہی تو دعویٰ کیا ہے کہ

''اگر تم مومن ہو تو کفار کی کثرت کے باوجود تم ہی غالب رہو گے۔''

جو لوگ برصغیر پاک و ہند کی سرزمین پر اس آیت مقدسہ کی عملی تفسیر دیکھنا چاہتے ہیں انہیں غیر جانبداری کے ساتھ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی حیات مبارکہ کا مطالعہ کرنا چاہئے اگر خداوند ذوالجلال اپنی لازوال قوت و جبروت کے ساتھ حضرت خواجہؒ کی پشت پناہی نہ کرتا تو سیستان کا یہ بے سروسامان درویش اپنے مشن میں کس طرح کامیاب ہوتا؟ یہی خدا کے وجود کی دلیل ہے کہ مسلح راجپوت مل کر بھی حضرت خواجہؒ کو پیغام حق سنانے سے باز نہ رکھ سکے۔ قتل کرنا چاہا تو خود بے بس ہو گئے۔ آخر یہ سب کچھ کیا تھا؟ کیا اب بھی اہل زمین کو کسی دوسری نشانی کی ضرورت ہے؟

بے شک! حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ عظیم وجلیل مومن تھے۔اس لئے لاکھوں کفار
رہے۔آپ نے منکرین کے سب سے مضبوط قلعے کو ایک ضرب "لا الہ" سے مسمار کیا۔پھر
فاتح قرار پائے۔آپ کی فتح عجیب فتح تھی۔آپ سکندر، چنگیز یا تیمور کی قبیل کے فاتح نہیں
آپ کا طریقۂ جنگ بھی مختلف تھا اور فتح کا انداز بھی جداگانہ۔

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

اجمیر اسی فاتح کی آخری آرام گاہ بھی ہے اور زندہ یادگار بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان
سو سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔اس لئے حضرت سلطان الہندؒ کا روضۂ مبارک بھی دل
کا مرکز بنا رہا۔ہم کچھ دیر کیلئے تسلیم کر لیتے ہیں کہ مسلم دور اقتدار کے سبب حضرت خواجہ معین الدین
چشتیؒ کے آستانۂ عالیہ کی ظاہری زینت و آرائش کا کام جاری رہا اور بے شمار لوگ ہندوستان کے
گوشے گوشے سے سمٹ کر اپنے روحانی پیشوا کی زیارت کو حاضر ہوتے رہے..... مگر 1947ء
بعد تو مسلمان ہر شعبۂ حیات میں بے اثر ہو گئے اور کلمہ گویوں کی جو چند ریاستیں تھیں وہ بھی جمہوریہ
ہند میں ضم ہو گئیں۔لاکھوں مسلمان تاریک راہوں میں مارے گئے اور کوئی ایک کروڑ کے قریب
پاکستان ہجرت کر گئے۔اس اعتبار سے سلطان الہندؒ کے دربار میں سلام عقیدت پیش کرنے والوں
کی تعداد بھی کم ہو جانی چاہئے تھی...... مگر ہم دیکھتے ہیں کہ زائرین کے ہجوم میں روز بروز اضافہ ہو
جا رہا ہے۔

محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اُٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اگر سلطان الہندؒ کے حضور آنے والوں کے اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو یقیناً ان میں ا
لاکھوں ہندو شامل ہو گئے جو اپنے دیوتاؤں سے مایوس ہو کر در خواجہؒ پر آتے ہیں اور ایک مسلمان
درویش کی چوکھٹ پر سرِ نیاز جھکا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ان پر کوئی جبر نہیں، کوئی ظلم نہیں
ایک عقیدت کی لہر ہے جو انہیں ان کے گھروں سے نکال کر سلطان الہندؒ کے دربار تک لے
ہے۔ہندو زائرین میں محض توہم پرست اور جاہل ہی نہیں ہوتے۔ان میں بے شمار لوگ
اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں بلکہ انہیں اپنی تاریخ سے بھی بھرپور واقفیت حاصل ہوتی ہے۔انہیں
روز و شب کا یہ راز معلوم ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہی کا اشارہ پا کر شہاب الدین
نے دوبارہ ہندوستان پر حملہ کیا تھا اور آپ ہی کی دعاؤں سے افغان سپہ سالار کو عظیم الشان
حاصل ہوئی تھی۔ ہر چند کہ ہندو زائرین کے سینوں میں تعصب کی دبی دبی چنگاریاں بھی
ہوتی ہیں لیکن وہ سلطان الہندؒ کے دربار میں آکر فرقہ پرستی کی صدیوں پرانی رسموں کو
کر دیتے ہیں۔اگرچہ پرتھوی راج چوہان ہندو قوم پرستوں کا عظیم ہیرو ہے لیکن سلطان الہند
مملکت کے حصار میں داخل ہونے کے بعد کسی بت پرست کو اس کا احساس تک نہیں رہا
راج کون تھا؟ اس کے محلات کی بنیادیں کہاں تھیں۔ رام راج کے نام لیواؤں کا دربار
آراستہ ہوتا تھا...... اور وہ بہادر و شجاع راجپوت جن کے تذکروں سے ہندو تہذیب کی دا

ذہن نہیں یکایک کہاں غائب ہو گئے؟ نہ ان کی کوئی یادگار ہے نہ سمادھی، لاکھوں جسیم اور مسلح افراد
زمین نے کس طرح نگل لیا؟ ایسے بے شمار سوالات ہیں جو ہندو زائرین کے ذہنوں میں اُبھر
سکتے ہیں...... مگر یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا جاہ و جلال ہے کہ بت پرست اپنے ماضی سے
بے نیاز ہو کر اس مرد جلیل کی بارگاہ میں سر جھکا دیتے ہیں جہاں تارک الدنیا سادھو اور جوگی بھی
دست بستہ کھڑے رہنے کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا شرف سمجھتے ہیں۔یہ کیسی عجیب بات ہے کہ
ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے غیر مسلموں کے قافلے اجمیر آتے ہیں لیکن وہ ایک بار بھی
پرتھوی راج چوہان یا دوسرے ہندو حکمرانوں کو یاد نہیں کرتے۔یہی بت پرست فرط عقیدت میں
مزار خواجہؒ پر شمعیں روشن کرتے ہیں تازہ و شاداب گلابوں کی چادریں چڑھاتے ہیں۔آستانہ
سلطان الہندؒ کی خاک اُٹھا کر اپنی پیشانیوں پر ملتے ہیں اور جب انہیں حاضری کی سعادت حاصل
ہو جاتی ہے تو اس طرح اُلٹے قدموں لرزاں و ترساں واپس جاتے ہیں جیسے کوئی زندہ شہنشاہ ان کی
حرکات و سکنات کا نگراں ہو۔

مزار خواجہؒ سے کچھ فاصلے پر تاراگڑھ پہاڑ ہے۔اسی پہاڑ کی چوٹی پر راجپوت فرمانروا پرتھوی راج
چوہان کا مضبوط ترین قلعہ تھا...... اور آج اسی قلعے کے عین قلب میں حضرت سید حسین مشہدیؒ (خنگ
سوار) کا مزار مبارک ہے حضرت سید حسینؒ راجپوتوں سے ایک معرکہ آرائی کے دوران شہید ہو گئے
تھے۔بے شک! اس مرد خدا کو ظاہری موت آگئی مگر وہ آج بھی اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ زندہ
ہے۔ہندو زائرین حضرت سید حسین مشہدیؒ کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کیلئے تاراگڑھ بھی جاتے
ہیں۔وہ منظر کیسا عجیب ہوتا ہے کہ پتھر کے پجاری اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے ایک مسلمان
بزرگ کی بارگاہ میں مسلسل دعائیں مانگتے رہتے ہیں اور انہیں ایک لمحے کیلئے بھی احساس نہیں ہوتا کہ
وہ اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں کبھی پرتھوی راج اپنی تمام تر ہیبت و قوت کے ساتھ تخت نشیں تھا۔یہ
کیسی زندگی ہے جو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت سید حسین مشہدیؒ کو حاصل ہوئی اور یہ
کیسی موت ہے جس سے پرتھوی راج چوہان اور اس کے پیش رو حکمراں دوچار ہوئے اگر کوئی سمجھنا
چاہے تو اس میں قدرت کی بڑی نشانیاں پوشیدہ ہیں۔

اجمیر میں ایک حضرت سلطان الہندؒ کا دربار ہے جو عقیدت مندوں اور غلاموں سے کسی موسم میں
خالی نہیں رہتا...... دوسری طرف اسی شہر میں پرتھوی راج اور دیگر ہندو فرمانرواؤں کے زیر زمین
مقبرے ہیں جہاں کبھی کوئی ہندو نہیں آتا کوئی فرقہ پرست اپنے نامور ہیرو کی سمادھی تعمیر نہیں کراتا......
اور کوئی ان سورماؤں کا نام لے کر نہیں پکارتا جن کے پاس مادی طور پر بڑے وسائل و اسباب تھے۔
ایک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا آستانۂ عالیہ ہے جہاں ہمہ وقت نور الٰہی کی بارش ہوتی رہتی
ہے، شب و روز عود و عنبر کی خوشبوئیں سلگتی رہتی ہیں اور فضائیں آیات قرآنی کے ابدی آہنگ سے گونجی
رہتی ہیں۔اسی مقام پر راجپوت حکمرانوں اور سپہ سالاروں کے بے نام و نشاں عبرت کدے ہیں
جہاں غلاظت و کثافت ہمیشہ کیلئے مسلط کر دی گئی ہے۔ جہاں ہجوم شغالاں (گیدڑ) اور گروہ سگاں

اپنی کریہہ آوازوں میں دن رات چیختار رہتا ہے اور جہاں ویرانی رقص کناں اور بے کسی مرثیہ خواں ہے۔ کیا لوگوں کو اب بھی عقل نہیں آتی۔

بُوم نوبت می زند جو گنبد افراسیاب

(اُلو شہنشاہ افراسیاب کی گنبد پر بیٹھا ہوا شور مچا تا رہتا ہے)

یہی اہل دنیا ہیں اور ان سے اسی قسم کا وعدہ کیا گیا تھا۔

جن لوگوں کو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے آستانۂ عالیہ پر حاضر ہونے کا شرف حاصل ہے، وہ بخوبی واقف ہیں کہ سلطان الہندؒ کا روحانی دربار کیا ہے؟ وہاں کیسے کیسے اکابر سر جھکائے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور کتنی دیر تک گریہ وزاری کے ساتھ حال دل بیان کرتے رہتے ہیں۔ کسی مجبوری کے سبب جن لوگوں کو یہ سعادت حاصل نہیں ہو سکی ہے، انہیں ہم تصوراتی طور پر دیار خواجہ غریب نوازؒ میں لئے چلتے ہیں۔ اگرچہ اہلِ طلب کیلئے یہ خیالی منظر کشی ناکافی ہوگی لیکن پھر بھی کسی حد تک دل ونظر کے یہ فاصلے کم ہو جائیں گے۔

تاریخ کے مطالعے سے یہ پتا نہیں چلتا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے فوراً بعد کس شخص نے روضۂ مبارک کی عمارت تعمیر کرائی۔ غیاث الدین خلجیؒ کے دور میں ایک بزرگ حضرت خواجہ حسین ناگوریؒ گزرے ہیں۔ آپ نے 938ھ کے آخر میں سلطان الہندؒ کے دربار مبارک کی تعمیر کا آغاز کیا اور پھر 939ھ میں یہ منصوبہ تکمیل تک پہنچا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تین سو سال تک خواجہؒ کی قبر مبارک یا تو غیر پختہ رہی یا پھر کچھ حصہ پختہ کرا دیا گیا ہوگا۔ ویسے با قاعدہ تعمیر کا کام حضرت حسین ناگوریؒ کی نگرانی میں شروع ہوا۔ خواجہ حسین ناگوریؒ سلطان الہندؒ کے مشہور خلیفہ صوفی حمید الدین ناگوریؒ (سوالی) کی اولاد میں سے تھے اور آپ کا شمار سلسلۂ چشتیہ کے نامور بزرگوں میں ہوتا ہے۔ خواجہ حسین ناگوریؒ کو حضرت سلطان الہندؒ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ آپ اکثر بڑے حسرت آمیز لہجے میں فرمایا کرتے تھے۔

"میرے روحانی پیشوا کو ظاہری زینت و آرائش کی ضرورت نہیں مگر پھر بھی آنے والوں کو اتنا تو معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں سلطان الہندؒ آرام فرما ہیں۔"

ان الفاظ سے حضرت خواجہ حسین ناگوریؒ کی دلی تمنا کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر ایک طویل عرصے تک آپ کی یہ خواہش تکمیل نہ پاسکی۔ اس وقت اجمیر کی صورتحال یہ تھی کہ حضرت سلطان الہندؒ کی قبر مبارک کے آس پاس ایک گھنا جنگل موجود تھا۔ پرتھوی راج چوہان کی شکست کے بعد اجمیر کی کوئی سیاسی حیثیت باقی نہیں رہی تھی۔ تین سو سال تک بے التفاتی کے سبب اس علاقے میں بے شمار خودرو درخت اُگ آئے تھے۔ پھر جھاڑیوں اور پودوں کا یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے ایک جنگل میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ گردونواح کے درندوں نے ان گھنے پیڑوں کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ دن کے وقت بھی وہاں گہری تاریکی چھائی رہتی تھی۔ حضرت خواجہ حسین ناگوریؒ نے اس خوفناک فضا میں بھی سلطان الہندؒ کی قبر مبارک سے علیحدہ ہونا گوارا نہیں کیا۔ آپ ہمہ وقت مرقد خواجہؒ پر حاضر رہ کر عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ کبھی آپ کا کوئی عزیز یا دوست اس پُر ہول ویرانے کی طرف اشارہ کرکے کہتا۔

"حسین! تمہیں ان جنگلی درندوں کے درمیان ڈر نہیں لگتا؟"

حضرت خواجہ حسین ناگوریؒ دوستوں کے اس اندیشۂ خوف پر مسکرانے لگتے۔ "جس ذات پاک نے حسین ناگوری کو پیدا کیا ہے وہی ان درندوں کا بھی خالق ہے، پھر اس مخلوق سے کیا ڈرنا جس کی حرکات وسکنات اللہ کے حکم کے تابع ہوں۔ ویسے یہ درندے بھی سلطان الہندؒ کے خدمت گار ہیں۔ تم ان کی زبان نہیں سمجھتے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جوش عقیدت انہیں بھی سلطان الہندؒ کے دربار میں کھینچ لاتا ہے۔"

حضرت خواجہ حسین ناگوریؒ کا بیان کردہ کوئی افسانہ نہیں تھا۔ فی الواقع اکثر شیر جیسے درندے بھی سلطان الہندؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ جن لوگوں نے یہ عجیب وغریب منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان کی روایت کے مطابق شیر اپنے ٹھکانوں سے نکل کر، سر جھکائے ہوئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی قبر مبارک کی طرف آتے تھے اور پھر مرقد کے نزدیک پہنچ کر اس طرح اپنی گردنیں جھکا دیا کرتے تھے جیسے عقیدت مندوں کی کوئی جماعت سلطان الہندؒ کے روبرو بصد ادب واحترام حاضر ہو۔ یہ خونی درندے ایک مخصوص صف بندی کے ساتھ کچھ دیر تک سلطان الہندؒ کے پاس کھڑے رہتے تھے اور پھر حضرت خواجہؒ کو نذر عقیدت پیش کر کے خاموشی سے واپس چلے جاتے تھے۔

پھر تین سو سال بعد 938ھ کے آخر میں غیاث الدین خلجی نذر عقیدت پیش کرنے کیلئے سلطان الہندؒ کے دربار میں حاضر ہوا تو اس کی ملاقات حضرت خواجہ حسین ناگوریؒ سے ہوئی جو اس خوفناک جنگل میں قیام پذیر تھے۔ غیاث الدین خلجی حضرت خواجہ حسینؒ کی اس بے مثال محبت سے بہت متاثر ہوا۔ گفتگو کے دوران ایک موقع پر خلجی نے حضرت خواجہ حسینؒ سے کہا۔

"بزرگ میری دلی خواہش ہے کہ آپ مجھے کسی خدمت کا موقع دیں۔"

حضرت خواجہ حسینؒ اسی دن کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی غیاث الدین خلجی کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ "اللہ سلطان کو حسن نیت کا صلہ دے۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ آپ نے میری خبر گیری کی۔"

جب خلجی نے بہت زیادہ اصرار کیا تو حضرت خواجہ حسین ناگوریؒ نے بڑی بے باکی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ "درویش اپنی موجودہ حالت سے مطمئن ہے مگر پھر بھی اپنے دل میں یہ خواہش رکھتا ہے کہ کوئی بندۂ خدا اس طرف آئے اور عقیدت کے ساتھ سلطان الہندؒ کا روضہ مبارک تعمیر کرے۔"

غیاث الدین خلجی بھی اس بات کا منتظر تھا۔ اس نے حضرت حسین ناگوریؒ کے ایماء پر سلطان الہندؒ کے مزار مبارک کی تعمیر کا حکم جاری کر دیا۔ یہ کار نیک تقریباً ایک سال تک جاری رہا اور پھر

939ھ میں حضرت سلطان الہندؒ کے روضے کی تکمیل ہوئی۔

1025ھ میں مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر انتہائی عقیدت کے ساتھ آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوا۔ اس نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی قبر مبارک کے گرد ایک احاطہ تعمیر کرایا تھا جو تمام تر سونے سے آراستہ تھا۔

اس احاطے سے دو تین فٹ کے فاصلے پر دوسرا احاطہ ہے جسے ریاست جے پور کے حکمران راجہ اجے سنگھ نے تعمیر کرایا تھا۔

سلطان الہندؒ کے مزار مبارک کا فرش قیمتی سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ گنبد مبارک کے دو دروازے ہیں اور دائیں بائیں دو حجرے تعمیر کئے گئے ہیں، ایک دروازے میں وہ کواڑ نصب کئے گئے ہیں جو مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر چتوڑ سے لایا تھا۔ ان کواڑوں پر یہ شعر کندہ ہے۔

رکھے ہمیشہ تری تیغ کار کفر تباہ ......
بحق اشہد ان لا الہ الا اللہ !

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے آستانۂ عالیہ کے تین بڑے احاطے ہیں۔ پہلے احاطے میں نقار خانۂ عثمانی، نقار خانۂ شاہ جہانی اور اکبری مسجد واقع ہیں۔ نقار خانۂ عثمانی کو حیدر آباد دکن کے نواب میر عثمان علی خان نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے دروازے پر ایک خوبصورت بارہ دری موجود ہے۔ اندر نوبت خانہ ہے جہاں دن میں پانچ مرتبہ نوبت بجتی ہے۔ نقار خانۂ شاہ جہانی 1045ء میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ دلکش عمارت مغل شہنشاہ شہاب الدین شاہ جہاں کے جوش عقیدت کا نتیجہ ہے۔ اس کا دروازہ سنگ سرخ سے بنایا گیا ہے۔

اکبری مسجد مغل حکمران جلال الدین اکبر نے 978ھ میں تعمیر کرائی تھی۔ دونوں مینار سنگ مرمر سے تیار کئے گئے ہیں جو صناعی اور نقاشی کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔ مسجد کے صحن میں ایک حوض بھی ہے۔

دوسرے احاطے میں بلند دروازے کے علاوہ محفل خانہ، حوض شاہی اور کچھ دوسرے حجرے نظر آتے ہیں۔ بلند دروازے کی اونچائی 75 فٹ ہے۔ یہ دروازہ خلجیوں کے عہد کی یادگار ہے جسے سنگ سرخ سے تعمیر کیا گیا ہے۔

تیسرے احاطے میں مسجد صندل خانہ، بہشتی دروازہ، حجرہ بی بی حافظ جمالؒ اور بابا فرید گنج شکرؒ چلہ گاہ، حجرہ حورالنساء بیگم، مزار خواجہ حسین ناگوریؒ، اولیاء مسجد اور جامع مسجد شاہ جہانی جیسی عمارتیں موجود ہیں۔ مسجد صندل خانہ کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسے 859ھ میں سلطان محمود خلجی نے تعمیر کرایا تھا۔ کچھ روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ تاریخی عبادت گاہ شہنشاہ جہانگیر نے 1610ھ میں بنوائی تھی۔ یہ مسجد حضرت سلطان الہندؒ کے روضے کی شمالی دیوار سے ملحق ہے۔ اس مسجد میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار مبارک کیلئے صندل گھسا جاتا ہے۔ اس لئے اسے مسجد صندل خانہ کہتے ہیں۔ اس مسجد کے شمال میں ایک احاطہ ہے جس میں چنبیلی کے درخت ہیں۔ روایت

ہے۔ یہاں حضرت سلطان الہندؒ کی دونوں بیویاں محوخواب ہیں۔

مسجد صندل خانہ کے نیچے حجرہ بابا فریدالدین شکر گنجؒ واقع ہے۔ حجرے میں دور تک تہہ خانے بنے ہوئے ہیں۔ حضرت سلطان الہندؒ کے مزار خامہ کا بھی راستہ ہے۔ حجرے کا دروازہ ہمیشہ مقفل رہتا ہے۔ صرف پانچ محرم کو کھولا جاتا ہے۔ احاطۂ نور کے مغربی دروازے کا نام بہشتی دروازہ ہے جو جامع مسجد کے عین سامنے ہے۔ یہ دروازہ بھی عام طور پر مقفل رہتا ہے۔ صرف حضرت سلطان الہندؒ کے عرس کے زمانے میں یکم سے 6 رجب تک کھلا رہتا ہے، یا پھر اس دروازے کو عاشورہ محرم میں کھولا جاتا ہے۔ بہشتی دروازے کے بارے میں روایت مشہور ہے کہ جو شخص بھی اس دروازے سے سات بار گزرے گا وہ جنت میں جائے گا۔

اس احاطے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی صاحبزادی بی بی حافظہ جمالؒ کا حجرۂ مبارک بھی ہے۔ اس عظیم خاتون کی قبر حضرت سلطان الہندؒ کے روضۂ مبارک کی جنوبی دیوار سے ملحق ہے۔ بی بی حافظہ جمالؒ کے مزار کے سامنے دو چھوٹی چھوٹی قبریں ہیں۔ یہ حضرت خواجہؒ کے دو صاحبزادوں کے مرقد ہیں جو بہت کم سنی کے عالم میں وفات پا گئے تھے۔

دوسرے حجرے میں مغل فرمانروا شہاب الدین شاہ جہاں کی بڑی بیٹی حورالنساء مدفون ہے۔ اس مغل خاتون کا انتقال 1025ھ میں ہوا تھا۔ حورالنساء بیگم نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی کہ اسے سلطان الہندؒ کے دربار کے کسی گوشے میں دفن کر دیا جائے۔

اس احاطے میں سنگ مرمر کی چھوٹی سی مسجد بھی ہے جسے ''اولیاء مسجد'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مشہور روایت ہے کہ اس مقام پر حضرت سلطان الہندؒ نماز ادا کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک اور تاریخی روایت بھی مشہور ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آمد سے پہلے یہاں ایک بت خانہ تھا۔ سلطان الہندؒ اسی صنم خانے کے قریب اپنی مذہبی رسوم ادا کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جیسے جیسے اسلام کو فروغ حاصل ہوتا گیا حضرت خواجہؒ کے خدمت گاروں نے بت خانے کی چار دیواری کو منہدم کر دیا اور پتھروں کے خداؤں کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ حضرت سلطان الہندؒ کے زمانے میں یہ عبادت گاہ ناپختہ تھی۔ آپ کے وصال کے بعد عقیدت مندوں نے اس مسجد کو سنگ مرمر کی دلکش عمارت میں تبدیل کر دیا۔

اجمیر میں سب سے بڑی مسجد ''جامع مسجد شاہ جہانی'' ہے جو حضرت سلطان الہندؒ کے مزار مبارک کے احاطے کے اندر واقع ہے۔ اس مسجد کی تعمیر کے بارے میں شاہ جہاں کی لڑکی جہاں آراء لکھتی ہے۔ ''والد محترم نے اپنے جلوس شاہی کے دسویں سال 1638ء میں اس مسجد کی تعمیر کا آغاز کیا۔ مسلمانوں کی یہ عبادت گاہ چودہ سال میں مکمل ہوئی۔ جمعہ اور عید کی نمازیں اسی مسجد میں ادا کی جاتی ہیں۔''

مسجد شاہ جہانی کے قریب ہی ایک حوض ہے جسے ''حوض شاہی'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ حوض ہر وقت پانی سے لبریز رہتا ہے۔ اس میں ایک فوارہ بھی موجود ہے جس سے اندازہ کیا جاتا ہے

کہ یہ جدید دور کی تعمیر ہے۔ حوض پر ایک سنگی بارہ دری بھی بنائی گئی ہے۔ اس کے درمیان میں مندرجہ ذیل الفاظ کندہ کئے گئے ہیں۔

''یہ عمارت حضور ملکہ معظمہ (کوئن ایمپریس) میری صاحبہ کے درگاہ ملاحظہ کرنے کی یادگار میں تعمیر کی گئی ہے۔'' اس عبارت کے ساتھ ہی 22 / دسمبر 1911ء کی تاریخ درج ہے۔ روایت ہے کہ انگریز ملکہ میری نذر عقیدت پیش کرنے کیلئے حضرت سلطان الہندؒ کے دربار عالیہ میں حاضر ہوئی تھی۔ واپسی کے وقت اس نے درگاہ کے مجاورین سے درخواست کی تھی کہ حوض شاہی پر ایک بارہ دری تعمیر کی جائے۔ اس کام میں خرچ ہونے والی رقم ملکہ میری نے اپنی جیب سے ادا کی تھی۔ اب یہ علیحدہ بات ہے کہ اس وقت کے کچھ زمانہ ساز لوگوں نے پتھر پر ایک ایسی عبارت تحریر کر دی جس سے حکومت برطانیہ کی خوشامد کا رنگ جھلکتا ہے۔

حضرت سلطان الہندؒ کے مزار مبارک کے بڑے گنبد کا کلس سونے کا ہے۔ اسے ریاست رام پور کے حکمراں نواب کلب علی خان نے تعمیر کرایا تھا۔ اس میں تین من سونا استعمال کیا گیا۔

اس کے علاوہ بھی حضرت سلطان الہندؒ کے مزار مبارک کے احاطے میں کئی تاریخی عمارتیں موجود ہیں۔ اگر ان سب کا تفصیلی ذکر کیا جائے تو مزید کئی صفحات درکار ہوں گے۔ ہندوستان کے بے شمار سلاطین و نوابین اور دیگر ارباب اقتدار میں سے ہر ایک کی یہ دلی خواہش تھی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے قربت کا کوئی نہ کوئی رشتہ قائم ہو جائے۔ اکثر صاحبان ثروت جو عقیدتاً مسلمان تھے، ان کی یہ آرزو تھی کہ مرنے کے بعد انہیں دیار خواجہؒ میں پیوند زمین کر دیا جائے تاکہ سلطان الہندؒ کے طفیل ان کی قبروں پر بھی بارش کرم ہوتی رہے۔ تمناؤں کی پرورش انسانی فطرت ہے مگر ہر تمنا تکمیل کے مرحلے تک نہیں پہنچتی۔ قدرت کے اس نظام کے تحت جس کے مقدر میں یہ سعادت لکھی جا چکی تھی، اسے سلطان الہندؒ کے دربار میں دو گز زمین مل گئی ورنہ...... مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں، مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھی کسی نہ کسی عنوان اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ نتیجتاً وہ لوگ کچھ اور نہ کر سکے تو انہوں نے ایک پتھر ہی پر اپنا نام کندہ کرا دیا۔

مزار مبارک کے احاطے میں دو ایسی تاریخی چیزیں جو ہمیشہ زائرین کی توجہ کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ ان میں ایک بڑی دیگ ہے اور دوسری چھوٹی۔ جہانگیر نے یہ دیگ 1022ھ میں نصب کرائی تھی۔ اس میں تقریباً ساٹھ من کھانا تیار ہوتا ہے۔ بڑی دیگ کو ''دیگ کلاں'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بلند دروازے کے قریب مغربی سمت میں نصب کرائی گئی ہے۔ اس کا محیط ساڑھے تیرہ گز کے قریب ہے اور اس میں سو من چاول آسانی سے پکایا جا سکتا ہے۔ یہ دیگ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے تعمیر کرائی تھی۔ مغل شہنشاہ چتوڑ کے راجپوتوں کی سرکشی اور بغاوت سے ہمیشہ پریشان رہتا تھا۔ اس وقت چتوڑ کا حکمران رانا اودے سنگھ تھا۔ چتوڑ پر حملہ کرنے سے پہلے جلال الدین اکبر فوج سمیت سلطان الہندؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہوا اور اپنی کامیابی کیلئے دعا مانگی۔ 1567ء میں اکبر نے چتوڑ پر حملہ کر دیا۔ چار ماہ

وہاں محاصرے کے بعد فروری 1568ء میں اکبر کو ایک ناقابل یقین فتح حاصل ہوئی اور راجھستان کے راجپوتوں کا قلع قمع کر دیا گیا۔ اس فتح کی خوشی میں اکبر دوبارہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے آستانہ عالیہ پر حاضر ہوا۔ اجمیر اور گرد و نواح کے تمام لوگوں کو کھانا کھلایا اور یادگار کے طور پر ''دیگ کلاں'' تیار کروائی۔

جلال الدین اکبر جو خود اپنے زمانہ گمراہی میں خدا بن بیٹھا تھا، ایک خادم کی حیثیت سے اس کا بار بار سلطان الہندؒ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ایک روشن کرامت ہے۔

ایک اکبر ہی پر کیا منحصر ہے جدید ہندوستان کا سیاسی دیوتا پنڈت جواہر لال نہرو اپنے نظریات کے اعتبار سے سوشلسٹ تھا اور عقائد کے لحاظ سے منکر...... مگر وہ جب تک زندہ رہا حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پر حاضر ہوتا رہا۔ سلطان الہندؒ کے عرس مبارک کی اکثر تقریبات میں پنڈت نہرو شریک ہوا کرتا تھا اور بڑی عقیدت سے پھولوں کی چادریں چڑھاتا تھا۔ ہندوستانی وزیراعظم کے رازدار حلقوں کا کہنا ہے کہ نہرو ایک ہی دعا مانگا کرتا تھا۔

''خواجہ! تمہارے حوالے سے بے شمار لوگوں کو نہ جانے کیا کیا ملا ہے مگر میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھوں۔ دنیا سے اس طرح جاؤں کہ میرے چہرے اور لباس پر شکست اور زوال کا کوئی داغ نظر نہ آئے۔''

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جب نہرو کی موت واقع ہوئی تو وہ نہ صرف بھارت کا وزیراعظم تھا بلکہ پچاس کروڑ ہندوستانیوں کا محبوب رہنما بھی۔

یہی حال مسز اندرا گاندھی کا تھا۔ ایک بار 1977ء میں مرارجی ڈیسائی سے شکست کھائی تو سلطان الہندؒ کے دربار عالیہ میں قیمتی نذریں لے کر حاضر ہوئی۔ آج بھی سرکاری کاغذات میں اس دورے کا ریکارڈ موجود ہے۔ درمیانی مدت کے انتخابات میں اندرا گاندھی نے تاریخی فتح حاصل کی جبکہ سیاسی پنڈت پیش گوئیاں کر رہے تھے کہ اندرا گاندھی کا دور ختم ہو چکا ہے۔

مہاتما گاندھی حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے قدموں میں جھکا۔ اس کے آثار آج بھی موجود ہیں اور تا قیامت رہیں گے۔ پنڈت نہرو اور اندرا گاندھی حضرت سلطان الہندؒ کی بارگاہ میں خم ہوئے...... حجت پوری ہو چکی۔ کوئی کسی بھی مقصد کیلئے جھکا، اللہ نے اسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سامنے جھکا دیا۔ ترقی پسندوں کیلئے اس میں بڑی نشانیاں ہیں۔ اگر کوئی سمجھنے کی کوشش کرے۔

جب شیخ مجیب الرحمٰن مغربی پاکستان میں نظر بند تھا اور اس کی رہائی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے بلکہ یحییٰ خان نے کئی بار اس کی موت کے احکام بھی جاری کر دیئے تھے۔ ایسے سنگین لمحات میں شیخ مجیب الرحمٰن کی بیوی نے مسز اندرا گاندھی سے درخواست کی تھی کہ وہ حضرت سلطان الہندؒ کے مزار پر حاضر ہونا چاہتی ہے۔ ہندوستانی وزیراعظم نے سرکاری سطح پر اس حاضری کے انتظامات کئے اور شیخ مجیب الرحمٰن کی بیوی بہت دیر تک حضرت خواجہؒ کے آستانے پر روتی رہی۔ پھر شیخ مجیب الرحمٰن کو آزاد

کر دیا گیا اور وہ بابائے بنگلہ دیش کے منصب پر فائز ہوا۔

ہندوستانی عوام کی اسی بے پناہ عقیدت کو دیکھتے ہوئے وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے حکومت برطانیہ کو اپنی رپورٹ میں لکھا۔

''ہندوستان پر آٹھ سو سال سے ایک قبر حکومت کر رہی ہے۔''

اور اس حکومت کے خاتمے کے کوئی آثار نہیں۔ یہ وہ حکومت ہے کہ جس کا سلسلہ قیادت کے دن سے جڑا ہوا ہے۔ جس روز زمین پر حشر برپا ہوگا، اسی روز یہ حکومت ختم ہوگی۔ حافظ شیرازی کے بقول

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما !

(جس کا دل عشق کی حرارت سے زندہ ہو جاتا ہے اسے کبھی موت نہیں آتی۔ ہم وہ لوگ ہیں کہ جن کی زندگی کی مہر تاریخ عالم پر ثبت ہے)

حضرت لال شہباز قلندرؒ

ولادت......537ھ......مروند (افغانستان)

وفات......673ھ......سہون (سندھ)

اسم گرامی سیّد عثمان......والد محترم کا نام سیّد کبیر......آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادقؒ سے ملتا ہے۔ پیر و مرشد نے ''لال شہباز'' کا لقب عطا کیا۔ کچھ روایتوں کے مطابق آخری عمر میں آپ پر ''جذب وسکر'' کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس لئے قلندر کہلائے۔ حضرت لال شہبازؒ نے تلاشِ علم میں مختلف علاقوں کے طویل سفر اختیار کئے۔ بعض روایتوں کے مطابق حضرت بابا فریدؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ جیسے عظیم صوفیاء سے آپ کی صحبتیں رہتی تھیں۔ مگر تاریخی اعتبار سے یہ روایتیں درست نہیں۔ ''برٹن ہسٹری آف سندھ'' کے مطابق آپ علم لسانیات اور صرف ونحو (قواعد) کے بہت بڑے ماہر تھے۔

یہ ساتویں صدی ہجری کے دوسرے عشرے کا واقعہ ہے۔ اگرچہ ہندوستان پر اسلامی سلطنت قائم ہو چکی تھی لیکن کچھ علاقوں میں ابھی تک ہندو حکمراں برسرِ اقتدار تھے۔ زیادہ تر ہندو حاکم مسلمان بادشاہوں کے خراج گزار تھے اور انہیں سیاسی مصلحت کے طور پر برقرار رکھا گیا تھا۔ ان ہی ہندو حاکموں میں راجہ سیوستان بھی تھا۔ اس شہر کا موجودہ نام سہون ہے جو حیدر آباد (سندھ) سے اٹھاسی میل کے فاصلے پر کیرتھر کی پہاڑیوں میں واقع ہے۔ اس شہر کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ بعض مؤرخین کے مطابق اس وقت سہون کا حاکم راجہ جیر جی تھا جو عرف عام میں چوپٹ راجہ کے نام سے مشہور تھا۔ ممکن ہے کہ یہ اس راجہ کا علامتی نام ہو...... ہندی زبان میں ''اندھیر نگری چوپٹ راج'' ایک مشہور محاورہ ہے۔ چوپٹ راجہ سے مراد انتہائی نااہل حکمراں ہے جس کے عہد حکومت میں بدانتظامی، بے ایمانی اور ناانصافی حد سے گزر گئی ہو۔

اسی چوپٹ راجہ کے دور اقتدار میں ایک درویش نے سہون کا رخ کیا۔ پھر اس درویش نے اپنے چند خدمت گاروں کے ساتھ سہون کے اس محلے میں سکونت اختیار کی جہاں کی بیشتر آبادی زنانِ بازاری (طوائفوں) پر مشتمل تھی۔ درویشوں کا یہ مختصر ترین قافلہ شام کے وقت اس محلے میں داخل ہوا تھا اور ایک کھلے میدان میں ان فاقہ مست لوگوں نے ڈیرا ڈال دیا تھا۔

رات بھر مختلف مکانوں سے ناچنے گانے کی آوازیں آتی رہیں۔ شراب کے نشے میں بدمست لوگ فجر کی اذان تک شور مچاتے رہے۔ درویش اپنے اوراد و وظائف میں مشغول رہا مگر اس کے خدمت گاروں کی نیندیں اُڑ گئیں۔ وہ ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔

''یہ کیا محلہ ہے اور کیسے اس کے مکین ہیں؟''

غرض رات گزر گئی۔ پھر صبح ہوئی تو خدمت گار صورتحال جاننے کیلئے محلے میں پہنچے۔ گوشے گوشے ... ہنوز آباد تھے۔ بس دو چار گھر مسلمانوں کے تھے۔ درویش کے خدمت گاران مسلمانوں کے پاس گئے تو صورتحال منکشف ہوئی۔

''بابا! آپ یہاں کہاں آ گئے؟'' سہون کے مسلمانوں نے نو وارد درویشوں سے کہا۔ ''یہ ہندوؤں کی بستی ہے اور وہ بھی گناہوں سے بھری ہوئی۔ یہاں ناچنے گانے والی عورتیں رہتی ہیں جن کی سیاہ کاریوں نے ہماری زندگی وبال کر دی ہے۔ اگر کسی دوسرے شہر میں ہمارے لئے جائے اماں ہوتی تو ہم اس جگہ کو چھوڑ کر بہت پہلے جا چکے ہوتے۔ یہ اوباشوں کی نگری ہے جہاں دن رات آسمان سے لعنت برستی رہتی ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کب ہمیں اس عذاب مسلسل سے نجات ملے گی۔''

درویش حیران و پریشان واپس لوٹ آئے۔ اپنے مرشد سے کہنے لگے۔ ''شیخ! یہاں سے جلد کوچ کر جائیں کہ یہ بستی ہمارے رہنے کے لائق نہیں ہے۔''

''آخر کیوں؟'' شیخ نے اپنے خدمت گاروں سے پوچھا۔

خدام نے تمام صورتحال بیان کر دی۔ ''ہم لوگ غلطی سے طوائفوں کے ایک محلے میں آ گئے ہیں۔''

''غلطی سے نہیں آئے، بلکہ قصداً بھیجے گئے ہیں۔'' شیخ نے ایک خاص ادائے بے نیازی کے ساتھ کہا۔

''شیخ! اس معصیت کدے میں تو سانس لینا بھی دشوار ہے۔'' درویش، زنان بازاری کی بستی میں بہت زیادہ گھٹن محسوس کر رہے تھے۔

''مسلمان کو اس لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے کہ وہ سازگار ماحول میں اپنے روز و شب بسر کرے اور چند روزہ زندگی گزار کر واپس چلا جائے۔'' شیخ نے فرمایا۔ ''مسلمان ایک چراغ کے مثل ہے کہ جہاں تاریکی دیکھے وہاں چلا جائے اور اپنے وجود سے ظلمتوں کو دور کر دے۔ بے شک! اس وقت ہم فاسقوں اور فاجروں کی بستی میں خیمہ زن ہیں مگر ہمارا قیام عارضی نہیں۔ یہاں درویشوں کا ڈیرا مستقل ہوگا...... اور اللہ اپنی قدرت سے اس بستی کی تمام غلاظتیں دور فرما دے گا۔ وہ پاک ہے اور وہی اپنی پاکی کے صدقے میں اس زمین کی ساری کثافتیں دھو ڈالے گا۔''

خدمت گار اپنے شیخ کے فرمودات سن کر بظاہر مطمئن ہو گئے تھے مگر وہ دلی طور پر اس کیفیت فضا میں عجیب سی خلش اور بے چینی محسوس کر رہے تھے۔

دن کے اُجالے میں اہل محلہ نے اجنبی درویشوں کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ لوگ ہنستے، گاتے جھومتے، لڑکھڑاتے اور خدا پرستوں سے استہزا کرتے گزر رہے تھے۔ سورج اپنے مستقر پر گردش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ اندھیرے کی آمد سے پہلے ہی یہاں گھر گھر میں چراغ جل جاتے تھے۔ عطر اور پھول بیچنے والے گلی کے موڑ پر کھڑے ہو جاتے تھے تا کہ خریداران بدمست اپنے ظاہری و باطنی تعفن کو چھپانے کیلئے خوشبوؤں کا سہارا لے سکیں۔ برسوں سے یہی کاروبار جاری تھا...... مگر اُس دن کی شام اچانک بازار کا رنگ بدل گیا۔

روز کا معمول تھا کہ سورج ڈوبتے ہی خاموش گلیاں جاگ اُٹھتی تھیں لیکن آج حیرت انگیز طور پر دور دور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ عطر اور پھول بیچنے والوں نے دیکھا کہ رقص و موسیقی کے شائقین گلی میں

داخل ہوتے تھے اور یکا یک گھبرا کر پیچھے کی طرف لوٹ جاتے تھے۔ آتے وقت ان لوگوں کے چہروں پر سرمستی و سرخوشی کے آثار ہوتے تھے مگر جاتے ہوئے وحشت و سراسیمگی نمایاں ہوتی تھی۔ گل فروش انہیں آوازیں دیتے رہ جاتے مگر وہ پلٹ کر نہ دیکھتے اور اس طرح واپس چلے جاتے کہ اب ان کیلئے بازار حسن میں کوئی کشش باقی نہیں رہی ہے۔

رات آئی تو اس محلے پر سکوت مرگ کا سا گمان ہونے لگا۔ کہاں طبلوں، گھنگھروؤں اور آوازوں کا شور کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی...... اور کہاں یہ خاموشی کہ اس بستی کے مکین اپنے دلوں کی دھڑکنیں بھی سن سکتے تھے۔ آخر طوائفوں کے محافظ صورتحال جاننے کیلئے گھروں سے باہر نکل آئے اور گل فروشوں سے ''سردیٔ بازار'' کا سبب پوچھنے لگے۔

گل فروش ایک ہی جواب دیتے۔ ''آنے والے گلی تک تو آتے ہیں مگر آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ پوچھو تو جواب نہیں دیتے۔ بس خاموشی سے لوٹ جاتے ہیں۔''

گل فروشوں کا ناقابل فہم جواب سن کر بازار حسن کے نگہبان گلیوں کے موڑ پر کھڑے ہو گئے۔ آنے والے آئے لیکن کچھ کہے بغیر واپس چلے گئے۔ نگہبانوں نے واپسی کا سبب پوچھا تو بعض لوگوں نے بس اتنا کہا۔ ''ہمیں اندر جاتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا ہے۔''

نگہبانوں نے خریداروں کو سمجھانا چاہا، حفاظت کا یقین دلایا مگر کوئی دلیل کام نہیں آئی۔ باہر کا کوئی شخص بھی گناہوں کی اس بستی میں داخل نہ ہو سکا۔

وہ رات بازار کے اُصولوں کے مطابق بہت سرد گزری۔ کوئی خریدار کوچۂ حسن تک نہیں پہنچا۔ زنان بازاری حیران و پریشان تھیں اور اپنے محافظوں سے بار بار پوچھتی تھیں۔

''آج تک تو ایسا نہیں ہوا۔ پھر اس بستی کے شائقین پر کیا گزری ہے کہ ان کے آشنا قدم راستہ بھول گئے ہیں؟''

محافظ کیا جواب دیتے؟ وہ خود صورتحال کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

آخر اندیشوں اور پریشانیوں کے درمیان بازار حسن کی وہ رات گزر گئی۔

درویشوں نے سکون کی سانس لی اور دلجمعی کے ساتھ ذکر حق میں مشغول ہو گئے۔ مگر اُنہیں حیرت ضرور تھی کہ یہ شور و شغب اچانک تھم کیسے گیا؟

دوسرے دن بھی بازار حسن کا یہی حال رہا۔ لوگ گلی کے موڑ تک آتے رہے اور حالت خوف میں واپس جاتے رہے۔

بازار کے محافظ و نگہبان رقص و موسیقی کے شائقین سے اس کا سبب پوچھتے تو وہ ایک ہی بات کہتے۔ ''کوئی غیر مرئی قوت ہے جو ہمیں آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ اگر ہم اس کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں تو ہم پر شدید خوف طاری ہو جاتا ہے۔''

پھر اسی عالم میں کئی دن گزر گئے۔ چراغوں کے ساتھ چولہے بھی بجھ گئے اور سنگین اقتصادی مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

''اگر یہ صورتحال جاری رہی تو فاقہ کشی کی نوبت آجائے گی۔'' بازارِ حسن کے ایک فرد نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

''آخر ہم لوگ اس صورتحال سے کیوں دوچار ہوئے؟'' دوسرے شخص نے سوال کیا۔ ''ان والوں پر کوئی جبر نہیں، کوئی پابندی نہیں، پھر وہ یہاں کیوں نہیں آتے؟ ان کے پیروں میں کس نے زنجیریں ڈالی ہیں اور اُنہیں یہاں آنے سے کون روکتا ہے؟'' اس شخص نے بیک وقت کئی سوال ڈالے تھے۔

بہت غور وفکر کے بعد اس کوچے کے لوگ اس نتیجے پر پہنچ گئے۔ ''جب سے یہ گدڑی پوش مسلمان یہاں آئے ہیں، اسی روز سے بازار کے درودیوار پر سناٹا پھیل گیا ہے۔''

اس بستی کے مکینوں کی سمجھ میں بات آ گئی۔ پھر طویل مشورے کے بعد طے پایا کہ ان گدڑی پوشوں سے بات کی جائے۔ نتیجتاً بازار کے چند جہاندیدہ افراد گدڑی پوشوں کے خیمے میں پہنچے اور سخت لہجے میں پوچھنے لگے۔

''تم لوگ کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟''

''ہم اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کی زمین پر مقیم ہیں۔'' گدڑی پوش درویش نے بے نیازانہ کہا۔

''یہ ہمارے دیوتاؤں کی زمین ہے۔'' بازارِ حسن کے محافظ نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ اپنے ڈیرے اُٹھاؤ اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔''

''ہم اپنے شیخ کے حکم کے پابند ہیں۔'' گدڑی پوش فقیر نے جواب دیا۔ ''اگر شیخ فرمائیں گے تو ہم لوگ کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''تمہارا شیخ کون ہے؟'' بازار کے محافظ نے سخت لہجے میں پوچھا۔

گدڑی پوش خادم نے ایک خیمے کی طرف اشارہ کر دیا۔

بازارِ حسن کے نگہبان شیخ کے خیمے میں داخل ہوئے۔ ان کے چہروں پر غصے کے آثار تھے اور لہجے کا انداز جارحانہ تھا...... مگر جب وہ بدکار لوگ شیخ کے روبرو پہنچے تو ان کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ اپنی قوتِ گویائی کھو بیٹھے۔

''تم لوگ کیوں آئے ہو؟'' شیخ نے پوچھا۔

بستی کے مکین مسلمان گدڑی پوشوں کو اپنے محلے سے نکالنے آئے تھے مگر جب شیخ نے ان کی آمد کا مقصد دریافت کیا تو وہ اپنی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکال سکے۔ یہاں تک کہ گنگ زبانوں اور کانپتے قدموں سے واپس چلے گئے۔

پھر طے پایا کہ طوائفیں خود گدڑی پوش شیخ کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان سے عاجزانہ لہجے میں درخواست کریں۔ آخر تمام زنان بازاری شیخ کے خیمے میں پہنچیں اور گریہ وزاری کے انداز میں کہنے لگیں۔

''ہمیں نہیں معلوم کہ آپ کون ہیں اور کس مقصد سے یہاں آئے ہیں...... مگر اتنا ضرور ہے کہ

آپ کی وجہ سے ہمارا کاروبار ختم ہو گیا ہے۔''

''رونا تو درکنار، ہم نے کسی سے کچھ کہا تک نہیں۔'' شیخ نے طوائفوں کو مخاطب کرتے ہوئے ''اگر تم گناہوں کی تجارت قائم رکھنا چاہتی ہو تو شوق سے جاری رکھو۔ ہمیں تمہارے معمولات سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

سہون کی بازاری عورتیں شیخ کے مفہوم کو سمجھ نہ سکیں اور خوش خوش اپنے گھروں کو لوٹ گئیں۔ ان کا ... کہ گم کردہ راہ خریدار اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ آئیں گے...... مگر کئی دن گزر جانے کے بعد بھی حسن وشباب کی منزلوں کا کوئی مسافر لوٹ کر نہیں آیا۔

طوائفیں دوبارہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ''شہر آرزو'' کی بربادی پر ماتم کرنے لگیں۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ جب تک آپ یہاں موجود ہیں، ان کے قدم اس کوچے کی طرف نہیں اُٹھ سکتے۔''

''پھر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟'' گدڑی پوش شیخ نے زنان بازاری سے پوچھا۔

''براہ کرم آپ یہاں سے چلے جائیں تاکہ ہمارے ویران گھروں کا اندھیرا دور ہو جائے۔'' طوائفوں نے عرض کیا۔ ''جب تک آپ یہاں موجود ہیں، کسی مکان میں کوئی چراغ نہیں جلے گا۔''

''مجبوری ہے، ہم یہاں سے کہیں اور نہیں جا سکتے۔'' شیخ نے فرمایا۔ ''اس مقام پر ہماری آخری آرام گاہ تعمیر ہوگی۔ اگر ہمارا وجود تمہارے کاروبار میں حارج ہے تو پھر تم لوگ کہیں اور چلے جاؤ۔''

''ہم تو مجبور عورتیں ہیں مگر ہمارا حاکم راجہ جیر جی بہت طاقتور ہے۔ وہ تمہیں چین سے رہنے نہیں دے گا۔'' طوائفیں مسلمان درویش کو دھمکی دے کر چلی گئیں۔

گدڑی پوش درویش فاحشہ عورتوں کی اس دھمکی پر مسکرا کر رہ گیا۔

☆☆............☆☆............☆☆

پھر وہ طوائفیں حاکم سہون راجہ جیر جی کے دربار میں پہنچ کر فریاد کرنے لگیں۔ ''ہمیں ایک مسلمان کے ظلم وستم سے نجات دلائی جائے۔''

راجہ جیر جی نے پورا واقعہ سنا تو حیران رہ گیا۔ پھر حاکم سہون نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ لوگ بہ رضا ورغبت یہاں سے چلے جائیں تو بہتر ہے ورنہ اُنہیں یہاں سے نکال دو۔''

راجہ جیر جی کے شمشیر بدست سپاہی گدڑی پوشوں کے خیمے میں داخل ہوئے اور اُنہیں حاکم سیوستان (سہون) کا حکم سنایا۔

گدڑی پوشوں نے وہی الفاظ دہرا دیئے۔ ''ہم صرف اپنے شیخ کے حکم کی پابندی کرتے ہیں۔ اگر تمہیں کچھ کہنا ہے تو ہمارے شیخ سے کہو۔''

گدڑی پوشوں کے انکار سے راجہ جیر جی کے سپاہیوں کا غصہ بھڑک اُٹھا تھا۔ وہ اسی حالت غضب میں شیخ کے خیمے کی طرف بڑھے مگر اندر داخل نہیں ہو سکے۔ سپاہیوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے بدن کی طاقت سلب ہو چکی ہے اور وہ اپنے جسم کو حرکت دینے سے قاصر ہیں۔ پھر جب سپاہیوں

نے واپسی کا ارادہ کیا تو ان کی ساری طاقت بحال ہو گئی۔

راجہ جیر جی اپنے سپاہیوں کی مجبوریوں کا قصہ سن کر پہلے تو حیران ہوا۔ پھر وہ ایک انجانے خوف کی لپیٹ میں آ گیا۔ "کیا وہ اتنا شکتی شالی (طاقتور) ہے کہ تم لوگ اس کے آگے دم بھی نہیں مار سکتے؟ تم نے اُسے دیکھا تک نہیں اور ڈر کے مارے بھاگ کھڑے ہوئے۔"

"ہم کچھ نہیں جانتے مہاراج!" سپاہیوں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "ہم نے اپنی حالت و کاست بیان کر دیا۔ دیوتا ہی جانیں کہ وہ کون ہے اور یہاں کس لئے آیا ہے؟ ہمارے کان بڑے خطرے کی آہٹ سن رہے ہیں۔"

راجہ جیر جی نے فوری طور پر اپنے وزیروں، مشیروں اور درباری نجومیوں کو طلب کر لیا۔

تمام واقعات سن کر حاکم سہون کی طرح اراکین سلطنت اور ستاروں کا علم جاننے والے بھی حیران و پریشان تھے۔

پھر درباری نجومیوں نے کاغذ پر بارہ خانے بنائے اور ان خانوں میں ستاروں کی موجودہ پوزیشن درج کی۔ کچھ دیر تک آپس میں مشورے کرتے رہے۔ پھر یکایک ان کے چہروں پر خوف کے گہرے سائے لرزنے لگے۔ نجومیوں نے راجہ جیر جی کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کیا۔

"ہم نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایک مسلمان حدود سلطنت میں داخل ہوگا اور پھر وہ شخص اقتدار کے ساتھ ساتھ آپ کی زندگی کیلئے بھی ایک سنگین خطرہ بن جائے گا۔"

حاکم سہون راجہ جیر جی نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ وہی شخص ہے؟"

"ہمارا علم یہی کہتا ہے۔" تمام نجومیوں نے بیک زبان کہا۔ "شاید یہ وہی فقیر ہے جس کے ایک شاگرد کو آپ نے قید میں ڈال دیا ہے۔"

ماہرین نجوم نے جس واقعے کی طرف اشارہ کیا تھا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ کچھ دن پہلے ایک مسلمان سہون میں داخل ہوا تھا اور قلعے کے جنوبی حصے میں گھنی جھاڑیوں کے اندر مقیم ہو گیا تھا۔ وہ دن میں تین مرتبہ اپنے رومال سے زمین کو صاف کرتا اور باآواز بلند کہتا۔

"لوگو! میرا مرشد آ رہا ہے۔ میں اس کے استقبال کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ تم بھی میرے مرشد کو گرمجوشی کے ساتھ خوش آمدید کہنا کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

فقیر روزانہ یہی ایک نعرہ لگایا کرتا تھا۔ اتفاق سے راجہ جیر جی کے محل کی ایک کھڑکی جھاڑیوں کی طرف کھلتی تھی۔ حاکم سہون کی خوبصورت لڑکی بناؤ سنگھار کرنے کے بعد دریچے میں آ کر بیٹھ جاتی اور جنگل کا نظارہ کرتی رہتی۔ راج کماری کا یہ غیر معمولی انہماک دیکھ کر محل کی کنیزوں نے حاکم سہون کو اطلاع دی کہ وہ اپنی بیٹی کی خبر لیں ورنہ صورتحال بے قابو ہو سکتی ہے۔ راج کماری ایک مسلمان فقیر پر فریفتہ ہو گئی ہے۔

راجہ جیر جی نے خلوت میں راج کماری کو طلب کر کے پوچھا۔ "بیٹی! یہ کنیزیں تمہارے بارے میں کیا کہہ رہی ہیں؟"

راج کماری نے کسی جھجک کے بغیر اس بات سے انکار کر دیا۔ "مہاراج! میں اس شخص کو جانتی تک نہیں۔ آپ خود دریچے میں بیٹھ کر دیکھ لیں۔ فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ وہاں سے انسانی ہیولے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔"

بیٹی کے کہنے پر راجہ جیر جی نے خود محل کے دریچے میں بیٹھ کر دیکھا۔ واقعتاً گھنی جھاڑیوں اور محل کے دریچے میں بہت زیادہ فاصلہ تھا۔ وہاں سے کسی انسان کے نقش و نگار کا نظر آنا ممکن ہی نہیں تھا۔ پھر راج کماری ایک ہیولے سے کس طرح عشق کر سکتی تھی۔

راجہ جیر جی شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اسی دوران کچھ تنگ نظر اور متعصب وزیروں نے حاکم سہون کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "اس سلسلے میں راج کماری بے قصور ہیں۔ سارا قصور اس مسلمان فقیر کا ہے جو مہاراج کی عزت و آبرو سے ایک بھیانک کھیل کھیل رہا ہے۔"

راجہ جیر جی نے استفہامیہ نظروں سے اپنے وزیروں کی طرف دیکھا۔

"دراصل وہ مسلمان فقیر راج کماری کے عشق میں مبتلا ہے۔" وزیروں نے شک کا بیج بو دیا۔

راجہ جیر جی نے اقتدار و حکمرانی کے نشے میں تحقیق کئے بغیر مسلمان فقیر کو زنجیریں پہنا کر قید خانے میں ڈال دیا۔ پھر روزانہ اس کے کمزور جسم کو مشق ستم بنایا جاتا مگر وہ ہر بار ایک ہی بات کہتا۔

"میں اپنے مرشد کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔ اسی کے عشق میں تڑپ رہا ہوں اور خلش دل سے بے قرار ہو کر اسی کو پکارتا ہوں۔"

راجہ جیر جی اور اس کے وزیر ایک مسلمان درویش کی زبان سمجھنے سے قاصر رہے اور اس کے جسم پر وحشیانہ انداز میں تازیانوں کی بارش کرتے رہے۔ اسی اثناء میں طوائفوں والا واقعہ پیش آ گیا۔ ماہرین نجوم نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

"پھر کیا کیا جائے؟" راجہ جیر جی نجومیوں کی بات سن کر وحشت زدہ نظر آ رہا تھا۔

"مہاراج کو چاہئے کہ وہ مسلمان فقیر کی خدمت میں قیمتی نذریں پیش کریں اور یہاں سے چلے جانے کی درخواست کریں۔" ایک نجومی نے حاکم سہون کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

راجہ جیر جی دل سے تو نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایک غیر مسلم فقیر کا اس طرح احترام کرے مگر ماہرین نجوم نے اسے جھک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

پھر ایک معتبر وزیر، ہیرے جواہرات اور اشرفیوں سے بھرا ہوا خوان لے کر درویشوں کے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت مسلمان فقیروں نے کھانا پکانے کیلئے آگ جلائی تھی۔

راجہ جیر جی کے وزیر نے جواہرات اور سونے سے بھرا ہوا خوان شیخ کے سامنے رکھتے ہوئے عرض کیا۔ "یہ حاکم سہون کی طرف سے آپ کیلئے ایک گرانقدر تحفہ ہے۔ اسے قبول فرمائیے اور براہ کرم کسی دوسری جگہ تشریف لے جائیے۔"

"جسے تم گرانقدر تحفہ کہتے ہو، اس کی حیثیت مٹھی بھر راکھ سے زیادہ نہیں۔" یہ کہہ کر شیخ نے اپنے ایک خادم کو حکم دیا۔ "اس خوان کو اُٹھا کر آگ میں ڈال دو۔"

راجہ جیرجی کے وزیر نے بڑی حیرت سے مسلمان درویش کی بات سنی۔ وہ دل ہی دل میں ... زن تھا کہ ایک معمولی سی آگ قیمتی ہیروں اور سونے کے ٹکڑوں کو کس طرح جلائے گی؟

خدمت گار نے اپنے مرشد کے حکم کے مطابق خوان اُٹھا کر آگ میں ڈال دیا۔ دیکھتے ... ایک شعلہ سا بھڑکا، تمام لعل و جواہر اور سونے کے ٹکڑے جل کر خاک ہو گئے۔

"ہمیں نذر کرنے کیلئے ایک مٹھی بھر راکھ لایا تھا؟" شیخ نے بت پرست وزیر کو مخاطب ... ہوئے فرمایا۔

حاکم سہون کا نمائندہ کچھ دیر تک پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ یہ ناقابل یقین منظر دیکھتا ... سونا جو تپتی ہوئی بھٹی میں بہت دیر کے بعد پگھلتا ہے، اسے معمولی آگ کے شعلوں نے چند لمحوں ... جلا کر خاک کر ڈالا تھا۔ مسلمان درویش کی یہ کرامت دیکھ کر وزیر نے قدموں پر سر رکھ دیا اور گڑگڑا ... لہجے میں عرض کرنے لگا۔

"میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، میں تو راجہ کے حکم سے مجبور ہوں۔ میری جان بخش دی جائے۔" وزیر اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔

"تجھے معاف کیا جاتا ہے۔" شیخ نے بے نیازانہ فرمایا۔

پھر جب وزیر کانپتے قدموں کے ساتھ واپس جانے لگا تو شیخ نے نہایت پُر جلال لہجے میں فرمایا۔

"اپنے راجہ سے کہہ دینا کہ ہم یہاں سے واپس جانے کیلئے نہیں آئے ہیں۔ ہم بفضل خدا اس بستی میں تادیر رہیں گے اور اسی کے حکم سے اسی جگہ ہماری قبر تعمیر ہوگی۔ اگر حاکم سہون اپنی سلامتی چاہتا ہے تو خود یہاں سے چلا جائے۔"

پھر مختصر سے سکوت کے بعد شیخ نے فرمایا۔ "راجہ کو چاہیئے کہ ہمارے مرید کو ایذا پہنچانے سے باز رہے۔ اُسے عزت و احترام کے ساتھ رہا کر دے ورنہ ہم خود اُسے آزاد کرالیں گے۔"

وزیر دوبارہ حاکم سہون کی خدمت میں پہنچا اور اس نے لعل و جواہر کے راکھ ہو جانے کا پورا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ "مہاراج! وہ ایک انتہائی طاقتور سنیاسی ہے۔ بہتر ہے کہ اس کی بات مان لی جائے۔"

وزیر کی گفتگو سن کر راجہ جیرجی غضبناک ہو گیا۔ "تو بزدل ہے کہ ایک معمولی سی بات سے ڈر گیا۔ میں نے اس سے بھی بڑی شعبدہ بازیاں دیکھی ہیں۔ میری سلطنت میں ایسے ایسے کامل جادوگر موجود ہیں جو مسلمان سنیاسی کے طلسم کو پارہ پارہ کر دیں گے۔"

پھر جب وزیر نے شیخ کے مرید کو رہا کرنے کی بات کی تو حاکم سہون اور بھی زیادہ بھڑک اُٹھا۔ "ہم تو اُسے نہیں چھوڑیں گے۔ اگر وہ جادوگر اپنے چیلے کو آزاد کرا سکتا ہے تو کرالے۔"

ماہرین نجوم نے بھی راجہ جیرجی کو سمجھایا کہ وہ ضد سے کام نہ لے مگر حاکم سہون کے دماغ پر اقتدار کا نشہ طاری تھا۔ اس لئے اس نے اپنے کان بند کر لئے اور ایک ہی بات کو بار بار دہراتا رہا۔ "وہ اپنے دل کی حسرتیں نکال لے۔ میں ہر نقصان برداشت کرنے کیلئے تیار ہوں۔"

حاکم سہون کی ضد دیکھ کر وزیر و مشیر خاموش ہو گئے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

پھر ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ درویش نے عشاء کی نماز ادا کی۔ پھر خدمت گاروں کی موجودگی میں اپنے اس شاگرد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا جو راجہ جیرجی کی قید میں تھا اور کئی مہینے سے دردناک سزائیں برداشت کر رہا تھا۔

"بودلہ! اب تم ہمارے پاس چلے آؤ! ہماری آنکھیں تمہیں دیکھنے کیلئے بے چین ہیں۔"

خدمت گار حیران تھے کہ پیر و مرشد کسے پکار رہے ہیں؟ بودلہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟

خادموں کو حیرت زدہ پا کر شیخ نے فرمایا۔ "بودلہ ہمارا مرید ہے اور تمہارا بھائی ہے۔ وہ ہمارے ہی حکم پر سہون آیا تھا مگر یہاں کے جابر حاکم نے جھوٹا الزام لگا کر اُسے قید خانے میں ڈال دیا ہے...... مگر آج رات زنداں کی دیواروں میں گہرے شگاف پڑ جائیں گے اور تمام زنجیریں کھل کر زمین پر گر پڑیں گی۔ بودلہ بس آنے ہی والا ہے۔"

اِدھر شیخ کی زبان مبارک سے یہ کلمات ادا ہوئے ...... اور اُدھر بودلہ کا زخمی جسم اچانک زنجیروں سے آزاد ہو گیا۔ بودلہ نے بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھا۔ ابھی اس کی حیرانی برقرار تھی کہ یکایک زنداں کا دروازہ کھل گیا۔ بودلہ سمجھ گیا کہ یہ تائید غیبی کے سوا کچھ نہیں۔ اس نے بے اختیار نعرہ مارا۔

"میرا مرشد آ گیا...... میرا مرشد آ گیا۔"

شدید زخمی ہونے کے سبب بودلہ کی ناتوانی انتہا کو پہنچ چکی تھی مگر زنجیروں سے آزاد ہونے کے بعد اسے اپنے جسم میں نئی توانائی محسوس ہونے لگی۔ وہ تیزی سے اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ قید خانے کے میدان سے گزر کر صدر دروازے کی طرف آیا تو زنداں کی بلند دیواریں اس کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔ بودلہ نے حسرت سے دیواروں کی طرف دیکھا۔ یکایک ایک دیوار شق ہوئی اور اس میں گہرا شگاف پڑ گیا۔ بودلہ نے زوردار نعرہ مارا اور شگاف سے گزر کر باہر آ گیا۔

پھر اُسے مرشد کی آواز سنائی دی۔ "بودلہ اسی راستے پر چلے آؤ، ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

بودلہ نے حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا مگر دور دور تک کسی کی موجودگی کے آثار نہیں تھے۔ وہ اپنے مرشد کی آواز کو پہچانتا تھا۔ آخر اسی آواز کے سہارے چل پڑا۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلے طے کیا ہوگا کہ بودلہ کو چند خیمے نظر آئے۔ پھر وہ غیر ارادی طور پر ایک خیمے میں داخل ہو گیا۔ یہ اس کے مرشد کا خیمہ تھا۔ بودلہ نے حیران ہو کر شیخ کی طرف دیکھا۔ پھر والہانہ انداز میں آگے بڑھا اور مرشد کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔ شیخ کے دوسرے خدمت گار بھی ایک اجنبی شخص کو خیمے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کے گرد سمٹ آئے تھے۔ بودلہ ہچکیوں سے رو رہا تھا اور مرشد اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نہایت مشفقانہ لہجے میں فرما رہے تھے۔ "بس! تمہاری آزمائش ختم ہوئی۔ تم سرخرو ہوئے اور تمہارے دشمن ہلاکت کو پہنچے۔"

خدمت گاروں نے دیکھا کہ اجنبی شخص کے پورے جسم پر زخموں کے نشانات تھے اور جگہ جگہ سے گوشت نچا ہوا تھا۔

شیخ نے اپنے خدام کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ ''یہی تمہارا بھائی بودلہ ہے۔ اسے حاکم کھنوں نے ناحق ستایا ہے۔ انشاء اللہ! وہ بہت جلد اپنے عبرتناک انجام کو پہنچے گا۔''

پھر دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ چند روز میں بودلہ کے تمام زخم، کسی دوا کے بغیر بھر گئے اور جسم پر چوٹ کا کوئی نشان تک باقی نہ رہا۔ یہ شیخ کی ایک اور کرامت تھی۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

جب دوسرے دن زنداں کے محافظوں نے بودلہ کو موجود نہیں پایا تو راجہ جیرجی کے دربار میں ہلچل مچ گئی۔

''مہاراج! آپ نے دیکھا کہ مسلمان سنیاسی اپنے قیدی کو اس طرح چھڑا کر لے گیا کہ ہمارے آہنی دروازے اور طاقتور محافظ کسی کام نہ آئے۔'' وزیر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ یہ وہی وزیر تھا جو شیخ کی خدمت میں قیمتی تحائف لے کر حاضر ہوا تھا۔ ''ابھی وقت ہے کہ ہم سنبھل جائیں اور اس فقیر کو ستانے سے باز رہیں۔''

راجہ جیرجی نے اپنے وزیر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اس کا عیار ذہن نیا منصوبہ تراشنے لگا۔

پھر جب مسلمان درویش کی اس کرامت کا شور بلند ہوا تو اُس محلے کی طوائفیں ترک سکونت کر کے کسی اور محلے میں چلی گئیں۔

زنان بازاری کے رخصت ہوتے ہی شیخ نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا۔ ''ان مکانوں کو ڈھا دو اور زمین کو ہموار کر دو۔''

خدام، پیرومرشد کے حکم پر فوراً ہی عمل پیرا ہوئے اور ان لوگوں نے طوائفوں کے مکانوں کو مسمار کرنا شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی یہ خبر پورے شہر میں عام ہوگئی۔ ابھی ایک مکان بھی پوری طرح منہدم نہیں ہوا تھا کہ چند مسلح افراد گھوڑوں پر نمودار ہوئے۔ پھر ایک توانا شخص، غصے سے بھرا ہوا نیچے اترا اور انتہائی غضبناک لہجے میں درویشوں کو مخاطب کر کے بولا۔ ''تم لوگ کس کے حکم سے مکانوں کو ڈھا رہے ہو؟''

درویشوں نے مسلح افراد کی طاقت سے مرعوب ہوئے بغیر کہہ دیا کہ وہ اپنے شیخ کے حکم پر عمل کر رہے ہیں۔

''تمہارا شیخ کون ہے؟'' اس شخص نے قہر آلود لہجے میں پوچھا۔

خدمت گار اس سوال کا جواب دینے ہی والے تھے کہ شیخ اپنے خیمے کے دروازے پر جلوہ افروز ہوئے۔

''وہ ہیں ہمارے شیخ۔'' درویشوں نے اپنے شیخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مسلح شخص آگے بڑھا اور چیختے ہوئے بولا۔ ''میں اس زمین کا مالک ہوں۔ تم لوگ کس حیثیت سے میرے تعمیر کردہ مکانوں کو مسمار کر رہے ہو؟'' اس کے ساتھ ہی راجپوت زمیندار کے منہ سے مغلظات کا فوارہ اُبل پڑا۔

شیخ نے کچھ کہے بغیر اپنے عصا سے زمیندار کے جسم پر ایک ضرب لگائی اور پھر پورا علاقہ اس کی چیخوں سے گونجنے لگا۔ وہ زمین پر گر کر کسی ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح تڑپنے لگا۔ راجپوت زمیندار کے ساتھی حیرت و خوف کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے زمیندار دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے ملازمین پر اس قدر دہشت طاری ہوئی کہ وہ درویشوں کو روکنے کے بجائے وہاں سے فرار ہو کر راجہ جیرجی کے پاس پہنچے اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔

''مہاراج! اگر مسلمان سنیاسی کو نہ روکا گیا تو پورے سہون میں بھونچال آجائے گا۔''

راجہ جیرجی نے اسی وقت سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کرتے ہوئے حکم جاری کر دیا۔ ''ایک معزز شہری کے قتل کے جرم میں مسلمان سنیاسی کو گرفتار کر کے ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔''

بعض روایتوں میں درج ہے کہ خود حاکم سہون سپاہی لے کر درویش کے پاس پہنچا اور نہایت تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔ ''راجپوت زمیندار کے قتل کا حساب کون دے گا؟'' راجہ جیرجی کا خیال تھا مسلمان سنیاسی اس کا جاہ و جلال دیکھ کر خوف زدہ ہو جائے گا مگر حاکم سہون کی یہ خوش گمانی اس وقت دور ہوگئی جب درویش نے مادی اقتدار کی نفی کر دی۔

''تم کون ہو اور کس کے قتل کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟'' درویش نے راجہ جیرجی سے پوچھا۔

ایک مرد مومن کی اس شان بے نیازی پر حاکم سہون بھڑک اُٹھا۔ ''میری ہی زمین پر رہتے ہو اور مجھ ہی سے سوال کرتے ہوئے کہ میں کون ہوں؟''

''زمین کی ملکیت کا معاملہ کچھ اور ہے جسے تم عنقریب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ فی الحال اپنی آمد کا مقصد بیان کرو۔'' درویش نے جان بوجھ کر اپنی لاعلمی اور بے خبری کا مظاہرہ کیا۔

یہ سن کر راجہ جیرجی کچھ اور غضبناک ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے ایک وزیر کی طرف اشارہ کیا کہ وہ مسلمان سنیاسی کو فرد جرم پڑھ کر سنائے۔

وزیر مملکت درویش سے مخاطب ہوا۔ ''تمہارا پہلا جرم یہ ہے کہ تم اجازت کے بغیر اس محلے میں خیمہ زن ہوئے...... ان ناچنے گانے والی عورتوں کو بے دخل کیا جو ایک طویل عرصے سے یہاں مقیم تھیں...... پھر ان مکانوں کو مسمار کرنا شروع کیا جو راجپوت زمیندار کی ملکیت تھے...... اور آخر میں جب زمین کا مالک ان زیادتیوں کے خلاف احتجاج کرنے آیا تو اسی کو قتل کر ڈالا۔''

مسلمان درویش نے اپنے خلاف فرد جرم سنی اور پھر نہایت مطمئن لہجے میں الزامات کا جواب دینا شروع کیا۔

''ہم مسلمان کسی پر جبر نہیں کرتے۔ زنان بازاری یہاں سے خود گئیں۔ انہیں کسی نے زبردستی نہیں اُٹھایا...... مکانوں کو مسمار اس لئے کیا کہ وہ ناپاک تھے...... ساری زمین اللہ کی ہے۔ اسی لئے

اس کے حکم سے یہ جگہ ہماری ملکیت ہے......اور ہم نے کسی راجپوت زمیندار کو قتل نہیں کیا۔ ہاں! ایک پاگل کتا اِدھر ضرور آیا تھا۔ ہم نے بہت چاہا کہ وہ اِدھر سے بھونکتا ہوا گزر جائے اور ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچے......مگر جب وہ کاٹ کھانے کیلئے جھپٹا تو ہم نے اسے بحکم خدا ہلاک کر ڈالا۔ سامنے اس کی قبر ہے۔" درویش نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم نے اس کتے کو وہیں دفن کیا ہے۔"

"وہ کتا نہیں سردار تھا۔" پاس کھڑے لوگوں نے تردید کی۔

راجہ جیر جی دوبارہ مسلمان درویش سے مخاطب ہوا۔ "یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ان کی نظر میں مرنے والا سردار ہوگا مگر ہم نے تو ایک کتے ہی کو زمین کے سپرد کیا ہے۔" درویش نے اسی بے نیازی اور استقامت کے ساتھ اپنے الفاظ دہرا دیئے۔

راجہ جیر جی نے اپنے سپاہیوں کو قبر کھولنے کا حکم دیا اور انتہائی قہر آلود لہجے میں مسلمان درویش کو تنبیہ کرتے ہوئے بولا۔ "اگر اس گڑھے سے راجپوت سردار کی لاش برآمد ہوگئی تو پھر تم لوگوں کی خیر نہیں۔ اس قتل کی پاداش میں ایک ایک کو سولی پر لٹکا دیا جائے گا۔"

"یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کا کیا حشر ہوگا؟ ویسے تم اپنے اطمینان کیلئے قبر کھول کر دیکھ لو کہ وہاں تمہارا راجپوت زمیندار دفن ہے یا کوئی کتا؟" مسلمان درویش کے چہرے اور لہجے سے اسی اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر جب قبر کھولی گئی تو راجہ جیر جی کے سپاہی خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ قبر میں راجپوت زمیندار کے بجائے ایک سیاہ کتا دفن تھا۔ حاکم سہون نے بھی یہ ناقابل یقین منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ زمین کے ملازمین دہشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جیر جی کے سپاہی بھی وہاں سے فرار ہو جانا چاہتے تھے مگر راجہ کی ناراضی کے سبب مجبوراً ٹھہرے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد حاکم سہون ایک شکست خوردہ انسان کی حیثیت سے اپنے محل میں واپس لوٹ آیا......اور درویش کے خدمت گار مکانوں کو مسمار کرنے میں مشغول ہوگئے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

راجہ جیر جی کی نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔ سہون میں ایک مسلمان درویش کی موجودگی اس کیلئے مستقل عذاب بن کر رہ گئی تھی۔ وہ درباریوں کے سامنے اپنے آپ کو بے خوف و بے نیاز ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر اندرونی طور پر بہت زیادہ خوف زدہ تھا۔ اکثر اسے تنہائی میں نجومیوں کے الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔

"مہاراج! یہ وہی شخص ہے جس کے ہاتھوں آپ کی زندگی اور اقتدار کو شدید خطرہ لاحق ہوگا۔"

راجہ جیر جی کئی بار اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ کر چکا تھا مگر ہر بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ آخر حاکم سہون نے اپنے علاقے کے کچھ جادوگروں کو طلب کر کے ان سے مسلمان درویش کے بارے میں مشورہ کیا۔

بہت غور و فکر کے بعد تمام جادوگر ایک ہی نتیجے پر پہنچے اور ان سیاہ کاروں نے حاکم سہون کے

مسلمان درویش کی روحانی طاقتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "مہاراج! اس شخص کی اُڑان بہت اونچی ہے۔ بد قسمتی سے ہمیں اس مقام تک رسائی حاصل نہیں۔ ہمارا علم و ہنر مسلمان درویش کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

جادوگروں کے اس اعتراف پر راجہ جیر جی بہت برہم ہوا۔ "جب تم لوگ میرے دشمن کو دفع نہیں کر سکتے تو پھر تمہارا عدم و وجود دونوں برابر ہیں۔"

سہون کے ساحروں نے مقابلے سے پہلے ہی اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ "ہمارا عجز اپنی جگہ مگر پھر بھی ہم مہاراج کو ایک مفید مشورہ دے سکتے ہیں۔ اگر اس ترکیب پر عمل کیا گیا تو بہت جلد آپ کو اپنے دشمن سے چھٹکارا مل جائے گا۔"

پھر جب حاکم سہون نے وہ ترکیب پوچھی تو جادوگروں نے اپنا تجویز کردہ نسخہ بتا دیا۔ "اگر کسی طرح مسلمان درویش کے شکم میں حرام غذا داخل کر دی جائے تو اس کی ساری روحانی قوت زائل ہو جائے گی اور پھر ہمارے جادو کی شکتی اس پر غالب آ جائے گی۔"

راجہ جیر جی نے ساحروں کا مشورہ قبول کر لیا اور پھر کچھ دن تک مسلمان درویش کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی عقیدت کا اظہار کرتا رہا۔ یہ حاکم کی ایک سیاسی چال تھی۔ وہ اپنے اس منافقانہ عمل سے یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اس نے مسلمان درویش کے وجود کو تسلیم کر لیا ہے۔

آخر راجہ نے ایک روز کسی حرام جانور کا گوشت پکوایا اور کئی خوان سجا کر مسلمان درویش کی خدمت میں بھیج دیئے۔

خدمت گاروں نے حاکم سہون کی نذر قبول کر لی اور تمام خوان اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

"یہ کیا ہے؟" شیخ نے خدام سے پوچھا۔

"راجہ جیر جی نے آج فقیروں کی دعوت کی ہے۔" خدام نے دست بستہ عرض کیا۔

شیخ نے ایک خوان سے کپڑا اُٹھایا۔ کھانا دیکھتے ہی شیخ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ پھر چہرے پر غیظ و جلال کے آثار نمایاں ہوئے۔ خدام حیرت و سکوت کے عالم میں مرشد کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ رہے تھے۔

"ہمارا خیال تھا کہ وہ کافر اتنی نشانیاں دیکھنے کے بعد ایمان لے آئے گا مگر جس کی تقدیر میں ذلت و بربادی لکھی جا چکی ہو، اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں ٹال سکتا۔" یہ کہہ کر شیخ نے کھانے سے بھرا ہوا خوان اُلٹ دیا۔

مرشد کے اس عمل سے خدام پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے زمین بھی لرزنے لگی۔ سہون زلزلے کی لپیٹ میں تھا۔ زمین نے دو تین کروٹیں لیں اور طاقت و اقتدار کا سارا کھیل ختم ہو گیا۔ ادھر شیخ کے سامنے خوان اُلٹا پڑا تھا......اور اُدھر راجہ جیر جی کے قلعے کی بنیادیں اُلٹی ہو گئی تھیں۔ سیکڑوں منکرین حق ملبے میں دب کر ہلاک ہو گئے اور پھر کچھ دن بعد ان کی ہڈیاں گل سڑ کر خاک ہو گئیں۔

یہ درویش، مشہور بزرگ حضرت مخدوم لال شہباز قلندرؒ تھے جن کے ہیبت و جلال سے بت پرستوں کی صفوں میں شگاف پڑ گئے۔ ہزاروں پتھر کے پجاریوں نے اپنے ہاتھوں سے قشقے کے نشانات کھرچ ڈالے اور گلے میں پڑے ہوئے زنار توڑ کر پھینک دیئے۔ درختوں، جانوروں، ستاروں، چاند اور سورج کو سجدہ کرنے والوں نے ''حی و قیوم'' کی وحدانیت پر گواہی دی اور سرورِ کونین ﷺ کی رسالت کا اقرار کیا۔

روایت ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے خوف سے جو طوائفیں ترکِ سکونت کر کے کسی اور جگہ میں چلی گئی تھیں، اُنہیں سکونِ قلب میسر نہ آسکا۔ یہاں تک کہ وہ حضرت قلندرؒ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئیں اور آپ کے دستِ مبارک پر تائب ہو کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئیں۔

☆☆.................☆☆.................☆☆

حضرت لال شہباز قلندرؒ کا خاندانی نام عثمان تھا۔ آپ کی تاریخ ولادت میں بڑا اختلاف ہے۔ کچھ مؤرخین نے 538ھ کو آپ کا سال پیدائش قرار دیا ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق حضرت قلندرؒ 573ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا اسم گرامی سید کبیرؒ تھا اور سلسلۂ نصب حضرت امام جعفر صادقؒ سے ملتا ہے۔

بعض کتابوں میں آپ کے نام کی ہجے ''لعل'' تحریر کی گئی ہے۔ ''لعل'' ایک قیمتی پتھر کو کہتے ہیں۔ اکثر تاریخوں میں ''لال'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں سرخ۔ حضرت قلندرؒ کا آبائی وطن مروند تھا جسے مہمند بھی کہتے ہیں۔ اسی شہر میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد حضرت شیخ عثمانؒ، حضرت بابا ابراہیمؒ سے بیعت ہوئے۔ پیرومرشد کی ہدایت کے مطابق آپ نے ایک سال تک سخت ریاضتیں کیں۔ پھر پیرومرشد سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

حضرت بابا ابراہیمؒ نے اپنے مرید خاص کو ''شہباز'' کا خطاب عطا کیا۔ اس خطاب کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپ کی آنکھیں شہباز کی طرح چمکتی تھیں۔ اس لئے پیرومرشد اسی نام سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ ''لال'' کا لفظ آپ کی ذات سے اس لئے وابستہ ہوا کہ حضرت قلندرؒ اکثر سرخ لباس پہنا کرتے تھے اور یہ رنگ آپ کو بہت زیادہ مرغوب تھا۔

کچھ مؤرخین ''قلندر'' کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ حضرت لال شہبازؒ نے حضرت سید جمال مجردؒ کا خرقہ حاصل کیا تھا اور سید جمالؒ ایک قلندر تھے۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ آپ کے پیرومرشد حضرت بابا ابراہیمؒ نے حضرت شہبازؒ کو قلندری سلسلے میں داخل کیا تھا۔

کچھ تذکرہ نگاروں کی تحقیق کے مطابق مشہور بزرگ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے حضرت لال شہباز قلندرؒ کو ''قلندر'' کہہ کر پکارا تھا۔ اسی روز سے آپ ''قلندر'' مشہور ہو گئے۔

کچھ بزرگوں کا خیال ہے کہ آخری عمر میں آپ پر جذب و مستی کی شدید کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس لئے قلندر کے نام سے مشہور ہو گئے۔

کچھ تاریخ نویسوں نے ''شہباز'' کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کی ہے کہ ایک بار آپ اپنے ہم عصر

حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ، حضرت جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشتؒ اور حضرت مخدوم بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کے ہمراہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ اچانک آپ چلتے چلتے رک گئے اور چہرۂ مبارک سے پریشانی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

''مخدوم! کیا ہوا؟'' ساتھی بزرگوں نے آپ کو پریشان دیکھ کر پوچھا۔

''میرا ایک مرید اس وقت بڑی مشکل میں پھنس گیا ہے۔'' حضرت سید عثمان مروندیؒ نے غمزدہ لہجے میں فرمایا۔ ''آپ حضرات اپنا سفر جاری رکھیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر حضرت شیخؒ نے اس طرح جست لگائی جیسے ہوا میں پرواز کر رہے ہوں۔ دوسرے ہی لمحے آپ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

کچھ دیر بعد حضرت بابا فریدؒ، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اور حضرت بہاءالدین زکریاؒ نے حضرت سید عثمانؒ کو سامنے سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ آپ کے ہمراہ ایک اجنبی شخص تھا۔ پھر جب چاروں بزرگ منزل پر پہنچ گئے تو ایک بزرگ نے سوال کیا۔ ''مخدوم! کیا یہی وہ مرید ہے جس کی وجہ سے آپ بہت پریشان تھے؟''

حضرت سید عثمانؒ نے فرمایا۔ ''حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے میرے مرید کو گرداب بلا سے نکال کر عافیت کے ساحل تک پہنچایا۔''

روایت ہے کہ آپ کی یہ کرامت دیکھ کر تینوں عارفان وقت نے بے ساختہ فرمایا۔ ''مخدوم! آپ ''شاہ باز'' ہیں۔''

اسی دن سے حضرت سید عثمان ''شاہ باز'' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ پھر یہ لفظ کثرت استعمال کے سبب شہباز ہو گیا۔

حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ، حضرت جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اور حضرت بہاءالدین زکریا ملتانیؒ نے آپ کی جس کرامت سے متاثر ہو کر ''شہباز'' کا لقب دیا اس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ کا ایک مرید کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ دشمنوں نے اس کے خلاف سازش کی اور اسے ایک سنگین جرم میں پھنسوا دیا۔

مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوا۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے مرید نے پُرزور لہجے میں صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اس جرم سے میرا کوئی تعلق نہیں۔''

قاضی کو ایک مسلمان کے بیان پر یقین آچلا تھا کہ دشمنوں نے عدالت میں جھوٹے گواہ لا کر کھڑے کر دیئے۔ وہ لوگ بھی اللہ کو حاضر و ناظر جان کر قسمیں کھاتے رہے کہ یہ شخص مجرم ہے اور موت کے خوف سے جھوٹ کا سہارا لے رہا ہے۔

قاضی نے حضرت لال شہباز قلندرؒ کے مرید سے کہا۔ ''تمہارے خلاف بہت سی شہادتیں موجود ہیں۔ اگر تم بھی ایک گواہ پیش کر دو تو میں تمہیں رہا کر دوں گا۔''

دشمن بہت زیادہ بااثر تھے، اس لئے حضرت قلندرؒ کے مرید کے حق میں کوئی ایک شخص بھی شہادت

نہ دے سکا۔ نتیجتاً قاضی نے ایک بے قصور انسان کو پھانسی کی سزا سنادی۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ اپنے بزرگ دوستوں کے ساتھ سفر میں تھے کہ اچانک آپ کو اپنا مرید یاد آ گیا۔ حضرت شیخؒ نے اس کے حال پر نظر کی تو یہ تکلیف دہ منظر دیکھا کہ سپاہی اسے کھینچتے ہوئے پھانسی گھر کی طرف لے جا رہے تھے۔

یکا یک مغرب سے سیاہ آدھی اُٹھی اور چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا۔ پھر گرد و غبار صاف ہوا تو سپاہی حیرت و خوف سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے اور وہ قیدی غائب تھا جسے کچھ دیر بعد پھانسی دی جانے والی تھی۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ اپنا مُرید چھڑا کر لے گئے تھے۔

قلندرؒ کے اس تصرف روحانی کو دیکھ کر ان کے ہم عصر بزرگوں نے اُنہیں "شہباز" کا لقب دیا تھا۔

مؤرخ خداداد خان نے اپنی تصنیف "لب تاریخ" میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کی پیدائش کے بارے میں ایک عجیب واقعہ تحریر کیا ہے۔

اس وقت حضرت قلندرؒ کے والد محترم سید کبیرؒ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ایک رات سید کبیرؒ نے خواب میں دیکھا۔ ایک نہایت پُر فضا مقام تھا ہر طرف دلکش باغات اور سبزہ زار تھے۔ میوہ دار درخت تھے اور ان کے قریب صاف و شفاف پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ طائران خوش الحان نغمے گا رہے تھے کہ اچانک ایک گوشے سے، سرخ رنگ والا ایک خوبصورت بچہ نمودار ہوا اور سید کبیرؒ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"مجھے اس مقام سے باہر لا یئے۔"

سید کبیرؒ کچھ دیر تک اس خوبصورت بچے کو دیکھتے رہے۔ پھر مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "جنت میں باہر آنا افضل ہے۔" (جنت میں باہر آنے سے مُراد جنت کی سیر کرنا ہے)

جیسے ہی سید کبیرؒ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، وہ خوبصورت بچہ نظروں سے اُوجھل ہو گیا...... اس کے ساتھ ہی سید کبیرؒ کی آنکھ کھل گئی۔ بڑا عجیب خواب تھا۔ سید کبیرؒ کچھ دیر تک اپنے خواب پر غور کرتے رہے مگر جب ذہن اس کی کوئی عقلی توجیہہ پیش نہ کر سکا تو پھر اسے محض خواب سمجھ کر فراموش کر دیا۔

کچھ دن بعد سید کبیرؒ نے دوبارہ وہی خواب دیکھا۔ سرخ رنگ والا وہی خوبصورت بچہ آپ کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ "بزرگوار! مجھے اس مقام سے باہر لا یئے۔"

سید کبیرؒ نے بچے کی بات سن کر اپنا وہی جواب دہرا دیا۔ "جنت میں باہر آنا افضل ہے۔" اب کی بار بچہ خاموش نہیں رہا۔ اس نے سید کبیرؒ کو مخاطب کر کے کہا۔ "دنیا میں ظاہر ہونا بھی اچھا ہے۔" یہ کہہ کر بچہ پہلے کی طرح غائب ہو گیا۔

بچے کے نظروں سے اُوجھل ہوتے ہی سید کبیرؒ بیدار ہو گئے۔ صبح کاذب کا وقت تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد فجر کی اذان شروع ہو گئی اور ارض و سما کی وسعتوں میں اللہ کی کبریائی بیان ہونے لگی۔

دوسری مرتبہ اسی بچے کو خواب میں دیکھنے کے بعد سید کبیرؒ کچھ مضطرب سے ہو گئے۔ پھر آپ ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو خواب کی تعبیر کا علم رکھتے تھے۔ بزرگ نے سید کبیرؒ کا خواب سننے کے بعد فرمایا۔ "سید! آپ شادی شدہ ہیں؟"

سید کبیرؒ نے نفی میں جواب دیا۔

"قدرت چاہتی ہے کہ اب آپ شادی کر لیں۔" بزرگ نے فرمایا۔ "وہ آپ ہی کا بچہ ہے جسے حق تعالیٰ عدم سے وجود میں لانا چاہتا ہے۔"

سید کبیرؒ نے بزرگ کی بات سن کر حیرت کا اظہار کیا۔

"تمہیں حق تعالیٰ سے اُمید رکھنا چاہئے کہ وہ ایک غیر معمولی بچہ ہوگا۔" بزرگ نے خواب کے بعض خفیہ گوشوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

سید کبیرؒ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتے تھے مگر بزرگ کی ہدایت کے بعد ان کا ارادہ بدل گیا اور انہوں نے بعض بے تکلف دوستوں کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا۔ پھر یہ خبر اُڑتے اُڑتے اس وقت کے بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچی۔......اور اس نے اپنی عفیفہ بیٹی کا نکاح کبیرؒ سے کر دیا۔

"لب تاریخ" کی روایت کے مطابق ہرات کے بادشاہ نے بھی ایک خواب دیکھا تھا اور اُسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کا عقد سید کبیرؒ سے کر دے۔ الغرض یہ شادی ہو گئی اور پھر حضرت لال شہباز قلندرؒ عالم اسباب میں ظاہر ہوئے۔ "لب تاریخ" کے مؤلف نے بادشاہ اور اس کی بلند کردار بیٹی کے نام تحریر نہیں کئے ہیں۔ جب حضرت قلندرؒ کی عمر مبارک چھ سال سال کی ہوئی تو ایک دن آپ کے والد محترم نے بہت غور سے اپنے بیٹے کے نقش و نگار دیکھے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی صورت اسی بچے سے ملتی تھی جسے سید کبیرؒ نے دو بار خواب میں دیکھا تھا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت بابا ابراہیمؒ اور پھر حضرت سید جمال شاہ مجردؒ سے خرقہ حاصل کرنے کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ "حرمین شریفین" کی زیارت کیلئے حاضر ہوئے۔ اس سفر کے دوران آپ کی ملاقات مشہور بزرگ حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ سے ہوئی۔ حضرت سرخ بخاریؒ، نامور صوفی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے دادا محترم تھے۔ حضرت سید جلال الدین بخاریؒ اور حضرت لال شہباز قلندرؒ میں قدرِ مشترک یہ تھی کہ دونوں سید زادے تھے، دونوں طالبان راہ حق تھے اور دونوں سرخ لباس پہنتے تھے۔

حضرت سرخ بخاریؒ اور حضرت لال شہباز قلندرؒ کئی سال تک مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ ان مقامات مقدسہ پر، دونوں بزرگوں نے مل کر سخت ریاضتیں اور مجاہدے کئے۔

پھر حضرت جلال الدین سرخ بخاریؒ اور حضرت لال شہباز قلندرؒ بخارا تشریف لے گئے۔ یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بعض روایتوں کے مطابق جب یہ دونوں بزرگ بخارا میں داخل ہوئے تو شہر کے محافظ سپاہیوں نے پوچھا کہ آپ کون لوگ ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟

جواب میں حضرت جلال الدین بخاریؒ نے فرمایا۔ ''ہم سید ہیں اور بخارا کے علماء کی صحبت سے فیضیاب ہونے کیلئے آئے ہیں۔''

سپاہی دونوں بزرگوں کو حاکم بخارا کے دربار میں لے گئے۔

''تمہارے پاس اس دعوے کی کیا دلیل ہے کہ تم لوگ سیدزادے ہو؟'' حاکم بخارا نے حضرت سرخ بخاریؒ اور حضرت قلندرؒ سے سوال کیا۔

''ہمارا اقرار ہی ہمارے دعوے کی دلیل ہے۔'' حضرت جلال الدین سرخ بخاریؒ نے فرمایا۔

''تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ بہت سے لوگ آل رسول ﷺ ہونے کے دعویدار ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس زمین پر سیدزادے بہت کم ہیں۔'' حضرت جلال الدین بخاریؒ کا جواب سن کر حاکم بخارا نے کہا۔ ''کسی شخص کا زبانی دعویٰ اس کے سید ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔''

''پھر آپ کس طرح مطمئن ہو سکتے ہیں؟'' حضرت سرخ بخاریؒ نے فرمایا۔ اس دوران حضرت لال شہباز قلندرؒ خاموش رہے۔

''روایت ہے کہ سید کو آگ نہیں جلاتی۔'' حاکم بخارا نے کہا۔ ''اگر تم لوگ آگ کے بھڑکتے ہوئے الاؤ سے سلامتی کے ساتھ گزر جاؤ تو میں اس بات کو تسلیم کرلوں گا کہ تم دونوں سیدزادے ہو۔''

حضرت جلال الدین بخاریؒ نے نہایت پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ ''حاکم بخارا! آگ بھڑکائیں، یہ سیدزادہ اس امتحان سے گزرنے کیلئے تیار ہے۔''

الغرض حاکم بخارا کے حکم پر آگ روشن کی گئی۔ پھر جب آگ کے شعلے پوری شدت کے ساتھ بھڑکنے لگے تو حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ بسم اللہ پڑھ کر آگ میں داخل ہوگئے۔ انسانی ہجوم نے خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کرلیں۔ حاکم بخارا کے ساتھ دیگر حاضرین کو بھی یقین تھا کہ آگ کے سرخ شعلے آن کی آن میں حضرت سرخ بخاریؒ کو جلا کر خاک کردیں گے...... مگر اس وقت بخارا کے باشندوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے حضرت جلال الدین بخاریؒ کو آگ کے درمیان بالکل محفوظ پایا۔ کچھ دیر بعد حضرت سرخ بخاریؒ زیر لب کچھ پڑھتے ہوئے باہر نکل آئے۔

حاکم بخارا نے برسرعام حضرت شیخؒ سے معافی مانگی اور اپنی بیٹی کا نکاح آپ سے کردیا۔

یہ واقعہ اپنی جگہ کتنا بھی درست ہو مگر سید کی قومیت یا حسب ونسب کو پرکھنے کا وہ معیار مناسب نہیں جو حاکم بخارا نے قائم کیا تھا۔ مذہبی تاریخ میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ مستند واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے جنہیں بادشاہ وقت نمرود نے منجنیق کے ذریعے بھڑکی ہوئی آگ میں پھینکا تھا...... اور جب خلیل اللہؑ کا جسم اقدس آگ کے شعلوں سے مس ہونے والا تھا، تو اسی لمحے آسمان سے حکم نازل ہوا تھا۔

''اے آگ! ٹھنڈی ہوجا سلامتی کے ساتھ ابراہیمؑ پر۔'' (ترجمہ)

پھر اسی حکم الٰہی کے ساتھ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے مہکتے ہوئے پھولوں میں تبدیل ہوگئے تھے۔ اس واقعے کے بعد جتنے بھی اہل ایمان آگ کی آزمائش سے گزرے ہیں، ان سب نے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کو زندہ کیا تھا...... اور وہ اسی آسمانی حکم کے زیر سایہ تھے۔ علامہ اقبالؒ کے بقول ؎

آج بھی ہو جو ابراہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

مگر یہ عقیدہ کہ سید وہی ہے جو آگ کے شعلوں میں محفوظ رہے، خلاف شریعت بھی ہے اور خلاف فطرت بھی۔ خلاف شریعت اس لئے کہ قرآن کریم اور حدیث رسول ﷺ میں ایسی کوئی سند موجود نہیں۔ آگ کا کام صرف جلانا ہے۔ اس لئے جو چیز بھی اس کی زد میں آئے گی جل کر راکھ ہوجائے گی۔ اب اگر کوئی اہل ایمان آتش سوزاں کے اثرات بد سے محفوظ رہتا ہے تو یہ محض اللہ کا کرم ہے اور اس حقیقت ازلی کا اظہار کہ دنیا کی ہر شے اللہ ہی کے حکم سے اپنے اندر مخصوص تاثیر رکھتی ہے اور جب اللہ چاہتا ہے تو ایک لمحے کے لاکھویں حصے میں اس کی تاثیر کو بدل ڈالتا ہے۔

حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے ایک مرید سیدی مولہؒ پر سلطان جلال الدین خلجی کے عہد حکومت میں بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ پھر جب سیدی مولہؒ زنجیروں میں جکڑ کر بادشاہ کے سامنے لائے گئے تو آپ نے باآواز بلند فرمایا۔

''میں حکومت وقت کو تسلیم کرتا ہوں اور میرا اس سازش سے کوئی تعلق نہیں۔''

سلطان جلال الدین خلجی کے چند مشیروں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ آگ بھڑکائی جائے اور پھر سیدی مولہؒ کو شعلوں کے درمیان سے گزارا جائے۔ اگر وہ بے گناہ ہوئے تو آگ سے محفوظ رہیں گے۔

سلطان جلال الدین خلجی اس آزمائشی ترکیب کیلئے آمادہ ہوگیا تھا مگر علمائے دربار نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''آگ کی فطرت جلانا ہے۔ یہ کسی شخص کے گناہ گار اور معصوم ہونے کا پیمانہ نہیں۔''

☆☆..................☆☆..................☆☆

حاکم بخارا کی بیٹی سے شادی کے بعد حضرت سید جلال الدین بخاریؒ اور حضرت لال شہباز قلندرؒ کچھ دنوں تک اسی تاریخی شہر میں سکونت پذیر رہے اور مختلف صاحبان معرفت سے کسب فیض کرتے رہے۔ ایک دن حضرت جلال الدین سرخ بخاریؒ پر جذب کی کیفیت طاری تھی۔ آپ نے اسی حالت میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''سید! میں نے آسمان معرفت پر ایک شہباز کو اُڑتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ شہباز تم ہو!''

الغرض چند ماہ بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ نے حضرت جلال الدین سرخ بخاریؒ سے اجازت چاہی اور بخارا سے رخصت ہوکر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زیارت کیلئے نجف اشرف حاضر ہوئے۔ یہاں مزارات پر آپ نے ... رہے تھے۔ آپ نے یہاں خواب میں دیکھا۔ کوئی بزرگ حضرت لال شہباز قلندرؒ کو مخاطب کرکے کہہ

"سید عثمان! تم بلا تاخیر کربلائے معلیٰ چلے جاؤ! وہاں تمہارے والد محترم مقیم ہیں اور تمہارے لیے بہت بے قرار و مضطرب ہیں۔"

اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت لال شہباز قلندرؒ حرمین شریفین کی زیارت کی غرض سے طویل سفر پر روانہ ہوئے تو آپ کے والد گرامی حضرت سید کبیرؒ کربلائے معلیٰ تشریف لے گئے تھے۔ اب ان کا آخری وقت قریب آ پہنچا تھا اور وہ بیٹے کو یاد کر کے بہت روتے تھے۔ اسی دوران حضرت لال شہباز قلندرؒ نے عالم خواب میں بزرگ کی ہدایت سنی اور پھر دوسرے دن کربلائے معلیٰ روانہ ہو گئے۔

حضرت سید کبیرؒ نے اپنے قلندر بیٹے کو سینے سے لگایا اور وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔ "فرزند! یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ میں نے اپنے اللہ سے عمر بھر بس ایک ہی دعا کی ہے کہ وہ ذات پاک تمہیں آزمائش میں ثابت قدم رکھے۔"

اس واقعے کے چند روز بعد حضرت سید کبیرؒ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت سید کبیرؒ کی وفات کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ کربلائے معلیٰ سے سبزوار تشریف لے گئے۔ یہاں آپ کے پیر و مرشد حضرت بابا ابراہیمؒ سکونت پذیر تھے۔ اپنے مرید کو دیکھ کر حضرت بابا ابراہیمؒ بے قرار ہو گئے۔

"سید! تم سے ملاقات کیلئے ہی اللہ تعالیٰ نے مجھے زندہ رکھا تھا۔"

"شیخ محترم! ابھی سالہا سال آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے گا۔" حضرت لال شہباز قلندرؒ بھی آبدیدہ ہو گئے۔

"نہیں سید!" حضرت بابا ابراہیمؒ نے فرمایا۔ "فرشتۂ اجل میرے دروازے پر آ پہنچا ہے۔ بس اندر آنے کی دیر ہے۔" یہ کہہ کر حضرت بابا ابراہیمؒ نے پیر و مرشد کا خرقہ اور دیگر تبرکات حضرت لال شہباز قلندرؒ کے حوالے کیے۔ "میرے پاس تمہارا جتنا خرقہ تھا تمہیں مل گیا۔ جب میں دنیا سے گزر جاؤں تو تم جمال شاہ مجردؒ کی خدمت میں حاضر ہو جانا۔ وہی تمہاری تکمیل کریں گے۔"

حضرت لال شہباز قلندرؒ مرشد کی جدائی کے تصور سے بہت رنجیدہ و ملول تھے مگر وقت معلوم کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا۔ چند روز بعد ہی حضرت بابا ابراہیمؒ بھی "دار فنا" سے "دار بقا" کی طرف کوچ کر گئے۔ والد گرامی سید کبیرؒ کے انتقال کے بعد یہ دوسرا المناک سانحہ تھا جسے حضرت لال شہباز قلندرؒ نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ مختصر سے عرصے میں دو محبوب ترین ہستیوں سے بچھڑنا اور پھر ان صدمات کو برداشت کرنا آسان کام نہیں تھا...... مگر حضرت لال شہباز قلندرؒ منزل تسلیم و رضا کے مسافر تھے، اس لئے آپ نے اسلام کے روایتی صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ والد ماجد اور پیر و مرشد کے فراق میں آپ کی آنکھیں اشکبار تھیں مگر ہونٹوں پر شور و فغاں نہیں تھا۔

بعض تاریخوں میں درج ہے کہ پیر و مرشد حضرت بابا ابراہیمؒ کی وفات کے بعد حضرت لال شہباز

قلندرؒ حضرت سید جمال شاہ مجردؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت قلندرؒ کے حوالے سے ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ کسی تذکرہ نگار نے آپ کے مرشد اول حضرت سید بابا ابراہیمؒ کے تفصیلی حالات تحریر نہیں کئے۔ کچھ یہی معاملہ حضرت جمال مجردؒ کا ہے۔ ان بزرگ کے بارے میں بھی کسی مؤرخ نے یہ نہیں لکھا کہ شاہ جمالؒ کون تھے اور کہاں مقیم تھے؟

ایک کتاب "الشہباز" حضرت قلندرؒ کے عام عقیدت مندوں میں بڑی شہرت رکھتی ہے۔ اس کے مؤلف جلیل سیوہانی ہیں۔ کتاب پر سن اشاعت بھی موجود نہیں، مصنف مذکور نے کسی تاریخی حوالے کے بغیر بہت سے واقعات تحریر کیے ہیں۔ جلیل سیوہانی کے بقول جب حضرت بابا ابراہیمؒ دنیا سے رخصت ہونے لگے تو حضرت لال شہباز قلندرؒ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

"تم اپنی منزل آسان تر کرنے کے بعد ہندوستان جاؤ اور وہاں پہنچ کر ہمارے طالب جمال شاہ مجردؒ سے اپنی امانتیں حاصل کرو۔"

"الشہباز" کے مصنف کے مطابق شیخ جمال شاہ مجردؒ ہندوستان میں سکونت پذیر تھے...... مگر کس شہر میں مقیم تھے، اس کا کوئی حوالہ کتاب میں نہیں ملتا۔ میری ناقص معلومات میں جمال شاہ مجردؒ نام کا کوئی صوفی ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے...... اور نہ اُنہوں نے کسی دوسرے ملک سے ہجرت کر کے سرزمین ہند کو رونق بخشی۔ پھر ہم جمال شاہ مجردؒ کو کہاں تلاش کریں؟...... اور اگر بالفرض ہم حضرت شیخ جمال مجردؒ کو نظر انداز کر دیں تو پھر حضرت لال شہباز قلندرؒ کی شخصیت کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ یہ اس دنیا کا ایک معروف کلیہ ہے کہ شاگرد اپنے استاد کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ دیگر علوم و فنون میں عموماً اور "صوفیت" میں خصوصاً، سلسلہ روحانی کا جاننا ضروری ہوتا ہے کہ فلاں صوفی تصوف کے فلاں خانوادے سے تعلق رکھتا ہے؟ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ چند بزرگ مادر زاد ولی پیدا ہوئے تھے مگر آگے چل کر اُنہیں بھی کسی مرشد کامل کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ اکثر مصنفین کی تحقیق کے مطابق حضرت لال شہباز قلندرؒ کے مرشد اوّل حضرت بابا سید ابراہیمؒ ہیں۔ مگر بدقسمتی سے کسی مستند تاریخ میں ان بزرگ کے حالات زندگی نظر نہیں آتے۔

حضرت قلندرؒ کے دوسرے مرشد حضرت شیخ جمال شاہ مجردؒ ہیں جنہوں نے آپ کی روحانی تربیت کو تکمیل تک پہنچایا۔ "سوانح لال شہباز قلندرؒ" کے مصنف مختار احمد کاشف نے مولانا غلام سرور لاہوری کی مشہور تصنیف "خزینۃ الاصفیا" کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔

"حضرت لال شہباز قلندرؒ، حضرت شیخ جمال مجردؒ کے مرید تھے اور شیخ جمالؒ کو حضرت سید ابراہیمؒ سے شرف ارادت حاصل تھا۔" "خزینۃ الاصفیا" کے حوالے سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ شیخ جمال مجردؒ کون بزرگ تھے؟ گزشتہ دنوں میں نے سلسلۂ چشتیہ کے نامور بزرگ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ پر ایک خصوصی مضمون تحریر کیا تھا۔ مطالعے کے دوران میرے ذہن میں ایک بزرگ کا نام محفوظ رہ گیا...... اور وہ بزرگ تھے سید جمال مجرد ساوجیؒ۔ حضرت چراغ دہلیؒ اپنی مشہور تصنیف "خیر المجالس" میں فرماتے ہیں۔

''سید جمال ساوَجیؒ ایک طویل مدت تک مصر میں مفتی کے عہدے پر فائز رہے۔
باشندے حضرت ساوَجیؒ کو ''کتب خانۂ رواں'' (چلتی پھرتی لائبریری) کہا کرتے تھے۔
مجردؒ کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ کھڑے کھڑے مشکل سے مشکل سوال کا جواب دیتے تھے۔
حوالہ پیش کرتے وقت کبھی کتاب کھول کر نہیں دیکھی۔ علماء نے سید جمال ساوَجیؒ کو بارہا آزمایا اور ہر
مرتبہ آپ کا جواب درست پایا۔ پھر ایک دن حضرت جمال ساوَجیؒ پر ایک عجیب جذبہ طاری
ہوا کہ آپ نے داڑھی مونچھیں منڈوا دیں اور قبرستان میں جا کر بیٹھ گئے۔ حضرت سید جمال
ایک متقی اور پابند صوم وصلوٰۃ انسان تھے..... مگر جب آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہوئی تو
رسم ورواج کے ساتھ ساتھ نمازیں بھی چھوٹ جاتیں۔

حضرت سید جمال ساوَجیؒ کا اس طرح قبرستان میں گوشہ نشیں ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔
کچھ دن بعد علمائے مصر نے آپ کو اپنی مجلسوں سے غیر حاضر پایا تو ان کے شاگردوں اور معتقدین سے
پوچھا کہ شیخ ساوَجیؒ کہاں ہیں؟

شاگردوں نے روتے ہوئے اپنے شیخ کی حالت بیان کی۔ ''وہ آج کل گورستان کے سناٹوں میں
رہتے ہیں اور اپنے قریبی دوستوں تک کو نہیں پہچانتے۔''

علمائے مصر نے ساوَجیؒ کا یہ حال سنا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر مصر کے سب سے بڑے عالم جو
''ملک العلماء'' کہلاتے تھے، اپنے ہمراہ علمائے ظاہر کی ایک جماعت لے کر قبرستان پہنچے۔ اس
وقت حضرت سید جمال مجرد ساوَجیؒ قبلہ رخ بیٹھے تھے۔ آپ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ایسا محسوس
ہو رہا تھا جیسے کسی خاص منظر کے مشاہدے میں گم ہیں۔

ملک العلماء نے باآواز بلند سلام کیا..... مگر حضرت سید جمال ساوَجیؒ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر
دوسرے علماء نے مسنون طریقے کے مطابق سلام کیا لیکن اس بار بھی حضرت جمال ساوَجیؒ نے
جواب نہیں دیا بلکہ ان کے جسم کو حرکت تک نہ ہوئی۔ مصر کے ملک العلماء نے سوچا کہ ساوَجیؒ جان
بوجھ کر علماء کی جماعت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس لئے بار بار سید جمالؒ کو جھنجھوڑا گیا مگر ان کے
حیرت وسکوت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ علمائے مصر کی جماعت سید جمال ساوَجیؒ کے پاس اس لئے گئی
تھی کہ ان کا احتساب کر کے اُنہیں دوبارہ نماز اور دیگر مذہبی اُمور کی تلقین کی جائے۔ ملک العلماء کا
خیال تھا کہ حضرت جمال ساوَجیؒ احتساب سے بچنے کیلئے خود کو فاتر العقل اور دیوانہ ثابت کرنے کی
کوشش کر رہے ہیں۔

''شیخ جمال! تم نے یہ غیر مسلموں کا سا حلیہ کیوں بنایا ہے اور نماز کیوں ترک کی ہے؟'' ملک
العلماء نے اتمام حجت کیلئے آخری بار حضرت سید جمال ساوَجیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ملک العلماء نے تین بار یہی سوال دہرایا مگر سید جمال ساوَجیؒ نے کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ نہ پلکیں
جھپکائیں اور نہ اپنی نشست کا زاویہ تبدیل کیا۔

آخر ملک العلماء نے سزا کے طور پر رانگ (دھات) کو پگھلا کر ساوَجیؒ کے حلق میں ڈال دینے

کا حکم جاری کر دیا۔ الغرض رانگ کو پگھلایا گیا اور پھر زبردستی حضرت سید جمال ساوَجیؒ کے حلق میں وہ
دھات ڈال دی گئی۔ علماء کی جماعت کو یقین تھا کہ اس تکلیف دہ سزا سے گزرتے ہوئے شیخ
چیخ اُٹھیں گے..... مگر اس وقت حاضرین کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب سید جمال
ساوَجیؒ اسی طرح ساکت بیٹھے رہے۔ پگھلا ہوا سیسہ حلق سے اُتر گیا اور آپ نے اُف تک نہ کی۔ یہ
ولی کی قوت برداشت اور مشاہدۂ حق میں محویت کی اعلیٰ ترین مثال تھی۔ اس واقعے کا دوسرا حیرت
انگیز اور ناقابل یقین پہلو یہ تھا کہ پگھلی ہوئی دھات نے حضرت سید جمالؒ کو کوئی گزند نہیں پہنچایا۔
آخر ملک العلماء اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔

''شیخ جمال کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اب اللہ ہی ان کے معاملات کو درست کر سکتا ہے۔''

پھر کئی صدیاں گزر جانے کے بعد مشہور صوفی سیاح حضرت حامد بن فضل اللہ جمالیؒ مصر پہنچے اور
حضرت سید جمال ساوَجیؒ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں۔ حضرت جمالیؒ اپنی کتاب
''سیر العارفین'' میں تحریر فرماتے ہیں۔

''یہ احقر جمالی جب اس مقام مقدس پر پہنچا تو میں نے اس علاقے کے علماء اور دیگر اکابرین کی
زبانی جو معتبر لوگ تھے، یہ سنا کہ حضرت سید جمالؒ ایک طویل عرصے تک مصر میں مقیم رہے۔ وہ بہت
خوبصورت اور نہایت باکمال انسان تھے۔ صاحب جمال ہونے کی وجہ سے مصر کے لوگ اُنہیں
''یوسف ثانی'' کہتے تھے۔ پھر ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے حضرت سید جمالؒ کی دنیا ہی
بدل ڈالی۔ جس طرح عزیز مصر کی بیوی زلیخا، حضرت یوسف علیہ السلام پر عاشق ہو کر تمام اخلاقی
حدود سے گزر گئی تھی، بالکل اسی طرح امرائے مصر میں سے ایک مشہور رئیس کی بیوی حضرت سید جمالؒ
کے حسن پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ اس بے راہ رو عورت نے شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور بے حجابانہ
حضرت سید جمالؒ کی عبادت وریاضت میں خلل انداز ہوتی تھی۔

حضرت سید جمالؒ کو ''مجرد'' اس لئے کہتے ہیں کہ آپ نے شادی نہیں کی تھی۔ ''خزینۃ الاصفیا''
کے بیان کے مطابق آپ کے پیرو مرشد حضرت سید بابا ابراہیمؒ نے بھی رشتۂ ازدواج قائم نہیں کیا تھا
اور ساری زندگی تجرد کے عالم میں بسر کی تھی۔ اپنے پیشواؤں کے اسی دستور پر عمل کرتے ہوئے
حضرت لال شہباز قلندرؒ نے بھی شادی نہیں کی اور عمر عزیز اپنے سلسلۂ روحانی کی تبلیغ میں گزار دی۔

ان تمام روایتوں کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت سید جمال مجردؒ ہی حضرت
قلندرؒ کے مرشد تھے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ''ساوَجی'' کا لفظ بگڑتے بگڑتے ''شاہ جی'' بن گیا اور پھر
تذکرہ نویسوں نے آپ کے اسم گرامی کے ساتھ ''شاہ'' لکھنا شروع کر دیا۔ تاریخ کی روشنی میں یہ
روایت درست نہیں کہ حضرت سید جمال مجردؒ ہندوستان میں مقیم تھے۔ اور حضرت بابا ابراہیمؒ نے لال
شہباز قلندرؒ کو ہدایت کی تھی کہ وہ ہندوستان پہنچ کر حضرت سید جمالؒ سے اپنی امانتیں حاصل کر لیں۔
حضرت شیخ جمالؒ ایک دن کیلئے بھی ہندوستان تشریف نہیں لائے۔ آپ نے اپنے آخری ایام
''دمیاط'' میں گزارے اور اسی مقام پر آسودۂ خاک ہوئے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ بھی حضرت سید

جمالؒ سے فیض روحانی حاصل کرنے کیلئے ''دمیات'' میں حاضر ہوئے تھے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض مؤرخین نے ''مرند'' کو حضرت لال شہباز قلندرؒ کا آبائی وطن قرار دیا ہے۔ ''مرند'' آذر بائیجان کا علاقہ ہے اور آپ اسی مقام پر پیدا ہوئے تھے۔ اسی طرح آپ کے سلسلۂ روحانی میں بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ ''قلندر نامہ'' کے مصنف حکیم فتح سیوہانی دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کا سلسلۂ روحانی حضرت امام زین العابدین کے واسطے سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ان کے نزدیک سید جمالؒ حضرت شیخ علیؒ کے مرید تھے اور شیخ علیؒ حضرت امام موسیٰ رضاؒ کے صاحبزادے تھے۔ اس روحانی سلسلے میں حضرت بابا سید ابراہیمؒ کا نام موجود نہیں۔

کئی تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت لال شہباز قلندرؒ سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ''تذکرۃ الفقراء'' میں یہ شجرۂ روحانی حضرت سید جمالؒ، حضرت بابا ابراہیمؒ اور حضرت مرتضٰی سبحانیؒ کے واسطے سے حضرت احمد بن مبارک تک پہنچتا ہے اور شیخ احمد بن مبارکؒ غوث اعظمؒ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے مرید تھے۔ اس روحانی سلسلے میں حضرت سید بابا ابراہیمؒ کا اسم گرامی موجود ہے اور حضرت سید جمالؒ کو ان کا مرید ظاہر کیا گیا ہے۔ اس تحقیق میں قابل اعتراض پہلو یہ ہے کہ سلسلہ قادریہ اور سلسلۂ قلندریہ میں بظاہر کوئی نسبت نہیں۔ دونوں سلسلے طریق سلوک کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف اور جدا ہیں۔

اکثر محققین کی رائے کے مطابق سلسلۂ قلندریہ کے بانی حضرت سید جمال مجردؒ ہیں۔ اس طرح اپنے بزرگوں کے واسطے سے شیخ جمالؒ کو تو سلسلۂ قادریہ سے نسبت ہو سکتی ہے مگر حضرت لال شہباز قلندرؒ براہ راست حضرت غوث اعظمؒ کے سلسلۂ روحانی میں شامل نہیں ہو سکتے۔ جب طریقہ، مسلک اور تعلیم بدل جائے تو ایک سلسلہ دوسرے سلسلے سے جدا ہو جاتا ہے اور مختلف حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت لال شہباز قلندرؒ، حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید تھے۔ مولانا نور احمد خان فریدی اپنی کتاب ''تذکرہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ'' میں تحریر کرتے ہیں۔

''حضرت مخدوم سید عثمان مروندی لعل شہباز قلندرؒ پابند شریعت بزرگ تھے۔ اگرچہ آپ شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے لیکن حضور آپ کو دوستوں میں شمار فرماتے تھے۔ صوفیاء میں جو چار یار مشہور ہیں، ان سے حضرت بہاء الدین زکریاؒ، حضرت شیخ العالم فریدالدین مسعود گنج شکرؒ، سید السادات حضرت جلال الدین بخاریؒ اور مخدوم شیخ عثمان مروندیؒ مراد ہیں۔''

آگے چل کر مولانا نور احمد خان فریدیؒ تحریر کرتے ہیں۔ ''معراج الولایت'' کی عبارت سے شروع شروع میں نیاز مند کو بھی حضرت مخدوم لال شہباز قلندرؒ کے بارے میں یہ شبہ ہوا تھا کہ انتہائی جذب و مستی کی وجہ سے آپ احکام شریعت کے پابند نہیں تھے...... لیکن جب احقر نے سہون شریف میں چپے چپے پر ان کی عبادت گاہیں دیکھیں تو عبارت کی صحت پر یقین نہیں آیا...... اور پھر وہ ذات

جو حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ جیسی سرکار شریعت کی صحبت میں ایک دو دن نہیں بلکہ کئی برس گزار چکی ہو، اس کے متعلق اس قسم کی رائے تہمت نہیں تو کیا ہے؟

ہم ناقص کے نزدیک مولانا فریدی صاحب کی یہ دلیل بے وزن ہے۔ اگر حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی ارادت کو بنیاد بنا کر یہ دعویٰ کیا جائے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ پر جذب و کیف کی حالت طاری نہیں ہو سکتی تو ہمیں حضرت منصور حلاجؒ کے حالات زندگی کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ حضرت حسین بن منصورؒ بھی سالہا سال حضرت شیخ عمرو بن عثمان مکیؒ، حضرت سہل تستریؒ، حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ اور سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ جیسے اکابر مشائخ کی صحبتوں میں رہے تھے مگر پھر بھی ''نعرۂ انا الحق'' بلند کرتے رہے۔ حضرت حلاجؒ کی یہ کیفیت خود اختیاری نہیں بلکہ اضطراری تھی۔ اسی وجہ سے غوث اعظم حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت سید علی ہجویری داتا گنج بخشؒ نے حضرت حسین بن منصورؒ کو ''مہجور'' اور ''مجبور'' قرار دیا ہے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے ساتھ بھی یہی صورتحال پیش آئی تھی۔ اگر ہم یہ بات تسلیم بھی کر لیں کہ حضرت قلندرؒ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے، تب بھی اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت لال شہبازؒ کی زندگی کا بڑا حصہ جذب و مستی کی حالت میں گزرا ہے۔ ان کے طریق سلوک اور حضرت مخدوم بہاء الدین زکریاؒ کے طریق سلوک میں بڑا فرق تھا۔ صوفیا کی جماعت میں فارسی زبان کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

نماز زاہداں سجدہ سجود است
نماز عاشقاں ترک وجود است

(زاہدوں کی نماز یہ ہے کہ وہ رکوع و سجود کرتے ہیں۔ اس کے برعکس عاشقوں کی نماز یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کو ترک کر دیتے ہیں)

ترک وجود سے شاعر کی مراد یہ ہے کہ عشاق مشاہدۂ حق میں مکمل طور پر گم ہو جاتے ہیں اور انہیں اپنی جان تک کا ہوش نہیں رہتا۔ جب بندہ بے خبری کی اس منزل تک پہنچ جائے تو پھر ساری دنیا جانتی ہے کہ اس کی نماز اور دیگر عبادتیں بھی قضا ہو جاتی ہیں۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے اسی جذب و کیف کو دیکھ کر ''معراج الولایت'' کے مصنف نے یہ لکھ دیا ہوگا کہ انتہائی مستی کے سبب وہ احکام شریعت کے پابند نہیں تھے۔ اگر کوئی صوفی ہوش کے عالم میں یہ ہے کہ زاہدوں کی نماز سجدہ و سجود ہے اور ترک وجود کر رہا ہوں تو اس کا یہ قول شریعت کی کھلی خلاف ورزی ہوگا۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے اپنی مثنوی میں ایک مجذوب کا واقعہ بیان کیا ہے جو حق تعالیٰ سے ناراض ہو کر کوہ طور پر یا کسی جنگل میں جا بیٹھا تھا۔ اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ اس بندے کے پاس جائیں اور اسے ہماری حکمت و قدرت کے اسرار سمجھائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس شخص کے گستاخانہ عمل پر غصہ آیا تو حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر جلیلؑ پر ''ہوش و مستی'' کے فرق کو اس طرح ظاہر کیا۔

موسیا! آداب داناں دیگر انند
سوختہ جان و رواناں دیگر انند

(اے موسیٰ! ہوش مندوں کے آداب، الگ ہیں اور جلے ہوئے جسموں اور جانوں کے [illegible] جدا۔ یعنی جو لوگ ہمارے عشق میں جل کر راکھ ہوگئے ہیں ان کے طریقے ہوش مند [illegible] انسانوں سے مختلف ہوتے ہیں)

حضرت سید علی ہجویریؒ نے حضرت منصور حلاجؒ کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے بہت خوبصورت اور متوازن بات کہی تھی کہ حضرت منصورؒ "مہجور الاصل" نہیں تھے بلکہ اپنے اعمال [illegible] وجہ سے "مہجور" قرار دیئے گئے تھے۔ یعنی حضرت منصور حلاجؒ بنیادی طور پر موحد تھے۔ مہجور (بچھڑے ہوئے) نہیں تھے بلکہ اپنے بعض اعمال کے سبب شریعت کے قافلے سے بچھڑ گئے تھے۔ اسی سلسلے میں حضرت داتا گنج بخشؒ کا یہ قول مبارک بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔

"ایسے لوگ (یعنی مجذوبین) پسندیدہ تو ہوتے ہیں مگر ان کے اعمال و افعال تقلید کے لائق نہیں ہوتے۔"

شریعت کے سلسلے میں اس سے بھی زیادہ واضح بات امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ نے فرمائی تھی۔ حاضرین مجلس میں سے کسی شخص نے سوال کیا۔ "امام! آپ کے قول کی کیا حیثیت ہے؟"

جواب میں حضرت امام اعظمؒ نے فرمایا۔ "میرا ہر قول اور میری ہر رائے قرآن و سنت کے مطابق ہوتی ہے۔"

"اگر آپ کا کوئی قول قرآن کریم اور حدیث رسول ﷺ سے متصادم ہو؟" اسی شخص نے دوسرا سوال کیا۔

حضرت امام اعظمؒ نے بے اختیار فرمایا۔ "اگر کبھی ایسی صورتحال پیش آجائے تو میرے قول کو دیوار پر مار دو۔"

حضرت ابوحنیفہؒ کے استاد گرامی حضرت امام شعبیؒ قرآن و سنت کے معاملے میں بہت زیادہ جذباتی تھے۔ سیکڑوں علماء کے ہجوم میں برسر مجلس فرمایا کرتے تھے۔ "اگر میرا کوئی قول قرآن و سنت کے خلاف نظر آئے تو اس پر پیشاب کردو۔"

صوفیاء کے سلسلے میں عام مسلمان کو آئمہ مجتہدین کے اسی قول مبارک پر عمل کرنا چاہئے ورنہ شدید گمراہی کا خطرہ ہے...... اور حضرت داتا گنج بخشؒ کے بقول۔ "اس میں بڑا فتنہ اور بڑی ہلاکت ہے۔"

☆☆..................☆☆..................☆☆

اب ہم کچھ ایسے تاریخی حقائق پیش کریں گے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ، شیخ الاسلام حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید اور خلیفہ نہیں تھے...... محض صحبت یافتہ، دوست اور جلیس تھے۔

ڈاکٹر عبدالمجید سندھی اپنی کتاب "پاکستان میں صوفیانہ تحریکیں" میں صفحہ 323 پر تحریر کرتے ہیں۔

[illegible] تذکروں میں آیا ہے کہ حضرت سید عثمان قلندر شہبازؒ، حضرت غوث بہاء الحق زکریا ملتانیؒ کے [illegible] ہوئے تھے...... لیکن یہ درست نہیں ہے۔ حضرت قلندر شہبازؒ کا طریقہ قلندری تھا جو سلسلۂ [illegible] سے مختلف تھا...... اور قلندری سلسلے کی نسبت حضرت سید جمال مجردؒ سے ہے۔"

ہم بڑی آسانی سے اس روایت کی عقلی توجیہہ پیش کر سکتے ہیں کہ جب دونوں بزرگوں کے طریقہ ہائے سلوک میں نمایاں فرق اور اختلاف پایا جاتا ہے تو پھر حضرت لال شہباز قلندرؒ، حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید کس طرح ہو سکتے ہیں؟ مرید کا تو مفہوم ہی یہ ہے کہ وہ اپنے مرشد کے ایک ایک عمل کا قائل بھی ہوتا ہے اور مقلد بھی۔ اگر بالفرض کسی معاملے میں پیر سے اختلاف بھی رکھتا ہو تو زندگی بھر اپنے زبان و عمل سے اس کا اظہار نہیں کرتا۔ حضرت بابا فریدؒ ایک دن حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کی کتاب "عوارف المعارف" کا درس دے رہے تھے۔ حضرت بابا فریدؒ کے پاس کتاب کا جو نسخہ موجود تھا اس میں کسی مقام پر کتابت دھندلی تھی یا کوئی اور مشکل درپیش تھی۔ حضرت بابا فریدؒ نے کچھ دیر کیلئے توقف فرمایا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے عرض کیا۔

"سیدی! میں نے عوارف المعارف کا اس سے بہتر نسخہ کسی شخص کے پاس دیکھا ہے۔"

اپنے محبوب مرید کی بات سن کر حضرت بابا فریدؒ کے چہرۂ مبارک پر ناخوشگواری کا رنگ اُبھر آیا۔ پھر حضرت محبوب الٰہیؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "سید نظام! کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ بوڑھا کتابت کی غلطی درست کرنے اور اس کا مفہوم سمجھانے پر قادر نہیں ہے؟"

جیسے ہی پیر و مرشد کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، حضرت محبوب الٰہیؒ کے ہوش اُڑ گئے۔ پھر آپ نے نہایت عاجزانہ لہجے میں حضرت بابا فریدؒ سے معافی مانگی۔ "سیدی! میرا یہ مفہوم ہرگز نہیں تھا۔"

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ جب تک حیات رہے، اس واقعے پر افسوس کرتے رہے۔

"کاش! پیر و مرشد کے سامنے میری زبان سے یہ الفاظ ادا نہ ہوتے۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایک معمولی سے اختلاف کو جو دراصل اختلاف بھی نہیں تھا، اتنی شدت سے محسوس کیا۔ پھر زندگی بھر اس واقعے کو بیان کر کے روتے رہے اور اظہار ندامت کرتے رہے۔

جبکہ ہم حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اور حضرت لال شہباز قلندرؒ کے طریقہ ہائے سلوک میں [illegible] اختلاف پاتے ہیں۔ یہ فرق دونوں بزرگوں کی زندگی میں بھی قائم رہا اور وصال کے بعد بھی [illegible]۔ انتہا یہ ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ فرق و اختلاف اسی طرح موجود ہے۔ ہم کھلی آنکھوں سے آج بھی دیکھ سکتے ہیں کہ "خانقاہ زکریاؒ" کی رسمیں الگ ہیں اور "خانقاہ قلندریہ" کے آداب جداگانہ۔

ایک بار حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے توحید کے مسئلے پر گفتگو کی۔ پھر جب اس واقعے کی اطلاع حضرت جنید بغدادیؒ کو ہوئی تو آپ نے اپنے مرید خاص کو تنبیہہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "شبلی! تمہیں محتاط رہنا چاہئے۔ آئندہ تم ایسے نازک مسائل پر عام مجلسوں میں تقریر نہیں کرو گے۔"

پیرومرشد کی اس تنبیہہ کے بعد حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے زندگی بھر ایسے نازک موضوعات پر لوگوں سے گفتگو نہیں کی۔

جب حضرت منصور حلاجؒ، حضرت جنید بغدادیؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے تو آپ نے اپنے مرید کو ہدایت کرتے ہوئے فرمایا۔ ''حسین! تم صبروسکون سے رہو اور گوشہ نشینی اختیار کرو۔'' حضرت حسین بن منصورؒ نے پیرومرشد کی اس ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ نتیجتاً حضرت حلاجؒ مجذوب قرار پائے اور حضرت جنید بغدادیؒ ان سے خفا ہوگئے۔ اسی طرح حضرت حسین بن منصورؒ کی بے باکانہ گفتگو کی وجہ سے حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ بھی ان سے ناراض ہوگئے تھے۔

اس تمام گفتگو کا ماحاصل یہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے دو انسانوں میں پیری اور مریدی کا رشتہ قائم نہیں ہوسکتا۔ تمام تاریخوں سے ثابت ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ میدان تصوف میں ایک مختلف نظریہ رکھتے تھے، اس لئے آپ حضرت مخدوم بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کے مرید نہیں ہوسکتے۔ اس سلسلے میں دوسری اہم دلیل یہ ہے کہ کوئی مرید، محبوبیت کے کسی درجے پر بھی فائز ہو مگر مرشد کی بارگاہ میں ''دوست'' کی حیثیت اختیار نہیں کرسکتا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

آگے چل کر مولانا نوراحمد خان تحریر کرتے ہیں۔ ''بعض تذکروں میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کو ملامتی ظاہر کیا گیا ہے۔ اس لئے آپ احکام شریعت کے پابند نہیں رہ سکتے تھے۔ خاکسار نے اہل علم و فضل سے تحقیق کی تو انہوں نے اسے تہمت قرار دیا۔ خاکسار کی بھی یہی رائے ہے کیونکہ حضرت بہاءالدین زکریاؒ جیسے شیخ کامل کا دوست اور خلیفۂ کامل، ملامتی نہیں ہوسکتا۔ بالخصوص جب لال باغ اور پہاڑ کی نشست گاہ میں آپ کے مصلے زبان حال سے آپ کے متبع شریعت ہونے کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں۔''

صوفیا میں ایک فرقہ ''ملامتیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق اس فرقے کے بانی مشہور صوفی بزرگ حضرت بایزید بسطامیؒ تھے۔ اس فرقے سے تعلق رکھنے والے صوفی اپنے آپ کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ دیکھنے والے انہیں ملامت کریں۔ مثال کیلئے ہم حضرت بایزید بسطامیؒ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ پیش کرتے ہیں، اس وقت حضرت شیخؒ کی شہرت عام تھی اور لوگ آپ کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے بےقرار رہا کرتے تھے۔

رمضان المبارک کا مہینہ تھا، ایک دن عقیدت مندوں کی ایک جماعت آپ کے دیدار کیلئے حاضر ہوئی۔ جب خدمت گار نے حضرت بایزید بسطامیؒ کو اطلاع دی تو آپ نے رات کی بچی ہوئی روٹی کا ایک ٹکڑا اُٹھایا اور اسے کھاتے ہوئے دروازے پر تشریف لائے۔ جب لوگوں نے حضرت شیخؒ کو روٹی کھاتے ہوئے دیکھا تو پوری شدت کے ساتھ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

''آپ کیسے بزرگ ہیں کہ رمضان کے فرض روزے بھی نہیں رکھتے...... اور اگر کوئی شرعی عذر درپیش تھا تو کم سے کم اس مقدس مہینے کا احترام ہی کرلیا ہوتا۔'' عقیدت برہمی میں تبدیل ہوئی، احترام نفرت میں بدل گیا......اور لوگوں کا ہجوم ملامت کرتا ہوا واپس چلا گیا۔

پھر جب لوگ اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئے تو حضرت بایزید بسطامیؒ نے روٹی کا نوالہ زمین پر تھوک دیا۔ اس وقت حضرت شیخؒ روزے سے تھے مگر لوگوں کی عقیدت کا طلسم توڑنے کیلئے آپ نے خود کو ''بے روزہ'' ثابت کیا اور نفس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''تو نے سن لیا کہ لوگ تجھے کیا کہہ رہے ہیں۔ یاد رکھ کہ میں آئندہ بھی تجھے اسی طرح اذیتیں پہنچاؤں گا اور ہرگز اس لذت سے سرشار نہیں ہونے دوں گا کہ دنیا والے تجھے متقی اور پرہیزگار کہہ کر پکاریں۔''

حضرت بایزید بسطامیؒ نے اپنی ساری زندگی ''ملامت'' کے اسی خارزار میں گزاری......مگر جب حضرت جنید بغدادیؒ کے ایک مرید نے برسر مجلس حضرت بایزید بسطامیؒ کا مقام معرفت جاننا چاہا تو حضرت شیخؒ نے پُرزور لہجے میں فرمایا۔

''ہم صوفیا میں بایزیدؒ کا وہی مقام ہے جو ملائکہ (فرشتوں) میں حضرت جبریل امینؑ کا۔''

ویسے ہمیں اس حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ''ملامتی'' ہونا کوئی تحقیر کی بات نہیں۔ یہ تو ایک انتہائی دشوار راستہ ہے، جس پر مردان جانباز ہی گامزن ہوسکتے ہیں۔ حضرت بہاءالدین زکریاؒ کے خلیفہ اور فارسی کے مشہور صوفی شاعر مولانا فخرالدین عراقی کے بقول ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(یہ کسی دشمن کا نصیب کہاں کہ وہ تیری تیغ سے ہلاک ہوجائے۔ بس تیرے دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو اس پر خنجر آزمائی کرتا رہے۔)

اور جہاں تک حضرت لال شہباز قلندرؒ کے مسلک کا سوال ہے تو آپ خود اپنی زبان سے ''ملامتی'' ہونے کا اعلان کرتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے ؎

منم عثمان مروندی کہ یار خواجہ منصورم
ملامت می کند خلقے و من بردار می رقصم

(میں عثمان مروندی ہوں کہ خواجہ منصور میرے دوست ہیں۔ ساری دنیا مجھے ملامت کرتی ہے اور میں ملامت کے بوجھ کو اُٹھائے ہوئے رقص کرتا ہوں)

یہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی اس مشہور غزل کا مقطع ہے جو صوفیانہ شاعری میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے خیال میں خواجہ منصورؒ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے مرشد تھے...... مگر ہمارے نزدیک خواجہ منصور سے مراد حضرت منصور حلاجؒ ہیں...... کیونکہ حضرت حسین بن منصورؒ کو بھی دنیا ملامت کرتی تھی اور آپ مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ان اذیتوں کو برداشت کرتے تھے۔

''معارج الولایت'' میری نظر سے نہیں گزری مگر مولانا نوراحمد خان فریدی نے اس کتاب کا ایک اقتباس اپنی تالیف ''تذکرہ حضرت بہاءالدین زکریا ملتانیؒ'' میں پیش کیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

''وہ صاحب کمالات ظاہری و باطنی تھے اور صوری و معنوی تصرفات رکھتے تھے۔ ان سے خوارق
کرامات بے اختیار ظاہر ہوتی تھیں۔ وہ سندھ میں رہتے تھے اور سادات حسینی سے تعلق رکھتے تھے۔
ان کا نام نامی سید عثمان تھا اور وہ شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔
جب ان پر جذب و مستی کا غلبہ ہوتا تھا تو وہ احکام شریعت کے پابند نہیں رہتے تھے۔ سید عثمانؒ
لباس پہنتے تھے اور انہیں ''لال شہباز'' کا خطاب ان کے پیر روشن ضمیر کی بارگاہ سے عطا ہوا تھا۔''
عبارت فارسی زبان میں تھی۔ میں نے حرف بہ حرف اس کا ترجمہ پیش کر دیا ہے۔

''معارج الولایت'' کے مطالعے سے حضرت لال شہباز قلندرؒ کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔

ایک یہ کہ جب حضرت قلندرؒ پر جذب و مستی کا زیادہ غلبہ ہوتا تھا تو آپ سے احکام شریعت ساقط ہو جاتے تھے۔ اس موضوع پر گزشتہ صفحات میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔

دوسرے یہ کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ، حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اس سلسلے میں بھی مختلف تذکرہ نگاروں کی تحقیقات کا جائزہ لیا جا چکا ہے اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ دونوں بزرگوں کے درمیان صرف دوستی کا رشتہ قائم تھا۔

تیسرا اہم پہلو یہ کہ شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریاؒ نے اپنے مرید حضرت سید عثمانؒ کو ''لال شہباز'' کا خطاب عطا کیا تھا۔ ہمارے نزدیک یہ روایت بھی درست نہیں۔ حضرت بابا سید ابراہیمؒ بہت پہلے حضرت قلندرؒ کو اسی نام سے پکارا کرتے تھے۔ پھر بخارا کے سفر کے دوران حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ نے ایک بار آپ کو ''شہباز معرفت'' کہہ کر پکارا تھا۔ ان تمام روایتوں کی روشنی میں جب حضرت قلندرؒ سندھ میں داخل ہوئے تو ''لال شہباز'' کا لقب شہرت عام حاصل کر چکا تھا۔

اب ہم مولانا نور احمد فریدی کے حوالے سے ''منبع البرکات'' کی ایک اور روایت کا جائزہ لیں گے۔ اس کتاب میں درج ہے کہ جب حضرت لال شہباز قلندرؒ کے بارے میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ آپ احکام شریعت پر عمل نہیں کرتے تو ملتان کے قاضی قطب الدین کاشانیؒ نے آپ پر ''فسق'' کا فتویٰ لگا دیا۔ ''فسق'' کے لغوی معنی ہیں، احکام الٰہی کو قصداً ترک کرنا...... دوسرے معنی ہیں بداعمالی۔

ہم اپنے مضمون حضرت بہاء الدین زکریا میں علامہ قطب الدین کاشانیؒ کا ذکر تفصیل سے کر چکے ہیں، ملتان کا حاکم ناصر الدین قباچہ، حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی مقبولیت کو اپنی حکومت کیلئے ایک مستقل خطرہ سمجھتا تھا۔ نتیجتاً قباچہ نے کاشان سے علامہ قطب الدینؒ کو ملتان آنے کی دعوت دی تا کہ مذہبی حلقوں میں حضرت شیخ الاسلام کے اثرات کو کم کیا جا سکے۔ علامہ کاشانیؒ صوفیوں اور درویشوں کے قائل نہیں تھے۔ ناصر الدین قباچہ نے جامع مسجد کے ساتھ ایک بہت بڑا مدرسہ تعمیر کرایا اور قطب الدین کاشانیؒ اس کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے۔ حکومتی سطح پر علامہ موصوف کی بہت پذیرائی کی گئی۔ ناصر الدین قباچہ نے بطور خاص اپنے سپاہیوں اور امراء کو حکم دیا تھا کہ وہ علامہ قطب الدین کاشانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کریں۔ یہی وہ قاضی قطب الدین کاشانیؒ ہیں جنہوں نے حضرت

شہباز قلندرؒ کے جذب و مستی کے واقعات سن کر ان پر ''فسق'' کا فتویٰ عائد کر دیا تھا۔ ''منبع البرکات'' کی روایت کو مولانا نور احمد فریدی صاحب نے اس طرح بیان کیا ہے۔

ان دنوں حضرت لال شہباز قلندرؒ ملتان کے کسی قریبی گاؤں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اپنی قاضی صاحب کی یہ جسارت برداشت نہ ہوئی۔ برہم ہو کر اُٹھے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چل دیئے۔ شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریاؒ مسند ارشاد پر تشریف رکھتے تھے۔ اس وقت حضرت کا مجلس خانہ علماء اور مشائخ سے بھرا ہوا تھا۔ ''قال اللہ'' اور ''قال الرسول'' سے مجلس گرم تھی۔ شور اُٹھا کہ سندھ سے شیخ عثمانؒ نامی کوئی بزرگ قاضی قطب الدین کاشانیؒ سے ٹکر لینے کیلئے بگولے کی طرح اُڑے چلے آ رہے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلامؒ اپنے جواں سال بھتیجے شیخ حسنؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''انہیں سمجھا بجھا کر میرے پاس لے آؤ۔''

شیخ حسنؒ نے کچھ فاصلہ طے کر کے مخدوم عثمانؒ کا استقبال کیا۔ ''میرے عم بزرگوار حضرت شیخ الاسلامؒ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

مخدوم عثمانؒ (حضرت لال شہباز قلندرؒ) حضرت بہاء الدین زکریاؒ کا نام سنتے ہی ٹھنڈے پڑ گئے اور شیخ حسنؒ کے ہمراہ دربار غوثیہ میں حاضر ہوئے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے آپ پر شفقت کی نظر کی اور فرمایا۔ ''اے لال شہباز! آگے بڑھو۔''

شیخ عثمانؒ نے بے دلی سے آنکھ اُٹھا کر نظر کی...... اور خدا معلوم کیا دیکھا کہ جو کچھ سوچ کر آئے تھے سب بھول گئے۔ زیر لب آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

''یہ جمال کسی انسان کا نہیں، سورج کا نہیں، چاند کا نہیں۔ ایسا قالب جس کا چہرہ ہزار آفتابوں کی روشنی سے زیادہ منور دکھائی دے رہا ہے، یقیناً کسی عظیم شخصیت کا ہی ہو سکتا ہے۔ مسکراتا ہے تو ساری دنیا مسکراتی نظر آتی ہے۔ جبین نور پر ذرا شکن آتی ہے تو نوری ناری سب کانپ اُٹھتے ہیں۔ ایسے مردان خدا بار بار نہیں ملتے۔ اے عثمان! آگے بڑھ اور اپنا سر اس کے سامنے جھکا دے۔''

یہ کہہ کر شیخ عثمانؒ آگے بڑھے اور بولے۔

''اے پیکر نور! خطا ہوئی معاف فرما دیجئے۔ میں نے آپ کے شہر کے ایک عالم کو گرفت میں لانا چاہا تھا لیکن خود اسی زنجیر میں جکڑ دیا گیا۔ خدارا اب مجھے زیادہ نہ ترسایئے اور اپنی بیعت میں لے لیجئے۔''

حضرت شیخ الاسلامؒ نے شیخ عثمانؒ کو بغل میں لے کر خوب بھینچا اور اسی محبت میں آپ کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کر لیا۔ چونکہ حضور نے شیخ عثمانؒ کو لال شہبازؒ کہہ کر پکارا تھا۔ اس لئے آپ اسی نام سے مشہور ہو گئے اور لال شہباز قلندرؒ کہلانے لگے۔

بہت تلاش کے باوجود ''منبع البرکات'' نامی کتاب میرے ہاتھ نہ آ سکی۔ اس لئے میں نے مجبوراً مولانا نور احمد فریدی کی تالیف ''تذکرہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ'' کا سہارا لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مذکورہ اقتباس ''منبع البرکات'' کی عبارت کا حرف بہ حرف ترجمہ ہے یا مولانا موصوف نے اپنی طرف سے عبارت آرائی کی ہے۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو۔ اس اقتباس کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات

ظاہر ہو جاتی ہے کہ راوی کے بیان کردہ واقعات ایک دوسرے سے متصادم بھی ہیں اور متضاد بھی۔ شیخ حسنؒ کے کہنے پر حضرت لال شہباز قلندرؒ کا خاموشی کے ساتھ حضرت شیخ الاسلام کی خانقاہ تک چلے آنا، غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے بھتیجے شیخ حسنؒ اور حضرت قلندرؒ ایک دوسرے سے قطعاً ناواقف تھے۔ پھر یہ صورتحال کس طرح پیش آئی کہ حضرت لال شہبازؒ نے شیخ حسنؒ سے کوئی وضاحت طلب نہیں کی اور چپ چاپ ایک اجنبی نوجوان کے ساتھ ایک نا آشنا منزل تک چلے آئے؟ خیر! اسے ہم حضرت بہاء الدین زکریاؒ کا تصرف روحانی تصور کئے لیتے ہیں کہ قلندرؒ کے قدم بے ارادہ شیخ الاسلام کی بارگاہ معرفت کی طرف اُٹھ گئے ہوں گے۔

''منبع البرکات'' کے الفاظ ہیں کہ قاضی قطب الدین کاشانیؒ کا فتویٰ سن کر حضرت قلندرؒ غضب ناک ہو گئے تھے اور علامہ سے ٹکر لینے کیلئے بگولے کی طرح اُڑے چلے آ رہے تھے۔ غصے اور طیش کی انتہائی حالت کا یکایک زائل ہو جانا، بذات خود ایک غیر فطری عمل ہے۔ مصنف نے اس تبدیلی کا جواز پیش کیا ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کا نام سنتے ہی حضرت لال شہباز قلندرؒ ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ قلندرؒ شیخ الاسلامؒ سے نہ صرف واقف تھے بلکہ پرانے ربط و ضبط کے سبب ان کا احترام بھی کرتے تھے۔

''منبع البرکات'' کے مصنف کے بقول جب حضرت لال شہباز قلندرؒ خانقاہ میں داخل ہوئے تو حضرت بہاء الدین زکریاؒ کا چہرۂ مبارک دیکھ کر حیران رہ گئے اور بے اختیار بول اُٹھے۔

''یہ جمال کسی انسان کا نہیں، سورج کا نہیں، چاند کا نہیں......''

حضرت قلندر کا اظہار حیرت ایک ہی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ پہلی بار حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے دیدار سے مشرف ہوئے تھے اور حیران رہ گئے تھے۔

پھر حضرت لال شہبازؒ کے یہ الفاظ کہ خدارا اب مجھے زیادہ نہ ترسایئے اور اپنی بیعت میں لے لیجئے، اس بات کی دلیل ہیں کہ جیسے حضرت قلندرؒ برسوں سے شیخ الاسلامؒ کے آستانے پر پڑے رہے ہوں اور دن رات ان سے حلقہ ارادت میں شامل کر لینے کی درخواست کرتے رہے ہوں...... مصنف کا دعویٰ ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ نے پہلی ہی ملاقات میں حضرت لال شہبازؒ کو ''مریدی'' کا اعزاز بخش دیا تھا۔

ان تضادات کے علاوہ اس روایت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ جو واقعہ حضرت لال شہباز قلندرؒ سے منسوب کیا گیا ہے، وہ قلندر کے شایان شان نہیں۔ جس مرد خدا نے زندگی بھر اس بات پر فخر کیا ہو

ملامت می کند حلقے و من برداری رقصم

(ساری دنیا مجھے ملامت کرتی ہے اور میں اس ناقابل برداشت بوجھ کو اُٹھائے ہوئے رقص کرتا ہوں)

اور تمام عمر جس مرد جانباز کے عشق کی یہ کیفیت ہو۔

زعشق دوست ہر ساعت درون ناری رقصم
گہہ برخاری غلطم، گہہ برخاری رقصم

(دوست کے عشق میں میرے شب و روز کا ہر لمحہ اس طرح گزرتا ہے کہ میں آگ کے اندر رقص کرتا ہوں۔ میری یہ حالت ہو گئی ہے کہ میں کبھی خاک پر لوٹتا ہوں اور کبھی کانٹوں پر رقص کرتا ہوں۔)

یہ شعر حضرت لال شہباز قلندرؒ کی اسی مشہور غزل کا مطلع ہے جو صوفیانہ شاعری میں ایک خاص مقام رکھتی ہے اور جسے پڑھ کر صاحبان جذب و کیف آج بھی ایک نئی زندگی حاصل کرتے ہیں۔

جس سرفروش صوفی کا یہ حال ہو کہ تپتی ہوئی خاک پر اور نوک خار پر رقص کرتا ہو...... بھڑکتے ہوئے شعلوں میں رقص کرتا ہو...... اور ساری دنیا کی ملامتیں برداشت کر کے رقص کرتا ہو، وہ اپنے بارے میں دیئے ہوئے فتوے کو کس طرح خاطر میں لاتا؟ قلندر کے تو جینے کا انداز ہی نرالا ہوتا ہے۔ وہ نفس کشی کی اس منزل سے گزرتا ہے جہاں سنگ دشنام بھی اسے مہکتے ہوئے تر و تازہ پھول محسوس ہوتے ہیں۔ حضرت لال شہبازؒ بھی اسی شان کے قلندر تھے۔ انہیں علامہ قطب الدین کاشانیؒ کا ایک فتویٰ کیا متاثر نہیں کر سکتا تھا کہ وہ غضب ناک ہو کر اپنی خانقاہ سے نکل کھڑے ہوتے۔ قلندر تو برسوں سے ملامت گاہ ہستی میں دیوانہ وار رقص کر رہے تھے۔ انہیں اتنا ہوش کہاں تھا کہ اہل ہوش ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

پھر ''منبع البرکات'' کے مصنف نے یہ واقعہ جس طرح بیان کیا ہے اسے پڑھ کر ایک عامیانہ سی کہانی کا گمان ہوتا ہے۔ اس قسم کی باتوں سے حضرت لال شہباز قلندرؒ کی بھی اور علامہ قطبؒ کی بھی شان گھٹتی ہے۔ اگر بالفرض ایسا کوئی واقعہ پیش آیا بھی ہوگا تو اس کا انداز یکسر جداگانہ ہوگا۔ اس طرح نہیں کہ حضرت قلندرؒ اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک علامہ سے ٹکر لینے کیلئے گھر سے نکل کھڑے ہوں گے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

''موج کوثر'' کے مصنف شیخ اکرام اپنی کتاب میں برٹن کی ''ہسٹری آف سندھ'' کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں۔

''حضرت لال شہباز قلندرؒ بہت بڑے عالم تھے۔ لسانیات اور صرف و نحو (قواعد) میں مہارت رکھتے تھے۔ برٹن کے زمانے (1852ء) میں صرف و نحو کی جو کتابیں مروج تھیں مثلاً ''میزان الصرف'' اور ''صرف صغیر'' وہ حضرت قلندرؒ سے منسوب کی جاتی ہیں۔''

''مآثر الکرام'' کے مصنف میر غلام علی آزاد بلگرامی کے مطابق جب حضرت لال شہباز قلندرؒ ملتان پہنچے تو بابا ابراہیمؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہوئے۔ بابا ابراہیمؒ سیّد جمال مجردؒ کے مرید تھے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے حضرت جمال مجردؒ کو حضرت بابا ابراہیمؒ کا مرید قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں بھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ بہرکیف حضرت لال شہباز قلندرؒ ان دونوں بزرگوں کی صحبت میں رہ کر درجۂ کمال کو پہنچے اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

آگے چل کر میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں۔ ''خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ نے کئی اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کی۔ حرمین شریفین جا کر حج بیت اللہ کی سعادت

سے شرف یاب ہوئے۔ پھر بغداد سے نکل کر کیچ مکران کے راستے سے سندھ میں تشریف لائے اور اس خطۂ ارض کے بہت سے علاقوں میں سکونت پذیر رہے۔ ملتان، گجرات اور برصغیر کے کئی شہروں میں جا کر دین اسلام کی تبلیغ کی۔

ملتان میں حضرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانیؒ سے ملے اور ان کے ساتھ سندھ کے دورے کئے۔ تذکروں اور تاریخوں میں "چار یاروں" کا سندھ اور ملتان کی سیر و سیاحت کرنا مشہور ہے۔ اس سفر کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ سندھ میں اقامت گزیں ہو گئے۔

حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے وصال کے بعد دوبارہ ملتان گئے اور ان کے صاحبزادے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ سے ملاقات کی۔ اس زمانے میں سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا شہزادہ سلطان محمد (خان شہید) ملتان کا حاکم تھا۔ شہزادہ فطرتاً سادہ مزاج اور نیک سیرت نوجوان تھا۔ اسے بزرگان دین سے بہت زیادہ عقیدت تھی۔ مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ شہزادہ سلطان محمد کے بارے میں تحریر کرتا ہے۔

"شہزادہ سلطان محمد خان شہید، سلطان غیاث الدین بلبن کا محبوب ترین بیٹا تھا۔ وہ تمام [illegible] صفات اور پسندیدہ عادات جو ایک شہزادے میں ہونی چاہئیں، خان شہید میں موجود تھیں۔ شہزادہ سلطان محمد ہوش و خرد اور ہنر پروری میں بلاشبہ اپنے زمانے کا بہترین انسان تھا۔ اس کی محفل میں بڑے نامی گرامی علماء اور بڑے بڑے شاعر شرکت کرتے تھے، خان شہید اپنے ہمدردوں اور بہی خواہوں کے ساتھ ہمیشہ لطف و کرم سے پیش آتا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے مریدان خاص حضرت امیر خسروؒ اور حضرت خواجہ حسن سنجریؒ اسی شہزادے کے دربار سے وابستہ تھے اور رونق محفل کہلاتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے پورے پانچ سال تک خان شہید کی ملازمت کی۔ شہزادہ سلطان محمد حضرت امیر خسروؒ اور حضرت خواجہ حسن سنجریؒ کی سب سے زیادہ عزت اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔"

ضیاء الدین برنی سے لے کر قاسم فرشتہ تک تمام معتبر ذرائع اس بات پر متفق ہیں کہ شہزادہ سلطان محمد اس قدر سلیقہ مند اور مہذب تھا کہ اگر دن رات کسی محفل میں بیٹھتا، تب بھی اپنا زانو اونچا نہ کرتا۔ قسم کھاتے وقت ہمیشہ اس کی زبان پر لفظ "حقا" رہتا تھا۔

شہزادے کی تہذیب و متانت کا یہ عالم تھا کہ جب محفل شراب آراستہ ہوتی اور وہ نشے کی حالت میں ہوتا، تب بھی اس کی زبان سے کوئی غیر مہذب اور ناشائستہ کلمہ ادا نہ ہوتا۔ اس کی مجلس میں مشہور فارسی شعراء انوری، نظامی، خاقانی اور حضرت امیر خسروؒ کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ شہزادہ خان شہید ہر شعر کو پوری طرح سمجھتا تھا اور اس کی مناسب داد دیتا تھا۔ بڑے بڑے اساتذہ سلطان محمد کی سخن فہمی کے قائل تھے۔ ایک مجلس شعر و سخن میں حضرت امیر خسروؒ نے خان شہید کی سخن فہمی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں نے ذوق صحیح، سخن فہمی، نکتہ رسی اور تمام نئے پرانے شعراء کے اشعار یاد رکھنے میں خان شہید جیسا فاضل شخص کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔"

شہزادہ خان شہید مشہور بزرگ صوفی شاعر حضرت شیخ سعدیؒ سے بھی نہایت عقیدت رکھتا تھا۔ [illegible]

حضرت شیخ سعدیؒ سے کئی بار درخواست کی۔

"آپ ملتان تشریف لا کر ہمیں سرفراز کریں۔ یہاں آپ کیلئے ایک خانقاہ تعمیر کرا دی جائے گی اس کے مصارف کیلئے چند گاؤں وقف کر دیئے جائیں گے۔"

شہزادے کے قاصد دو مرتبہ حضرت شیخ سعدیؒ کی خدمت میں شیراز حاضر ہوئے مگر حضرت شیخ نے اپنی ضعیفی کے سبب ملتان آنے میں معذرت پیش کی لیکن ہر بار اپنے دست مبارک سے اپنے اشعار اور غزلیات لکھ کر خان شہید کی خدمت میں بطور تحفہ روانہ کیں۔

ان تمام واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شہزادہ سلطان محمد خان شہید کیسا علم دوست، ادب نواز اور درویشوں سے عقیدت رکھنے والا حاکم تھا۔

مؤرخ قاسم فرشتہ ایک مجلس شعر و سخن کا حال لکھتے ہوئے کہتا ہے۔ "جس زمانے میں شہزادہ خان شہید کا قیام ملتان میں تھا، اسی زمانے میں شیخ عثمان ترمذیؒ جو اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور عارف کامل تھے، اتفاق سے ملتان تشریف لائے۔ سلطان نے شیخؒ کی آمد کی خبر سنی تو اپنے مصاحب خاص کے ذریعے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ شیخ عثمانؒ نے دعوت قبول کر لی۔ پھر جب شہزادہ سلطان محمد ان بزرگ سے ملا تو فرمانروائے ملتان ہوتے ہوئے بھی اس نے نہایت انکسار اور عقیدت کا مظاہرہ کیا۔ بہت دیر تک شیخؒ کے سامنے دست بستہ بیٹھا رہا۔ پھر جب شیخ عثمانؒ واپس جانے لگے تو شہزادہ سلطان محمد نے ان کی خدمت میں درخواست پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔

"یہ میری انتہائی خوش نصیبی ہوگی کہ شیخ ملتان میں قیام فرمائیں۔"

شیخ عثمانؒ نے سکوت اختیار کیا تو شہزادہ خان شہید عاجزانہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔ "حکومت کے خرچ پر ایک خانقاہ تعمیر کرا دی جائے گی اور یہ شیخ کی خدمت میں ایک حقیر نذر ہوگی۔"

شیخ عثمانؒ نے شہزادہ سلطان محمد کی محبت و عقیدت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا۔ "ہم فقیروں کا ٹھکانا کہیں اور ہے۔ اللہ شہزادے کو اس فقیر نوازی کا اجر عطا کرے۔"

قاسم فرشتہ نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ شہزادہ خان شہید نے حضرت شیخ عثمان ترمذیؒ کی خدمت میں قیمتی نذریں اور تحائف بھی پیش کئے تھے۔ تاریخ میں اس واقعے کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ تاہم اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخ عثمانؒ نے شہزادہ سلطان محمد کی عقیدت کو دیکھتے ہوئے یہ تحائف قبول کر لئے تھے..... مگر ملتان میں مستقل قیام سے انکار کر دیا تھا۔

ابھی حضرت شیخ عثمان ترمذیؒ ملتان میں سکونت پذیر تھے کہ ایک دن شہزادہ خان شہید نے محفل شعر و سخن آراستہ کی اور حضرت شیخ عثمان ترمذیؒ کو بھی شریک محفل ہونے کی دعوت دی۔ حضرت شیخ [illegible] حضرت مخدوم بہاء الدین زکریاؒ کے صاحبزادے اور خلیفۂ اکبر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ [illegible] محفل میں تشریف لائے۔

خوش الحان مطرب نے عربی اشعار پڑھنا شروع کئے۔ ایک شعر پر حضرت شیخ عثمانؒ اور حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کو وجد آ گیا، اضطراری حالت میں یہ دونوں بزرگ کھڑے ہو گئے۔ مشائخ کے

احترام میں پوری محفل کھڑی ہوگئی اور شہزادہ سلطان محمد نے بھی اہل محفل کا ساتھ دیا۔

حضرت شیخ عثمان ترمذیؒ اور حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ پر بہت دیر تک وجد کی کیفیت طاری رہی۔ اس دوران شہزادہ خان شہید دست بستہ کھڑا رہا اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے رہے۔ بعد میں آنے والے تذکرہ نگاروں نے تحریر کیا ہے کہ شہزادہ سلطان محمد کی مجلس میں شریک ہونے والے شیخ عثمانؒ دراصل حضرت لال شہباز قلندرؒ تھے...... مگر فرشتہ کی روایت سے پتا چلتا ہے کہ یہ بزرگ "ترمذ" کے رہنے والے کوئی اور شیخ عثمانؒ تھے۔ اس سلسلے میں تذکرہ نگار یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ کاتب کی غلطی کے سبب "مروند" کی جگہ "ترمذ" لکھ دیا گیا۔ حالانکہ "مروند" اور "ترمذ" کی ظاہری ساخت میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اس دلیل کے جواب میں کہنے والے کہتے ہیں کہ مؤرخ قاسم فرشتہ سے سہو ہوگیا اور اس نے "مروند" کی جگہ "ترمذ" لکھ دیا۔

مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی نے اس واقعے کو ذرا تفصیل سے پیش کیا ہے۔ واضح رہے کہ ضیاء الدین برنی سلطان غیاث الدین بلبن کی حکومت کے آخری سال یعنی 684ھ میں پیدا ہوا۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے 673ھ میں انتقال فرمایا۔ یعنی حضرت قلندرؒ کے وصال کے گیارہ سال بعد ضیاء الدین برنی پیدا ہوا۔ اس لئے ان واقعات کے سلسلے میں سب سے زیادہ معتبر اور قریب ترین راوی صرف ضیاء الدین برنی ہے۔ اس کے برعکس محمد قاسم فرشتہ تقریباً تین سو سال بعد 1552ء میں پیدا ہوا۔ اس لئے فرشتہ نے بیشتر واقعات میں ضیاء الدین برنی ہی پر انحصار کیا ہے۔ حضرت شیخ عثمانؒ اور حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کا یہ واقعہ بھی برنی کی مشہور تاریخ "فیروز شاہی" سے ماخوذ ہے۔

مندرجہ بالا واقعے کو ضیاء الدین برنی اس طرح بیان کرتا ہے۔ "میں ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی کا مؤلف ہوں۔ میں نے حضرت امیر خسروؒ اور خواجہ امیر حسن سنجریؒ سے بارہا خان شہید کی تعریف میں سنا ہے کہ ہم نے خان شہید جیسا باادب اور مہذب شہزادہ کم دیکھا ہے۔ اگر وہ ساری رات اور دن مسند امارت پر بیٹھتا تو زانوئے ادب بلند نہ کرتا۔ ہم نے کبھی اسے ایسی مجلسوں میں پالتی مار کر بیٹھے نہیں دیکھا۔ وہ شراب کی محفل میں ہوتا یا کسی دوسری مجلس میں، ہم نے کبھی اس کی زبان سے کوئی لغو، بے ہودہ اور فحش بات نہیں سنی۔ وہ صرف اتنی شراب پیتا کہ اس سے مستی اور بے خودی نہ ہو۔"

آگے چل کر ضیاء الدین برنی تحریر کرتا ہے۔ "شیخ عثمان مریدیؒ ایک بڑے بزرگ تھے۔ جب وہ ملتان تشریف لائے تو شہزادہ خان شہید نے اپنی عقیدت مندی اور معرفت کی وجہ سے ان کی بہت تواضع کی اور بہت کچھ ان کی نذر کیا۔ شہزادے کی کوشش تھی کہ انہیں ملتان ہی میں رکھے اور ان کیلئے ایک خانقاہ تعمیر کرائے مگر عثمانؒ نے وہاں قیام کرنا منظور نہیں کیا۔ ایک دن خان شہید نے شیخ عثمانؒ اور شیخ صدرالدین عارفؒ کو اپنی مجلس میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ محفل میں عربی غزلیں سنی جا رہی تھیں یکایک شیخ عثمانؒ اور دوسرے درویش وجد کی حالت میں رقص کرنے لگے۔ جتنی دیر یہ لوگ جذب کی کیفیت میں رقص کرتے رہے، شہزادہ خان شہید برابر ہاتھ باندھے کھڑا رہا اور زار و قطار روتا رہا۔

خان شہید کی عادت تھی کہ اگر مجلس میں اس کے دوست (مصاحب) کوئی ایسا شعر پڑھتے جس میں محبت کی باتیں ہوتیں تو وہ سارے کام چھوڑ کر انتہائی عقیدت اور یقین کے ساتھ سنتا اور بہت روتا۔ یہاں تک کہ حاضرین اس کی سخن فہمی پر حیران رہ جاتے۔"

ضیاء الدین برنی کی روایت سے پتا چلتا ہے کہ وہ شیخ عثمان مریدیؒ تھے۔ "تاریخ فیروز شاہی" کے مرتب سید معین الحق نے کتاب کے حاشیئے میں تحریر کیا ہے۔ "مریدی، کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے صحیح لفظ "ترمذی" ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ ڈاکٹر سید معین الحق نے تاریخ فرشتہ کو سامنے رکھ کر یہ رائے قائم کی ہوگی کیونکہ فرشتہ نے شیخ عثمانؒ کے ساتھ "ترمذی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ضیاء الدین برنی نے "مریدی" ہی تحریر کیا تھا۔ فرشتہ کیلئے یہ لفظ اجنبی تھا، نتیجتاً اس نے مریدی کو ترمذی سے تبدیل کر دیا۔ اگر ہمارے تذکرہ نگار اس بات پر اصرار کریں کہ شیخ عثمانؒ لال شہباز قلندرؒ ہی تھے تو پھر "مریدی" کی جگہ "مرندی" ہونا چاہئے کیونکہ حضرت قلندرؒ کا وطن مالوف "مرند" تھا۔ اگرچہ محمد قاسم فرشتہ بزرگان دین سے بہت زیادہ عقیدت رکھتا تھا۔ زیادہ مشائخ کی مجلسوں میں بھی حاضر ہوتا تھا اور دنیا سے گزر جانے والے اولیائے کرام کے مزارات پر حاضری دیتا تھا...... لیکن وہ شیخ عثمانؒ کے حوالے سے "مریدی" کی تحقیق نہ کر سکا...... اور اگر بالفرض قاسم فرشتہ نے تحقیق کی تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ شیخ عثمانؒ ترمذ کے رہنے والے تھے اور اتفاق سے ملتان چلے آئے تھے اور ان کی ملاقات شہزادہ خان شہید سے ہوئی تھی۔

تاریخ فرشتہ اور "تاریخ فیروز شاہی" دونوں سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت امیر خسروؒ اور خواجہ حسن سنجریؒ آخر تک شہزادہ خان محمد کے دربار سے وابستہ رہے۔ منگولوں کے جس حملے میں شہزادہ سلطان محمد شہید ہوا تھا، اسی میں مغل حضرت امیر خسروؒ کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ حضرت امیر خسروؒ نے شیخ عثمانؒ اور شہزادہ خان شہید کی اس ملاقات کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ شیخ عثمانؒ 670ھ کے قریب ملتان تشریف لائے تھے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے بڑے بیٹے شہزادہ خان شہید کو ملتان کا حاکم مقرر کیا تھا...... اور حضرت امیر خسروؒ 680ھ میں شہزادہ سلطان محمد کے دربار سے وابستہ ہوئے تھے۔

اب اگر ہم تاریخی حقائق کے حوالے سے حضرت لال شہباز قلندرؒ اور شہزادہ خان شہید کی ملاقات کا جائزہ لیں تو جس مجلس شعر و سخن کا ذکر ضیاء الدین برنی اور محمد قاسم فرشتہ نے کیا ہے، اس کا انعقاد 673ھ سے پہلے ممکن نہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب حضرت لال شہباز قلندرؒ آخری بار ملتان تشریف لائے تھے۔ واضح رہے کہ حضرت سید عثمان مروندیؒ کی عمر اس وقت سو سال کے قریب تھی۔ 673ھ میں آپ دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ یعنی اپنی وفات سے تین سال پہلے آپ ملتان تشریف لائے۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آخری عمر میں حضرت لال شہباز قلندرؒ پر مکمل جذب و مستی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب آپ کی ملاقات شہزادہ خان شہید سے ہوئی، اس وقت سید عثمانؒ

پورے برصغیر میں ''لال شہباز قلندرؒ'' کے نام سے مشہور ہو چکے تھے، قاسم فرشتہ ضیاء الدین برنی کے تین سو سال بعد پیدا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے برنی کی بعض روایات کی تصحیح بھی کی ہے ہے کہ اس نے شیخ عثمان ترمذیؒ تحریر کیا اور حاشئے میں اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ شیخ ... دراصل لال شہباز قلندرؒ تھے۔ اس صورتحال کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ شیخ عثمان ترمذیؒ کوئی دوسرے بزرگ تھے۔

اب ان قیاسات کا ذکر کہ جن کے سہارے شیخ عثمانؒ کو لال شہباز قلندرؒ ثابت کیا جاسکتا ہے۔ یہ کہ حضرت قلندرؒ اور حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ میں گہرے مراسم موجود تھے۔ اکثر تذکروں ... دونوں بزرگوں کی ملاقاتیں ثابت ہیں چونکہ شہزادہ خان شہید کی مجلس شعر و سخن میں حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ بھی موجود تھے۔ اس لئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ حضرت شیخ عارفؒ سے ملنے کیلئے ملتان آئے ہوں گے اور پھر ان ہی کے ساتھ شہزادہ سلطان محمد کی مجلس میں تشریف لے گئے ہوں۔

دوسرے یہ کہ حضرت لال شہبازؒ قلندرانہ مزاج رکھتے تھے، اس لئے مراعات شاہی کو قبول نہیں کیا۔ اسی شان بے نیازی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شہزادہ خان شہید کی مجلس میں شریک ہونے والے شیخ عثمان، لال شہباز قلندرؒ ہی تھے۔

تیسرے یہ کہ ضیاء الدین برنی اور محمد قاسم فرشتہ نے شیخ عثمانؒ کے علم و فضل کا ذکر کیا ہے۔ ... تصنیف کردہ ہسٹری آف سندھ سے پتا چلتا ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ لسانیات اور صرف و نحو کے بہت بڑے عالم تھے۔

چوتھے یہ کہ ضیاء الدین برنی کی روایات کے مطابق شیخ عثمانؒ نے جذب و کیف کی حالت میں مجلس والہانہ رقص کیا تھا چونکہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کا رقص کرنا تواتر کے ساتھ ثابت ہے، اس لئے شیخ عثمان نامیؒ بزرگ حضرت لال شہباز قلندرؒ ہی ہوسکتے ہیں۔

اور آخری بات یہ کہ ہمیں کسی معتبر کتاب کے حوالے سے یہ پتا نہیں چلتا کہ شیخ عثمان ترمذیؒ کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کس سلسلہ روحانیت سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے ہمیں تسلیم کرنا پڑا کہ وہ بزرگ حضرت لال شہباز قلندرؒ ہی تھے۔

ویسے اس ذیل میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہم نے تحقیق کا یہ تمام سفر صرف ... یکسانیت اندازوں اور قیاسات کے سہارے طے کیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی ذات گرامی پر مزید تحقیق کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ محض خوش عقیدگی اور ضعیف روایتوں کی بنیاد پر حضرت لال شہباز قلندرؒ جیسے جانباز صوفی کے مقام روحانی کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

''تحفۃ الکرام'' کے مصنف علی شیر قانع کا بیان ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے مشہور بزرگ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کی خدمت میں ...

... ہوئے تھے۔ دو قلندروں اور دو صوفیوں کی اس ملاقات کو بعض غیر ذمے دار تذکرہ نگاروں نے بڑے عجیب انداز میں پیش کیا ہے۔ ''الشہباز'' کے مصنف جلیل سیوہانی کی روایت ملاحظہ کیجئے۔

''ہندوستان کی سیر و سیاحت کے دوران حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے بھی حضرت لال شہباز قلندرؒ سے کئی مقابلے کئے لیکن ہر بار مات کھائی۔ ایسے کچھ مقابلوں کی تفصیلات یہاں پیش کی جاتی ہیں۔''

صرف اسی ایک جملے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مصنف کی ذہنی سطح کیا ہے اور وہ بزرگان دین کے سلسلے میں کیا نظریہ رکھتے ہیں؟ مجھے مجبوراً اس غیر معتبر کتاب سے چند اقتباس پیش کرنے پڑ رہے ہیں تاکہ ایک اہم موضوع پر گفتگو کی جاسکے۔

جلیل سیوہانی اپنی کتاب ''الشہباز'' میں فرماتے ہیں۔ ''ایک بار حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ ایک کچی دیوار پر چڑھ کر اسے سواری (گھوڑے) کی طرح دوڑاتے چلے گئے۔''

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے یہ منظر دیکھا تو ہاتھ کا اشارہ کیا۔ فوراً ہی دیوار کھڑی ہوگئی۔ (دیوار کھڑے ہونے سے مصنف کی مراد ہے کہ دیوار رک گئی اور حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ اپنے مقصد یا اظہار کرامت میں ناکام ہوگئے)

''الشہباز'' کے مصنف دوسرا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''حضرت لال شہباز قلندرؒ فقیرانہ لباس پہننے کے بعد ہمیشہ شیر کی سواری کرتے تھے اور ایک سیاہ سانپ چابک کے طور پر آپ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ ایک بار حضرت لال شہباز قلندرؒ، حضرت بوعلی قلندرؒ کے مہمان ہوئے۔

''شیخ! آپ کا شیر اور سانپ کیا غذا کھاتے ہیں۔'' حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے حضرت لال شہباز قلندرؒ سے پوچھا۔

''میرے شیر کی غذا گائے ہے اور میرا سانپ مرغ کھاتا ہے۔'' حضرت لال شہباز قلندرؒ نے جواباً فرمایا۔

یہ سن کر حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے اپنے مہمان سے کہا۔ ''تو پھر ان کی غذا تلاش کر لیجئے۔''

اپنے میزبان کی فرمائش پر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے شیر کو گائے کے باڑے کی طرف اور سانپ کو مرغیوں کے ڈربے کی جانب روانہ کیا۔

پھر جیسے ہی حضرت لال شہباز قلندرؒ کا شیر اور سانپ اپنی اپنی غذا کی تلاش میں چلے تو حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے اشارہ کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گائے نے شیر کو اور مرغ نے سانپ کو کھا لیا۔

یہ منظر دیکھ کر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اپنی سواری اور چابک کو طلب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''زمین کبھی کسی کی امانت ہضم نہیں کرتی۔'' یہ کہہ کر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے شیر اور سانپ کو آواز دی۔

ابھی فضا میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ شیر گائے کے اور سانپ مرغ کے پیٹ سے صحیح و سلامت نکل آئے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اپنی سواری اور چابک کو مخاطب

کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تمہیں گائے اور مرغ کیسے کھا گئے؟''

شیر اور سانپ نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''ہم مہمان تھے، اس لئے ہم نے اپنی طاقت کا مظ نہیں کیا۔''

شیر اور سانپ کا جواب سن کر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔ ''اب تم دونوں انہیں کھا جاؤ۔'' پھر دوسرے ہی لمحے شیر نے گائے اور سانپ نے مرغ کو کھا لیا۔

اس کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ نے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تم نے ہماری امانت میں خیانت کی اسی طرح تمہارے فقراء (مرید) ہمارے فقراء کی امانتیں ہضم کر جائیں گے۔ لہٰذا ہم تمہارا فقر بند کئے دیتے ہیں، البتہ تمہاری فقیری اور لنگر کو جاری رکھا جاتا ہے۔''

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد مصنف اپنا دعویٰ پیش کرتا ہے کہ اسی لئے حضرت لال شہباز قلندرؒ کا فقر قائم اور حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کا فقر ختم ہے۔ البتہ ان کی درگاہ کا لنگر آج تک جاری ہے۔

''الشہباز'' کے مصنف نے اپنے بیان کردہ واقعے کے سلسلے میں کسی معتبر کتاب کا حوالہ پیش نہیں کیا۔ اگر بالفرض وہ کوئی حوالہ پیش بھی کر دیتے تو اس بے سروپا قصے پر کون یقین کرتا، یہ مسلمان بزرگوں کی کرامت نہیں، کوئی دیومالائی افسانہ ہے جسے زیادہ سے زیادہ ''طلسم ہوشربا'' کا کوئی باب قرار دیا جا سکتا ہے ایک ''الشہباز'' پر کیا منحصر ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں ایسی روایتوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر معاذ اللہ! مسلمان بزرگوں پر جادوگر اور شعبدہ باز ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ طلسماتی قصے تحریر کرنا، اسلام کی خدمت نہیں۔ آج کا بے بنیاد قصہ، کل کی روایت میں ڈھل جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے اکثر بزرگوں کے ساتھ ان کے کم عقل عقیدت مندوں نے یہی سلوک کیا ہے۔ اپنے روحانی سلسلے کو دوسرے سلاسل سے بہتر ثابت کرنے کیلئے ایسے ایسے افسانے تراشے گئے ہیں کہ انہیں پڑھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس صورتحال کو علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

خداوند ترے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

میں ذاتی طور پر دو ایسے مصنفوں کو جانتا ہوں جو اپنے ذہن سے محیر العقول واقعات تراشتے تھے اور بزرگان دین کے ناموں سے منسوب کر دیتے تھے۔ جب آسمانی کتابوں میں تحریف کی جا سکتی ہے اور سرور کونین ﷺ کی احادیث مقدس میں جھوٹی حدیثیں شامل کی جا سکتی ہیں تو اولیاء اللہ کے ناموں کے ساتھ جھوٹے واقعات منسوب کر دینا کوئی مشکل کام ہے؟

جس شخص نے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ اور حضرت لال شہبازؒ کے حوالے سے مذکورہ واقعات تحریر کئے ہیں، اسے اندازہ ہی نہیں کہ برصغیر پاک و ہند کے یہ دونوں بزرگ کون تھے اور روحانیت کے کس مقام پر فائز تھے، ''قلندری'' اس کا نام نہیں کہ کوئی ولی کسی شیر پر سوار ہو جائے۔ درندوں کا مطیع و فرمانبردار ہو جانا تو ولایت کی ایک عام سی نشانی ہے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اپنے نفس کے بہ

جیسی کی ہوگی کیونکہ انسانی نفس شیر سے بھی زیادہ طاقتور اور خونخوار ہوتا ہے۔ اکثر انسان نفس نام کے اسی درندے کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ استاد ذوق دہلوی کے بقول ۔

بڑے موذی کو مارا، نفس امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدھا و شیر نر مارا تو کیا مارا

اس واقعے کے راوی کو تو یہ بھی پتا نہیں کہ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کس شان کے بزرگ تھے؟ آپ امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا نام نامی شیخ شرف الدین تھا؟ حضرت نظام الدین اولیاء جیسے عظیم صوفی حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ حضرت امیر خسروؒ بھی اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت قلندرؒ کا مزاج تھا کہ کسی امیر یا وزیر کی نذر قبول نہیں فرماتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کی شدید خواہش تھی کہ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کسی طرح اس کی نذر قبول کر لیں۔ پھر جب اسے قلندرؒ کی ادائے بے نیازی کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے سفارش کرائی۔ کسی درباری نے سلطان علاء الدین پر یہ راز ظاہر کر دیا تھا کہ حضرت بوعلی شاہؒ حضرت محبوب الٰہی کی بے حد عزت کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے کہنے کو نہیں ٹالیں گے۔ آخر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے سلطان علاء الدین کے تحائف کے ساتھ اپنے ایک خدمت گار کو حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کی خدمت میں بھیج دیا۔

''شیخ! سلطان کی دیرینہ آرزو ہے کہ وہ درویشوں کی کوئی خدمت انجام دے سکے۔ میں جانتا ہوں کہ امراء کی نذریں قبول کرنا آپ کے شایان شان نہیں مگر میری خاطر سلطان کے تحائف قبول فرما لیجئے۔''

حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے اپنی عادت کے خلاف حضرت محبوب الٰہیؒ کے احترام میں سلطان علاء الدین کے قیمتی تحائف قبول کر لئے مگر دوسرے ہی لمحے شاہی کارندوں کے سامنے، ساری رقم کھڑے کھڑے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے سلطان علاء الدین کی سفارش اس لئے کی تھی کہ فرمانروائے ہند کو ایک قلندر کی شان بے نیازی کا اندازہ ہو جائے یہ خرقہ پوش اور بوریا نشیں حقیقتاً اقلیم معرفت کے تاجدار ہوتے ہیں جن کی نظروں میں شاہان ظاہری کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ علامہ اقبال کے بقول۔

قلندر جز دو حرف ''لا الہ'' کچھ بھی نہیں رکھتا

مگر اس کے قدموں میں سیم و زر کے دریا بہتے ہیں اور شاہان وقت اس کے آستانے پر اس امید میں سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں کہ قلندر انہیں ایک نظر ہی دیکھ لے۔

یہ تھی شان حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کی تھی۔ ''تحفۃ الکرام'' کے مصنف شیر علی قانع تحریر کرتے ہیں۔ ''حضرت لال شہباز قلندرؒ ہندوستان کے مختلف علاقوں کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کی خدمت میں پہنچے۔''

شیر علی قانع نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ اس وقت حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ دہلی میں مقیم تھے

یا پانی پت میں؟ بہرحال حضرت بوعلی شاہؒ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے ساتھ نہایت محبت واحترام سے پیش آئے۔ کئی دن تک خاطر مدارات کی۔ کچھ عرصے تک دونوں بزرگ ایک دوسرے کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ رسم میزبانی ادا کرنے کے بعد ایک روز حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے حضرت لال شہبازؒ سے فرمایا۔

''اس وقت ہند میں تین سو قلندر موجود ہیں۔ آپ سندھ تشریف لے جائیں۔ اس علاقے کو آپ کی ضرورت ہے۔''

شیر علی قانع نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے مشورے سے حضرت لال شہباز قلندرؒ سہون تشریف لے آئے اور مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے۔

پروفیسر معین الدین درانی نے اپنی تصنیف ''مجلس صوفیہ'' میں اور اعجاز الحق قدوسی نے اپنی تالیف ''صوفیائے سندھ'' میں تحفتہ الکرام'' کی اسی روایت کو نقل کیا ہے۔

کہاں وہ روایت کہ حضرت لال شہبازؒ نے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ سے فرمایا۔ ''جس طرح تم نے امانت میں خیانت کی ہے، اسی طرح تمہارے فقراء، ہمارے فقرا کی امانتیں ہضم کر جائیں گے لہٰذا تمہارے فقر کو ختم کیا جاتا ہے۔''

اور کہاں یہ روایت کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے مشورے سے سرزمین سہون کو وہ رونق بخشی جس کی ضیا باریوں کو مسلمان تو مسلمان اہل ہنود بھی پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

بعض روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ جب حضرت لال شہباز قلندرؒ سہون میں تشریف لائے تو آپ کے ساتھ درویشوں اور خدمت گاروں کی ایک بڑی جماعت بھی تھی۔ ان خادموں میں ایک ہندو بنیا بھی تھا جس کا نام کانونگو تھا۔ شروع میں وہ بنیا دکانداری کرتا تھا اور جب بھی اسے فرصت ملتی تو حضرت لال شہباز قلندرؒ کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ کانونگو کی طبیعت کاروبار سے ہٹ گئی اور وہ مستقل طور پر حضرت مخدومؒ کی خدمت میں رہنے لگا۔

''تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟'' ایک دن حضرت لال شہباز قلندرؒ نے ہندو بنئے سے پوچھا۔

''اب کسی کام کو جی نہیں چاہتا۔'' کانونگو نے عرض کیا۔

''پھر پیٹ کس طرح بھرو گے؟'' حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اپنے عقیدت مند سے سوال کیا۔

''شیخ کے صدقے میں پیٹ تو بھر ہی جاتا ہے۔'' کانونگو نے ادب سے سر جھکاتے ہوئے عرض کیا۔

اس کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ نے ہندو بنئے سے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ اس کے بیٹوں نے دکانداری شروع کر دی اور انہیں اس قدر منافع حاصل ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں وہ لوگ خوش حال ہوگئے..... مگر کانونگو حضرت قلندرؒ کے قدموں ہی میں پڑا رہا۔

کانونگو ایمان تو نہیں لایا لیکن اسے حضرت لال شہباز قلندرؒ سے عشق کی حد تک عقیدت تھی..... اور حضرت قلندرؒ بھی اس پر بہت کرم فرماتے تھے۔ کانونگو نے آپ کی اس قدر خدمت کی کہ آج بھی اسے اعزاز حاصل ہے کہ عرس کے موقع پر جہاں مسلمان اپنی رسمیں ادا کرتے ہیں، وہاں کانونگو خاندان کے ہندو بھی بطور خاص اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

سہون شریف کے ریلوے اسٹیشن کے جنوب میں ایک پہاڑ ہے جس کے اندر ایک قدیم غار موجود ہے۔ اس غار کے بارے میں ہندوستان کا مشہور مورخ دوارکا پرشاد لکھتا ہے۔ ''پچیس ہزار سال پہلے جب انسان غاروں میں رہتے تھے تو یہ غار بنی نوع آدم کا مسکن تھا۔''

اسی غار میں حضرت لال شہباز قلندرؒ نے چلہ کشی کی تھی۔ غار کے اندر درمیان میں ایک بڑی سی چٹان نما سل رکھی ہے۔ جسے ''یک چٹی'' کہتے ہیں۔ غار میں قبلے کے رخ پر ایک محراب بھی ہے۔ اس سل پر بیٹھ کر حضرت لال شہباز قلندرؒ عبادت کیا کرتے تھے۔ اس کے نیچے ہموار پہاڑی ہے جسے فرش کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس جگہ تقریباً چار سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔

1009ھ میں میر ابوالقاسم نمکین سہون کے صوبیدار تھے۔ روایت ہے کہ وہ چاندنی راتوں میں اسی جگہ کچہری لگا کر لوگوں کے مسائل سنا کرتے تھے۔

غار میں شمال کی سمت ایک قبر بھی موجود ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے ایک دولت مند مرید کا مدفن ہے۔ جس نے اپنی تمام دولت اور جائداد چھوڑ کر، ساری زندگی اپنے پیرومرشد کی خدمت میں بسر کر دی تھی۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

اسی طرح سہون کے ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ''لال باغ'' بھی ہے جو آپ ہی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس باغ کے نزدیک ایک پہاڑی بھی ہے مشہور ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ اس جگہ بھی ایک طویل عرصے تک چلہ کش رہے تھے۔ لال باغ کا رقبہ تقریباً پانچ سو ایکڑ ہے۔ اس باغ میں مختلف پھلوں کے درخت ہیں۔ اسے ''لال واہی'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس باغ کے اندر ایک پہاڑ بھی ہے جس سے چشمہ بہتا ہے اور اسی چشمے کا پانی باغ کے حوضوں میں آتا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی آمد سے پہلے نہ یہ باغ تھا اور نہ چشمہ۔ اہل نظر اسے حضرت لال شہباز قلندرؒ کی کرامت سمجھتے ہیں کہ ایک مرد خدا کے قدم پڑتے ہی پتھر کا جگر نرم ہوگیا اور اس سے ایک چشمہ پھوٹا۔

کراچی سے آگے ''منگھو'' نامی پہاڑی حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے ہم عصر بزرگ دفن ہیں۔ بعض روایتوں کے مطابق یہ بزرگ حضرت بابا فرید الحق مسعود گنج شکرؒ کے خلیفہ ہیں اور منگھو پیر کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی پہاڑ پر حضرت لال شہباز قلندرؒ کے نام پر ایک بستی آباد ہے جس کے دونوں جانب خوبصورت باغ ہیں۔ یہ جگہ درویشوں کا مسکن ہے۔ مشہور ہے کہ اس مقام پر بھی

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے چلہ کشی کی تھی۔

روایت ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے سندھ کے ایک گاؤں ''ریحان'' میں بھی کچھ دن قیام فرمایا تھا۔ اس سفر میں حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے حضرت شیخ رکن الدینؒ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ بعد میں یہی گاؤں حضرت رکن الدینؒ کی نسبت سے ''رکن پور'' کہلانے لگا۔ جب حضرت لال شہباز قلندرؒ اس دیہات میں تشریف لے گئے تو یہ ایک ویران علاقہ تھا اور یہاں کی زمین بنجر تھی۔ پھر اللہ نے اپنے دو برگزیدہ بندوں کے قیام کی برکت سے اس زمین کی سرشت بدل ڈالی۔ علاقہ بھی آباد ہو گیا اور زمین بھی سرسبزی و شادابی کا خزانہ اگلنے لگی۔ آج بھی ''رکن پور'' میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کے قیام کے آثار پائے جاتے ہیں۔

آپ کی شخصیت میں ایک خاص کشش تھی جس کی وجہ سے ہر مکتب فکر کے لوگ آپ سے متاثر ہوتے تھے۔ آپ کا مسلک قلندری تھا، اس لئے نہ کسی حکمراں سے مرعوب ہوئے، نہ دربار شاہی کی طرف دیکھا اور نہ مال و زر کی خواہش کی۔ عقیدت مند قیمتی نذریں قدموں میں ڈھیر کر دیتے مگر آپ فوراً ہی ضرورت مندوں میں تقسیم فرما دیتے۔ شدید ریاضت و عبادت کے علاوہ سخاوت آپ کی شخصیت کا نمایاں وصف تھا۔ اسی لئے آپ کو سخی شہباز قلندرؒ بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ سے بے شمار کرامات ظاہر ہوئیں۔ روایت ہے کہ جب حضرت لال شہباز قلندرؒ ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے، جونا گڑھ تشریف لائے تو مقامی باشندے ایک عجیب صورتحال سے دوچار تھے۔ دن میں ایک مقررہ وقت پر ایک زنبیل اور ڈنڈا نمودار ہوتے تھے اور اس شہر کے رہنے والوں سے خیرات و صدقات وصول کرتے تھے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ مانگنے والے ہاتھ نظر نہیں آتے تھے۔ بس ایک آواز سنائی دیتی تھی۔

''جسے جو کچھ دینا ہے، اس زنبیل میں ڈال دے۔''

مقامی آبادی خوش عقیدگی کے طور پر یا خوفزدہ ہو کر اس زنبیل میں حسب استطاعت رقم اور دوسری چیزیں ڈال دیا کرتے تھے۔ کہنے کو وہ ایک چھوٹا سا کاسہ تھا مگر اس میں بہت سا سامان سما جاتا تھا۔ پھر بھی کاسہ خالی رہتا تھا۔ اسی شہر (جونا گڑھ) میں ایک درویش بھی قیام پذیر تھے۔ جب ان بزرگ نے لوگوں کی زبانی یہ محیر العقول واقعہ سنا تو انہیں اعتبار نہیں آیا۔ پھر اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا تو حیران رہ گئے۔ روایت ہے کہ ان درویش نے بہت کوشش کی مگر وہ زنبیل اور ڈنڈا اپنے کام میں مصروف رہے۔ بزرگ نے کئی بار نادیدہ شخص کو مخاطب کر کے کہا۔

''اگر تم کوئی بزرگ ہو تو سامنے کیوں نہیں آتے؟''

مگر جواب میں کوئی آواز نہیں اُبھری۔ زنبیل اور ڈنڈا حسب دستور گردش کرتے رہے اور مقامی باشندوں سے صدقات و خیرات وصول کرتے رہے۔ اس پراسرار عمل کا خاص پہلو یہ تھا کہ اگر کوئی شخص اس زنبیل میں کچھ ڈال دیتا تو اسے مالی یا کسی اور قسم کا فائدہ پہنچ جاتا...... اور اگر کوئی شخص صدقہ دینے سے انکار کر دیتا تو اسے کسی عنوان کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا۔

جونا گڑھ میں رہنے والے درویش خود بھی روحانی قوتوں کے مالک تھے مگر وہ اس زنبیل کی گردش کو روکنے سے قاصر رہے۔ ان بزرگ نے بارہا اپنے اوراد و وظائف سے بھی کام لیا مگر زنبیل کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان ساری کوششوں کے بعد درویش کو ایک بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی شیطانی خلل نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آیات قرآنی کی تلاوت کے سامنے کسی باطل شے کا ٹھہرنا ممکن نہیں ہے۔

قصہ مختصر! جونا گڑھ کے وہ بزرگ اس ''زنبیل اور ڈنڈے'' سے سخت پریشان تھے۔ اسی دوران حضرت لال شہباز قلندرؒ (پاکستان کے حوالے سے) اس تاریخی شہر میں تشریف لائے۔ درویش فوری طور پر آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے درویش کی زبانی پورا واقعہ سننے کے بعد فرمایا۔ ''اس فقیر کو اس جگہ لے چلو۔''

حضرت قلندرؒ شہر سے باہر مقیم تھے۔ درویش وقت کا انتظار کرتا رہا۔ پھر مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے درویش نے حضرت لال شہباز قلندرؒ سے اس محلے میں چلنے کی درخواست کی جہاں برسوں سے یہ پراسرار عمل جاری تھا۔ پھر جب حضرت قلندرؒ وہاں تشریف لے گئے تو آپ نے دیکھا کہ ایک زنبیل اور ڈنڈا دروازے دروازے گردش کر رہے تھے اور لوگ انتہائی عقیدت کے ساتھ اپنی نذریں اس کاسے میں ڈال رہے تھے۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ ایک دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ پھر جب وہ دونوں چیزیں گردش کرتی ہوئی حضرت قلندرؒ کے پاس آئیں تو آپ نے اپنا دست مبارک بڑھایا۔ زنبیل اور ڈنڈا، دونوں خود بخود حضرت قلندرؒ کے ہاتھ میں آ گئے۔ درویش کے ساتھ محلے کے تمام لوگ بھی حیرت زدہ رہ گئے۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے وہ دونوں چیزیں درویش کے سامنے رکھتے ہوئے فرمایا۔

''یہ ڈنڈا مجھے دے دو۔''

درویش نے حضرت قلندرؒ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے وہ ''پراسرار'' ڈنڈا آپ کے حوالے کر دیا۔

پھر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے درویش کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ زنبیل اپنے پاس رکھ لو۔ آج سے تم زنبیل شاہ ہو۔ جو بھی تمہاری زنبیل سے کھائے گا، وہ فیضیاب ہوگا۔''

اس کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ جونا گڑھ سے سہون تشریف لے آئے۔ آپ کی پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ جونا گڑھ کے ان بزرگ کا اصلی نام کوئی نہیں جانتا...... مگر ''زنبیل شاہ'' کے نام سے وہ آج بھی مشہور ہیں۔ روایت ہے کہ جب بھی کسی دیوانے شخص کے عزیز و اقارب زنبیل شاہ کے مزار پر جا کر دعا کرتے ہیں، اللہ اس پاگل کو صحت عطا کر دیتا ہے...... اور یہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کا فیض روحانی ہے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب حضرت لال شہباز قلندرؒ بخارا میں مقیم تھے۔ اس وقت آپ کا عہد شباب تھا مگر شہرت عام ہو چکی تھی۔ بخارا کا بادشاہ بے اولاد تھا۔ اس نے نامور طبیبوں کے نسخے آزمائے، علماء کے کہنے پر ضرورت مندوں میں دولت تقسیم کی...... لیکن دوا کام آئی اور نہ دعا۔ آخر ایک وزیر نے بادشاہ کو حضرت لال شہباز قلندرؒ کی خانقاہ کا پتا بتاتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ اس نوجوان درویش سے رجوع کریں تو عجب نہیں کہ اللہ آپ کی مشکل آسان فرما دے۔"

بادشاہ بخارا کو وزیر کی بات پر یقین نہیں آیا لیکن وہ تاج و تخت کے وارث کی تلاش میں تھک چکا تھا اس لئے قلندرؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا۔ "شیخ! دینے والے نے مجھے سب کچھ دے رکھا ہے مگر میں اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ میرے لئے دعا فرمائیے کہ خالق کائنات مجھے بے نشان ہونے سے بچا لے۔"

"کوئی کتنا بھی کثیر الاولاد ہو مگر بے نشانی ہر شے کا مقدر ہے۔" شاہ بخارا کی التجا سن کر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔

"میں اس بے نشانی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔" شاہ بخارا نے عرض کیا۔ "مجھے اپنے تاج و تخت کا وارث چاہئے۔"

"سب کچھ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔" حضرت لال شہباز قلندرؒ نے شاہ بخارا کو ٹالنے کی غرض سے فرمایا۔ "جس نے تمہیں تاج و تخت بخشے ہیں، وہی اولاد بھی عطا کرے گا۔ اسی کے آگے دامن مراد پھیلائے رکھو۔"

"شیخ! میرے گناہ مجھے مایوسی کی طرف کھینچے چلے جا رہے ہیں۔" شاہ بخارا نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ "اگر میری التجاؤں میں تاثیر ہوتی تو میرا نخل مراد اب تک بار آور ہو چکا ہوتا۔"

شاہ بخارا کی عاجزی و بے چارگی دیکھ کر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے آپ مراقبے میں ہیں۔ پھر کچھ دیر بعد حضرت قلندرؒ نے سر اٹھایا اور فرمانروائے بخارا سے مخاطب ہوئے۔ "تمہیں بحکم خدا تخت کا وارث تو مل جائے گا مگر اس کی ایک شرط ہے۔"

"شیخ! مجھے ہر شرط منظور ہے۔" شاہ بخارا حضرت قلندرؒ کی زبان مبارک سے اولاد کی نوید سن کر بے اختیار ہو گیا۔

"تمہارے شہزادے میں آدھا حصہ ہمارا ہوگا۔" حضرت لال شہباز قلندرؒ نے شاہ بخارا کے سامنے اپنی شرط پیش کر دی۔

"آدھا حصہ؟" حضرت لال شہباز قلندرؒ کی شرط سن کر شاہ بخارا حیرت زدہ رہ گیا۔ "شیخ! میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔"

"وقت تو آنے دو۔ سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔" حضرت لال شہباز قلندرؒ نے بے نیازانہ کہا۔

شاہ بخارا سرشاری اور حیرت کے عالم میں قلندرؒ کی خانقاہ سے اُٹھ کر چلا گیا۔

پھر تقریباً ایک سال بعد بخارا کا قصر شاہی نقاروں اور شادیانوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ بزرگانِ ملک، امیران سلطنت اور دیگر خدمت گار شاہ بخارا کو خوبصورت فرزند کی ولادت پر مبارکباد دے رہے تھے...... اور فرمانروائے بخارا کی سماعتوں میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

"بحکم خدا شہزادہ تو دنیا میں آ جائے گا مگر اس میں ہمارا آدھا حصہ ہوگا۔"

شاہ بخارا نے حضرت لال شہباز قلندرؒ کے اس مبہم اشارے سے یہ مفہوم اخذ کیا تھا کہ آپ سیم و زر کے طلب گار ہوں گے۔ نتیجتاً وہ انتہائی قیمتی تحائف لے کر حضرت قلندرؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے لعل و جواہر اور دینار و درہم سے بھرے ہوئے طلائی اور نقرئی خوانوں کو دیکھا اور شاہ بخارا کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "یہ کیا ہے؟"

"آپ کا حصہ!" شاہ بخارا نے مسرت آمیز لہجے میں عرض کیا۔

"یہ تو میرا حصہ نہیں ہے۔" حضرت لال شہباز قلندرؒ نے قیمتی تحائف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"آپ ہی نے تو یہ شرط رکھی تھی کہ ولی عہد سلطنت میں آدھا حصہ آپ کا ہوگا۔" شاہ بخارا نے حیران ہو کر کہا۔

"شہزادہ کہاں ہے؟ اسے میرے پاس لے کر آؤ۔" حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔ "میں ولی عہد سلطنت سے اپنا حصہ وصول کر لوں گا۔"

شاہ بخارا اب بھی حضرت قلندرؒ کی بات سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ خانقاہ سے اُٹھا اور شہزادے کو لے کر حضرت لال شہباز قلندرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

حضرت قلندرؒ نے بڑی محبت سے بخارا کے ولی عہد سلطنت کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ کچھ دیر تک بہت غور سے شہزادے کو دیکھتے رہے پھر اپنی گدڑی (خرقے) میں چھپا لیا۔ شاہ بخارا اور اس کے وزراء دم بخود تھے۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ ولی عہد سلطنت کو کچھ دیر تک اپنے سینے سے لگائے رہے۔ پھر خوبصورت شہزادے کو شاہ بخارا کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ "اب تم جو چاہو کرو، ہم نے اپنا حصہ وصول کر لیا۔"

شاہ بخارا اور اس کے مصاحب ایک عارف کے رموز و کنایات کو کیا سمجھتے؟ وقت گزرتا رہا اور شہزادہ جوان ہو گیا۔ پھر شاہ بخارا کے انتقال کے بعد شہزادہ تخت نشین ہوا۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے ولی عہد کا نام "ادھم" رکھا تھا اور اب وہی شہزادہ سلطان ادھم کے نام سے بلخ اور بخارا پر حکومت کر رہا تھا۔

روایت ہے کہ سلطان ادھم نے کئی سال تک عدل و انصاف اور پاکبازی کے ساتھ حکومت کی۔ اس کے عہد اقتدار میں بلخ و بخارا کے باشندے پُرسکون اور خوشگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔ اچانک سلطان ادھم نے ایک دن اپنے وزراء اور امراء کو طلب کر کے کہا۔

''میرا دل اس فانی دنیا سے اُچاٹ ہو چکا ہے۔ اس لئے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔''

سلطان ادھم کی بات سن کر اراکین سلطنت پریشان ہوگئے۔ ''شہنشاہ! بلخ و بخارا کے عوام کسی دوسرے شخص کی امارت پر راضی نہیں ہوں گے۔ وہ آپ کے انتظامات اور انداز حکمرانی سے اس قدر مطمئن ہیں کہ کسی دوسرے فرمانروا کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''میں نے بہت چاہا کہ میں اس آواز کو نظرانداز کر کے دن رات تمہاری خدمت میں مشغول رہوں۔ مگر اب مجھے اپنے ارادوں پر کوئی اختیار نہیں رہا۔'' سلطان ادھم نے امرائے سلطنت کی درخواست کے جواب میں کہا۔ ''وہ آواز مجھے پیہم بلا رہی ہے۔''

''وہ کس کی آواز ہے جس نے شہنشاہ کے سکون کو منتشر کر دیا ہے؟'' وزراء اپنے فرمانروا کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے۔

''تم اس آواز کو نہیں پہچان سکتے۔'' سلطان ادھم نے کہا۔ ''مجھے جانا ہی ہوگا اور اسی میں میری سلامتی ہے۔''

اس کے بعد سلطان ادھم اپنے چچا زاد بھائی کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ پھر اس نے درویشانہ لباس پہنا اور حضرت لال شہباز قلندرؒ کی تلاش میں بلخ و بخارا کی حدود سے نکل کھڑا ہوا۔ ظاہر پرستوں نے اسے بادشاہ کا دماغی خلل سمجھا...... مگر سلطان ادھم بہت دانا اور ذہین تھا۔ وہ اپنی دنیا فروخت کر کے آخرت خریدنا چاہتا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ سلطان ادھم حضرت لال شہباز قلندرؒ کی جستجو میں در در بھٹکتا رہا۔ چہرہ موسم کی سختیوں سے جھلس گیا اور پاؤں آبلوں سے بھر گئے مگر بخارا کے بادشاہ نے ایک قلندر کی تلاش نہیں چھوڑی۔ آخر ایک دن وہ بامراد ہوا اور اس نے سہون پہنچ کر اپنا سر نیاز حضرت لال شہباز قلندرؒ کے قدموں پر رکھ دیا۔

''سلطان! کیسے ہو؟'' حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اپنا دست مہربان والیٔ بخارا کے سر پر رکھ دیا۔

''شیخ! بہت مضطرب ہوں۔ دل کی خلش چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔'' سلطان ادھم اپنے آنسوؤں سے قلندر کے پائے مبارک کو بھگوتا رہا۔

''اگر سلطانی چھوڑ کر فقیری مل جائے تو یہ بہت سستا سودا ہوگا۔'' حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔

''شیخ! میں تو نجات کا طالب ہوں۔'' سلطان ادھم کی گریہ وزاری میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''اس سے مانگتے رہو۔ نجات بھی مل جائے گی۔'' حضرت قلندرؒ نے فرمایا۔

اس کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ نے سلطان ادھمؒ کو اپنے حلقۂ بیعت میں شامل کر لیا۔ پھر طویل ریاضت و مجاہدات کے بعد پیر و مرشد کے حکم سے سلطان ادھمؒ خیر پور کی پہاڑی پر چلہ کش ہوگئے۔ آپ نے باقی عمر یہیں گزاری اور وفات کے بعد اسی مقام پر آسودۂ خاک ہوئے۔ سلطان

ادھمؒ کا مزار مبارک آج بھی خیر پور میں موجود ہے۔

بعض تذکروں میں حضرت سلطان ادھمؒ کو ''گودڑ شاہ'' کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ''گدڑی'' پہننے کی وجہ سے لوگ آپ کو گودڑ شاہ کے نام سے یاد کرنے لگے ہوں گے۔ برصغیر کے لوگوں کا مزاج بھی کچھ عجیب سا ہے۔ بہت سے بزرگوں کے حقیقی نام گم ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ عقیدت مندوں کے وضع کردہ ''القاب و خطاب'' نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ مثال کے طور پر ایک بزرگ اپنی سواری کیلئے گھوڑا استعمال کرتے تھے۔ نتیجتاً چاہنے والوں نے انہیں ''گھوڑا شاہ'' کے نام سے مشہور کر دیا۔ ایک اور بزرگ رنگین قبا پہنتے تھے جس پر نسوانی لباس کا گمان ہوتا تھا۔ انجام کار وہ بزرگ ''سدا سہاگن'' کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ شاید یہی صورتحال سلطان ادھمؒ کے ساتھ بھی پیش آئی ہوگی۔ بہرکیف حضرت لال شہباز قلندرؒ نے سلطان ادھمؒ سے اپنا نصف حصہ اس طرح وصول کیا کہ ان کی آدھی زندگی فقیری میں بسر ہوئی۔ یہ حضرت قلندرؒ کی بڑی کرامت ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

جس زمانے میں حضرت لال شہباز قلندرؒ گرنار میں مقیم تھے، آپ کے گرد حاجت مندوں کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ یہ زمانے بھر کے ستائے ہوئے، بیمار اور مفلس انسان تھے جنہیں حضرت قلندرؒ کے تسکین آمیز کلمات جینے کا حوصلہ دیتے تھے۔ گرنار میں ایک دل گرفتہ شخص بھی رہتا تھا جس کا جوان لڑکا گم ہو گیا تھا۔ بیٹے کی جدائی میں اس شخص کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ دن رات روتا رہتا تھا۔ عزیز و اقارب اور یار دوست اسے صبر کی تلقین کے ساتھ بیٹے کی موت کا یقین دلانے کی کوشش بھی کرتے تھے کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو ضرور لوٹ کر آتا۔ یا تو کسی شخص نے اسے قتل کر دیا ہوگا یا پھر جنگلی جانور کھا گئے ہوں گے۔ غرض جتنے منہ تھے، اتنی باتیں۔ غمزدہ باپ بیٹے کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی کبھی کبھی اُمید کی ایک لہر اُٹھتی تھی اور وہ اپنی بیوی سے کہتا تھا۔

''میرا بیٹا زندہ ہے۔ تم دیکھ لینا کہ ایک دن وہ آئے گا اور زندہ درگور باپ کے سینے پر سر رکھ دے گا اور ہمارے تاریک مکانوں میں خوشیوں کے چراغ جل اُٹھیں گے۔''

شکستہ ماں کیا جواب دیتی؟ اس کی حالت تو شوہر سے بھی بدتر تھی۔ بس خاموش نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھتی اور آنسو بہانے لگتی۔

پھر جب حضرت لال شہباز قلندرؒ گرنار تشریف لائے اور آپ کے کمالات روحانی کی شہرت عام ہوئی تو ایک دن اس شخص کے دوست نے کہا۔ ''تم بھی اپنے گم شدہ بیٹے کی بازیابی کیلئے دعا کرا لو۔ بہت سے لوگ اس مرد خدا کی دعاؤں سے فیضیاب ہو چکے ہیں۔''

غمزدہ باپ کو یوں محسوس ہوا جیسے حق تعالیٰ نے اس کی مدد کیلئے ان بزرگ کو گرنار بھیجا ہے۔ پھر وہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو زار و قطار رو رہا تھا۔ ''شیخ! میرا بیٹا مجھے دیدو۔''

''تیرے بیٹے کو کیا ہوا ہے؟'' حضرت لال شہبازؒ نے غمزدہ باپ کو اپنے قریب بٹھایا اور نہایت

شفقت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"اگر میں جانتا تو آپ کے پاس کیوں حاضر ہوتا؟" شکستہ دل باپ نے عرض کیا۔ "... ہو گئے۔ ایک دن وہ گھر سے گیا تو لوٹ کر نہیں آیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مر گیا مگر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔"

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے کچھ دیر کیلئے سکوت اختیار کیا۔ پھر فرمایا۔ "تیرے دل کی گواہی ... ہے۔ وہ زندہ ہے اور بہت اچھے حالوں میں ہے۔"

یہ نوید جاں فزا سن کر فراق کی آگ میں جلنے والے باپ کو سکتہ سا ہو گیا۔ پھر جب اچانک ... والی خوشی کی تند و تیز لہر کا اثر کچھ کم ہوا تو اس نے حضرت لال شہباز قلندرؒ کے ہاتھ پکڑ لئے۔ "شیخ! ... بدنصیب باپ پر رحم کرو۔ اب مجھے تاب جدائی نہیں۔"

"تو بدنصیب نہیں۔ ایک خوش قسمت باپ ہے۔ اللہ کا شکر ادا کر!" حضرت قلندرؒ نے فرمایا۔

"اب تو اس راحت جاں کو دیکھ کر ہی اللہ کا شکر ادا کروں گا۔" بیٹے کی زندگی کی خبر سن کر وہ شخص پہلے سے زیادہ مضطرب ہو گیا تھا۔ "وہ کب آئے گا میرے پاس؟"

"وہ خود نہیں آئے گا۔ اسے جا کر لانا پڑے گا۔" حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔

پھر دوسرے دن حضرت قلندرؒ اس شخص کو لے کر روانہ ہوئے۔ پورے دن چلتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی اور آپ نے ایک گھنے جنگل میں قیام فرمایا۔ وہ شخص تھک کر چور ہو چکا تھا مگر حضرت قلندرؒ کے چہرۂ مبارک پر تھکن کے ہلکے سے آثار تک نہیں تھے۔

"شیخ! اب مجھ سے چلا نہیں جاتا۔" اس شخص نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"چلو گے نہیں تو منزل تک کس طرح پہنچو گے؟ بس اب تم سکون سے سو جاؤ۔ انشاء اللہ ... تمہیں تمہاری مراد مل جائے گی۔" یہ کہہ کر حضرت لال شہباز قلندرؒ عبادت میں مشغول ہو گئے اور ... شخص کچھ سنسان جگہ کی وجہ سے اور کچھ بیٹے سے ملاقات کے شوق میں رات بھر نہیں سو سکا۔

پھر صبح ہوئی تو حضرت لال شہباز قلندرؒ کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا..... مگر یہ سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ جنگل کے آخری کنارے پر ایک جھونپڑی نظر آئی۔ وہاں کچھ لوگ نظر آئے جو اپنے لباس سے ... بدوش دکھائی دیتے تھے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کو دیکھتے ہی وہ خانہ بدوش باادب کھڑے ہو گئے۔

حضرت قلندرؒ نے غمزدہ باپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "تم یہیں ٹھہرو! میں ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر حضرت لال شہبازؒ جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ دراصل وہ جھونپڑی ایک خانقاہ تھی جہاں سات درویش مراقبے میں مشغول تھے..... اور جو خانہ بدوش باہر بیٹھے تھے، وہ ان درویشوں کے خدمت گار تھے۔

جب حضرت لال شہباز قلندرؒ جھونپڑی میں داخل ہوئے تو ساتوں درویش استغراق کی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت قلندرؒ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان درویشوں کے قریب پہنچے اور پھر ... نے ایک درویش کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا۔

"تم یہاں سکون سے بیٹھے ہوئے ہو اور کوئی تمہارے فراق کی آگ میں جل کر راکھ ہوا جا رہا ہے۔"

حضرت قلندرؒ کی آواز میں بڑا جلال تھا۔ نوجوان درویش نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی آواز سن کر دوسرے درویش بھی ہوشیار ہو گئے تھے۔ ایک قلندر کو اپنے سامنے پا کر سارے درویش احتراماً کھڑے ہو گئے۔ حضرت لال شہبازؒ نے انہیں اپنی دعاؤں سے نوازا اور نوجوان درویش کو اپنے ساتھ لے کر جھونپڑی سے باہر نکل آئے۔

نوجوان درویش نے باپ کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔

"تمہارا بیٹا گم نہیں ہوا تھا۔" حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اس باپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اسے آپ کے طفیل اس کی کھوئی ہوئی دولت مل گئی تھی۔ یہ دنیا کے قابل نہیں اور دنیا اس کے قابل نہیں ہے۔"

"میرے بے قرار دل سکون پا گیا اور پیاسی آنکھیں سیراب ہو گئیں۔" اس شخص نے حضرت قلندرؒ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "اگر میرا بیٹا دنیا کے قابل نہیں ہے تو پھر آپ اسے اپنے قدموں میں جگہ دیجئے۔"

پھر وہ نوجوان درویش ماں باپ کی اجازت سے حضرت لال شہباز قلندرؒ کی خدمت میں مشغول ہو گیا اور ایک دن منصب ولایت پر فائز ہوا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت لال شہباز قلندرؒ کی ایک اور کرامت بھی مشہور ہے۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب حضرت قلندرؒ مستقل طور پر سہون میں قیام پذیر تھے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ اتفاق سے قاضیٔ شہر کا گزر ہوا۔ اس نے دیکھا کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ اپنی خانقاہ کے دروازے پر بیٹھے روٹی پکا رہے تھے۔ قاضیٔ شہر کو قلندر کے اس عمل پر بہت تعجب ہوا۔ وہ ٹھہر گیا اور اس نے حضرت لال شہباز قلندرؒ کو مخاطب کر کے کہا۔

"شیخ! آپ رمضان المبارک کے مہینے میں روٹی پکا رہے ہیں؟"

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے قاضیٔ شہر کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "معاف کرنا قاضی صاحب! ہم بھول گئے تھے کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔" اتنا کہہ کر حضرت قلندرؒ نے کچی روٹی آگ میں دبا دی۔ پھر اپنے چہرۂ مبارک پر چادر ڈال لی اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے۔

قاضیٔ شہر علمائے ظاہر میں سے تھے اور درویشوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اسی لئے قاضی صاحب نے حضرت لال شہباز قلندرؒ پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ رمضان کے مہینے میں بھی روٹی پکا رہے ہیں۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ فرقہ ملامتیہ کے بزرگ نفس کشی کیلئے انتہائی دشوار گزار راستے اختیار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ حقیقتاً روزے سے ہوتے ہیں مگر اہل دنیا پر کچھ اور ظاہر کرتے ہیں۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے بھی قاضی شہر کے سامنے کچھ ایسا ہی مظاہرہ کیا تھا۔

پھر رمضان المبارک کا پورا مہینہ گزر گیا اور عید آ گئی۔ قاضیٔ شہر، ایک قلندر کی عید کا منظر دیکھنے کیلئے خانقاہ کی طرف سے گزرے اور حیرت زدہ رہ گئے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ اسی طرح چہرۂ مبارک پر چادر ڈالے ہوئے مشاہدۂ قدرت میں گم تھے۔ قاضیٔ شہر حضرت قلندرؒ کے پاس پہنچے اور اعتراض کیا۔

''شیخ! رمضان کا مہینہ ختم ہو گیا۔ آج تو عید کا دن ہے۔''

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے چادر ہٹائی اور قاضیٔ شہر کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''قاضی صاحب! آپ کو عید مبارک ہو۔ اب ہماری روٹی بھی پک گئی ہوگی۔'' یہ کہہ کر آپ اپنی نشست سے اُٹھے اور چولہے کے قریب پہنچے۔ قاضیٔ شہر نے حیرت سے دیکھا۔ آگ اسی طرح جل رہی تھی۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اپنا دست مبارک بڑھا کر آگ میں دبی ہوئی روٹی نکال لی۔ یہ منظر دیکھ کر قاضیٔ شہر کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ روٹی پک کر تیار ہو چکی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' بے اختیار قاضیٔ شہر کی زبان سے نکلا۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ناقابل فہم اور ناقابل یقین۔'' قاضیٔ شہر ایک ولی کی کرامت کو سمجھنے سے قاصر رہے اور اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے چلے گئے۔

ہمارے قارئین کیلئے بھی یہ واقعہ ناقابل فہم ہوگا۔ ان کے ذہنوں میں مختلف سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ چند گھنٹوں میں بجھ جانے والی آگ اتنے دن تک کیسے جلتی رہی اور پھر اس میں دبی ہوئی روٹی جل کر راکھ کیوں نہیں ہوئی۔ ان سوالات کی حیثیت اپنی جگہ مگر معجزہ اور کرامت اسی کا نام ہے کہ انسان کی ظاہری آنکھ اور عقل ان باتوں کو سمجھنے سے عاجز آ جائے۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے اپنے ایک شعر میں اولیاء کی روحانی طاقت کو اس طرح بیان کیا ہے ۔

اولیاء راست قدرت از الٰہ
تیر جستہ باز گردانند راہ

(اولیاء کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ قدرت بخشی گئی ہے کہ وہ کمان سے چھوٹے ہوئے تیر کو موڑ کر واپس لا سکتے ہیں)

جب سمجھنے والے حضرت مولانا رومؒ کے اس شعر کا حقیقی مفہوم سمجھ لیں گے تو پھر ان پر یہ راز بھی منکشف ہو جائے گا کہ وہ آگ اتنے دن تک کیسے روشن رہی۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی روٹی جل کر راکھ کیوں نہیں ہوئی؟

☆☆..............☆☆..............☆☆

سندھ کے عوام میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کی ایک اور کرامت بھی بہت زیادہ مشہور ہے۔ مختلف روایات کے مطابق جب حضرت لال شہباز قلندرؒ سہون میں تشریف لائے تھے تو آپ کے گلے میں مستقل طور پر پتھر کا ایک گلوبند پڑا رہتا تھا۔ اس گلوبند میں چھوٹے چھوٹے پتھر شامل تھے۔ جنہیں بڑی خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی ایک خاص عادت تھی کہ آپ راستے میں چلتے وقت ہمیشہ سر جھکائے رہتے تھے۔ اسی طرح جب آپ مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو گردن خم

رہتی تھی۔ روایت ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ محلّہ ''کانوگن'' کے قریب ایک گلی میں اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ اسی محلے میں ''کانوگا'' ایک مشہور ہندو خاندان تھا۔ یہ لوگ پردے کے سخت پابند تھے۔ اس خاندان کی عورتیں ڈولی میں بیٹھ کر جایا کرتی تھیں۔ کانوگا خاندان کی ایک عورت حضرت لال شہباز قلندرؒ سے بے حد عقیدت رکھتی تھی۔ جب بھی آپ گلی میں آ کر بیٹھتے، وہ عورت بھی کھڑکی میں بیٹھی گھنٹوں حضرت قلندرؒ کی طرف دیکھتی رہتی۔ ہندو عورت کی شدید خواہش تھی کہ کسی طرح حضرت لال شہباز قلندرؒ کا دیدار کر لے مگر آپ ہمیشہ سر جھکا کر بیٹھتے تھے، اس لئے وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

ایک دن ہندو عورت کی وحشت اس قدر بڑھی کہ اس نے شوق دیدار میں کھڑکی سے چھلانگ لگا دی اور حضرت لال شہباز قلندرؒ کے قدموں میں جا گری۔ اونچائی سے گرنے کے سبب ہندو عورت شدید زخمی ہو گئی تھی۔ اس نے ایک نظر حضرت قلندرؒ کے چہرۂ مبارک کو دیکھا اور دنیا سے رخصت ہو گئی۔

جب محلے کے لوگوں کو معلوم ہوا تو ہر طرف ایک شور برپا ہو گیا۔ مرنے والی ہندو عورت کے رشتے دار اس کی لاش اٹھانے کیلئے حضرت لال شہباز قلندرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے۔

''اگر آپ اجازت دیں تو اس بدنصیب عورت کو لے جائیں اور اس کی آخری رسوم ادا کر دیں۔''

کانوگا خاندان کے لوگوں نے حضرت قلندرؒ سے اجازت اس لئے چاہی تھی کہ مرنے کے بعد بے ہوئی کے خیال سے حضرت قلندرؒ نے اس کے جسم پر اپنی چادر ڈال دی تھی ...... اور یہ بات بھی خاندان میں مشہور ہو چکی تھی کہ ہندو عورت لال شہبازؒ سے بے حد عقیدت رکھتی تھی۔

''میری اجازت کی کیا ضرورت ہے؟'' حضرت لال شہباز قلندرؒ نے ان لوگوں کی درخواست سن کر فرمایا۔ ''تمہاری امانت ہے، جہاں چاہو لے جاؤ۔''

حضرت قلندرؒ کی اجازت کے بعد ہندو عورت کے رشتے داروں نے اس کی لاش اٹھانے کی کوشش کی مگر اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے لاش بہت زیادہ وزنی ہو گئی ہو۔ پھر دوسرے عزیزوں کو بلایا گیا مگر پندرہ بیس افراد مل کر بھی ایک کمزور سی عورت کو نہ اُٹھا سکے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ لاش زمین سے چپک گئی ہو۔

''اگر تم پورے شہر کے ہندوؤں کو بھی جمع کر لو گے تو یہ لاش نہیں اُٹھ سکے گی۔'' ان لوگوں کو حیران و پریشان دیکھ کر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔

حضرت قلندرؒ کی بات سن کر کانوگا خاندان کے لوگوں پر دہشت طاری ہو گئی۔ ''آخر اس بدنصیب عورت سے کیا گناہ سرزد ہوا ہے۔'' خاندان کے بوڑھے افراد نے حضرت لال شہبازؒ کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''گناہ و ثواب کی بات نہیں ہے۔'' حضرت قلندرؒ نے پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ ''اس عورت کی

قسمت میں جلنا نہیں ہے۔"

"پھر ہم کیا کریں؟" اس عجیب و غریب صورتحال سے اہل ہنود بہت پریشان تھے۔ "اگر تم دفن کرنے کا وعدہ کرو تو لاش اُٹھ جائے گی۔" حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ ہندو عورت کی ارتھی اُٹھنے کے بجائے جنازہ اُٹھا اور اسے مسلمانوں کے طریقے دفن کیا گیا۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ کی یہ کرامت دیکھ کر کانوگا خاندان کے کئی ہندو آپ کے دست مبارک پر ایمان لے آئے۔

اس عورت کی قبر آج بھی سہون میں موجود ہے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے عرس کے موقع پر اس قبر سے "مہندی" اُٹھتی ہے...... اور وہ مہندی مختلف علاقوں میں گزر کر حضرت لال شہبازؒ کی درگاہ پر لائی جاتی ہے۔

یہ واقعہ کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اہل اللہ کی محبت رنگ لاتی ہے اور یہ اسی محبت کا ایک ہلکا سا رنگ ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

"تحفۃ الکرام" کے مطابق، حضرت لال شہباز قلندرؒ کی آمد سے پہلے سہون میں چٹھہ امرانی ایک درویش رہا کرتا تھا۔ یہ راجہ دکورا کا چھوٹا بھائی تھا مگر بچپن سے مذہب اسلام کیلئے اپنے دل میں انتہائی نرم گوشہ رکھتا تھا۔ پھر یہ دلچسپی اس حد تک بڑھی کہ چٹھہ امرانی بت پرستی سے بیزار ہو گیا اور مسلمانوں کی صحبت میں رہنے لگا۔ اہل خاندان نے چٹھہ امرانی سے نفرت کا اظہار کیا تو وہ کسی دوسرے شہر میں چلا گیا اور مذہب اسلام قبول کر کے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ پھر وہ حج بیت اللہ کی سعادت سے شرفیاب ہوا اور اس نے مکہ معظمہ میں رہنے والی ایک ہندوستانی لڑکی سے شادی کر لی۔

چٹھہ عمرانی نے ایک طویل عرصہ عرب میں گزارا اور مختلف بزرگوں سے فیض روحانی حاصل کیا۔

پھر جب وہ اپنی بیوی کے ہمراہ لوٹ کر سہون آیا تو اس کے خلاف نفرتوں کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ راج گھرانے نے چٹھہ امرانی کو اچھوت بنا کر رکھ دیا۔ اسے جان سے مارنے کی دھمکیاں تک دی گئیں مگر اس کے پائے استقامت میں ذرا سی بھی لرزش پیدا نہیں ہوئی۔ چٹھہ امرانی نے خونی رشتے سے مجبور ہو کر اپنے بڑے بھائی راجہ دکورا اور دوسرے رشتہ داروں کو قبول اسلام کی دعوت دی اور مؤثر الفاظ میں عذاب آخرت سے ڈرایا...... مگر وہ سب کے سب بہرے ہو چکے تھے اور ان کے دلوں پر قفل لگائے جا چکے تھے۔ نتیجتاً تمام لوگوں نے چٹھہ امرانی کی دعوت اسلام کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔

چٹھہ امرانی ذہنی طور پر پہلے ہی راج محل سے ترک تعلق کر چکا تھا اب جسمانی طور پر بھی اپنے عزیزوں سے الگ ہو گیا۔ امیرانہ طرز زندگی چھوڑ کر فقیرانہ روش اپنا لی اور شریک حیات کے ساتھ ایک جھونپڑی میں رہنے لگا۔ چٹھہ امرانی کا بڑا بھائی راجہ دکورا ایک سنگدل اور اوباش حاکم تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو تبدیلیٔ مذہب کی سزا دینے کیلئے ایک شرمناک منصوبہ بنایا۔ راجہ دکورا اپنے چھوٹے

بھائی کی بیوی کو بے آبرو کرنا چاہتا تھا...... مگر وہ اپنی ناپاک کوششوں میں ناکام رہا۔ پھر ایک دن چٹھہ امرانی کی بددعا سے پورا خاندان تباہ و برباد ہو گیا۔ خوفناک زلزلہ آیا اور پھر آن کی آن میں وہ بدکار حاکم اپنے ہم نواؤں کے ساتھ زمین کی خوراک بن گیا۔

اس واقعے کو چٹھہ امرانی کی کرامت سے تعبیر کیا گیا اور سہون کے بہت سے لوگ اس کے معتقد ہو گئے۔

بعض تذکرہ نگاروں نے چٹھہ امرانی کی اس کرامت کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ اپنا چراغ تیل کے بجائے پانی سے جلایا کرتا تھا۔ لوگوں نے بارہا پانی کی آزمائش کی مگر اس میں تیل کا ایک قطرہ بھی شامل نہیں تھا۔ بعض راویوں نے اسے شعبدہ بازی سے تعبیر کیا ہے۔ بہرحال چٹھہ امرانی کے بارے میں مختلف روایتیں مشہور ہیں۔

پھر جب حضرت لال شہباز قلندرؒ سہون میں تشریف لائے تو چٹھہ امرانی نے اپنے ایک خدمت گار کے ذریعے دودھ سے بھرا ہوا پیالہ حضرت قلندرؒ کی خدمت میں بھیجا۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے دودھ سے لبریز پیالے کو بغور دیکھا اور اپنے پیرہن کی جیب سے سرخ گلاب کا ایک پھول نکال کر پیالے میں ڈال دیا۔

پھر جب چٹھہ امرانی کا خدمت گار واپس چلا گیا تو حضرت لال شہباز قلندرؒ کے خادم درویشوں نے عرض کیا۔ "شیخ! یہ کیا راز ہے؟"

جواب میں حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔ "یہاں ایک درویش رہتا ہے۔ اس نے اشارتاً ہمیں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دودھ کے پیالے کی طرح یہ شہر اولیاء سے بھرا ہوا ہے۔"

"دودھ کے پیالے میں پھول ڈالنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟" حضرت قلندرؒ کے دوسرے خادم نے عرض کیا۔

"ہم نے درویش کو جوابی پیغام بھیج دیا ہے کہ ہم گلاب کے پھول کی طرح اس شہر میں رہیں گے۔" حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اپنے عمل کی وضاحت فرمائی۔

اس کے بعد چٹھہ امرانی حضرت قلندرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے آنے کا انداز نیازمندانہ تھا۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے بھی چٹھہ امرانی کا والہانہ استقبال کیا۔ پھر دونوں بزرگوں میں بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں حضرت قلندرؒ نے فرمایا۔

"درویش! اپنی روحانی قوتوں کا بہت مظاہرہ کر چکے۔ بس اب اس چراغ کو بجھا دو۔"

"شیخ! کوئی اپنے چراغ کو بھی بجھاتا ہے۔" چٹھہ امرانی نے کہا۔ "اگر چراغ بجھ گیا تو اندھیرا نہیں پھیل جائے گا۔"

"پانی کے چراغ کو بجھا کر تیل کے چراغ کو روشن کر لو۔" حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔ "اگر تمہارا چراغ اسی طرح پانی سے جلتا رہا تو چودھویں صدی کے لوگ گمراہ ہو جائیں گے۔"

چٹھہ امرانی نے حضرت قلندرؒ کی بات مانتے ہوئے اپنے چراغ کو بجھا دیا اور اس کے ساتھ ہی

حضرت لال شہباز قلندرؒ سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ آئندہ آپ کے عنایت کردہ تیل سے میرا چراغ جلے گا۔

پھر دونوں بزرگ اس دنیا سے رخصت ہو گئے مگر صدیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ روایت ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی درگاہ کے تیل سے چٹھہ امرانی کا چراغ جلتا ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ آخری عمر میں حضرت لال شہباز قلندرؒ پر جذب وسکر کی کیفیت طاری ہوگئی تھی اور آپ نے ''قلندریہ'' مشرب اختیار کر لیا تھا۔ تصوف میں دو حالتیں اور کیفیتیں بہت مشہور ہیں۔ ایک ''صحو'' جس کا مطلب ہے، روحانیت کے انتہائی مدارج طے کرنے کے باوجود صوفی کا ہوش میں نہ رہنا۔ ہماری تحقیق کے مطابق حضرت لال شہبازؒ ابتدا ہی سے قلندرانہ مسلک رکھتے تھے۔ رہی حالت وکیفیت، تو آپ عہد شباب میں بھی جذب وکیف کی منزلوں سے گزرتے تھے مگر آخری ایام میں آپ پر مدہوشی کا بہت زیادہ غلبہ ہو گیا تھا۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ کے ملفوظات عام طور پر مشہور نہیں، اس لئے آپ کے نظریات کا صحیح اندازہ کرنا بہت دشوار ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت قلندرؒ، شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ کی طرح ''وحدت الوجود'' کے قائل تھے۔ یہ تصوف کی مشہور ترین اصطلاح اس نظریے کے مطابق دنیا کی ہر شے میں اللہ تعالیٰ کا وجود جلوہ گر ہے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ بھی اسی نظریے پر کاربند تھے۔ آپ کی شاعری سے سوزِ عشق، وارفتگی، جاں نثاری اور بے خودی کا اظہار ہوتا ہے۔ حضرت قلندرؒ کی اسی سرمستی نے اہل سندھ کو متاثر کیا جس کے مظاہرے آج بھی کھلی آنکھوں سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے طویل عمر پائی۔ اکثر روایتوں کے مطابق 21 رشعبان 673ھ کو آپ دنیا سے رخصت ہوئے۔ بظاہر عشق کا نغمہ گر خاموش ہو گیا مگر اس کے نغموں کی گونج آج بھی پاکستان کے طول وعرض میں سنائی دیتی ہے۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کے دور حکومت میں سہون کے حاکم ملک اختیار الدین نے حضرت لال شہباز قلندرؒ کا مزار مبارک تعمیر کرایا۔ یہ 757ھ کا زمانہ تھا۔

اس کے بعد مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد اقتدار میں ''ترخانی'' خاندان کے آخری حکمران مرزا جانی بیگ نے حضرت قلندرؒ کے روضے کی توسیع وترمیم کرائی۔ اس کے بعد 1009ھ میں مرزا جانی بیگ ترخان کے بیٹے مرزا غازی بیگ مزار کی عمارت میں دوبارہ ترمیم کرائی۔

1173ھ میں سندھ کے کلہوڑہ حکمران میاں غلام شاہ نے خانقاہ میں پتھر کا فرش لگوایا اور بلند دروازہ تعمیر کرایا۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ کو اس عالم فانی سے رخصت ہوئے سات سو چوالیس سال ہو چکے ہیں مگر آپ کا فیض روحانی آج بھی جاری ہے۔ ''مآثر الکرام'' کے مؤلف میر غلام علی آزاد بلگرامی

حضرت کے حوالے سے ایک اہم واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جب ربیع الاول 1143ھ کی دسویں تاریخ کو راقم الحروف سیوستان (سہون) کے شہر پہنچا تو میر سید محمد خان نے بخشی گری اور وقائع نگاری کی خدمت میرے سپرد کی اور خود بلگرام روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑے ہی دنوں بعد میری ملازمت ختم ہو گئی۔ جس کا کوئی ظاہری سبب موجود نہیں تھا۔ اس واقعے کا مجھے بے حد صدمہ ہوا اور میں دن رات پریشان رہنے لگا۔ ملازمت کی بحالی کیلئے ذاتی طور پر سارے تعلقات آزما لئے مگر کوئی بھی تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔ آخر ایک رات دل پر یہی بوجھ لئے ہوئے سو گیا۔ اچانک میں نے خواب میں دیکھا کہ شہر کی ایک گلی سے گزر رہا ہوں۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے یہ گلی ختم ہو گئی ہے اور آگے راستہ بند ہے۔ میں کچھ سوچتے ہوئے ٹھہر گیا۔ یکایک ایک شخص سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ پھر جب وہ اجنبی شخص میرے قریب پہنچا تو میں نے اس سے دریافت کیا۔

''یہ گلی بند ہے یا آگے بھی جاتی ہے؟''

''آگے چلے جاؤ! وہاں تمہیں کچھ لوگ ملیں گے۔'' اس شخص نے عربی زبان میں جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

میں جھجکتا ہوا آگے بڑھا۔ ابھی چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ مجھے ایک جگہ تین بزرگ بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان بزرگوں کی وضع قطع سندھیوں جیسی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر سلام کیا اور ایک بزرگ کے سامنے دوزانو ہو کر ادب سے بیٹھ گیا۔ یہ بزرگ ان دونوں بزرگوں کے پیشوا تھے۔

''کیسے آئے ہو؟'' میرے سوال کا جواب دینے کے بعد پیشوا بزرگ نے مجھ سے پوچھا۔

''شیخ! میں ایک پریشانی میں مبتلا ہوں۔'' میں نے عرض کیا۔ ''مجھے سرکاری ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ کیا میں دوبارہ اپنے عہدے پر بحال کر دیا جاؤں گا؟''

میری درخواست سن کر بزرگ پیشوا مراقبے میں چلے گئے۔ پھر پورے ایک پہر کے بعد انہوں نے سر اٹھا کر فرمایا۔ ''تمہیں تمہاری کھوئی ہوئی ملازمت مل جائے گی۔''

بزرگ کی زبان سے یہ نوید سن کر میں کچھ بے قرار سا ہو گیا۔ ''کیا واقعی ایسا ہی ہوگا؟'' میں نے دوبارہ عرض کیا۔

بزرگ نے فرمایا۔ ''میں کہہ تو رہا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میں بے چینی سے اس دن کا انتظار کرنے لگا۔ آخر ایک سال بعد میری ملازمت بحال ہوئی اور خواب میں نظر آنے والے شیخ کا قول سچ ثابت ہوا۔ بعد میں مجھے یوں لگا جیسے بشارت دینے والے بزرگ حضرت مخدوم لال شہباز قلندرؒ تھے......اور پورے ایک پہر کا مراقبہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ مجھے میرے مقصد کے حصول میں ایک سال کا عرصہ درکار رہوگا۔''

ایک میر غلام علی آزاد بلگرامی پر کیا منحصر ہے؟ ایسے بے شمار واقعات ہیں جو آئے دن ظاہر ہوتے

رہتے ہیں، ہر شخص کا اپنا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ اگر تمام مشاہدات و تجربات کو قلمبند کیا جائے تو یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہیں ہوگا۔ اللہ اسی طرح اولیاء کی شان بڑھاتا ہے۔ بے شک! وہ اپنے وعدے سے خلاف نہیں کرتا۔

حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ

ولادت...... 565ھ (ملتان)

وفات...... 666ھ (ملتان)

خاندانی نام...... بہاء الدین، والدِ محترم کا اسمِ گرامی کمال الدین علی شاہؒ۔ آپ کا تعلق قریش کے قبیلے "ہبادی اسدی" سے ہے۔ یہ قبیلہ دوسری صدی ہجری میں مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے پہلے خوارزم آیا پھر مستقل طور پر ملتان میں سکونت پذیر ہو گیا۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نہایت عالم و فاضل بزرگ تھے۔ آپ ہی کے دم سے برصغیر پاک و ہند میں سلسلۂ سہروردیہ کو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔

شہاب الدین غوری کے بعد اس کا غلام قطب الدین ایبک منصب اقتدار تک پہنچا اور تاریخ کے ورق نے ”خاندان غلاماں“ کے بانی کی حیثیت سے اپنے اوراق میں محفوظ کرلیا۔ پھر جب وہ دنیا سے رخصت ہوا تو اس کا محبوب داماد اور غلام شمس الدین التمش اقتدار کا وارث قرار پایا۔ اگرچہ قطب الدین ایبک کا دوسرا داماد ناصر الدین قباچہ بھی حکمرانی کی صلاحیت رکھتا تھا مگر سلطان شمس الدین التمش حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مرید تھا اور دیگر اولیائے کرام کی دعاؤں کے زیر سایہ تھا، اس لئے کارزار حیات میں مظفر و منصور ٹھہرا اور یادگار فتوحات حاصل کیں۔

مرتے وقت سلطان قطب الدین ایبک نے اپنے دونوں دامادوں کو وصیت کی تھی۔

”التمش میرا دایاں بازو ہے اور ناصر الدین قباچہ بایاں بازو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے دونوں بازو سلامت رہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اگر کوئی ایک بازو بھی کمزور ہوا تو اسلامی سلطنت کا توازن بگڑ جائے گا۔ میری روح کو تکلیف پہنچے گی اور اسلامیان ہند نئی نئی مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیں گے۔“

سلطان شمس الدین التمش نے اپنے خسر کی اس وصیت کا بے شمار مواقع پر احترام کیا اور سیاسی حکمت عملی سے بہت سی بغاوتوں کو سر اُٹھانے سے پہلے ہی کچل دیا۔ مگر قطب الدین ایبک کا دوسرا داماد ناصر الدین قباچہ اقتدار کی اس تقسیم پر بظاہر مطمئن تھا مگر دلی طور پر رضامند نہیں تھا۔ وہ پنجاب کا حاکم تھا اور اس کا ہم زلف شمس الدین التمش مملکت ہند کا سلطان۔ ”حاکم“ اور ”سلطان“ کے منصب و حیثیت میں بڑا فرق تھا...... اور ناصر الدین قباچہ اس فرق کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اب برابری کی یہی ایک صورت تھی کہ سلطنت ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو جائے یا پھر ناصر الدین قباچہ سلطان شمس الدین التمش کے خلاف اعلان بغاوت بلند کر کے خود مختار بن جائے اور پھر دوسرے مرحلے میں سلطان کو شکست دے کر ”سلطان“ کے لقب کو اپنے نام کا حصہ بنا دے۔

بہرحال بوئے اقتدار نے ناصرالدین قباچہ کے دماغ کو پراگندہ کر دیا اور وہ زیرزمیں بغاوت کے جال پھیلانے لگا۔

پنجاب کے ایک درویش کو اس خفیہ منصوبے کی خبر ملی تو اس مردحق پرست نے سلطان شمس الدین کے نام ایک خط تحریر کیا۔

''یہ فقیر اس حقیقت سے باخبر ہے کہ سلطان کے شب و روز بندگان خدا کی خدمت میں صرف ہوتے ہیں۔ اس لئے فقیر کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ فرمانروائے ہند کے حق میں دعائے خیر کرے اور سلطان کو بدخواہوں کی فتنہ انگیزیوں کی اطلاع دے۔ پنجاب کے حاکم ناصرالدین قباچہ کی موجودہ سرگرمیاں سلطنت اسلامیہ کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ نادان شخص مرکز کے خلاف بغاوت کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس لئے سلطان کو چاہئے کہ وہ اپنے عمال کی گرفت کریں اور مخلوق خدا کو تباہی و بربادی سے بچائیں۔''

درویش نے اپنے ایک معتمر اور ذمہ دار خادم کو یہ خط دے کر دارالسلطنت دہلی کی طرف روانہ کیا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی مضمون کا ایک خط ملتان کے قاضی شرف الدین نے بھی والئ ہندوستان کے نام تحریر کیا۔ اپنے مکتوب میں قاضی صاحب نے سلطان شمس الدین سے درخواست کی تھی کہ وہ جلد از جلد باغیوں کا محاسبہ کریں ورنہ خوفناک خونریزی کا خدشہ ہے۔ قاضی شرف الدین ایک نہایت عالم اور دیندار شخص تھے۔ آپ نے اپنے غیر جانبدارانہ رویے اور منصفانہ فیصلوں کے ذریعے مسند عدالت کو رونق بخشی اور اہالیان ہند کو اسلامی عدل سے روشناس کرایا۔

اس قدر نازک لمحات میں دونوں بزرگوں نے اپنی ذمہ داریاں پوری کر دی تھیں مگر بدقسمتی سے یہ دونوں خط سلطان شمس الدین التمش تک نہ پہنچ سکے۔ واقعہ یوں ہوا کہ ناصرالدین قباچہ کے جاسوس بہت زیادہ ہوشیار اور سرگرم عمل تھے۔ جب دونوں قاصد پنجاب کی سرحد کے قریب پہنچے تو جاسوسوں نے اُنہیں پکڑ لیا اور پھر ایک ہی لمحے کی تاخیر کے بغیر اُنہیں ناصرالدین قباچہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

قباچہ نے ملتان کے گوشہ نشیں درویش اور قاضی شرف الدین کے خطوط پڑھے اور پھر جیسے ہی وہ آخری سطر تک پہنچا، غضبناک ہو کر چیخنے لگا۔

''میری مملکت میں رہتے ہیں، میرا نمک کھاتے ہیں اور میرے ہی خلاف سلطان کو ورغلاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر ناصرالدین قباچہ نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ درویش اور قاضی ملتان کو اس کے دربار میں پیش کیا جائے۔

درویش اور قاضیٔ شہر دربار میں بے نیازانہ داخل ہوئے۔ ناصرالدین نے درویش کو اپنے دائیں جانب بٹھایا اور قاضیٔ شہر کو شرف الدین کو سامنے۔ دونوں بزرگ صورتحال سے بے خبر تھے۔ ان کے خیال میں یہ ایک معمول کی کارروائی تھی۔ اس سے پہلے بھی ناصرالدین قباچہ دونوں بزرگوں کو دربار میں آنے کی دعوت دے چکا تھا۔ ان ملاقاتوں میں انتظامی امور زیر بحث آتے تھے۔ پھر یہ دونوں

بزرگ اپنی رائے اور مشورے دے کر رخصت ہو جاتے تھے......مگر اس بار صورتحال بہت سنگین تھی۔

ناصرالدین قباچہ نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے قاضی شرف الدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''قاضی صاحب! آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟''

''ذاتی طور پر مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔'' قاضی شرف الدین نے عالمانہ وقار کے ساتھ جواب دیا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو؟'' اچانک ناصرالدین قباچہ کا لہجہ ناشائستہ ہو گیا۔

''اللہ حاضر و ناظر ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔'' قاضی شرف الدین نے اس الزام تراشی پر نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ ''اگر میں جھوٹ بولوں گا تو عدالت کی آبرو کیسے برقرار رہے گی؟''

''پھر یہ کیا ہے؟'' ناصرالدین قباچہ نے قاضی شرف الدین کا لکھا ہوا خط ان کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ سارا خط میری برائیوں سے بھرا ہوا ہے۔''

قاضی شرف الدین نے خط لے لیا اور اس پر ایک نظر ڈالی۔ یہ ان کی اپنی وہی تحریر تھی جس کے ذریعے سلطان شمس الدین التمش کو ناصرالدین قباچہ کی بغاوت کے بارے میں خبر دی گئی تھی۔ قاضی شرف الدین نے خاموشی اختیار کر لی۔

حاکم پنجاب ناصرالدین قباچہ نے قاضی صاحب کے سکوت کو اعتراف جرم سے تعبیر کیا اور اسی وقت جلاد کو طلب کر کے اس مرد پاکباز کو قتل کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ اصولی طور پر حکومت کے مجرموں کو سرِ مقتل سزا دی جاتی ہے مگر ناصرالدین قباچہ نے قاضی شرف الدین کو سرِ دربار قتل کرا دیا تاکہ ملتان کے درویش پر اقتدار کی ہیبت طاری ہو جائے۔ پھر جب قاضی شرف الدین کا جسم ساکت ہو گیا تو خدمت گاروں نے اس شخص کے خون سے دربار کے فرش کو صاف کر دیا جو نہایت متقی اور منصف تھا۔

درویش کے چہرے پر رنج و الم کے سائے نمایاں تھے۔ ایک مردحق کو ایک مرد عادل کے گزر جانے کا بہت قلق تھا۔ ناصرالدین قباچہ نے درویش کی یہ کیفیت دیکھ کر سمجھ لیا کہ اس کی تدبیر کارگر ثابت ہوئی ہے۔ پھر اس نے درویش سے بھی وہی سوال کیا جو کچھ دیر پہلے مقتول و مظلوم قاضی سے لیا جا چکا تھا۔

''شیخ! کیا آپ کو بھی مجھ سے کوئی شکایت ہے؟''

''میرے اور آپ کے درمیان کوئی مخاصمت نہیں ہے۔'' درویش نے قلندرانہ لہجے میں جواب دیا۔

''پھر یہ کیا ہے؟'' ناصرالدین قباچہ نے دوسرا خط درویش کی طرف بڑھا دیا۔

درویش نے ایک نظر اس خط کو دیکھا جو سلطان شمس الدین التمش کے نام تحریر کیا گیا تھا۔ ''ہاں! یہ میرا ہی مکتوب ہے۔'' درویش کی پُرجلال آواز دربار میں گونجنے لگی۔ ''اس کا ایک ایک لفظ میں نے اپنے ارادے سے نہیں، خدا کے حکم سے لکھا ہے۔ اس مالک کے حکم سے جو مالک الملک ہے اور جس کے آگے بڑے بڑے زور آور بے دست و پا اور ناتواں ہیں۔ میں یہ تحریر لکھنے پر مجبور تھا اور تم اسے

پڑھنے پر مجبور ہو۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

درویش کی حق گوئی اور جرأت گفتار نے اہل دربار پر لرزہ طاری کر دیا۔ خود ناصر الدین قباچہ کی یہ حالت تھی کہ وہ درویش کے سامنے دم تک نہ مار سکا۔ اس نے سر جھکا لیا اور نہایت عاجزانہ لہجے میں کہنے لگا۔

''شیخ معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کو زحمت دی۔''

درویش نے سر دربار قاضی شرف الدین کے حق میں دعائے مغفرت کی اور حاکم پنجاب کے دربار سے نکل کر اپنی خانقاہ کی طرف چلے گئے۔

یہ درویش، سلسلۂ سہروردیہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ تھے جن کی راست گوئی اور بے باکی تاریخ ہند کے اوراق پر اس طرح ثبت ہے کہ صدیوں کا غبار بھی اسے دھندلا نہیں سکا ہے۔

قاضی شرف الدین حق کے راستے میں قربان ہو گئے مگر ان کا خون ناحق ایسا رنگ لایا کہ ناصر الدین قباچہ کی داستان حیات بھی سرخ ہو گئی۔

614ھ میں دریائے چناب کے کنارے سلطان شمس الدین التمش اور ناصر الدین قباچہ کے درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی۔ قباچہ کو شکست ہوئی اور وہ میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔ پھر اس کے اور التمش کے درمیان کئی خوں رنگ معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ یہاں تک کہ ایک بار وہ بھکر سے بھاگ کر دریا عبور کرنا چاہتا تھا مگر اس وقت دریا میں شدید طغیانی آئی ہوئی تھی۔ انجام کار ناصر الدین قباچہ سیلاب کی نذر ہو گیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ قاضی شرف الدین کے قتل کا عذاب تھا جو کئی سال تک قباچہ پر نازل ہوتا رہا......اور یہ موج عذاب اس وقت رکی جب ناصر الدین قباچہ ذلت و بربادی کی موت سے ہمکنار ہو گیا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ 565ھ میں پیدا ہوئے۔ ارض ملتان کو آپ کا مقام ولادت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ قریشی الاصل تھے۔ آپ کے خلیفہ سید جلال الدین سرخ بخاریؒ اس بات پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''میرے پیر و مرشد کے آبا و اجداد عرب کے امراء اور شرفاء میں سے تھے اور قریش کے ممتاز قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ میرے شیخ کا یہ نسب نامہ قصی کے حوالے سے رسالت پناہ ﷺ کے نسب مبارک سے مل جاتا ہے۔ قصی کے دو فرزند تھے۔ ایک عبد مناف جو سرکار دو عالم ﷺ کے جد امجد ہیں......اور دوسرے عبدالعزیٰ جو میرے شیخ کے مورث اعلیٰ ہیں۔''

بعض محققین کی رائے کے مطابق ہبارؓ بن اسود حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مورث اعلیٰ تھے۔ ہبارؓ بن اسود نے شروع میں رسول کریم ﷺ کی مخالفت کی تھی مگر فتح مکہ کے بعد ایمان لے آئے تھے اور پھر احکام دین کی اطاعت میں بہت مستقل مزاج ثابت ہوئے تھے۔ حضرت ہبارؓ بہت

...انسان تھے۔ مکہ معظمہ میں آپ کی تجارت کے بڑے بڑے مراکز تھے، بیک وقت کئی تجارتی ...شام اور مصر جایا کرتے تھے۔ مشہور مؤرخ خطیب بغدادی کی روایت ہے کہ حضرت ہبارؓ کے ...دوں کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ''الجبال'' کا علاقہ جاگیر میں مرحمت فرمایا تھا جو بعد ...خوارزم کے نام سے موسوم ہوا۔ حضرت ہبارؓ بن اسود قبول اسلام کے بعد بھی مستقل طور پر مکہ مکرمہ ...مقیم رہے اور اپنی ساری زندگی جوار کعبہ میں گزار دی۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا خاندان نہ صرف علم و فضل میں یکتائے روزگار تھا بلکہ کئی ...پشتوں تک اسی خاندان کے افراد کوٹ کروڑ (سندھ) کے منصب قضا پر فائز رہے تھے۔ حضرت شیخ کے ...بزرگوں میں سے جو بزرگ سب سے پہلے ملتان تشریف لائے تھے، وہ حضرت کمال الدین علی شاہؒ تھے۔ مشہور سیرت نگار مولانا سید سلطان ندویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا ...پہلے دوسری صدی ہجری میں سندھ آ کر آباد ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد یہ خاندان سکھر کے علاقے میں ''...تور'' نامی قصبے میں جا بسا۔ پھر پانچویں صدی ہجری کی ابتداء میں یہ لوگ وہاں سے نقل مکانی ...کر کے ملتان چلے آئے۔

شہرۂ آفاق سیاح ابن بطوطہ کا بیان ہے۔ ''مجھے خود حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے حضرت شاہ رکن عالمؒ نے بتایا تھا کہ ان کے بزرگ سندھ سے ملتان تشریف لائے تھے۔''

ابن بطوطہ کے علاوہ مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ اور نامور سیاح صوفی حامد بن فضل اللہ جمالیؒ کی روایت ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے بزرگوں میں سے تاج الدین المطہر ف خوارزم ...آئے اور جب سندھ پر ہباریوں کو اقتدار حاصل ہو گیا تو تاج الدین المطہر ف کی اولاد بھی المنصورہ ...منتقل ہو گئی۔ پھر جب قرامطہ نے ہباریوں پر غلبہ حاصل کر لیا تو سلطان محمود غزنوی طوفان بلاخیز کی طرح سندھ پہنچا اور قرامطہ کو تباہ و برباد کر دیا۔ اپنی اس جنگی مہم کو کامیابی کے ساتھ تکمیل تک پہنچانے کے بعد فاتح سومنات حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مورث اعلیٰ حضرت کمال الدین علی شاہؒ ...کو ملتان لے آیا۔ کچھ عرصہ آپ یہاں مقیم رہے اور پھر سلطان کے حکم سے کوٹ کروڑ (سندھ) میں منصب قضا پر فائز ہوئے۔ کمال الدین علی شاہؒ کے بعد شیخ جلال الدینؒ اور پھر ان کے صاحبزادے شیخ ابوبکر اس اہم عہدے پر فائز ہوئے۔

حضرت شیخ ابوبکرؒ کے صاحبزادے مولانا وجیہہ الدین محمد غوثؒ تھے۔

...سیر العارفین کی روایت کے مطابق مولانا حسام الدین ترمذیؒ نے فتنۂ تاتار کے سبب ہجرت کی اور ہندوستان آ کر کوٹ کروڑ میں سکونت اختیار کی۔ مولانا حسام الدینؒ کی ایک صاحبزادی تھیں جن کا نکاح مولانا وجیہہ الدین محمد غوث سے ہوا اور ان ہی پاکباز خاتون کے بطن سے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ پیدا ہوئے۔ بعض محققین نے 27 رمضان المبارک 566ھ کو حضرت شیخ کا سال ولادت ...لکھا ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے بارے میں مشہور روایت ہے کہ آپ پیدائشی ولی تھے۔ بیشتر تذکرہ نویس اس ذیل میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ شیرخواری کے زمانے میں جب بھی رمضان کا مقدس مہینہ آتا تھا، حضرت شیخ دن کے وقت دودھ پینا چھوڑ دیتے تھے۔

آپ کے پیدائشی ولی ہونے کے سلسلے میں ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ جب آپ کے والد محترم مولانا وجیہہ الدینؒ قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ ماں کا دودھ پینا چھوڑ دیتے تھے۔ بعض دنیا پرست اس قسم کی روایتوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ روحانیت سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے اپنے سلسلوں کو شہرت دینے کیلئے اس انداز کے افسانے تراش لیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ انتہائی کم نظری اور بے خبری کی علامت ہے۔ جو ذات پاک کروڑوں انسانوں میں سے اپنے رسول اور نبی کا انتخاب کرتی ہے، وہی ذات بے نیاز بے شمار آدم زادوں میں سے اپنے ولی کو بھی منتخب کرتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام گہوارے میں اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو نہایت کم سنی میں رسالت اور نبوت عطا کی گئی تھی۔ اب اگر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کو گہوارے میں ولایت عطا کر دی گئی تو عقل کے شعبدہ بازوں اور تہذیب کے کوچہ گردوں کو حیرت کیوں ہے؟

☆☆..................☆☆..................☆☆

ابھی حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ بہت چھوٹے تھے کہ آپ کے والد محترم نے آپ کو ابتدائی تعلیم کیلئے مولانا نصیر الدین بلخیؒ کے مکتب میں داخل کر دیا۔ روایت ہے کہ حضرت شیخ نے سات سال کی عمر میں قرآن شریف ساتوں قرأتوں کے ساتھ حفظ کیا۔ یہ انسانی حافظے اور ذہنی رسائی کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ حفظ کلام الٰہی کے بعد حضرت شیخؒ درسی کتابوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

ابھی آپ کی عمر صرف گیارہ سال تھی کہ ایک جانگداز واقعہ پیش آیا۔ 577ھ میں حضرت شیخ کے والد محترم مولانا وجیہہ الدین محمد غوثؒ کا انتقال ہو گیا۔ ایسے مرحلے میں ایک شفیق باپ کی جدائی اولاد کیلئے ناقابل برداشت ہوتی ہے مگر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے اس صدمۂ عظیم کو صابرین کی طرح برداشت کیا کہ آگے چل کر آپ کو بہت سے بار گراں اُٹھانے تھے۔

مہربان چچا شیخ احمد غوثؒ نے آپ کے سر پر دستار باندھی اور آبا و اجداد کی مسند پر بٹھا دیا۔ علماء، مشائخ اور اس علاقے کے زمینداروں نے حاضر خدمت ہو کر رسم تعزیت ادا کی۔ خدمت گار، ملازم اور نوکر سلام کو حاضر ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق خزانے کے نگراں نے درخواست کی کہ رقوم اور دیگر حسابات کی جانچ پڑتال کی جائے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ کے والد محترم ایک مالدار شخص تھے۔

''جائداد کے سارے انتظامات آپ سنبھالیں۔'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے عم محترم کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کیا۔ ''والد محترم کے بعد آپ ہی میرے بزرگ ہیں۔''

یہ سن کر حضرت شیخ احمد غوثؒ آبدیدہ ہو گئے۔

''بس میری ایک درخواست ہے کہ مجھے تحصیل علم کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔'' حضرت شیخ نے عرض کیا۔

''میرے عزیز بھائی کی نشانی! تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔'' شیخ احمد غوثؒ نے بھتیجے کو گلے سے لگا لیا۔ ''تمہارے باپ کی طرح میری بھی یہی خواہش ہے کہ خداوند ذوالجلال تمہیں علم کی دولت سے مالا مال کرے۔ یہ سیم و زر کے چند سکے تمہاری پہچان نہیں۔ تمہارا تخت مسند علم ہے، تمہارا تاج دستار فضیلت ہے اور یہی تمہاری شناخت ہے۔''

بھتیجے کی طرف سے اس خواہش کا اظہار ہوتے ہی شیخ احمد غوثؒ نے بڑے بڑے علماء کو ''کوٹ کروڑ'' میں جمع کر دیا۔ مولانا عبدالرشید کرمانیؒ بھی حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے اساتذہ میں شامل تھے۔ محلہ کڑہ (ملتان) کے اندر ایک مسجد کے جنوبی حجرے میں مولانا عبدالرشید کرمانیؒ کا مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

مقامی علماء سے اکتساب علم کرنے کے بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے خراسان کا سفر اختیار کیا۔ ان دنوں خراسان کا شمار علوم مشرقیہ کے بڑے مراکز میں ہوتا تھا۔ حضرت شیخؒ ایک قافلے کے ہمراہ خراسان پہنچے اور سات سال تک مختلف علماء اور مشائخ سے علوم ظاہری حاصل کرتے رہے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا طریق کار یہ تھا کہ چند دن تک ایک استاد کی خدمت میں حاضر رہتے اور ان کے سینے میں جس قدر علم ہوتا اس کا مکاشفہ کر لیتے۔ پھر دوسرے استاد کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ اس طرح آپ نے چار سو چوالیس باکمال اساتذہ کے آگے زانوائے تلمذ طے کیا اور سند فضیلت حاصل کی۔

کم نظر اور سطحی علم رکھنے والے حضرات اس روایت پر شکوک شبہات کا اظہار کریں گے کہ ہفتہ دس دن کے مختصر ترین عرصے میں کسی باکمال شخص کے علم کا احاطہ کرنا کس طرح ممکن ہے؟ دراصل ہمارے تاریخ نویسوں اور سیرت نگاروں میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ وہ روایت بیان کرتے وقت اس کی وضاحت نہیں کرتے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ذہین ترین انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طبیعت اور ذہن میں ایک ایسی مقناطیسی صلاحیت رکھی تھی کہ اگر ایک بار کوئی نکتہ سن لیتے تو اس کے سارے معانی اور مفاہم آپ کے شعور میں جذب ہو کر رہ جاتے۔ ہفتہ دس دن میں کسی اہل کمال کا سارا علم حاصل کر لینا، اسی صلاحیت کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں علم کی مادّی مقدار کا ذکر نہیں علم کی روح مراد ہے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا یہی وصف خاص تھا کہ آپ اپنے اساتذہ کے ذہن رسا تک سفر کرتے تھے اور ان کے طرز استدلال اور نکتہ آفرینی کے جوہر اپنی ذات میں سمونے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں یہ بات ہمارے قارئین کے علم میں اضافے کا سبب ہوگی کہ امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ نے چار ہزار اساتذہ سے علم حاصل کیا تھا۔ امام اعظمؒ کا بھی یہی طریقہ تھا کہ آپ اپنے اساتذہ کے علم کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ علم الفاظ کے ذخیرے اور روایتوں کے انبار کا نام نہیں۔ حقیقی علم وہی ہے جو انسان کے فکری اور معاشرتی مسائل کو حل کر سکے۔

خراسان کے بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ؒ بخارا تشریف لے گئے۔ اس وقت بخارا خراسان سے بھی بڑا علمی مرکز تھا۔ یہاں بھی حضرت شیخ ؒ کے پاس دو ہزار سے زیادہ کتابیں جمع ہوگئی تھیں۔ اس زمانے میں جبکہ طباعت کا انتظام نہیں تھا دو ہزار کتابوں کو بہت بڑا علمی خزانہ کہا جاسکتا ہے۔

''تذکرۂ اولیائے کرام'' کے مؤلف کا بیان ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ؒ نے بخارا میں آٹھ سال قیام فرمایا۔ یہاں کے لوگ حضرت شیخ ؒ کے اوصاف حمیدہ سے یہاں تک متاثر ہوئے کہ آپ کو ''بہاء الدین فرشتہ'' کہہ کر پکارنے لگے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

خراسان اور بخارا کی تمام درس گاہوں سے فیضیاب ہونے کے بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ؒ تزکیۂ نفس اور باطن کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے مسلسل بیس سال تک اس قدر سخت مجاہدات کئے کہ ان کی تفصیلات پڑھنے سے حیرت ہوتی ہے۔ ''خلاصۃ العارفین'' کے مصنف ان ریاضتوں اور مجاہدوں کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

''ایک بار کسی مرید یا عقیدت مند نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ؒ سے عرض کیا۔ ''شیخ! آپ اپنے مجاہدے کا کوئی واقعہ بیان فرمائیے۔''

خادم کی بات سن کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ؒ نے گریز اختیار کیا مگر جب اس شخص کا اصرار بہت زیادہ بڑھا تو آپ نے فرمایا۔

''فقیر کیلئے اپنے مجاہدے اور ریاضت کی کیفیت بیان کرنا مناسب نہیں کہ ایک طرف اس سے غرور کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف طالب کو خوف لاحق ہوتا ہے کہ کہیں اس کی محنت برباد نہ ہوجائے ...... مگر پھر بھی اتنا سمجھ لو کہ یہ فقیر بیس سال تک ایک پیالہ پانی اور ایک چھٹانک غذا پر روزہ افطار کرتا رہا ہے...... اور یہ ایک ادنیٰ مجاہدہ ہے کہ جسے ہر مبتدی اپنی طبیعت اور نفس پر غلبہ پانے کیلئے آسانی کے ساتھ کرسکتا ہے۔ اس کے بعد میں حج کی نیت سے ارض پاک کی طرف روانہ ہوا۔''

ایک اور موقع پر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ؒ اپنے مجاہدات کے بارے میں فرماتے ہیں۔

''میں نے یہ تمام تر مشقت اور ریاضت رب کعبہ کی رضا جوئی کیلئے کی۔ یہاں تک کہ ارض مقدس میں جا پہنچا۔ حج کیا اور عرفات کی پہاڑی پر حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوا۔ خداوند کریم کے فضل و احسان سے اس دوران میں نے بڑا فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد نیا احرام باندھ کر سرور کونین حضور اکرم ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوا۔ پانچ سال مدینہ منورہ میں رہ کر رسالت پناہ ﷺ کے قدموں کی خاک پاک کے صدقے میں انوار الٰہی کا ظاہری اور باطنی مشاہدہ کیا۔''

حامد بن فضل اللہ جمالی ؒ کا بیان ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ؒ پانچ سال تک مدینہ منورہ میں قیام فرما رہے۔ اس زمانے میں حضرت مولانا کمال الدین محمد یمنی ؒ جو اپنے وقت کے بہت بڑے محدث تھے، حرم نبوی ﷺ میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے، حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ؒ ان

کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے ...... اور طلباء کی اگلی صف میں استاد کے ساتھ بیٹھ کر حدیث پاک کا درس لینے لگے۔ حضرت شیخ ؒ، مولانا یمنی ؒ کے ساتھ ہر سال حج پر جاتے اور پھر مدینہ منورہ حاضر ہوجاتے۔ جب حدیث شریف کا سبق تمام ہوچکا تو رسم زمانہ کے مطابق حضرت مولانا کمال الدین یمنی ؒ نے آپ کو حدیث رسول ﷺ پڑھانے کی سند عطا کی۔ اس کے بعد آپ اپنے استاد گرامی کی دعاؤں کے سائے میں بیت المقدس کی طرف روانہ ہوگئے۔

مدینہ منورہ کے قیام کے دوران حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ؒ روضۂ مبارک کے دائیں جانب ایک خاص مقام پر معتکف رہا کرتے تھے جو بعد میں آپ کے نام سے منسوب ہوگیا تھا۔ چنانچہ جب مشہور صوفی شاعر حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی ؒ دیار رسول اللہ ﷺ میں حاضر ہوئے تو آپ نے بھی اسی مقام کو عبادت و ذکر کیلئے پسند فرمایا۔ حضرت جامی ؒ کے بقول۔ ''مجھے اس جگہ بیٹھ کر عجیب روحانی لذت کا احساس ہوا اور میں نے بہت فیض حاصل کیا۔''

☆☆..................☆☆..................☆☆

تمام معتبر روایات سے پتا چلتا ہے کہ مدینہ منورہ سے رخصت ہوکر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ؒ بیت المقدس میں حاضر ہوئے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کیا اور تمام انبیائے پاک علیہم السلام کے مزارات اقدس کی زیارت سے شرف یاب ہوئے۔ اس کے بعد آپ دمشق تشریف لے گئے۔

دمشق میں شہر کے باہر ایک خوفناک اژدھا رہتا تھا جو بہت سے لوگوں کو ہلاک کرچکا تھا۔ مقامی باشندوں نے اژدھے کو مارنے کی بہت کوششیں کی تھیں مگر وہ ہر بار ناکام رہے تھے۔ آخر مجبور ہوکر لوگوں نے اس راستے سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی اگر کوئی اجنبی مسافر اس راستے پر آنکلتا تو وہ اس خون آشام اژدھے کی خوراک بن جاتا۔ وہ افعی ایک غار میں روپوش رہتا تھا۔ پھر جیسے ہی اسے کسی انسان کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوتی وہ تیزی سے باہر آتا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس آدم زاد کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ مقامی لوگوں نے کئی مرتبہ اس غار کو بند کرنے کی بھی کوشش کی تھی مگر اژدھے نے ان کی یہ تدبیر بھی ناکام بنادی تھی۔

ایک بار حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ؒ کا گزر اسی غار کی طرف سے ہوا۔ اژدھا حسب معمول اپنے شکار کا منتظر تھا۔ آپ کے قدموں کی آہٹ سنتے ہی غار سے باہر نکلا اور پوری شدت کے ساتھ آپ پر حملہ آور ہوا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ؒ نے ایک نظر اس موذی کی طرف دیکھا اور اطمینان کے ساتھ اپنی چادر اژدھے پر ڈال دی۔ پھر آپ آگے بڑھ گئے اور پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ اژدھے کا کیا حال ہوا؟ کچھ دیر بعد جب دور سے گزرنے والوں نے غار کی طرف دیکھا تو وہاں صرف چادر موجود تھی اور اژدھا مرا پڑا ہوا تھا۔ لوگ ڈرتے ڈرتے افعی کے قریب گئے مگر جب اس کے جسم میں برائے نام بھی حرکت نہیں پائی تو دمشق کے نواحی علاقے میں ایک شور سا مچ گیا۔ مقامی باشندے گروہ در گروہ غار کے سامنے جمع ہوکر اژدھے کی موت پر خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔ پھر لوگوں کو جستجو ہوئی کہ یہ کس بزرگ کی چادر ہے کہ جس کے اثر سے اژدھے کی موت واقع ہوئی ہے۔ آخر کئی

دن کی جستجو اور تحقیق کے بعد یہ راز کھلا کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اس راستے سے گزرے تھے۔ پھر خبر سینہ بہ سینہ چلی اور شہرت عام تک پہنچی تو ہزاروں لوگ حضرت شیخؒ کے دیدار کیلئے اس مکان کے گرد جمع ہو گئے جہاں آپ ایک طویل عرصے سے سکونت پذیر تھے۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے پانچ سال تک دمشق میں قیام فرمایا۔ اس دوران بڑے بڑے مشائخ حاضر خدمت ہوئے اور آپ کی وسعت علم سے استفادہ کیا۔

دمشق میں قیام کے دوران ہی حضرت شیخؒ پر ایک عجیب سا اضطراب طاری رہنے لگا۔ آپ اپنی طویل دعاؤں میں یہ دعا بھی خصوصیت کے ساتھ مانگا کرتے تھے۔ "اے مالک کون ومکاں! اے بے پناہ دینے والے! تو نے اپنے بندے بہاء الدین کو اتنا دیا کہ اس کا دامن تنگ ہو گیا۔ عقل کی پیاس بجھ گئی مگر قلب اور روح کی پیاس اسی شدت سے بھڑک رہی ہے۔ اب اپنی بارش کرم سے اس پیاس کو بھی بجھا دے کہ تیری ذات بے نیاز بخشش وعطا کے ہر زاویے پر قادر ہے۔"

دراصل واقعہ یہ تھا کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ بہت دنوں سے کسی مرشد روحانی کی تلاش میں تھے۔ آپ جس بزرگ کی شہرت سنتے اس کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ اب یہ عجیب بات ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے بے شمار بزرگوں کے روحانی دربار میں حاضری دی مگر کسی آستانے پر پہنچ کر آپ کے دل سے یہ آواز نہیں آئی کہ یہی وہ مقام ہے...... بس یہیں ٹھہر جا! عام لوگ تو اسے اتفاق ہی سمجھیں گے مگر تصوف کی دنیا میں اتفاقات اور حادثات نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کاتب تقدیر نے جس طرح عام انسانوں کی تقدیریں لکھی ہیں، اسی طرح بزرگان دین کی قسمت کے فیصلے بھی تحریر کیے ہیں۔ یہ اسی قادر مطلق کا قائم کیا ہوا اندازہ ہے جو عالم اسباب میں ہمیں صاف نظر آتا ہے۔ جس طرح ہر شخص انتہائی کوشش کے باوجود شہنشاہیت کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا اسی طرح ہر انسان شدید ریاضت کے بعد بھی منصب ولایت پر فائز نہیں ہو سکتا۔ اس ذیل میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہر طالب معرفت کو ہر بزرگ کے فیض روحانی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے کے مطابق حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ بھی ابھی اس مرد کامل کی خانقاہ تک نہیں پہنچے تھے جس کے دروازے سے آپ کی روحانی تقدیر وابستہ کر دی گئی تھی۔

ابھی حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ دمشق ہی میں قیام فرما تھے کہ آپ نے سمرقند کے ایک بزرگ کے بارے میں سنا جو صاحب کمال تھے۔ یہ خبر سنتے ہی شوق دید نے آپ کو دمشق میں ٹھہرنے نہیں دیا۔ نتیجتاً حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے دمشق کے دوستوں کو الوداع کہا اور سمرقند کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆......☆☆......☆☆

آخر طویل اور دشوار گزار سفر طے کرنے کے بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ سمرقند پہنچے اور اس مرد کامل کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کسی تاریخ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ ان بزرگ کا نام کیا تھا اور وہ کس روحانی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے؟ بہر حال جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ بزرگ

کی خدمت میں پہنچے تو ان پر استغراق کی کیفیت طاری تھی۔ حضرت شیخؒ روزانہ پابندی کے ساتھ بزرگ کی خدمت میں جاتے رہے مگر انہوں نے نہ سلام کا جواب دیا اور نہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو بزرگ کی مجذوبانہ حالت دیکھنے کے بعد مایوس ہو کر واپس چلا جاتا لیکن حضرت شیخؒ کے پائے استقامت میں نہ لرزش آئی اور نہ صبر کے دامن کو اپنے ہاتھ سے چھوڑا۔ مشہور روایت ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ سمرقند کے ان بزرگ کی خدمت میں دو سال تک بلا ناغہ حاضر ہوتے رہے۔ یہ طلب اور جستجو کی ایک بہترین مثال ہے۔ آخر دو سال کے طویل عرصے کے بعد وہ بزرگ ہوش میں آئے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اسی ساعت مبارک کے منتظر تھے۔ والہانہ انداز میں آگے بڑھے اور دست بوسی کی سعادت حاصل کی۔ بزرگ نے حضرت شیخؒ کی طرف دیکھ کر تبسم فرمایا۔

"بہاء الدین! تمہارا آنا مبارک ہو۔ تم نے بہت انتظار کیا اور اس راستے میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں؟ مگر یاد رکھو کہ بزرگوں کی خدمت سے دونوں جہان کی مرادیں ملتی ہیں۔"

"اگر آپ سے ملاقات کے انتظار میں عمر بھی گزر جاتی تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔" حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے عرض کیا۔

"بہاء الدین! میری بات غور سے سن!" بزرگ نے نہایت پرسوز لہجے میں فرمایا۔ "تیس سال گزر چکے ہیں کہ یہ فقیر بحر تجلیات میں غرق ہے اور آنے جانے والوں سے بے خبر! آج دوست کا حکم ہوا ہے کہ تجھ سے ہم کلام ہو کر تجھے اپنی حالت سے آگاہ کروں۔"

یہ کہہ کر وہ بزرگ خاموش ہو گئے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں بزرگ پر جذب کی وہی کیفیت طاری نہ ہو جائے اور آپ ایک مرد کامل کی گفتگو سننے سے محروم نہ رہ جائیں۔ حضرت شیخؒ کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا مگر آپ احترام کے پیش نظر مداخلت نہیں کر سکتے تھے۔

آخر طویل وقفۂ سکوت کے بعد وہ بزرگ دوبارہ مخاطب ہوئے۔ "اے عزیز! یاد رکھ کہ درویش کیلئے مخلوق کی صحبت سے بڑھ کر کوئی اور چیز مضرت رساں نہیں ہے۔ انسان جس قدر خلقت سے قریب ہوتا ہے، اسی قدر خالق سے دور ہو جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر بزرگ نے اپنا مصلیٰ اور مٹھی بھر اشرفیاں حضرت شیخؒ کو عنایت کیں اور نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ "یہ تمہارا زاد راہ ہے۔ اس لئے کہ تمہیں بہت دور جانا ہے۔ بس اب تم جاؤ۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے بڑے ذوق وشوق سے وہ تبرک لے لیا۔ ابھی آپ سے یہ پوچھنے ہی والے تھے کہ میری منزل کہاں ہے؟ وہ بزرگ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ حیران رہ گئے۔ کبھی مصلے اور اشرفیوں کو دیکھتے اور کبھی اس خالی جگہ کو جہاں چند لمحے پہلے ایک جاں سوختہ عشق الٰہی موجود تھا۔ پھر آپ نے ایک آہ سرد بھری گویا زبان حال سے کہہ رہے ہوں۔

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

(ہم نے جی بھر کے پھول کے چہرے کو دیکھا بھی نہیں کہ بہار ختم ہوگئی)

جس مردِ خدا سے فیض روحانی حاصل کرنے کیلئے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے دو سال انتظار کیا تھا، وہ ہم کلام ہوا تو اس طرح کہ جیسے بادِ نسیم کا کوئی تیز جھونکا آئے اور گزر جائے۔ بعض روایتوں میں درج ہے کہ ان بزرگ کے اچانک غائب ہو جانے سے حضرت شیخؒ کو شدید صدمہ پہنچا تھا۔ مرشد کامل کی جستجو میں آپ جس اضطرابی کیفیت سے دوچار تھے، اس میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ پھر جب کبھی حضرت شیخؒ پر مایوسی کا غلبہ ہونے لگتا تو یکایک آپ کو ان بزرگ کے آخری الفاظ یاد آتے۔

''بہاء الدین! تمہیں بہت دور جانا ہے۔''

ان الفاظ کا اعجاز مسیحائی یہ تھا کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے دل میں نئی تڑپ پیدا ہوجاتی اور آپ نئے حوصلے کے ساتھ سرگرم سفر ہو جاتے۔ آخر ذوق طلب آپ کو ایک ایسے مردِ حق کی بارگاہ میں لے گیا جو برسوں سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف بلا رہا تھا۔

یہ تھے مشہور بزرگ اور سلسلۂ سہروردیہ کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمتہ اللہ علیہ۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی خانقاہ میں داخل ہوئے اور حضرت شیخؒ کے چہرۂ مبارک پر آپ کی نظر پڑی تو بے اختیار آپ کے دل سے آواز آئی۔

''بہاء الدین! یہی تیری منزل ہے اور یہی تیرا گوہر مقصود۔''

کچھ دیر تک آپ پر جذب کی سی کیفیت طاری رہی۔ پھر آپ بڑے والہانہ انداز میں حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی طرف بڑھے اور اس مردِ جلیل کے سامنے خم ہوگئے۔ دست بوسی کی سعادت حاصل کی اور گلوگیر آواز میں یہ شعر پڑھا۔

مابہ عشق تو نہ امروز گرفتار شدیم

کہ گرفتاری میا تو زروز ازل است

(میں آج تیرے عشق میں گرفتار نہیں ہوا ہوں بلکہ یہ اسیری تو روزِ ازل سے میرا مقدر ہے)

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے یہ شعر سنا تو حضرت زکریا ملتانیؒ کو اُٹھا کر گلے سے لگا لیا۔

''شیخ! میں بہت تھک گیا ہوں۔'' حضرت زکریا ملتانیؒ اس طرح رو رہے تھے جیسے کوئی بچھڑا ہوا بچہ باپ کے سینے پر سر رکھ کر گریہ وزاری کرتا ہے۔

''فرزند! ہم بھی تمہارے فراق میں تڑپ رہے تھے۔'' حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ ''خلاق عالم کا یہی انتظام ہے۔ فراق کے بعد وصال اور وصال کے بعد فراق۔ اس کا شکر ادا کرو کہ آسودۂ منزل ہوگئے ورنہ بے شمار لوگ راستے ہی میں پیاسے مر جاتے ہیں۔''

آخر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اس بے قرار عشق کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کرلیا جس نے مرشد کامل کی جستجو کیلئے اپنی حیات عزیز وقف کردی تھی۔

بڑی عجیب بات ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی خدمت میں صرف سترہ دن رہے اور وہ تمام فیوض و برکات حاصل کرلئے جو دوسرے مرید سترہ سال میں بھی حاصل نہ کر سکے تھے۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ فرماتے ہیں۔

''اس وقت شیخ الشیوخ جو خرقہ زیب تن فرمائے ہوئے تھے، اپنے جسم مبارک سے اُتار کر میرے سر پر رکھ دیا۔ پھر اپنا وہ مصلیٰ جس پر پیر و مرشد عمر بھر مصروف عبادت رہے تھے اور وہ خرقہ جو حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے حضرت شیخ الشیوخ کو اپنے مشائخ کے توسط سے پہنچا تھا، دونوں اس خاکسار کے سپرد فرما دیئے۔''

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے دوسرے مرید جو ایک طویل عرصے سے ریاضتوں میں مصروف تھے، پیر و مرشد کی بخشش و عطا کا یہ انداز دیکھ کر حیران رہ گئے۔ شیخ کی موجودگی میں تو کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ ہوسکی مگر پس پردہ وہ ایک دوسرے سے شکایتی لہجے میں کہنے لگے۔

''کیسی حیرت کا مقام ہے کہ ہم لوگ برسوں سے حضرت شیخ کے آستانے پر دست طلب دراز کئے ہوئے کھڑے ہیں مگر ہمارے ہاتھ اور دامن ابھی تک خالی ہیں۔ مگر اس درویش کو دیکھو کہ اچانک آیا اور ایک ہی رات میں معرفت کے خزانوں کا مالک بن گیا۔ نہ اس نے کوئی ریاضت کی اور نہ شیخ نے اسے کسی مشقت میں ڈالا۔ پھر یہ سب کچھ کیسے ہوگیا؟'' بظاہر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مریدوں کا لہجہ محتاط تھا مگر در پردہ سب کے سب یہی کہنا چاہتے تھے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ خرقۂ خلافت کے حقدار نہیں تھے اور پیر و مرشد کی یہ عنایت منصفانہ نہیں ہے۔

صبح حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے تمام مریدانِ خاص کو اپنے حجرۂ مبارک میں طلب کیا۔ پھر ایک خادم کو چند کبوتر لانے کا حکم دیا۔ جب کبوتر آگئے تو حضرت شیخؒ نے وہ سارے پرندے اپنے مریدوں میں تقسیم کر دیئے اور خرقۂ خلافت کے دعوے داروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''پہلے تم لوگ ان کبوتروں کو ایسی جگہ ذبح کرو جہاں تمہیں دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ پھر میرے پاس آ جاؤ۔''

تمام مرید کبوتر لے کر چلے گئے۔ ان مریدوں میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ بھی شامل تھے۔

تھوڑی دیر بعد تمام مریدوں نے گوشۂ تنہائی تلاش کر کے پیر و مرشد کی ہدایت کے مطابق کبوتروں کو ذبح کر ڈالا اور حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوگئے، خدام شدید حیرت کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھیں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کو ڈھونڈ رہی تھیں جو ابھی تک پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے تھے۔

حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کو بھی اپنے خلیفہ اکبر کا انتظار تھا۔ آخر حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اس حالت میں تشریف لائے کہ آپ کے ہاتھ میں زندہ کبوتر موجود تھا۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کے تمام مرید بہت خوش ہوئے اور دل ہی دل میں کہنے لگے۔

''یہ مرید جسے خلافت کبریٰ حاصل ہوگئی ہے، کوئی نادان شخص ہے کہ کبوتر کو ذبح کئے بغیر چلا آیا۔ اب یہ پیر ومرشد کے غضب سے محفوظ نہیں رہے گا اور جو دولت عظمیٰ اسے کسی مشقت کے بغیر راتوں رات حاصل ہوگئی ہے، یکایک سلب ہوجائے گی۔''

ابھی حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے مریدان خاص یہ سوچ ہی رہے تھے کہ حضرت شیخؒ ان سے مخاطب ہوئے۔

''تم لوگوں نے میری ہدایت کے مطابق ان پرندوں کو ذبح کیا ہے؟''

''شیخ محترم! اس میں کیا شک ہے۔'' تمام مریدان خاص نے بیک زبان عرض کیا۔ ''ہم تو پیر ومرشد کی نافرمانی کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔''

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنے مریدان خاص کا جواب سنا اور پھر آپ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ سے مخاطب ہوئے۔ ''بہاء الدین! تم نے اس کبوتر کو ذبح کیوں نہیں کیا؟''

''سیدی! اس حقیر وعاجز کو کوئی گوشۂ تنہائی نہ مل سکا۔ پھر یہ غلام کس طرح پیر ومرشد کے حکم پر عمل پیرا ہوتا؟'' حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے نہایت عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔

''اور تم بہت دیر سے بھی آئے۔'' حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا۔

''یہ خادم، گوشۂ تنہائی کی تلاش میں تھا۔'' حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے عرض کیا۔ ''اگر یہ غلام ساری زندگی جستجو میں گزار کے آتا، تب بھی اس عاجز کا یہی جواب ہوتا۔ پوری کائنات میں کہیں کوئی گوشۂ تنہائی موجود نہیں ہے۔ یہ حقیر جہاں بھی گیا، حق تعالیٰ کو حاضر وناظر پایا۔''

''تم نے سچ کہا بہاء الدین!'' حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا لہجہ نہایت پُرجوش تھا۔ پھر آپ نے اپنے مریدان خاص کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ ''اور تم لوگوں کو اتنی جلد گوشۂ تنہائی میسر آگیا۔''

مریدان خاص کی گردنیں ندامت سے جھک گئیں۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے دوبارہ اپنے مریدوں کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ ''تم سب لوگ جنگل میں چلے جاؤ اور اپنے اپنے حصّے کی گھاس کاٹ کر لے آؤ۔''

اب کی بار مریدان خاص اس راز کو سمجھ گئے تھے کہ جس طرح کبوتر کا ذبح کرنا ایک امتحان تھا، اسی طرح جنگل سے گھاس لانا بھی ایک آزمائش تھی۔ مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ حکم شیخ میں کون سا نکتہ پوشیدہ ہے؟

الغرض جب سلسلۂ سہروردیہ کے تمام درویش جنگل سے واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں ہرے بھرے گھاس کے گٹھر تھے۔ اس کے برعکس حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پاس سوکھی گھاس موجود تھی۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنے دوسرے مریدوں سے پوچھا۔ ''تم یہ ہری بھری سرسبز گھاس کیوں لائے؟''

''سرسبز گھاس نظروں کو اچھی لگتی ہے، اس لئے ہم شیخ کے حضور بھی خوبصورت اور پسندیدہ چیز لے کر آئے۔''

تمام مریدوں کا کم وبیش ایک ہی جواب تھا۔

''اور بہاء الدین! تم یہ خشک گھاس کس لئے اُٹھا لائے؟'' آخر میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنے خلیفۂ اکبر سے دریافت کیا۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے عرض کیا۔ ''سیدی! جنگل میں ہری گھاس کی تو کمی نہیں تھی مگر میں جہاں بھی گیا، اسے یاد الٰہی میں مصروف پایا۔ مجھے اچھا نہیں لگا کہ اسے یاد الٰہی سے محروم کردوں۔ چونکہ خشک گھاس ذکر الٰہی سے فارغ تھی، اس لئے اسے کاٹ کر پیر ومرشد کی خدمت عالیہ میں پیش کردیا۔''

اپنے خلیفۂ اکبر کا جواب سن کر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے تبسم فرمایا اور پھر دوسرے مریدوں سے مخاطب ہوئے۔ ''اب تم لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ بہاء الدین کو خلافت کبریٰ کیوں دی گئی ہے؟''

تمام مرید حیران وپریشان تھے۔ اُنہیں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے ذہن کی رسائی اور نکتہ آفرینی کا اندازہ تو ہوگیا تھا مگر وہ پیر ومرشد کے سوال کا جواب دینے سے قاصر تھے۔

آخر کچھ دیر بعد حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے معرفت کے اس راز کی عقدہ کشائی کرتے ہوئے فرمایا۔ ''مرید پر لازم ہے کہ وہ مرشد کے فیصلے سے اختلاف نہ کرے اور اپنے دل ودماغ کو اندیشوں کے غبار سے آلودہ نہ ہونے دے۔ دوستو! تم سب گیلی لکڑی کے مانند ہو جس پر آگ جلدی اثر نہیں کرتی۔ اسے جلانے کیلئے شدید محنت درکار ہوتی ہے...... مگر بہاء الدین ملتانی، سوکھی لکڑی کی طرح تھا کہ ایک ہی پھونک میں بھڑک اُٹھا اور عشق الٰہی کی آگ نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔''

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے وہ تمام مرید جو پیر ومرشد کے فیصلے پر معترض تھے اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کو خلافت کبریٰ کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، نادم وشرمسار نظر آنے لگے۔

''حق بہ حق دار رسید۔'' حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ نے اپنے مریدوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''دنیا میں کوئی کام توفیق الٰہی کے بغیر نہیں ہوتا اور مشیت الٰہی یہ ہے کہ بہاء الدین زکریا ملتانی میرا خلیفۂ اکبر ہے جو اس کی طرف اپنے دل صاف رکھے گا، اسے دونوں جہان کی سعادتیں اور نعمتیں حاصل ہوں گی...... اور جو اپنے دل ودماغ کو شک اور حسد کے غبار سے آلودہ کرے گا، وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ صرف اپنی دنیا اور آخرت سے ایک خطرناک کھیل کھیلے گا۔'' یہ مریدوں کیلئے تنبیہ بھی تھی اور ہدایت بھی۔

آخر انسانی نفس پر چھائی ہوئی کدورت ختم ہوگئی اور ان سب کو اعتراف کرنا پڑا کہ مرشد کی نظر، نظر

ہوتی ہے......اور اس نظر کی گہرائی تک عام مرید نہیں پہنچ سکتا۔

پھر ایک دن شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین عمر سہروردیؒ نے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کو خلوت میں طلب کیا۔ جب آپ وہاں پہنچے تو پیرومرشد کے ہاتھوں میں کٹا ہوا انار تھا۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے وہ انار آپ کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا۔

''بہاء الدین! اسے کھالو۔ یہ تمہارے ہی لئے ہے۔''

حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے بڑی عقیدت سے پیرومرشد کا بخشا ہوا تبرک لیا۔ اتفاق سے ایک انار کا دانہ زمین پر گر پڑا۔ حضرت شیخ زکریاؒ نے فوراً وہ دانہ اُٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اپنے مرید کے اس عمل کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ جب حضرت بہاء الدین زکریاؒ انار کے اس دانے کو کھا چکے تو پیرومرشد نے فرمایا۔ ''بہاء الدین! تم نے زمین پر پڑی ہوئی چیز کو کیوں کھالیا؟''

''حضرت شیخ کا عطیہ تھا، اسے کس طرح رائیگاں جانے دیتا۔'' حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے نہایت والہانہ انداز میں عرض کیا۔

''وہ انار کا دانہ دراصل دنیا تھی۔'' حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ نے اپنے خلیفۂ اکبر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میں نے چاہا کہ تم دنیا کے جھمیلوں میں نہ پڑو۔ اس لئے میں نے وہ دانہ قصداً زمین پر گرا دیا تھا مگر تم نے تبرک سمجھ کر اسے کھالیا۔''

پیرومرشد کا ارشاد گرامی سن کر حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے چہرۂ مبارک پر ذہنی کشمکش کے آثار نظر آنے لگے۔

مرید کی یہ کیفیت دیکھ کر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ مسکرائے۔ ''پریشان نہ ہو۔ انشاء اللہ! دنیا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اب دین بھی تمہارے قبضے میں ہے اور دنیا بھی۔''

''یہ سب پیرومرشد کی دعاؤں کا ثمر ہے ورنہ غلام اپنی حیثیت جانتا ہے۔'' حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے نہایت عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔

''ولایت ملتان تمہارے سپرد کی جاتی ہے۔'' پیرومرشد نے فرمایا۔ ''وہاں کے لوگوں کو تمہاری ضرورت ہے۔''

پیرومرشد کا حکم سن کر حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے چہرۂ مبارک پر عکس ملال اُبھر آیا مگر آپ نے حضرت شیخ کے سامنے اپنی دلی کیفیت کا اظہار نہیں کیا۔

''بہاء الدین! تمہارے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ملتان جانا نہیں چاہتے۔'' حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا۔

''سیّدی! ملتان میرے بزرگوں کا وطن ہے۔ میں خود وہیں پیدا ہوا۔ دنیا میں ایسا کون شخص ہے جسے اپنے وطن کی یاد نہ آتی ہو......مگر میں دیار مرشد کو چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں؟'' حضرت بہاء الدین زکریاؒ نے نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''میں پیرومرشد کی محبت پر مٹی کے تمام رشتے قربان کر

سکتا ہوں۔ میرے نزدیک پیرومرشد کے قدم مبارک سے اُٹھنے والا غبار خاک وطن سے بہتر ہے۔''

اپنے خلیفۂ اکبر کے جذبات کی شدت اور گہرائی دیکھ کر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ بھی بہت متاثر ہوئے۔ ''مگر فرزند! تم منزل عشق کے مسافر ہو اور عشق میں نزدیکی و دوری کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ تم یقیناً ملتان میں رہو گے مگر بغداد بھی تم سے زیادہ دور نہیں ہوگا۔''

آخر پیرومرشد کی دعاؤں کے سائے میں حضرت بہاء الدین زکریاؒ ملتان کی طرف روانہ ہوگئے۔ اکثر روایتوں میں یہی درج ہے کہ حضرت شیخ زکریاؒ اپنے پیرومرشد کی صحبت میں صرف سترہ دن رہے۔

''تذکرہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ'' کے مصنف نے تحریر کیا ہے کہ حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ نام کے ایک بزرگ شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے آستانے پر رہتے تھے۔ جب حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ بغداد تشریف لائے اور حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے تو حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ آپ کی طرف بطور خاص متوجہ ہوئے اور پھر چند ملاقاتوں میں یہ دونوں درویش گہرے دوست بن گئے۔

پھر جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ بغداد سے روانہ ہونے لگے تو حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ نے شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین عمر سہروردیؒ سے عرض کیا۔

''سیدی! اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی شیخ بہاء الدینؒ کے ہمراہ ملتان چلا جاؤں۔''

''آخر تم بہاء الدین کے ساتھ ہندوستان کیوں جانا چاہتے ہو؟'' حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے سید جلال الدین تبریزیؒ سے پوچھا۔

''میں اپنے دل میں شیخ بہاء الدین کیلئے بہت زیادہ محبت پاتا ہوں۔'' سید جلال الدین تبریزیؒ نے عرض کیا۔

''جلال الدین! تم جانا چاہتے ہو تو شوق سے چلے جاؤ مگر تمہاری منزل تو کہیں اور ہے۔'' حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ نے فرمایا۔

الغرض یہ دونوں بزرگ بغداد سے روانہ ہوئے۔ ان دنوں ملتان پہنچنے کیلئے بخارا کی گزرگاہ کو استعمال کرنا پڑتا تھا۔ آخر طویل مسافت طے کر کے جب یہ دونوں درویش نیشاپور پہنچے تو حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ایک خانقاہ میں ٹھہر گئے مگر حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ دوسرے مشائخ اور صوفیاء سے ملاقات کرنے کیلئے اندرون شہر تشریف لے گئے۔

پھر جب شام کو حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ خانقاہ میں واپس آئے تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے پوچھا۔ ''شیخ! آج تمہاری ملاقات کن کن بزرگوں سے ہوئی اور تم نے ان مشائخ میں سے کس کو بہتر پایا؟''

''میں نے نیشاپور کے تمام بزرگوں میں حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کو سب سے بہتر پایا۔'' حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ نے حضرت عطارؒ کا ذکر اس طرح کیا کہ آپ کے لہجے سے بے پناہ

عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''شیخ فریدالدین عطارؒ سے کیا کیا باتیں ہوئیں؟'' حضرت بہاءالدین زکریا ملتانیؒ نے اپنے بزرگ دوست سے دوسرا سوال کیا۔

''شیخ عطارؒ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا کہ آپ حضرات کہاں سے آ رہے ہیں۔'' حضرت سید جلال الدین تبریزی نے حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے شیخ کو بتایا کہ ہم لوگ بغداد سے آ رہے ہیں اور ہندوستان ہماری منزل ہے۔''

''بغداد میں کون سے بزرگ ایسے ہیں، جو سب سے زیادہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے ہیں؟'' حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ نے مجھ سے پوچھا۔

''پھر تم نے کس بزرگ کا نام لیا؟'' حضرت شیخ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ نے حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ سے پوچھا۔

''میں نے حضرت شیخ عطارؒ کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔'' حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ نے فرمایا۔ ''میں نے اس معاملے میں مکمل سکوت اختیار کیا۔''

اپنے بزرگ دوست کا جواب سن کر حضرت شیخ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ نے فرمایا۔ ''برادر عزیز! تم نے اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ الشیوخ کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ بغداد میں ایسا کون سا بزرگ ہے جو حضرت شیخ سے زیادہ ذکر الٰہی میں غرق رہتا ہو۔''

''سچ تو یہ ہے کہ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کی عظمت میرے دل پر اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ ذہن حضرت شیخ الشیوخ کی طرف منتقل ہی نہیں ہو سکا۔'' حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ نے فرمایا۔

حضرت شیخ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کو اپنے بزرگ دوست کا جواب بہت گراں گزرا۔ پھر آپ نے حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے ناخوشگوار لہجے میں فرمایا۔ ''جس شخص کا ذہن اپنے مرشد کے سلسلے میں سہو کا شکار ہو سکتا ہے، اس سے ہم کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر حضرت شیخ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ نے اپنا مصلّٰی کاندھے پر ڈالا اور اکیلے ہی ملتان کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہمارے نزدیک یہ روایت انتہائی کمزور ہے اور جس تذکرہ نویس نے بھی اسے تاریخ الصوف کے اوراق میں محفوظ کیا ہے، اس نے نہ تو تحقیق سے کام لیا اور نہ حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ کے روحانی مرتبے کو پیش نظر رکھا۔ ہمارے تصوف کی پوری تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے جن میں ایک سلسلے کے دوسرے سلسلے کے بزرگوں پر طعنہ زن نظر آتے ہیں...... اور اپنے سجادوں کی رونق بڑھانے کیلئے دوسرے بزرگوں کی خانقاہوں کے نقش و نگار کو اس قدر دھندلا دیتے ہیں کہ وہ پہچانے ہی نہیں جاتے۔ میری ناقص رائے میں حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ کا یہ واقعہ بھی افراط و تفریط اور مسابقت کی اسی کشاکش کا شکار ہوا ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ کا مختصر تعارف یہ ہے کہ آپ آغاز جوانی میں بڑے پُرشکوہ بادشاہ تھے۔ ظاہری طمطراق کا یہ عالم تھا کہ نہایت قیمتی لباس زیب تن فرماتے۔ آپ کے رعب و جلال کی یہ ہیبت تھی کہ لوگ آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ پھر ایک دن سینے میں عشق الٰہی کی آگ بھڑک اٹھی جس نے جاہ و جبروت، عیش و نشاط، غرض دنیا پرستی کے ہر جذبے کو جلا کر راکھ کر دیا۔ آپ نے اقتدار اپنے صاحب زادے کے سپرد کیا اور سیم و زر کا بہت بڑا ذخیرہ لے کر حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی خدمت میں بغداد حاضر ہو گئے۔

''یہ کیا ہے جلال الدین؟'' حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلیوں کو دیکھ کر فرمایا۔

''شیخ کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے یہ حقیر سی نذر لایا ہوں۔'' حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ بادشاہ ہوتے ہوئے بھی غلامانہ لہجے میں عرض کر رہے تھے۔

''مجھے شیخ بھی کہتے ہو اور دنیادار بھی سمجھتے ہو۔'' حضرت شہاب الدین عمر سہروردیؒ نے فرمایا۔

''میں تو شیخ کو شیخ ہی سمجھتا ہوں۔ دنیادار سمجھتا تو حاضر ہی کیوں ہوتا۔'' حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ نے دست بستہ عرض کیا۔

''تو پھر اس مال دنیا کو ضرورت مندوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دو۔'' حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا۔ ''جب تک میرے اور تمہارے درمیان یہ دنیا حائل ہے اس وقت تک ملاقات نہیں ہو سکتی۔''

''شوق ملاقات میں تو بادشاہت چھوڑی ہے۔'' حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں عرض کیا۔ ''میں اس دنیا کو اپنے اور آپ کے درمیان دیوار نہیں بننے دوں گا۔'' یہ کہہ کر اُٹھے اور سیم و زر کا تمام ذخیرہ کھڑے کھڑے محتاجوں اور مسکینوں میں لُٹا دیا۔

پھر حاضر خدمت ہوئے تو حرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''جلال الدین! اب تم سے ملاقات ہو سکتی ہے۔''

''سیدی! غلام حاضر ہے۔'' یہ کہہ کر بادشاہ تبریز نے مرد قلندر حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی بارگاہ میں سر جھکا دیا۔

''جلال الدین! تمہارے دماغ میں ابھی تک بوئے اقتدار موجود ہے۔'' حضرت شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا۔

''شیخ بہتر جانتے ہیں۔'' حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ نے عرض کیا۔ ''میں شہنشاہیت کی اسی بو سے نجات حاصل کرنے کیلئے تو حضور کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''

''جلال الدین! تم چار سال تک درویشوں کے استنجے کے ڈھیلے اور وضو کا پانی فراہم کرو گے۔ یہی تمہاری ریاضت ہے اور یہی تمہارا مجاہدہ!''

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے دوسرے مریدوں کا خیال تھا کہ پیر و مرشد جلال الدین

بخاریؒ کو کوئی ورد یا کوئی وظیفہ بتائیں گے مگر جب حضرت شیخ کی زبان مبارک سے آخری لفظ ادا ہوئے تو اہل مجلس حیران رہ گئے۔

حاضرین دریائے حیرت میں غرق تھے لیکن حضرت سیّد جلال الدین بخاریؒ کے چہرے پر گرد ملال تک نہیں تھا۔ آپ حضرت شیخ سے کہہ سکتے تھے کہ میں تاج وتخت چھوڑ کر معرفت کی تلاش میں نکلا ہوں، آپ نے مجھے کس کام پر لگا دیا؟ یہ کیسی ریاضت ہے اور کیسا مجاہدہ ہے؟ مگر سید جلال الدین بخاریؒ نے نہ زبان سے کوئی بات کہی اور نہ چہرے سے کوئی سوال۔ آپ مسلسل چار برس تک پورے ذوق وشوق کے ساتھ درویشوں کی خدمت انجام دیتے رہے۔ حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ آپ کی اس نفس کشی سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ عام مریدوں اور خدمت گاروں کا خیال تھا کہ تبریز کا یہ بادشاہ وقتی جذبے کے زیر اثر ہے۔ چند دنوں میں بغداد چھوڑ کر اپنے وطن واپس چلا جائے گا یا پھر درویشوں کی خدمت سے اُکتا کر پیر ومرشد کے حضور میں حرف شکایت زبان پر لے آئے گا۔ لوگوں کی یہ سوچ انسانی فطرت کے عین مطابق تھی مگر وہ جو تاج وتخت لُٹا کر بغداد آیا تھا، اس کی طلب کا اندازہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ یا کسی حد تک حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ جانتے تھے کہ معرفت کے راستے میں تبریز کے بادشاہ کی استقامت کیا ہے؟

حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ سفر میں حضرت شیخ کے ساتھ رہتے اور خوراک کا سامان، چولہا اور آگ ہمیشہ پاس رکھتے تا کہ جب بھی پیر ومرشد کھانا طلب کریں فوراً تیار کردیں۔ روایت ہے کہ حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ چولہا ہمیشہ سر پر اُٹھائے پھرتے تھے۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے سفر کے دوران جلال الدین تبریزیؒ حضرت شیخ کی سواری کے ساتھ سخت گرمی اور دھوپ میں پیدل چلتے تھے۔ مرشد کے احترام کے پیش نظر آپ کبھی اونٹ پر سوار نہیں ہوئے۔ آپ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خدمت میں سات سال تک رہے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس طویل عرصے میں حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ کے شوق کی لے کبھی کم نہیں ہوئی بلکہ لحظہ بہ لحظہ آتش عشق بھڑکتی ہی رہی۔ یہاں تک کہ پیر ومرشد طالب صادق سے راضی ہوگئے اور ایک دن حضرت شیخؒ نے فرمایا۔

''جلال الدین! تیرے دل ودماغ سے بوئے اقتدار اس طرح رخصت ہوگئی کہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔ تو نے اللہ سے اچھا سودا کیا۔ تبریز کی چند روزہ بادشاہت کے بدلے میں اللہ نے تجھے دین کا اقتدار بخش دیا اور یہ وہ اقتدار ہے جس کا رعب وجلال قیامت تک کم نہیں ہوگا۔''

ایک بار حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ حج سے تشریف لائے تو معتقدین نے قیمتی تحائف پیش کئے۔ اسی دوران ایک ضعیف عورت خانقاہ میں داخل ہوئی اور اس نے حضرت شیخ کی خدمت میں ایک درہم پیش کیا۔ پھر جب تحائف پیش کرنے والے چلے گئے تو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنے مریدوں کو مخاطب کرکے فرمایا۔

''جسے جو چیز پسند ہو، بصد شوق اُٹھالے۔''

تمام مریدوں نے حسب پسند قیمتی تحائف اُٹھانے شروع کردیئے۔ حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ بھی مرشد کا حکم سن کر آگے بڑھے اور بوڑھی خاتون کا پیش کردہ درہم اُٹھالیا۔ جب تمام مرید اپنی اپنی پسند کی چیزیں حاصل کرچکے اور کوئی تحفہ باقی نہیں رہا تو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''جلال الدین! تم نے جو چیز اُٹھائی ہے وہ زر وجواہر کے اس انبار میں سب سے زیادہ قیمتی اور تحائف کی روح تھی۔ نادان لوگ اشیاء کی ظاہری چمک دمک سے بہل گئے مگر تم دانا تھے اس لئے کامیاب ہوئے اور یہ دانائی تمہیں اللہ نے بخشی ہے۔ سیم وزر کے اس ڈھیر میں جو کچھ تھا، وہ بوڑھی خاتون کا پیش کردہ درہم تھا۔ اللہ انسان کی نیت کو دیکھتا ہے۔ اس ضعیف خاتون نے جس خلوص نیت کے ساتھ وہ تحفہ پیش کیا تھا، بس سب کچھ وہی تھا۔ باقی دنیاداری تھی۔''

ان تمام واقعات کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ اپنے پیر ومرشد کی خدمت کے سلسلے میں تمام خدمت گاروں پر فضیلت رکھتے تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کی روحانی عظمت کے سامنے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کو فراموش کردیتے؟ بالفرض اگر یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا تھا جیسا کہ کتابوں میں تحریر کیا گیا ہے، تب بھی حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اپنے عزیز دوست اور مرشد کے محبوب مرید کے ساتھ یہ سلوک روا نہیں رکھ سکتے تھے۔ یہ محض تحقیق کی کمی ہے یا جوش عقیدت جو ایک بزرگ کی روحانی عظمتوں کو ثابت کرنے کیلئے دوسرے بزرگ کی نفی کردیتا ہے۔

الغرض حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے ساتھ ملتان تشریف لائے۔ کچھ دنوں ملتان میں قیام فرمایا اور پھر دہلی چلے گئے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت مخدوم عبدالرشیدؒ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے چچا زاد بھائی تھے۔ محترم چچا حضرت شیخ احمد غوثؒ کے انتقال کے بعد وہی گھر اور جائداد وغیرہ کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی غیر حاضری میں ایک طویل عرصے تک ''کوٹ کروڑ'' میں رہے۔ حضرت شیخؒ کی ہمشیرہ بی بی کمال خاتونؒ سے شادی کی اور پھر کوٹ کروڑ سے ہجرت کر کے ملتان آئے اور قلعہ قدیم میں اس جگہ قیام فرمایا جہاں آج کل حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا مزار مبارک ہے۔ ہندوؤں کے دور اقتدار میں اس مقام پر ایسر دیو کا بیٹا نرسنگ دیو رہا کرتا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں حضرت مخدوم عبدالرشیدؒ کے علم وفضل اور فقر وولایت کی شہرت عام ہوگئی اور دور دور کے لوگ اس دریا کے معرفت سے سیراب ہونے لگے۔

ایک دن حضرت مخدوم عبدالرشیدؒ کی خانقاہ عالیہ میں علماء اور مشائخ کا اجتماع تھا۔ بحث ومناظرہ میں پورا دن گزر گیا۔ پھر جب تمام علماء اور مشائخ خانقاہ سے چلے گئے تو عصر کے قریب حضرت مخدوم عبدالرشیدؒ پر غنودگی طاری ہوگئی۔ آپ نے خواب میں اپنے والد محترم کو دیکھا۔ حضرت شیخ احمد غوثؒ

فرمارہے تھے۔

''فرزند! تمہارے بھائی شیخ بہاء الدین زکریاؒ دین کی سعادتوں سے مالا مال ہو کر ملتان آ رہے ہیں۔ اس لئے تمہیں لازم ہے کہ اپنی ہمشیرہ کو ان کے نکاح میں دیدو اور خود حرمین شریفین کی زیارت کیلئے روانہ ہو جاؤ۔''

حضرت مخدوم عبدالرشیدؒ خواب سے بیدار ہوئے برادر بزرگ کی آمد کی بشارت سن کر نہایت مسرور ہوئے اور بڑی بے چینی کے ساتھ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا انتظار کرنے لگے۔

حضرت شیخؒ اپنے بزرگ دوست حضرت سید جمال الدین تبریزی کے ہمراہ نہایت اطمینان سے سفر کر رہے تھے کہ اچانک حالات نے ایک نئی کروٹ لی جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ غزنی کے مضافات میں داخل ہوئے تو پتا چلا کہ ملتان کے حاکم ناصرالدین قباچہ اور غزنی کے خلجیوں کے درمیان جنگ چھڑ چکی ہے۔ اس لئے ملتان جانے والے تمام راستے بند ہیں۔ خلجیوں کے بہت سے قبائل جنوب مشرقی افغانستان میں آباد تھے۔ روزانہ سیکڑوں جانباز بھرتی کر کے محاذ جنگ پر بھیجے جا رہے تھے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اس صورتحال کی پروا کئے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن اس گاؤں میں داخل ہو گئے جہاں سے ناصرالدین قباچہ کی مملکت کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے کچھ دنوں تک اسی گاؤں میں قیام فرمایا۔ گرچہ مقامی باشندے آپ کی ذات گرامی سے نا آشنا تھے لیکن جب سورج چمکتا ہے تو بینا اور نابینا سبھی اس کی حرارت اور روشنی کو محسوس کرتے ہیں۔ نتیجتاً غزنی کے لوگ بھی آفتاب معرفت کی تابانی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہزاروں گم کردہ دل انسان آپ کے آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوتے اور اپنے خالی دامنوں میں دین کی دولت سمیٹ کر رخصت ہو جاتے، اللہ اپنے رازوں کو بہتر جانتا ہے۔ اگر خلجیوں اور ناصرالدین قباچہ کے درمیان ہنگامۂ کارزار برپا نہ ہوتا تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ براہ راست ملتان تشریف لے جاتے اور غزنی کے باشندے ہدایت سے محروم رہ جاتے۔ قیام غزنی کے دوران ہزاروں بدکاروں فاسقوں اور رہزنوں نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے دست حق پرست پر توبہ کی اور بھٹکے ہوئے مسافر صراط مستقیم کی طرف لوٹ آئے۔

کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ خلجیوں کو اس جنگ میں سخت ہزیمت اٹھانی پڑی ہے۔ انجام کار وہ فرمانروائے سلطان شمس الدین التمش سے مدد حاصل کرنے کیلئے دہلی کی طرف جا رہے ہیں۔ مقامی باشندوں نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو بتایا کہ سلطان شمس الدین التمش کی عسکری طاقت بہت زیادہ ہے دو سال پہلے غزنی کے حاکم تاج الدین یلدوز نے بھی التمش سے ٹکرانے کی کوشش کی تھی مگر اسے بھی ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اسی طرح ناصرالدین قباچہ سے بھی سلطان کے مراسم اچھے نہیں ہیں۔ نتیجتاً اس علاقے میں ایک خونریز جنگ ہوئی اور اس کے اثرات بد سرزمین ملتان پر بھی مرتب ہوں گے۔

چند ماہ بعد اطلاع ملی کہ فرمانروائے ہند سلطان شمس الدین التمش برق رفتاری کے ساتھ خلجیوں کی

ہوتا رہا ہے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ ملتان روانہ ہونے والے تھے۔ یہ خبر سن کر آپ نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ سیاسی انتشار کے سبب مقامی لوگ سخت ہراساں تھے جب انہیں کوئی جائے پناہ نظر نہ آتی تھی تو وہ حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعاؤں کی درخواست کرتے تھے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ پریشان حال لوگوں کی تالیف قلب فرماتے۔

''تائید حق پر یقین رکھو۔ انشاء اللہ یہ طوفان بلاخیز بہت جلد گزر جائے گا اور مخلوق خدا کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔''

حضرت شیخؒ کا ارشاد گرامی سن کر بے قرار دل ٹھہر جاتے اور چہروں پر گم شدہ مسکراہٹ لوٹ آتی۔

ایک دن خبر ملی کہ سلطان شمس الدین التمش اور ناصرالدین قباچہ کے درمیان سخت معرکہ آرائی ہوئی ہے اور قباچہ شکست کھا کر سندھ کی طرف فرار ہو گیا ہے۔ اس صورتحال پر لوگوں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اب ملتان کی خیر نہیں۔ سلطان شمس الدین التمش اور ناصرالدین کے درمیان دوسری جنگ اسی شہر میں ہوگی۔''

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے مقامی لوگوں کی باتیں سن کر فرمایا۔ ''سلطان التمش ایک دیندار حکمراں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ناحق بندگان خدا کا خون نہیں بہائے گا اور اہل ملتان انشاء اللہ جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہیں گے۔''

پھر بحکم خدا ایسا ہی ہوا۔ تیسرے دن محاذ جنگ سے آنے والوں نے بتایا کہ سلطان اپنے لشکر کے ساتھ دہلی کی طرف لوٹ گیا ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اپنی مسند پر کھڑے ہو گئے۔

''اب میں یہاں ایک لمحہ بھی قیام نہیں کروں گا۔ مجھے جلد از جلد ملتان پہنچنا ہے۔''

حضرت شیخؒ کو روانگی کیلئے آمادہ پا کر مقامی باشندے اداس اور فکرمند نظر آنے لگے۔

''شیخ محترم! آپ ہمیں کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔'' بیک زبان کئی افراد نے عرض کیا۔

''تم پہلے بھی اللہ کی پناہ میں تھے اور آئندہ بھی اس کی رحمتوں کے سائے میں رہو گے۔'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''یہ فقیر تو ایک دعا گو کی حیثیت سے تمہارا مہمان تھا اور مہمان کو ایک نہ ایک دن اپنے گھر جانا ہوتا ہے۔''

ہزاروں مقامی باشندوں نے سوگوار چہروں کے ساتھ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو رخصت کیا۔

ایک روایت کے مطابق حضرت شیخؒ 614ھ میں بغداد سے روانہ ہوئے تھے۔ پھر جب آپ ملتان تشریف لائے تو 615 کا ابتدائی زمانہ تھا۔

حضرت مخدوم عبدالرشید ''دیدل دروازے'' پر پہنچے اور نہایت گرم جوشی کے ساتھ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے بغلگیر ہو گئے۔ پھر دونوں بھائی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے اپنے آبائی مکان میں داخل ہوئے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی والدہ ماجدہ کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب آپ اپنے علمی اور روحانی سفر پر تھے اور دشوار گزار منزلیں طے کر رہے تھے۔ روایت ہے کہ جب بھی

مادر گرامی کی یاد آتی، حضرت شیخؒ بے حال ہو جاتے اور اس شفیق و مہربان ہستی کو جس کا دنیا میں کوئی نعم البدل نہیں، یاد کرکے بہت دیر تک روتے رہتے۔ پھر جب طبیعت کسی قدر پُرسکون ہوتی تو انتہائی رقت آمیز لہجے میں دعا فرماتے۔

''اللہ آپ کی قبر کو نور سے بھر دے اور آپ پر اپنی بے شمار نعمتوں کا نزول فرمائے کہ آپ ہی کی دعاؤں کے صدقے میں بہاء الدین اس مقام تک پہنچا ہے۔''

کچھ دن بعد حضرت مخدوم عبدالرشیدؒ نے اپنے والد محترم حضرت شیخ احمد غوثؒ کی وصیت کے مطابق اپنی بہن رشیدہ خاتون کی شادی حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ سے کردی اور اس کے ساتھ ہی خزانوں کی چابیاں اور جاگیر کے تمام حسابات بھی آپ کے سپرد کر دیئے۔ واضح رہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ امیر و کبیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ''خزانوں کی چابیاں'' اسی کثیر رقم کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد حضرت مخدوم عبدالرشیدؒ اپنے سات خدمت گاروں کے ہمراہ دیار حرم کی جانب روانہ ہو گئے...... اور ان کے اہل و عیال اور چھوٹے بھائی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ روایت ہے کہ شادی کے بعد حضرت شیخؒ نے ملتان کے قلعہ قدیم میں ایک محل نما مکان تعمیر کرایا۔ جسے دیکھ کر کسی حاکم یا نواب کی یاد آجاتی۔ سلسلہ سہروردیہ کے لوگ کہتے ہیں کہ حضرت شیخؒ کی یہ عالیشان حویلی درویشوں اور فقیروں کے ٹھہرنے کیلئے بنائی تھی جبکہ اپنے اور اہل خانہ کے لئے حجرے تعمیر کرائے تھے۔

اس کے برعکس دوسرے سلسلوں کے لوگ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے اس طرز معاشرت پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک درویش کو اس محل نما مکان اور رئیسانہ زندگی کی کیا ضرورت تھی؟ ہمارے نزدیک یہ اعتراض مہمل ہے اور انتہائی کم نظری کی دلیل ہے۔ دراصل برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کے ذہن میں ایک درویش کا تصور بس اتنا ہے کہ اسے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ہونا چاہئے۔ رہنے کیلئے ایک جھونپڑی اور کھانے کیلئے سوکھی روٹی کے چند ٹکڑے۔ بنی نوع آدم کی یہ بڑی عجیب روش ہے کہ وہ ایک درویش کے آستانے پر اس لئے حاضر ہوتا ہے کہ اس بزرگ سے اپنی آسودہ حال زندگی کی دعاؤں کیلئے درخواست کرے یعنی درویش کی دعاؤں سے وہ شخص امیر کبیر ہو جائے ...... مگر خود درویش بوسیدہ لباس پہنے اور فاقہ کشی کی زندگی بسر کرے۔ اب اگر اتفاق سے انہیں کوئی درویش خوشحال زندگی گزارتا ہوا نظر آتا ہے تو ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ جاتی ہیں اور ان کی کوتاہ نظری اور تنگ دلی یہ مطالبہ کرتی ہے کہ درویش کو ایسا نہیں ہونا چاہئے۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے ساتھ بھی یہی صورتحال پیش آئی تھی کہ برصغیر کے لوگوں نے پہلی بار ایک امیر و کبیر درویش کو دیکھا تھا حالانکہ یہاں اور بھی بہت سے بزرگ امیرانہ شان رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے قدموں میں بھی سیم و زر کے انبار لگے رہتے تھے مگر ان

بزرگوں نے کوئی محل تعمیر نہیں کیا۔ ظاہری آرائش پر کوئی توجہ نہیں دی اور اپنے جسم کی پرورش کیلئے لذیذ کھانوں کا سہارا نہیں لیا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ذات گرامی پر تو مخالفین کا بھی اتفاق ہے کہ برصغیر کے تمام بزرگوں میں سب سے زیادہ فتوحات آپ کو حاصل ہوئیں اور ہندوستان میں کوئی لنگر خانہ آپ کے لنگر خانے سے زیادہ وسیع نہیں تھا...... مگر خود حضرت محبوب الٰہی کی زندگی ضبط مسلسل کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ معمولی لباس، جو کی روٹی اور نمک کا پانی یہ تھے آپ کے ذاتی اخراجات۔ اس تمام گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ بھوک کی زیادتی بھی درویش کیلئے امتحان ہوتی ہے اور دولت کی فراوانی بھی۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ بھی وہی مرد درویش تھے جنہیں سیم و زر کا انبار دے کر آزمائش کے سخت ترین مرحلے سے گزارا گیا۔

اگر ہم انبیائے پاک علیہم السلام کی حیات طیبہ کا مطالعہ کریں تو حضرت یونس علیہ السلام کو مصر کی بادشاہت عطا کی گئی...... اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو تو پوری دنیا کا اقتدار بخشا گیا۔ جن و انس آپ کے مطیع و فرمانبردار...... ہوائیں مسخر...... پہاڑ، دریا اور سمندر تابع۔ آخر مادی دنیا کا وہ کون سا گوشہ تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زیر اثر نہیں تھا...... اس کے برعکس فخر موجودات، سیدالسادات، سرور کائنات، حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کا انداز کہ چالیس چالیس وقت آپ کے مکان سے روٹی پکانے کے لئے دھواں نہیں اُٹھتا تھا۔ یہ تو قسام ازل کا انداز تقسیم ہے کہ اس نے کس کو کیا دیا اور کیوں دیا؟

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے قدموں میں بھی لاکھوں اشرفیاں پڑی رہتی تھیں مگر سنگ ریزوں کی طرح۔ آپ کو دنیا کی تمام آسائشیں حاصل تھیں، مگر آپ دل کے بھی درویش تھے اور دماغ بھی فقیرانہ رکھتے تھے۔ روح کے نہاں خانوں پر حرص و طمع کا عکس تک نہیں تھا۔ دینے والے نے بے حساب دیا اور خرچ کرنے والے نے اسے اسی کے بندوں میں لٹا دیا۔ یہی حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی حیات مبارک کا انداز تھا۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

اسلامی تہذیب کا مرکز ہونے کے باعث ملتان میں بڑے بڑے مشائخ اور علماء کا اجتماع تھا۔ جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اپنے وطن تشریف لائے تو چند ہی روز میں آستانہ عالیہ پر عقیدت مندوں کا ہجوم نظر آنے لگا بعض روایتوں کے مطابق دنیادار علماء کی دکانیں آہستہ آہستہ ویران ہونے لگیں۔ آخر کئی نامور علماء اور مشائخ نے آپس میں اتفاق کرنے کے بعد ایک بہت بڑا پیالہ منگوایا اور اسے دودھ سے بھر دیا۔ پھر اپنے ایک خادم کو حکم دیا کہ اسے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں لے جاؤ۔

خادم دودھ سے لبریز پیالہ لے کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوا اور اسے حضرت شیخؒ کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے اجنبی شخص سے سوال کیا۔

"یہ دودھ کا پیالہ علمائے ملتان نے آپ کی خدمت میں ارسال کیا ہے۔" مشائخ کے خدمت گار نے جواب دیا۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے سامنے اس وقت گلاب کے پھول رکھے ہوئے تھے۔ آپ نے ایک پھول اُٹھا کر دودھ کے پیالے میں ڈال دیا اور علماء کے خادم سے فرمایا۔ "اسے واپس لے جاؤ! یہی ہمارا جواب ہے۔"

جب علمائے ملتان کا خدام واپس چلا گیا تو حاضرین میں سے کسی مقتدر شخص نے پوچھا۔ "شیخ! یہ کیا ماجرا تھا؟"

"علمائے ملتان نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا، میں نے اس کا جواب دیدیا۔" حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے فرمایا۔ "ان لوگوں کا سوال تھا کہ جس طرح یہ پیالہ دودھ سے لبریز ہے، اسی طرح ملتان بھی علماء سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں تمہارے رہنے کیلئے کوئی جگہ نہیں، میں نے جواباً ان لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ میں انشاء اللہ اسی علاقے میں رہوں گا اور جس طرح یہ پھول دودھ پر حاوی ہے، میں بھی اسی طرح ان پر غالب رہوں گے۔"

تصوف کی تاریخ میں اسی انداز کا ایک اور واقعہ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے حقیقی بھانجے اور مشہور جلالی بزرگ حضرت مخدوم علاء الدین احمد صابر کلیریؒ نے پانی پت کا علاقہ اپنے خلیفہ حضرت شمس الدین ترکؒ کے حوالے کیا تھا۔ جب حضرت ترکؒ پانی پت پہنچے تو اس وقت یہاں نامور صوفی حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ موجود تھے۔ حضرت شمس الدین ترکؒ نے اپنے خادم کے ذریعے دودھ سے لبریز پیالہ حضرت بوعلی شاہؒ کی خدمت میں بھیجا۔ قلندر خادم کو دیکھ کر مسکرائے۔ اس وقت آپ کے سامنے گلاب کے پھول رکھے ہوئے تھے۔ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے پھول کی چند پتیاں دودھ میں ڈال دیں اور فرمایا۔

"حضرت شیخ کی خدمت میں میرا اسلام عرض کرنا۔"

حضرت شمس الدین ترکؒ گلاب کی پتیاں دیکھ کر مسکرائے۔ حاضرین مجلس نے اس تبسم کی وجہ پوچھی تو حضرت شمس الدین ترکؒ نے فرمایا۔ "بوعلی شاہ قلندرؒ ایک بڑے بزرگ ہیں اور پانی پت میں مقیم ہیں۔ میں نے ان کے نام یہ پیغام ارسال کیا تھا کہ میرے پیر و مرشد نے یہ علاقہ میرے سپرد کر دیا ہے۔ جس طرح دودھ کا پیالہ لبریز ہے، اسی طرح پانی پت میرے آنے سے بھر گیا ہے۔ بوعلی شاہ قلندرؒ نے جواباً کہا ہے کہ وہ میرے علاقے سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے۔ وہ پانی پت میں قیام کریں گے مگر اس طرح جیسے دودھ میں گلاب کی پنکھڑیاں۔"

پھر جب حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ سے ان کے مریدوں نے اس واقعہ کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے بھی یہی جواب دیا۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ دونوں بزرگوں میں آخر دم تک انتہائی خلوص اور یگانگت کا رشتہ قائم رہا۔

ایک ہی قسم کے دو واقعات ہیں مگر دونوں کی توجیہات مختلف ہیں۔ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے

حضرت شمس الدین ترکؒ کو جواب دیا تھا کہ وہ ان ہی کے علاقے میں رہیں گے مگر پھول کی پتیوں کے مانند۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے دودھ کا پیالہ دیکھ کر فرمایا کہ وہ ملتان ہی میں رہیں گے اور سب پر غالب رہیں گے۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کا یہ سخت جواب اس لئے تھا کہ علمائے ملتان کے دلوں میں ایک مرد کامل کے خلاف کدورت بھری ہوئی تھی۔ اس کے برعکس حضرت شمس الدین ترکؒ حضرت بوعلی قلندرؒ کے مقام روحانی سے واقف تھے، اس لئے نہایت لطیف اور نرم و شیریں انداز میں پیغام بھیجا...... اور قلندر نے بھی اسی لطافت اور ادب و احترام کے ساتھ ایک مرد کامل کے سوال کا جواب ارسال کیا۔

☆☆......☆☆......☆☆

تاریخ میں ہمیں چند ایسے واقعات بھی نظر آتے ہیں جن کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ کچھ درویش بھی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی امیرانہ شان سے نہ صرف حسد رکھتے تھے بلکہ جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا برملا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی مجلس عرفان آراستہ تھی اور خانقاہ میں بہت سے درویش موجود تھے۔ حضرت شیخؒ کسی خاص موضوع پر تقریر فرما رہے تھے اور الفاظ و معانی کا ایک سمندر موجزن تھا۔ پھر جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اپنی تقریر ختم کر چکے تو ایک بزرگ شیخ حمید الدینؒ نے با آواز بلند سوال کیا۔

"حضرت! کیا وجہ ہے کہ جہاں خزانہ ہوتا ہے، وہاں سانپ بھی موجود رہتا ہے۔ جیسا کہ مشہور محاورہ ہے۔ "سانپ کے ساتھ خزانہ اور پھول کے ساتھ کانٹا" حالانکہ سانپ اور دولت میں نہ صوری نسبت ہے اور نہ معنوی کیا حضرت اس کی وضاحت فرمائیں گے؟"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ایک سادہ دل بزرگ تھے۔ آپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شیخ حمید الدینؒ ایک خاص مقصد کے تحت یہ سوال کر رہے ہیں چنانچہ آپ نے کسی ذہنی تحفظ کے بغیر سیدھے سادے انداز میں عالمانہ جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ "بے شک! سانپ اور دولت میں صوری (شکل و صورت) کے اعتبار سے کوئی نسبت نہیں ہے لیکن معنوی اعتبار سے دونوں میں گہری نسبت موجود ہے۔"

"میں اس نسبت کی وضاحت چاہتا ہوں۔" شیخ حمید الدینؒ نے عرض کیا۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اب بھی شیخ حمید الدینؒ کے سوال کی گہرائی کو نہیں سمجھے تھے۔ اس لئے کسی تامل کے بغیر فرمایا۔ "سانپ اور دولت میں معنوی نسبت یہ ہے کہ سانپ اپنے زہر کے باعث ہلاکت کا سبب ہے اور مال بھی اپنی فطری خرابیوں کے سبب انسانوں کو ہلاکتوں میں ڈالتا ہے۔"

"گویا حضرت نے یہ بات تسلیم کر لی کہ مال بھی سانپ کی سی خاصیت رکھتا ہے۔" اب کی بار شیخ حمید الدینؒ نے کسی قدر پُر جوش لہجے میں کہا۔ "اس طرح حضرت کے ارشاد کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جس شخص نے مال و دولت جمع کر رکھا ہے، وہ کسی زہریلے سانپ کی پرورش

کر رہا ہے۔''

شیخ حمید الدینؒ کے اس طنز کو حاضرین مجلس نے بھی محسوس کر لیا۔ لاکھ اشاروں اور کنایوں کا ہو مگر شیخ حمید الدینؒ کے طنز کا ہدف حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی ذات گرامی تھی۔ اب حضرت شیخؒ سمجھ گئے تھے کہ بھری مجلس میں شیخ حمید الدینؒ نے یہ سوال کیوں کیا ہے؟ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ شیخ حمید الدینؒ کے سوال کی شدت کو زائل کرنے کیلئے سخت لہجہ اختیار کرتے مگر آپ نے اپنی شان درویشی پر کوئی حرف نہیں آنے دیا اور انتہائی خوشگوار لہجے میں فرمایا۔

''برادر عزیز! بات دراصل یہ ہے کہ جس شخص کو سانپ کا افسوں (طلسم) آتا ہو اسے سانپ کے زہر سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟''

شیخ حمید الدینؒ نے ایک خاص منصوبے کے تحت یہ بحث چھیڑی تھی، اس لئے برجستہ طور پر کہا۔

''شیخ! آخر ایسے غلیظ اور زہریلے کیڑے کو پالنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ انسان اس کے زہر کو اُتارنے کیلئے جھاڑ پھونک کا محتاج رہے۔''

شیخ حمید الدینؒ کا یہ اعتراض منطقی تھا۔ وہ علم کلام کا سہارا لے کر گفتگو کر رہے تھے مگر انہیں درویشی کی عظمتوں کا اندازہ نہیں تھا۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے بظاہر کچھ دیر کیلئے سکوت اختیار کیا مگر درپردہ آپ اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی روح پرفتوح کی طرف متوجہ تھے۔

حاضرین مجلس حضرت شیخؒ کے جواب کے منتظر تھے اور شیخ حمید الدینؒ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے اپنے طرز استدلال اور زور بیان سے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو عاجز کر دیا ہے۔

مجلس کا یہ سکوت بہت عارضی تھا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے محسوس کیا کہ جیسے پیر و مرشد آپ سے مخاطب ہوں۔

''فرزند! شیخ حمید الدین سے کہہ دیجئے کہ ان کی درویشی اس قدر حسن و جمال نہیں رکھتی کہ اسے نظر بد کا اندیشہ ہو...... لیکن ہماری درویشی کو وہ جمال و کمال حاصل ہے کہ اگر اس کے چہرے پر سیاہی کا تل نہ لگائیں تو نظر لگ جانا لازمی ہے۔''

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے یہی الفاظ دہرا دیئے۔ آپ کا جواب سن کر حاضرین مجلس بہت محظوظ ہوئے مگر شیخ حمید الدینؒ یہی کہتے رہے۔

''شیخ! کوئی بھی دلیل پیش کریں مگر سچ تو یہ ہے کہ درویشی اور دولت میں کوئی نسبت نہیں۔ فقیر کیلئے اس زہریلے سانپ کو پرورش نہ کرنا ہی بہتر ہے۔''

بہرحال یہ شیخ حمید الدینؒ کا اپنا نقطۂ نظر تھا مگر اس ذیل میں سلسلۂ سہروردیہ سے تعلق رکھنے والے حضرات یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ فقر اور فاقے کی زندگی بسر کرنے والے درویش حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی امیرانہ شان کو بڑی حیرت سے دیکھتے تھے۔ پھر یہی حیرت بعض درویشوں کو اس مقام تک لے گئی کہ وہ حضرت شیخؒ کی آسودہ حال زندگی سے حسد کرنے لگے۔

☆☆..............☆☆..............☆☆

ایک طرف چند فاقہ مست درویشوں کے حسد کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف بڑے بڑے حاکم آپ کے چہرۂ مبارک کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے بے قرار رہتے تھے۔ بغداد سے واپسی کے بعد جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے روحانی کمالات کی شہرت عام ہوئی تو ملتان اور سندھ کے حاکم ناصر الدین قباچہ نے اپنے ایک خدمت گار کے ذریعے آپ کو پیغام بھیجا۔

''اگر شیخ کسی دن دربار سلطانی میں جلوہ افروز ہوں تو یہ میرے لئے بڑی سعادت کی بات ہوگی۔''

واضح رہے کہ اس وقت سلطان شمس الدین التمش پورے ہندوستان کا حکمران تھا مگر بوئے حکومت ناصر الدین قباچہ کے دماغ میں بھی موجود تھی۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو سلطان کہلوایا کرتا تھا۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے ناصر الدین قباچہ کا پیغام سنا اور نہایت نیازانہ فرمایا۔ ''فقیر اپنی مصروفیت کے باعث دربار سلطانی میں حاضر ہونے سے قاصر ہے۔''

ناصر الدین قباچہ نے حضرت شیخؒ کا جواب سنا۔ چند لمحوں کیلئے چہرے پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا مگر اس نے بہت جلد اپنے جذبات پر قابو پالیا۔ خوشامدی مصاحبوں نے حضرت شیخؒ کے انکار کو سرکشی اور نافرمانی کا رنگ دینے کی کوشش کی مگر ناصر الدین قباچہ مشتعل نہیں ہوا۔ ''درویشوں کی یہی شان ہوتی ہے اگر شیخ ہمارے دربار میں تشریف نہیں لائے تو ہم خود کسی دن شیخ کی خانقاہ میں حاضر ہو جائیں گے۔''

پھر چند روز بعد ہی ناصر الدین قباچہ اپنے مصاحبوں کے ہمراہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی خانقاہ میں حاضر ہو گیا۔ حضرت شیخؒ نے رسم میزبانی ادا کرتے ہوئے بڑے پُرجوش انداز میں حاکم ملتان کا استقبال کیا۔

روایت ہے کہ ناصر الدین قباچہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو اپنے دربار میں بلا کر درویشی کا امتحان کرنا چاہتا تھا مگر جب وہ اپنے منصوبے میں ناکام ہو گیا تو خود حضرت شیخؒ کی بارگاہ میں چلا آیا۔ یہاں بھی اس کی نیت یہی تھی کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو مختلف انداز سے آزمائے گا۔ نتیجتاً حاکم ملتان مختلف موضوعات پر حاضرت شیخ سے گفتگو کرتا رہا اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سوالوں کے جواب اس طرح دیتے رہے کہ ناصر الدین قباچہ پریشان نظر آنے لگا۔

اسی دوران ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے دیکھا کہ ایک مکھی بار بار ناصر الدین قباچہ کی ناک پر بیٹھ جاتی تھی۔ حاکم ملتان اس مکھی کو اُڑا دیا کرتا تھا مگر وہ ضدی مکھی ایک دو چکر کاٹ کر دوبارہ قباچہ کی ناک پر بیٹھ جاتی تھی۔ ناصر الدین مکھی کو اُڑاتے اُڑاتے جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ بہت دیر سے حاکم ملتان کی اس کیفیت کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ اسی دوران ناصر الدین قباچہ نے حضرت شیخؒ سے نیا سوال کیا۔

''شیخ! یہ بتایئے کہ ''شان اولیا چیست؟'' (اولیا کی پہچان کیا ہے؟)

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''ولی کی شناخت یہ ہے کہ اس کے جسم پر

کھی نہیں بیٹھتی۔"

ناصرالدین قباچہ نے ایک ولی کامل کا جواب سنا تو سخت شرمندہ ہوا اور پیچ و تاب کھاتا ہوا اپنے چلا گیا۔

اس سلسلے میں حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ فرماتے ہیں۔"میں نے ایک بزرگ سے سنا ہے کہ شیخ الاسلام حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے جسم مبارک اور لباس پر کسی شخص نے عمر بھر کبھی کو بیٹھتے نہیں دیکھا۔"

☆☆..................☆☆..................☆☆

اگرچہ ناصرالدین قباچہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی درویشی کا قائل ہو گیا تھا لیکن اس کا نفس ہمیشہ اسے ورغلاتا رہتا تھا۔ حاکم ملتان کی شدید خواہش تھی کہ دوسرے درویشوں کی طرح حضرت شیخ بھی اس کے دربار میں حاضر ہوں...... مگر جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اس کی خواہش کی تکمیل نہیں کی تو وہ آپ کی طرف سے بدگمان ہو گیا اور کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہنے لگا تا کہ حضرت شیخؒ کی گرفت کی جا سکے۔

ابھی ناصرالدین قباچہ اسی فکر میں تھا کہ ملتان میں ہولناک قحط پڑا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے لنگر خانے میں گندم کی بڑی مقدار موجود تھی قباچہ کو اپنے آدمیوں کے ذریعے خبر ملی تو اس نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے درخواست کی۔"حکومت کو کچھ اناج بطور قرض دیدیا جائے۔ آئندہ سال فصل بہتر ہوتے ہی یہ قرض لوٹا دیا جائے گا۔"

حضرت شیخؒ نے حکومت کے کارندوں سے فرمایا کہ فلاں ذخیرے کا تمام گندم اُٹھالیں اور ضرورت مندوں میں بانٹ دیں۔ ساتھ ہی آپ نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ اس اناج کو لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ مصیبت کی گھڑی میں یہ ایک مسلمان کی طرف سے دوسرے مسلمان بھائیوں کی خدمت کیلئے ایک حقیر سا تحفہ ہے۔

جب سرکاری کارندے گندم اُٹھا رہے تھے تو انہیں مٹی کے سات کوزے (گھڑے) نظر آئے جو چاندی کے سکوں سے بھرے ہوئے تھے۔ جب کارندوں نے ناصرالدین قباچہ کو اطلاع دی تو اس نے اپنے ملازموں سے کہا۔"یہ ساتوں کوزے حضرت شیخؒ کو واپس کر دیئے جائیں کیونکہ یہ ان ہی کے غلے سے برآمد ہوئے ہیں۔"

پھر جب قباچہ کے کارندے وہ کوزے لے کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا۔"ہمیں ان کوزوں کا پہلے سے علم تھا۔ گندم کے ساتھ یہ رقم بھی حاجت مندوں میں تقسیم کر دی جائے۔"

خوشامدی مصاحبوں نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی اس فیاضی اور نیک نیتی کا غلط مفہوم لیا اور ناصرالدین قباچہ کو ورغلاتے ہوئے کہا۔"حضور! یہ فقیر آپ کی رعایا ہوتے ہوئے بھی آپ کی برابری کر رہا ہے۔"

حضرت شیخؒ کی طرف سے قباچہ کے دل میں پڑی ہوئی گرہ کچھ اور سخت ہوتی چلی گئی۔

ابھی ناصرالدین قباچہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے روحانی اثرات کو کم کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا کہ اللہ کی پُرسکون زمین پر فتنہ تاتار نازل ہوا۔ بے شمار بندگان خدا تہہ تیغ ہوئے، سبزہ زار قبرستان بن گئے اور دریا انسانی خون سے لبریز ہو گئے۔ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ نے بڑی بے جگری کے ساتھ مغلوں کا مقابلہ کیا...... مگر وہ تنہا انسان کب تک اس طوفان بلاخیز کو روکتا۔ جب خوارزم شاہ کو ایران اور افغانستان سے فوجی کمک نہ ملی تو وہ اس اُمید پر ہندوستان کی طرف بڑھا کہ شاید یہاں سے کچھ مدد حاصل ہو جائے اور وہ تازہ دم لشکروں کے ساتھ چنگیز خان کا مقابلہ کر سکے۔

پھر جیسے ہی سلطان جلال الدین خوارزم شاہ نے ہندوستان کا رخ کیا، چنگیز خان بھی اس کے تعاقب میں آگے بڑھا۔ سندھ کے قریب پہنچ کر خوارزم شاہ نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ مغل بھی اس کے تعاقب میں دریا عبور کرنا چاہتے تھے مگر چنگیز خان نے اپنے سپاہیوں کو روک دیا۔

دریائے سندھ عبور کر کے سلطان جلال الدین خوارزم شاہ لاہور پہنچا اور اس نے سلطان شمس الدین التمش اور ناصرالدین قباچہ سے فوجی مدد مانگی۔ مگر یہ دونوں مسلمان حکمراں سیاسی مصلحت کے باعث چنگیز خان جیسے خوں آشام درندے سے لڑائی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ نتیجتاً سلطان شمس الدین نے خوارزم شاہ کو ایک خط تحریر کیا۔

"برادرم! میں تمہاری شجاعت کا تہہ دل سے معترف ہوں مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ تمہیں اس ملک کی آب و ہوا راس نہیں آئے گی۔"

سلطان شمس الدین التمش نے بڑے شائستہ لہجے میں اس طرف اشارہ کیا تھا کہ جلال الدین خوارزم شاہ یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے مگر خوارزم شاہ نے فرمانروائے ہند کے اس لطیف اشارے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور اپنی فوج کے ساتھ سلطان شمس الدین التمش کی حدود سلطنت میں خیمہ زن ہو گیا۔

خوارزم شاہ کا اس علاقے میں رہنا خطرناک تھا، یہ سوچ کر سلطان شمس الدین التمش نے دوسرا خط تحریر کیا جس میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ بلاتاخیر اس علاقے کو چھوڑ دیا جائے۔ خوارزم شاہ نے کچھ دن قیام کرنے کی اجازت مانگی۔ سلطان التمش نے انکار کر دیا، پھر جب خوارزم شاہ نے فرمانروائے ہند کے اصرار کے باوجود یہ علاقہ نہیں چھوڑا تو سلطان شمس الدین نے ایک کثیر فوج لے کر خوارزم شاہ کے لشکر پر حملہ کر دیا، نتیجتاً خوارزم شاہ سلطان التمش کی حدود سے فرار ہو کر سندھ اور سیوستان کی طرف چلا گیا۔

ناصرالدین قباچہ کے جاسوسوں نے خوارزم شاہ کی یلغار کی خبر دی تو وہ اپنے پورے لشکر کے ساتھ مقابلے پر آمادہ ہوا۔ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کے سپہ سالار ازبک پائی نے کھوکھروں کی مدد سے اوچ شریف کے مقام پر ناصرالدین قباچہ کی فوج پر ایک کاری ضرب لگائی۔ نتیجتاً قباچہ فرار ہو کر بھکر کی طرف چلا گیا۔ خوارزم شاہ ملتان کی طرف بڑھا۔ قباچہ کو معلوم ہوا تو وہ بھاگ کر ملتان پہنچا اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ ازبک پائی نے آگے بڑھ کر ملتان کا محاصرہ کر لیا۔ اگر جلال الدین خوارزم شاہ

چاہتا تو ناصر الدین قباچہ کی قسمت کا فیصلہ کر سکتا تھا۔ اس کا سپہ سالار ازبک پائی یہی چاہتا تھا کہ ملتان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر قباچہ کا خاتمہ کر دے اور اس کی شکست خوردہ فوج کو عام معافی دے کر اپنے لشکر کے ساتھ ملا لے اور پھر چنگیز خان کا مقابلہ کرے، ازبک پائی کے تیور خطرناک تھے مگر سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کی غیرت نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ وہ مسلمانوں کا خون بہائے اور فوجی طاقت حاصل کرنے کیلئے ہزاروں بے گناہوں کو خاک میں ملا دے۔ آخر کچھ دن بعد خوارزم شاہ محاصرہ اٹھا کر سیوستان کے راستے سے اپنے علاقے کی طرف واپس چلا گیا اور آخری سانس تک مغلوں سے برسرپیکار رہا۔ انتہائی تحقیق کے باوجود آج تک یہ راز فاش نہیں ہو سکا کہ اس مرد شجاع کا کیا انجام ہوا؟ پھر بھی عام خیال یہی ہے کہ اس غیرت مند مسلمان نے مغلوں سے معرکہ آرائی میں قوم و ملت پر اپنی جان قربان کر دی ہوگی۔

یہ بھی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا فیض روحانی تھا کہ آپ کی دعاؤں کے طفیل ملتان کی سرزمین کسی بڑے عذاب سے محفوظ رہی۔ طالع آزما بار بار اس علاقے کی طرف لپکے مگر عوام الناس کو جان و مال کا نقصان پہنچائے بغیر گزر گئے۔

☆☆......☆☆......☆☆

تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ چنگیز خان نے دریائے سندھ کو عبور نہیں کیا تھا مگر اس کا سپہ سالار طرطائی سندھ سے گزر کر بھیرہ تک آ پہنچا تھا اور پھر اس نے پورے شہر کی آبادی کو کشتیاں تیار کرنے پر لگا دیا تھا۔ چنانچہ جب تھوڑے عرصے میں بہت سی کشتیاں تیار ہو گئیں تو سپہ سالار طرطائی نے ان کشتیوں کو دریائے جہلم میں ڈال دیا۔ طرطائی کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ ملتان پر شدید سنگ باری کر کے ناصر الدین قباچہ کو شکست دے اور اس علاقے پر مکمل غلبہ حاصل کر لے۔ آخر یہ کشتیاں دریائے جہلم کے پار اتریں اور پتھروں کا یہ ذخیرہ قلعہ ملتان کے قریب پہنچا دیا گیا۔

ناصر الدین قباچہ قلعہ بند ہو گیا اور خود کو مغلوں کی یورش سے محفوظ سمجھنے لگا۔

منگول سپہ سالار طرطائی کے محاصرہ کرنے سے پہلے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ بغداد کی طرف روانہ ہوئے۔ فتنۂ تاتار کے سبب تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ اس لئے بہت دنوں سے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو اپنے پیرومرشد حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی کوئی خیریت نہیں ملی تھی۔ آپ نے کئی لوگوں کے ہاتھ پیرومرشد کے نام خطوط بھیجے مگر جواب موصول نہیں ہوا۔ آخر اسی پریشانی کے عالم میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ابھی آپ نے ایک ہی منزل طے کی ہوگی کہ راستے میں سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور سید جلال الدین تبریزیؒ سے ملاقات ہو گئی۔ یہ دونوں بزرگ بغداد سے ملتان کی طرف تشریف لا رہے تھے۔ حضرت قطبؒ اور حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ کو دیکھ کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے انتہائی مضطرب لہجے میں پوچھا۔

''میرے شیخ کیسے ہیں؟''

''شیخ الشیوخ بعافیت ہیں۔'' دونوں بزرگوں نے حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی صحت و سلامتی کی خبر دی۔

''مگر آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''بہت دنوں سے پیرومرشد کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی، اس لئے سوئے بغداد جا رہا تھا۔'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اپنی بے قراریوں کا اظہار کیا۔

''بہت پرآشوب زمانہ ہے اور ہر قدم پر آفات و مصائب انسان کے منتظر ہیں۔'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا۔ ''شیخ الشیوخ کا حکم ہے کہ آپ واپس چلے جائیں اور جب تک فضا سازگار نہ ہو جائے، اس وقت تک ملتان سے باہر قدم نہ نکالیں۔''

پیرومرشد کی صحت و سلامتی کی خبر سن کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا اور دونوں بزرگوں کو نہایت احترام کے ساتھ اپنی خانقاہ میں لے آئے۔ یہ سرزمین ملتان کی انتہائی خوش نصیبی کا زمانہ تھا کہ ایک ہی وقت میں تین بزرگ یہاں قیام فرما تھے۔

پھر جیسے ہی حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ شہر میں داخل ہوئے، مغل سپہ سالار طرطائی نے آگے بڑھ کر ملتان کا محاصرہ کر لیا۔ پھر اس نے منجنیقوں کے ذریعے قلعہ پر سنگ باری شروع کر دی۔ ایک روایت کے مطابق طرطائی کے ساتھ مغل شہزادہ بیلا بھی تھا اور یہ دونوں سپہ سالار اپنی فوج کو لڑا رہے تھے۔

سپاہیوں کی سنگ باری اتنی شدید تھی کہ قلعے کی فصیل میں جگہ جگہ گہرے شگاف پڑ گئے۔ اہل شہر پر سخت خوف و ہراس طاری تھا اور ناصر الدین قباچہ کو یقین ہو چلا تھا کہ قلعے کی پناہ گاہ چند دنوں کی مہمان ہے۔ عنقریب فصیلیں زمیں بوس ہو جائیں گی اور مغل وحشیوں کا لشکر سرزمین ملتان کو روند ڈالے گا۔

حضرت بابا فرید مسعود گنج شکرؒ فرماتے ہیں کہ جن دنوں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ ملتان میں یکجا تھے، وہ عجیب سعادتوں اور برکتوں کا زمانہ تھا۔ تینوں بزرگ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے تھے اور نوافل میں پورا قرآن ختم کرتے تھے۔ اسی پرانوار فضا میں زندگی بسر ہو رہی تھی کہ اچانک مغلوں نے ملتان پر حملہ کر دیا۔ جب سپاہیوں کی سنگ باری سے قلعہ کی دیواریں بوسیدہ ہو گئیں تو ایک رات حاکم ملتان ناصر الدین قباچہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ میں گھبرایا ہوا داخل ہوا اور وحشت زدہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔

''اے یاد خدا میں مشغول درویشو! کچھ مخلوق خدا کا بھی خیال کرو۔''

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے حاکم ملتان کی طرف دیکھا اور نہایت پرجلال لہجے میں فرمایا۔ ''تجھے کیسے خبر ہوئی کہ ہم مخلوق خدا کے دکھ درد سے بے خبر ہیں؟''

''اگر آپ حضرات خبرگیری فرماتے تو اہل شہر کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتے۔'' ناصر الدین قباچہ نے اس طرح کہا کہ جیسے یہ درویش ملتان کی حفاظت و نگرانی کے ذمہ دار ہیں۔

''کیسے دن؟'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے حاکم ملتان سے پوچھا۔

''مغلوں کی سنگ باری سے قلعے کی فصیلیں مسمار ہونے والی ہیں۔'' ناصرالدین قباچہ نے عرض کیا۔ ''اگر وہ وحشی شہر میں داخل ہو گئے تو پھر ایک متنفس بھی زندہ نہیں رہے گا۔''

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اسی پُر جلال لہجے میں قباچہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''ملتان کے حاکم تم ہو یا ہم گوشہ نشیں درویش؟''

''حاکم تو میں ہوں۔'' ناصرالدین قباچہ نے عرض کیا۔

''تو پھر اس شہر کی حفاظت کے ذمہ دار بھی تم ہو۔'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا۔ ''اپنے سپاہیوں کو لے کر کھلے میدان میں نکلو اور مخلوق خدا کو ان وحشیوں کے دست ستم سے بچاؤ۔''

''میں دشمنوں کے غول بیابانی کے آگے خود کو حقیر اور کمزور پاتا ہوں۔'' ناصرالدین قباچہ بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ ''اسی لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اب تائید غیبی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''اللہ تمہارا بھی ہے اور ہمارا بھی۔ تم اسے کیوں نہیں پکارتے؟'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ حاکم ملتان کو تنبیہہ کر رہے تھے اور اسے اس کی عیش پرستیوں کا زمانہ یاد دلا رہے تھے جس کے باعث مملکت اسلامیہ کو یہ دن دیکھنا پڑے تھے۔

ناصرالدین قباچہ کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ آخر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے حاکم ملتان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''مخلوق خدا ہی کا تو خیال ہے کہ یہ درویش ہر وقت اپنے مالک کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے رہتے ہیں۔''

ناصرالدین قباچہ نے پُر اُمید نظروں سے تینوں بزرگوں کی طرف دیکھا۔

''جاؤ! اور اپنے استعمال کا ایک تیر لے کر آؤ۔'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا۔

حاکم ملتان بہت تیزی سے اُٹھا اور ایک تیر لے کر دوبارہ ان بزرگان دین کی خدمت میں حاضر ہوا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے قباچہ کے ہاتھ سے وہ تیر لے لیا اور کچھ دیر تک اس پر اپنا ہاتھ پھیرتے رہے۔ پھر ناصرالدین قباچہ کو تیر دیتے ہوئے فرمایا۔ ''جب مغرب کی نماز کا وقت ہو جائے تو قلعے کے برج سے اس تیر کو مغل لشکر کی طرف پھینک دینا۔ حق تعالیٰ تیری مشکل کشائی فرمائیں گے۔''

ناصرالدین قباچہ نے بڑے ادب سے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں سلام پیش کیا اور تیر لے کر چلا گیا۔

پھر حضرت قطبؒ کی ہدایت کے مطابق ناصرالدین قباچہ نے مغرب کی نماز کے وقت تیر اپنی کمان پر چڑھایا اور پوری طاقت سے مغل لشکر کی طرف پھینک دیا۔ پھر اپنے محل میں واپس چلا آیا۔ اللہ ہی جانے کہ اس تیر میں کیا تاثیر تھی۔ مغلوں کے لشکر میں ہلچل سی مچ گئی۔ ہر سپاہی خوف و دہشت کے عالم میں بھاگا چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ رات ختم ہوتے ہی موت کی وہ کالی آندھی بھی کسی طرف چلی گئی۔

جب ناصرالدین قباچہ کے جاسوسوں نے اسے خبر دی کہ مغلوں کا لشکر واپس جا چکا ہے تو اسے اپنی سماعت اور مخبروں کی اطلاع پر یقین نہیں آیا۔ خود قلعے سے باہر آیا اور ملتان کے مضافاتی علاقوں کو خالی دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ مشہور روایت ہے کہ اس واقعے سے پہلے ناصرالدین قباچہ بزرگان دین کی روحانی عظمت کا قائل نہیں تھا مگر جب اس نے اپنی آنکھ سے حضرت قطبؒ کی کرامت دیکھی تو درویشوں کی بارگاہِ جلال میں خم ہو گیا۔

مغل لشکر کی واپسی کے بعد حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ غزنی کی طرف چلے گئے اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ دہلی کی جانب تشریف لے جانے لگے تو ناصرالدین قباچہ نے عاجزانہ لہجے میں درخواست کی۔

''اگر حضرت شیخ کچھ دنوں ملتان میں قیام فرمائیں تو یہ میرے لئے بڑی سعادت ہوگی۔''

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے قباچہ کی درخواست قبول نہیں فرمائی اور والیٔ ملتان سے صاف صاف کہہ دیا۔ ''یہ مقام حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے سپرد کیا گیا ہے اور ہمیشہ ان ہی کی دعاؤں کے سائے میں رہے گا۔''

☆☆..............☆☆..............☆☆

مغلوں کی واپسی کے بعد جیسے ہی علاقے میں امن قائم ہوا، ناصرالدین قباچہ کی شخصیت پر خود پرستی کا وہی رنگ غالب آ گیا۔ آفات و مصائب کے زمانے میں اسے درویش یاد آتے تھے...... اور جب سیاسی فضا پُر سکون ہو جاتی تو وہ ایک مغرور حکمراں بن جاتا۔ پھر اس کی ایک ہی خواہش ہوتی کہ رعایا کا ہر شخص اقتدار کے آگے سجدہ ریز ہو جائے۔ ناصرالدین قباچہ کو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا انداز بے نیازی سخت گراں گزرتا تھا۔ پھر خوشامدی مصاحب اور ریاکار امراء بھی اسے حضرت شیخؒ کے خلاف ورغلاتے رہتے تھے۔

''حضرت شیخ نے آپ کی مملکت میں ایک دوسری مملکت قائم کر لی ہے اور عقیدت مندوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ان کے حلقۂ اثر کی توسیع کا یہی عالم رہا تو ایک دن اقتدار شاہی قلعۂ معلیٰ سے شیخ کی خانقاہ میں منتقل ہو جائے گا۔''

''پھر کیا کیا جائے؟'' ناصرالدین قباچہ شدید بے چارگی کے عالم میں کہتا۔ ''حضرت شیخ احتیاج و ضرورت سے بے نیاز ہیں، اگر وہ بھوک اور افلاس کا شکار ہوئے تو ان کے دست طلب کے دراز ہونے کی توقع کی جا سکتی تھی۔''

''ان کے روحانی اثرات کو کم کر دیا جائے۔'' ایک دنیادار صاحب نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر عقیدت مندوں کا یہ ہجوم اپنے گھروں کو لوٹ جائے گا۔ اور شیخ اپنے چند خدمت گاروں کے ساتھ خانقاہ کے ایک گوشے تک محدود ہو جائیں گے۔''

''شیخ کے روحانی اثرات کو کس طرح کم کیا جا سکتا ہے؟'' بات ناصرالدین کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

''ایک قد آور مذہبی شخصیت کو شیخ کے مقابل کھڑا کر دیا جائے، پھر شیخ کا قد خود بخود کم ہو جائے

گا۔" ناصر الدین قباچہ کے مصاحب نے اپنی تجویز کی وضاحت کی۔

حاکم ملتان نے ستائشی نظروں سے اس غلام کی طرف دیکھا جو انسانی نفس کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر اپنے آقا کو تباہی و بربادی کے راستے پر لے جا رہا تھا۔

پھر بہت غور و فکر کے بعد ناصر الدین قباچہ نے کاشان کے مشہور عالم حضرت علامہ قطب الدینؒ کو ملتان آنے کی دعوت دی۔ علامہ قطب الدینؒ ایک معتبر عالم تھے اور تقریر و تحریر میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ روایت ہے کہ جب علامہ قطب الدینؒ ملتان میں داخل ہوئے تو ناصر الدین قباچہ نے اپنے امراء اور سپاہیوں کے ساتھ ان کا شاندار استقبال کیا۔ اہل شہر نے بھی پوری دلچسپی اور انہماک کے ساتھ یہ منظر دیکھا...... مگر رازداران خاص جانتے تھے کہ ناصر الدین قباچہ نے ایک علامہ کا نہیں، اپنے نفس کا استقبال کیا ہے۔

علامہ قطب الدین نے کچھ دنوں تک قلعہ میں قیام کیا۔ پھر مختصر سے عرصے میں ناصر الدین قباچہ نے جامع مسجد ملتان سے ملحق ایک بہت بڑا مدرسہ تعمیر کرایا اور علامہ قطب الدین "شیخ الدرس" مقرر کئے گئے۔ اس کے بعد سرکاری طور پر ایک حکم جاری کیا گیا جس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"ہر امیر کا یہ فرض ہے کہ علامہ قطب الدین کا زیادہ سے زیادہ احترام کرے اور فارغ اوقات میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیضِ روحانی حاصل کرے۔"

فرمان شاہی کے مطابق تمام امراء اور دوسرے سرکاری ملازمین دست بستہ علامہ قطب الدین کاشانیؒ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ خود ناصر الدین قباچہ بھی ہفتے میں ایک یا دو بار پورے جاہ و حشم کے ساتھ علامہ قطب الدینؒ کے مدرسے میں حاضر ہوتا اور اہل شہر بڑی حیرت سے عقیدت کے یہ مناظر دیکھتے۔ نتیجتاً ان کے دلوں میں حاکم ملتان کی عزت بھی بڑھ گئی اور وہ علامہ قطب الدین کاشانیؒ کی عظمتوں کے بھی قائل ہونے لگے۔ ناصر الدین قباچہ یہی تو چاہتا تھا۔ اپنے منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار ہوتے دیکھ کر حاکم ملتان کے مصاحب کہنے لگے۔

"حضور کا اقبال بلند ہو! شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی شخصیت کا طلسم ٹوٹنے ہی والا ہے۔"

کم نظروں اور بے خبروں کے گروہ نے حضرت شیخؒ کے روحانی اثرات کو "طلسم" سے تعبیر کیا اور اس کے ٹوٹنے کی آس میں زندگی بھر عجیب عجیب خواب دیکھتے رہے۔

دوسری جانب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے خادمان خاص نے بھی اس طرف اشارہ کیا۔ آپ نے فرمایا۔ "کہاں تک دوسروں کے اعمال پر نظر رکھو گے۔ وقت بہت تیزی سے گزر جائے گا اور تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرو کہ اسی میں انسان کی نجات کا راز پوشیدہ ہے۔ اغیار جو کچھ کرتے ہیں انہیں کرنے دو۔ احباب پر لازم ہے کہ وہ اپنا عمل جاری رکھیں۔"

منصوبہ سازوں کا خیال تھا کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ علامہ قطب الدین کاشانیؒ کی ملتان آمد اور سرکاری پذیرائی کے اس انداز پر اپنے منفی ردعمل کا اظہار کریں گے مگر یہ تنگ نظروں کے منصوبے...

...تھے اور انتہائی سطحی سوچ تھی۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ علامہ قطب الدین کاشانیؒ کی ...کے قائل تھے اور ان کی اس فضیلت پر گواہی دینے کیلئے خود بھی جامع مسجد تشریف لے جاتے ... حضرت شیخؒ کے رہائشی علاقے میں ایک بڑی مسجد موجود تھی لیکن آپ پابندی کے ساتھ ... علامہ قطب الدین کاشانیؒ کی امامت میں ادا کیا کرتے تھے۔

... نماز فجر کے بعد علامہ قطب الدین کاشانیؒ نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے کہا۔ ... آپ یہ زحمت کیوں اُٹھاتے ہیں؟"

"کیسی زحمت؟" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے حیرت کے ساتھ فرمایا۔

"آپ کی اپنی مسجد موجود ہے۔ پھر آپ یہ طویل فاصلہ طے کر کے جامع مسجد تک آنے کی تکلیف ... اُٹھاتے ہیں؟" علامہ قطب الدین کاشانیؒ نے اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے جواباً فرمایا۔ "میں اس حدیث پاک پر عمل کرتا ہوں۔ جس نے ... باعمل عالم کے پیچھے نماز پڑھ لی، گویا اس نے نبیٔ مرسل کے پیچھے نماز ادا کی۔"

... ایک درویش کی طرف سے ایک عالم کو بہترین خراج تحسین تھا۔ علامہ قطب الدین کاشانیؒ نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا جواب سنا اور خاموش ہو گئے۔

ایک دن حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کسی قدر تاخیر سے مسجد میں حاضر ہوئے۔ اس وقت تک علامہ قطب الدین کاشانیؒ ایک رکعت پڑھا چکے تھے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ دوسری رکعت میں شریک ہوئے۔ پھر جیسے ہی علامہ قطب الدین کاشانیؒ نے پہلا سلام ادا کیا، حضرت شیخ اپنی نماز پوری کرنے کیلئے کھڑے ہو گئے۔ مسلمانوں کا عام طریقہ یہی ہے کہ اگر کسی وجہ سے نمازی کی ایک رکعت چھوٹ جائے تو امام کے پہلے سلام ادا کرتے ہی وہ شخص قیام میں چلا جاتا ہے اور اپنی بقیہ نماز ادا کرتا ہے۔ چونکہ مخالفانہ فضا موجود تھی، اس لئے جیسے ہی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ پہلے سلام کے بعد کھڑے ہوئے، علامہ قطب الدین کاشانیؒ کے ایک خدمت گار نے سرگوشی میں کچھ کہا۔

علامہ قطب الدین کاشانیؒ، حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی نماز ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جیسے ہی حضرت شیخؒ نماز سے فارغ ہوئے، علامہ قطب الدین کاشانیؒ نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"شیخ! آپ نے میرے دوسرے سلام کا انتظار کیوں نہیں کیا؟ اگر مجھ سے سہو ہو جاتا تو پھر آپ کیا کرتے؟"

علامہ قطب الدین کاشانیؒ کا مطلب یہ تھا کہ اگر ان سے نماز میں سہو ہو جاتا تو پھر امام کو ایک سجدہ اور ادا کرنی پڑتی۔ نتیجتاً وہ نمازی جو پہلے سلام کے بعد ہی اُٹھ کھڑا ہوا تھا اس کی اور امام کی نماز میں فرق آ جاتا۔ علامہ قطب الدین کاشانیؒ نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ علامہ قطب الدین کاشانیؒ درویشوں اور صوفیوں کے قائل نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علامہؒ نے حضرت شیخؒ کو بھری مسجد میں تمام نمازیوں کے سامنے ٹوک دیا تھا...... مگر علامہ

قطب الدین کاشانیؒ اس راز سے واقف نہیں تھے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کس شان کے بزرگ ہیں اور علم ظاہری پر کس قدر دسترس رکھتے ہیں؟ اس بے خبری کے باوجود علامہ قطب الدین کاشانیؒ کو یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ وہ اس شخص کی نماز کو تمام لوگوں کے سامنے اعتراض کا ہدف بنائیں جو ملتان کی سب سے محترم شخصیت تھا اور جس کے حلقۂ عقیدت میں لاکھوں انسان شامل تھے۔ اگر مذہبی معاملات میں کوئی عام انسان بھی کسی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے، تب بھی یہی حکم ہے کہ رازداری کے ساتھ اس کی اصلاح کی جائے تا کہ وہ بھرے مجمع میں نادم و شرمسار ہونے سے بچ جائے۔ اس کے برعکس حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ تو ایک معزز ترین شخصیت تھے۔ بالفرض اگر وہ کسی کوتاہی کے مرتکب ہوئے تھے تو علامہ قطب الدین کاشانیؒ پر لازم تھا کہ وہ اس معاملے کو انتہائی خلوت اور رازداری کی فضا میں زیر بحث لاتے۔ پھر وہ شخص جو علامہ کو عالم باعمل سمجھتا تھا، اس کے ساتھ یہ سلوک کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا...... مگر شاید علامہ قطب الدین کاشانیؒ بھی مجبور تھے کہ انہیں تو ملتان بلا ہی اسی لئے گیا تھا کہ وہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے اعمال کی سرعام گرفت کریں تا کہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنے والا درویش عوام کی نظروں میں بے اثر ہو کر رہ جائے۔ الغرض یہ کہ علامہ قطب الدین کاشانیؒ نے ناصرالدین قباچہ کے منصوبے کے مطابق حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی گرفت کی اور جامع مسجد ملتان میں نماز ادا کرنے والے سیکڑوں انسانوں کو یہ تاثر دینا چاہا کہ حضرت شیخؒ ولایت کے کسی بھی منصب پر فائز ہوں لیکن وہ عالم دین سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ علامہ قطب الدین کاشانیؒ کا اعتراض سنا اور پھر نہایت نرم لہجے میں فرمایا۔ ''اگر کسی شخص کو نور باطن سے معلوم ہو جائے کہ امام کو سہو نہیں ہوا ہے تو وہ پہلے سلام پر ہی کھڑا ہو سکتا ہے؟''

''نور باطن کیا ہوتا ہے؟'' علامہ قطب الدین کاشانیؒ کے لہجے سے ہلکی سی ناخوشگواری کا اظہار ہونے لگا۔ ''ہر وہ نور جو احکام شریعت کے موافق نہیں ہے، ظلمت ہے۔''

علامہ قطب لدین کاشانیؒ نے نہایت سخت الفاظ میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی روحانیت کی نفی کر دی تھی۔ علامہ کاشانیؒ نور باطن (کشف کی صلاحیت) سے ناآشنا تھے، اس لئے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے نور باطن کو ظلمت سے تعبیر کرنے لگے۔ اہل ظاہر کی نظر میں علامہ قطب الدین کاشانیؒ کا جواب درست ہو سکتا ہے مگر ''نور باطن'' کی اپنی ایک منفرد حیثیت ہے اور یہ دولت ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوتی۔ بڑی عجیب بات ہے کہ جس شخص نے علامہؒ کے پیچھے نماز پڑھنے کو بہت بڑی سعادت سمجھا، علامہ نے شریعت کی آڑ لے کر اسی شخص کی تحقیر کی۔ روایت ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو علامہ قطب الدین کاشانیؒ کا یہ جواب نہایت گراں گزرا۔ آپ مزید کسی علمی بحث میں اُلجھے بغیر کھڑے ہو گئے اور خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔ ''بوستان غوثیہ'' کے مصنف کا بیان ہے کہ اس واقعے کے بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ پھر کبھی اس مسجد میں نہیں آئے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

مشہور سیاح اور صوفی حامد بن فضل اللہ جمالیؒ تحریر کرتے ہیں کہ ایک دن قطب الدین کاشانیؒ کے ایک بے تکلف اور قریبی دوست نے ان سے پوچھا۔ ''علامہ! آخر ان درویشوں سے بے اعتقادی کی کیا وجہ ہے؟''

قطب الدین کاشانیؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر ناخوشگوار لہجے میں کہنے لگے۔ ''میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک درویش دیکھا ہے۔ اس کے بعد اس جیسا کوئی نظر ہی نہیں آیا۔ یہ موجودہ درویش تو مجھے دکاندار دکھائی دیتے ہیں۔ بڑے بڑے سجادوں پر بڑی شان سے بیٹھتے ہیں مگر حقیقتاً ان میں کوئی رنگ، کوئی کیفیت نہیں ہے۔''

''آخر وہ درویش کون تھا جس کی یاد اب تک آپ کے دل سے محو نہیں ہوئی ہے اور جس کی روحانیت سے متاثر ہو کر آپ نے تمام درویشوں کی نفی کر دی ہے۔'' علامہ کے دوست نے پوچھا۔

قطب الدین کاشانیؒ نے اپنی زندگی کا اہم ترین واقعہ سناتے ہوئے کہا۔

''ایک بار میں شہر کاشغر میں مقیم تھا۔ میرے پاس ایک نہایت نفیس اور نایاب چاقو تھا۔ اتفاق سے وہ چاقو زمین پر گرا اور اس کا دستہ ٹوٹ گیا۔ مجھے اس کا بہت افسوس ہوا۔ کچھ لوگوں کے کہنے پر میں کاشغر کے بازار میں گیا جہاں ماہر کاریگر موجود تھے۔ میں نے ان کاریگروں سے کہا کہ میرے چاقو کی مرمت اس طرح کرو کہ وہ پہلے جیسا ہو جائے۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' تمام کاریگروں نے مجھے ایک ہی جواب دیا۔ ''ٹوٹی ہوئی چیز کو جوڑنا آسان ہے مگر اس نقص کو مکمل طور پر دور نہیں کیا جا سکتا۔''

الغرض میں اسی تگ و دو میں کوچہ در کوچہ پھرتا رہا مگر کوئی کاریگر میرے چاقو کو میری مرضی کے مطابق درست کرنے پر آمادہ نہ ہو سکا۔ آخر میں ایک روز ایک اور کاریگر کی دکان پر پہنچا اور تمام واقعہ سنانے کے بعد اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

کچھ دیر تک وہ شخص ٹوٹے ہوئے دستے کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر مجھے چاقو واپس کرتے ہوئے بولا۔ ''دنیا کا کوئی کاریگر تمہارے چاقو کو تمہاری خواہش کے مطابق ٹھیک نہیں کر سکتا۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' میں نے اپنی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! ابھی ایک کاریگر باقی ہے۔'' اس شخص نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''کیا وہ ہنرمند اسی شہر میں موجود ہے؟'' ذرا سی اُمید بندھی تو میں نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔

''تمہاری خوش قسمتی ہے کہ وہ اسی شہر میں رہتا ہے۔'' اس شخص نے کہا۔ ''فلاں مکان پر چلے جاؤ، وہاں تمہیں ایک بوڑھا شخص نظر آئے گا۔ وہ بڑا صاحب کمال ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اس چاقو کو درست کر دے اور تمہاری یہ عجیب سی خواہش پوری ہو جائے۔'' یہ کہہ کر اس شخص نے مجھے بوڑھے کاریگر کی دکان کا پتا سمجھایا۔

پھر جب میں اس دکان پر پہنچا تو واقعتاً وہاں ایک پیر مرد موجود تھا۔ جس کے چہرے سے بزرگی ٹپک رہی تھی اور پیشانی سے نور جھلک رہا تھا۔

میں نے ان بزرگ کی خدمت میں سلام عرض کیا اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔

بزرگ نے نظر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور فرمایا۔ ''کہاں ہے تمہارا چاقو؟''

میں نے چاقو ان کی طرف بڑھا دیا، وہ بزرگ کاریگر چند لمحوں تک چاقو کو دیکھتے رہے۔ پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ''تم تھوڑی دیر کیلئے اپنی آنکھیں بند کر لو۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ شاید ٹوٹی ہوئی چیز دوبارہ جڑ جائے۔''

میں نے بوڑھے کاریگر کو دکھانے کیلئے ظاہری طور پر اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر گوشۂ چشم سے دیکھتا رہا کہ آخر وہ کس طرح چاقو کو ٹھیک کرتے ہیں؟ میں نے دیکھا کہ وہ بزرگ چاقو کو اپنے ہونٹوں تک لے گئے۔ زیرِ لب کچھ پڑھتے رہے پھر دم کر کے وہ چاقو مجھے واپس کر دیا۔

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے دیکھا کہ ان بزرگ نے کسی اوزار کے بغیر میرا چاقو نہ صرف درست کر دیا بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوش نما نظر آ رہا تھا۔ میری عجیب حالت تھی۔ مجھ پر بے اختیاری کی کیفیت طاری ہو گئی اور میں ان بزرگ کے سامنے جھک گیا۔ پھر جب میری حیرت ختم ہوئی تو میں نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور ایک روپیہ سامنے رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' بزرگ نے روپے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''میں اسے کام کی اُجرت تو نہیں کہہ سکتا۔ بس مجھ غریب کی طرف سے حقیری نذر سمجھ لیجئے۔'' میں نے بڑے عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔

''اسے اُٹھا لو اور خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلے جاؤ۔'' بزرگ نے بیزاری کے ساتھ فرمایا۔

میں بہت دیر تک منت و ساجت کرتا رہا کہ وہ میری پیش کردہ نذر کو قبول فرما لیں مگر بزرگ مسلسل انکار کرتے رہے۔ ''تمہارا چاقو درست ہو گیا اب مجھے کیوں پریشان کرتے ہو؟''

''بالآخر میں نے روپیہ اُٹھا لیا اور اپنی قیام گاہ پر واپس چلا آیا۔'' علامہ قطب الدین کاشانیؒ نے اپنی زندگی کا یہ عجیب ترین واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ ''ان بزرگ کے بعد مجھے ایسا کوئی درویش نہیں ملا۔''

جب قطب الدین کاشانیؒ پورا واقعہ سنا چکے تو ان کے دوست نے پوچھا۔ ''علامہ! کیا تم ان بزرگ کے نام سے واقف ہو؟''

''نہیں؟'' قطب الدین کاشانیؒ نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بزرگ عام لوگوں سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے میں ان کی خدمت میں دوبارہ حاضر نہیں ہو سکا۔''

''میں جانتا ہوں ان بزرگ کو!'' دوست نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے بتاؤ کہ وہ درویش کون تھے؟'' علامہ قطب الدین کاشانیؒ نے بے قرار ہو کر کہا۔

''وہ بزرگ نجم الدین یوسفؒ ہیں۔'' علامہ کاشانیؒ کے دوست نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اور نجم الدین یوسفؒ، حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے ادنیٰ مریدوں میں شامل ہیں۔''

یہ سن کر علامہ قطب الدین کاشانیؒ کو سکتہ سا ہو گیا۔ بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ دوست نے دیکھا کہ علامہ کے چہرے پر شدید اذیت و کرب کے آثار نمایاں تھے۔ پھر جب قطب الدین

کاشانیؒ کی اس کیفیت میں کچھ کمی نمایاں ہوئی تو دوست نے اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''علامہ! آپ جانتے ہیں کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفۂ اکبر ہیں؟''

قطب الدین کاشانیؒ نے اپنے دوست کی طرف اس طرح دیکھا کہ ان کے چہرے پر شرم و ندامت کی گہری جھلک موجود تھی۔

''علامہ! آپ کو معلوم ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو خلافت کبریٰ کس طرح حاصل ہوئی تھی؟'' یہ کہہ کر قطب الدین کاشانیؒ کے دوست نے اس روح پرور اور جانفزا واقعے کی تفصیلات سنائیں۔

''حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ، حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی خانقاہ میں مقیم تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ آپ کو خرقۂ خلافت کب حاصل ہوتا ہے؟ ایک رات عبادت کرتے کرتے حضرت شیخؒ کی آنکھ لگ گئی۔ آپ نے خواب میں ایک مکان دیکھا جس کے بام و در اس طرح روشن تھے کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ حضرت رسالت مآب ﷺ اس مکان میں تشریف فرما تھے اور شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ سرورِ کونین ﷺ کی خدمت میں دربانوں کی طرح حاضر تھے۔ اسی مکان کی ایک طرف ایک ڈوری بندھی ہوئی تھی اور اس میں چند خرقے لٹک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد حضورِ اکرم ﷺ نے شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''عمر! بہاء الدین کو بلاؤ۔''

آقا کا حکم سنتے ہی حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ باہر تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد حضرت بہاء الدین زکریاؒ کو لے کر حاضر ہوئے اور ملتان کے درویش کو سرکارِ دو عالم ﷺ کی قدم بوسی سے مشرف کیا۔

فخرِ موجودات، سید السادات ﷺ نے ڈوری میں لٹکنے والے خرقوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''عمر! یہ خرقہ بہاء الدین کو پہناؤ۔''

حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ نے وہ خرقہ اُتارا اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو پہنا دیا۔ پھر اپنے مرید کا ہاتھ پکڑ کر سرورِ عالم ﷺ کے پائے اقدس پر جھکا دیا۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی آنکھ کھلی تو آپ پر سرشاری کی ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ خواب کا وہ حیات افزا منظر دیکھ کر حضرت شیخؒ پُر یقین ہو گئے تھے کہ خرقۂ خلافت آپ کو ضرور عطا ہو گا۔

دوسرے دن چاشت کی نماز کے بعد شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین عمر سہروردیؒ نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو اپنے مکان میں طلب کیا۔ جب حضرت شیخؒ پیر و مرشد کے دولت کدے پر حاضر ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کل رات یہی مکان آپ کو خواب میں نظر آیا تھا۔ اسی طرح ایک گوشے میں ایک ڈوری بندھی ہوئی تھی اور اس میں خرقے لٹک رہے تھے۔ حضرت شیخ بہاء الدین

زکریاؒ نے پیرومرشد کی دست بوسی کی سعادت حاصل کی اور دوزانو ہوکر بیٹھ گئے۔

حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کھڑے ہوئے اور اس خرقے کو ڈوری سے اُتار کر جس طرف حضور اکرم ﷺ نے اشارہ فرمایا تھا۔ پھر حضرت شیخؒ نے اپنے ہاتھوں سے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو خرقہ پہنایا اور نہایت پُراثر لہجے میں فرمایا۔

"بابا بہاء الدین! حضور پُرنور جناب سرور عالم ﷺ کے خرقوں کے درمیان، میں ایک ریزے سے زیادہ نہیں ہوں۔ کسی کو اپنے آقا کی اجازت کے بغیر خرقہ نہیں دے سکتا۔ جیسا کہ گزشتہ رات تم خود بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔"

یہ واقعہ سنانے کے بعد قطب الدین کاشانیؒ کے دوست نے کہا "علامہ! یہ عجیب بات ہے کہ آپ نجم الدین یوسفؒ سے تو اتنے متاثر ہیں کہ ان کے سوا کسی کو درویش نہیں سمجھتے اور جو نجم الدین یوسفؒ کے پیرومرشد ہیں ان کی طرف سے اپنے ذہن میں اس قدر غبار رکھتے ہیں؟"

علامہ قطب الدین کاشانیؒ اپنے دوست کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکے۔ انہیں نماز کے دوران پیش آنے والے واقعے پر اس قدر ندامت تھی کہ علامہ کیلئے ملتان میں رہنا دُشوار ہوگیا۔ پھر کچھ دن بعد ہی قطب الدین کاشانیؒ اپنا عظیم الشان مدرسہ چھوڑ کر دہلی چلے گئے اور اس وقت تک واپس نہیں آئے جب تک حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ دنیا سے رخصت نہیں ہوگئے۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے وصال کے بعد علامہ قطب الدین کاشانیؒ دوبارہ ملتان تشریف لائے اور اپنی زندگی کے باقی دن اسی شہر میں گزارے۔ علامہؒ کی جگہ دارالعلوم کے مشرقی حصے میں آج بھی موجود ہے۔ قطب الدین کاشانیؒ کا قائم کردہ یہ مدرسہ صدیوں قائم رہا۔ دسویں صدی ہجری کے آغاز میں مولانا وجیہہ الدین یوسفؒ ملتان تشریف لائے اور اسی مدرسے کے استاد مقرر ہوئے۔ پھر چشم فلک نے گردش روز و شب کا وہ ہولناک منظر دیکھا کہ جسے یاد کر کے آج بھی اہل دل کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ جب سکھوں کو پنجاب میں اقتدار حاصل ہوا تو اس قوم کے کچھ شرپسندوں نے مسجد اور مدرسے کو بارود سے اُڑا دیا۔ یہ وہی جامع مسجد تھی جس میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ، علامہ قطب الدین کاشانیؒ کے پیچھے نماز فجر ادا کیا کرتے تھے...... اور یہ وہی مدرسہ تھا جس میں اپنے وقت کے بڑے بڑے فاضل استاد تشنگان علم کی پیاس بجھایا کرتے تھے۔

☆☆......☆☆......☆☆

الغرض جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے جلال روحانی سے گھبرا کر علامہ قطب الدین کاشانیؒ دہلی چلے گئے تو حاکم ملتان ناصر الدین قباچہ کا منصوبہ بھی ناکام ہوگیا اور وہ خود ایسی آفات و مصائب میں گرفتار ہوا کہ سلطان شمس الدین التمش کے خوف سے دربدر مارا پھرتا رہا اور پھر ایک دن اپنے اہل و عیال کے ساتھ دریا میں ڈوب کر مرگیا۔ اللہ نے ایک ولی کو سرخرو کیا اور اس کے دشمنوں کو عبرتناک انجام تک پہنچایا۔

ان ہی دنوں یعنی 621ھ میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو فرزند کی دولت عظیم سے سرفراز کیا۔

شیخ صدرالدین محمد عارفؒ پیدا ہوئے تو درویشوں کے حلقے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے طویل سجدہ شکر ادا کیا اور بیٹے کی ولادت کی خوشی میں ملتان کے غریبوں اور مسکینوں کے دامن دولت سے بھر دیئے۔

اس زمانے میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا دسترخوان بہت وسیع تھا اور اس پر مختلف اقسام کے پُرتکلف کھانے ترتیب دیئے جاتے تھے۔ معتبر روایت ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے دسترخوان پر سینکڑوں مشائخ اور ہزاروں فقراء، دونوں وقت کا کھانا کھایا کرتے تھے۔ حضرت شیخؒ مہمانوں کو شریک طعام دیکھ کر بہت مسرور ہوتے تھے۔ جس قدر لوگ زیادہ آتے تھے۔ اسی قدر آپ کے چہرۂ مبارک سے خوشی کا اظہار ہوتا تھا۔

ایک دن کھانے کے دوران حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے ایک درویش کو دیکھا جو روٹی کو شوربے میں اچھی طرح تر کر کے کھا رہا تھا۔ حضرت شیخؒ نے فرمایا۔ "سبحان اللہ! اتنے بڑے مجمع میں یہ شخص بہترین کھانا کھا رہا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ثرید (چوری ہوئی روٹی) کو باقی کھانوں پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسے مجھے انبیائے پاک علیہم السلام پر اور عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مستورات عالم پر۔"

بعض تنگ نظر اور حاسد درویش حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی اس خوشحالی پر اعتراض کرتے تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ حضرت شیخؒ کا دسترخوان بھی شاندار تھا اور ذوق عبادت بھی۔

ایک دن ایک چرب زبان شخص حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتفاق سے اس وقت آپ کے سامنے کھانے کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ اس شخص نے کہا کہ حضرت کیا یہ حدیث پاک صحیح ہے۔ "جس کسی نے زندہ کی زیارت کی اور اس کی کوئی شے نہ چکھی، گویا اس نے کسی مُردے کی زیارت کی۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اس شخص کی بات سن کر فرمایا۔ "ہاں یہ حدیث معتبر ہے مگر عوام اس کے معنی نہیں جانتے۔ مخلوق کی دو قسمیں ہیں، عوام اور خواص۔ عوام سے مجھے غرض نہیں، ہاں! خواص جب آتے ہیں تو اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق فیض پاتے ہیں اور ذوق حاصل کرتے ہیں۔ اس حدیث شریف کے یہی معنی ہیں۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا خزانہ ہمیشہ درویشوں اور ضرورت مندوں کیلئے کھلا رہتا تھا۔ محتاج اور مساکین آتے تھے اور حضرت شیخؒ کے دربار سے اپنے خالی دامن بھر کے واپس جاتے تھے۔

ایک بار حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اپنے حجرۂ مبارک میں مصروف عبادت تھے اور چند درویش آپ کے قریب خاموش بیٹھے تھے۔ درویشوں نے دیکھا کہ حضرت شیخؒ یکایک مصلّے سے اُٹھے۔ حجرے کے ایک گوشے سے روپوں کی تھیلی نکالی اور بہت تیزی سے باہر تشریف لے گئے۔ حضرت شیخؒ کا عمل کچھ اس قدر اضطراری تھا کہ درویش بھی آپ کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

خانقاہ سے باہر نکل کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک مفلوک الحال شخص کو

دھمکیاں دے رہے تھے۔ ''اگر تو نے آج ہمارا قرض ادا نہیں کیا تو ہم جبراً وصول کرلیں گے۔''
وہ غریب شخص ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا۔ ''میں تم لوگوں کا قرض واپس کرنے سے منکر نہیں ہوں مگر اس وقت میرے پاس ایک پائی بھی نہیں ہے۔ مجھے کچھ دن کی مہلت اور دے دو۔''
قرض خواہ اس شخص کو رعایت دینے کیلئے تیار نہیں تھے۔ اتنے میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ وہاں تشریف لے گئے اور قرض خواہوں کو مخاطب کرکے فرمانے لگے۔ ''اگر تم لوگ اس مجبور شخص کو کچھ دن کی مہلت اور دیدیتے تو حق تعالیٰ تم پر کشادگی کے نئے دروازے کھول دیتا مگر تمہاری کم نظری نے اس موقع کو گنوا دیا۔''
''ہمیں ہمارا قرض چاہئے۔'' وہ لوگ حضرت شیخؒ کی باتوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے۔ ''اور ہم یہ قرض حاصل کرکے رہیں گے۔''
حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اپنے ہاتھ کی تھیلی قرض خواہوں کی طرف بڑھادی۔ ''تم اپنی مطلوبہ رقم اس میں سے لے لو۔''
روپوں سے بھری ہوئی تھیلی دیکھ کر قرض خواہوں کی نیت خراب ہوگئی۔ ایک شخص نے تھیلی میں ہاتھ ڈال کر مطلوبہ رقم سے کہیں زیادہ پیسے نکال لئے۔
''اب تو اس شخص کے ذمے تمہاری رقم واجب الادا نہیں ہے؟'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے قرض خواہوں سے پوچھا۔
''ہاں! ہمارا قرض ادا ہوگیا۔'' قرض خواہ نے بلند آواز میں کہا۔
حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ بچے ہوئے روپے لے کر خانقاہ کی طرف واپس جانے لگے۔ ابھی آپ نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ عقب سے ایک قرض خواہ کے چیخنے کی آواز آئی۔
''شیخ! مجھے معاف فرمادیں۔''
حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ شخص زار و قطار رو رہا تھا۔ ''تم نے میرا کیا جرم کیا ہے جو میں تمہیں معاف کردوں۔''
''میں نے اپنی مطلوبہ رقم سے زیادہ پیسے لے لئے تھے۔ قدرت نے مجھے اس کی سزا دیدی۔'' قرض خواہ نے گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے جس ہاتھ سے زیادہ رقم لی تھی، میرا وہی ہاتھ مفلوج ہوگیا ہے۔''
حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے قرض خواہوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تم لوگ بددیانتی بھی کرتے ہو اور مخلوق خدا کی دل آزاری بھی، آخر کب تک اپنے پیدا کرنے والے سے نہیں ڈرو گے؟'' یہ کہہ کر حضرت شیخؒ جانے لگے۔
قرض خواہ آگے بڑھ کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے قدموں سے لپٹ گیا۔ ''شیخ! اگر آپ نے مجھے معاف نہیں کیا تو خدا بھی معاف نہیں کرے گا۔''
حضرت شیخؒ کی شان کریمانہ تو یہ تھی کہ دشمنوں کو بھی معاف فرمادیا کرتے تھے۔ وہ تو محض ایک

تھا۔ آپ صرف تنبیہہ کے طور پر اپنی ناراضی کا اظہار کررہے تھے۔ آخر حضرت شیخؒ نے اس شخص کو معاف فرمادیا۔ ابھی آپ کی زبان مبارک سے ادا ہوئے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ بددیانت قرض خواہ کے خون کی گردش بحال ہوگئی اور اس کا ہاتھ درست ہوگیا۔
حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ خانقاہ میں تشریف لے آئے اور مہمان درویشوں کو مخاطب کرکے فرمانے لگے۔ ''حق تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے مجھے اپنے ایک بندے کی خدمت کیلئے بروقت بھیج دیا۔''
اسی طرح ایک بار کچھ چور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ میں چوری کی نیت سے داخل ہوئے۔ حضرت شیخؒ نصف شب کے سناٹے میں ذکر الٰہی کررہے تھے۔ ناگہاں آپ کی نظر چوروں پر پڑی تو وہ سب کے سب بینائی سے محروم ہوگئے...... اور پھر پوری خانقاہ ان کی فریادوں کے شور سے گونجنے لگی۔
''شیخ! ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا ئیے!''
''میں تمہیں اس وقت تک معاف نہیں کروں گا جب تک تم اس فعل قبیح سے ہمیشہ کیلئے تائب نہیں ہوجاؤ گے۔'' اس وقت حضرت شیخؒ حالت جلال میں تھے۔
آخر وہ چور عمر بھر کیلئے اس فعل سے تائب ہوئے تو ان کی آنکھوں کی روشنی بحال ہوئی۔
روایت ہے کہ دن رات فسق و فجور میں مبتلا رہنے والے وہ لوگ ترک معصیت کرکے حضرت شیخؒ کی گلیوں میں پڑے رہے۔ پھر ایک دن حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی نگاہ کیمیا اثر نے انہیں بھی کندن بنادیا۔

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے جود و سخا کے تذکرے سن کر دور دور سے لوگ آتے تھے اور اپنی مالی ضرورتیں پوری کرکے واپس چلے جاتے تھے۔ اتفاق سے ایک دن ایک ایسا شخص حضرت شیخؒ کی خانقاہ میں داخل ہوا جس کے عجیب و غریب سوال نے تمام حاضرین کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔
''شیخ! میں نے آپ کی سخاوت کے بہت قصے سنے ہیں۔'' اس شخص نے آتے ہی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی تعریف شروع کردی۔ ''دنیا میں مشہور ہے کہ آپ اپنے دروازے سے کسی سوالی کو خالی نہیں لوٹاتے۔''
''تم اپنا مقصد بیان کرو۔'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا، آپ کسی کی زبان سے اپنی تعریف پسند نہیں کرتے تھے۔
''حضور! میں نے سنا ہے کہ آپ اللہ کے نام پر سب کچھ دیدیتے ہیں۔'' وہ شخص عرض حال کرنے سے پہلے طویل تمہید باندھنے کی کوشش کررہا تھا۔
''میرے عزیز! اس میں میرا کیا ہے؟'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ ''سارے خزانے

اسی کے ہیں۔ میں تو اس کا ایک ادنیٰ منتظم ہوں۔ وہ جسے چاہتا ہے، دلا دیتا ہے۔ تم بھی اپنی ضرورت بیان کرو، انشاء اللہ خالی ہاتھ نہیں جاؤ گے۔"

سوالی نے عرض کیا۔ "حضور! آج آپ اللہ کی راہ میں اتنی اشرفیاں عنایت فرمائیں، جتنے انبیاء پاک علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے ہیں۔"

اس شخص کا سوال سن کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ حیران رہ گئے۔ حاضرین مجلس کے چہروں پر بھی شدید حیرت واستعجاب کی لہر دوڑ گئی۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے ساتھ ایک عام مسلمان بھی جانتا تھا کہ ایک مشہور روایت کے مطابق اس دنیا میں کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور رسول دنیا میں تشریف لائے ہیں۔ بڑی عجیب صورتحال تھی۔ اس شخص کے مطالبے کی تکمیل کا مطلب یہ تھا کہ پورا خزانہ اس کے حوالے کر دیا جائے۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو خاموش دیکھ کر سائل نے عرض کیا۔ "شیخ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"کیا تم اتنے ضرورت مند ہو کہ اتنی بڑی رقم ہی تمہاری کفالت کر سکتی ہے؟" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے کچھ دیر تک غور وفکر کرنے کے بعد فرمایا۔

"حضور! میری ضرورت کو چھوڑیں، میرے سوال پر غور فرمائیں۔" اس شخص نے حضرت شیخؒ کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے عرض کیا۔ "میں تو حضور کی بخشش وعطا کا انداز دیکھنا چاہتا ہوں۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ شدید ذہنی کشمکش کا شکار نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف یہ صورتحال تھی کہ آج تک کوئی سوالی آپ کی بارگاہ سے خالی نہیں گیا تھا...... اور دوسری طرف یہ مشکل درپیش تھی کہ اگر اس شخص کو اتنی بڑی رقم دیدی جائے گی تو دوسرے مستحق افراد مالی امداد سے محروم ہو جائیں گے۔ بڑا وہ فکر انگیز مرحلہ تھا جسے سلجھانے میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ مصروف تھے۔ اس وقت آپ کی خانقاہ میں دیگر صوفیاء اور مشائخ بھی موجود تھے۔ ہر شخص ایک ہی سوچ میں غرق تھا کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اتنا بڑا خزانہ ایک شخص کے حوالے کر دیں گے یا اپنی خانقاہ کی روایت کے خلاف سائل کو خالی ہاتھ لوٹا دیں گے۔

خانقاہ کے در و بام پر گہرا سکوت طاری تھا اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں سرگرداں تھے کہ یکایک خانقاہ کے ایک گوشے سے آواز اُبھری۔

"حضرت! اس شخص کو میرے حوالے فرما دیجئے! میں اس کا سوال پورا کروں گا۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے ساتھ تمام حاضرین مجلس نے اس آواز کی طرف دیکھا۔ حضرت حاجی جمال کنبوہؒ اپنی نشست پر انتہائی ادب کے ساتھ کھڑے تھے۔ حاجی جمال کنبوہؒ ملتان کے ایک امیر و کبیر شخص تھے اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ بعض روایتوں میں درج ہے کہ حضرت حاجی جمال کنبوہؒ، حضرت شیخؒ کے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ کچھ روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ حضرت حاجی جمالؒ، حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مرید صادق تھے۔ الغرض

حاجی جمالؒ اور حضرت شیخؒ کے درمیان کوئی بھی رشتہ ہو مگر محبت اور عقیدت کا رشتہ سب رشتوں پر بھاری تھا۔

حضرت حاجی جمالؒ کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ آپ نہایت ذہین شخص تھے اور انتہائی پیچیدہ مسائل کو بڑی آسانی کے ساتھ حل کر دیا کرتے تھے۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے حاجی جمالؒ کی عرضداشت سن کر فرمایا۔ "حاجی! میرے قریب آؤ۔"

حاجی جمالؒ حضرت شیخؒ کے قریب آئے تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ "حاجی! تم نے سوال سمجھ لیا ہے۔"

"سیدی! میں نے سوال کو بھی سمجھ لیا ہے اور سوالی کو بھی۔" حاجی جمال کنبوہؒ نے نہایت ادب اور عاجزی کے ساتھ عرض کیا۔

"تو پھر اس غریب کے مسئلے کو حل کر دو۔" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے خوش ہو کر فرمایا حاجی جمال کنبوہؒ کے جواب نے حضرت شیخؒ کی ذہنی پریشانی کو دور کر دیا تھا۔

"حضرت! یہ مسئلہ یہاں حل نہیں ہوگا۔" جمال کنبوہؒ نے عرض کیا۔

"پھر؟" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے پوچھا۔

"میں آپ کے اس مہمان کو اپنے گھر لے جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔" حاجی جمال کنبوہؒ نے عرض کیا۔

پھر جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے حاجی جمالؒ کو اجازت دیدی تو وہ سائل کو اپنے ساتھ لے کر گھر چلے گئے۔ اس دوران تمام حاضرین مجلس سوچ رہے تھے کہ آخر حاجی جمالؒ اس مشکل مسئلے کو کیسے حل کریں گے؟

حاجی جمال کنبوہؒ سائل کو لے کر گھر پہنچے اور بڑی عزت کے ساتھ مسند پر بٹھایا اور خود فرش پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "تم میرے شیخ کے مہمان ہو، اس لئے تمہاری عزت وتکریم مجھ پر فرض ہے۔"

سائل حضرت جمال کنبوہؒ کے اس طرز عمل سے بہت خوش نظر آ رہا تھا اور اسے اُمید ہو چلی تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد حاجی جمالؒ کا ایک خدمت گار شربت لے کر آیا۔ سائل نے اطمینان قلب کے ساتھ شربت پیا۔ پھر دوسرا خادم حاضر ہوا اور اس نے طشت میں رکھا ہوا ایک قیمتی لباس مہمان کو پیش کیا۔

"اسے پہن لو!" حاجی جمالؒ نے سائل کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"یہ سب فروعات ہیں۔ پہلے مجھے میرے سوال کا جواب چاہئے۔" سائل اس ظاہری تواضع کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ حاجی جمالؒ اسے اس طرح ٹالنا چاہتے ہیں۔

"پہلے مجھے رسم میزبانی ادا کرنے دو۔" حضرت حاجی جمالؒ نے فرمایا۔ "میں تمہارے سوال کا جواب دینے ہی کیلئے تمہیں یہاں لایا ہوں۔"

پھر جب اس سائل نے حضرت حاجی جمالؒ کا پیش کردہ لباس پہن لیا تو آپ نے اپنے خدمت گار کو آواز دیتے ہوئے فرمایا۔ ''خزانے کا دروازہ کھول کر ساری اشرفیاں لے آؤ۔''

خدمت گار اشرفیاں لا لا کر حضرت حاجی جمالؒ کے سامنے ڈھیر کرتے رہے اور سائل خوش ہوتا رہا کہ چند لمحوں بعد ہی وہ ایک مالدار شخص بن جائے گا۔

جب اشرفیوں کا انبار لگ گیا تو حضرت حاجی جمال کنبوہؒ نے فرمایا۔ ''معزز مہمان! اب تم اپنا سوال پیش کرو۔''

''میرا سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آج تک جس قدر انبیائے پاک اس زمین پر بھیجے ہیں، ان سب کے نام پر ایک اشرفی عنایت کیجئے۔'' سائل نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

''تو پھر بسم اللہ کیجئے!'' حضرت حاجی جمال کنبوہؒ نے مہمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''آپ ایک ایک پیغمبر کا نام لیتے رہیں، میں اللہ کے پاک نبی کے نام پر ایک ایک اشرفی آپ کی خدمت میں پیش کرتا رہوں گا۔''

حاجی جمالؒ کی بات سن کر سائل گھبرا گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے حلقۂ عقیدت میں شامل یہ ذہین ترین شخص، اس کو اسی کے سوال میں اُلجھا کر رکھ دے گا۔ سائل کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ چند انبیائے پاک علیہم السلام کے اسمائے گرامی زبان پر لائے اور اسی تناسب سے اشرفیاں حاصل کر کے واپس چلا جائے۔

''حضرت آدم علیہ السلام۔'' سائل نے ابوالبشر کا نام لیا اور جواب میں حضرت حاجی جمال کنبوہؒ نے ایک اشرفی اس کے آگے رکھ دی۔

اس طرح سائل بمشکل پندرہ بیس انبیائے پاک کے نام لے سکا اور اتنی ہی اشرفیاں واپس لے کر چلا گیا۔

پھر جب حضرت شیخ بہاء الدین ملتانیؒ نے یہ واقعہ سنا تو بہت خوش ہوئے اور حضرت حاجی جمال کنبوہؒ اور ان کی اولاد کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

ان ہی دنوں ایک اور واقعہ پیش آیا جس کے سبب دارالحکومت دہلی میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

گزشتہ سطور میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ ناصر الدین قباچہ کے دور میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کچھ دنوں تک حضرت شیخ بہاء الدین ملتانیؒ کی خانقاہ میں مقیم رہے تھے۔ پھر جب فتنۂ تاتار کا رخ دوسری طرف مڑ گیا اور راستے کھل گئے تو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ دہلی تشریف لے گئے اور حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ غزنی چلے گئے۔ پھر کچھ دن بعد حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ دہلی تشریف لائے تو فرمانروائے ہندوستان سلطان شمس الدین التمش نے اپنے محل سے نکل کر حضرت شیخؒ کا استقبال کیا۔ شیخ نجم الدین صغریٰ جو اس وقت ''شیخ الاسلام'' کے منصب پر فائز تھے، ایک درویش سے سلطان کی یہ عقیدت دیکھ کر حسد کا شکار

سلطان شمس الدین التمش سے شیخ نجم الدین صغریٰ سے پوچھا۔

پھر اسی دوران سلطان شمس الدین التمش نے شیخ نجم الدین صغریٰ سے پوچھا۔ ''حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کو کہاں ٹھہرایا جائے۔''

سلطان کے اس سوال کا مقصد یہ تھا کہ شیخ نجم الدین صغریٰ، حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کے شایانِ شان کوئی جگہ بتائیں گے مگر چونکہ شیخ الاسلام ایک مردِ خدا پرست کی شہرت و مقبولیت سے جل رہے تھے، اس لئے کہنے لگے۔ ''جلال الدین تبریزیؒ کو ''بیت الجن'' میں ٹھہرا دیا جائے۔''

''بیت الجن'' دہلی میں ایک مشہور مکان تھا جو طویل عرصے سے بند پڑا ہوا تھا۔ یہاں جنوں کی ایک جماعت رہتی تھی جس کے خوف سے بڑے سے بڑا جری اور بہادر انسان بھی اس مکان میں رہنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔

''میں اپنے معزز مہمان کو اس آسیب زدہ مکان میں ہرگز نہیں ٹھہراؤں گا۔'' سلطان شمس الدین نے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کی تجویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

''سلطان معظم! اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' شیخ نجم الدیٰ صغریٰ نے نئی منطق پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر جلال الدین تبریزیؒ واقعتاً درویش ہیں تو مکان جنوں سے خالی ہو جائے گا...... اور اگر وہ اپنے جسم پر درویشی کا مصنوعی لباس سجائے ہوئے مخلوق خدا کو فریب دے رہے ہیں تو پھر اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے۔''

سلطان شمس الدین التمش اور شیخ نجم الدین صغریٰ کے درمیان یہ گفتگو تنہائی میں ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ کا خادم تراب آیا اور شیخ نجم الدین صغریٰ سے کہنے لگا۔ ''میرے مرشد نے اس مکان کی کنجی طلب فرمائی ہے جس میں جن رہتے ہیں۔''

یہ سن کر سلطان شمس الدین التمش مسکرایا مگر شیخ نجم الدین صغریٰ کے چہرے پر شدید ندامت کے آثار نظر آنے لگے۔

پھر حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کے خادم نے ''بیت الجن'' کا دروازہ کھولا اور بآواز بلند پکار کر کہا۔

''اے جنو! میرے مرشد نے حکم دیا ہے کہ اس مکان کو فوراً خالی کر دو۔''

پھر اسی رات حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ بیت الجن میں تشریف لے گئے اور آپ کے مبارک قدموں کے سبب یہ مکان تمام اثرات سے پاک ہو گیا۔

شیخ الاسلام نجم الدیٰ صغریٰ کا منصوبہ ناکام ہو گیا اور وہ حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کے اثرات کو کم کرنے کیلئے کسی دوسرے موقع کی تلاش میں رہنے لگے۔ دراصل شیخ نجم الدین کو یہ اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں سلطان شمس الدین التمش، حضرت شیخ تبریزیؒ سے متاثر ہو کر انہیں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز نہ کر دے، وہ ایک دنیا پرست عالم تھے۔ اس لئے درویشوں کی محبوبیت سے ہمیشہ خائف رہتے تھے اور ان کی مقبولیت کو اپنے منصب و جاہ کیلئے بہت بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔

دوسرے دن حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملنے کیلئے

خانقاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت حضرت قطبؒ اپنے مریدوں کو درس دے رہے تھے۔ یکایک آپ نے درس روک دیا اور بآواز بلند فرمایا۔

"دوست آ رہا ہے۔"

یہ کہہ کر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اپنے چند خدمت گاروں کے ساتھ خانقاہ سے باہر تشریف لے گئے اور راستے میں حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کا بڑے والہانہ انداز میں استقبال کیا۔ جب یہ خبر سلطان شمس الدین التمش تک پہنچی تو وہ حضرت سیّد تبریزیؒ کا مزید معتقد ہو گیا۔ واضح رہے کہ فرمانروائے ہندوستان حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مرید تھا۔

حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کئی دن تک حضرت قطبؒ کی خانقاہ میں مقیم رہے۔ اس دوران سماع کی کئی مجلسیں آراستہ ہوئیں اور دونوں بزرگوں کے دیدار کی سعادت حاصل کرنے کیلئے ہزاروں لوگ جمع ہوئے۔ ان خبروں نے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کی آتش حسد کو اس قدر بڑھایا کہ وہ حضرت شیخ تبریزیؒ کو سلطان التمش کی نظروں سے گرانے کیلئے نئے منصوبے ترتیب دینے لگے۔

حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ جس مکان میں فروکش تھے، وہ قصر شاہی سے بہت قریب تھا۔ اسی مکان پر جنوں نے قبضہ کر لیا تھا مگر جب حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ تشریف لائے تو یہ آتشیں مخلوق کہیں اور چلی گئی۔ حضرت شیخ تبریزیؒ بڑے عبادت گزار انسان تھے۔ رات رات بھر ذکر الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ ان ہی ایام میں حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ نے ڈیڑھ ہزار روپے میں ایک نہایت حسین و جمیل ترکی غلام خریدا چند دنوں میں غلام کے حسن کے چرچے عام ہو گئے۔ شیخ نجم الدین صغریٰ بھی اس غلام کو دیکھنے کیلئے آئے جو حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کی خدمت پر مامور تھا۔ شیخ الاسلام کو حضرت تبریزیؒ کے خلاف مہم چلانے کا ایک اور بہانہ مل گیا۔

"درویش ہو کر خوبصورت لڑکوں سے خدمت کراتا ہے۔" شیخ نجم الدین صغریٰ نے یہ بات اتنے زور و شور سے کہی کہ دہلی کے اکثر حلقوں میں اس کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

لوگ حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے مگر آپ شیخ الاسلام کی سازشوں اور دہلی کے باشندوں کی نکتہ چینیوں سے بے نیاز ہو کر اپنے کام میں مشغول رہے۔

پھر ایک دن حضرت شیخ تبریزیؒ نے خود ہی نجم الدین صغریٰ کو یہ موقع فراہم کر دیا۔ آپ نے نماز فجر ادا کی اور چادر اوڑھ کر مکان کے صحن میں لیٹ گئے۔ وہ خوبصورت ترکی غلام حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ کے پاؤں دبانے لگا۔ اتفاق سے اس روز شیخ نجم الدین صغریٰ نماز فجر سے پہلے محل پہنچ گئے تھے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، اس لئے نماز فجر قصر سلطانی کی چھت پر پڑھی گئی۔ نماز کے بعد شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ ٹہلتے ہوئے چھت کے کنارے تک آئے اور حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کے مکان میں جھانکنے لگے۔ پھر وہی منظر اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ترکی غلام حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کے پاؤں دبا رہا تھا۔ نجم الدین صغریٰ کو اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا تھا۔ شیخ الاسلام نے سلطان شمس الدین التمش کو حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"سلطان ذی وقار! آپ اس شخص سے عقیدت رکھتے ہیں جو نماز فجر چھوڑ کر گہری نیند سو رہا ہے اور خوبصورت غلام سے اپنے پاؤں دبوا رہا ہے۔ اگر عام مسلمان اپنی آنکھوں سے یہ مناظر دیکھیں گے تو ان کے عقائد کا کیا حال ہو گا۔ فرمانروائے ہند کا فرض ہے کہ جلد از جلد اس فتنے سے سر زمین دہلی کو پاک کر دیا جائے۔"

سلطان التمش نے بھی اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور اسے شدید اذیت پہنچی۔ ابھی والیٔ ہندوستان کچھ کہنے ہی والا تھا کہ حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ نے چادر پھینک دی اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر قصر شاہی کی طرف دیکھا اور بلند آواز سے فرمایا۔

"شیخ نجم الدین! اگر تم کچھ دیر پہلے مجھے دیکھتے تو اس لڑکے کو میرے پاس نہ پاتے، یہ تو تمہاری آزمائش کے لئے یہاں آیا ہے۔"

حضرت جلال الدین تبریزیؒ کی قوت کشف دیکھ کر سلطان شمس الدین التمش حیران رہ گیا۔ پھر اس نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "شیخ! آپ کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ خاصان خدا سے بدگمانی رکھتے ہو اور مجھے بھی ورغلاتے ہو۔ آپ کے حق میں بہتر یہی ہے کہ حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ اور دوسرے درویشوں کی طرف سے اپنے دل کو صاف کر لیں۔"

اس واقعے کے بعد سے کسی شخص نے اس خوبصورت ترکی غلام کو دہلی میں نہیں دیکھا۔ بعض عقیدت مندوں نے حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ سے پوچھا۔ "شیخ! یہ کیا راز تھا؟"

"وہ لڑکا شیخ الاسلام کو خوش کرنے کیلئے آیا تھا۔" حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "مگر میں کیا کروں کہ شیخ نجم الدین صغریٰ کی قسمت میں خوشی تحریر ہی نہیں کی گئی ہے۔ اللہ انہیں توفیق دے کہ وہ اپنے مالک کی بخشی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کر سکیں۔" یہ کہہ کر حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ خاموش ہو گئے۔

شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ نے کھلی آنکھوں سے حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کا مقام روحانی دیکھا مگر اپنے سینے میں بھڑکنے والی آتش حسد کو سرد نہ کر سکے۔ دہلی میں گوہر نامی ایک خوبصورت رقاصہ رہتی تھی۔ اکثر امرائے دہلی اس کے رقص سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ نجم الدین صغریٰ نے بڑے رازدارانہ انداز میں ایک دوست کے ذریعے رقاصہ گوہر کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ پر آبروریزی کا الزام لگائے اور اپنا مقدمہ دربار سلطانی میں پیش کر دے۔ رقاصہ گوہر نے اس تہمت طرازی کیلئے بہت بڑی رقم طلب کی۔ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کے دوست نے رقاصہ کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے نصف رقم پیشگی ادا کر دی...... اور آدھی رقم دہلی کے ایک دکاندار مشرف کے پاس بطور امانت رکھوا دی کہ جب رقاصہ گوہر سلطان شمس الدین التمش کی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کرے تو اسے یہ رقم ادا کر دی جائے۔

آخر ایک دن رقاصہ گوہر سلطان شمس الدین التمش کے دربار میں حاضر ہوئی اور اس نے رو رو کر سارا ماجرا بیان کیا۔ "حضور! میں جلال الدین تبریزیؒ کے نورانی چہرے سے دھوکا کھا گئی۔ شیخ نے

میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔"

سلطان شمس الدین التمش حیرت زدہ رہ گیا۔ جس کا احترام خود اس کے پیر و مرشد کرتے ہوں، وہ شخص اتنے بڑے گناہ میں کیسے ملوث ہوسکتا ہے؟ فرمانروائے ہندوستان نے سوچا۔ "تو کون ہے اور کہاں سے آئی ہے؟"

رقاصہ گوہر نے اپنا تعارف کرایا تو سلطان شمس الدین التمش برہم ہوگیا۔ "ایک زن فاحشہ کی گواہی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔"

"حضور! میں رقاصہ ضرور ہوں مگر جسم فروشی میرا پیشہ نہیں۔" گوہر نے گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا۔ "شیخ نے مجھے دھوکا دیا۔"

"تیرے شور فغاں سے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔" سلطان شمس الدین التمش کا لہجہ غضب ناک تھا۔ "میں جانتا ہوں کہ حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کون ہیں۔"

فرمانروائے ہند اس مقدمے کو سننے کیلئے تیار نہیں تھا مگر علمائے دربار نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "سلطان ذی وقار! یہ اس فریادی عورت کا حق ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم پر انصاف طلب کرے...... اور یہ شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا فرض ہے کہ وہ اپنی بے گناہی ثابت کریں۔"

"میں جانتا ہوں کہ حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ بے قصور ہیں۔" سلطان شمس الدین التمش نے کہا۔ "مگر عدالت عالیہ پر اپنا فیصلہ مسلط کرنے سے گریزاں ہوں کہ لوگ مجھ پر بھی جانبداری کا الزام عائد کردیں گے۔ کہا جائے گا کہ میں نے اس شخص کی حمایت کی جو میرے پیر و مرشد کا دوست ہے۔ اس لئے آپ حضرات محضر تیار کریں۔ اہل دنیا خود دیکھ لیں گے کہ کون گناہ گار ہے اور کون معصوم؟"

اس کے بعد ہندوستان کے تمام اکابر علماء اور مشائخ کے نام دعوت نامے جاری کردیئے گئے۔ جب سرکاری قاصد ملتان پہنچ کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے سلطان شمس الدین التمش کا دعوت نامہ پیش کیا تو حضرت شیخؒ کا چہرۂ مبارک اذیت و کرب کی شدت سے متغیر ہوگیا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ "کیا علمائے دہلی کو اس کا علم نہیں کہ سید جلال الدین تبریزیؒ کون ہیں اور کس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں؟"

پھر آپ اسی وقت اپنے چند خدمت گاروں کے ساتھ تیز رفتار سواری پر دہلی کی طرف روانہ ہوگئے۔

آخر جب تمام علماء اور مشائخ جمع ہوگئے تو نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد دہلی میں وہ محضر پیش کیا گیا۔ حامد بن فضل اللہ جمالیؒ کی روایت کے مطابق اس وقت خانۂ خدا علماء اور مشائخ سے بھرا ہوا تھا۔ ڈھائی سو سے زیادہ اولیائے کرام شریکِ عدالت تھے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ سلطان شمس الدین التمش کے دائیں جانب تشریف

[illegible]ـے۔

"آپ ان علماء اور مشائخ میں سے کسی ایک کو ثالث منتخب کرلیں۔" سلطان التمش نے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اسی ثالث کا فیصلہ عدالت کا فیصلہ قرار پائے گا۔"

نجم الدین صغریٰ کو کسی نے یہ بات بتادی تھی کہ حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے درمیان رنجش موجود ہے۔ حالانکہ وہ ایک معمولی واقعہ تھا جس کی وجہ سے دونوں بزرگوں کے درمیان کچھ اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ شیخ الاسلام نے اسی اختلاف کو رنجش سے تعبیر کیا اور [illegible]انہ انداز میں سوچا کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ نتیجتاً نجم الدین صغریٰ نے ثالث کے طور پر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا نام لیا اور پوری مجلس کے سامنے باآواز بلند کہا۔ "شیخ جو بھی فیصلہ دیں گے، وہ عدالت کے تمام اراکین کیلئے قابل قبول ہوگا۔"

اس مرحلے سے گزرنے کے بعد سرکاری کارندوں نے حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کو پیش کیا جن پر دہلی کی رقاصہ گوہر کی آبرو ریزی کا الزام تھا۔ شیخ الاسلام اور ان کے ہم نوا علماء خوش تھے کہ آج درویشی کا پردہ چاک ہوجائے گا۔ دوسری طرف درویشوں اور صوفیوں کی جماعت آزردہ تھی کہ ان کا ایک ساتھی مکروفریب اور سازش کی خوف ناک آندھیوں کی زد پر تھا۔

آخر اسی اذیت ناک فضا میں، حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ جامع مسجد میں داخل ہوئے۔ آپ کو دیکھتے ہی تمام صوفی اور درویش والہانہ انداز میں استقبال کیلئے اپنی نشستوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ تیزی سے آگے بڑھے اور سیّد جلال الدین تبریزیؒ کے جوتے رومال میں لپیٹ کر اپنی نشست پر واپس آگئے۔ سلطان شمس الدین التمش بڑی حیرت سے اس کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔ حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کا یہ عزت و احترام دیکھ کر شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کا چہرہ زرد ہوگیا تھا۔ جس شخص کو ثالث بنایا گیا تھا جب اسی نے "ملزم" کے جوتے اُٹھائے تو پھر کیا باقی رہ جاتا ہے۔ چند لمحوں کیلئے نجم الدین صغریٰ بدحواس ہوگئے تھے مگر اُنہیں اپنے منصوبے کی مضبوطی پر یقین تھا، اس لئے فوراً ہی سنبھل گئے۔

جب سیّد جلال الدین تبریزیؒ علماء اور مشائخ کی عدالت میں حاضر ہوگئے تو سلطان شمس الدین التمش نے اپنی نشست پر کھڑے ہوکر کہا۔

"صاحبانِ نظر! جب کہ امام الاولیاء حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ جیسے جلیل القدر ثالث نے حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کی اس قدر توقیر کی ہے تو پھر ان کی بزرگی میں کلام کرنا، دانشمندی سے بعید ہے۔ پس وہ الزام جو رقاصہ نے سیّد جلالؒ پر عائد کیا ہے، میری نظر میں باطل ہے۔"

فرمانروائے ہند نے حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کو بے گناہ قرار دیدیا تھا مگر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ انصاف کے تقاضوں کے پیش نظر حاضرین عدالت کو مقدمے کی پوری کارروائی دکھانا چاہتے تھے۔ نتیجتاً اپنی نشست سے اُٹھے اور کھڑے ہوکر باآواز بلند فرمایا۔

"یہ میرے لئے فخر کی بات ہے کہ میں شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے قدموں کی خاک کو اپنی

آنکھوں کا سرمہ بناؤں کیونکہ وہ میرے پیرو مرشد شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے ساتھ کئی سال تک سفر وحضر میں رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ یہ خیال کریں کہ اس نسبت خاص کی وجہ سے میں اپنے بھائی کے عیب پر پردہ ڈال رہا ہوں، اس لئے ضروری ہے کہ مدعیہ کو بھی سر عدالت طلب کر لیا جائے۔ پھر قادر مطلق جس طرح چاہے گا اپنے نام لیواؤں کی برأت فرما دے گا۔"

یہ سن کر شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کے چہرے پر خوشی کا گہرا رنگ اُبھر آیا۔ اُنہیں یقین تھا کہ ان کے اثر ورسوخ کو دیکھتے ہوئے رقاصہ گوہر، سید جلال الدین تبریزیؒ پر الزام عائد کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائے گی۔ آخر کچھ دیر بعد رقاصہ گوہر بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ شاہی عدالت میں حاضر ہوئی مگر جب وہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے روبرو پہنچی اور پھر جیسے ہی اس نے ایک مردِ خدا کو دیکھا، اس کی نظریں جھک گئیں۔

"تو اُنہیں پہچانتی ہے؟" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے رقاصہ کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کی طرف اشارہ کیا۔

"جی حضور!" رقاصہ گوہر نے سر جھکائے ہوئے کہا۔ حضرت شیخؒ کے رعب وجلال سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"میری طرف دیکھ!" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی پُر جلال آواز گونجی۔

رقاصہ گوہر نے حضرت شیخؒ کی طرف دیکھا مگر فوراً ہی اس کی نظریں جھک گئیں۔

"اے فاحشہ! تجھے ایک مردِ خدا پر یہ تہمت لگانے کی جرأت کیوں کر ہوئی۔" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے غضب ناک لہجے میں رقاصہ کو مخاطب کیا۔ "اللہ کے دوستوں سے کوئی امر پوشیدہ نہیں ہے۔ سچ سچ بتا کہ حقیقت کیا ہے؟ ورنہ اپنے کئے کی ایسی سزا پائے گی کہ تجھے دیکھ کر لوگ عبرت حاصل کریں گے۔"

رقاصہ گوہر پر حضرت شیخؒ کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگی۔ پھر اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا شاہد ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے اور افترا پردازی ہے۔ میں نے ان مردِ بزرگ کو اپنی زندگی میں آج پہلی بار دیکھا ہے۔"

"پھر یہ کیسی ہنگامہ آرائی ہے؟" حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے اسی حالت غضب میں فرمایا۔ "ان لوگوں کو کس لئے جمع کیا گیا ہے؟"

"حضور! مجھے تو مشرف دکاندار نے پانچ سو اشرفیاں دی تھیں اور کہا تھا کہ میں سیّد جلال الدین تبریزیؒ نام کے ایک شخص پر اپنی آبرو ریزی کی تہمت لگا دوں۔ پھر جب یہ بہتان ثابت ہو جائے گا تو مجھے پانچ سو اشرفیاں اور دے دی جائیں گی۔ میرے نزدیک یہ ایک کاروباری سودا تھا۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتی۔"

رقاصہ گوہر کا بیان سن کر شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ درمیان میں بول اُٹھے۔ "شیخ! یہ ثابت ہو گیا

کہ یہ عورت جھوٹی ہے اور سیّد جلال الدین تبریزیؒ بے قصور ہیں۔"

شیخ نجم الدین صغریٰ مقدمے کی کارروائی اسی مقام پر ختم کر دینا چاہتے تھے مگر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے شیخ الاسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "رقاصہ کا جھوٹ تو ثابت ہو چکا لیکن مشرف دکاندار کو حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ سے کیا پرخاش ہے؟ اس نے ایک کثیر رقم خرچ کر کے آخر ایک بزرگ ہستی پر یہ بہتان کیوں باندھا؟ اسے بھی اسی وقت عدالت میں پیش کیا جائے۔"

پھر جب سلطان شمس الدین التمش کے سپاہی مشرف دکاندار کو پکڑ کر جامع مسجد دہلی میں لائے تو اس کا پورا جسم خوف سے لرز رہا تھا۔ وہ آتے ہی فرمانروائے ہند کے قدموں پر گر پڑا اور رو رو کر عرض کرنے لگا۔ "سلطان عالی مقام! میں اس سلسلے میں بے قصور ہوں۔ مجھے تو شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ نے اس گھناؤنی سازش پر مجبور کیا تھا۔ اگر میں ان کے حکم کی تعمیل نہ کرتا تو میری گردن اُڑا دی جاتی۔"

حاضرین عدالت نے دیکھا کہ اس انکشاف کے بعد شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کا چہرہ شدت خوف سے زرد تھا اور ان کی آنکھیں بارِ ندامت سے جھکی ہوئی تھیں۔

سلطان شمس الدین التمش نے غضب ناک نظروں سے نجم الدین صغریٰ کی طرف دیکھا اور اُنہیں زہر آلود لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مولانا! آخر آپ نے یہ پست و رکیک حرکت کیوں کی؟ اللہ نے آپ کو شیخ الاسلام کا منصب عظیم عطا فرمایا۔ دولت و عزت بخشی، پھر بھی آپ نے اس قدر کفرانِ نعمت کیا کہ خدا کی پناہ! اللہ کے دوستوں پر بھی بہتان تراش دیئے۔ بغض و حسد کا یہ کون سا انداز ہے؟"

شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سرِ عدالت سر جھکائے کھڑے رہے۔

ایک روایت ہے کہ سلطان شمس الدین التمش نے اسی وقت شیخ نجم الدین صغریٰ کو شیخ الاسلام کے عہدے سے برطرف کر دیا اور زندگی بھر اُن کی صورت نہیں دیکھی۔

دوسری روایت ہے کہ سلطان شمس الدین التمش نے اسی وقت حکم جاری کر دیا کہ شیخ نجم الدین صغریٰ کی گردن اُڑا دی جائے۔ والئ ہند کا فرمان سن کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے فرمایا۔ "سلطان! آپ شیخ نجم الدین صغریٰ کی اس قبیح حرکت سے درگزر کریں۔ اللہ ان کی سزا خود تجویز کرے گا۔"

بہرحال امر واقعہ کچھ بھی ہو مگر یہ روایت درست ہے کہ نجم الدین صغریٰ کو اسی وقت ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان شمس الدین التمش نے اپنے پیرو مرشد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے درخواست کی۔

"سیدی میری اور تمام اہل شہر کی خواہش ہے کہ آپ اس منصب کو قبول فرمالیں۔"

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر آپ نے فرمانروائے ہند کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''شیخ الاسلام کا منصب ایک نہایت اہم اور نازک ذمہ داری ہے۔ سلطان مجھے ایک رات غور کرنے کی مہلت دیں۔''

اس کے بعد حضرت قطبؒ نے جامع مسجد میں موجود تمام علماء اور مشائخ سے فرمایا۔ ''آپ حضرات بھی آج رات استخارہ کریں۔ پھر حضور اکرم ﷺ جس شخص کے نام حکم جاری فرمائیں اسی کو شیخ الاسلام کا منصب دیا جائے۔''

الغرض اسی رات تمام مشائخ نے استخارہ کیا۔ نصف شب کے قریب تمام بزرگوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ عرش کے نیچے سرور کونین ﷺ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہیں۔ ان سب کی موجودگی میں رسالت مآب ﷺ نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو بلا کر اپنے دست مقدس سے خلعت پہنائی اور فرمایا۔

''بہاء الدین! تمہیں شیخ الاسلام کا یہ منصب مبارک ہو۔''

دوسرے دن نماز فجر کے بعد تمام مشائخ جامع مسجد دہلی میں پھر جمع ہوئے۔ اس وقت سلطان شمس الدین التمش بھی موجود تھا۔

''اب تو کسی شخص کو اس بات میں تردد نہیں ہونا چاہئے کہ شیخ الاسلام کون ہے؟'' حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا۔

تمام مشائخ نے بیک زبان کہا۔ ''جسے بارگاہِ نبوت ﷺ سے شیخ الاسلام کا منصب عطا ہوا ہو، اس کی خوش بختی اور سعادت میں کسے کلام ہوسکتا ہے۔''

سلطان شمس الدین التمش خود بھی خواب میں یہ روح پرور منظر دیکھ چکا تھا۔ اس نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے درخواست کی جسے آپ نے قبول فرمالیا۔

اس کے بعد شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریاؒ ملتان کی طرف روانہ ہوگئے اور حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ دہلی سے بدایوں تشریف لے گئے۔ یہ دونوں بزرگوں کی آخری ملاقات تھی۔

کچھ دن بعد درد شکم کے عارضے میں نجم الدین صغریٰ کا انتقال ہوگیا۔ جب سیّد جلال الدین تبریزیؒ کو کشف کے ذریعے اس سانحۂ ارتحال کی خبر ہوئی تو آپ نے مریدوں اور عقیدت مندوں سے فرمایا۔

''شیخ نجم الدین صغریٰ دنیا سے رخصت ہوگئے۔''

پھر آپ نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی اور نہایت پُرسوز لہجے میں دعائے مغفرت فرمائی۔

''اے اللہ! میں نے شیخ نجم الدین کو معاف کردیا تو بھی اُنہیں معاف فرمادے۔''

حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کے دست حق پرست پر لاکھوں ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ آپ کا مزار پُرانوار بندرگاہ دیوحل (بنگال) میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ میں بہت گہری دوستی تھی۔ روایت ہے کہ ایک دن حضرت بابا فریدؒ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کو خط لکھ رہے تھے۔ خط کی ابتداء سے پہلے آپ نے سوچا کہ حضرت شیخؒ کو کس لقب سے مخاطب کیا جائے۔ بہت دیر تک غور وفکر کرنے کے باوجود کوئی مناسب لقب سمجھ میں نہ آیا تو حضرت بابا فریدؒ نے آسمان کی طرف نظر کی۔ روشن حروف میں صاف تحریر تھا۔ ''شیخ الاسلام'' حضرت بابا فریدؒ، حضرت بہاء الدین زکریاؒ کو اسی لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

روایت ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ تنہا سفر بہت کم کرتے تھے۔ آپ کا زیادہ تر وقت حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کی صحبتوں میں گزرا ہے۔

حضرت بابا فریدؒ فرماتے ہیں۔ ''ایک بار سلطان شمس الدین التمش کے دربار میں کئی علماء اور مشائخ موجود تھے۔ ان حضرات نے متفقہ طور پر شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریاؒ سے سوال کیا۔

''شیخ! انسان کی نظر کیمیا کیسے ہوسکتی ہے؟''

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ ان علماء کے سوال کا جواب دینے کے بجائے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''بابا فرید! آپ بازار جائیں اور آپ کو جو غلام سب سے زیادہ مجہول نظر آئے اسے خرید لائیں۔'' یہ کہہ کر آپ نے اپنے پیرہن کی جیب سے سونے کا ایک ٹکڑا نکالا اور میرے حوالے کردیا۔

میں فرمان شیخ کے مطابق بازار گیا اور ایک ایسا غلام خرید لایا جو شکل وصورت کے اعتبار سے تمام غلاموں میں سب سے زیادہ احمق نظر آرہا تھا اور عقیدے کے لحاظ سے غیر مسلم تھا۔

حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ نے اس غلام کو اپنے سامنے بٹھایا اور کلمۂ شہادت کی تلقین کی۔ غلام نے باآواز بلند توحید اور رسالت پر گواہی دی اور مسلمان ہوگیا۔

قبول اسلام کے بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اس نومسلم غلام کی پشت پر ایک تھپکی دی اور فرمایا۔

''یہ علماء حضرات تجھ سے جس علم کے بارے میں سوال کریں، تو انہیں جواب دے۔''

غلام نے نظر اُٹھا کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی طرف دیکھا اور نہایت مؤدبانہ لہجے میں عرض کیا۔ ''جو مخدوم کا حکم؟''

سلطان شمس الدین التمش اور دوسرے علمائے دربار نے بڑی حیرت سے غلام کو دیکھا، یکایک اس کے چہرے میں ایک عجیب سی تبدیلی آگئی تھی۔

''اور تو بھی ان حضرات سے سوال کر کہ میں نے تجھے اپنی طرف سے مناظر مقرر کیا ہے۔'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے غلام کو دوسری ہدایت دی۔

شیخ الاسلام کا حکم سن کر غلام سیدھا ہوگیا اور علماء سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''فرمایئے! آپ جو سوال

کریں گے، انشاء اللہ اس کا شافی جواب پائیں گے۔"

علماء نے پے در پے اس غلام سے کئی مشکل سوالات کئے مگر وہ بڑی روانی کے ساتھ جواب د[illegible] رہا۔ علماء پر شدید استعجاب کی کیفیت طاری تھی۔ ایک ناخواندہ اور غیر مہذب غلام نے بڑے بڑے عقدوں کو سلجھا دیا تھا۔ آخر علماء خاموش ہو گئے۔

پھر ایک مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد غلام نے وہاں موجود سارے علماء سے ایک سوال کیا۔ سلطان شمس الدین التمش کو اُمید تھی کہ ہندوستان کے یہ صاحبان نظر ایک لمحے میں سوال کا جواب دے کر اس غلام کو عاجز کر دیں گے...... مگر اس وقت فرمانروائے ہند کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب تمام اہل دانش حیرت سے غلام کا منہ تکتے رہے۔

"اچھا! اب آپ ہی اس سوال کا جواب ارشاد فرمائیے۔" بالآخر ایک عالم نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

غلام نے بڑے شائستہ اور عالمانہ لہجے میں اس طرح سوال کا جواب دیا کہ تمام علماء مطمئن ہو گئے۔

اس مرحلے سے گزرنے کے بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ "آپ حضرات اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے ہیں کہ انسان کی نظر اس طرح کیمیا کا اثر دکھاتی ہے۔"

"بے شک!" تمام علماء نے بیک زبان کہا۔ "اسی کو نگاہ کیمیا کہتے ہیں۔"

حضرت امیر خسروؒ نے اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی شان میں ایک منقبت کہی تھی۔ جس کا یہ مصرع سات صدیاں گزر جانے کے بعد بھی برصغیر پاک و ہند کے گلی کوچوں میں گونج رہا ہے۔

"چھاپ تلک سب چھین لی، مو سے نیناں ملائے کے"

یہ مردِ مومن کی اسی نگاہِ کیمیا اثر کی طرف اشارہ ہے۔

روایت ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے دست حق پرست پر مسلمان ہونے والا وہ غلام کئی سال تک دہلی میں درس دیتا رہا۔ بڑے بڑے علماء اس کے درس میں شریک ہوتے تھے اور سر جھکائے بیٹھے رہتے تھے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کی روایت ہے کہ ایک بار جامع اُمیہ (دمشق) میں اہل [illegible] مجلس آراستہ تھی۔ پانچ سو کے قریب مشائخ موجود تھے اور عشق کے موضوع پر نہایت لطیف اور [illegible] گفتگو ہو رہی تھی۔ اتنے میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ تشریف لے آئے۔ حضرت بابا فرید[illegible] آپ کے احترام میں اپنی نشست سے اُٹھے اور پھر حضرت شیخؒ کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ [illegible] دیگر مشائخ عشق کے بارے میں اپنے اپنے تجربات اور مشاہدات بیان کرتے رہے۔ جب مجلس عرفاں پر سکوت طاری ہو گیا تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے عشق کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔

"صاحبو! عشق میں ہر شخص کے تجربے نئے نئے اور جدا جدا ہیں...... مگر حقیقی عشق اسی کو کہتے ہیں کہ عارف حق تعالیٰ کے سوا کسی کو نہ دیکھے۔ جنت و دوز، عذاب و ثواب اور مال و منال واصلین حق کے نزدیک......"

ابھی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے تھے کہ آپ پر حیرت طاری ہو گئی۔ پھر آپ یہ رباعی پڑھتے ہوئے اپنی نشست سے کھڑے ہو گئے۔

آں کس کہ شناخت جاں راچہ کند
فرزند و عیال و خانماں راچہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بدہی
دیوانہ تو ہر دو جہاں راچہ کند

(جو تجھے پہچان گیا ہے وہ اس جان کا کیا کرے گا...... بیوی بچوں اور گھر کا کیا کرے گا...... تو نے اسے اپنا دیوانہ بنا کر دونوں جہان بخش دیئے...... مگر تیرا دیوانہ دونوں جہان کا کیا کرے گا)

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ مذکورہ رباعی بار بار پڑھتے تھے اور بے تابانہ رقص فرماتے۔ پھر اہل مجلس کا یہ حال ہوا کہ ان کے سینوں میں دبی ہوئی عشق کی چنگاری بھڑک اُٹھی اور وہ بھی بے اختیار رقص کرنے لگے۔

حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ فرماتے ہیں کہ ملتان سے ایک بزرگ میرے پاس تشریف لائے۔ ان کا بیان ہے کہ وہ ایک روز حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی خدمت میں حاضر تھے۔ اس وقت حضرت شیخؒ پر شوق کا غلبہ تھا۔ آپ سر بہ سجدہ ہو کر فرماتے تھے۔

"عشق اندر آیا۔ پھر اس نے اپنے سوا باقی سب کو نکال دیا۔ یہاں تک ہمارا نشان بھی مٹا دیا۔"

ان بزرگ کا کہنا ہے کہ میں نے شمار کیا تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ ٹھیک سو بار سجدے میں گئے اور ہر بار یہی فرمایا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

ایک بار حضرت بابا فریدؒ اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ پرانے بغداد کی "مسجد کیف" میں تشریف فرما تھے اور چند بزرگ عشق کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے کہا۔

"عشق ایک سلطنت ہے جس کا دارالحکومت "شوق" ہے۔ تخت کے اوپر "رضا" کے ہاتھ میں نرگس وصال کی ایک شاخ ہے جس پر تیغ ہجر اور خنجر فراق کا پہرہ ہے۔ اگر کوئی عاشق اِدھر کا رخ کرتا ہے تو اس پر خنجر اور تلوار کے وار شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی کو ایک لمحہ بھی وصال کا میسر آ جائے تو ان تلواروں اور خنجروں سے سیکڑوں اسرار منکشف ہوتے ہیں۔ پس! اے دوستو! جسے دولت عشق حاصل ہے، ہزار بار اس کی گردن کاٹی جائے، وہ اُف تک نہیں کرے گا۔"

یہ سنتے ہی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے ایک آہ سرد کھینچی اور نہایت رقت آمیز لہجے میں یہ رباعی پڑھی۔

دریاد تو اے دوست چناں مدہوش شم
صد تیغ اگر زنی سر نہ خرو شم!!
آہے کہ زنم بیاد تو وقت سحر
گر ہر دوجہاں ہند واللہ نہ فروشم!

(اے دوست! میں تیری یاد میں اس قدر مدہوش ہوں......اگر مجھ پر سیکڑوں تلواریں کھینچی جائیں تب بھی میں سر نہ اُٹھاؤں......میں صبح کے وقت تیری یاد میں جو آہ بھرتا ہوں......اگر اس کے بدلے میں مجھے دونوں جہان بھی دے دیئے جائیں تو میں اسے فروخت نہ کروں)

یہ اشعار سنتے ہی حاضرین مجلس پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ بعض صاحبان دل کسی بسمل کی طرح تڑپنے لگے جیسے نادیدہ شمشیر عشق نے ان کے جسموں کو زخموں سے بھر دیا ہے۔

جو لوگ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی ظاہری امارت دیکھ کر یہ سمجھتے تھے کہ حضرت شیخؒ کو کوئی غم نہیں ہے اور آپ ایک آسودہ زندگی گزار رہے ہیں، انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ کوچۂ عشق کا کوئی مسافر کسی بھی حال میں بے نیاز غم نہیں رہ سکتا۔ عشق تو نام ہی سوز مسلسل اور گریہ پیہم کا ہے۔ عشق میں آسودگی تو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب محبوب عاشق کو دائمی قربت کا اعزاز بخش دے۔ اطمینان و آسودگی کا یہ اصول عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں پر صادق آتا ہے۔ چونکہ عشق حقیقی میں محبوب کا دیدار اور قربت روز محشر سے مشروط ہے، اس لئے اس راستے کا مسافر زندگی بھر تڑپتا ہی رہتا ہے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا بھی یہی حال تھا کہ محل جیسے مکان میں رہنے والا یہ بوریا نشین درویش چپ چاپ کس آگ میں جل رہا ہے؟

ایک بار حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ مکاشفے کے عالم میں تھے۔ آپ نے بندگان خدا کو سخت اذیت میں مبتلا دیکھا تو آپ پر شدید خوف طاری ہوگیا......اور ایسی اضطراری کیفیت میں حضرت شیخؒ نے اپنے حجرے کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر خانقاہ کے خدمت گاروں نے گریہ وزاری کی صدائیں سنیں۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کئی دن تک توبہ و استغفار کرتے رہے۔ اہل خانہ اور خدمت گار بہت پریشان تھے۔ کئی بار حجرۂ مبارک کے دروازے پر دستک دی گئی مگر حضرت شیخؒ نے کوئی توجہ نہیں دی۔ آخر تمام عقیدت مندوں اور خاندان کے لوگوں نے حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ سے درخواست کی۔ حضرت شیخ رکن الدینؒ اس وقت بہت کم سن تھے۔ آپ نے حجرۂ مبارک کے سامنے کھڑے ہو کر باآواز بلند فرمایا۔

''دادا جان! دروازہ کھول دیجئے۔''

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اپنے پوتے حضرت شیخ رکن الدینؒ سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ آپ نے یہ معصوم آواز سنی تو حجرۂ مبارک کا دروازہ کھول دیا۔ عقیدت مندوں اور خدمت گاروں نے دیکھا۔ روتے روتے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی آنکھیں سوج گئی ہیں اور رخساروں پر زخم پڑ گئے ہیں۔ مریدوں اور خدمت گاروں نے یہ صورتحال دیکھ کر عرض کیا۔ ''مخدوم! آخر اس گریہ وزاری کا

سبب کیا ہے؟''

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ ''میں مکاشفے کے عالم میں تھا کہ ناگہاں میری آنکھوں نے ایک دل دہلا دینے والا منظر دیکھا۔ بہاء الدین نامی ایک شخص تھا جس کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے بہت قصے مشہور تھے۔ پھر جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی ساری ریاضت اس کے منہ پر ماردی گئی۔ فرشتوں نے پکار کر کہا۔

''بہاء الدین! آج حق تعالیٰ کی بارگاہ میں تیرا کوئی عمل بھی مقبول نہیں۔ تیرے ہاتھ بھی خالی ہیں اور تیرا دامن بھی۔ بس ناکامی و محرومی تیرا مقدر ہے۔''

''یہ دیکھ کر مجھ پر ناقابل بیان خوف طاری ہوگیا۔ میں اس لئے روتا ہوں کہ مجھے بھی اپنا انجام معلوم نہیں۔ بس! ایک یوم جزا کی پناہ مانگتا ہوں۔ پتا نہیں کہ اس فقیر بہاء الدین کے ساتھ حشر میں کیا سلوک کیا جائے گا۔''

یہ تھا وہ سوز عشق جو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو راتوں کی تنہائی میں اس قدر رلایا کرتا تھا کہ کبھی کبھی آپ کے رخسار مبارک زخموں سے بھر جاتے تھے۔

☆☆......☆☆......☆☆

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ فرمایا کرتے تھے۔ ''میرے پاس جو کچھ ہے وہ نماز کا صدقہ ہے اور مجھے جو کچھ حاصل ہوا ہے، وہ نماز کے ذریعے حاصل ہوا ہے۔''

ایک اور موقع پر حضرت شیخؒ نے اپنی زندگی کا ایک اہم ترین راز بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میں نے بڑے بڑے مشائخ کے جملہ وظائف کا ورد کیا مگر مجھ سے ختم قرآن نہ ہو سکا۔''

حاضرین مجلس نے بڑے تعجب کے ساتھ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے اس ارشاد گرامی کو سنا۔ پھر ایک عقیدت مند نے سر مجلس عرض کیا۔ ''مخدوم! آپ تو حافظ قرآن ہیں۔ ہزاروں بار کلام الٰہی کا ختم کر چکے ہیں۔''

''بات یوں نہیں ہے جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو۔'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے جواباً فرمایا۔ ''دراصل معاملہ اس طرح تھا کہ مجھ سے فلاں بزرگ کے بارے میں کہا گیا جو صبح صادق سے طلوع آفتاب تک ختم قرآن کر لیتے تھے۔ میں نے بہت کوشش کی مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔''

''حضرت! اتنے مختصر وقت میں یہ ممکن بھی نہیں ہے۔'' دوسرے عقیدت مند نے عرض کیا۔

''یہ عمل فقیر بہاء الدین کیلئے ممکن نہ ہو مگر خاصان خدا کے لئے بہت سہل ہے۔'' حضرت شیخؒ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے فرمایا۔ ''قاضی حمید اللہ رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد گرامی ہے کہ وہ ایک بار طواف کعبہ میں مصروف تھے۔ ان کے آگے ایک اور بزرگ بھی طواف کر رہے تھے، قاضی حمید الدینؒ نے ان کی متابعت شروع کر دی۔ جس جگہ وہ بزرگ قدم رکھتے تھے، حضرت قاضی حمید الدین بھی اسی جگہ قدم رکھتے تھے۔ تھوڑی دیر تک یہ عمل جاری رہا۔ آخر ان مرد روشن ضمیر پر قاضی حمید الدینؒ کی نیت کا حال ظاہر ہو گیا۔ فرمانے لگے۔

"اے مسافرِ عشق! تو میرے ظاہری عمل کی متابعت کیوں کرتا ہے؟ اس عمل کی تقلید کیوں نہیں کرتا جسے میں بطور خاص کیا کرتا ہوں؟"

"حضرت! آخر وہ کون سا عمل ہے؟" قاضی حمید الدینؒ نے حیرت سے عرض کیا۔

"میں سات سو قرآن شریف روزانہ ختم کرتا ہوں۔" بزرگ نے فرمایا۔

قاضی حمید الدینؒ خاموش ہو گئے اور سوچنے لگے کہ وہ بزرگ قرآن شریف کے معانی پر غور کرتے ہوں گے ورنہ ترتیل کے ساتھ کلام الٰہی کو ایک دن میں سات سو بار پڑھنا انتہائی طاقت سے باہر ہے۔

پھر ایک دن یہی روایت حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنی مجلس وعظ میں بیان فرمائی تو حضرت محبوب الٰہی کے ایک خاص مرید میاں اعزاالدین علی شاہؒ نے عرض کیا۔

"حضرت! یہ ان بزرگ کی کرامت ہوگی ورنہ یہ کام طاقت بشری سے باہر ہے۔"

جواب میں حضرت نظام الدین اولیاء نے فرمایا۔ "بے شک! یہ ان کی کرامت تھی۔ جس معاملے میں عقل انسانی عاجز ہو، اسی کو کرامت کہتے ہیں۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے بارہا ایک رات میں قرآن شریف ختم کیا تھا۔ ایک دن آپ کی مجلس میں عقیدت مندوں، خدمت گاروں اور احباب کا اجتماع تھا۔ حضرت شیخؒ نے ان حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "کیا یہاں ایسا کوئی شخص ہے کہ آج کی رات دو رکعت میں کلام الٰہی ختم کرے؟"

حاضرین نے معذرت پیش کی تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ "آیئے! آج کی رات یہ سعادت حاصل کریں۔"

یہ کہہ کر حضرت شیخؒ نے دو رکعت نماز کی نیت باندھ لی۔ پھر ایک رکعت میں پورا قرآن حکیم ختم کیا بلکہ مزید چار پارے پڑھے، پھر دوسری رکعت میں سورۂ اخلاص پڑھ کر نماز تمام کی۔

اس قسم کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے سخت ترین ریاضتیں کی تھیں اور پھر ان ہی مجاہدات نے آپ کو روحانیت کے اعلیٰ مقام تک پہنچایا تھا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

ایک زمانہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی روحانی عظمتوں کا قائل تھا مگر پھر بھی کچھ تنگ نظر لوگ اپنے فطری حسد کے سبب آپ کی کرامات کے منکر تھے۔ ایک بار شہر کا حاکم رمضان المبارک کے مہینے میں حاضر خدمت ہوا اور عرض کرنے لگا۔

"شیخ! کرامت کسے کہتے ہیں؟"

"جو بات عادت کے خلاف ہو، اسے تصوف کی زبان میں کرامت کہا جاتا ہے۔" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے جواباً فرمایا۔ "مثال کے طور پر آگ کی فطرت جلانا ہے۔ اگر آگ کسی شے کو جلانے سے قاصر رہے تو یہ اس شخص کا روحانی تصرف ہوگا جس کی ریاضت کی تاثیر سے آگ کی فطرت تبدیل ہو گئی۔"

"یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی شخص کے روحانی عمل سے آگ کا مزاج بدل جائے۔" حاکم ملتان نے جرح کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو صرف پانی کی تاثیر ہے کہ وہ آگ کو بجھا سکتا ہے۔"

"انسانی ریاضت میں اس سے بھی زیادہ اثر ہے۔" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ "اس کائنات میں جو کچھ ہے، حکم خداوندی ہے۔ اس کے حکم سے آگ بھڑکتی ہے اور اسی کے حکم سے بجھ جاتی ہے۔ جب بندہ ریاضت کی مختلف منازل طے کر کے اپنے اللہ کی رضا حاصل کر لیتا ہے تو اسے انعام قدرت کی طرف سے روحانی طاقت بخش دی جاتی ہے...... اور پھر یہی طاقت بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کیلئے پانی سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔"

"شیخ! آپ کی یہ دلیل انسانی عقل سے بعید ہے۔ اس لئے میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔" حاکم ملتان نے کج روی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ دراصل وہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی آزمائش کیلئے آیا تھا۔

"میں کسی انسان کو مجبور نہیں کر سکتا مگر امر واقعہ یہی ہے۔" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے مزید بحث سے گریز کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں کسی ولی کی کرامت کا قائل نہیں ہوں۔" حاکم ملتان کا لہجہ گستاخانہ تھا۔ "یہ سب دکانداری کی باتیں ہیں۔ پیر ہوا میں نہیں اُڑتے مگر مرید اُنہیں اُڑاتے ہیں۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے سکوت اختیار کیا۔

حاکم ملتان نے اولیاء اللہ کے بارے میں مزید بے سروپا گفتگو شروع کر دی۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا مگر آپ نے رسم میزبانی نبھاتے ہوئے مہمان کے اس طرز عمل کو برداشت کیا۔

پھر جب حاکم ملتان مسلسل اولیائے کرام کی نفی کرتا رہا تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو جلال آ گیا۔ آپ نے اپنے گستاخ مہمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "آج تم اور تمہارے مصاحب ہمارے ساتھ روزہ افطار کریں گے۔"

اس کے بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اپنے چند خدمت گاروں کو طلب کر کے فرمایا۔ "پورے شہر میں منادی کرا دو کہ فقیر بہاء الدین سب لوگوں کے ساتھ افطاری کرے گا اور تمام روزے دار اپنے گھروں میں مقیم رہیں۔"

حاکم ملتان نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی طرف بڑی حیرت سے دیکھا۔ "شیخ! آپ تو ہمارے ساتھ روزہ افطار کریں گے۔ پھر اس اعلان کا کیا مفہوم ہے؟"

"وقت کا انتظار کرو۔ حق تعالیٰ سب کچھ ظاہر کر دے گا۔" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے۔

پھر افطاری کی ساعت آئی تو حضرت شیخؒ نے حاکم ملتان کے ساتھ افطار کیا۔

حاکم ملتان اسی لمحے کے انتظار میں تھا۔ اس نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے ساتھ استہزا

کرتے ہوئے کہا۔ ''شیخ! آپ نے ان روزہ داروں کو کس لئے دھوکے میں رکھا؟''

''مردانِ خدا کسی کو فریب نہیں دیتے۔'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ''اب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کرامت کسے کہتے ہیں اور اولیاء اللہ کون ہیں؟'' یہ کہہ کر حضرت شیخ نمازِ مغرب ادا کرنے کیلئے تشریف لے گئے۔

پر جب حاکم ملتان نے اپنے آدمیوں کے ذریعے تحقیق کرائی تو اس پر عجیب راز منکشف ہوا کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے ملتان کے سیکڑوں مسلمانوں کے ساتھ روزہ افطار کیا تھا۔ تذکرہ نگاروں نے حاکم ملتان کا نام تحریر نہیں کیا مگر غالب گمان یہی ہے کہ ناصر الدین قباچہ نے اولیاء اللہ کی کرامت سے انکار کیا تھا مگر جب اس نے حضرت شیخؒ کا یہ تصرف روحانی دیکھا تو اس بات کا قائل ہو گیا۔

اولیا را ہست قدرت ازالہٰ
تیر جستہ باز گردانندز راہ
(مولانا روم)

(اولیاء کو اللہ کی طرف سے یہ قدرت دی جاتی ہے کہ وہ کمان سے چھوٹے ہوئے تیر کو واپس لا سکتے ہیں)

''آگ اور اس کی فطرت'' کے حوالے سے نامور صوفی بزرگ حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ کا یہ واقعہ ایک خاص شہرت رکھتا ہے۔ روایت ہے کہ ایک بار ایک فلسفی حضرت شیخ اکبرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ شخص خوارق عادات اور انبیائے پاک علیہم السلام کے معجزات کا منکر تھا۔ جاڑوں کا موسم ہونے کی وجہ سے حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی مجلس میں انگیٹھی جل رہی تھی۔ فلسفی نے دہکتے ہوئے کوئلوں پر نظر کی اور حضرت شیخ اکبرؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''عام لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آتش نمرود میں ڈالا گیا مگر بھڑکتی ہوئی آگ اُنہیں جلانے سے قاصر رہی تھی۔ میری نظر میں یہ روایت غلط ہے کیونکہ آگ کا کام جلانا ہے اور کسی شے کی فطرت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔''

''روایت بھی درست ہے اور آگ کی فطرت کو بدلا بھی جا سکتا ہے۔'' حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے فرمایا۔ ''اللہ خالق ہے اور فطرت مخلوق۔ پس خالق جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ اسے روکنے والا کوئی نہیں۔''

''میں آپ کی اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتا۔'' فلسفی نے فخر و غرور کے لہجے میں کہا۔ ''اس واقعے کو سمجھنے میں کم علم لوگوں سے غلطی ہوئی۔ قرآن حکیم میں جس آگ کا ذکر ہے، دراصل وہ نمرود کے غضب کی آگ ہے...... اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے سے مراد ہے کہ نمرود سخت جھنجھلایا اور غصے سے سرخ ہو گیا۔'' فلسفی اپنے علم کے زعم میں مشہور قرآنی واقعے کی عجیب و غریب تاویل پیش کر رہا تھا۔ ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نہ جلنے سے مراد یہ ہے کہ آپ اپنی دلیل و حجت سے نمرود کو

جواب آگئے تھے اس لئے اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔''

فلسفی نے اپنی پُر زور تقریر ختم کی تو حاضرین مجلس نے حضرت محی الدین ابن عربیؒ کی طرف دیکھا کہ شیخ اکبرؒ فلسفی کی دلیل کو کس طرح رد کرتے ہیں؟''

حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر آپ نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ''کیا تم اس قرآنی واقعے کا انکار کرتے ہو؟''

''مسئلہ واقعے کی صحت سے انکار کا نہیں ہے۔'' فلسفی نے فلسفیانہ موشگافی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''بات آگ اور اس کی فطرت کے بارے میں ہو رہی ہے اگر قرآن کی مراد حقیقی آگ سے ہے تو میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔''

''قرآن پاک میں جس آگ کا ذکر ہے، وہ حقیقی آگ تھی جسے نمرود کے آدمیوں نے مسلسل کئی روز تک بھڑکایا تھا۔'' حضرت شیخ اکبرؒ نے پُر جوش لہجے میں فرمایا۔ ''تم اتنی دور کیوں جاتے ہو؟ میں تمہیں اسی جگہ مشاہدہ کرائے دیتا ہوں کہ آگ کیا ہے اور اس کی فطرت کیا ہے؟''

''شیخ! کیوں میرا اور اپنا وقت ضائع کرتے ہو؟'' فلسفی نے انتہائی تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

حاضرین مجلس بھی حیران تھے کہ آخر شیخ اکبرؒ فلسفی کو کس طرح مشاہدہ کرائیں گے؟

ابھی لوگ اسی ذہنی کشمکش کا شکار تھے کہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے کوئلوں سے بھری ہوئی انگیٹھی کو اُٹھا کر اپنے قریب کر لیا۔ پھر فلسفی سے کہا۔ ''کیا یہ وہی آگ ہے جس کے متعلق تمہارا دعویٰ ہے کہ جلانے کی خاصیت رکھتی ہے۔''

''یقیناً یہ وہی آگ ہے۔'' فلسفی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تک حضرت شیخ اکبرؒ کے دعوے کو محض ایک مذاق سمجھ رہا تھا۔

حضرت محی الدین ابن عربیؒ نے انگیٹھی اُٹھا کر فلسفی کے دامن میں اُلٹ دی۔ فلسفی گھبرا کر پیچھے ہٹا مگر جب اس نے دیکھا کہ انگاروں سے نہ کپڑے جلتے ہیں اور نہ جسم کو حرارت محسوس ہوتی ہے تو وہ حیرت سے شیخ اکبرؒ کی طرف دیکھنے لگا۔

حضرت محی الدین ابن عربیؒ انگاروں کو اُلٹتے پلٹتے رہے۔ پھر آپ نے ان انگاروں کو اس طرح فلسفی کے سر پر ڈال دیا جیسے پھول نچھاور کئے جا رہے ہوں۔ فلسفی نے بھی ڈرتے ڈرتے انگاروں کو چھونے کی کوشش کی اور پھر وہ حیران رہ گیا کہ دہکتی ہوئی آگ اپنی تاثیر کھو چکی تھی۔

حضرت شیخ اکبرؒ نے بکھرے ہوئے انگاروں کو دوبارہ انگیٹھی میں بھر دیا، پھر فلسفی سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''اب تم اس آگ کو چھو کر دیکھو؟''

فلسفی چند لمحات پہلے ہی آگ کو چھو کر دیکھ چکا تھا، اس لئے بلا جھجک ہو کر اس نے اپنا ہاتھ انگیٹھی کی طرف بڑھایا۔ ابھی وہ انگاروں کو چھونے بھی نہیں پایا تھا کہ آگ کی حرارت سے اس کا ہاتھ جلنے لگا۔ فلسفی نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''شیخ! یہ کیا ماجرا ہے؟ ابھی کچھ دیر قبل میں نے انگاروں کو چھو کر دیکھا تھا، وہ کسی پتھر کی طرح سرد

تھے......مگر اب اتنی دور سے میرے ہاتھ کو جلائے دے رہے ہیں؟" فلسفی بدحواسی کے عالم میں شیخ اکبرؒ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اس وقت میں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ اپنے اس منکر کو عاجز کردے۔" حضرت محی الدین ابن عربیؒ نے پُرسوز لہجے میں فرمایا۔

"پھر اب یہ کیا ہے؟" فلسفی کی حیرت بدستور تھی۔

"اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ اللہ کا حکم ہی سب کچھ ہے۔" حضرت شیخ اکبرؒ نے فرمایا۔ "آگ بھی اپنے خالق کے حکم سے اشیاء کو جلاتی ہے اور اسی کے حکم سے اپنا اثر کھو بیٹھتی ہے۔"

روایت ہے کہ اس واقعے کے بعد وہ فلسفی خدائے واحد پر ایمان لے آیا۔

☆☆............☆☆............☆☆

حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریاؒ نے درویشی کے ستر ہزار علوم طے کر لئے تھے اور ان تمام پر اپنے عمل کو حد کمال تک پہنچا دیا تھا۔ انہیں اس قدر روحانی قوت حاصل ہو چکی تھی کہ اگر آسمان کی جانب نظر اُٹھاتے تو عظمت عظیم کا مشاہدہ کرتے......اور اگر زمین کی طرف دیکھتے تو تحت الثریٰ تک کی چیزیں دکھائی دینے لگتیں......مگر حضرت شیخ بار بار یہی فرماتے تھے کہ درویشی کا مرتبہ اس سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے۔ اگر اہل مجلس کے سامنے کہہ ڈالوں تو سننے والوں کا زہرہ آب ہو جائے یہ تو درویشی کا ادنیٰ درجہ ہے۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اظہار کرامت کو ناپسند فرماتے تھے۔ مریدوں کو بھی یہی حکم تھا کہ حق تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں کا اس طرح کھلے عام مظاہرہ نہ کریں۔ اس سلسلے میں آپ خود بھی بہت محتاط رہتے تھے۔ ایک بار حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے ہمراہ سفر میں تھے۔ شام کے وقت دونوں بزرگوں کا گزر ایک ایسے علاقے سے ہوا جو لٹیروں اور ڈاکوؤں کا مسکن تھا۔ دریا کے پار شہری آبادی تھی مگر اتفاق سے وہاں کوئی کشتی موجود نہیں تھی۔ حضرت بابا فریدؒ نے اللہ کا نام لے کر دریا میں قدم رکھ دیا اور سطح آب پر چلنے لگے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو اس طرح دریا پار کرنے پر تامل ہوا۔ حضرت بابا فریدؒ بذریعۂ کشف آپ کی اس کیفیت سے آگاہ ہو گئے۔

"برادر عزیز! یہ مقام بے حد خطرناک ہے۔ قزاقوں کا ٹھکانا ہے۔ یہاں کرامت کے اظہار میں کوئی حرج نہیں۔ بلا تکلف چلے آیئے۔"

یہ سن کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے بھی سطح آب پر قدم رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے دریا عبور کر گئے۔

"اسرار الاولیاء" کی روایت ہے کہ ایک بار حضرت بابا فریدؒ کو اطلاع ملی کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے مسلسل کرامات کا اظہار ہو رہا ہے۔ آپ نے فوراً حضرت شیخؒ کے نام ایک مکتوب تحریر کیا۔

"اے درویش! یہ کیا نادانی ہے کہ دوست کے رازوں کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہ بات اہلِ اسرار کیلئے مناسب نہیں۔"

جواب میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے تحریر فرمایا۔ "برادر عزیز! کام گفتگو کے مرحلے سے گزر گیا۔ میرا سینہ اسرار محبوب سے اس قدر بھر چکا ہے کہ ذرہ بھر بھی جگہ خالی نہیں رہی۔ اس لئے وہ انوار و اسرار جو تجلی کرتے ہیں وہ خود بخود ظاہر ہو جاتے ہیں۔ میرے بھائی! میں تو بہت کوشش کرتا ہوں کہ ہر راز کو محفوظ رکھوں مگر اب یہ بات میرے اختیار میں نہیں رہی۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ میں کیا کروں؟"

جب حضرت بابا فریدؒ نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا خط پڑھا تو سر جھکا لیا، پھر نہایت پُراثر لہجے میں فرمایا۔ "ہمارے یار نے اپنا کام انجام تک پہنچا دیا۔"

☆☆............☆☆............☆☆

ایک بار روم سے عبداللہ نامی درویش ملتان میں آیا۔ چند روزہ قیام کے بعد ہی ہر طرف اس کی کرامات کا چرچا ہونے لگا۔ جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو اس واقعے کا علم ہوا تو آپ نے بے اختیار فرمایا۔

"یہ شعبدہ باز کہاں سے آ گیا؟"

پھر ایک دن حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ بہ نفس نفیس عبداللہ رومیؒ کی خانقاہ میں تشریف لے گئے۔ عبداللہ رومی پر حضرت شیخؒ کی اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ وہ کھڑے ہو گئے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے انہیں بیٹھ جانے کیلئے کہا اور خود بھی تشریف فرما ہو گئے۔ کچھ دیر تک رسمی گفتگو کرنے کے بعد حضرت بہاء الدین زکریاؒ نے عبداللہ رومیؒ سے فرمایا۔

"آپ کی کرامات کا بہت شہرہ ہے۔ میں نے سوچا کہ ایک مرد خدا کی دیدار کی سعادت حاصل کر لوں۔"

عبداللہ رومیؒ بہت خوش ہوئے۔

پھر کچھ دیر بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ "میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں کہ ایک مرد خدا نماز کس طرح ادا کرتا ہے؟"

عبداللہ رومیؒ احساس فخر کے ساتھ نماز پڑھنے کیلئے کھڑے ہو گئے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے دیکھا کہ عبداللہ رومیؒ کے قدموں کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے۔

"مجھے اندازہ تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے عبداللہ رومیؒ کو نماز پڑھتے دیکھ کر زیر لب فرمایا۔ "جس شخص کی کرامات کا شہرہ پورے ملتان میں ہے، وہ صحیح طور پر نماز بھی ادا نہیں کر سکتا۔"

پھر جب عبداللہ رومیؒ نماز ادا کر چکے تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے تنہائی میں فرمایا۔ "شیخ! اہل نظر تمہیں دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟ نماز پڑھتے ہو مگر اس کی ترکیب ظاہری درست

نہیں رکھتے۔"

عبداللہ رومیؒ نے حیرت سے حضرت شیخؒ کی طرف دیکھا۔ پھر جب حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ نے اپنی بات کی وضاحت کی تو عبداللہ رومیؒ سخت نادم ہوئے۔

"آپ کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اوچ تشریف لے جایئے۔" حضرت شیخؒ نے اس شخص کو مخاطب کر کے فرمایا جو اپنے کسی عمل کے ذریعے شعبدہ بازی کے چند گوشوں پر حاوی ہو گیا تھا اور جن کے ذریعے وہ کم فہم لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا کرتا تھا۔ نتیجتاً ملتان میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ عبداللہ رومیؒ ایک صاحب کرامات بزرگ ہیں۔

میں ذاتی طور پر ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جو اپنی ریاضت اور مشق کے ذریعے بڑے بڑے شعبدے دکھاتے ہیں مگر ان کی اس کرتب بازی کو کرامت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ شاہی بازار ٹھٹھہ میں سومار نام کے ایک صاحب تھے جو بڑے عجیب عجیب تماشے دکھاتے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کراچی اور دیگر شہروں کے بڑے بڑے رئیس سومار بابا کے دروازے پر کھڑے ہوتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ سائل سوال کرتا تھا اور جواب دیوار سے آتا تھا۔ بعض لوگوں کے بقول کوئی مؤکل ان کے تابع تھا جو لوگوں کے جواب دیا کرتا تھا۔ بہر حال سومار بابا دنیا میں نہیں رہے مگر اس واقعہ کے بہت سے گواہ آج بھی موجود ہیں۔

عبداللہ رومیؒ بھی کچھ اسی انداز کے ماہر فن تھے مگر یہ حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ کی نظر کرم تھی کہ ان کی دنیا کے ساتھ آخرت بھی سنوار دی۔ عبداللہ رومیؒ اوچ چلے گئے اور حضرت شیخؒ کی توجہ سے سلوک کی بڑی بڑی منازل طے کیں اور پھر منصب ولایت پر فائز ہو گئے۔ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ فرماتے ہیں۔

"حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ شریعت کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ آپ کے زمانے میں علی کھیری نام کا ایک شخص گزرا ہے جو درویشوں کے معاملے میں بڑا دریدہ دہن تھا۔ علی کھیری کی ایک خاص عادت تھی کہ وہ صوفیاء کی تلاش میں دربدر مارا مارا پھرتا تھا۔ لوگ اس سے پوچھتے تھے۔

"علی؟ آخر تجھے کس کی تلاش ہے؟"

"میں کسی درویش کو ڈھونڈتا ہوں۔" علی کھیری بڑے عجیب لہجے میں جواب دیتا۔

"تم اتنی خانقاہوں میں حاضری دے چکے ہو مگر تمہیں اب تک کوئی درویش نہیں ملا؟" لوگ علی کھیری سے سوال کرتے۔

"وہ لوگ عابد بھی ہیں اور زاہد بھی...... مگر ان میں کوئی درویش نہیں۔" علی کھیری بڑی بے باکی سے جواب دیتا۔

"پھر درویش کون ہوتا ہے؟" لوگ پوچھتے۔

"درویش وہ کہلاتا ہے جس کے سینے میں درد اور اشک ہوتا ہے۔" علی کھیری کا لہجہ دیہاتی تھا اس لئے وہ "عشق" کو "اشک" کہتا تھا۔

علی بھی بہت صاف گو تھے۔ وہ اس کے منہ پر ہی کہہ دیتے تھے۔ "تجھے ایسا درویش کہاں سے ملے گا جس کے سینے میں اشک ہو۔"

غرض اسی جستجو میں علی کھیری کے دن گزر رہے تھے۔ ایک روز کسی کی زبانی حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ کی تعریف سنی تو ایک دن علی کھیری آپ کی خانقاہ میں حاضر ہو گیا۔ علی کھیری کا ایک خاص انداز تھا کہ کسی بزرگ کو دیکھتے ہی کہہ دیا کرتا تھا کہ یہ دردِ عشق سے خالی ہے...... مگر جب اس نے حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ کو دیکھا تو بے اختیار بول اٹھا۔

"یہ بزرگ تو اشک سے بھرے ہوئے ہیں۔"

یہ پہلی خانقاہ تھی جہاں علی کھیری دل و جان کے ساتھ جھک گیا اور حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ سے درخواست کرنے لگا کہ حضرت شیخؒ اسے حلقۂ ارادت میں شامل فرما لیں۔

الغرض علی کھیری حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ کا مرید ہو گیا۔ حضرت شیخؒ نے اسے چند اوراد و وظائف تلقین کئے اور علی کھیری شہر سے باہر جا کر ایک حجرے میں مقیم ہو گیا۔

کچھ دن بعد حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ اپنے نئے مرید کی خبر گیری کیلئے اس حجرے کی طرف تشریف لے گئے۔ علی کھیری اپنے پیر و مرشد کی آمد پر بہت خوش تھے۔ حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ علی کھیری سے گفتگو کرنے لگے۔ بات چیت کے دوران علی کھیری نے مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھایا اور زمین پر زور سے مارا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مٹی کا ڈھیلا سونے کے ٹکڑے میں تبدیل ہو گیا۔

یہ منظر دیکھتے ہی حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ نے آنکھیں بند کر لیں اور بلند آواز سے تین بار یہ اسم الٰہی پڑھا۔

"یا غفور، یا غفور، یا غفور۔"

اس کے بعد حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ نے اپنے مرید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "علی! تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔" یہ کہہ کر حضرت شیخؒ واپس تشریف لے گئے مگر علی کھیری نے پیرو مرشد کی تلخی کو محسوس نہیں کیا۔

کچھ دن بعد حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ دوبارہ اپنے مرید سے ملنے کیلئے حجرے میں تشریف لے گئے۔ شام کا وقت تھا۔ علی کھیری نے چراغ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چراغ روشن ہو گیا۔ حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ کو اپنے مرید کا یہ عمل دیکھ کر سخت ملال ہوا۔

"علی! تو نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟" حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ نے انتہائی ناخوشگوار لہجے میں فرمایا۔

"شیخ! کیا تماشا؟" علی کھیری حضرت شیخؒ کی تنبیہہ کو مسلسل نظر انداز کر رہا تھا۔

حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ غصے میں کھڑے ہو گئے۔ "علی تجھے نفس امارہ نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔" یہ کہہ کر حضرت شیخؒ شدید ناراضی کے عالم میں واپس تشریف لے گئے۔

نفس امارہ اسے کہتے ہیں جو انسان کو گناہوں کی ترغیب دیتا ہے۔ حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ

نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔ حضرت شیخؒ کے جاتے ہی علی کھیری کی موجودہ حالت بدل گئی اور وہ طرح طرح کے مکروہات میں پھنس گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے ''جوع البقر'' کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ ''جوع البقر'' اس مرض کو کہتے ہیں جس میں انسان دن رات کھاتا رہتا ہے مگر اس کی بھوک نہیں مٹتی۔ علی کھیری بھی اس تکلیف دہ بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ پھر اس پر ایسی وحشت طاری ہوئی کہ نماز، مناجات اور اوراد و وظائف اور ذکر و فکر سب کچھ چھوٹ گیا، اگرچہ علی کھیری کے ان تمام امراض کا علاج ملتان ہی میں ہو سکتا تھا لیکن اس کی قسمت میں گردش و اضطراب لکھ دیا گیا تھا۔ وہ پیر و مرشد سے معافی مانگنے اور اس کے قدموں میں پڑے رہنے کے بجائے دوسرے بزرگوں کی خانقاہوں میں بھٹکنے لگا۔ علی کھیری کی عقل ماری گئی تھی، اس لئے مسیحا کا آستانہ چھوڑ کر نیم حکیموں کی دکانوں پر توجہ کی بھیک مانگنے لگا۔ اب اسے ملتا تو کیا ملتا اور دیتا تو کون دیتا؟

آخر اس دربدری کے عالم میں علی کھیری بنگال پہنچ گیا۔ جہاں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے پیر بھائی حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ قیام فرما تھے۔

علی کھیری نے رو رو کر حضرت شیخؒ کے سامنے سارا ماجرا بیان کیا اور اپنے حق میں دعا کی درخواست کی۔

حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ نے ایک راندۂ درگاہ شیخ کا حال سن کر فرمایا...... ''علی! میں تو بس تیری بد نصیبی اور کم عقلی پر ماتم ہی کر سکتا ہوں جس شخص کو اس کے مرشد کے قدموں میں پناہ نہ مل سکی اسے کسی غیر کے یہاں سائبان کیسے میسر آئے گا۔ شیخ کی ایک نگاہِ کرم کے سوا تیرا کوئی علاج نہیں۔''

علی کھیری پر وحشت و اضطراب طاری تھا۔ وہ حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا۔ بس ایک ہی التجا کرتا رہا۔ ''شیخ! میرے حق میں دعائے خیر فرما دیجئے ورنہ میں اسی طرح بھاگتے بھاگتے مر جاؤں گا۔''

''علی! یہ بہت نازک معاملہ ہے۔'' حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''جب تک حضرت شیخ الاسلام اجازت نہیں دیں گے، اس وقت تک میں تمہارے لئے دعا نہیں کر سکتا۔''

علی کھیری کو حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کے جواب سے سخت مایوسی ہوئی۔ وہ بے اختیار رونے لگا۔

حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ نے اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ ''ابھی وقت ہے، تم اپنے پیر و مرشد سے اجازت لے آؤ۔ پھر میں تمہارے لئے حق تعالیٰ سے عافیت طلب کروں گا۔''

''شیخ! بنگال سے ملتان تک کا سفر اتنا آسان ہے؟'' علی کھیری کی وحشت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ''اس قدر طویل اور دشوار گزار راستہ طے کرتے کرتے کہیں مجھے موت ہی نہ آ جائے۔''

''اگر تم کہو تو میں تمہارے لئے حضرت شیخ الاسلام سے اجازت طلب کر لوں؟'' حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ نے فرمایا...... ''اور یہ بھی صرف اس لئے ہے کہ تمہیں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے

نسبت خاص ہے۔''

حضرت سیّد جلالؒ کی بات سن کر علی کھیری کی جان میں جان آئی۔ ''شیخ! اگر ایسا ہو جائے تو میں عمر بھر آپ کا ممنون کرم رہوں گا۔''

''ممنون کرم ہونے کی بات چھوڑو۔'' حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ نے ناخوشگوار لہجے میں فرمایا۔ ''جب تم اسی ذات گرامی کے احسان مند نہیں ہوئے جس نے تمہیں سب کچھ عطا کیا تو پھر کسی کو کیا یاد رکھو گے۔ بس اپنی فکر کرو اور اس مہلت سے فائدہ اُٹھاؤ۔''

علی کھیری بڑی شدت کے ساتھ اپنی ندامت کا اظہار کرنے لگا۔

''اب یہ تمہاری قسمت ہے کہ تمہیں اجازت ملتی ہے یا دوبارہ اس بارگاہِ کرم سے خالی ہاتھ لوٹائے جاتے ہو؟'' حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ نے فرمایا۔

''شیخ! آپ کوشش تو کریں، شاید آپ کے حوالے سے اس گناہ گار کی بگڑی بن جائے۔'' علی کھیری کسی بھکاری کی طرح گڑگڑا رہا تھا۔

آخر حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ نے ایک کاغذ پر یہ عبارت تحریر کی۔

''بھائی کا ٹھکرایا ہوا میرے پاس آیا ہے۔ اگر اجازت ہو تو اس کے حق میں دعا کی جائے۔''

یہ عبارت لکھ کر حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ نے وہ کاغذ اپنے مصلّے کے نیچے رکھ دیا اور خود نماز پڑھنے کیلئے کھڑے ہو گئے۔

علی کھیری اُمید و بیم کی کیفیت میں مبتلا تھا اور حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ نماز ادا فرما رہے تھے۔

پھر سلام پھیرنے کے بعد حضرت سیّد جلالؒ نے مصلّے کا کونا اُٹھا کر دیکھا۔ کاغذ پر حضرت شیخ تبریزیؒ کی تحریر کے ساتھ ایک اور عبارت درج تھی۔

''چونکہ وہ آپ کی طرف آیا ہے، اس لئے میں اجازت دیتا ہوں۔ اگر وہ اس فعل سے توبہ کرے تو اس کے حق میں دعائے خیر فرما دیجئے۔''

حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ نے علی کھیری کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ ''تمہیں مبارک ہو علی! پیر و مرشد نے اجازت دیدی مگر اس شرط کے ساتھ کہ تم اپنے اس فعل سے تائب ہو جاؤ گے جس کے ذریعے تم نے درویشی کو تماشا بنا رکھا تھا۔''

''شیخ! میں اپنے اس گناہ سے ہزار بار تائب ہوتا ہوں۔'' شدّتِ جذبات میں علی کھیری حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کے قدموں سے لپٹ گیا۔

حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ نے نہایت رقت آمیز لہجے میں دعا فرمائی...... ''یا غفور الرحیم! ہم گناہ گاروں کو اپنی ان صفات عالیہ کا صدقہ عطا فرمایئے کہ ہدایت و نعمت آپ ہی کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ علی کے حسن ظن کی آبرو رکھ لیجئے کہ وہ مجھے آپ کا بندہ سمجھ کر میرے پاس آیا ہے۔ اس کے گناہوں کی پردہ پوشی فرمایئے اور اس کے قلب و دماغ کی کدورتوں کو اپنی بارش کرم سے دھو دیجئے کہ

آپ کے سوا کوئی دستگیر نہیں، کوئی مشکل کشا نہیں۔"

ابھی حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے کلمات کی گونج فضا میں باقی تھی کہ علی کھیری کو یوں محسوس ہوا کہ وہ شہر ظلمات سے نکل کر دیارِ نور میں داخل ہو گیا ہے۔ وحشت زائل ہو گئی اور دل بے قرار کو سکون حاصل ہو گیا۔ "جوع البقر" کی بیماری ختم ہو گئی اور ایک گم کردہ راہ صراط مستقیم پر لوٹ آیا۔

پھر حضرت سیّد جلال الدین تبریزیؒ نے علی کھیری پر اس قدر توجہ فرمائی کہ وہ حضرت خواجہ علیؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔

شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریاؒ نے اپنی خانقاہ عالیہ سے ملحق ایک علمی درس گاہ کی بنیاد رکھی تھی جس کے دو شعبے تھے۔ ایک شعبے میں علماء تربیت حاصل کرتے تھے...... اور دوسرے شعبے میں مبلغ حضرات کو تعلیم دی جاتی تھی۔ مبلغین کیلئے ضروری تھا کہ جس ملک یا علاقے میں انہیں بھیجا جائے وہاں کی زبان اور معاشرتی رسموں سے پوری طرح واقف ہوں...... تاکہ تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دینے والوں کو کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہ ہو۔ اس لئے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے کم و بیش ہر ملک سے ایک عالم و فاضل شخص کو ملتان بلا کر اپنی درس گاہ میں ملازم رکھا۔ اسے معقول تنخواہ دی اور آرام دہ رہائش کی سہولت فراہم کی۔

جب تبلیغی شعبے کے طلباء فارغ التحصیل ہو کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ ان سے دریافت کرتے۔

"کیا تم فی سبیل اللہ تبلیغ کیلئے تیار ہو؟"

اس طرح بہت سے نوجوان اپنے آپ کو اس کارِ عظیم کیلئے پیش کر دیتے تھے۔ جو نوجوان عالم جس ملک میں جانا چاہتا، وہ اسی علاقے کی زبان اور ثقافت کی تعلیم حاصل کرتا۔ دو سال بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اس مبلغ کے استاد کو پانچ ہزار اشرفیاں دے کر فرماتے۔

"اس ملک کیلئے شہر سے مفید اور ضروری سامان خرید کر جہاز میں رکھ دو۔"

پھر جب سامان سفر تیار ہو جاتا تو حضرت شیخ الاسلام اپنی دعاؤں کے سائے میں اس جہاز کو روانہ کرتے اور مبلغ کو مندرجہ ذیل ہدایات فرماتے۔

"سامان کم منافع پر فروخت کرنا۔"

لین دین کے ہر معاملے میں اسلامی تعلیمات کو پیش نظر رکھنا۔

ناقص چیزوں کو فروخت نہ کرنا بلکہ فقراء اور مساکین کو مفت دیدینا۔

خریداروں سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنا۔

جب تک لوگوں کا اعتماد حاصل نہ ہو جائے، اس وقت تک ان کے سامنے اسلامی تعلیمات پیش نہ کرنا۔"

اس طرح یہ نوجوان مبلغینِ اسلام سوداگروں کے لباس میں جہازوں پر سامان تجارت لاد کر ملتان

[سے روانہ] ہوتے اور جاوا، سماٹرا، فلپائن اور چین کے علاقوں میں پہنچ کر اپنی دکانیں کھولتے۔ مقامی [آبادی جو غیر] مسلموں پر مشتمل ہوتی، اس کے ساتھ اسلامی اصولوں کے مطابق کاروبار کرتے۔ پھر [جب انہیں قر]بت حاصل ہو جاتی تو نظریۂ وحدانیت سے ناآشنا لوگوں کے سامنے اسلام پیش کرتے۔ ان [کی] کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوتا اور غیر مسلم حضرات مبلغینِ اسلام کے حسن اخلاق، خدا ترسی، دیانت داری اور معاملات کی صفائی دیکھ کر اسلام قبول کر لیتے۔ آج مشرقِ بعید [کے] چھوٹے چھوٹے جزیروں میں جو کروڑوں مسلمان نظر آتے ہیں، یہ ان ہی مبلغ تاجروں کی سعی [مسلسل] کا نتیجہ ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی درس گاہ میں داخلی تبلیغی کا شعبہ تھا جس کی نگرانی خود حضرت شیخؒ فرماتے تھے۔ کشمیر سے راس کماری اور گوادر سے بنگال تک مبلغین اور واعظین کی کئی [جماعتیں] مصروف عمل تھیں۔ حضرت شیخ اسلامؒ کی آمد سے پہلے حضرت سلطان غنی سرورؒ کی تبلیغی [جماعتیں] بھی موجود تھیں مگر صحیح نگرانی نہ ہونے کے باعث ان میں سست روی پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت شیخ [بہاء] الدین زکریاؒ نے ان تبلیغی جماعتوں کی بھی سرپرستی فرمائی۔ دس دس میل کے فاصلے پر مبلغین [اسلام] کی قیام گاہیں مقرر ہوئیں۔ جہاں سرسبز اور گھنے درختوں کے سائے میں کئی کئی دن تک وعظ و [تلقین] کی مجلسیں گرم رہتیں۔ سال کے خاتمے پر مبلغین کے یہ گروہ ملتان حاضر ہوتے اور حضرت شیخ [بہاء] الدین زکریاؒ کے سامنے اپنی کارگزاری کی مکمل تفصیلات پیش کر کے ان جماعتوں کا قائد "خلیفہ" [کہلا]تا تھا۔ اہل اللہ کی ان ہی تبلیغی سرگرمیوں کو دیکھ کر عیسائی مشنریوں نے بھی اپنے پادری دیہاتوں [میں] روانہ کئے اور آج بھی جنوبی ایشیا کے طول و عرض میں عیسائیت کی تبلیغی سرگرمیاں جاری ہیں۔

کم نظر لوگ صوفیاء حضرات کی گوشہ نشینی پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے اسلام کی کوئی [خد]مت انجام نہیں دی۔ بس سماع کی مجلس آراستہ کیں اور لنگر خانے قائم کئے۔ حضرت شیخ بہاء الدین [زک]ریاؒ کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ آپ نے کس طرح منظم طریقے پر تبلیغی مراکز قائم کئے اور اپنے [خد]مت گاروں کو کیسے کیسے خطرناک علاقوں میں بھیجا۔ یہ صوفیائے کرام ہی کی جاں سوزیوں کا نتیجہ ہے [کہ بر]صغیر پاک و ہند کے تاریک ترین علاقوں میں اسلام کی روشنی پہنچی اور مضبوط ترین بت خانوں کی [بنیاد]یں تک ہلا کر رکھ دیں۔ ہم علمائے ظاہر کے کردار پر نکتہ چینی نہیں کرتے مگر یہ بھی ایک تاریخی سچائی [ہے کہ] علماء حضرات دارالحکومت یا پھر بڑے بڑے مخصوص شہروں ہی میں مقیم رہے۔ خوفناک [جنگلوں]، گندگی اور بیماریوں سے بھرے ہوئے دیہاتوں، تاریک غاروں اور پُرہول بیابانوں میں اگر [کوئی پر]چم توحید لے کر پہنچا تو یہی وہ گوشہ نشین درویش تھے یا پھر ان کے جاں نثار خادم۔ یہاں یہ [بات بھی] واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسلام کے نظریۂ وطنیت پر صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین [کے بعد سب] سے زیادہ عمل ان درویشوں اور صوفیوں ہی نے کیا ہے۔ اسلام کی نظریۂ وطنیت یہ ہے ۔

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

(ہر ملک ہمارا ملک ہے کہ ہمارے خدا کا ملک ہے)

اسی نظریئے کے تحت صحابۂ کرامؓ اپنے گھروں سے نکلے تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ وقت آخر آیا تو خدائے واحد کے یہ نام لیوا اپنے گھروں سے رشتے داروں اور دوستوں سے سیکڑوں میل دور "دیارِ غیر" میں دفن ہوئے۔ یہی حال اکثر صوفیائے کرام کا ہے۔ اس جماعت نے زمین اور معاشرت کے تمام رشتوں سے بے نیاز ہو کر تبلیغ اسلام کی اور اس راستے میں جس قدر تکالیف برداشت کیں، تاریخ عالم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

خود حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اپنی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ حصول علم اور سخت ترین ریاضتوں میں بسر کیا۔ پھر جب آپ کے پیر و مرشد شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ نے سمجھ لیا کہ ان کا مرید ایک مثالی انسان بن چکا ہے تو حکم دیا کہ ملتان جاؤ اور مخلوق خدا کو صراطِ مستقیم کی طرف بلاؤ۔ اہل ظاہر نے بس اتنا دیکھا کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے پاس سیم و زر کے انبار ہیں..... مگر کسی نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی کہ سیم و زر کے یہ ذخیرے کس کام میں خرچ ہو رہے ہیں؟

سلطان ناصر الدین محمود کے دورِ حکومت میں بھی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ "شیخ الاسلام" کے منصب پر فائز رہے..... مگر کسی روایت سے یہ پتا نہیں چلتا کہ اس زمانے میں آپ دہلی تشریف لے گئے تھے اور فرمانروائے ہند سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی یا نہیں؟ عام اندازہ یہی ہے کہ اس وقت حضرت شیخؒ مکمل طور پر گوشہ نشیں ہو گئے تھے۔ یہ گوشہ نشینی شاید اس لئے بھی تھی کہ اس وقت حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اپنی عمر شریف کی نوے منزلیں طے کر چکے تھے۔ 655ھ میں کچھ مسلمان سرداروں کی سازش سے مغلوں نے اُوچ اور ملتان پر حملہ کیا۔ مغلوں کے لشکر نے برج اور مورچے گرا کر شہر کو غیر محفوظ کر دیا تھا۔ پھر یہ افواہ عام ہو گئی کہ مغل لوٹ مار کا بازار گرم کرنا چاہتے ہیں۔ ملتان کے باشندے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے اور مغلوں کے فتنے سے محفوظ رہنے کیلئے دعا کے طالب ہوئے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے مکاشفے کے بعد لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "یہ فتنہ دعاؤں سے نہیں ٹلے گا۔"

شیخ کا ارشاد گرامی سن کر حاضرین کے چہرے خوف و دہشت سے زرد ہو گئے۔

کچھ دیر بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اپنے خدمت گاروں سے فرمایا۔ "ایک لاکھ درہم تھیلیوں میں بھر دو۔"

خدام نے خزانے سے مطلوبہ رقم نکالی۔ پھر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اس کثیر رقم کے ساتھ مغلوں کے لشکر میں پہنچے اور ان کے سردار سے فرمایا۔ "تمہیں جس چیز کی تلاش ہے، میں اسے ہمراہ لے آیا ہوں۔ یہ ایک لاکھ درہم لے لو اور بندگان خدا کو معاف کر دو۔"

مغل سردار نے وہ کثیر رقم لے لی اور لوٹ مار کئے بغیر واپس چلا گیا۔

اس واقعے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا خزانہ کس کام آتا تھا؟

☆☆..............☆☆..............☆☆

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے ایک مرید خواجہ کمال الدین مسعود شیروانیؒ بہت مالدار سوداگر تھے اور جواہرات کی تجارت کیا کرتے تھے۔ ایک بار خواجہ مسعود شیروانیؒ مال تجارت لے کر اردن سے بندرگاہ عدن کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی جہاز نے آدھا سفر بھی طے نہیں کیا تھا کہ یکا یک سمندر میں طوفان اُٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے جہاز کا مستول ٹوٹ گیا۔ سرکش موجیں جہاز کے اوپر سے گزرنے لگیں۔ تمام مسافر اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ ان سنگین لمحات میں خواجہ کمال الدین مسعود شیروانیؒ نے باآواز بلند کہا۔

"شیخ! وقت دعا ہے۔ اللہ سے ہم گناہ گاروں کیلئے عافیت طلب کیجئے۔"

ابھی فضا میں خواجہ مسعود شیروانیؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ جہاز کے عرشے پر نمودار ہوئے اور ہاتھ کے اشارے سے اپنے مرید کو پُر سکون رہنے کی تلقین فرمائی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پُر شور ہوائیں رک گئیں اور سمندری لہریں پُر سکون ہو گئیں۔ خواجہ مسعود شیروانیؒ اور دوسرے مسافروں نے گھبرا کر جہاز کے عرشے کی طرف دیکھا مگر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ وہاں موجود نہیں تھے۔ جب تاجروں کا جہاز سلامتی کے ساتھ عدن کی بندرگاہ تک پہنچ گیا تو تمام سوداگروں نے نہایت اِخلاص کے ساتھ اپنا تہائی مال خواجہ مسعود شیروانیؒ کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔ "ہماری یہ نذر حضرت شیخؒ کی خدمت میں ارسال کر دی جائے۔"

خواجہ کمال الدین مسعود شیروانیؒ نے تمام تاجروں کا مال لے کر اس میں اپنے نصف جواہر شامل کئے اور خواجہ فخر الدین گیلانیؒ کی معرفت ملتان بھجوا دیئے۔ خواجہ فخر الدین گیلانیؒ، خواجہ مسعود شیروانیؒ کے بھانجے تھے۔ جب آپ طویل مسافت طے کر کے ملتان پہنچے تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو اسی لباس میں دیکھا جس لباس میں حضرت شیخؒ جہاز کے عرشے پر جلوہ فرما ہوئے تھے۔ اس صورتحال نے خواجہ فخر الدین گیلانیؒ کے اعتقاد میں مزید اضافہ کر دیا۔ پھر آپ نے ستر لاکھ کی مالیت کے زر و جواہر حضرت شیخؒ کی خدمت میں پیش کئے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے تین دن کے اندر وہ سارا زر کبیر محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ انداز سخاوت دیکھ کر خواجہ فخر الدین گیلانیؒ نے اپنا تمام مال و اسباب حضرت شیخؒ کی نذر کر دیا اور حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ بھی اپنے مرید کے بے پناہ اخلاص سے متاثر ہوئے۔ پھر آپ نے خواجہ فخر الدین گیلانیؒ پر خصوصی توجہ فرمائی اور مختصر عرصے میں سلوک کی منازل طے کرا کے خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ خواجہ فخر الدین گیلانیؒ پانچ سال تک پیر و مرشد کی صحبت میں رہے۔ پھر حضرت شیخؒ سے اجازت لے کر حج بیت اللہ کیلئے روانہ ہوئے اور جدہ پہنچ کر اچانک انتقال فرما گئے۔ حامد بن فضل اللہ جمالیؒ کی روایت کے مطابق خواجہ فخر الدین گیلانیؒ کا مزار مبارک آج بھی سمندر کے کنارے موجود ہے۔

ان تمام واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی بخشش و عطا کا کیا انداز تھا۔ جو لوگ آخرت کی طلب لے کر حاضر ہوتے، انہیں بھی سرفراز کیا جاتا اور جو دنیا کی خواہش رکھتے تھے ان کے دامنوں کو بھی بھر دیا جاتا تھا۔ یہ سب کچھ خدائے حی و قیوم کی طرف سے تھا مگر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ

ایک ظاہری سبب تھے......اور حق تعالیٰ اپنے نام لیواؤں کو مخلوق کے درمیان اسی طرح سربلندی عطا کرتا ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت شیخ الاسلامؒ کا معمول تھا کہ اگر کبھی کوئی غریب الحال سید حاضر خدمت ہوتا تو آپ اسے ایک خلعت اور سات اشرفیاں مرحمت فرماتے۔ ایک بار ملتان کے علاقے میں قحط پڑ گیا جس کی وجہ سے بے شمار لوگ بھوک کا شکار ہو گئے۔ شہر کے مضافات میں ایک نومسلم کمہار رہتا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سادات کی بہت عزت کرتے ہیں، وہ بھی ایک منصوبے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

حضرت شیخؒ نے ایک پریشان حال شخص کو دیکھا تو اسے قریب بلا کر فرمایا۔ ''میرے عزیز! کیسے آنا ہوا؟''

''شیخ! میں ایک غریب سیّد ہوں۔ مسلسل فاقہ کشی سے تنگ آ کر آپ کے دروازے پر آیا ہوں۔ خدا کیلئے میری مدد فرمائیے۔''

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کمہار کی عاجزانہ درخواست سن کر کھڑے ہو گئے اور اپنے خدمت گار کو حکم دیا۔ ''یہ ہمارے مہمان ہیں، ان کی خدمت میں دو خلعتیں پیش کر دو۔''

حاضرین مجلس میں سے اکثر لوگ اس کمہار سے واقف تھے مگر حضرت شیخؒ کے احترام میں لب کشائی نہ کر سکے۔ پھر جب وہ کمہار سرفراز ہو کر چلا گیا تو ایک شخص نے باآواز بلند کہا۔

''شیخ! وہ فلاں گاؤں کا کمہار تھا۔ آپ سے جھوٹ بول کر اس قدر مال لے گیا۔''

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ بات تو مجھے معلوم تھی۔'' یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے بعض مریدوں کی بھی یہی شان کریمانہ تھی۔ آپ کے ایک مرید حضرت شیخ بدر بجستانیؒ لاہور میں رہتے تھے۔ ایک بار عید آئی تو شیخ بدر بجستانیؒ نماز پڑھنے کیلئے عیدگاہ تشریف لے گئے۔ وہاں ہزاروں مسلمان موجود تھے۔ نماز ختم ہوئی تو حضرت شیخ بدر بجستانیؒ نے آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر اپنے دونوں ہاتھ دراز کر دیئے۔

''خداوند عالم! زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ تیری ملکیت ہے اور ہر شے تیری ہی تسبیح بیان کر رہی ہے۔ تیرے فضل سے اہلِ ایمان نے روزے رکھے اور تیرے ہی کرم سے بندگان توحید عید کی خوشیاں منا رہے ہیں، رسمِ دنیا کے مطابق ہر چھوٹا اپنے بزرگ سے اور ہر غلام اپنے مالک سے عیدی مانگ رہا ہے مگر میں تجھ سے عیدی مانگتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی دینے والا نہیں۔''

قریب کھڑے ہوئے بہت سے نمازی حضرت شیخؒ کی اس دعا کو بہت غور سے سن رہے تھے۔ ابھی حضرت شیخ بدر بجستانیؒ کی دعا کے الفاظ ختم ہی ہوئے تھے کہ عیدگاہ میں جمع ہزاروں مسلمانوں نے ایک سفید ریشمی کپڑے کو آسمان سے اُترتے ہوئے دیکھا۔ وہ کپڑا سیدھا حضرت شیخ بدر بجستانیؒ کے ہاتھ میں پہنچا۔ حضرت شیخؒ نے بےقراری کے عالم میں کپڑے کو کھول کر دیکھا۔ اس پر سبز روشنائی سے یہ عبارت تحریر تھی۔

''ہم نے اس عید سعید کی خوشی میں تجھ پر آتشِ دوزخ حرام کی۔''

ہزاروں انسانوں نے اپنی آنکھوں سے یہ کرامت دیکھی تو حضرت شیخ بدر بجستانیؒ کی طرف ہجوم اور آپ کے دستِ مبارک کو بوسہ دینے لگے۔

ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''حضرت میں کچھ نہیں چاہتا۔ صرف آپ سے عیدی مانگتا ہوں۔''

''اس وقت تو میرے پاس کچھ نہیں ہے۔'' حضرت شیخ بدر بجستانیؒ نے اس شخص سے فرمایا۔ ''درویش کے گھر چلو۔''

''مجھے تو ایسی ہی عیدی چاہئے جیسی آپ کو ملی ہے۔'' اس شخص نے کہا۔

''اب یہ عیدی تو بار بار نہیں ملتی۔'' حضرت شیخ بدر بجستانیؒ نے فرمایا۔

''تو پھر مجھے کوئی دوسری عیدی نہیں چاہئے۔'' یہ کہہ کر وہ شخص جانے لگا۔

''اپنا دل کیوں چھوٹا کرتے ہو؟'' حضرت بدر بجستانیؒ نے عیدی مانگنے والے شخص سے کہا۔ ''یہ تم لے لو! قیامت کے دن میں جانوں اور آتشِ دوزخ!'' یہ کہہ کر حضرت شیخ بدر بجستانیؒ نے وہ حریری کپڑا اس شخص کے حوالے کر دیا جسے آپ جانتے تک نہیں تھے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے بھی بعض لوگ عجیب عجیب مطالبات کرتے تھے۔ آپ کے زمانے میں قلندروں اور ملنگوں کا بہت زور تھا۔ جاہل عوام کی اکثریت اس قسم کے ملنگوں کے حلقۂ اثر میں آجاتی تھی۔ پھر یہ گروہ عجیب عجیب دعوے کرنے لگتا تھا۔ ایک بار ان ہی ملنگوں کی ایک جماعت حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ میں بھی داخل ہوئی اور پُرشور آوازوں کے ساتھ مطالبہ کرنے لگی۔

''بہاء الدین! ساری دنیا میں تیری داد و دہش کی بڑی دھوم ہے۔ ہم اللہ والوں کو بھی کچھ دے۔''

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اس گروہ کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اس لئے خاموشی سے ان کے بے ہنگم نعرے سنتے رہے۔

جب وہ ملنگ بہت شور کر چکے تو حضرت شیخؒ نے اپنے خدمت گاروں سے فرمایا۔ ''ان لوگوں کو خانقاہ سے نکال دو۔''

ملنگوں کا گروہ کھڑا ہو گیا اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی شان میں انتہائی نازیبا کلمات ادا کرنے لگے۔ حضرت شیخؒ نے سکوت اختیار کیا۔ پھر وہ لوگ خانقاہ سے باہر چلے گئے اور پتھر جمع کرنے لگے۔

''خانقاہ کا دروازہ بند کر دو۔'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے خدمت گاروں کو حکم دیا۔

جب خانقاہ کا دروازہ بند ہو گیا تو ملنگوں نے پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ ''ہم خالی ہاتھ نہیں

جائیں گے۔" ملنگ پوری طاقت سے چیخ رہے تھے۔ "اگر تو نے ہمارا مطالبہ پورا نہیں کیا تو ہم خانقاہ کے در و دیوار مسمار کر دیں گے۔"

خدمت گاروں پر خوف طاری تھا۔ ملنگوں کے ساتھ شہر کے کچھ آوارہ شرپسند بھی شامل ہو گئے تھے اور وہ سب مل کر خانقاہ کے دروازے پر سنگ باری کر رہے تھے۔ پھر یکایک ان بدمستوں نے ایک اور نعرہ بلند کیا۔

"تجھے یہاں کس نے بٹھایا ہے اور تو کس کے حکم سے ان معصوم اور بے خبر لوگوں پر حکومت کر رہا ہے؟"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے ملنگوں کی یہ بات سنی اور اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا۔ "خانقاہ کا دروازہ کھول دو۔"

خدمت گار گھبرا گئے۔ "حضرت! ان لوگوں کا غیظ و غضب عروج پر ہے۔ وہ چلے جائیں تو دروازہ کھولنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ یہ سنگین لمحات خاموشی سے گزار دیئے جاتے...... مگر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اپنی نشست سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ "میں ان لوگوں کے غصے کو دیکھوں یا اس سوال کا جواب دوں؟"

"حضرت! ایسے شرپسندوں کے کسی سوال کا جواب دینا ضروری نہیں ہے۔" خدام نے دست بستہ عرض کیا۔ "وہ تو چاہتے یہی ہیں کہ ہم لوگ مشتعل ہو کر خانقاہ کے دروازے کھول دیں اور انہیں تخریب کاری کا موقع مل جائے۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اپنے خدمت گاروں کی کوئی درخواست قبول نہیں کی اور حکم دیا کہ خانقاہ کا دروازہ بلا تاخیر کھول دیا جائے۔

خدام نے ڈرتے ڈرتے دروازہ تو کھول دیا مگر وہ کسی خوفناک حادثے کے منتظر تھے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نہایت جرأت اور بے باکی کے ساتھ دروازے میں نمودار ہوئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ملنگوں کی آنکھوں میں نفرت و غضب کی آگ بھڑک رہی تھی اور ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے پتھر تھے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو دیکھتے ہی ملنگوں اور ان کے ہم نواؤں کا ہجوم مزید مشتعل ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ شریر لوگ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو کوئی نقصان پہنچاتے، حضرت شیخؒ کی پُرجلال آواز گونجی۔

"غور سے سنو! میں یہاں خود نہیں بیٹھا ہوں۔" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے ملنگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "مجھے شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین عمر سہروردی نے یہاں بٹھایا ہے۔"

یہ سنتے ہی ملنگوں پر نامعلوم خوف طاری ہو گیا۔ ان کے ہاتھوں سے پتھر گر پڑے اور پھر ان شرپسندوں نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے سامنے زمین پر سر رکھ دیئے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ان ملنگوں نے کیا دیکھا کہ آن کی آن میں سارا غصہ زائل ہو گیا اور حضرت شیخؒ سے رو رو کر اپنے گستاخانہ

رویّے کی معافی مانگنے لگے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

قلندروں کے حوالے سے ایک اور تاریخ ساز واقعہ بھی بہت زیادہ شہرت رکھتا ہے۔

شیخ فخرالدین عراقی فارسی زبان کے عظیم المرتبت شاعر تھے۔ اس کے علاوہ عراقی کو حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کے حقیقی بھانجے ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ عراقی ہمدان میں پیدا ہوئے۔ آپ غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ پانچ سال کی عمر میں پڑھنے بیٹھے اور نو دس ماہ کے قلیل عرصے میں عراقی نے قرآن کریم حفظ کر لیا۔ فطری طور پر آواز میں سوز و گداز تھا۔ اس لئے جب بھی کلام الٰہی کی تلاوت کرتے، سننے والوں کی آنکھیں بھیگ جاتیں اور خوابیدہ روحیں جاگ اُٹھتیں۔ مشہور ہے کہ ہمدان کے لوگ عراقی کی خوش گلوئی پر فریفتہ تھے۔ حفظ قرآن کے بعد عراقی نے معقولات و منقولات کا درس لیا اور سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔

یہ علم اور ذہانت کی ایک اعلیٰ مثال تھی کہ فخرالدین عراقی نوعمری میں مدرس مقرر ہوئے اور دور دور سے طالبانِ علم و ادب ہمدان آ کر آپ سے استفادہ کرنے لگے۔ عراقی ایک باکمال شاعر بھی تھے۔ جس مجلس ادب میں آپ اپنا کلام سناتے تو لوگوں پر وجد طاری ہو جاتا۔ مختصر یہ کہ جو شہرت و عظمت لوگوں کو بڑھاپے میں بھی حاصل نہیں ہوتی، عراقی اس سے عین عالم شباب میں لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یکایک ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس نے فخرالدین عراقی کی دنیا ہی بدل ڈالی۔

ایک دن مولانا عراقی اپنے مدرسے میں طالب علموں کو درس دے رہے تھے کہ قلندروں کی ایک جماعت داخل ہوئی اور اس نے عراقی کو دیکھتے ہی فارسی کی ایک غزل شروع کر دی۔ مولانا نے اپنے طالب علموں کو رخصت کر دیا اور حیرت سے قلندروں کی جماعت کو دیکھنے لگے۔ جب ایک خوش گلو قلندر نے یہ شعر پڑھا تو مولانا فخرالدین عراقیؒ پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔

مارخت ز مسجد بہ خرابات کشیدیم
خط بر ورق زہد و کرامات کشیدیم

(میں نے مسجد سے اپنا سامان اُٹھایا اور میخانے چلا گیا۔ پھر میں نے پرہیزگاری اور کرامات کے اوراق پر خط تنسیخ کھینچ دیا)

قلندر یہ غزل پڑھتے رہے اور مولانا عراقی کی حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ پھر جب غزل ختم ہوئی تو ایک اور آفت مولانا کی منتظر تھی۔ قلندروں کے ساتھ ایک نہایت حسین و جمیل لڑکا بھی تھا۔ اسے دیکھتے ہی مولانا عراقی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ عشق کی آگ بھڑکی تو بھڑکتی ہی چلی گئی۔ قلندروں کی جماعت دو تین دن تک مولانا کے مدرسے میں مقیم رہی۔ اس دوران فخرالدین عراقیؒ اس حسین و جمیل لڑکے ہی کو دیکھتے رہے۔

پھر جب قلندروں کی جماعت ہمدان سے رخصت ہو گئی تو مولانا عراقی اس لڑکے کی جدائی میں تڑپنے لگے۔ بار بار خیال آتا کہ اگر لوگ اس بارے میں سنیں گے تو کیا کہیں گے؟ عراقی تم کس

خاندان سے تعلق رکھتے ہو اور تمہارا علمی مقام کیا ہے؟ الغرض عراقی دو تین دن تک اپنے نفس سے جنگ کرتے رہے مگر اُنہیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ ایک روز مولانا عراقی اس لڑکے کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ قلندروں کی جماعت بہت دور جا چکی تھی مگر مولانا کی بے قراریوں نے یہ فاصلے مٹا دیئے۔ قلندروں نے بڑی حیرت سے ہمدان کے عالم کو دیکھا۔ مولانا عراقی کے چہرے پر نا قابل بیان وحشت برس رہی تھی۔

''مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو!'' مولانا عراقیؒ نے قلندروں سے درخواست کی۔

''مولانا! ذرا اپنا خاندانی پس منظر دیکھیں!'' ایک قلندر نے گریز کا راستہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''آج سے میری خاندانی حیثیت کچھ نہیں۔'' مولانا عراقی پر اضطراب طاری تھا۔ ''مجھے اپنے خاندان میں شامل کرلو۔ پھر یہی میری نسبت ہوگی اور یہی میری پہچان ہوگی۔''

جب قلندروں نے دیکھا کہ مولانا عراقیؒ ٹلنے والے نہیں تو اُنہوں نے ایک عجیب شرط پیش کردی۔ ''آپ ایک عالم اور بزرگ انسان ہیں۔ اس لئے ہمارا اور آپ کا ساتھ ممکن نہیں...... لیکن پھر بھی بضد ہیں تو ہماری ایک ہی شرط ہے کہ اپنے چاروں ابرو صاف کرادیں۔''

(چاروں ابرو صاف کرنے سے مراد ہے سر، بھنوؤں، مونچھ اور داڑھی کے بال صاف کرانا)

قلندروں کا خیال تھا کہ مولانا عراقیؒ ان کی یہ شرط تسلیم نہیں کریں گے مگر اس وقت اس جماعت کا ایک ایک فرد حیران رہ گیا جب مولانا عراقیؒ نے اپنی دستار اُتار پھینکی اور اپنا پیرہن چاک کر ڈالا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ جیسے بزرگ کا بھانجا، ہمدان کا بہت بڑا عالم اور فارسی زبان کا مایہ ناز شاعر چاروں ابرو صاف کرائے ہوئے قلندروں کی جماعت کے ساتھ شہر در شہر گھوم رہا ہے۔

پھر قلندروں کی یہ جماعت ہمدان سے خراسان اور خراسان سے ملتان پہنچی۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے مسافروں کیلئے ایک وسیع وعریض سرائے تعمیر کرائی تھی۔ قلندروں کی یہ جماعت بھی اسی سرائے میں ٹھہری۔ ایک دن حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سرائے تشریف لے گئے تو قلندروں کے ساتھ اپنے پیر و مرشد کے بھانجے کو بھی دیکھا۔ اگرچہ مولانا عراقیؒ عجیب وغریب حلئے میں تھے مگر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اُنہیں پہچان لیا تاہم عراقیؒ پر یہ بات ظاہر نہیں کی۔

حضرت شیخؒ کے جانے کے بعد مولانا عراقیؒ نے اپنے ساتھی قلندروں سے کہا۔ ''فوراً کسی دوسری جگہ کوچ کر جاؤ۔''

''آخر کیوں؟'' قلندروں نے حیرت سے کہا۔ ''ملتان ایک اچھا مقام ہے۔ کچھ دن یہاں گزارنے میں کوئی حرج نہیں۔''

''میں اپنے لئے بہت بڑا خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔'' مولانا فخر الدین عراقیؒ کچھ پریشان سے نظر آرہے تھے۔

''کیسا خطرہ؟'' مولانا عراقیؒ کی بات سن کر قلندر بھی چونک اُٹھے تھے۔

''تم نے شیخ کی طرف غور سے نہیں دیکھا۔'' مولانا عراقیؒ نے خطرے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، اسی طرح شیخ کی نظریں بھی مجھے جذب کر رہی ہیں۔ لگتا ہے میں یہاں قید ہو کر رہ جاؤں گا۔''

''پھر کیا کریں؟'' قلندروں نے پوچھا۔

''اب اس خطرے سے نجات حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہمیں جلد از جلد کسی دوسرے مقام کی طرف روانہ ہو جانا چاہئے۔'' مولانا عراقیؒ نے اپنے ساتھی قلندروں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ پھر یہ جماعت راتوں رات ملتان سے دہلی کی طرف روانہ ہوگئی۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے وہ رات بڑے کرب میں گزاری۔ بار بار خود کلامی کے انداز میں فرماتے تھے۔ ''میرے پیر و مرشد کی نشانی اور ان گمراہوں کے نرغے میں؟ خدا فخر الدین پر اپنا رحم کرے۔''

دوسرے دن حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اپنے ایک خدمت گار کو بھیجا کہ وہ قلندروں کی جماعت کو خانقاہ میں لے آئے مگر جب خادم سرائے میں پہنچا تو قلندر جا چکے تھے۔ خادم نے پیر و مرشد سے یہ صورتحال بیان کی تو حضرت شیخؒ کا چہرۂ مبارک متغیر ہوگیا۔

''وہ کہاں جا سکتا ہے؟ اسے ہر حال میں لوٹ کر آنا ہوگا۔''

بعض خدمت گاروں نے دریافت کیا کہ حضرت شیخؒ کس کے بارے میں فرمارہے ہیں۔ قلندروں کی اس جماعت میں ایسا کون شخص ہے جسے لوٹ کر آنا ہوگا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اپنے خدام کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا مگر چہرۂ مبارک سے صاف نظر آتا تھا کہ آپ کسی شدید اُلجھن میں مبتلا ہیں۔

قلندروں کی جماعت ملتان سے دہلی پہنچی۔ کچھ دن اس تاریخی شہر میں گزارنے کے بعد وہ لوگ سومنات کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی قلندروں کا یہ قافلہ راستے ہی میں تھا کہ ایک خوفناک آندھی آئی جس نے زمین اور فضا کو زیر وزبر کر کے رکھ دیا۔ بڑے بڑے تناور درخت زمیں بوس ہوگئے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہا۔ تاریکی اور گرد وغبار کے اس طوفان میں کوئی کسی طرف جا نکلا اور کوئی کسی راستے پر بھٹک گیا۔ پھر جب آندھی کا زور ٹوٹا تو مولانا فخر الدین عراقیؒ نے دیکھا کہ وہ ایک ویرانے میں تنہا کھڑے ہیں۔ نہ وہ قلندر ہیں اور نہ وہ حسین وجمیل لڑکا جس کی خاطر مولانا عراقیؒ نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ تاریخ داں تو اسے اتفاق کہتے ہیں کہ طوفان تھم جانے کے بعد مولانا عراقیؒ جس راستے پر گامزن ہوئے، وہ ملتان کی طرف جاتا تھا...... مگر اہلِ نظر جانتے ہیں کہ یہ اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ قدرت حضرت شہاب الدین عمر سہروردیؒ کے بھانجے کو گمراہی سے بچانا چاہتی تھی، اس لئے طوفان اُٹھایا گیا اور پھر عراقیؒ کو قلندروں سے جدا کر کے ان کے قدموں کو ملتان جانے والے راستے پر ڈال دیا۔

آخر سفر کی صعوبتیں اور سختیاں برداشت کرتے ہوئے مولانا عراقیؒ ملتان پہنچے اور حضرت شیخ بہاء

الدین زکریاؒ کی خانقاہ کے دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔ شرم وندامت کے مارے اندر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس لئے سر جھکائے باہر ہی کھڑے رہے۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اس وقت درس دے رہے تھے۔ اچانک آپ نے تقریر روک دی اور ایک خدمت گار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''عراقی دروازے پر کھڑا ہے، اسے اندر بلالو۔''

مولانا فخر الدین عراقیؒ جھکے ہوئے سر کے ساتھ خانقاہ کے اندر آئے اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوگئے۔

حضرت شیخؒ نے ایک نظر عراقی کی طرف دیکھا اور بڑے عجیب سے لہجے میں فرمایا۔ ''مجھ سے بھاگنا چاہتا ہے عراقی! تو بھاگ جا!''

یہ سنتے ہی مولانا فخر الدین عراقیؒ کی حالت غیر ہوگئی۔ بے اختیار آگے بڑھے اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگے۔

''میرا دل ایک لمحے کیلئے بھی تجھ سے گریزاں نہیں رہا۔ آخر ایک جسم روح کے بغیر کس طرح رہ سکتا ہے۔'' مولانا فخر الدین عراقیؒ اس قدر پُرسوز لہجے میں اپنی دلی کیفیت بیان کر رہے تھے کہ حاضرین مجلس بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے عراقیؒ کو اُٹھا کر گلے سے لگایا، اس سلسلے میں خود عراقیؒ کا بیان ہے کہ جیسے ہی میرا سینہ حضرت شیخؒ کے سینۂ مبارک سے مس ہوا، دل وجاں میں ایک عجیب سی روشنی پھیل گئی۔ خوبرو قلندر زادے کا خیال جس نے عراقیؒ کی زندگی کو عذاب مسلسل میں مبتلا کر رکھا تھا، اس طرح محو ہوگیا جیسے کبھی اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ پھر جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اپنا لباس خاص پہنایا تو عراقیؒ کے دل میں عشق حقیقی کی آگ بھڑک اُٹھی۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ، مولانا فخر الدین عراقیؒ کی واپسی پر بے حد خوش تھے۔ آپ کے پیرو مرشد کا حقیقی بھانجا ایک بڑی تباہی سے محفوظ رہا تھا۔ حاضرین مجلس کو پتا بھی نہیں چلا کہ مولانا عراقیؒ کیسے گرداب بلا میں پھنسے ہوئے تھے اور ان کا سفینۂ حیات کس طرح عافیت کے ساحل تک پہنچا تھا۔ یہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی بہت بڑی کرامت ہے۔ اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

مولانا فخر الدین عراقیؒ کی آمد کے دوسرے دن حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اُنہیں اپنے خلوت خانے کے قریب ایک حجرے میں لے گئے اور فرمایا۔ ''عراقی! تم بہت صحرا نوردی کر چکے۔ اب گوشۂ تنہائی میں بیٹھو اور دل ودماغ کی یکسوئی کے ساتھ ذکر الٰہی کرو۔''

روایت ہے کہ مولانا عراقیؒ نے اس حجرے میں دس روز سکون سے گزارے مگر گیارہویں دن ان پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ پھر اسی حالت جذب میں عراقیؒ نے ایک غزل کہی جسے فارسی شعری ادب میں شہرت دوام حاصل ہے۔ عراقیؒ ترنم کے ساتھ غزل پڑھتے جاتے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

خانقاہ کے خدمت گاروں نے مولانا عراقیؒ کی آواز سنی تو حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ خانقاہ میں ذکر

اور مراقبے کے سوا کسی دوسری چیز کی اجازت نہیں تھی۔ کچھ لوگوں نے عراقیؒ کو نغمہ سرائی سے منع کیا مگر عراقیؒ اپنے ہوش میں نہیں تھے، ہر تنبیہہ سے بے نیاز اسی پُرسوز لہجے میں غزل پڑھتے رہے۔

بہ عالم ہر کجا رنج و ملامت
بہم کردند عشقش نام کردند

(دنیا میں جہاں جہاں رنج اور ملامت موجود تھے، انہیں یکجا کر کے ان کا نام عشق رکھ دیا)

سمجھانے کے باوجود بھی عراقیؒ نغمہ سرائی سے باز نہیں آئے تو خدمت گاروں نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے عرض کیا۔ ''رسم خانقاہی کے خلاف عراقیؒ بہت شور وغل کرتے ہیں اور اتنی بلند آواز میں گاتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کی یکسوئی متاثر ہوتی ہے۔''

خدمت گاروں کا خیال تھا کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سخت انداز میں مولانا عراقیؒ کو سرزنش فرمائیں گے...... مگر اس وقت تمام لوگ حیران رہ گئے جب حضرت شیخؒ نے بہت نرم لہجے میں فرمایا۔

''یہ چیزیں تم لوگوں کیلئے منع ہیں، مگر عراقی کیلئے نہیں۔''

خدمت گار خاموش ہوگئے کہ اُنہیں پیرو مرشد کے سامنے مزید گفتگو کی مجال نہیں تھی...... مگر وہ لوگ حیرت زدہ ضرور تھے کہ حضرت شیخؒ نے ایک شخص کی خاطر رسم خانقاہ کیوں بدل ڈالی؟

پھر ایک دن حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے خادم خاص شیخ عماد الدینؒ شہر کی طرف گئے۔ وہاں ایک میخانے سے گزرے تو کچھ رندوں کو مولانا عراقیؒ کی وہی غزل گاتے ہوئے دیکھا جو خود مولانا عراقیؒ ایک رات خانقاہ کے حجرے میں گا رہے تھے۔ شیخ عماد الدینؒ کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ اشعار عراقی کی چلہ گاہ سے ان شرابیوں تک کس طرح پہنچے۔ غرض اسی حیرت واستعجاب کے عالم میں شیخ عماد الدینؒ پیرو مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ بیان کرتے ہوئے عرض کیا۔

''اب آپ کو اختیار ہے کہ مولانا عراقیؒ کے بارے میں جو چاہیں فیصلہ کریں۔''

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر اپنے خادم خاص سے فرمایا۔ ''عماد الدین! تمہیں عراقیؒ کی وہ غزل یاد ہے؟''

شیخ عماد الدینؒ نے پیرو مرشد کی اجازت سے وہ غزل پڑھی۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ بہت غور سے ایک ایک شعر کو سنتے رہے۔ پھر شیخ عماد الدین مقطع پر پہنچے۔

چو خود کروند راز خویشتن فاش
عراقی راچرا بدنام کردند!

(جب تو نے اپنا راز فاش کر دیا تو پھر عراقی کو کیوں بدنام کیا ہے؟)

یہ شعر سنتے ہی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ ''عراقی کا کام پورا ہوگیا۔''

پھر حضرت شیخؒ حجرۂ مبارک سے اُٹھے اور مولانا عراقیؒ کی چلہ گاہ پہنچ کر فرمایا۔ ''عراقی اب تم خرابات میں بھی مناجات کرنے لگے ہو۔''

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سن کر مولانا فخر الدین عراقیؒ رونے لگے۔

''بس اب اُٹھو اور حجرے سے باہر آؤ۔'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''تمہارا کام ختم ہوگیا۔''

مولانا فخرالدین عراقیؒ چلہ گاہ سے باہر آئے اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے دامن سے لپٹ گئے۔

حضرت شیخؒ نے اسی وقت اپنا خرقہ اُتار کر مولانا عراقیؒ کو پہنایا اور بعد میں ان سے اپنی ایک صاحبزادی کا عقد کر دیا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مریدین میں یہ شرف خاص صرف مولانا فخرالدین عراقیؒ کو حاصل ہے۔

عراقیؒ تقریباً پچیس سال تک پیرومرشد کی خدمت میں رہے اور سلوک کی اعلیٰ منازل طے کیں۔ جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے عراقیؒ کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔ شیخؒ کی وفات کے بعد مولانا عراقیؒ کا ملتان میں رہنا دُشوار ہوگیا۔ چونکہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ آپ کو بے حد عزیز رکھتے تھے، اس لئے دوسرے مریدین ان سے حسد کرنے لگے۔ آخر اس کشمکش سے نجات حاصل کرنے کیلئے مولانا عراقیؒ مکہ معظمہ چلے گئے۔ پھر آپ نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور سرورِ کونین ﷺ کے سلام کیلئے مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ پھر روم تشریف لے گئے اور شیخ صدرالدینؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے۔ اسی زمانے میں مولانا عراقیؒ نے اپنی مشہور کتاب ''لمعات'' لکھ کر شیخ صدرالدینؒ کی خدمت میں پیش کی۔ حضرت شیخؒ نے اسے پسند فرمایا۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کی وفات کے بعد عراقیؒ شیخ صدرالدینؒ سے اجازت لے کر دمشق چلے آئے۔ کچھ دن بعد اسی مقام پر 6/ذی قعدہ 688ھ کو عراقیؒ نے وفات پائی۔ آپ کا مزار شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ کے مزار کے عقب میں ہے۔ عراقیؒ کے پہلو میں ان کے صاحبزادے کبیرالدینؒ کی قبر بھی ہے جو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی صاحبزادی کے بطن سے تھے اور ملتان چھوڑ کر اپنے والد کے پاس دمشق آ گئے تھے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

جس زمانے میں مولانا فخرالدین عراقیؒ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے تھے، اسی زمانے میں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا جو حضرت شیخؒ کی بزرگی پر ایک روشن دلیل ہے۔

سید نجم الدینؒ ہرات کے بہت بڑے سوداگر تھے۔ ایک بار تجارتی قافلے کے ہمراہ ملتان تشریف لائے اور شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ سید نجم الدینؒ کے ساتھ ان کا نوجوان بیٹا میر حسینی بھی تھا مگر اس نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی روحانی شخصیت سے کوئی خاص تاثر قبول نہیں کیا۔ پھر کچھ دن بعد یہ دونوں باپ بیٹے تجارتی قافلے کے ہمراہ ہرات واپس چلے گئے۔

ہرات پہنچ کر میر حسینی نے شاہی فوج میں نوکری کر لی۔ ایک روز وہ شکار کیلئے جنگل کی طرف نکل

حسینی بہت دیر تک کسی جانور کی تلاش میں سرگرداں پھرتا رہا۔ آخر بہت جستجو کے بعد اسے ایک ہرن نظر آیا۔ میر حسینی نے گھوڑا دوڑایا اور ہرن کے قریب پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ تیر نکال کر ہرن کا شکار کرتا، میر حسینی کو صدائے غیبی سنائی دی۔

''اے سید! حق تعالیٰ نے تجھے اپنے رسول ﷺ کے اہل بیت سے پیدا کیا ہے۔ تیرا کام خدائے بزرگ کی اطاعت و عبادت کرنا ہے نہ کہ شکار جو بیکاروں کا مشغلہ ہے۔ تیری یہ حالت ہے کہ تو اپنا تمام کام چھوڑ کر میرے پیچھے مارا مارا پھر رہا ہے۔''

یہ سن کر میر حسینی پر شدید حیرت طاری ہوئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہرن اس سے گفتگو کر رہا ہے یا کوئی مردِ غیب؟ میر حسینی ابھی اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ وہ ہرن نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ سیر و تفریح اور شکار کا شوقین یہ سیّد زادہ کچھ دنوں تک عجیب اضطراب میں مبتلا رہا۔ آخر اس نے اپنا سارا مال خدا کے راستے میں لٹا دیا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اتفاق سے اس وقت ایک تجارتی قافلہ ملتان کو جا رہا تھا، میر حسینی بھی اس قافلے میں شامل ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد یہ قافلہ ملتان پہنچا اور تمام مسافروں نے سرائے شاہی میں قیام کیا۔

اسی رات حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے خواب میں دیکھا۔ رسالت پناہ ﷺ فرما رہے تھے۔

''بہاء الدین! میرا ایک فرزند تجارتی قافلے کے ساتھ سفر کر رہا ہے، اسے وہاں سے نکالو اور خدا شناسی کا راستہ دکھاؤ۔''

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی آنکھ کھلی تو آپ بے حد مسرور نظر آ رہے تھے اور یہ خوشی اس وجہ سے تھی کہ حضرت شیخ کو حضور اکرم ﷺ کا دیدار ہوا تھا۔ صبح ہوتے ہی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سرائے شاہی میں پہنچے اور بآواز بلند فرمایا۔

''تم لوگوں میں میر حسینی کون ہے؟''

قافلے کے تاجروں نے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ چند قدم آگے بڑھے۔ میر حسینیؒ نے حضرت شیخؒ کو دیکھا تو بے ساختہ پکار اُٹھا۔

''شیخ! آپ کے دیدار کی سعادت تو ایک بار پہلے بھی حاصل کر چکا ہوں مگر میری کم نصیبی مجھے دور بھگاتی رہی۔'' یہ کہہ کر میر حسینی نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے جلال کی وجہ سے اس پر اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور وہ فرش پر گر گیا۔

حضرت شیخؒ آگے بڑھے اور میر حسینی کو اُٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ ''فرزند! اللہ کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ اب تم منزلِ مقصود کی طرف آ گئے ہو۔ انشاء اللہ سارے بگڑے ہوئے کام سنور جائیں گے۔''

اس کے بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ میر حسینی کو لے کر خانقاہ میں داخل ہوئے اور اسے اپنے حلقۂ ارادت میں شامل فرما لیا۔

حامد بن فضل اللہ جمالیؒ کا بیان ہے کہ میر حسینیؒ نے تین سال تک سخت ریاضتیں کیں اور پھر منصب

ولایت پر فائز ہوئے۔ میر حسینیؒ اپنے زمانے کے بہت بڑے شاعر اور ادیب تھے۔ آپ نے نثر میں "نزہت الارواح" اور "طرب المجالس" اور نظم میں "زاد المسافرین" جیسی بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔ ان تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ میر حسینیؒ اپنے تمام مسودات حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ حضرت شیخؒ بہت غور سے ان تحریروں کا مطالعہ فرماتے اور میر حسینیؒ کی ذہنی کاوشوں کو سراہتے۔ یہ ہے اس شکاری نوجوان کی مختصر سی داستان حیات جس نے تیر وتفنگ سے جانوروں کا شکار کرنے کے بجائے سخت ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعے اپنے نفس کو شکار کیا۔ پھر وہ نجات کی منزل تک پہنچا اور یہ سب کچھ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا فیضان نظر تھا۔

مولانا صدر الدین کوفیؒ کا بیان ہے کہ میں ایک بار مولانا نجم الدین سنامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا سنامیؒ نے میری خیریت دریافت کی اور کچھ دیر تک رسمی گفتگو کرتے رہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"مولانا صدر الدین! آج کل تمہارا کیا مشغلہ ہے؟"

میں نے عرض کیا۔ "تفسیر کا مطالعہ کر رہا ہوں۔"

مولانا نجم الدین سنامیؒ نے فرمایا۔ "کون سی تفسیر تمہارے زیر مطالعہ ہے؟"

"کشاف، ایجاز اور عمدہ۔" میں نے مشہور تفاسیر کا ذکر کیا۔

"تمہارے لئے عمدہ کافی ہے۔" مولانا نجم الدین سنامیؒ نے فرمایا۔ "کشاف اور ایجاز کا مطالعہ کر کے اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟"

مجھے مولانا نجم الدین سنامیؒ کی یہ بات سن کر حیرت ہوئی کہ وہ مشہور تفاسیر کو اس قدر آسانی سے نظر انداز کر رہے ہیں۔ "کشف اور ایجاز کی اپنی جگہ ایک خاص اہمیت ہے۔"

مولانا نجم الدین سنامیؒ نے میری رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی، بلکہ کسی قدر تیز لہجے میں فرمایا۔

"مولانا صدر الدین! کشاف اور ایجاز کو آگ لگا دو، تمہارے لئے عمدہ کافی ہے۔"

مجھے مولانا نجم الدین سنامیؒ کا یہ انداز گفتگو سخت ناگوار گزرا تاہم میں نے ان سے اس بات کی وضاحت چاہی۔ "آخر آپ ایسا کیوں کہتے ہیں؟"

مولانا نجم الدین سنامیؒ نے فرمایا۔ "میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اسی طرح فرماتے ہیں۔"

مجھے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی بات بھی گراں گزری، مگر میں نے مولانا نجم الدین سنامیؒ کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا اور چپ چاپ اٹھ کر چلا آیا...... مگر میرے دل میں ایک عجب سی خلش موجود تھی۔

پھر جب رات آئی تو میں نے چراغ جلا کر تینوں کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ میں نے حسب عادت پہلے "کشاف اور ایجاز" کو پڑھا۔ پھر "عمدہ" کی ورق گردانی کی۔ اسی اثناء میں مجھ پر نیند کی کیفیت طاری ہونے لگی، میں نے کتابیں ایک طرف رکھ دیں۔ اس وقت کشاف اور ایجاز نیچے تھیں

اور عمدہ سب سے اوپر۔ یہاں تک کہ مجھے نیند آ گئی، پھر میں نے خواب میں دیکھا کہ اچانک ایک شعلہ بیدار ہوا جس سے میرے کمرے میں آگ لگ گئی ہے۔ میں گھبرا کر اٹھا تو واقعی آگ لگی ہوئی تھی۔ کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور چاروں طرف کاغذ جلنے کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ تپائی پر رکھی ہوئی کشاف اور ایجاز جل کر راکھ ہو گئی تھیں اور عمدہ مکمل طور پر محفوظ تھی۔ میں بہت دیر تک حیرت وسکوت کے عالم میں بیٹھا رہا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ نیچے رکھی ہوئی کتابیں جل کر خاک ہو گئیں مگر اوپر رکھی ہوئی کتاب جو "عمدہ" تھی کس طرح محفوظ رہی؟ پھر جب میرے ہوش وحواس بحال ہوئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کون ہیں اور ان کے فرمودات کیا تاثیر رکھتے ہیں؟

"کشاف" قرآن مجید کی مشہور تفسیر ہے، جسے ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری نے اسلامی عقائد کی فلسفیانہ تعبیر کی ہے۔ فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے قرآن کریم کے ادبی محاسن کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ زمخشری نے اپنی تشریحات کی تائید میں کثرت سے قدیم عربی شاعری کے حوالے دیئے ہیں۔ اس کے برعکس مفسر نے احادیث رسول کریم ﷺ سے بہت کم استفادہ کیا ہے۔ زمخشری فرقۂ معتزلہ کے عقائد کا پیروکار تھا۔ جمہور علمائے اسلام کے مطابق زمخشری کا عقیدہ باطل تھا۔

زمخشری کے حوالے سے ایک اور واقعہ بھی کافی شہرت رکھتا ہے۔ خواجہ حسن سنجریؒ اپنی شہرۂ آفاق تالیف "فوائد الفواد" میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کی روایت ہے کہ شیخ الاسلام حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ زمخشری کی مشہور کتاب "نحو مفصل" پڑھنے کے آرزومند تھے۔ آپ نے اپنے والد محترم کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔

"آج کی رات صبر کرو، انشاء اللہ صبح فیصلہ کریں گے۔"

حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ ادب واحترام کے پیش نظر خاموش رہے، مگر مسلسل سوچتے رہے کہ انہیں ایک رات ٹھہرنے کا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ آخر اسی کشمکش میں حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ کو نیند آ گئی۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ کچھ لوگ ایک شخص کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے لئے جا رہے ہیں۔ حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ نے ان لوگوں سے پوچھا۔

"یہ کون شخص ہے اور تم لوگ اسے کہاں لئے جا رہے ہو؟"

ان نامعلوم افراد نے حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ کو بتایا۔ "یہ "مفصل" کا مصنف زمخشری ہے اور ہم لوگ اسے دوزخ میں لئے جا رہے ہیں۔"

روایت ہے کہ اس خواب کے بعد حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ کے دل میں یہ آرزو باقی نہ رہی کہ وہ مفصل کا مطالعہ کریں۔ یہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا تصرف روحانی تھا کہ آپ نے اپنے فرزند اکبر سے بحث ومباحثہ کرنے کے بجائے عالم خواب میں ایک ایسی حقیقت کا مشاہدہ کرا دیا جو

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔

☆☆......☆☆......☆☆

ہم گزشتہ اوراق میں اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ تحصیل علم کی غرض سے دور دراز کے ملکوں میں تشریف لے گئے تھے اور اس طویل سیاحت کے دوران عجیب عجیب واقعات پیش آئے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی روایت ہے کہ جن دنوں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ بخارا میں مقیم تھے، یہ خوبصورت شہر سخت قحط کی لپیٹ میں آ گیا۔ اشیائے خوردنی ناپید ہو گئیں۔ پہلے جانور بھوک کے مرنے لگے، پھر غریب انسانوں کی جان پر بن گئی۔ جنگلی پھل کھا کر گزارہ کرنے کی کوشش کی گئی، مگر یہ تدبیریں ناکام رہیں۔ قحط آب کی وجہ سے درخت بھی سوکھ گئے۔ اگر کسی شخص کے ہاتھ کھانے کی کوئی چیز آ جاتی تو وہ اپنی اولاد سے چھپا کر کھانے کی کوشش کرتا۔ ماں باپ بھوک کے خوف سے اپنے بچوں کو فروخت کرنے پر آمادہ ہو گئے، مگر انہیں کوئی خریدنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ پھر صورتحال یہاں تک بگڑی کہ دریا اور تالاب بھی خشک ہو گئے۔ پانی جو زندگی کا آخری سہارا تھا، وہ بھی معدوم ہونے لگا۔ مقامی علماء کے کہنے پر بار بار نماز استسقاء پڑھی گئی، مگر خالق کائنات کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ گہرے بادل اُٹھتے تھے، جنہیں دیکھ کر اہالیان بخارا کے پژمردہ چہروں پر مسرت کا رنگ اُبھر آتا تھا، مگر کچھ دیر بعد ہی تیز ہوائیں ان سیاہ بادلوں کو اُڑا کر لے جاتی تھیں اور بارش کی اُمید میں آسمان کی طرف اُٹھنے والی آنکھیں دوبارہ زمین کی جانب لوٹ آتی تھیں، جہاں ہر طرف موت کا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

مقامی باشندے بار بار علمائے بخارا کے آستانوں پر حاضر ہوتے تھے اور ان سے دعاؤں کی درخواست کرتے تھے۔ علماء بھی سخت عاجز و پریشان تھے۔ پھر کسی شخص نے علمائے بخارا کو بتایا کہ یہاں بہاء الدین زکریاؒ بھی مقیم ہیں۔ ان سے بھی دعا کی درخواست کی جائے۔ شاید ان کی دعاؤں کے طفیل ہمارے سروں سے یہ عذاب ٹل جائے۔ بالآخر علمائے بخارا اور شہری باشندوں کی ایک جماعت حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔

''میں کس قابل ہوں؟'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے بھوک سے مرتے ہوئے لوگوں کی فریاد سن کر کہا۔ ''جب آپ جیسے پرہیزگار انسانوں کی دعائیں بے اثر رہیں تو پھر مجھ جیسے ناکارہ انسان کی دعا میں کس طرح تاثیر ہو سکتی ہے۔''

لوگوں نے سمجھا کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اپنے انکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے دامن بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ''شیخ! ہم نے سنا ہے کہ آپ مستجاب الدعوات ہیں۔ پھر دعا کرنے سے گریزاں کیوں ہیں؟''

''یہ تم لوگوں کا حسن ظن ہے، ورنہ میں خوب جانتا ہوں کہ میں کون ہوں؟'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ''یہ تو اس ذات کریم کی بخشش و عطا ہے کہ اس نے ایک ناقص بندے کو عزت کی مسند پر بٹھا دیا ہے۔''

''اسی ذات کریم سے ہم گناہ گاروں کیلئے بھی عافیت طلب کیجئے۔'' اکثر لوگ شدت کرب سے رونے لگے۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے اہالیان بخارا کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ آپ کے چہرۂ مبارک پر بھی اذیت و کرب کا رنگ نمایاں تھا۔ بہت دیر تک غور و فکر میں ڈوبے رہے۔ پھر حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''ہاں! ایک واسطہ باقی رہ گیا ہے، اب میں اسی واسطے کو بارگاہ ذوالجلال میں پیش کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کھڑے ہو گئے۔ ''آپ حضرات میرے ساتھ مسجد تشریف لے چلیں۔ ہم سب مل کر اپنے خالق کی جناب میں ایک عاجزانہ درخواست پیش کرتے ہیں۔''

پھر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ علمائے بخارا اور شہریوں کی جماعت کے ساتھ جامع مسجد تشریف لے گئے۔ پھر حضرت شیخؒ کی ہدایت پر تمام لوگوں نے دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اپنی کلاہ (ٹوپی) سر سے اُتاری اور آسمان کی جانب نگاہ کرتے ہوئے عرض کیا۔ ''بارالٰہا! یہ شیخ الشیوخ (حضرت شہاب الدین سہروردیؒ) نے یہ کلاہ صدق اور اخلاص سے میرے سر پر رکھی ہے اور میں نے بھی دین و دنیا کی سعادت سمجھ کر اسے اخلاص کے ساتھ قبول کیا ہے، تو اس کی برکت سے بارش برسا دے۔''

ابھی فضا میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ بجلی کی تیز کڑک سنائی دی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا آسمان سیاہ بادلوں سے بھر گیا۔ لوگ جامع مسجد سے نکلنے بھی نہیں پائے تھے کہ تیز بارش شروع ہو گئی۔ بادل اس قدر ٹوٹ کر برسے کہ سات دن تک شہر بخارا میں پانی کھڑا رہا۔ اس طرح حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی بخشی ہوئی کلاہ کی برکت سے زمین کی پیاس بھی بجھ گئی اور وہ خوفناک قحط بھی دور ہو گیا جس کی وجہ سے ہزاروں بندگان خدا کی ہلاکت کا خطرہ تھا۔

اسی طرح تاریخ کے سینے میں ایک اور واقعہ بھی محفوظ ہے جب مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کے عطا کردہ خرقے کے طفیل سلطان محمود غزنوی کو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی تھی۔

حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ سلسلہ نقشبندیہ کے نامور بزرگ ہیں جن کے فیض روحانی سے لاکھوں انسان فیضیاب ہوئے۔ جب سلطان محمود غزنوی نے حضرت شیخؒ کے کمالات کی شہرت سنی تو اس کے دل میں ایک مرد جلیل سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ اس وقت سلطان محمود غزنوی سیاسی امور کی انجام دہی کیلئے خراسان آیا ہوا تھا اور حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ اسی تاریخی شہر کے قریب خرقان میں قیام فرما تھے۔ سلطان محمود، حضرت شیخؒ سے ملاقات کیلئے تیار ہو چکا تھا، مگر اچانک اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔ مصاحبین خاص نے پوچھا تو سلطان نے جواب دیا۔

''میں سیاسی غرض سے خراسان آیا تھا، اس لئے شرم آتی ہے کہ میں خدا کے خاص بندوں کی زیارت کیلئے حاضری دوں۔''

یہ کہہ کر سلطان محمود غزنوی ہندوستان کی طرف روانہ ہو گیا اور وہاں اس نے کفار سے جنگیں

لڑیں۔ پھر اپنی فتوحات میں مزید اضافہ کر کے غزنی واپس لوٹ گیا۔

غزنی پہنچ کر سلطان محمود غزنوی نے حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کی زیارت کیلئے بطور خاص احرام باندھا اور خرقان روانہ ہوگیا۔ پھر جب سلطان محمود غزنوی خرقان پہنچا تو اس نے اپنے ایک خادم خاص کے ذریعے حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا۔

"بادشاہ آپ سے ملنے کیلئے غزنی سے چل کر خراسان آیا ہے۔ اب اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ آپ بھی اپنی خانقاہ سے باہر تشریف لائیں اور سلطان سے ملاقات کریں۔"

اس کے ساتھ ہی سلطان محمود غزنوی نے اپنے قاصد سے کہا۔ "اگر حضرت شیخؒ باہر آنے سے انکار کریں تو انہیں یہ فرمان خداوندی سنا دینا۔

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم پر حاکم ہیں۔"

حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے سلطان محمود غزنوی کا پیغام سن کر فرمایا۔ "مجھ فقیر کو اس خدمت سے معذور سمجھا جائے۔" حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کا اشارہ خانقاہ سے نکل کر سلطان کا استقبال کرنے کی طرف تھا۔

حضرت شیخؒ کے انکار کے بعد قاصد نے سلطان کے حکم کے مطابق قرآن کریم کی آیت مقدسہ کی تلاوت کی۔

اس کے جواب میں حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے فرمایا۔ "سلطان سے جا کر کہو کہ میں اب تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اس حد تک مستغرق ہوں کہ مجھے رسول ﷺ کی اطاعت کے مرتبے تک نہ پہنچنے پر شدید ندامت ہے۔ میں بھلا ایسی صورت میں حاکم کی اطاعت کی طرف کیسے متوجہ ہو سکتا ہوں۔"

حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کا جواب سن کر سلطان محمود غزنوی بہت رویا۔ پھر اس نے اپنے مصاحبین سے کہا۔ "چلو! ہم خود ہی چل کر حضرت شیخؒ کی زیارت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ یہ مرد حق آگاہ ایسے نہیں ہیں جیسا کہ ہم نے غلطی سے اُنہیں سمجھ رکھا ہے۔"

یہ کہہ کر سلطان محمود غزنوی نے اپنا لباس اپنے محبوب غلام ایاز کو پہنایا اور خود ایاز کا لباس پہن کر حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کی خانقاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کے علاوہ سلطان نے اپنی دس کنیزوں کو مردانہ لباس پہنائے اور اُنہیں اپنے ساتھ لے لیا۔ پھر یہ لوگ اس طرح حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کے سامنے پہنچے کہ غلام ایاز سلطانی لباس میں جلوہ گر تھا اور منصوبے کے مطابق حاضرین کے آگے آگے تھا۔ حضرت شیخؒ نے آنے والوں کے سلام کا جواب تو دے دیا، مگر سلطان محمود غزنوی کے احترام میں اپنی نشست سے اُٹھ کر کھڑے نہیں ہوئے، بلکہ غلام ایاز کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابھی حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کچھ فرمانے ہی والے تھے کہ غلام ایاز درمیان میں بول اُٹھا۔

"شیخ! اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نہ تو بادشاہ کی تعظیم کیلئے اُٹھے اور نہ آپ نے اس طرف کوئی توجہ فرمائی۔ کیا فقر کے جال کی یہی کائنات ہے کہ فرمانروا کو اس طرح نظر انداز کر دیا جائے؟"

حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے غلام ایاز کی بات سنی اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "ہاں! جال تو یہی ہے۔ مگر تیرا مخاطب اس جال کا گرفتار نہیں ہے۔"

سلطان محمود غزنوی کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا، وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کے سامنے آ کر نہایت ادب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر عرض کرنے لگا۔

"شیخ! کچھ ارشاد فرمائیے۔"

حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے ان کنیزوں کی طرف دیکھا جو مردانہ لباس میں خانقاہ میں موجود تھیں۔ "پہلے ان نامحرموں کو یہاں سے اُٹھاؤ۔"

سلطان محمود غزنوی اپنے منصوبے کو ناکام ہوتے دیکھ کر بہت شرمندہ ہوا۔ پھر اس نے کنیزوں کی طرف اشارہ کیا۔ کنیزیں سر جھکائے خانقاہ سے اُٹھ کر چلی گئیں تو سلطان محمود غزنوی نے دوبارہ عرض کیا۔

"شیخ! مجھے حضرت بایزید بسطامیؒ کی کوئی حکایت سنائیے!"

حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے فرمایا۔ "شیخ بایزیدؒ کا ارشاد ہے کہ جس نے مجھے دیکھ لیا، وہ ظلم و ستم کی تمام برائیوں سے محفوظ ہوگیا۔"

یہ سن کر سلطان محمود غزنوی نے کہا۔ "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا معاذ اللہ، بایزید بسطامیؒ کا مرتبہ سرور کونین ﷺ کے مرتبے سے بھی زیادہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے دیکھنے والوں میں بھی کئی لوگ ہدایت یافتہ نہیں تھے۔ ابوجہل اور ابولہب ویسے ہی کافر رہے۔ پھر بایزید بسطامیؒ کے دیکھنے والوں میں ہر ظالم کس طرح اچھا انسان بن سکتا ہے؟"

سلطان محمود غزنوی کی بات سن کر حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے ناخوشگوار لہجے میں فرمایا۔ "محمود! تو اپنی بساط سے بڑھ کر باتیں نہ کر! ادب کو ملحوظ رکھ! بے ادبی کے ساتھ ولایت کی دنیا میں قدم نہ رکھ! تجھے اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ رسالت مآب ﷺ کو سوائے چار دوستوں (حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عمر فاروق اعظمؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ) اور دوسرے صحابۂ کرامؓ کے کسی اور نے نہیں دیکھا۔ کیا تو نے قرآن کریم کی یہ آیت نہیں سنی؟

"اور تم دیکھتے ہو ایسے لوگوں کو کہ وہ نظر کرتے ہیں تمہاری طرف حالانکہ حقیقتاً تم کو نہیں دیکھ سکتے۔"

سلطان محمود غزنوی کو حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کا یہ جواب بہت پسند آیا۔ پھر اس نے نہایت عقیدت مندانہ لہجے میں کہا۔ "شیخ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔"

حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے فرمایا۔ "تجھے چاہئے کہ چار چیزوں کو اختیار کرے، اوّل نماز باجماعت...... دوم پرہیزگاری...... سوم سخاوت...... اور چہارم شفقت۔"

سلطان محمود غزنوی نے حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کی بارگاہ میں سر نیاز خم کر دیا۔ "میرے حق میں دعائے خیر فرمائیے۔"

حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے سلطان کی درخواست سن کر فرمایا۔ ”میں پانچوں وقت کی نماز کے بعد یہ دعا کرتا ہوں، اے اللہ! تمام مومنین و مومنات کی مغفرت فرمادے۔“

سلطان محمود غزنوی نے عرض کیا۔ ”شیخ! یہ تو عام دعا ہے، میرے لئے کوئی خاص دعا فرمایئے!“

حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے فرمایا۔ ”جا! تیری عاقبت محمود ہو۔“

اس دعا کے بعد سلطان محمود غزنوی نے اشرفیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کی خدمت میں پیش کی۔ جواب میں حضرت شیخؒ نے جو کی سوکھی ہوئی روٹی سلطان کے سامنے رکھتے ہوئے فرمایا۔ ”فقیر کی ضیافت قبول کیجئے۔“

سلطان محمود غزنوی نے جو کی روٹی اُٹھالی اور اسے کاٹ کر کھانے کی کوشش کی۔ روٹی اس قدر سخت تھی کہ اس کا چبانا بہت مشکل تھا۔ سلطان نے کسی نہ کسی طرح روٹی کا ٹکڑا توڑ لیا تو اسے نگلنا دشوار تھا۔ حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے محمود غزنوی کی یہ حالت دیکھ کر فرمایا۔

”سلطان! کیا یہ ہماری روٹی تمہارے گلے میں اٹکتی ہے؟“

سلطان محمود غزنوی نے اثبات میں جواب دیا تو حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے فرمایا۔ ”جس طرح ہماری یہ خشک روٹی تمہارے گلے سے نہیں اترتی، اسی طرح تمہاری اشرفیاں بھی ہمارے گلے میں اٹک جاتی ہیں۔ انہیں ہمارے سامنے سے اُٹھالو، کیونکہ ہم بہت پہلے دولت کو طلاق دے چکے ہیں۔“

یہ سن کر سلطان محمود غزنوی کا چہرہ اُتر گیا۔ ”پھر بھی شیخ! مجھے کچھ تو تبرک عطا فرمایئے۔“ سلطان نے نہایت عاجزانہ لہجے میں درخواست کی۔

حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ اس کی تعظیم کیلئے اپنی مسند سے اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ حضرت شیخؒ کے اس عمل پر سلطان محمود غزنوی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”شیخ! آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب میں حاضر ہوا تھا تو آپ نے میری طرف ذرا بھی التفات نہیں فرمایا تھا، مگر جب میں واپس جا رہا ہوں تو آپ میرے لئے اُٹھ کر کھڑے ہوگئے ہیں؟“

حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے فرمایا۔ ”جب تم خانقاہ میں داخل ہوئے تھے تو بادشاہی کے نشے سے سرشار تھے۔ مزید یہ کہ تم میرا امتحان لینے کی غرض سے یہاں آئے تھے...... مگر اب تم عاجزی اور انکسار کے ساتھ واپس جا رہے ہو، اس لئے فقیر پر بھی تمہارا احترام لازم ہے۔“

الغرض سلطان محمود غزنوی حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ سے ملاقات کر کے غزنی واپس آیا۔ وہ حضرت شیخؒ کے عطا کردہ خرقے کو بڑی حفاظت کے ساتھ ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ پھر جب سلطان محمود غزنوی نے سومنات پر حملہ کیا تو اس کا مقابلہ پرم دیو اور دابشلیم سے ہوا۔ جنگ کے دوران ایک ایسا نازک اور سنگین مرحلہ بھی آگیا تھا کہ ہندوؤں کے لشکر غالب آنے لگے تھے اور سلطان محمود غزنوی کو اپنی شکست کا خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ ایسی اذیت ناک ساعت میں سلطان گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کے عطا کردہ خرقے کو لے کر سجدے میں چلا گیا۔ پھر فاتح

سومنات نے ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگی۔ ”اے مالک ارض وسما! اس خرقے کے مالک کے طفیل مجھے کفار پر غلبہ عطا فرما۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ مجھے جس قدر مال غنیمت حاصل ہوگا، اسے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کردوں گا۔“

تمام معتبر مؤرخین کا بیان ہے کہ اس دعا کے مانگتے ہی آسمان کے ایک حصے سے سیاہ بادل اُٹھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے آسمان پر چھا گئے۔ بادل کی خوفناک گرج اور بجلی کی ہولناک چمک سے ہندوؤں کا لشکر ہراساں ہوگیا...... اور ایسی تاریکی چھا گئی کہ ہندو بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے سے اُلجھ پڑے اور آپس ہی میں لڑنے لگے۔ اس وحشت اور انتشار کے باعث پرم دیو کی فوج میدان جنگ سے بھاگ نکلی اور سلطان محمود غزنوی کو ایک یادگار فتح حاصل ہوئی۔

مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ کہتا ہے۔ ”میں نے ایک معتبر تاریخ میں یہ روایت دیکھی ہے کہ جس روز سلطان محمود غزنوی نے حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کے خرقے کو ہاتھ میں لے کر دعا مانگی، اسی رات سلطان نے حضرت شیخؒ کو خواب میں دیکھا۔ حضرت شیخؒ نے سلطان سے فرمایا۔

”محمود! تو نے میرے خرقے کی عزت نہیں کی۔ اگر تو فتح کی دعا کے بجائے تمام غیر مسلموں کے اسلام لے آنے کی دعا کرتا تو وہ بھی قبول ہو جاتی۔“

☆☆..................☆☆..................☆☆

”خیر المجالس“ میں حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کی روایت ہے کہ سید جمال الدین ساوَجیؒ مصر کے مفتی تھے۔ آپ کے علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ جس مسئلے میں کوئی مشکل پیش آتی سید جمال الدینؒ اسے کسی کتاب کی مدد کے بغیر حل کر دیا کرتے تھے۔ اس لئے اہل مصر انہیں چلتا پھرتا کتب خانہ کہتے تھے۔ سید جمال الدین ساوَجیؒ کے حسن و جمال کا یہ عالم تھا کہ یوسف ثانی کہلاتے تھے۔ اتفاق سے ایک دن کسی مجلس میں مصر کی ایک مالدار شادہ شدہ خاتون نے سید جمال الدینؒ کو دیکھ لیا۔ اس کے سفلی جذبات کچھ اس طرح بھڑکے کہ وہ سید جمالؒ پر فریفتہ ہوگئی۔ سید جمالؒ نے اسے لاکھ سمجھایا کہ وہ شیطانی خیالات سے توبہ کرے، مگر اس عورت پر آپ کی نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ سید جمال الدین ساوَجیؒ ناقابل بیان کرب میں مبتلا تھے۔ آخر جب اس فتنے سے بچنے کی تمام تدبیریں ناکام ہوگئیں تو سید جمال الدینؒ ایک دن آدھی رات کے قریب مصر سے فرار ہوکر ”دمیاط“ پہنچے۔ یہ مقام مصر سے سات آٹھ منزلوں کے فاصلے پر واقع تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے سے ویران چلا آتا تھا۔ سید جمال دمیاط پہنچ کر ایک قبرستان میں روپوش ہوگئے۔ مصری خاتون نے اپنے جاسوس سید جمال الدینؒ کے تعاقب میں لگا رکھے تھے۔ پھر جب اسے پتا چلا کہ سید جمال الدین ساوَجیؒ دمیاط کے قبرستان میں روپوش ہیں تو وہ عشق زدہ خاتون اس ویرانے میں پہنچ گئی۔

حضرت سید جمال الدین ساوَجیؒ نے اُس وارفتہ عورت کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو بڑے رقت آمیز لہجے میں دعا کی۔ ”اے میرے معبود میں تیری پناہ مانگتا ہوں خدوخال کی یہ دلکشی جو میرے لئے فتنہ بن گئی ہے، اسے اس طرح بدل دے کہ کوئی شخص میری طرف متوجہ نہ ہو اگر تو نے میری مدد نہ

فرمائی تو میں ہلاک ہوجاؤں گا۔" یہ دعا مانگ کر سید جمال الدین ساؤجیؒ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرے۔

خدا کی قدرت کہ ہاتھ پھیرتے ہی سید جمالؒ کے سر، داڑھی، مونچھوں اور بھنوؤں کے بال گر گئے۔ عورت نے آپ کا بگڑا ہوا چہرہ دیکھا تو چیخ مار کر منہ پھیر لیا۔ "میں اس بدصورت شخص کے عشق میں مبتلا تھی؟"

"ہاں! میں وہی ہوں، تیرا محبوب۔" سید جمال الدین ساؤجیؒ یہ صورتحال دیکھ کر بہت خوش تھے۔

"تجھ جیسا کریہہ المنظر انسان میرا محبوب نہیں ہوسکتا۔" عورت نفرت سے منہ پھیر کر چلی گئی اور سید جمال الدین ساؤجی اپنے رب کی کبریائی بیان کرنے کیلئے سجدہ ریز ہوگئے۔

پھر جب سید جمال الدین ساؤجیؒ کا انتقال ہوا تو ان کے قائم مقام درویش نے پیر و مرشد کی نقل کرتے ہوئے سر، داڑھی، مونچھ اور بھنوؤں کے بال منڈوا دیئے اگرچہ سید جمالؒ نے قصداً یہ حلیہ اختیار نہیں کیا تھا لیکن ان کے پیروکاروں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔

حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی روایت ہے کہ جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اپنے پیرو مرشد حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی خدمت سے واپس لوٹے تو ایک مسجد میں قیام فرمایا۔ اسی مسجد میں کچھ گدڑی پوش قلندر بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ عبادت میں مشغول ہوگئے پھر جب شیخ رات کو عبادت سے فارغ ہوئے تو آپ کی نظر قلندروں کی جماعت پر پڑی تو حیران رہ گئے ایک قلندر کے جسم سے سورج کی طرح تیز روشنی پھوٹ رہی تھی اور اس کا رخ سورج کی طرف تھا۔

"اس لباس اور صورت میں ایسا نور؟" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ آخر اس روشنی کی حقیقت کیا ہے؟ حضرت شیخ کچھ دیر تک سوچتے رہے اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر قلندروں کے پاس پہنچے۔ قلندروں نے آپ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے موقع پاکر اس قلندر سے سرگوشی کے انداز میں فرمایا۔

"اے مردِ خدا! تو اس کم بخت قوم کے ساتھ کیا کر رہا ہے؟"

"شیخ زکریا! میں اس قوم میں اس لئے شامل ہوا ہوں کہ تمہیں بھی حقیقت معلوم ہوجائے۔" نوجوان قلندر نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"کیسی حقیقت؟" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے قلندر کی زبان سے اپنا نام سنا تو آپ کو اور بھی تعجب ہوا۔

"یہ حقیقت کے عوام میں خاص ہوتے ہیں۔" قلندر نے کہا۔ "اور ان ہی خاص لوگوں کی وجہ سے عوام کی بخشش ہوتی ہے۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے کچھ دیر تک مراقبہ کیا پھر نوجوان قلندر سے فرمایا۔ "لوگ کسی بھی رنگ میں رہیں مگر تیرے لئے یہ رنگ جائز نہیں۔"

دراصل وہ موصل کا رہنے والا سیدزادہ تھا اور اس کا نام سید عبدالقدوس تھا۔ عین عالم شباب میں اس پر جذب کا غلبہ ہوا پھر وہ اسی حالت میں موصل سے نکل کر سرور کونین ﷺ کے روضۂ اقدس پر سلام کیلئے حاضر ہوا۔ حج کی سعادت حاصل کی اور مصر چلا آیا۔ تقریباً سات ماہ تک مصر میں رہا پھر وہاں سے ملتان پہنچا اور حضرت سید جمال الدین ساؤجیؒ کے مزار پر حاضری دی وہاں بابا احمد اندبویؒ مقیم تھے ان ہی بزرگ نے سید عبدالقدوس کو قلندرانہ لباس پہنا دیا۔

جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے نگاہ خاص سے سید عبدالقدوس کو دیکھا تو اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ حضرت شیخؒ نے اسے کچھ دن تک اپنی صحبت میں رکھا پھر دست مبارک سے خرقہ پہنایا یہاں تک کہ وہ سیدزادہ قلندروں کے گروہ سے نکل کر سلوک کے راستے پر گامزن ہوا اور درجہ ولایت تک پہنچا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ فرماتے ہیں کہ جب شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریاؒ اجودھن پہنچے تو وہاں جذامیوں (کوڑھیوں) کا ایک گروہ انسانی آبادی سے الگ تھلگ ایک غار میں رہتا تھا۔ اتفاق سے ایک دن حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اس طرف جا نکلے۔ ایک خوفناک مرض میں مبتلا ہونے کے باعث مقامی لوگ اُدھر جاتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ جذامیوں نے ایک انسان کو اپنی طرف آتے دیکھا تو انہیں شدید حیرت ہوئی پھر جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ قریب پہنچے تو جذامی غار سے نکل آئے اور آپ کے گرد جمع ہوگئے۔ اُنہیں یقین تھا کہ آنے والا کوئی عام انسان نہیں ہے۔

بہت دنوں بعد اِدھر کوئی انسان آیا تھا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو دیکھ کر جذامی حیرت زدہ لہجے میں کہنے لگے۔ "ہمیں اہل دنیا نے چھوڑ دیا نہ وہ ہماری طرف آتے ہیں اور نہ ہمیں اپنی طرف آنے دیتے ہیں۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے جذامیوں کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ "تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"آپ کی دعاؤں کے طالب ہیں۔" جذامیوں نے روتے ہوئے عرض کیا۔

"تم خود اپنے حق میں دعا کیوں نہیں کرتے؟" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ "اس کی رحمت سے مایوس ہوکر ایک غار میں آپڑے ہو۔"

"بہت روئے، بہت فریادیں کیں مگر وہ ہماری نہیں سنتا۔" جذامی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے سامنے اپنی حالت زار بیان کر رہے تھے۔

آخر حضرت شیخ نے غار کے قریب واقع ایک تالاب میں وضو کیا۔ پھر دو رکعت نماز ادا کی، اس کے بعد جذامیوں کیلئے دعائے خیر کرنے لگے۔

ناگہاں ایک صدائے غیبی سنائی دی جسے جذامیوں نے بھی سنا۔ "بہاء الدین! تمہیں نہیں معلوم یہ

گروہ زیرِ عتاب ہے، اس لئے ان لوگوں کا معاملہ ہماری بارگاہ میں پیش نہ کرو۔"

ندائے غیب سن کر جذامیوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اب وہ اپنی صحت و زندگی سے مکمل طور پر مایوس ہو چکے تھے کہ ان کیلئے ایک مردِ خدا بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اپنی دعا جاری رکھی۔ آپ کے لہجے میں مزید رقت پیدا ہو گئی تھی۔ "اے میرے پروردگار! تیری بارگاہ کرم کے سوا یہاں کون سی بارگاہ ہے اگر میں ان لوگوں کا معاملہ تیرے دربارِ کرم میں پیش نہ کروں تو یہ مجبور و مقہور کس کے دروازے پر جائیں گے۔ یہ کتنے بھی معتوب سہی مگر تیری رحمت ہمیشہ تیرے قہر پر غالب رہتی ہے اپنی اسی رحمت بے پناہ کے صدقے میں اُنہیں معاف کر دے۔"

بالآخر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی دعا قبول ہوئی اور آپ نے جذامیوں سے فرمایا کہ اللہ کا نام لے کر تالاب میں غسل کریں حالانکہ وہ کوڑھی روزانہ اس تالاب میں نہاتے تھے مگر جب ایک مردِ حق نے بیماروں کیلئے دعا کی تو وہ عام سا پانی آبِ شفا بن گیا اور تمام جذامیوں کے بدن اس طرح صاف شفاف ہو گئے جیسے وہ کبھی اس خوفناک مرض میں مبتلا ہی نہ تھے۔

☆☆.................☆☆.................☆☆

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ایک اور روایت ہے کہ شیخ الاسلام حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اپنی طویل سیاحت کے دوران سراندیپ بھی تشریف لے گئے تھے اور ایک پہاڑ پر سال بھر تک آپ کا قیام رہا تھا۔ ایک دن ایک بوڑھا شخص اپنے سر پر لکڑیوں کا گٹھر اُٹھائے ہوئے آپ کے قریب سے گزرا، گرم موسم اور ناتوانی کے سبب وہ بوڑھا لڑکھڑایا اور لکڑیاں اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑیں۔ بوڑھے نے دوبارہ اس بوجھ کو اُٹھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کچھ دیر تک یہ منظر دیکھتے رہے، بوڑھا شخص بار بار لڑکیوں کے گٹھر کو اُٹھانے کی کوشش کرتا تھا لیکن ہر مرتبہ اس کی طاقت جواب دے جاتی تھی۔ آخر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ پہاڑ سے اُترے اور بوڑھے شخص کے پاس تشریف لائے۔

"بابا! اس ضعیفی میں تم اتنی محنت کیوں کرتے ہو؟" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے بوڑھے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "کیا تمہارا کوئی بیٹا نہیں جو یہ کام انجام دے سکے۔"

"یہی تو میری مجبوری ہے کہ میں کوئی بیٹا نہیں رکھتا۔" بوڑھے شخص نے انتہائی افسردہ لہجے میں کہا۔ "گھر میں کئی جوان بیٹیاں بیٹھی ہیں ان ہی کی شادی بیاہ کیلئے محنت کر رہا ہوں۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو بوڑھے کی حالت زار سن کر بہت افسوس ہوا۔ "چلو ہم دونوں مل کر اس بوجھ کو اُٹھاتے ہیں۔" یہ کہہ کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے لکڑیاں اُٹھا کر بوڑھے کے سر پر رکھ دیں۔

بوڑھے نے حضرت شیخ کا شکریہ ادا کیا۔ "خدا کرے کہ یہ بھاری بوجھ گھر تک پہنچ جائے۔ اگر کہیں راستے میں گر گیا تو کوئی سر پر اُٹھا کر رکھنے والا بھی نہیں ہوگا۔ لوگ تو میری ضعیفی کا تماشا ہی

دیکھتے ہیں۔ اللہ تمہارا بھلا کرے کہ تم نے میرا حال تو پوچھا۔"

"مجھے اسی کام کیلئے یہاں بٹھایا گیا تھا۔ انشاء اللہ! اب تمہارے سر سے یہ بوجھ اُتر جائے گا۔" حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا...... اور بوڑھا شخص آپ کو دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

پھر جب وہ ضعیف انسان لکڑیوں کا بوجھ لے کر گھر پہنچا تو حیرت زدہ رہ گیا تمام لکڑیاں چمکتے سونے میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ بوڑھے کی بیوی اور بچیاں حیران تھیں کہ یہ ناقابلِ یقین واقعہ کس طرح پیش آ گیا؟ آخر بہت غور و فکر کے بعد بوڑھے کو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ یاد آئے اور وہ بے ساختہ چیخ اُٹھا۔

"ہاں! یہ اسی مردِ حق کی کرامت ہے۔" بوڑھا جوشِ مسرت میں بہت مضطرب نظر آ رہا تھا۔ "اسی نے گری ہوئی لکڑیاں اُٹھا کر میرے سر پر رکھی تھیں۔"

بوڑھا اسی وقت پہاڑ کی طرف روانہ ہو گیا مگر جب وہاں پہنچا تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اپنے سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔

☆☆.................☆☆.................☆☆

ایک بار کچھ عقیدت مند حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی زیارت کیلئے بغداد سے ملتان روانہ ہوئے۔ اتفاق سے راستہ بھول کر وہ ایک ایسے لق و دق صحرا کی طرف نکل گئے جہاں نہ کوئی سایہ دار درخت تھا اور نہ پانی کا چشمہ۔ وہ لوگ جس قدر پانی اور سائے کی تلاش کرتے تھے اسی قدر ویرانی بڑھتی جاتی تھی یہاں تک کہ تمام لوگ تھک کر تپتے ہوئے صحرا کی ریت پر گر گئے۔ پیاس کی شدت سے ان کی زبانیں خشک ہو گئیں اور حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ آخر اس بے چارگی کے عالم میں وہ سب آسمان کی طرف دیکھ کر رونے لگے۔

"اے خدا، ہم تیرے ایک نیک بندے کی زیارت کو جاتے تھے۔ ناگہاں یہ کس مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہم گناہ گار سہی مگر تو شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے صدقے میں ہمارے سروں سے اس آفت کو ٹال دے۔"

ابھی وہ تشنہ لب یہ گریہ وزاری کر ہی رہے تھے کہ اچانک ایک درویش نمودار ہوا جس کے ہاتھ میں پانی کا برتن تھا۔ پیاسوں نے جی بھر کے پانی پیا جب ان کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو درویش سے پوچھنے لگے۔

"اے مردِ خدا! تم کون ہو؟ تمہیں ہمارے حالِ زار کی خبر کیسے ہوئی؟"

درویش نے ان کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پانی کا کوزہ زمین پر رکھا اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔ بغداد کے مسافر اس کے پیچھے دوڑے مگر درویش کچھ دور جا کر ان کی نظروں سے اُوجھل ہو گیا۔ مسافر پریشان ہو کر سوچنے لگے کہ یہ سب کچھ کیا تھا؟ اچانک ان کی نظر اس راستے پر پڑی جہاں تک وہ درویش کا تعاقب کرتے کرتے آ پہنچے تھے۔ بغداد کے مسافر حیران رہ گئے کہ یہ راستہ سیدھا شہری آبادی کی طرف جاتا تھا۔

پھر جب یہ لوگ ملتان پہنچ کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، کبھی وہ پانی پلانے والے درویش کا خیال کرتے تھے اور کبھی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھتے تھے۔ حضرت شیخؒ نے اُنہیں ذہنی کشمکش کا شکار پایا تو باآواز بلند فرمایا۔

”اللہ کی قدرت لازوال کے بے شمار مظاہرے ہیں اگر کبھی کوئی شخص ظاہری آنکھ سے اللہ کی رحمت کو مجسم ہوتا ہوا دیکھ لے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس راز کو اپنے سینے میں پوشیدہ رکھے۔“

بغداد کے مسافر اس راز کو سمجھ گئے تھے کہ جس درویش نے انہیں بے آب و گیاہ صحرا میں پانی پلایا تھا، وہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ تھے...... مگر حضرت شیخؒ کی ہدایت کے مطابق ان لوگوں نے اپنی زبانیں بند رکھیں۔ پھر جب وہ مسافر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی صحبتوں سے فیضیاب ہو کر بغداد واپس پہنچے تو انہوں نے پورے جذبہ عقیدت کے ساتھ حضرت شیخؒ کی یہ کرامت بیان کی۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ ہمیشہ حالت جمال میں رہتے تھے۔ حاسدین کے طنز کے جواب میں مسکراتے اور بدخواہوں کو دعائیں دے کر رخصت کرتے مگر کبھی کبھی آپ پر جلالی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس وقت کوئی شخص حضرت شیخ کے غصے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک بار ایک درویش آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کسی شخص کو مرید کرتے تو سب سے پہلے یہ نصیحت فرماتے۔

”جب میرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہو تو پھر مجھ ہی کو اپنا مرشد سمجھنا، ایسا نہ ہو کہ ہر دروازے پر ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو جاؤ۔ میرے پاس آئے ہو تو پھر میرے ہی ہو کر رہنا۔“

جب وہ شخص اپنی زبان سے اقرار کر لیتا تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اس سے پوچھتے۔

”درویشی میں بڑے مشکل مقام آتے ہیں کیا تم صبر کر سکو گے اور راز کو راز رکھ سکو گے؟“

وہ درویش بیعت کیلئے حاضر ہوا تو حضرت شیخؒ نے اس سے بھی وہی سوال کیا۔

”پیرومرشد مجھے ہر مرحلے میں صابر و شاکر پائیں گے۔“ نو وارد درویش نے بڑے پُرجوش لہجے میں عہد کیا۔ ”مگر شیخ مجھے کوئی ایسی نعمت عطا فرمائیں کہ ملتان سے دہلی تک میری آنکھوں کے سامنے کوئی حجاب نہ رہے۔“

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے درویش کو چلہ کشی کا حکم دیا پھر جب چلہ ختم ہوا تو حضرت شیخؒ نے پوچھا۔ ”اب تیرا کیا حال ہے؟“

”حضور کے طفیل ملتان سے دہلی تک تمام اشیاء کو اپنی نظروں کے سامنے پاتا ہوں۔“ مرید نے بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا۔

”بس! یہ تیرے لئے کافی ہے۔“ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ ”یہ مقام صبر بھی ہے اور مقام شکر بھی۔“

”مگر میں تحت الثریٰ سے عرش اعلیٰ تک ہر شے کو بے حجاب دیکھنا چاہتا ہوں۔“ مرید نے درخواست کی۔ ”مجھے کوئی ایسا ورد بتائیے کہ میں سارے مرحلے طے کر لوں۔“

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اپنے مرید کو بہت سمجھایا مگر جوش میں اس کی زبان بے قابو ہو گئی۔ ”شیخ محترم! میں تو حجاب عظمت کا مکاشفہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

حجاب عظمت سے درویش کی مراد دیدار خداوندی تھا۔ یہ سنتے ہی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی پیشانی مبارک پر ناگواری کی شکن اُبھر آئی اور آپ نے پُرجلال لہجے میں فرمایا۔

”ایسا نہ سوچ ورنہ ہلاک ہو جائے گا۔“

جیسے ہی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے درویش نے ایک نعرہ مارا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روح جسم سے پرواز کر گئی۔

”صابرین میں سے نہیں تھا، اس لئے اپنے عہد پر قائم نہیں رہا۔“ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے درویش کی موت پر افسوس کرتے ہوئے فرمایا۔ ”شکر گزار ہوتا تو اس دولت پر قناعت کر لیتا جو تھوڑی ہی محنت کے بعد حاصل ہو گئی تھی۔ پتا نہیں۔ یہ بے صبری اسے کس منزل پر لے جاتی؟“

تصوف کی تاریخ میں منصور حلاج کا واقعہ عالمگیر شہرت رکھتا ہے، مشاہدۂ حق کرتے کرتے اس کی آنکھیں دھوکا کھا گئیں اور وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔ پھر علی الاعلان کہنے لگا۔ ”اناالحق“ (میں حق ہوں) آخر مفتیان وقت نے اس کے قتل کا فتویٰ جاری کر دیا ورنہ مخلوق خدا ایک بڑے فتنے میں مبتلا ہو جاتی۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا مرید بھی حجاب عظمت کا کشف حاصل کرنا چاہتا تھا مگر خدا نے اسے دنیا سے اُٹھا لیا۔

شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع تھا مگر حضرت شیخ حسن افغانؒ آپ کے ارادت مندوں میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔

”فوائد الفواد“ میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی روایت ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں سے بارہا فرمایا۔ ”اگر حشر کے دن حق تعالیٰ مجھ سے پوچھیں گے، بہاء الدین تو دنیا سے ہمارے لئے کیا تحفہ لایا تو میں بارگاہِ ذوالجلال میں عرض کروں گا کہ حسن افغان کو لایا ہوں۔“

حضرت شیخ حسن افغانؒ ظاہری اعتبار سے ایک عام انسان تھے۔ اتنے ”ان پڑھ“ تھے کہ حرف شناس تک نہیں تھے...... مگر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اس قدر ”علم لدنی“ عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے صاحبان کمال حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ (علم لدنی تصوف کی اصطلاح میں اس علم کو کہا جاتا ہے جو خدا بطور خاص اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے۔ اس علم کے حصول میں انسانی کوششوں کو کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا)

لوگوں نے کئی بار حضرت شیخ حسن افغانؒ کا امتحان اس طرح لیا کہ ایک کاغذ پر آیت قرآنی تحریر کی دوسرے کاغذ پر حدیث رسول ﷺ...... اور تیسرے کاغذ پر کسی مشہور بزرگ کا قول لکھ دیا۔ پھر

ان تینوں کاغذوں کو خلط ملط کر کے حضرت شیخ حسن افغانؒ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "شیخ! بتائیے کہ ان تحریروں میں آیت قرآنی کون سی ہے۔"

حضرت شیخ حسن افغانؒ نے کسی جھجک اور تامل کے بغیر آیت قرآنی کو علیحدہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "یہ میرے رب کا کلام مقدس ہے۔"

پھر آپ نے دوسرا کاغذ اُٹھاتے ہوئے فرمایا۔ "یہ میرے آقا حضور اکرم ﷺ کی حدیث پاک ہے۔"

پھر تیسرے کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "یہ فلاں بزرگ کا قول مبارک ہے۔"

دہلی اور ملتان کے علماء نے سیکڑوں بار حضرت شیخ حسن افغانؒ کا امتحان لیا مگر آپ نے ہر مرتبہ آیت قرآنی، حدیث رسول ﷺ اور بزرگان دین کے اقوال کو الگ الگ کر دیا۔ پھر جب حضرت شیخ حسن افغانؒ نے امتحان لینے والے لوگوں کو حیرت زدہ پایا تو ان سے پوچھا۔ "آخر آپ حضرات میری آزمائش کیوں کرتے ہیں؟"

لوگوں نے بصد احترام عرض کیا۔ "شیخ! ہم صرف یہ راز جاننا چاہتے ہیں کہ ان پڑھ ہوتے ہوئے بھی آپ ان تحریروں میں فرق کس طرح کرتے ہیں؟"

حضرت شیخ حسن افغانؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "جب حق تعالیٰ اپنے بندے پر کرم فرماتے ہیں تو پھر اسے کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔" یہ کہہ کر آپ نے آیت قرآنی پر اپنی انگشت شہادت رکھ دی۔ "یہ مالک کائنات کا کلام ہے جس کا نور عرش الٰہی تک ہے جسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔"

پھر حضور اکرم ﷺ کی حدیث پاک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "یہ رسالت مآب ﷺ کا فرمان مقدس ہے جس کا نور ساتویں آسمان تک دیکھ رہا ہوں۔"

پھر مشائخ کرام کے اقوال مبارکہ کے بارے میں فرمایا۔ "ان کا نور پہلے آسمان تک ہے۔"

حضرت نظام الدین اولیاء کی روایت ہے کہ ایک بار حضرت شیخ حسن افغانؒ دہلی تشریف لائے۔ ابھی آپ راستے سے گزر رہے تھے کہ وہاں لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ حضرت شیخ حسن افغانؒ صورتحال جاننے کیلئے ٹھہر گئے۔ بادشاہ نے اس مقام پر ایک عالی شان مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔ خانۂ خدا کی بنیاد رکھتے وقت علماء میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ کچھ لوگ دائیں جانب اشارہ کر رہے تھے اور کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ قبلہ بائیں جانب ہے۔ اسی کشمکش میں مسجد کی تعمیر کا کام رک گیا تھا اور علمائے دہلی کے درمیان بحث جاری تھی۔ آخر حضرت شیخ حسن افغانؒ بھیڑ سے گزرتے ہوئے اگلی صف تک پہنچے اور علماء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اس معاملے میں بحث و تمحیص کی کیا ضرورت ہے؟ خود ہی دیکھ لو کہ قبلہ کس طرف ہے اور پھر اسی سمت پر مسجد کی بنیاد رکھ دو۔"

علمائے دہلی نے حضرت حسن افغانؒ کی اس رائے پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو آپ نے بڑی عجیب بات کہہ دی کہ ہم لوگ خانۂ کعبہ کا مشاہدہ کر لیں، یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟"

"جب رب کعبہ چاہتا ہے تو ہر بات ممکن ہو جاتی ہے۔" یہ کہہ کر حضرت شیخ حسن افغانؒ نے ایک عالم کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "ملاحظہ کیجئے کہ قبلے کا رخ کس طرف ہے؟"

جیسے ہی حضرت شیخ حسن افغانؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، خانۂ کعبہ کے خدوخال اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ روشن ہو گئے۔ سیکڑوں انسانوں نے کھلی آنکھوں سے بیت اللہ کا دیدار کیا۔ پھر انسانی ہجوم دست بوسی کیلئے دوڑا مگر حضرت شیخ حسن افغانؒ دامن چھڑا کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ لوگوں میں بہت دیر تک چہ میگوئیاں ہوتی رہیں کہ آخر وہ مرد بزرگ کون تھے؟ پھر کسی شخص نے حاضرین کو بتایا کہ وہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے خلیفہ حضرت حسن افغانؒ تھے۔

حضرت شیخ حسن افغانؒ ایک صاحب کشف بزرگ تھے۔ ان کے کشف کا یہ عالم تھا کہ ایک بار ملتان کی کسی مسجد میں تشریف لے گئے اور امام کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ پھر جب نماز ختم ہو گئی تو حضرت شیخ حسن افغانؒ اپنی جگہ سے اُٹھے اور امام سے فرمایا۔ "حضرت! مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔"

امام صاحب حضرت شیخ حسن افغانؒ سے واقف نہ تھے۔ ایک عام انسان سمجھ کر کہنے لگے۔ "فرمائیے! میں حاضر ہوں۔"

حضرت شیخ حسن افغانؒ نے فرمایا۔ "میں اپنی بات تنہائی میں کہنا چاہتا ہوں۔"

امام صاحب نے سمجھا کہ کوئی ضرورت مند شخص ہے۔ اس لئے دوسرے لوگوں کی موجودگی میں اپنا حال بیان کرتے ہوئے شرماتا ہے۔ "آئیے!" یہ کہہ کر امام صاحب مسجد کے ایک خالی گوشے کی طرف بڑھے۔ "اب بتائیے کہ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

حضرت شیخ حسن افغانؒ نے فرمایا۔ "میں نے آپ کی اقتدا میں نماز مغرب ادا کی مگر پوری نماز میں حیران و پریشان ہی رہا۔"

"اکثر لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ انہیں نماز میں حضوری کی کیفیت حاصل نہیں ہوتی۔" امام صاحب نے حضرت شیخ حسن افغان کی بات سن کر کہا۔ "آپ دلجمعی کے ساتھ نماز ادا کرتے رہیں، بفضلہ ایک دن یہ پریشاں خیالی ختم ہو جائے گی۔"

"مگر میری پریشانی تو کچھ اور ہے امام صاحب!" حضرت شیخ حسن افغانؒ نے آزردہ لہجے میں فرمایا۔ "آپ عین نماز کی حالت میں ملتان سے دہلی تشریف لے گئے۔ پھر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں گھومے۔ پھر وہاں سے غلام خرید کر ملتان تشریف لائے۔ پھر ملتان سے ان غلاموں کو فروخت کرنے کیلئے غزنی چلے گئے اور میں آپ کے پیچھے پیچھے دستہ بستہ، ننگے پاؤں مارا مارا پھرتا رہا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ میں ایسی نماز کو کیا نام دوں؟"

حضرت شیخ حسن افغانؒ کی گفتگو سن کر امام صاحب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر حضرت شیخؒ تو چلے گئے مگر امام صاحب بہت دیر تک اسی حالت سکوت میں کھڑے رہے۔ دراصل یہ امام صاحب کے

خیالات پریشاں اور نا آسودہ جذبے تھے جو حضرت شیخ حسن افغانؒ پر ظاہر ہو گئے تھے۔

حضرت شیخ حسن افغانؒ کوہ سلیمان کے رہنے والے تھے جہاں افغانوں کے مختلف قبائل آباد ہیں۔ حضرت شیخ حسن افغانؒ زہد و عبادت، ذوق و شوق اور عشق و محبت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ آپ نے 689ھ میں عالم فانی کو خیر باد کہا۔ حضرت شیخ حسن افغانؒ کا مزار پرانوار حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے روضۂ مبارک کے عقب میں ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے خلفاء میں آپ کے فرزند اکبر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ بھی شامل ہیں اور سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگوں میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ 612ھ میں پیدا ہوئے۔ اخبار الصالحین میں آپ کی تاریخ پیدائش 611ھ درج ہے۔ بہرحال اس معمولی اختلاف کے ساتھ سرزمین ملتان کو آپ کا مولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے اپنے والد محترم کی نگرانی میں بڑے اساتذہ سے مروجہ علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی۔ جب آپ قرآن حکیم کی تلاوت کرتے تو آیات الٰہی میں بہت زیادہ غور و فکر کرتے۔ اسی تفکر کے باعث حضرت شیخ صدرالدینؒ پر نئے نئے اسرار و رموز ظاہر ہوتے۔ نتیجتاً آپ ''عارف'' کے لقب سے مشہور ہوئے اور پھر یہ لفظ ہمیشہ کیلئے آپ کے اسم گرامی کا لازمی حصہ بن گیا۔

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی شادی کا واقعہ بھی بہت عجیب ہے۔ ایک سال آپ حج کیلئے تشریف لے گئے۔ اسی سال فرغانہ کی شہزادی بی بی راستی بھی حج بیت اللہ کیلئے حاضر ہوئی تھیں۔ بی بی راستی حسن و جمال میں یکتائے روزگار تھیں۔ اسی لئے دوسری ریاستوں کے شہزادے اور امراء آپ سے شادی کی شدید آرزو رکھتے تھے مگر شہزادی راستی کو کسی سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ایک عابدہ اور زاہدہ خاتون تھیں۔ پھر انہیں لہو و لعب میں ڈوبے ہوئے شہزادے اور امراء کس طرح پسند آتے؟ شہزادی راستی کے والد محترم سلطان جمال الدین بھی ایک صاحب کمال بزرگ تھے مگر باپ ہونے کی حیثیت سے ان کی خواہش تھی کہ وہ بی بی راستی کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ ایک دن انہوں نے شادی کے سلسلے میں بیٹی کا عندیہ معلوم کیا تو شہزادی راستی نے عرض کیا۔

''ہمیں خدا کے حکم کا انتظار کرنا چاہئے کہ اس کے حکم کے بغیر کوئی کام تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔''

شہزادی راستی نے بہت عاقلانہ جواب دیا تھا۔ اس لئے سلطان جمال الدین خاموش ہو گیا۔

ایک بار شہزادی راستی بیت اللہ کا طواف کر رہی تھیں کہ اتفاق سے ان کی نظر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ پر پڑی جوان سے چند قدم کے فاصلے پر طواف کر رہے تھے۔ اگرچہ حضرت شیخ عارفؒ کی پشت بی بی راستی کی طرف تھی مگر شہزادی فرغانہ نے محسوس کیا کہ اس اجنبی کے جسم سے ایک خاص نور پھوٹ رہا ہے۔ پھر جب طواف ختم ہوا تو بی بی راستی نے اپنی خادمہ سے کہا۔

''تم سراغ لگاؤ کہ یہ نوجوان کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟''

خادمہ نے تحقیق کر کے بتایا کہ وہ نوجوان شیخ صدرالدین عارفؒ ہیں اور مشہور بزرگ حضرت شیخ

بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے فرزند اکبر ہیں۔''

یہ سن کر شہزادی راستی نے بے اختیار کہا۔ ''مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی عام نوجوان نہیں ہیں۔''

حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد شہزادی راستی نے خادمہ کے ذریعے والد محترم تک اپنے جذبات پہنچائے۔ ''اب آپ کوشش فرمائیے۔ شاید اللہ کی طرف سے اس کام کا وقت آ گیا ہے۔''

سلطان جمال الدین بیٹی کے اس انتخاب سے بہت خوش ہوئے اور کسی تاخیر کے بغیر اپنے باڈی گارڈوں کے ساتھ فرغانہ سے ملتان پہنچے۔ جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے آپ کی آمد کی خبر سنی تو خانقاہ سے نکل کر معزز مہمان کا استقبال کیا۔

پھر دوسرے دن سلطان جمال الدین نے کسی تکلف کے بغیر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے کہا۔ ''شیخ! میری خواہش ہے کہ دونوں خاندانوں کے درمیان قریبی رشتہ قائم ہو جائے۔''

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ ''میں فقیر اور آپ سلطان! پھر یہ رشتہ کس طرح طے پا سکتا ہے؟''

''میری سلطانی تو آنی جانی ہے۔'' سلطان جمال الدین نے نہایت عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''درحقیقت دین و دنیا کے سلطان آپ ہی ہیں۔''

یہ محبت و عقیدت کی انتہا تھی۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ ''تو پھر آپ حکم دیجئے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ مخدوم زادہ صدرالدین میری بیٹی شہزادی راستی کو اپنی غلامی میں قبول فرما لیں۔'' سلطان جمال الدین نے واضح الفاظ میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''یہ خود صدرالدین کی بھی سعادت ہوگی۔'' حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔

پھر یہ تقریب نکاح ملتان میں منعقد ہوئی۔ فرغانہ، ملتان اور دیگر شہروں کے بڑے بڑے مشائخ اس یادگار شادی میں شریک ہوئے۔ روایت ہے کہ نکاح کے بعد جب شہزادی راستی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے سلام کیلئے حاضر ہوئیں تو آپ ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔

پھر جب سلطان جمال الدین دنیا سے رخصت ہوئے تو وراثت کے طور پر زر و جواہر کا انبار شہزادی راستی کے حصے میں آیا۔ آپ نے وہ ساری دولت مساکین اور غرباء میں تقسیم کر دی۔

اپنی شریک حیات کے اس طرز عمل کو دیکھ کر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے فرمایا۔ ''بی بی! آپ نے ساری زندگی عیش و عشرت میں بسر کی ہے۔ کہیں یہ فقر و فاقہ آپ کو پریشان نہ کرے۔''

''مجھے آپ کی رفاقت کا خزانہ کافی ہے۔'' شہزادی راستی نے عرض کیا۔ ''آپ کے ہوتے ہوئے مجھے دنیا کی کوئی دولت یاد نہیں آئے گی۔''

9رمضان المبارک 649ھ میں ان ہی عظیم خاتون کے بطن سے مشہور بزرگ حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ پیدا ہوئے۔ یہ وہی مرد جلیل ہیں جنہوں نے حضرت نظام الدین اولیاء کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا ترکہ ان کے ساتھ فرزندوں میں برابر سے تقسیم ہوا تو دیگر اسباب اور جائداد کے علاوہ سات لاکھ تنکے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے حصے میں آئے۔ روایت ہے کہ حضرت شیخ عارفؒ نے اسی روز اپنا تمام اثاثہ درویشوں میں تقسیم کردیا اور اپنے پاس ایک بھی دینار یا درہم باقی نہیں رہنے دیا۔ جود وسخا کے اس مظاہرے پر ایک درویش نے حضرت صدرالدین عارفؒ سے پوچھا۔

"شیخ! آپ کے والد محترم کا خزانہ تو رقم اور اسباب سے بھرا ہوا تھا اور وہ اسے آہستہ آہستہ خرچ کیا کرتے تھے مگر آپ نے آن کی آن میں سب کچھ لٹا دیا اور ترک و تجرید کی روش اختیار کی! آخر اس میں کیا راز ہے؟"

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے درویش کے اس سوال کے جواب میں فرمایا۔ "میرے والد محترم ہمیشہ دنیا پر غالب رہتے تھے اور اسے مغلوب کر کے مال واسباب خرچ کیا کرتے تھے۔ اگرچہ میں بھی بیشتر اوقات دنیا پر غالب ہی رہتا ہوں...... لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں اسے مساوی پاتا ہوں۔ یعنی میں نہ غالب ہوتا ہوں اور نہ مغلوب۔ اس کیفیت کو دیکھ کر مجھے اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ کہیں دنیا میری ذات پر غالب نہ آجائے اس لئے میں نے اس مردم آزار شے کو ہمیشہ کیلئے اپنے آپ سے جدا کردیا۔ اب میرا دماغ بھی مطمئن ہے اور دل کو بھی طمانیت حاصل ہے۔"

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی بے شمار کرامات مشہور ہیں۔ ایک بار آپ ایصال ثواب کیلئے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مزار مبارک کی طرف جا رہے تھے کہ آپ کی نظر شیخ احمد قندھاری پر پڑی۔ شیخ احمد بہت بڑے تاجر محمد قندھاری کے بیٹے تھے۔ ایک بار اپنے سامان تجارت کے ساتھ ملتان آئے۔ شیخ احمدؒ کثرت مال کے سبب عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شراب کے اس قدر عادی تھے کہ "ام الخبائث" کے بغیر روز وشب کا ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتے تھے۔ اتفاق سے ملتان کے بازار میں کچھ تاجروں کے ساتھ کھڑے تھے کہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی نظر ان پر پڑی۔ حضرت شیخؒ نے اپنے ایک خدمت گار سے فرمایا۔

"ان صاحب کو اپنے ساتھ لے کر خانقاہ پہنچو!" حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کا ارشاد شیخ احمد قندھاری کی طرف تھا۔ اس کے بعد حضرت شیخ عارفؒ نے والد محترم کی قبر کی زیارت کی۔ بعض روایات میں درج ہے کہ جب فاتحہ خوانی کر کے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ واپس لوٹے تو شیخ احمد قندھاری کو اپنے ہمراہ لیتے گئے۔

ایک روایت ہے کہ جب شیخ احمد قندھاری تجارت کے سلسلے میں ملتان آئے تو ان کے دل میں حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ بہرحال ان روایتوں میں سے کوئی بھی روایت درست ہو لیکن یہ امر طے شدہ ہے کہ شیخ احمد قندھاری حضرت صدرالدین عارفؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان دنوں شدید گرمی کا موسم تھا۔ حضرت شیخؒ نے شربت طلب کیا۔ تھوڑا سا خود پیا اور باقی شیخ احمد قندھاری کی طرف بڑھا دیا۔ پھر جیسے ہی حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے آگے کا

ہوا شربت شیخ احمد کے حلق سے اُترا تو ان کی حالت غیر ہوگئی۔

"شیخ! آپ نے مجھے یہ کیا چیز پلا دی؟" شیخ احمد قندھاری نے مضطرب ہو کر کہا۔

"شربت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟" حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"یہ کیسا شربت تھا کہ جسے پی کر اپنے دل کی دنیا کو زیروزبر پاتا ہوں۔" شیخ احمد قندھاری کا لہجہ نہایت پُرسوز تھا۔

"احمد! اب تم کیا محسوس کرتے ہو؟" حضرت صدرالدین عارفؒ نے شیخ احمد قندھاری سے پوچھا۔

"اپنی معصیت آلود زندگی پر شرمندہ ہوں۔" شیخ احمد قندھاری رونے لگے۔ "اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ بقیہ زندگی حضور کے قدموں میں گزار دوں۔"

"تو پھر تمہیں کس نے روکا ہے؟" حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے ایک دل آویز تبسم کے ساتھ فرمایا۔

حضرت شیخؒ کا ارشاد گرامی سنتے ہی احمد قندھاری نے اپنا سارا مال ومتاع درویشوں میں تقسیم کردیا۔ برسر مجلس اپنی عیش پرستانہ زندگی سے توبہ کی اور حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے۔

اس نعمت سے سرفراز ہونے کے بعد شیخ احمد قندھاریؒ تارک الدنیا ہوگئے اور سات سال ایک ہی لباس میں گزار دیئے۔ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ آپ پر خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ نتیجتاً شیخ احمد قندھاریؒ نے سلوک کی مشکل ترین منازل طے کیں اور درجۂ ولایت پر فائز ہوئے۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ شیخ احمد قندھاریؒ طلوع آفتاب سے پہلے غسل کرنے کیلئے دریا میں اُترے۔ موسم اس قدر سرد تھا کہ پانی جمتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر بھی شیخ احمد قندھاریؒ بہت دیر تک پانی میں کھڑے یہ مناجات پڑھتے رہے۔

"اے اللہ! تو حقیقت میں بادشاہ ہے اور اپنی مخلوق کی اطاعت سے بے نیاز ہے۔ یہ تیری ہی شان کرم ہے کہ تو اپنے بے بضاعت بندوں کو اطاعت کی توفیق دیتا ہے۔ مجھ پر بھی اپنی قدرت سے یہ راز فاش کردے کہ میں تیری محبت میں کہاں تک پہنچا ہوں اور مجھ گناہ گار کا اس کوچے میں کیا مقام ہے؟ جب تک تو اپنے فضل سے میرا یہ سوال پورا نہیں کرے گا، اس وقت تک میں پانی سے باہر نہیں آؤں گا۔"

تب ایک صدائے غیبی سنائی دی۔ "ہماری بارگاہ میں تیرا مرتبہ یہ ہے کہ قیامت کے دن کئی لوگ تیرے طفیل دوزخ سے نجات پا کر جنت الفردوس میں داخل کئے جائیں گے۔"

شیخ احمدؒ نے دوبارہ عرض کیا۔ "اے مالک کون ومکاں! تیری رحمتوں کا کوئی شمار نہیں ہے۔ بے شک! تو مجھ گناہ گار کی وجہ سے اپنے کئی بندوں کو بخش دے گا مگر تیری یہ بخشش وعطا میرے لئے کافی نہیں ہے۔ تو اپنی شان کرم کا لحاظ کر!"

دوسری بار صدائے غیب سنائی دی۔ "تمام طالب ہمارے عاشق ہیں مگر ہم نے کمال رحمت سے تمہیں اپنا معشوق بنایا۔"

یہ سن کر شیخ احمدؒ پانی سے باہر نکلے اور کپڑے پہن کر خانقاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد جہاں بھی جاتے، آپ کو دیکھتے ہی لوگ بے اختیار پکار اٹھتے۔

"شیخ احمد معشوقؒ آ رہے ہیں۔"

اسی روز سے "معشوق" کا لفظ آپ کی ذات کا ایک لازمی حصہ بن گیا۔ تمام تذکرہ نگار "شیخ احمد معشوق" ہی کے نام سے آپ کی سیرت بیان کرتے ہیں۔ اس واقعے کے بعد شیخ احمدؒ کی ذات میں دوسری تبدیلی یہ نمایاں ہوئی کہ آپ پر اکثر اوقات "جذب" اور "بے خودی" کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ پھر یہ جذب اس قدر بڑھا کہ شیخ احمدؒ سے نماز بھی چھوٹ گئی۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر اس وقت کے علماء نے فتویٰ دیا کہ کسی مسلمان کیلئے ترک نماز جائز نہیں ہے۔ شیخ احمدؒ کو جذب و مستی چھوڑ کر ہوش وحواس کی طرف آنا چاہئے...... اور باقاعدگی کے ساتھ پانچوں وقت کی نماز ادا کرنی چاہئے۔

جب علمائے ملتان نے اس معاملے میں حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ سے رجوع کیا تو آپ نے فرمایا۔ "شیخ احمد نماز کی حقیقت کو خوب جانتے ہیں اور انہوں نے برسوں بڑے ذوق و شوق سے نماز باجماعت ادا کی ہے مگر کچھ دنوں سے وہ اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔"

"انہیں ہوش میں لانا چاہئے۔" علمائے وقت نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیف و مستی بھی مسلمان کیلئے جائز نہیں ہے۔"

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے جواباً فرمایا۔ "شیخ احمد معشوقؒ نے جان بوجھ کر یہ مجذوبانہ روش اختیار نہیں کی ہے۔ وہ مدہوش کئے گئے ہیں مگر اس طرح کہ جذب و مستی کی حالت میں بھی اپنے مالک کی یاد سے غافل نہیں ہیں۔"

علمائے ملتان نے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے اس عذر کو تسلیم نہیں کیا تو آپ نے فرمایا۔

"آپ حضرات کوشش کر دیکھیں۔ شاید احمد معشوقؒ اپنے ہوش میں آجائیں مگر جہاں تک میرا مشاہدہ ہے، ان کیلئے ایسی حالت کو مقدر کر دیا گیا ہے۔"

علمائے ملتان عشق کی اس کیفیت سے واقف بھی نہ تھے اور جذب و مستی کے قائل بھی نہ تھے، اس لئے شیخ احمد معشوقؒ کی خدمت میں پہنچے اور ناخوشگوار لہجے میں کہنے لگے۔

"احمد! تم نے مسلمان ہوتے ہوئے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"یہ تو میرا مالک ہی جانتا ہے کہ میں کس حال میں ہوں؟" شیخ احمد معشوقؒ رونے لگے۔

علمائے ملتان واپس چلے گئے مگر ان پر یہ راز فاش نہ ہو سکا کہ شیخ احمد معشوقؒ کی یہ حالت کیوں ہوئی ہے؟

عشق کے ہزاروں مقامات ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کون کس درجے پر فائز ہے۔ ہم نے یہ واقعہ صرف اس لئے بیان کر دیا ہے کہ جہاں حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے حلقۂ ارادت میں بہت سے ہوشمند شامل تھے، وہاں یہ جاں سوختۂ عشق الٰہی بھی آستانۂ عالیہ پر سرِ نیاز جھکائے کھڑا رہتا تھا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

اب ہم حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی ذات گرامی سے وابستہ ایک ایسے واقعہ کا ذکر کریں گے جو سلسلہ سہروردیہ کے عقیدت مندوں میں بہت زیادہ شہرت رکھتا ہے۔

سیر العارفین میں حامد بن فضل اللہ جمالیؒ کی روایت ہے کہ جب سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے بڑے لڑکے قدر خان کو ملتان کا علاقہ عنایت کیا تو اس وقت حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی بزرگی کا شہرہ دور دور تک تھا۔ نتیجتاً قدر خان بھی حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعاؤں کا طالب ہوا۔ شہزادہ قدر خان نہایت خوش طبع اور لطیف مزاج نوجوان تھا۔ اگرچہ وہ خود تو شعر نہیں کہتا تھا لیکن اس کے دربار میں اہل کمال جمع رہتے تھے اور موقع بہ موقع گرانقدر انعامات پاتے تھے۔ شہزادہ قدر خان صاحبان علم و فضل کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس کی ایک بیوی نہایت حسین و جمیل تھی۔ شہزادہ قدر خان اپنی شریک حیات سے بے حد محبت کرتا تھا مگر تمام خوبیوں کے باوجود اسے شراب نوشی کی لت پڑ گئی تھی۔ قدر خان کی بیوی خود بھی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ سلطان شمس الدین التمش کے بیٹے سلطان رکن الدین کی لڑکی تھی۔ اور شوہر کی کثرت بادہ خواری سے ہمیشہ نالاں رہتی تھی۔ اس نے کئی بار قدر خان سے کہا تھا کہ وہ شراب ترک کر دے...... مگر شہزادے نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ آخر ایک دن بات بگڑ گئی۔ شہزادہ قدر خان تنک مزاج اور زود رنج نوجوان تھا۔ بیوی کی بات سن کر برہم ہو گیا اور اس نے کھڑے کھڑے شہزادی کو تین طلاقیں دے دیں۔

شہزادہ قدر خان دو تین دن تک تو بیوی کی جدائی برداشت کرتا رہا مگر جب دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تو اس نے علمائے ملتان کو خلوت میں طلب کر کے عرض کیا۔ "میں اپنے کئے پر نادم ہوں۔ مجھے اس اذیت ناک صورتحال سے نجات دلائی جائے۔ میں شہزادی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

علمائے ملتان نے بیک زبان کہا۔ "شہزادۂ معظم! طلاق تو واقع ہو چکی۔ اب حلالے کے بغیر شہزادی سے آپ کا ازدواجی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔"

فقہ کی اصطلاح میں "حلالہ" وہ شکل ہے کہ طلاق شدہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور اگر دوسرا شوہر اسے طلاق دے دے اس کے بعد وہ پہلے شوہر سے نکاح کرے اور اس کے حلقۂ زوجیت میں داخل ہو جائے۔

شہزادہ قدر خان نے علمائے ملتان کی دلیل سنی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ کسی صورت میں بھی یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی بیوی کسی دوسری مرد کی زوجیت میں چلی جائے۔ "آپ حضرات کا بہت بہت شکریہ!" یہ کہہ کر شہزادہ قدر خان اپنی مسند سے اٹھا اور اندر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی علمائے ملتان بھی واپس تشریف لے گئے۔ شہزادہ قدر خان نے قاضی امیر الدین خوارزمی کو خلوت میں طلب کیا۔ یہ مرد بزرگ شہزادہ قدر خان کے ہم دم و ہمراز تھے۔

"قاضی صاحب! اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" شہزادہ قدر خان نے امیر الدین خوارزمیؒ سے پوچھا۔

"شہزادے! میں کیا عرض کر سکتا ہوں؟" قاضی امیر الدین نے کہا۔ "جو علماء کی رائے ہے، وہی

میری رائے ہے۔ طلاق تو واقع ہو چکی۔ اب رفاقت وصحبت کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے جو صاحبان علم آپ کے سامنے بیان کر چکے ہیں۔"

"اگر میں شہزادی کو اسی حالت میں بلالوں تو قیادت کے دن گناہ گار اُٹھوں گا۔" شہزادہ قدر خان نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ "اور اگر اپنی بیوی کو چھوڑ دوں تو مجھ میں جدائی کی طاقت نہیں ہے۔"

قاضی امیرالدین خوارزمی بہت دیر تک غور وفکر میں ڈوبے رہے۔ آخر اُنہوں نے ایک مناسب راستہ تلاش کرلیا۔ "یہاں ملتان میں حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ جیسے فرشتہ صفت انسان موجود ہیں۔ ہم شہزادی کا نکاح ان سے کرائے دیتے ہیں۔ پھر کچھ دن بعد حضرت شیخؒ طلاق دیدیں گے اور اس طرح آپ شہزادی کے ساتھ دوبارہ رشتۂ ازدواج قائم کرسکیں گے۔"

شہزادہ قدر خان کو یہ بات بھی پسند نہیں تھی مگر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی ذات گرامی کو دیکھتے ہوئے، چاروناچار رضامند ہوگیا۔ قاضی امیرالدین خوارزمی حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر بڑی رازداری کے ساتھ یہ مرحلہ انجام پذیر ہوگیا۔

کچھ دن بعد شہزادہ قدر خان نے قاضی امیرالدین خوارزمی سے کہا۔ "حضرت شیخؒ کی خدمت میں جاؤ اور ان سے کہو کہ وہ شہزادی کو طلاق دیدیں۔"

قاضی امیرالدین خوارزمی شہزادے کے حکم کے مطابق حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قدر خان کا پیغام سنایا۔ حضرت شیخؒ نے قاضی امیرالدین کی بات سن کر تامل فرمایا۔

"کیا آپ شہزادی کو طلاق دینا نہیں چاہتے۔" قاضی امیرالدین خوارزمی نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں تو حسب وعدہ طلاق دینا چاہتا ہوں مگر شہزادی اس بات پر آمادہ نہیں ہیں۔" حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے فرمایا۔ "تاہم ایک بار پھر ان سے دریافت کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ خلوت میں تشریف لے گئے اور شہزادی کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "شہزادہ قدر خان کا قاصد یہ پیغام لے کر آیا ہے کہ میں تمہیں طلاق دیدوں۔"

یہ سنتے ہی شہزادی حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے قدموں سے لپٹ گئی اور رورو کر عرض کرنے لگی۔ "اس کنیز کو اپنے قدموں سے جدا نہ کیجئے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو روزِ حشر اپنے اللہ سے انصاف کی طالب ہوں گی۔"

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے فرمایا۔ "اب میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا اور شہزادہ قدر خان کے قاصد کو ناکام ونامراد واپس لوٹا دوں گا۔" یہ کہہ کر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ مردانے میں تشریف لائے اور قاضی امیرالدین خوارزمی سے صاف صاف کہہ دیا۔

"شہزادی کو یہ بات پسند نہیں کہ میں اُنہیں طلاق دے دوں۔"

یہ سن کر قاضی امیرالدین خوارزمی بدحواس ہوگئے اور پھر اسی حالت میں شہزادہ قدر خان کے پاس پہنچے۔ شہزادے نے ان کا زرد چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ لیا کہ صورتحال بگڑ گئی ہے، تاہم اس کے اتمام حجت کیلئے قاضی صاحب سے پوچھا۔ "کیا حضرت شیخؒ نے انکار کردیا ہے؟"

قاضی امیرالدین خوارزمی نے کانپتی ہوئی آواز کے ساتھ پورا واقعہ سنادیا۔

پھر جیسے ہی قاضی صاحب خاموش ہوئے، شہزادہ قدر خان نے اپنی شمشیر کھینچ لی اور غضب ناک لہجے میں کہا۔ "تو ہی اس فتنے کی بنیاد ہے۔ اس لئے پہلے تیرا ہی کام تمام کر ڈالوں۔"

قاضی امیرالدین خوارزمی موت کے خوف سے لرزنے لگے اور اُنہوں نے آگے بڑھ کر شہزادہ قدر خان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ "حضور! میں نے تو یہ سب کچھ آپ ہی کی بھلائی کیلئے کیا تھا۔ اگر شیخ اپنے وعدے سے منکر ہوگئے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

قاضی صاحب کی گریہ وزاری رنگ لائی۔ شہزادہ قدر خان نے اپنی شمشیر نیام میں کرلی۔ پھر غضب ناک لہجے میں کہنے لگا۔ "تجھ جیسے آدمی کا خون بہانے سے کیا فائدہ؟ اگر شیخ کے خون سے ان کے گھر کو رنگین کردیا تو پھر اس عورت سے بھی کم ہوں جو اس وقت ان کے گھر میں بیٹھی ہے۔"

شہزادہ قدر خان نے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے قتل کی قسم کھالی تھی۔ پھر اس نے اپنے دس ہزار سواروں کو اس حکم کے ساتھ طلب کیا۔ "اگر کوئی سپاہی وقت مقررہ پر حاضر نہ ہوا تو وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

شہزادے کا فرمان سنتے ہی فوج میں ہلچل مچ گئی۔ اس روز قدر خان نے نہ کھانا کھایا اور نہ شراب پی۔ پھر یہ خبر پورے شہر میں عام ہوگئی کہ ولی عہد سلطنت حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے والا ہے۔ حضرت شیخؒ کے مریدوں اور عقیدت مندوں پر لرزہ طاری تھا مگر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے فرزند اکبر انتہائی طمانیت وآسودگی کے ساتھ وعظ بیان کرنے میں مشغول تھے۔

اس سے پہلے کہ شہزادہ قدر خان اپنی قسم کو پورا کرتا، اچانک اسے خبر ملی کہ بیس ہزار مغل فوج نے ملتان پر حملہ کردیا ہے۔ اس وقت مغلوں کی قیادت سالار تیمور خان کررہا تھا۔ شہزادہ قدر خان نے اس سے پہلے بھی ایک معرکہ آرائی میں بڑے بڑے مغل سرداروں کو قتل کیا تھا۔ اب تیمور خان ان ہی سرداروں کا بدلہ لینے کیلئے ملتان پر حملہ آور ہوا تھا۔ تیمور خان دریا کو عبور کرکے شہزادہ قدر خان کے ساتھ مصروف جنگ ہوگیا۔ شہزادے کے جانباز سپاہیوں نے شمشیر زنی اور تیراندازی کے ایسے جوہر دکھائے کہ نامی گرامی مغل سرداروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ تیمور خان اپنا لشکر لے کر فرار ہوگیا۔ شہزادہ قدر خان کے سپاہیوں نے اس موقع پر عاقبت نااندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مغلوں کا تعاقب کیا اور بہت دور نکل گئے۔ شہزادہ قدر خان نے نماز ظہر ادا کرنے کیلئے دریا کے کنارے جانماز بچھائی اور اپنے پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ عبادت الٰہی میں مشغول ہوگیا۔ اسی اثناء میں دو ہزار مغل سپاہیوں کا ایک دستہ جو کمین گاہ میں چھپا ہوا تھا، موقع پا کر باہر نکلا اور اس نے شہزادہ قدر خان پر حملہ کردیا۔ مختصر سے فوجی دستے نے بڑی جانبازی کے ساتھ مغلوں کا مقابلہ کیا۔ وہ وقت قریب تھا کہ مغل میدان جنگ سے فرار ہوجاتے مگر اس سے پہلے ایک دشمن سپاہی کا زہر آلود تیر شہزادہ قدر خان کی گردن میں پیوست ہوگیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ امیر لشکر

کے مرتے ہی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ مغلوں نے شہزادہ قدر خان کے سپاہیوں کو گرفتار کرلیا اور اپنے علاقے کی طرف قدر خان کے سپاہیوں کو گرفتار کرلیا اور اپنے علاقے کی طرف واپس لوٹ گئے۔ ان جنگی قیدیوں میں نابغۂ روزگار شاعر اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید خاص حضرت امیر خسروؒ بھی شامل تھے پھر یہ خبر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے مریدوں اور عقیدت مندوں تک پہنچی تو سب لوگوں نے اس واقعے کو حضرت شیخؒ کی تاریخ ساز کرامت سے تعبیر کیا۔ اس کے بعد شہزادی نے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی صحبت میں رہ کر سلوک کی منازل طے کیں اور معرفت میں بلند مقام حاصل کیا۔

بے شک! حامد بن فضل اللہ جمالیؒ مشہور صوفی اور سیاح تھے مگر ان کی بیان کردہ اس روایت میں بے شمار خامیاں موجود ہیں۔ پہلی یہ کہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ جیسے عالم و فاضل بزرگ اس انداز سے شہزادی کے ساتھ نکاح نہیں کرسکتے تھے۔ دوسری یہ کہ اگر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ قاضی امیرالدین خوارزمی سے شہزادی کو طلاق دینے کا وعدہ کرلیتے تو پھر ہر حال میں ایفائے عہد کرتے۔ تیسری یہ کہ سلسلۂ سہروردیہ کے عقیدت منداس واقعے کے ذریعے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی روحانی طاقت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، جس کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔

جب ہم تاریخ کے حوالے سے اس واقعے کا جائزہ لیں گے تو یہ حقیقت ظاہر ہوجائے گی کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے سب سے بڑے بیٹے کا نام شہزادہ محمد سلطان تھا اور وہ تاریخ ہند میں ''خان شہید'' کے نام سے مشہور ہے۔ حامد بن فضل اللہ جمالیؒ نے شہزادہ محمد سلطان کی جگہ قدر خان کا ذکر کیا ہے جو سند کے اعتبار سے غلط ہے۔ غیاث الدین بلبن نے شہزادہ محمد سلطان ہی کو ملتان کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اسی شہزادے نے مغلوں سے جنگ کی تھی اور اسی نیک سیرت شہزادے کو شہادت کا درجہ حاصل ہوا تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ نے بھی حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی ذات گرامی سے وابستہ اسی واقعے کو بیان کیا ہے۔ فرشتہ کے بقول وہ شہزادہ قدر خان نہیں تھا بلکہ شہزادہ محمد سلطان (خان شہید) تھا جس نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی تھی۔ بعد میں جو واقعات پیش آئے وہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان کئے جاچکے ہیں۔ ایک طرف شہزادہ محمد سلطان کی درشتی کا یہ حال ہے کہ وہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ جیسے بزرگ کے خون سے ان کے گھر کو رنگین کرنے کی قسم کھاتا ہے ......اور دوسری شہزادے کی بلند کرداری کا یہ عالم ہے کہ وہ بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں کا ممدوح تھا۔ خود قاسم فرشتہ کے الفاظ ہیں۔

''شہزادہ محمد سلطان (خان شہید) سلطان غیاث الدین بلبن کا محبوب ترین فرزند تھا۔ شہزادہ خان شہید بہترین اوصاف اور عمدہ اخلاق کا مالک تھا عقل و خرد اور ہنر پروری میں بلاشبہ وہ اپنے زمانے کا بہترین انسان تھا۔ اس کی محفلوں میں ہمیشہ نامی گرامی علماء، فضلاء اور مایہ ناز شعراء کا ہجوم رہتا تھا۔ وہ اپنے ہمدردوں اور بہی خواہوں کے ساتھ نہایت لطف و کرم سے پیش آتا تھا۔ شہزادہ خان شہید ہنر

مندوں اور مستحقین کی جی کھول کر مدد کرتا تھا۔ وہ اس قدر مہذب اور سلیقہ مند تھا کہ اگر دن رات کسی محفل میں بیٹھتا، تب بھی اپنا زانو بلند نہ کرتا۔ قسم کھاتے وقت ہمیشہ ''حقا'' کا لفظ استعمال کرتا تھا۔ شہزادہ خان شہید کی تہذیب و شائستگی کا یہ عالم تھا کہ نشے کی حالت میں بھی اس کی زبان سے کوئی غیر مہذب کلمہ ادا نہ ہوتا تھا۔ اگر کبھی کوئی شخص خان شہید کی مجلس میں کوئی نصیحت آمیز شعر پڑھتا تو وہ دنیا کے خیال کو دل سے نکال کر بڑی توجہ کے ساتھ شعر کو سنتا اور شعر کے مضمون سے متاثر ہوکر زار و قطار روتا۔ اس نے حضرت شیخ سعدیؒ کیلئے دوبارہ قیمتی تحائف ارسال کئے اور بزرگ شاعر کو ملتان آنے کی دعوت دی......مگر حضرت شیخ مصلح الدین سعدیؒ نے اپنی ضعیفی کی وجہ سے معذرت کرلی۔ پھر بھی اپنے دست مبارک سے اشعار اور غزلیات لکھ کر بطور تحفہ شہزادے کی خدمت میں روانہ کیں۔ حضرت امیر خسروؒ اور حضرت خواجہ حسن سنجریؒ اس کے مصاحبین خاص میں شامل تھے۔

جس زمانے میں شہزادہ خان شہید ملتان میں مقیم تھے، مشہور بزرگ حضرت شیخ عثمان ترمذیؒ ملتان تشریف لائے۔ خان شہید نے ان کی بہت تعظیم کی۔ قیمتی نذریں پیش کیں اور اس کے ساتھ ہی درخواست کرتے ہوئے کہا۔

''اگر شیخ یہاں قیام کرنا پسند فرمائیں تو حکومت کے خرچ سے خانقاہ تعمیر کرادی جائے گی۔''

مگر حضرت شیخ عثمان ترمذیؒ نے ملتان میں رہنا پسند نہیں کیا اور واپس چلے گئے۔ مؤرخ قاسم فرشتہ ہی کی روایت ہے کہ ایک روز حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ اور حضرت شیخ عثمان ترمذی شہزادہ خان شہید کی مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ کسی خوش الحان شخص نے عربی کے کچھ اشعار پڑھے جنہیں سن کر دونوں بزرگوں پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ شہزادہ خان شہید حضرت شیخ عارفؒ اور حضرت شیخ عثمانؒ کے سامنے بہت دیر تک دست بستہ کھڑا رہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری رہے۔

جس شہزادے کی بلند کرداری پر حضرت شیخ سعدیؒ، حضرت امیر خسروؒ، حضرت خواجہ حسن سنجریؒ اور ہزاروں عالم و فاضل انسان گواہی دیتے ہوں، اس پر یہ الزام عائد کرنا کہ وہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کا خون بہانا چاہتا تھا، ایک سفاکانہ تہمت کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے ساتھ بھی بڑا ظالمانہ روایت کو منسوب کیا گیا اور اس پر فخر کرنے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ خدا ہم سب کی زبان و قلم کی لغزشوں کو معاف فرمائے۔

کم فہم عقیدت مندوں نے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی ذات گرامی سے ایک بے سروپا روایت ثابت کردی اور اسے ایک تاریخی کرامت سے تعبیر کیا حالانکہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کا روحانی درجہ ان بے بنیاد قصوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

حضرت شیخ مولانا حسام الدینؒ، حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے ایک باکمال مرید تھے۔ حضرت خواجہ حسن سنجریؒ نے اپنی تالیف ''فوائد الفواد'' میں حضرت نظام الدین اولیاء کے حوالے سے مولانا حسام الدینؒ کے کئی واقعات بیان کئے ہیں۔ ایک بار مولانا حسام الدینؒ ہندوستان کے تاریخی شہر بدایوں میں مقیم تھے۔ ایک دن مولانا محترم نے سرور کونین حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔

پیغمبر اسلام ایک مقام پر بیٹھے وضو فرما رہے تھے۔ صبح آپ کی آنکھ کھلی تو شدید اضطراب کے عالم میں اس مقام پر پہنچے۔ حیرت انگیز طور پر وہاں کی زمین پانی سے گیلی تھی۔ یہ دیکھ کر مولانا حسام الدینؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ نے بے قرار ہو کر اس جگہ کو بوسہ دیا اور پھر اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

''اگر میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو اسی جگہ میری قبر تعمیر کرنا۔''

پھر کچھ دن بعد مولانا حسام الدینؒ ملتان پہنچے۔ خود ان ہی کا بیان ہے کہ ایک دن پیر و مرشد حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ، حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی روح کو ایصال ثواب کرنے کے بعد مزار مبارک سے باہر تشریف لائے تو میرے دل میں خیال آیا کہ حضرت شیخؒ کی پائنتی ایک قبر کی زمین کیلئے درخواست کروں۔ شاید اللہ کے ایک ولی کی قربت کے باعث مجھے نجات حاصل ہو جائے۔ ابھی میرے دل میں یہ خیال گزر رہا تھا کہ حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ میری طرف متوجہ ہوئے اور نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''مولانا حسام الدین! میری طرف سے تمہاری قبر کی زمین کیلئے کوئی عذر نہیں ہے لیکن حضرت رسالت پناہ ﷺ نے تمہارے مزار کیلئے زمین شہر بدایوں میں تجویز فرمائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری مٹی وہیں کی ہوگی۔''

حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ کی یہ قوت کشف دیکھ کر مولانا حسام الدین حیران رہ گئے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حامد بن فضل اللہ جمالیؒ کا بیان ہے کہ میں ایک دن مشہور صوفی شاعر حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کے حجرۂ خاص میں ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اور وہاں حضرت مولانا فخر الدین عراقیؒ کی مشہور تصنیف ''لمحات'' رکھی تھی۔ دوران گفتگو مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے حضرت شیخ صدر الدین قونویؒ کی تعریف شروع کر دی اور تعریف میں بہت زیادہ مبالغہ کیا۔ حضرت شیخ صدر الدین قونویؒ، شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ کے مرید تھے۔ حضرت مولانا فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مرید خاص تھے۔ پھر جب حضرت شیخؒ کا انتقال ہو گیا تو مولانا عراقیؒ ہندوستان سے چلے گئے اور کچھ دنوں تک حضرت شیخ صدر الدین قونویؒ کی خدمت میں حاضر رہے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے اسی صحبت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''یہ کتاب (لمحات) حضرت شیخ صدر الدین قونویؒ کی توجہ کا نتیجہ ہے۔'' مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر حضرت شیخ صدر الدین قونویؒ توجہ نہ فرماتے تو مولانا فخر الدین عراقیؒ یہ کتاب تحریر نہیں کر سکتے تھے۔

حامد بن فضل اللہ جمالیؒ کو مولانا جامیؒ کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ انہوں نے اپنے میزبان کا احترام ملحوظ رکھا۔ پھر بھی اتنا ضرور کہہ دیا۔ ''یہ سب کچھ حق تعالیٰ کا عطیہ ہے اور اس ذات پاک سے کسی شخص کا مرتبہ پوشیدہ نہیں ہے۔''

حامد بن فضل اللہ جمالیؒ کا بیان ہے کہ اسی رات مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے خواب میں دیکھا کہ ایک پُرنور چبوترہ ہے اور اس پر شیخ المشائخ حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ درویشوں کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف فرما ہیں...... اور مولانا فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ کے جوتے لئے ہوئے باادب کھڑے ہیں۔ حامد بن فضل اللہ جمالیؒ بھی اس محفل نورانی میں حاضر تھے۔ حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''جمالی! تم بھی اس مجلس میں موجود ہو۔''

حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ کا ارشاد گرامی سن کر حامد بن فضل اللہ جمالیؒ نے فرطِ عقیدت سے سر جھکا دیا۔

اسی دوران مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ بھی مجلس میں داخل ہوئے اور حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ کے دست مبارک کو بوسہ دے کر حامد بن فضل اللہ جمالیؒ کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کو اپنے نزدیک پا کر حامد بن فضل اللہ جمالیؒ نے کہا۔ ''مولانا! آپ نے فخر الدین عراقیؒ کا مرتبہ دیکھا؟''

جواب میں مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے فرمایا۔ ''جمالی! حق تمہاری ہی طرف تھا۔'' یعنی حق تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کس شخص کا کیا مرتبہ ہے؟''

اس خواب کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ پر حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ کا مقام عارف ظاہر ہو جائے اور انہیں یہ پتا چل جائے کہ ''لمحات'' کی تصنیف میں کس کا فیض روحانی شامل تھا؟

پھر دوسرے دن جب حامد بن فضل اللہ جمالیؒ کی ملاقات مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ سے ہوئی تو انہوں نے اپنا یہ خواب بیان کیا اور سلسلۂ سہروردیہ کے ان بزرگوں کیلئے فاتحہ پڑھی۔

حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ فرمایا کرتے تھے۔ ''حدیث قدسی میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا ہے۔ لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے جو کوئی اس کے اندر داخل ہوا، میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔''

حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ نے اس حدیث قدسی کی تشریح اس طرح فرمائی ہے۔ ''قلعے کی تین قسمیں ہیں۔ ظاہر، باطن اور حقیقت۔ قلعہ ظاہر یہ ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے خوف زدہ نہ ہو اور کسی سے کوئی اُمید نہ رکھے۔ اگر تمام دنیا کے لوگ بھی اس کے دشمن ہو جائیں تو اس بات سے خائف نہیں ہونا چاہئے کیونکہ حق تعالیٰ کے حکم کے بغیر نفع و ضرر اور خیر و شر کا ظہور نہیں ہوتا...... قلعۂ باطن یہ ہے کہ بندے کو یقین ہونا چاہئے کہ موت سے پہلے جو کچھ پیش آتا ہے، وہ بالکل عارضی اور فانی ہے۔ دنیا کی کسی شے کو ثبات نہیں۔ اس لئے اس کے وجود کی ہستی یا نیستی قابل التفات نہیں...... قلعۂ حقیقت یہ ہے کہ دل میں نہ بہشت کی آرزو ہو اور نہ دوزخ کا خوف صرف اللہ ہی اللہ ہو۔ جب انسان کے دل میں یہ سچائی راسخ ہو جاتی ہے تو بہشت خود بخود پیچھے چلی آتی ہے۔''

ایک موقع پر اپنے مریدوں کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے فرمایا۔

''رسول ﷺ کی پیروی کی پہلی شرط کہ جب بندہ ایمان لائے تو اس پر آخری سانس تک قائم رہے ......اور شک وشبہ کی بجائے رغبت، محبت اور معرفت کے ساتھ دل میں یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی ذات میں اکیلا اور اپنی صفات میں یگانہ ہے۔ وہ تمام صفات کمالیہ سے متصف ہے۔ اسمائے صفات اور افعال کے لحاظ سے قدیم ہے۔ اوہام وافہام کے ادراک سے بالاتر ہے۔ حدوث، عوارض اور اجسام کی علامتوں سے پاک ہے۔ اس کی ذات وصفات میں چوں وچرا کرنا جائز نہیں، نہ وہ خود کسی سے مشابہہ ہے اور نہ کوئی اس سے۔ تمام پیغمبر اس کے بھیجے ہوئے ہیں اور محمد مصطفیٰ ﷺ تمام انبیاء میں افضل ہیں۔ جو کچھ آپ ﷺ نے فرمایا صحیح اور درست ہے اور اس میں کوئی تفاوت نہیں۔ خواہ یہ باتیں عقل میں آئیں یا نہ آئیں۔ اگر کوئی بات انسانی حلقۂ فہم سے بعید ہو تب بھی اسے تسلیم کر لینا چاہئے تاکہ اعتقاد درست رہے۔ کیونکہ رسول ﷺ نے اللہ کے حکم کو جانا۔ اس کی کیفیت اور اسباب معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر حق تعالیٰ کے حکم کی تاویل آیات قرآنی اور احادیث مبارکہ کے مطابق ہو تو تاویل کرنا جائز ہے۔ ایمان کی صحت کی علامت یہ ہے کہ اگر بندہ کوئی نیک کام کرے تو اسے خوشی محسوس ہو اور اگر اس سے کوئی برائی سرزد ہو تو اسے برائی، برائی معلوم ہو۔ بندے کے ایمان کی استقامت یہ ہے کہ وہ علم کے بجائے ذوق وحال کی بنا پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب رکھے۔''

ایک اور موقع پر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے اپنے مریدوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

''بندے کی کوئی سانس ذکر سے باہر نہیں نکلنا چاہئے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ جو انسان ذکر کے بغیر سانس لیتا ہے، اپنا حال ضائع کرتا ہے۔''

حضرت شیخؒ نے ایک اور موقع پر فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ جس کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو ''بندۂ سعید'' لکھ دیتا ہے۔ اور اسے زبان کے ذکر کے ساتھ قلب کی موافقت کی توفیق عطا کرتا ہے......اور زبان کے ذکر سے قلب کے ذکر کی جانب ترقی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر زبان ذکر سے خاموش رہتی تو قلب خاموش نہیں ہوتا۔

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی تعلیمات کا یہی خلاصہ ہے۔ اس سے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ کتنے بڑے عامل شریعت وسنت تھے۔

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے انہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی تاریخ وصال میں شدید اختلاف ہے۔ پھر بھی مؤرخین کی اکثریت نے 684ھ کو حضرت شیخؒ کا سال وفات قرار دیا ہے۔ آپ کا مرقد مبارک آپ کے والد محترم حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے پہلو میں ہے۔

آپ کے فرزند اکبر حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ کا شمار بھی سلسلۂ سہروردیہ کے عظیم بزرگوں میں ہوتا ہے۔ تاریخ تصوف میں ایسی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں کہ باپ، بیٹا اور پوتا، تینوں ولایت کے بلند درجے پر فائز ہوں......اور یہ فضیلت حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے گھرانے کو حاصل ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مریدوں میں حضرت سید جلال الدین بخاریؒ کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ آپ کا لقب ''جلال سرخ'' تھا۔ اس لئے آپ کو ''سرخ بخاری'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت سیّد جلال الدین سرخ بخاریؒ 590ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب نو واسطوں سے حضرت امام علی نقیؒ سے مل جاتا ہے۔ حضرت سیّد جلالؒ بخارا سے بھکر تشریف لائے اور اسی مقام پر سکونت اختیار کی۔ پھر آپ نے ملتان جا کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے دست حق پرست پر سلسلۂ سہروردیہ میں بیعت کی اور طویل مجاہدوں اور ریاضتوں کے بعد خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ میر شیر علی قانع کی مشہور تصنیف تحفۃ الکرام میں درج ہے کہ وہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مرید اور یار ہیں۔ یہ بزرگ آپس میں ''چار یار'' کہلاتے ہیں۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ، حضرت سید عثمان مروندیؒ (لال شہباز قلندرؒ) اور حضرت سیّد جلال الدین سرخ بخاریؒ۔

بھکر کے قیام کے دوران حضرت سرخ بخاریؒ نے اس علاقے کے ایک مشہور رئیس سید بدرالدین کی چھوٹی صاحبزادی سے نکاح کیا۔ عزیز واقارب کے حسد کی بناء پر حضرت سید جلال الدین بخاریؒ کو بھکر چھوڑنا پڑا۔ پھر آپ ''اوچ'' تشریف لے آئے اور پھر آخری وقت تک یہی سکونت پذیر رہے۔ اس زمانے میں اوچ کو ''دیوگڑھ'' کہتے تھے۔ حضرت سید بخاریؒ کی آمد کے سبب اس علاقے میں اسلام کی غیر معمولی اشاعت ہوئی۔ وہاں کے ہندو راجہ نے آپ کی شدید مخالفت کی مگر بالآخر اسے اپنی ریاست سے ہاتھ دھونا پڑے اور یہ شہر اسلام کا مرکز قرار پایا۔ اس کے بعد حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ نے پنجاب میں شہر ''جھنگ سیالاں'' کی بنیاد ڈالی اور ایک طویل عرصے تک مغربی پنجاب میں تبلیغ اسلام فرماتے رہے۔ آپ کی کوششوں سے راجپوتوں کے کئی قبیلوں نے اسلام قبول کیا۔ حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ نے 19/جمادی الاول 690ھ کو پچانوے سال کی عمر میں وفات پائی۔ اوچ شریف میں آپ کا مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔

جن دنوں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ بخارا میں سکونت پذیر تھے، ایک نجیب الطرفین سید، شیخ علیؒ آپ کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہو گئے پھر جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ ملتان تشریف لے آئے، تب بھی شیخ علیؒ کا جوش عقیدت کم نہیں ہوا۔ شیخ علیؒ ہر مجلس میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی تعریف کرتے۔ یہاں تک کہ ان کے نوجوان صاحبزادے سید جلال الدین بخاریؒ بھی غائبانہ طور پر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی شخصیت کے اسیر ہو گئے۔ پھر یہ عقیدت اس حد تک بڑھی کہ سید جلال الدین بخاریؒ اپنے والد محترم شیخ علیؒ سے اجازت لے کر ملتان روانہ ہو گئے۔ اس وقت سیاسی صورتحال نہایت ابتر تھی۔ شیخ علیؒ نے اپنے فرزند کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

''تم دیکھ رہے ہو کہ بخارا سے ملتان تک انسانی خون کے دریا بہہ رہے ہیں۔ قتل وغارت کا یہ سیلاب تھم جائے تو حضرت شیخؒ کی زیارت کو چلے جانا۔''

سید جلال الدین بخاریؒ نے والد محترم کی نصیحت سن کر عرض کیا تھا۔ ''جس شخص کی زیارت کو ملتان جا رہا ہوں، اس کے طفیل اتنا تو ہونا چاہئے کہ میں راستے کے آفات و مصائب سے محفوظ رہوں۔''

الغرض سید جلال الدین بخاریؒ کی طلب سچی تھی، اس لئے آپ سلامتی کے ساتھ ملتان پہنچے اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔

حامد بن فضل اللہ جمالیؒ اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ سماء الحق کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ ایک سرد علاقے کے رہنے والے تھے اور اس کے برعکس ملتان روئے زمین کے گرم ترین خطوں میں شامل تھا۔ اگر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ ملتان میں قیام فرما نہ ہوتے تو سید جلال الدین بخاریؒ ایک لمحے کیلئے بھی اس علاقے میں نہ ٹھہرتے...... مگر یہ ان کا اپنے پیر و مرشد سے انتہائی عشق تھا کہ سورج کی تمازت اور موسم کی سختیوں کو خوش دلی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔

ایک دن ہوا بند تھی اور حبس کا یہ عالم تھا کہ سانس لینا بھی دشوار تھا۔ حضرت سید جلال الدین بخاریؒ اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے۔ پورا بدن پسینے سے شرابور تھا اور آپ بڑی بے چینی کے عالم میں پنکھا جھل رہے تھے۔ پھر اسی حالت اضطراب میں آپ کے منہ سے آہ سرد نکلی اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

''آہ! یخ بخارا در چنیں حرارت کجا یابم۔''

(آہ! اس گرم موسم میں بخارا کا برف کہاں مل سکتا ہے۔)

اس وقت حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اپنے دولت کدے میں قیام فرما تھے۔ اچانک آپ باہر تشریف لائے اور خدمت گاروں کو جماعت خانے کی صفیں لپیٹنے اور جھاڑ دو دینے کا حکم دیا۔ تمام خدام فرمودۂ شیخ سن کر حیران تھے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اس سے پہلے عین دوپہر کے وقت صفیں لپیٹنے اور جھاڑ دو دینے کا حکم نہیں دیا تھا۔ الغرض خدمت گار تپتی ہوئی دھوپ میں حکم شیخ پر عمل کرتے رہے۔ نیلے آسمان پر سورج اپنی پوری توانائی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ یکا یک مشرق کی سمت سے ابر کا ایک ٹکڑا اٹھا اور خانقاہ کے اوپر سایہ فگن ہو گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس سیاہ بادل نے گرجنا شروع کر دیا اور بجلی پوری شدت سے کڑکنے لگی۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی بارش شروع ہو گئی اور مرغی کے انڈے کے برابر اولے برسنے لگے۔ آن کی آن میں مسجد کا پورا صحن آسمانی برف سے ڈھک گیا۔ گرمی کی شدت سے سبھی لوگ پریشان تھے۔ رحمت الٰہی کا یہ جانفزا منظر دیکھ کر تمام خدمت گار شاداں و فرحاں نظر آنے لگے۔ قرب و جوار کے لوگ بھی خانقاہ زکریاؒ کی جانب دوڑ پڑے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ پورے ملتان میں تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور سیاہ بادل صرف حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ عالیہ پر برس رہا تھا۔ مقامی باشندے اولوں کو تبرک سمجھ کر لے گئے۔ خانقاہ کے درویشوں نے بھی آسمانی برف کا ذائقہ چکھا اور حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ نے اپنے کھانے پینے کے برتن اولوں سے بھر لئے۔

نماز ظہر سے کچھ دیر پہلے بارش رک گئی اور سورج اسی آب و تاب کے ساتھ دوبارہ نکل آیا۔ خدمت گاروں نے صفیں بچھا دیں اور مؤذن نے خوش الحانی کے ساتھ اذان دی۔

جماعت سے چند لمحے قبل حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ مسجد میں تشریف لائے۔ حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ اگلی صف میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ پیر و مرشد آپ کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا۔

''سید جلال! در یں حال ژالۂ ملتان بہتر است یا یخ بخارا؟''

(سید جلال! اس حالت میں ملتان کے اولے بہتر ہیں یا بخارا کی برف؟)

حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ پیر و مرشد کے احترام میں کھڑے ہو گئے اور نہایت عقیدت مندانہ لہجے میں عرض کیا۔

''سیدی! ژالۂ ملتان از یخ بخارا بہ ہزار درجہ بہتر و اولیٰ است۔''

(سیدی! ملتان کے اولے بخارا کی برف سے ہزار درجہ بہتر اور اعلیٰ ہیں۔)

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے تبسم فرمایا اور نماز میں مشغول ہو گئے۔

اسی کا نام حقیقی ارادت مندی ہے اور اسی کو عشق کہتے ہیں کہ حضرت سید جلال الدین بخاریؒ نے اپنے پیر و مرشد کی محبت میں اپنے آبائی وطن کے تمام حوالوں کی نفی کر دی......اور ملتان کی شدید گرمی کو بخارا کے انتہائی خوشگوار موسم پر ترجیح دی۔ یہ اسی محبت و عقیدت کا صلہ تھا کہ نماز کے بعد اسی روز حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے حضرت سید جلال الدین بخاریؒ کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت نظام الدین اولیاء سے روایت ہے کہ بخارا میں ایک عالم تھے اور انہیں اپنے علم و فضل پر بڑا ناز تھا۔ شوق سیاحت انہیں ہندوستان لے آیا۔ مولانا دارالحکومت دہلی جانا چاہتے تھے۔ جب ملتان پہنچے تو ساتھیوں نے کہا۔

''یہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا علاقہ ہے۔ وہ حضرت شہاب الدین عمر سہروردیؒ کے خلیفۂ اکبر ہیں۔ اگر کچھ دیر کیلئے وہاں تشریف لے چلیں تو یہ ملاقات ہم لوگوں کیلئے باعث برکت ہو گی۔''

مولانا اپنے علم و دانش کے نشے سے سرشار تھے۔ بڑی رعونت کے ساتھ کہنے لگے۔ ''میں ان گوشہ نشین اور بے علم لوگوں سے کوئی رغبت نہیں رکھتا۔ اس قسم کی ملاقاتیں تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں۔''

بخارا کے وہ دانشمند مولانا کچھ دنوں تک ملتان میں مقیم رہے مگر انہوں نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے ملاقات نہیں کی۔ کچھ مقامی علماء ان کے پاس آتے رہے اور وہ اپنے علم و فضل کے بارے میں لاف زنی کرتے رہے۔ پھر جب ملتان سے رخصت ہونے کا وقت قریب آیا تو ساتھیوں نے ایک بار پھر کہا۔

''مولانا! اس میں کوئی حرج نہیں کہ ہم لوگ کچھ دیر کیلئے حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ بہاء الدین زکریاؒ کی بہت شہرت سنی ہے۔ ذرا چل کر تو دیکھیں کہ وہ کس پائے کے

بزرگ ہیں۔"

خلاف توقع مولانا آمادہ ہوگئے۔ یہ شوق ملاقات نہیں تھا بلکہ بخارا کے دانشمند کا انداز خود نمائی تھا۔ وہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے سامنے بھی اپنے علم و فضل کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔ یہی سوچ کر مولانا حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ میں داخل ہوئے۔ حاضرین مجلس نے دیکھا کہ مولانا کے لمبے لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی دستار کا شملہ نیچے لٹک رہا تھا اور وہ بڑی رعونت کے ساتھ قدم اُٹھا رہے تھے۔ جب بخارا کا یہ مغرور دانشمند حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے قریب پہنچا تو حضرت شیخؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"مولانا! دو دو سانپ لے کر آئے ہو؟"

یہ سننا تھا کہ مولانا کی ساری رعونت دور ہوگئی۔ اسی وقت الٹے قدموں واپس لوٹ گئے۔ حاضرین مجلس کو بڑی حیرت تھی۔ مولانا، کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے؟ تھوڑی دیر بعد دوبارہ حاضر ہوئے تو مولانا کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ مولانا نے سر کے بال منڈوا دیئے تھے اور اپنی دستار کا شملہ چھوٹا کرالیا تھا۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ بخارا کے دانشمند کی بدلی ہوئی حالت میں دیکھ کر مسکرائے۔ "مولانا! اچانک یہ انقلاب کیسے آگیا؟"

"یہ سب نگاہِ شیخ کا اثر ہے۔" مولانا نے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے بیعت کیلئے درخواست کی۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ "مولانا! آپ کو تو دہلی جانا ہے، پہلے وہاں کی سیاحت تو کر لیجئے۔"

"اب کہاں جاؤں گا؟" مولانا نے پُرسوز لہجے میں کہا۔ "سارے پتے اور نشانات بھول گیا۔ اب تو ہر راستہ آپ ہی کے در کی طرف جاتا ہے۔"

الغرض حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے مولانا کو حلقۂ ارادت میں شامل فرمایا۔ پھر علم ظاہری کے کوچوں میں بھٹکنے والا بخارا کا یہ دانشمند حقیقت آشنا ہوا۔ برسوں آستانۂ زکریاؒ پر سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر اس پر یہ راز فاش ہوا۔

ولایت، بادشاہی، علم، اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہے، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

اسی طرح سندھ کے مشہور بزرگ حضرت لال شہباز قلندرؒ کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے۔ شہباز قلندرؒ کا خاندانی نام شیخ عثمان مروندیؒ ہے۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ حضرت شیخ عثمان مروندیؒ (لال شہباز قلندرؒ) کا مسلک قلندرانہ تھا، اس لئے قلندر کہلائے۔ اس سلسلے میں یہ روایت بھی شہرت رکھتی ہے کہ ایک بار حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ وہ عظیم صوفی ہیں جنہیں حضرت نظام الدین اولیاءؒ جیسے جلیل القدر بزرگ بھی عزیز رکھتے تھے۔ روایت ہے

[حضرت] امیر خسروؒ بھی کبھی کبھی حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ سے نیاز حاصل کرنے پانی پت حاضر ہوتے [تھے۔ ...] جب حضرت شیخ عثمان مروندیؒ، حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کی خدمت میں پہنچے تو آپ بڑی محبت [سے] پیش آئے۔ کئی دن تک رسم میزبانی ادا کی۔ پھر لال شہباز قلندرؒ سے فرمایا۔

"ہندوستان میں تین سو قلندر موجود ہیں۔ آپ سندھ تشریف لے جائیں۔"

[...] کسی روایات سے یہ تصدیق نہیں ہوتی کہ وہ تین سو قلندر کون تھے؟ اگرچہ سندھ بھی ہندوستان کا [حصہ] تھا لیکن کسی زمانے میں برصغیر دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک ہند اور دوسرا سندھ۔ الغرض حضرت [بوعلی] شاہ قلندرؒ کی ہدایت کے مطابق حضرت لال شہباز قلندرؒ سندھ تشریف لے آئے۔

بعض تذکرہ نگاروں نے حضرت شیخ عثمان مروندیؒ کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ وہ فرقہ ملامتیہ [سے] تعلق رکھنے والے بزرگ تھے۔ "فرقۂ ملامتیہ" ان صوفیوں کا مسلک ہے جو حقیقتاً نہایت راسخ [العقیدہ] مسلمان ہوتے ہیں۔ شریعت اور سنت کے اسرار و رموز کو خوب پہچانتے ہیں مگر ان کا ظاہری عمل [...] ہوتا ہے جسے دیکھ کر عوام الناس انہیں ملامت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب نامور صوفی [حض]رت بایزید بسطامیؒ کی شہرت عام ہوئی تو ہزاروں عقیدت مند اُن کے تعاقب میں رہنے لگے۔

[ایک] بار رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ اپنے حجرے میں ذکرِ الٰہی کر رہے تھے۔ [ایک] خدمت گار نے عرض کیا۔

"شیخ! سیکڑوں بندگان خدا آپ کے دیدار کیلئے آستانے پر کھڑے ہیں۔"

حضرت بایزید بسطامیؒ نے مسکراتے ہوئے اپنے خادم سے کہا۔ "ابھی ان کی عقیدت فنا ہو جائے [گی] اور یہ سب مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"

اتنا کہہ کر حضرت بایزید بسطامیؒ اپنے حجرے سے نکل کر خانقاہ کے دروازے پر آئے۔ انسانی ہجوم [نے] حضرت شیخؒ کو دیکھ کر نعرہ زنی کی۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے اپنے پیرہن کی جیب میں ہاتھ ڈالا [اور] روٹی کا ٹکڑا نکال کر انسانی ہجوم کے سامنے کھانے لگے۔

لوگ بڑی حیرت سے حضرت شیخؒ کو روٹی کھاتے دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں سوچ رہے [تھے۔] "یہ ہے وہ شخص جس کی پارسائی کے قصے ملک کے طول و عرض میں مشہور ہیں۔ یہ روزے نہیں [رکھتا۔] بالفرض اگر اسے کوئی شرعی عذر لاحق ہے تو کم سے کم رمضان کا احترام ہی کرے۔ یہ کیا صوفی ہے [جس] نے درویشی کو مذاق بنا ڈالا ہے؟"

[ابھی] لوگ اسی قسم کی باتیں سوچ رہے تھے کہ حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ انسانی ہجوم سے مخاطب [ہوئے۔] "آپ حضرات کس لئے تشریف لائے ہیں؟"

"ہم ایک مرد بزرگ کے دیدار کو حاضر ہوئے تھے۔" انسانی ہجوم سے بہت سی آوازیں اُبھریں۔

"تو پھر مجھے دیکھ لو کہ میں کیسا ہوں؟" حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔

"بایزید! تم تو ایک عام انسان سے بھی بدتر ہو۔" بیک وقت کئی لوگوں نے چیخ کر کہا۔ "وہ بُرے [لوگ ...] کم سے کم رمضان کا احترام تو کرتے ہیں اور تم اس احساس سے بھی عاری ہو چکے ہو۔ افسوس! ہم

نے اس شخص کے دیدار کی تمنا میں اپنا قیمتی وقت برباد کر دیا جس کا چہرہ دیکھنے کے قابل نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر انسانی ہجوم اپنے گھروں کو لوٹ گیا۔

پھر جب تمام لوگ چلے گئے تو حضرت بایزید بسطامیؒ نے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اے بایزید کے نفس! تو کتنا خوش ہو رہا تھا کہ ہزاروں انسان تیری ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے قرار ہیں...... مگر اب دیکھ کہ کون تجھے دیکھ رہا ہے؟ تیری ذات کو ملامت کرتے ہوئے سب چلے گئے۔ میں آئندہ بھی تیرے ساتھ یہی عمل کروں گا...... اور تجھے لذت اور خوشی کا کوئی موقع حاصل نہیں ہونے دوں گا۔''

یہ ہے فرقہ ملامتیہ کے بزرگوں کا ایک انداز۔ حضرت بایزید بسطامیؒ حقیقتاً روزے سے تھے مگر آپ نے اہل دنیا کے سامنے خود کو روزہ شکن ثابت کیا۔ پھر لوگوں نے آپ کی ذات کو ہدف ملامت بنایا...... مگر حضرت شیخؒ مسکراتے رہے۔ یہ دنیا کا انتہائی مشکل کام ہے کہ پارسا ہوتے ہوئے خود کو گناہ گار ظاہر کرنا اور پوری زندگی کوچۂ ملامت میں بسر کرنا۔ اس پل صراط سے چند ہی بزرگ بعافیت گزر سکے ہیں ورنہ اکثر درویش اس راستے کے پیچ وخم میں ایسے کھوئے کہ پھر زندگی بھر بھٹکتے ہی رہے۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ کے بارے میں بھی کچھ مؤرخین کی یہی رائے ہے کہ آپ کا تعلق فرقۂ ملامتیہ سے تھا...... مگر بعض روایات ایسی بھی موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ آپ ایک باہوش بزرگ تھے۔ اب ہم تحقیق کی روشنی میں ان ہی روایتوں پر مختصر سی بحث کریں گے۔

جب، حضرت شیخ عثمان مروندیؒ کی قلندری کے قصے مشہور ہوئے تو ملتان کے قاضی علامہ قطب الدین کاشانی نے اپنے قریبی دوستوں سے پوچھا۔ ''یہ شیخ عثمان کون ہیں؟''

دوستوں نے علامہ کاشانی کو بتایا۔ ''شیخ عثمان مجذوبانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ احکام شریعت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔''

''کیا عثمان پر بے ہوشی کی کیفیت طاری رہتی ہے؟'' علامہ قطب الدین کاشانیؒ نے دوسرا سوال کیا۔

''شیخ عثمان پر مدہوشی کا غلبہ تو نہیں رہتا مگر وہ قلندرانہ انداز رکھتے ہیں۔'' علامہ کاشانی کے دوستوں نے لال شہباز قلندرؒ کے عمل کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

یہ وہی علامہ قطب الدین کاشانیؒ ہیں جنہیں ملتان کے حاکم ناصرالدین قباچہ نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی شخصیت کو بے اثر کرنے کیلئے کاشان سے بلایا تھا۔ علامہ قطب الدین ایک عالم و فاضل انسان تھے مگر صوفیت اور درویشی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ حضرت شیخ عثمان مروندیؒ کی قلندرانہ شان کے بارے میں سن کر کہنے لگے۔

''یہ قلندری کیا ہوتی ہے؟ مذہب میں شریعت وسنت کے سوا کسی شے کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر شیخ عثمان ایسا کرتے ہیں تو وہ ''فسق'' میں مبتلا ہیں۔''

شرع کی اصطلاح میں ''فسق'' اسے کہتے ہیں جب کوئی مسلمان جان بوجھ کر احکام الٰہی پر عمل

زل کردیتا ہے۔

حضرت شیخ عثمان مروندیؒ (لال شہباز قلندرؒ) ان دنوں اتفاق سے ملتان کے نواحی علاقے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کچھ لوگوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔

''شیخ! علامہ قطب الدین کاشانیؒ نے آپ کی ذات پر ''فسق'' کا فتویٰ عائد کر دیا ہے۔''

روایت ہے کہ علامہ کاشانیؒ کا فتویٰ سن کر حضرت شیخ عثمان مروندیؒ بھڑک اُٹھے۔ ''میں قطب الدین کاشانی کو بتاؤں گا کہ ان کا علم کیا ہے اور میرا فسق کیا ہے؟''

یہ کہہ کر حضرت شیخ عثمان مروندیؒ اپنے خدمت گاروں کے ساتھ اُٹھے اور شہر ملتان کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس وقت شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریاؒ مسند ارشاد پر جلوہ افروز تھے اور حدیث رسول ﷺ کی تشریح بیان کر رہے تھے۔ پھر جب حضرت شیخؒ درس دے چکے تو مجلس میں ایک شور سا بلند ہوا کہ سندھ سے شیخ عثمان نام کے کوئی بزرگ علامہ قطب الدین کاشانیؒ سے مناظرہ کرنے کیلئے بگولے کی طرح اُڑتے چلے آرہے ہیں۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اپنے حقیقی بھتیجے حضرت شیخ حسنؒ سے فرمایا۔

''فرزند! تم جاؤ اور شیخ عثمانؒ کو انتہائی نرمی سے سمجھا بجھا کر میرے پاس لے آؤ۔''

حضرت شیخ حسنؒ نے کچھ فاصلہ طے کر کے حضرت شیخ عثمان مروندیؒ کا استقبال کیا۔ ''میرے عم محترم شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریاؒ آپ کا انتظار فرما رہے ہیں۔''

روایت ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کا نام سنتے ہی حضرت لال شہباز قلندرؒ نرم پڑ گئے اور حضرت شیخ حسنؒ کے ہمراہ خانقاہ زکریاؒ میں داخل ہوئے۔ شیخ عثمانؒ کو دیکھتے ہی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''لال شہباز! آگے بڑھ!''

حضرت شیخ عثمانؒ نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھا اور پھر وہ سب کچھ بھول گئے۔ کچھ لوگوں نے دیکھا کہ لال شہباز قلندرؒ حیرت کے عالم میں کہہ رہے تھے۔ ''یہ جمال کسی انسان کا نہیں، چاند کا نہیں، سورج کا نہیں۔ یہ چہرہ تو ہزار آفتابوں سے زیادہ منور دکھائی دے رہا ہے۔ ایسے مردان خدا بار بار نہیں ملتے۔ اے عثمان! آگے بڑھ اور اپنے آپ کو اس کے قدموں میں ڈال دے۔''

پھر حاضرین مجلس نے دیکھا کہ حضرت شیخ عثمان مروندیؒ بے تابانہ آگے بڑھے اور آفتاب معرفت حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے سامنے خم ہو گئے۔ حضرت شیخؒ نے آپ کو اُٹھا کر گلے سے لگایا اور بہت دیر تک اسی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر حضرت شیخؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں عرض کیا۔

''اے پیکر نور! مجھ سے خطا ہوئی۔ معاف فرما دیجئے۔ میں آپ کے شہر کے ایک عالم کو اپنی گرفت میں لانا چاہتا تھا مگر خود اسی زنجیر میں جکڑ دیا گیا۔ براہِ کرم مجھے بھی اپنے حلقۂ بیعت میں

شامل فرما لیجئے۔"

سلسلۂ سہروردیہ کے تذکرہ نگاروں کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے حضرت شیخ عثمان مروندیؒ کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل فرما لیا تھا۔ دوسرے یہ کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے سب سے پہلے حضرت شیخ عثمانؒ کو "لال شہباز" کہہ کر پکارا تھا۔ پھر یہی لقب شہرت دوام حاصل کر گیا، اگر ہم ان روایات کو درست تسلیم کر لیں تو تحقیق کی روشنی میں یہ اُلجھن پیش آتی ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اور حضرت لال شہباز قلندرؒ کے مسلک جداگانہ تھے۔ اگر لال شہباز قلندرؒ، حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مرید ہوتے تو وہ اپنے نام کے ساتھ "قلندر" کا لفظ استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ حضرت شیخ عثمانؒ اپنی زندگی میں صرف "لال شہباز" کے لقب سے مشہور ہوں مگر بعد میں ان کے عقیدت مندوں نے لفظ قلندر کا اضافہ کر دیا ہو۔ ہم اس دلیل کو تسلیم کئے لیتے ہیں مگر دونوں بزرگوں کے عرس کے موقع پر جو رسمیں ادا کی جاتی ہیں ان میں بھی نمایاں اختلاف موجود ہے اور یہی اختلاف ثابت کرتا ہے کہ تصوف کے دونوں سلسلے جداگانہ ہیں۔ اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ اپنے پیرومرشد کی حیات تک تو سلسلۂ سہروردیہ کے طریقوں پر عمل پیرا رہے ہوں اور حضرت شیخؒ کے وصال کے بعد دوسرا مسلک اختیار کر لیا ہو۔

دورِ جدید کے مشہور محقق اعجاز الحق قدوسی نے اپنی کتاب "صوفیائے پنجاب" میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا خلیفہ قرار دیا ہے...... مگر صاحب کتاب نے دونوں بزرگوں کے متضاد انداز درویشی پر نظر نہیں ڈالی۔ اعجاز الحق قدوسی صاحب نے جن کتابوں کے حوالے سے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اور حضرت لال شہباز قلندرؒ کے درمیان یہ رشتہ قائم کیا ہے، وہ تمام کتابیں نگاہ تحقیق میں نامعتبر ہیں۔ ماضی کے کسی بھی مستند تذکرہ نگار نے حضرت لال شہباز قلندرؒ کو سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا ہے۔ اب حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اور حضرت شیخ عثمان مروندیؒ (لال شہباز قلندرؒ) کے درمیان روابط کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ دونوں بزرگ دوستانہ مراسم رکھتے تھے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ حسن اخلاق کا ایک بہترین نمونہ تھے۔ تواضع اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ آپ اپنی تعظیم و تکریم کو ناپسند فرماتے تھے۔ ایک دن خانقاہ میں کچھ مرید وضو کر رہے تھے کہ اتفاق سے حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ وہاں تشریف لے آئے۔ پیرومرشد کو دیکھتے ہی تمام مریدین اور خدمت گار وضو نامکمل چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور آپ کی خدمت میں سلام پیش کیا...... مگر ایک مرید اطمینان سے وضو مکمل کر کے کھڑا ہوا اور تعظیم بجا لایا۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے محبت آمیز نظروں سے اپنے مرید کی طرف دیکھا اور بہ آواز بلند فرمایا۔ "تم سب درویشوں میں افضل اور زاہد ہو۔"

اس کے برعکس حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ دوسرے لوگوں کی بڑی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔ جب سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ملتان تشریف لائے تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے آپ کو اپنا مہمان خاص بنایا اور انتہائی ادب اور احترام کا مظاہرہ کیا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ چنانچہ جب معتقدین نے مستقل طور پر قیام ملتان کے بارے میں حضرت قطبؒ سے عرض کیا تو آپ نے فرمایا۔ "ملتان پر شیخ بہاء الدینؒ کا سایہ اور قبضہ کافی ہے۔ انشاء اللہ ان ہی کی حمایت تم لوگوں کے ساتھ رہے گی۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے استغنا اور بے نیازی کی یہ کیفیت تھی کہ آپ نے ایک دن اپنے خادم سے فرمایا۔ "فلاں صندوقچے میں پانچ ہزار دینار، سرخ رکھے ہیں، وہ لے آؤ۔"

تھوڑی دیر بعد خادم نے واپس آ کر عرض کیا۔ "صندوقچہ کہیں نہیں ملتا۔"

خادم کا جواب سن کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ "الحمدللہ۔"

خادم نے دوبارہ تلاش شروع کی تو صندوقچہ مل گیا۔ اس نے خوشی خوشی آ کر اطلاع کی تو حضرت شیخؒ نے فرمایا۔ "الحمدللہ۔"

حاضرین مجلس میں سے کسی عقیدت مند نے پوچھا۔

"شیخ! آپ نے دونوں حالتوں میں الحمدللہ کہا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟"

جواباً حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ فقیروں کیلئے دنیا کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں۔ انہیں کسی چیز کے ملنے پر نہ خوشی ہوتی ہے اور نہ کسی چیز کے جانے کا غم ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر آپ نے وہ پانچ ہزار دینار ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیئے۔

پھر چھیانوے سال کی عمر میں زہد و تقویٰ، علم و فضل، انکسار و تواضع اور جود و سخا کا پیکر، دنیائے اسلام کا عظیم مبلغ بے شمار گمراہوں کو صراطِ مستقیم پر گامزن کر کے اپنے خالق سے جا ملا۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے وصال کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے، وہ 7/صفر 661ھ کا دن تھا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اپنے حجرۂ مبارک میں آرام فرما رہے تھے۔ اچانک ایک بزرگ صورت شخص خانقاہ کے دروازے پر نمودار ہوئے اور انہوں نے حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ کے بارے میں لوگوں سے پوچھا۔ پھر جب حضرت شیخ عارفؒ تشریف لائے تو ان اجنبی بزرگ نے آپ کی طرف ایک لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ اپنے بابا جان کو پہنچا دو۔ بہت ضروری خط ہے۔"

حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ نے لفافے پر لکھا ہوا عنوان دیکھا تو حیران ہوئے مگر بزرگ سے کوئی استفسار نہیں کیا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں پہنچ کر لفافہ پیش کیا اور فوراً ہی حجرے سے نکل آئے۔ پھر ان بزرگ کو تلاش کیا تو دور دور تک ان کا پتا نہیں تھا۔ ابھی حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ ان بزرگ کی آمد و رفت کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ فضا میں ایک تیز آواز

گونجنے لگی۔

''دوست بہ دوست رسید۔''

(دوست، دوست کے پاس پہنچ گیا۔)

یہ آواز اس قدر تیز تھی کہ خانقاہ میں موجود تمام لوگوں نے سنی۔ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ دوڑتے ہوئے حجرۂ مبارک میں داخل ہوئے اور آپ نے یہ جانگداز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

بظاہر حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ کا جسد خاکی قبر کی گہرائیوں میں اُتر گیا مگر آپ کے ایمان کی حرارت آج بھی آٹھ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی باقی ہے۔ اہل دل اس حرارت کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس سے نئی توانائیاں بھی حاصل کرتے ہیں۔

حضرت میاں میر لاہوریؒ

ولادت...... 957ھ سیہون (سندھ)

وفات...... 1045ھ لاہور

خاندانی نام...... میر محمد، بعض مؤرخین نے شیخ محمد بھی تحریر کیا ہے۔ والدِ محترم کا اسمِ گرامی سائیں دتہ اور دادا کا نام قاضی قلندر فاروقی تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ حضرت میاں میرؒ عہدِ شاہجہانی کے سب سے بااثر شیخ تھے۔ آپ کو عوام الناس کے ساتھ درباری اور علمی حلقوں میں بھی بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ حضرت میاں میرؒ کے روحانی کمالات کے سبب سلسلۂ قادریہ کو دوبارہ فروغ حاصل ہوا۔

شہنشاہ جہانگیر اور اس کی محبوب ملکہ نور جہاں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور مغل سلطنت جو ایک طویل عرصے سے انتشار کا ہدف بنی ہوئی تھی، ایک بار پھر مستحکم ہوگئی۔ نوجوان شہزادے خرم نے اپنے تمام سیاسی حریفوں کو شکست دی اور شہاب الدین، شاہ جہاں کے لقب سے ہندوستان کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔

مغل شہنشاہ کے شب و روز آرام سے گزر رہے تھے کہ اچانک اس کا سب سے بڑا اور محبوب بیٹا داراشکوہ بیمار ہوگیا۔ شاہی طبیبوں نے ابتدائی معائنے کے بعد بیک زبان کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں، یہ ایک عام سا بخار ہے جو معمولی دواؤں کے استعمال کے بعد اتر جائے گا۔ شاہ جہاں اور ملکہ ممتاز محل طبیبوں کی گفتگو سن کر مطمئن ہوگئے۔ علاج جاری رہا مگر شاہی طبیبوں کے تجویز کردہ نسخے سے شہزادہ داراشکوہ کو کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ مرض آہستہ آہستہ بڑھتا ہی رہا۔

مغل شہنشاہ نے دوبارہ طبیبوں سے رجوع کیا۔ شاہی حکیموں کو حیرت تھی کہ ان کی دوائیں بے اثر کیوں گئیں؟ ایک بار پھر شہزادے داراشکوہ کا تفصیلی معائنہ کیا گیا۔ بہترین اور اثر انگیز دوائیں منتخب کی گئیں مگر بالآخر وہ بھی ایک مشت خاک ٹھہریں۔ شہزادہ داراشکوہ کے مرض میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ولی عہد سلطنت اس قدر لاغر و نحیف ہوگیا کہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ شاہ جہاں اور ملکہ ممتاز محل کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ وہ اپنے محبوب فرزند کو ایک شمع کی طرح پگھلتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ آخر علمائے دربار نے مغل شہنشاہ کو مشورہ دیتے ہوئے عرض کیا۔

''شاہ عالی مقام! آثار و قرائن بتاتے ہیں کہ یہ کوئی بیماری نہیں۔ اگر شہزادۂ معظم کو کوئی مرض لاحق ہوتا تو شاہی طبیب اب تک بیماری کی تشخیص کر چکے ہوتے۔''

مغل شہنشاہ نے علمائے دربار کی گفتگو بہت غور سے سنی۔ پھر نہایت افسردہ لہجے میں بولا۔ ''اگر یہ کوئی مرض نہیں تو پھر کیا ہے؟''

"کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آسمانی بلائیں انسان کو گھیر لیتی ہیں۔" علمائے دربار نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اور ان بلاؤں کا رد کسی دوا سے ممکن نہیں۔ ایسے مواقع پر صدقات اور دعائیں ہی انسان کے کام آتی ہیں۔"

دیکھتے ہی دیکھتے دارالحکومت میں اعلان کرا دیا گیا۔ پھر ہر مذہب وملت کے لوگ اپنے اپنے طریقوں کے مطابق شہزادہ داراشکوہ کی صحت یابی کیلئے دعائیں کرنے لگے۔ مسجدوں، مندروں اور گردواروں میں ایک ہی قسم کے الفاظ کی گونج سنائی دینے لگی۔ انداز مختلف تھے مگر ہر مسلمان، ہندو، سکھ اور دیگر عقائد رکھنے والے لوگوں کی دعاؤں کا مفہوم ایک ہی تھا کہ خالق کائنات شہزادہ داراشکوہ کو صحت عطا کرے۔

دعاؤں کی گونج کے ساتھ صدقات بھی جاری تھے۔ خزانۂ شاہی کے زیر اہتمام قدم قدم پر لنگر خانے قائم کردیئے گئے تھے جہاں صبح وشام ہزاروں بھوکے کھانا کھا کر اپنے "ان داتا" سے ولی عہد سلطنت کی زندگی کی بھیک مانگا کرتے تھے...... مگر وہ نامعلوم بلا یا بیماری کسی طرح بھی شہزادہ داراشکوہ کا ساتھ نہیں چھوڑتی تھی۔

شاہجہاں اور ملکہ ممتاز محل کا اضطراب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ جواں سال بیٹے کی تیمارداری کرتے کرتے ماں باپ بھی بیمار نظر آنے لگے تھے۔

پھر ایک دن کسی مصاحب نے خلوت کدے میں مغل شہنشاہ سے عرض کیا۔ "ظل الٰہی! شہزادۂ معظم کی صحت وعافیت کیلئے بظاہر ساری تدبیریں آزمائی جا چکیں...... مگر فائدہ؟"

"ہمارے اختیار میں کچھ نہیں۔" اپنے مصاحب کی بات سن کر شاہجہاں رو پڑا۔ "اگر کوئی طبیب یا حکیم شہزادے کی زندگی کی ضمانت دے تو ہم اسے یہ سلطنت بطور انعام دے سکتے ہیں۔" ایک عظیم الشان سلطنت کے فرمانروا کی بے چارگی قابل دید تھی۔

"آپ ایک مرد فقیر سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟" مصاحب نے اپنے شہنشاہ کو مشورہ دیتے ہوئے عرض کیا۔ "اس مرد فقیر کو نہ سیم وزر کی حرص ہے اور نہ منصب وجاہ کی طلب۔"

"کون ہے وہ فقیر؟" شاہجہاں مصاحب کی بات سن کر چونک اُٹھا۔ اسے مایوسیوں کے اندھیرے میں امید کی ایک ہلکی سی کرن نظر آئی تھی۔ "کہاں رہتا ہے وہ فقیر؟ اس سے درخواست کرو کہ وہ اپنی جھولی میں پڑی ہوئی کیمیا داراشکوہ کو بخش دے۔"

"وہ فقیر لاہور کے ایک سنسان گوشے میں رہتا ہے۔" مصاحب نے درویش کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کس بات کا انتظار ہے۔ ہمارا پیغام اس درویش تک پہنچا دو۔" شاہجہاں نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ "اگر شہزادے کو کھوئی ہوئی صحت مل گئی تو ہم درویش کے ساتھ تمہارے بھی ممنون احسان ہوں گے۔"

پھر کئی برق رفتار شہسوار قاصدوں کی حیثیت سے لاہور کی طرف دوڑ پڑے۔

درویش خدامست اپنے ایک خادم کے ساتھ ایک مختصر سی خانقاہ میں گوشہ نشیں تھا۔

"شاہی کارندے حضور سے ملنا چاہتے ہیں۔" خادم نے دست بستہ عرض کیا۔

"مگر یہ فقیر تو کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔" درویش نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "پھر یہ شاہان مغرور، خدا کے بندے کو کیوں ستاتے ہیں؟"

شاہی قاصدوں کے چہرے اُتر گئے۔ درویش نے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر ان لوگوں نے بہت خوشامد کی۔ آخر درویش نے مغل شہنشاہ کے کارندوں کو اپنی خدمت میں طلب کر لیا۔

"تمہارے فرمانروا کو مجھ ناکارہ سے کیا کام ہے؟" درویش کے لہجے میں اس قدر جلال تھا کہ شاہی سفیر کانپنے لگا۔

"ولی عہد سلطنت بیمار ہے۔" شاہی سفیروں نے عرض کیا۔ "ظل الٰہی کی خواہش ہے کہ آپ ایک نظر شہزادے کو دیکھ لیں۔"

"میں کوئی طبیب ہوں کہ کسی بیمار کو دیکھ لوں۔" درویش نے بے نیازانہ کہا۔

شاہی قاصدوں نے بہت خوشامد کی مگر درویش کے ہونٹوں پر حرف انکار کے سوا کچھ نہیں تھا۔

پھر خادم کی درخواست پر درویش نے بس اس قدر آمادگی کا اظہار کیا۔ "اگر بادشاہ سمجھتے ہیں کہ یہ فقیر کسی مریض کا علاج کر سکتا ہے تو اُنہیں لازم ہے کہ وہ بیمار کو یہاں لے آئیں۔"

شاہی قاصد طوفانی انداز میں دہلی واپس لوٹے اور درویش کا جواب شہنشاہ ہند کے گوش گزار کر دیا۔

شہزادہ داراشکوہ کی ظاہری حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اتنا طویل سفر برداشت کر سکتا۔ پھر بھی مغل شہنشاہ نے اپنے درباری طبیبوں سے مشورہ کیا۔

"ظل الٰہی! دہلی سے لاہور کا سفر ایسا ہی ہے جیسے ہم شہزادۂ معظم کی زندگی سے جان بوجھ کر ایک خطرناک کھیل کھیلیں۔" شاہی طبیبوں نے بیک زبان کہا۔ "خاکم بدہن! اس کھیل کا نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" درباری حکیموں نے مبہم لہجے میں فرمانروائے ہندوستان پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ اگر شہزادے نے یہ سفر اختیار کیا تو وہ اپنی زندگی سے ہاتھ بھی دھو سکتا ہے۔

شہنشاہ شاہجہاں اور ملکہ ممتاز محل بہت دیر تک گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بیٹے کو لاہور لے جا کر ایک کھلا ہوا خطرہ مول لیں یا پھر شہزادے کو اسی طرح سسکتا ہوا چھوڑ دیں۔ بالآخر والیٔ ہندوستان نے ایک طویل ذہنی کشمکش کے بعد ملکہ ممتاز محل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ درویش خدا کا برگزیدہ بندہ ہے تو پھر اس کی دعاؤں سے شہزادہ ہر طرح محفوظ رہے گا...... اور اگر مشیت الٰہی میں داراشکوہ کی موت مقدر ہو چکی ہے تو پھر قصر شاہی کی تمام سہولتیں اور آسائشیں مل کر بھی اس کی سانسوں میں اضافہ نہیں کر سکتیں۔" یہ ایک مشکل ترین فیصلہ تھا جس پر شاہجہاں نے قوت ارادی کے ساتھ عمل کیا۔

راستے میں ایسے کئی مقام آئے جہاں مغل شہنشاہ کو یہ محسوس ہوا کہ اب شہزادہ داراشکوہ کے چراغ زندگی کو بجھنے سے نہیں بچایا جاسکتا...... مگر اچانک شاہجہاں کو محسوس ہوتا کہ چراغ کی لو تھرتھراتے تھرتھراتے یکا یک سنبھل گئی ہے۔ مختصر یہ کہ اسی اذیت ناک فضا میں شہاب الدین شاہ جہاں ایک ڈھانچے کو لے کر لاہور پہنچا اور پھر درویش کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔

مستند تاریخی روایت ہے کہ فرمانروائے ہندوستان جلال و جبروت کے کسی مظاہرے کے بغیر ایک عام انسان کی طرح درویش کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔

شاہجہاں کا یہ عجز و انکسار دیکھ کر فقیر اپنی چٹائی سے اُٹھا اور اسلامی آداب کے مطابق شاہجہاں سے مصافحہ کیا۔

اس دوران داراشکوہ کا پلنگ خانقاہ کے ایک گوشے میں رکھ دیا گیا تھا۔

پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مملکت ہند کا مطلق العنان حکمراں ایک گدڑی پوش فقیر کے سامنے دست بستہ اور دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔

"بادشاہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں کوئی طبیب نہیں ہوں اور روحانیت میں بھی میرا کوئی مرتبہ نہیں ہے۔" فقیر نے اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔ "اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تاجدار ہندوستان نے اس قدر دشوار گزار سفر کیوں اختیار کیا؟"

"میں حضور سے حسن ظن رکھتا ہوں۔" مغل شہنشاہ کے لہجے سے انتہائی عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"بے شک! آپ ایک غیرت مند صوفی اور مرد بے نیاز ہیں اگر آپ کے دل میں ذرہ برابر بھی طلب دنیا ہوتی تو میرے ایک اشارے پر دہلی چلے آتے۔"

درویش فرمانروائے ہندوستان کے اس طرز کلام سے بہت متاثر ہوا۔ "خدا شہنشاہ کو اس حسن ظن کی جزا دے۔" یہ کہہ کر درویش نے مٹی کے پیالے میں پانی بھرا۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھا اور شہزادہ داراشکوہ کے پلنگ کے قریب پہنچ کر ولی عہد سلطنت سے مخاطب ہوا۔

"اے جان بے قرار! ہمیں تو بہت دنوں سے تیرا انتظار تھا مگر تو آیا بھی تو کس حال میں آیا۔"

درویش کے لہجے میں اس قدر سوز تھا کہ شاہجہاں کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں اور خود داراشکوہ بھی رونے لگا۔

"شیخ! میری ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ میں اپنی کوشش سے اُٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا۔"

"شہزادے! ہمت تو کرو۔" یہ کہہ کر درویش نے ولی عہد سلطنت کے جسم کو اپنے بائیں ہاتھ کا ہلکا سا سہارا دیا۔ پھر حاضرین خانقاہ نے اپنی آنکھوں سے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ داراشکوہ جو ناتوانی کے سبب کروٹ بھی نہیں لے سکتا تھا، آسانی کے ساتھ اپنے پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر درویش نے اپنا ایک ہاتھ مغل شہزادے کے سر پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے پانی پلایا۔

مٹی کے پیالے کا وہ پانی کیا تھا، اپنی تاثیر میں آب حیات سے بڑھ کر تھا۔ چند گھونٹ حلق سے اترتے ہی داراشکوہ کو محسوس ہوا کہ جیسے بے جان سے جسم میں توانائی کی نئی لہر دوڑ گئی ہے۔

شاہجہاں نے درویش کی خانقاہ میں ایک ہفتے تک قیام کیا۔ اس دوران فرمانروائے ہند ایک فقیر بے مایہ کا مہمان تھا۔ درویش نے حسب استطاعت معمولی غذا تاجدار ہند کے سامنے دسترخوان پر رکھی اور مغل شہنشاہ نے اس غریبانہ خوراک کو نہایت ذوق وشوق کے ساتھ کھایا۔

داراشکوہ اپنی مشہور تصنیف "سکینۃ الاولیاء" میں ایک مقام پر تحریر کرتا ہے۔

"میرے والد محترم مجھے اس وقت حضرت شیخؒ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے جب ہندوستان کے تمام حاذق اطباء میرے علاج سے عاجز آگئے تھے اور بظاہر میری سانسوں کا شمار ختم ہوتا نظر آتا تھا مگر حضرت شیخؒ نے مجھے مٹی کے اس پیالے سے پانی پلایا جسے آپ خود استعمال فرمایا کرتے تھے۔ پھر قدرت خداوندی کا کرشمہ اس طرح ظاہر ہوا کہ میں ایک ہفتے کے اندر اس طرح صحت یاب ہوگیا کہ جیسے کبھی بیمار ہی نہیں ہوا تھا۔"

شاہجہاں بیٹے کی صحت یابی کا جشن اس طرح منانا چاہتا تھا کہ فقیر کے قدموں میں سیم وزر کے انبار لگادے اور اس کی خانقاہ کے درودیوار میں طلائی رنگ بھردے مگر درویش نے یہ کہہ کر انکار کردیا۔

"اگر بادشاہ کچھ دینا چاہتے ہیں تو بس اتنا کرم کریں کہ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔"

مغل شہنشاہ نے پہلی بار کسی انسان کی یہ شانِ بے نیازی دیکھی تھی۔ آخر اس نے دوسرے زاویے سے درخواست کی۔ "اگر شیخ یہ نذرات وتحائف خود قبول نہیں فرماتے تو اپنے خدمت گاروں میں تقسیم کردیں۔"

"بڑی عجیب بات ہے کہ میں جس چیز کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا، اسے دوسروں کیلئے پسند کروں۔" درویش نے نہایت پُرسوز لہجے میں کہا۔

انجام کار شاہجہاں دہلی لوٹ آیا۔ راستے بھر وہ زیر لب ایک ہی بات دہراتا رہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ ابھی اس کی مملکت میں ایسے جانباز موجود ہیں۔"

جس درویش کے دست کارساز سے پانی کے چند گھونٹ پی کر مغل شہزادے داراشکوہ نے ایک لاعلاج بیماری سے نجات حاصل کی تھی، وہ سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ حضرت میاں میر لاہوریؒ تھے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت میاں میرؒ کا خاندانی نام میر محمد تھا۔ بعض مؤرخین نے شیخ محمد تحریر کیا ہے۔ آپ سندھ کے قدیم شہر سیوستان میں پیدا ہوئے۔ سیوستان کو سہوان بھی کہتے ہیں جو موجودہ پاکستان کے ضلع دادو میں واقع ہے۔ حضرت میاں میرؒ کی تاریخ پیدائش میں بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ مغل شہزادے داراشکوہ نے اپنی مشہور تصنیف "سکینۃ الاولیاء" میں 938ھ کو آپ کا سال ولادت قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس مشہور کتاب "تحفۃ الکرام" میں آپ کی تاریخ پیدائش 957ھ درج ہے۔

سرنصف نامہ کے اعتبار سے حضرت میاں میرؒ کا تعلق خلیفہ ثانی امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے خاندان سے ہے۔ اسی لئے آپ فاروقی کہلاتے ہیں۔ حضرت میاں میرؒ کے والد محترم کا اسم

گرامی قاضی سائیں دتہ تھا۔ بعض مؤرخین نے ''سائیندنہ'' تحریر کیا ہے۔ حضرت قاضی سائیں اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے لحاظ سے نہ صرف سیوستان بلکہ پورے سندھ میں ممتاز مانے جاتے تھے۔ ابھی حضرت میاں میرؒ کی عمر صرف بارہ سال تھی کہ آپ کے سر سے والد ماجد کا سایہ اُٹھ گیا۔ مگر خاندان میں علم و فضل کا چرچا تھا اس لئے تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت میاں میرؒ کی والدہ محترم بی بی فاطمہ قاضی قازن کی صاحبزادی تھیں۔ خود بھی نہایت عالم و فاضل اور پرہیزگار خاتون تھیں، اس لئے بی بی فاطمہؒ نے اپنے فرزند حضرت میاں میرؒ کو سلسلۂ قادریہ کے سلوک کی تعلیم دی۔ بعض تاریخی روایتوں کے مطابق حضرت میاں میرؒ کے چار بھائی تھے۔ دو بہنیں تھیں جن میں سے ایک کا نام بی بی جمال خاتون تھا۔ بی بی جمال کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے زمانے کی رابعہ بصریؒ تھیں۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

علم ظاہری کی تکمیل کے بعد حضرت میاں میرؒ حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت شیخ خضرؒ سندھ میں سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ حضرت شیخؒ کے صبر و قناعت اور توکل کی انتہا یہ تھی کہ ساری زندگی مال دنیا کے نام پر ایک کوڑی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ نے اپنی عمر کا طویل حصہ ایک قبرستان میں گزارا۔ پھر آپ سیوستان کے باہر ایک پہاڑ میں سکونت پذیر ہوگئے جہاں سارا وقت عبادتوں، مجاہدوں اور یادالٰہی میں گزارتے تھے۔ حضرت خضر سیوستانیؒ نے ایک تنور بھی بنوایا تھا۔ جب شدید سردی کا موسم آتا تو آپ اس تنور کو جلتی ہوئی لکڑیوں سے بھر دیتے۔ پھر برفانی راتیں اسی تنور کے قریب بسر کرتے۔ حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ سردی اور گرمی میں ہمیشہ ایک ہی لباس استعمال کرتے اور وہ لباس ایک تہہ بند پر مشتمل ہوتا۔ پہاڑ میں مقیم ہونے کے بعد شہر سے آپ کا رابطہ کم و بیش ختم ہوگیا تھا۔ اہل دنیا سے اجتناب کا یہ عالم تھا کہ اللہ کے سوا آپ کا کوئی دوست نہیں تھا۔ حضرت شیخ درختوں کے پتے کھا کر زندگی بسر کرتے تھے۔

مغل شہزادے دارا شکوہ نے اپنی دوسری مشہور تصنیف ''سفینۃ الاولیاء'' میں ایک مقام پر تحریر کیا ہے۔

ایک بار سیوستان کا حاکم حضرت شیخ خضرؒ کی زیارت کیلئے پہاڑ پر حاضر ہوا۔ اس وقت شدید گرمی کا موسم تھا حاکم سیوستان نے دیکھا کہ حضرت شیخ خضرؒ پر استغراق کی کیفیت طاری تھی اور آپ جلتی ہوئی دھوپ میں ایک تپتے ہوئے پتھر پر بیٹھے تھے۔ حاکم دبے پاؤں آگے بڑھا مگر حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ نے آنکھ کھول کر نہیں دیکھا۔ پھر وہ آپ کے قریب پہنچ کر اس زاویئے سے کھڑا ہوگیا کہ سورج اس کی پشت پر آگیا اور حضرت شیخؒ چند لمحوں کیلئے حاکم کے سائے میں آگئے۔ حاکم کی نیت یہی تھی کہ حضرت شیخؒ کچھ دیر کیلئے تیز دھوپ سے محفوظ رہیں۔

پھر جیسے ہی حضرت شیخ خضرؒ پر حاکم سیوستان کا سایہ پڑا، آپ نے آنکھیں کھول دیں اور نہایت پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ ''تم کون ہو اور یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟''

''میں اس علاقے کا حکمراں ہوں۔'' حاکم سیوستان نے انتہائی عقیدت و انکسار کے ساتھ عرض

''آپ کی زیارت سے شرفیاب ہونے کیلئے حاضر ہوا ہوں۔''

''کیا تم نے زیارت کرلی؟'' حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ نے حاکم سے پوچھا۔

''جی ہاں! آپ کے صدقے میں یہ دولت دیدار مجھے حاصل ہوگئی۔'' حاکم سیوستان نے فرطِ ادب سے کسی قدر خم ہوتے ہوئے کہا۔

''جب مقصد پورا ہوگیا تو میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ نے ایک خاص شان بے نیازی کے ساتھ فرمایا۔

''اگر آپ مجھے کسی خدمت کا موقع عنایت کریں تو یہ میرے لئے انتہائی سعادت ہوگی۔'' حاکم سیوستان حضرت شیخ کے روبرو اپنے انکسار کا مظاہرہ کرنے کیلئے مزید خم ہوگیا۔

''میرے بھائی! مجھے کیوں تنگ کرتے ہو؟'' حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ نے نہایت بےزاری کے ساتھ فرمایا۔ ''بفضل خدا میرا کوئی کام ایسا نہیں ہے جسے تم انجام دے سکو۔''

''میں جانتا ہوں مگر پھر بھی شیخ مجھے کسی خدمت کا موقع مرحمت فرمائیں۔''

حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ کی بےزاری میں کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا مگر پھر بھی آپ نے نہایت تحمل کے ساتھ فرمایا۔ ''اگر میں تمہیں اپنی کسی خدمت کا موقع دوں تو کیا تم اسے خوش دلی کے ساتھ انجام دوگے؟''

حاکم سیوستان حضرت شیخؒ کی بات کی گہرائی کو سمجھنے سے قاصر رہا اور انتہائی پُرجوش لہجے میں کہنے لگا۔ ''شیخ! آپ حکم تو دیں۔''

''تم نے اپنا یہ سایہ جو مجھ پر ڈال رکھا ہے، اسے بلا تاخیر دور کردو۔'' حضرت شیخ سیوستانیؒ نے فرمایا۔ ''جو لوگ اللہ کے سائے میں زندگی بسر کرتے ہیں انہیں کسی دوسرے سائے کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

چند لمحوں کیلئے حاکم سیوستان کے چہرے پر مسرت کا جو رنگ اُبھر آیا تھا، وہ اس طرح ڈوب گیا کہ جیسے آندھی کا کوئی تیز جھونکا کسی چیز کو چھوتا ہوا گزر جائے۔

''اور دوسری خدمت یہ ہے کہ تم جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلے جاؤ۔'' حضرت شیخ خضرؒ نے فرمایا۔

حاکم سیوستان کو محسوس ہوا کہ جیسے ایک تنہا شخص نے کسی لشکر جرار کو شکست دے دی ہو۔ وہ خجالت کے پسینے میں ڈوبا ہوا چند قدم پیچھے ہٹا اور اتنی دور جاکر کھڑا ہوگیا کہ اس کا سایہ حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ پر نہ پڑے۔

حضرت شیخؒ نے نظر اُٹھا کر حاکم سیوستان کی طرف دیکھا اور ناخوشگوار لہجے میں فرمایا۔ ''جب ہم دونوں کے درمیان بات طے ہوچکی تو پھر کیوں کھڑے ہو؟''

حاکم سیوستان نے نہایت شکستہ لہجے میں عرض کیا۔ ''میں شیخ کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے واپس جارہا ہوں مگر پھر بھی میری یہ تمنا ہے کہ اس خاص موقع پر جب آپ یادِ حق میں مشغول ہوں تو میرے

لئے دعائے خیر فرمائیں۔"

حاکم سیوستان کی درخواست سن کر حضرت شیخ خضرؒ نے نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔"حق تعالیٰ مجھے اس وقت کیلئے زندہ نہ رکھے جب میرے دل میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کا خیال آئے۔"

یہ تھے سلسلۂ قادریہ کے جانباز حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ ......اور یہ تھی ان کے جینے کی ادا۔

حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ سے حضرت میاں میرؒ کی ملاقات کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے۔ اس سلسلے میں خود حضرت میاں میرؒ فرماتے ہیں کہ جب میں والدہ محترمہ سے اجازت لے کر گھر سے باہر نکلا تو بے اختیار میرا رخ جنگل کی طرف ہوگیا۔ یہاں تک کہ میں کوہِ سیوستان میں پہنچا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایک گوشے میں ایک تنور موجود ہے جس کا منہ ڈھکا ہوا ہے۔ میں وہاں سے خاموشی کے ساتھ گزر جانا چاہتا تھا مگر یکایک میرے دل میں آئی کہ اس تنور کو کھول کر دیکھوں۔ پھر جب میں نے تنور کھولا تو وہ گرم تھا اور اس کے اندر ایک بڑا سا پتھر رکھا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ کسی مرد بزرگ کا مقام ہے۔ پھر میں نے اپنے دل میں عہد کرلیا کہ اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گا، جب تک اس درویش خدامست کی زیارت نہ کرلوں جس کا ٹھکانہ جنگل کا یہ ویران گوشہ ہے۔ شاید یہ اس مرد بزرگ کی روحانی کشش تھی کہ میں اس مقام پر ٹھہر گیا جو خطرات سے بھرا ہوا تھا۔

حضرت میاں میرؒ فرماتے ہیں کہ دن تو کسی طرح گزر گیا مگر جب رات آئی تو محسوس ہوا کہ موسم بہت سخت ہے۔ سرد ہوائیں انسانی جسم کو منجمد کئے دیتی تھیں۔ دوسرے یہ کہ جنگلی جانوروں اور درندوں کی آوازیں آس پاس سنائی دے رہی تھیں۔ مگر کوئی میرے قریب نہیں آتا تھا۔ شاید یہ بھی اس مرد بزرگ کی کرامت تھی کہ خوفناک درندے اس مقام سے دور دور ہی رہتے تھے۔ پھر جنگلی جانوروں کی ضرر رسانی کا خوف تو دور ہوگیا مگر سرد موسم نے اس قدر ستایا کہ میں کئی بار تنور کے قریب گیا اور چاہا کہ اسے کھول کر اندر بیٹھ جاؤں اور یخ بستہ ہواؤں کے تیز جھونکوں سے محفوظ ہوجاؤں...... مگر ہر مرتبہ یہ سوچ کر لوٹ آیا کہ جو مقام کسی بزرگ کا ہو، وہاں اس طرح بیٹھنا بے ادبی ہے۔

الغرض مجھے اس ویران جگہ پر پڑے ہوئے تین دن گزر گئے ......اور جن بزرگ کے دیدار کی تمنا تھی ان کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ میں کسی دوسرے آباد علاقے میں جا کر اپنی بھوک اور پیاس مٹا سکتا تھا مگر اس خوف سے کہیں نہ جاسکا کہ اگر وہ بزرگ آکر واپس چلے گئے اور میں موجود نہیں ہوا تو پھر اس محرومی کا علاج ممکن نہیں ہوگا۔ بھوک اور پیاس بڑھتی جارہی تھی مگر اللہ نے غیب سے مجھے استقامت بخشی۔ آخر تین دن اور تین راتیں اسی عالم میں گزر گئے۔ اس دوران غذا کا کوئی لقمہ میرے حلق سے نیچے نہیں اُترا اور نہ میں نے پانی کا ایک گھونٹ پیا، آخر تین دن بعد میری آزمائش بھی ختم ہوئی اور کشمکش انتظار بھی۔ آخر وہ مرد بزرگ نمودار ہوئے اور تنور کی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سردیوں کے سخت موسم میں صرف ایک تہہ بند پہنے ہوئے تھے۔ مجھے کسی دلیل اور گواہی کے بغیر یقین آگیا کہ یہی وہ مرد بزرگ ہوسکتے ہیں۔ وہ ضعیف العمر تھے اور ان کا جسم بہت لاغر ونحیف تھا مگر رفتار میں نوجوانوں سے زیادہ مضبوطی تھی۔ میں تنور سے کچھ فاصلے پر موجود تھا۔ اس

بزرگ مجھے نہ دیکھ سکے۔ وہ آئے اور خاموشی سے ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور لرزتے قدموں سے آگے بڑھا۔ میرے پیروں کی یہ لرزش ان بزرگ کے ہیبت و جلال کے باعث تھی۔

میں نے قریب پہنچ کر بزرگ کی خدمت میں سلام پیش کیا۔

بزرگ نے میری طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اور بآواز بلند فرمایا۔"وعلیکم السلام! میر محمد!"

بزرگ کی زبان مبارک سے اپنا نام سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اب ان کی روحانی عظمت اور روشن ضمیری میں کوئی کلام باقی نہیں رہ گیا تھا۔

"کیسے ہو میر محمد؟" بزرگ نے دوبارہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"شیخ کی دعاؤں کے طفیل تمام آفات ارضی وسماوی سے محفوظ ہوں۔" میں نے بصد احترام عرض کیا۔

"کچھ کھایا پیا؟" حضرت شیخؒ نے ایک دلنواز تبسم کے ساتھ پوچھا۔

"یہاں قرب وجوار میں غذا اور پانی میسر نہیں تھے۔" میں نے بزرگ کے سوال کا جواب دیا مگر میرے لہجے میں شدید نقاہت ظاہر ہو رہی تھی۔

"تو کچھ دور جا کر اپنے حصے کا رزق اور پانی تلاش کرلیا ہوتا۔" بزرگ کے انداز گفتگو سے اپنائیت ومحبت جھلک رہی تھی۔

"کئی بار چاہا مگر ہر مرتبہ ایک ہی خوف دامن گیر ہوگیا۔" میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

"میر محمد! کیسا خوف؟" بزرگ نے محبت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"اگر میں تلاش رزق وآب میں نکلا اور آپ آکر واپس تشریف لے گئے تو پھر اس محرومی کا ازالہ کس طرح ہوگا؟" میں نے بے کم وکاست اپنے دل کی کیفیت بیان کردی۔

"جب ہمیں آنا تھا اور تم سے ملاقات طے ہوچکی تھی تو پھر محرومی کیسی؟ اور خوف کیسا؟" بزرگ نے باتوں ہی باتوں میں معرفت کا ایک عجیب نکتہ بیان فرمادیا تھا۔

میں خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔

"بیٹھ جاؤ! کشمکش انتظار نے تمہیں تھکا دیا ہوگا۔" بزرگ کے ہونٹوں پر بڑی دلآویز مسکراہٹ تھی۔ ایک مسکراہٹ کہ جس کی حیات افزا تاثیر میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔

جب میں دوزانو ہوکر بیٹھ گیا تو بزرگ نے فرمایا۔"میر محمد! تم یہاں کتنے دن سے ٹھہرے ہوئے ہو؟"

میں نے عرض کیا۔"تین دن اور تین راتوں سے آپ کا منتظر تھا۔"

"تین دن اور تین راتیں؟" بزرگ نے میری بات سن کر شدید حیرت کا اظہار کیا۔"دو دن سے تو میں کہیں گیا۔ بس آج ہی کچھ دیر کیلئے گیا تھا...... مگر میں نے تو تمہیں کہیں نہیں دیکھا۔"

بزرگ کا یہ انکشاف سن کر مجھے بھی بہت تعجب ہوا۔ اب میرے لئے نئی پریشانی یہ تھی کہ میں بزرگ

کے قول کی تردید کس طرح کروں؟ پھر بھی میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ''شیخ! بہتر جانتے ہوں کہ میں سچ بول رہا ہوں یا جھوٹ؟''

بزرگ نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور اسی روح پرور تبسم کے ساتھ فرمایا۔ ''شاید ایسا ہی ہو۔ فقیر کو تو اپنی ہی خبر نہیں ہے پھر وہ روز و شب کا حساب کیسے رکھے گا؟''

دراصل یہ بزرگ کے استغراق کی کیفیت تھی۔ اگرچہ اُنہیں یہاں سے گئے ہوئے تین دن گزر چکے تھے لیکن وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ آج ہی گیا ہوں اور آج ہی واپس آ گیا ہوں۔

بزرگ کچھ دیر تک خاموش رہے۔ پھر نہایت شفقت آمیز لہجے میں فرمانے لگے۔ ''میر محمد! تم نے میرے انتظار میں بہت زحمت برداشت کی مگر تم اپنے گھر سے کس کام کیلئے نکلے تھے؟''

''میں حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادے سے نکلا تھا کہ راستے میں تنور دیکھ کر ٹھہر گیا اور پھر شوق دیدار میرے پیروں کی زنجیر بن گیا۔''

''خضر سیوستانی تو یہی گناہ گار ہے مگر پتا نہیں کہ تم کس خضر کی تلاش میں ہو؟''

بزرگ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا اور بہت دیر تک حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ کے روشن چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر جب حیرت و استعجاب کے اثرات زائل ہوئے تو میں نے بے اختیار ہو کر حضرت شیخؒ کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔

''خود ہی زنجیر پہنائی اور خود ہی زنجیر کو کھول دیا۔'' جوش مسرت میں میری آواز لرز رہی تھی۔

''جو کچھ ہوتا ہے، اسی کی طرف سے ہوتا ہے۔'' حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ نے فرمایا۔ ''بندے تو محض درمیان کا ایک واسطہ ہیں۔ وہ مختار کل جسے چاہے ہدایت بخشے اور جسے چاہے صراطِ مستقیم سے محروم کر دے۔''

میں نے اپنی خوش قسمتی پر خالق کائنات کا شکر ادا کیا اور پھر حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ سے درخواست کی۔ ''گھر سے یہی نیت کر کے نکلا تھا کہ اگر میرے بخت نے یاوری کی تو شیخ کے حلقۂ غلامی میں شامل ہو جاؤں گا۔''

حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ نے میری درخواست سنی اور پھر مجھے بیعت سے شرف یاب فرمایا۔

حضرت میاں میرؒ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں کتنے دن رہے، کسی تاریخی دستاویز سے اس کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ مغل شہزادے دارا شکوہ نے اپنی تصنیف ''سکینۃ الاولیاء'' میں صرف اتنا تحریر کیا ہے۔

''حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ سے بیعت ہونے کے بعد حضرت میاں میرؒ نے ریاضتیں اور مجاہدے شروع کر دیئے۔ پھر تھوڑے ہی عرصے بعد حضرت شیخؒ نے فرمایا۔ ''شیخ محمد! تم نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ اب تمہیں یہاں رہنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں چاہو بود و باش اختیار کرو اور اللہ نے اپنے لامحدود خزانوں میں سے تمہیں جو دولت عطا کی ہے، اسے اس کے بندوں میں حسب ضرورت تقسیم کرو۔''

آخر حضرت میاں میرؒ اپنے پیر و مرشد سے اجازت لے کر لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت میاں میرؒ کے سفرِ لاہور کے متعلق دو متضاد خبریں مشہور ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ آپ نے پیرومرشد سے اجازت لے کر سیوستان چھوڑا تھا۔ اس روایت کو اکثر مؤرخین نے بیان کیا ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ جب حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ کا وصال ہو گیا تو حضرت میاں میرؒ عازم لاہور ہوئے۔ اس بحث سے قطع نظر حضرت میاں میرؒ پچیس سال کی عمر میں لاہور تشریف لائے۔ یہ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کا زمانہ تھا۔ لاہور پہنچ کر حضرت میاں میر مولانا سعد اللہؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ مولانا سعد اللہؒ یگانۂ روزگار عالم تھے۔ حضرت میاں میرؒ کئی سال تک مولانا کے فضل و کمال سے فیضیاب ہوئے۔

پھر آپ مفتی عبدالسلام لاہوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مفتی عبدالسلامؒ ایک طویل عرصے تک شاہی ملازمت سے وابستہ رہے۔ پھر اس منصب سے الگ ہو کر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور تقریباً پچاس سال تک بندگان خدا میں علم کی دولت تقسیم کرتے رہے۔ حضرت میاں میرؒ نے مفتی عبدالسلام لاہوریؒ سے اس طرح اکتساب علم کیا کہ استاد گرامی اپنے شاگرد پر ناز کیا کرتے تھے اور برسرِ مجلس فرماتے تھے کہ اللہ نے شیخ محمد کو وہ ذہن رسا عطا کیا ہے کہ لمحوں میں ان پر علم کے رموز و نکات آشکار ہو جاتے ہیں۔

مفتی عبدالسلام لاہوریؒ کے علاوہ حضرت میاں میرؒ، مولانا نعمت اللہؒ کے حلقۂ درس میں بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ مولانا نعمت اللہؒ، مولانا سعد اللہؒ کے شاگرد تھے۔ حضرت میاں میرؒ نے تھوڑے ہی عرصے میں ان بزرگ سے معقولات اور منقولات کا علم حاصل کیا۔ یہاں تک کہ مولانا نعمت اللہؒ کے تمام پرانے شاگرد پیچھے رہ گئے اور مکتب میں داخل ہونے والا ایک نو وارد اپنے ساتھیوں پر سبقت لے گیا۔ حضرت مولانا نعمت اللہ، حضرت میاں میرؒ کی ذکاوت اور فہم و تدبر کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔

''ہم کئی سال تک شیخ محمد کو پڑھاتے رہے اور اس دوران انہوں نے ہم سے ہمارا سارا علم لے لیا مگر اس طویل عرصے میں ہمیں ان کے اصلی حالات کا علم نہیں ہو سکا۔'' یہ حضرت میاں میرؒ کی شخصیت کی گہرائی پر ان کے استاد گرامی کی کھلی ہوئی گواہی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت میاں میرؒ معرفت کے رازوں کو دوسرے لوگوں سے کس قدر پوشیدہ رکھتے تھے۔

حضرت میاں میرؒ کا یہ معمول تھا کہ آپ دن کے وقت بزرگوں کے مقبروں، باغوں یا جنگلوں میں جا کر یادِ حق میں مشغول رہتے تھے۔ جو دوست آپ کے ہمراہ ہوتے وہ بھی الگ الگ ایک درخت کے نیچے ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ پھر جب نماز کا وقت آتا تو تمام ساتھی مل کر نماز باجماعت ادا کرتے۔ حضرت میاں میرؒ لوگوں کے میل جول اور اہلِ دنیا کی محبتوں سے ہمیشہ متنفر رہتے تھے۔ آپ رات کو حجرے کا دروازہ بند کر کے تنہا قبلے کی طرف منہ کئے بیٹھے رہتے اور ساری رات ذکر الٰہی میں مشغول رہتے۔ واضح رہے کہ حضرت میاں میرؒ کا تعلق صوفیائے کرام کے اس گروہ سے تھا جو ذکر خفی کو پسند کرتے ہیں۔ تصوف کی اصطلاح میں ذکر خفی سے مراد اللہ کو اس طرح یاد کرنا ہے کہ قریب بیٹھے

ہوئے شخص کو بھی یہ بات معلوم نہ ہو سکے کہ ذکر کرنے والا کسے پکار رہا ہے؟ دوسرے گروہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ لوگ زور وشور کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ پوری خانقاہ ان کی آوازوں سے گونج اُٹھتی ہے۔

مغل شہزادہ دارا شکوہ لکھتا ہے کہ حضرت میاں میرؒ کا باغوں میں جانا، رسالت پناہ حضور اکرم ﷺ کے طریق مبارک کے عین موافق تھا۔ جیسا کہ ”صحیح مسلم“ اور ”مشکوٰۃ“ کی تیسری فصل ”کتاب الایمان“ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ ”ایک دن سرور کونین ﷺ اپنے اصحاب کی مجلس سے اُٹھ کر ایک طرف تشریف لے گئے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے تلاش کے بعد سرور کائنات ﷺ کو ایک باغ میں دیکھا۔ رسول کریم ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو اپنے نعلین مبارک دے کر فرمایا۔

”اے ابو ہریرہ! اس شخص کیلئے خوشخبری ہے جسے تو ”لا الہ الا اللہ“ کہتے ہوئے دیکھے۔ وہ ضرور بالضرور بہشت میں داخل ہوگا۔“

اس حدیث پاک سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ یکسوئی اور جمعیت خاطر کیلئے باغوں میں تشریف لے جاتے تھے۔ ان مقامات پر سرور کونین ﷺ کو وجد اور ذوق حاصل ہوتا تھا۔ اسی لئے مومنوں کو بشارت دی اور ”لا الہ الا اللہ“ کے ذکر کی تلقین فرمائی جو ہر مسئلے کا حل ہے اور ہر قفل کی چابی ہے۔

شہزادہ دارا شکوہ کے بیان کے مطابق ایک معزز درباری ملا سید خان کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت میاں میرؒ ”ذکر“ کے موضوع پر تقریر فرما رہے تھے۔ اسی دوران آپ نے اپنا ایک واقعہ سناتے ہوئے فرمایا۔

”شہر کے باہر ایک غیر آباد مکان پڑا تھا۔ مشغول حق ہونے کیلئے میں تقریباً پندرہ روز تک وہاں جا کر بیٹھتا رہا مگر مجھے جمعیت خاطر حاصل نہ ہو سکی۔ آخر میں نے طے کر لیا کہ یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ اس مکان کے قریب ہی ایک کنواں تھا اور وہاں پر ایک سقہ رہا کرتا تھا۔ الغرض جب میں اس مکان کو چھوڑ کر جانے لگا تو سقے نے مجھ سے کہا۔

”شیخ! آپ یہاں سے کیوں جا رہے ہیں؟ آپ کے دم سے تو بڑی آبادی تھی۔“

”یہ مقام میرے لئے موزوں نہیں، مجھے آج تک یہاں اطمینان قلب حاصل نہیں ہوا۔“ میں نے سقے کو مکان چھوڑ کر جانے کی وجہ بتائی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟“

سقہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”شیخ! کچھ دن پہلے اس علاقے میں ایک بارات آئی تھی۔ جب وہ لوگ یہاں پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ مجبوراً انہیں اسی مکان میں قیام کرنا پڑا۔ پھر وہ لوگ رات بھر تفریح میں مشغول رہے اور صبح ہوتے ہی بارات لے کر چلے گئے۔“

جب سقہ یہ واقعہ سنا چکا تو مجھ پر حقیقت ظاہر ہوئی کہ یہ ان کی ہنگامہ آرائی اور تفریح کا اثر ہے؟ جس کی وجہ سے مجھے جمعیت خاطر حاصل نہیں ہوئی۔ نتیجتاً میں نے اسی روز وہ مکان چھوڑ دیا اور دوسری جگہ منتخب کر لی۔

اس واقعہ سے اہل نظر کو اندازہ کرنا چاہئے کہ جس طرح ذکر الٰہی سے کسی مکان یا مجلس پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اسی طرح لہو ولعب کی باتوں اور کاموں سے بھی وہ خطۂ زمین متاثر ہوتا ہے اور برائی کے نقوش جگہ پکڑ لیتے ہیں۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت میاں میرؒ ہفتہ ہفتہ بھر رہتے تھے مگر اپنا حال کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ غیرت فقر اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ امراء وزراء قیمتی نذریں لے کر حاضر ہوتے مگر آپ یہ کہہ کر انہیں لوٹا دیتے۔

”اللہ کے بے شمار مستحق بندے ہیں۔ یہ چیزیں ان تک پہنچا دو۔“

جب آپ امراء کی نذریں واپس کرتے تو اس وقت آٹھ آٹھ دن کے فاقے سے ہوتے تھے۔ یہ صبر و قناعت اور توکل آپ کے کردار کا روشن ترین پہلو ہے۔

ایک دن حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ ”تیس سال تک ہمارے گھر کچھ نہیں پکا۔“

اس بات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت میاں میرؒ اور آپ کے اہل خانہ نے تیس سال تک کچھ نہیں کھایا۔ شہزادہ دارا شکوہ نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے کہ حضرت میاں میرؒ کا رزق اس آیت کریمہ کے مطابق تھا۔

”تمہارا رزق اور جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، آسمان میں ہے۔“ (ترجمہ)

اسی فرمان الٰہی کے مطابق حضرت میاں میرؒ کو غیب سے رزق حاصل ہوتا تھا مگر اس طرح کہ آٹھ آٹھ دن فاقے سے گزر جاتے تھے۔ ایک دن آپ کے حقیقی بھائی سیوستان (سندھ) سے لاہور تشریف لائے۔ بھائی کو دیکھ کر حضرت میاں میرؒ بہت متفکر ہوئے۔ اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ”میرا بھائی ایک مدت کے بعد میرے پاس آیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے خوشی حاصل ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے میری یہ خوشی فکر و غم میں تبدیل ہو گئی۔ اس وقت نہ میرا کوئی مرید تھا اور نہ معتقد کہ میں اس سے بھائی کے کھانے کا بندوبست کرنے کیلئے کہتا۔ خود میری ناداری کا یہ عالم تھا کہ گھر میں ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ آخر میں نے اپنے بھائی سے کہا کہ تم میرے حجرے میں بیٹھ جاؤ تا کہ میں تمہارے لئے کھانے کا انتظام کروں۔ یہ کہہ کر میں باغ میں چلا آیا۔ پھر وضو کیا اور دو رکعت نماز ادا کی۔ اس کے بعد اپنے خالق کے سامنے دامن مراد پھیلا دیا۔

”اے میرے پالنے والے! تیرے سوا میرا اس دنیا میں کوئی دوست، کوئی مہربان نہیں۔ تجھے معلوم ہے کہ میرے گھر مہمان آیا ہوا ہے اور میں رسم میزبانی ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں۔“

ابھی میری دعا مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ایک صدائے غیب سنائی دی۔ ”جب ہمارے سوا تمہارا کوئی نہیں ہے تو پھر پریشان کیوں ہوتے ہو۔ ہم نے دعا مانگنے سے پہلے ہی تمہاری خواہش پوری کر دی ہے۔“

پھر میں نے بھائی کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ مجھے اپنی دعا کی قبولیت کا یقین تھا۔ پھر بھی

میں نے بھائی سے سوال کیا۔ "کیا بات ہے؟ تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"آپ کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی ایک شخص کھانا لے کر آیا اور پوچھنے لگا کہ شیخ میر محمد کہاں ہیں؟" میرے بھائی نے بتایا۔ "وہ شخص آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

میں فوراً ہی اپنے بھائی کے ہمراہ گھر پہنچا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت نوجوان موجود ہے۔

پھر جب ہم دونوں بھائی کھانے سے فارغ ہو گئے تو اس نوجوان نے برتن اُٹھائے اور ہمیں سلام کر کے چلا گیا۔

اس نوجوان کے چلے جانے کے بعد مجھے ایک فکر سی لاحق ہو گئی۔ آخر بہت دن بعد مجھ پر یہ راز فاش ہوا کہ وہ فرشتہ تھا جو رسمِ میزبانی ادا کرنے کیلئے آیا تھا۔

خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

(توکل کرنے والوں کیلئے اللہ خود ہی میر سامان بن جاتا ہے)

دہلی میں میاں حاجی محمدؒ صاحب ایک بزرگ گزرے ہیں۔ ایک دن مغل شہزادے داراشکوہ نے ان سے کہا۔ "حاجی صاحب! حضرت شیخؒ کی کوئی کرامت سنائیے۔"

حاجی صاحبؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر کہنے لگے۔ "میں ایک دن حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر تھا۔ حضرت شیخؒ نے کسی درویش کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا کہ سیوستان اور بھکر کے لوگوں میں قدیم رسم تھی کہ جب تک کسی شخص کے پاس مویشیوں کا ریوڑ یا نقد مال نہ ہو، اس وقت اس کی لڑکی کیلئے کوئی شادی کا پیغام نہیں بھیجتا تھا۔ ان ہی لوگوں میں ایک عزت دار شخص تھا جس کا سارا مال و متاع گردشِ وقت کے سبب برباد ہو چکا تھا۔ اس کی ایک جوان لڑکی تھی مگر مفلسی کے باعث لڑکی کا رشتہ نہیں آتا تھا۔ اسی علاقے میں ایک فقیر بھی رہتا تھا۔ جو کبھی کبھی اس شخص کے گھر آتا اور پانی مانگتا۔ لڑکی بڑے ذوق و شوق سے فقیر کو پانی پلاتی اور فقیر اسے دعائیں دے کر چلا جاتا۔ پھر جب بیٹی کی شادی کے سلسلے میں ماں باپ بہت زیادہ پریشان رہنے لگے تو ایک دن لڑکی نے اپنی ماں سے کہا۔

"وہ درویش بابا مجھے بہت دعائیں دیتے ہیں، آپ اس سلسلے میں ان سے بات کیوں نہیں کرتیں؟"

اتفاق سے دوسرے دن وہ فقیر آ گیا۔ لڑکی کی ماں نے درویش سے شکایتاً کہا۔ "تیری فقیری ہمارے کسی کام نہیں آتی۔ تو آتا ہے اور پانی پی کر چلا جاتا ہے، تیری نگاہ کی برکت سے ہمیں کوئی آسودگی حاصل نہیں ہوئی۔ ہمارے حالات ویسے ہی ہیں جیسے تیرے آنے سے پہلے تھے۔"

فقیر اس عورت کی بات سن کر مسکرایا۔ "آخر تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں اپنی لڑکی کی شادی کرنا چاہتی ہوں مگر میرے پاس ایک تنکہ (سکہ) بھی نہیں۔" عورت اپنی حالت زار بیان کرتے ہوئے رونے لگی۔

فقیر نے اس عورت کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ عورت حیران و پریشان درویش کے ساتھ چلتی رہی۔ پھر وہ فقیر ایک بنیے کی دکان پر پہنچا اور عورت کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "تمہیں جس چیز کی

ضرورت ہو اس شخص سے لے لینا مگر اپنے لئے سامان کی ذخیرہ اندوزی نہ کرنا۔"

اس کے بعد وہ فقیر پانی پینے اس مکان پر نہیں آیا۔ عورت روزانہ بنیے کی دکان پر جاتی اور اپنی ضرورت کا اسباب لے کر واپس آ جاتی۔ کچھ دن بعد لڑکی کا رشتہ آیا اور شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ عورت بنیے کے پاس گئی اور شادی سے متعلق ساز و سامان اور نقد رقم طلب کی۔ بنیے نے کسی حیل و حجت کے بغیر عورت کو مطلوبہ چیزیں فراہم کر دیں۔ پھر شادی کا دن آیا اور عورت نے اتنی دھوم دھام سے اپنی بیٹی کی شادی کی کہ محلے والے دیکھتے رہ گئے۔

شادی کے کچھ دن بعد عورت بنیے کی دکان پر گئی اور ذخیرہ کرنے کیلئے بہت سا اناج لے آئی۔ دوسرے روز کپڑا اور دیگر اشیاء لینے کیلئے دکان پر پہنچی تو حیرت زدہ رہ گئی۔ وہاں نہ بنیا موجود تھا اور نہ دکان۔ بس ایک ویران جگہ پڑی ہوئی تھی۔ عورت روتی پیٹتی واپس چلی آئی۔

پھر ایک مدت کے بعد اس نے فقیر کو دوبارہ دیکھا تو دیوانہ وار اس کے قدموں پر گر کر کہنے لگی۔

"مجھے بس اتنا بتا دے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟"

"تو نے میری بات نہ مانی اور حاجت روائی کا ایک آسان ذریعہ کھو دیا۔" فقیر نے پُرجلال لہجے میں کہا۔

"خدا کیلئے مجھے یہ راز بتا دے کہ وہ دکان کہاں چلی گئی۔" عورت رو رو کر اصرار کرنے لگی۔

"اگر تو اس دکان کا حال پوچھے گی تو پھر مجھے بھی نہیں پائے گی۔" فقیر نے عورت کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

مگر عورت اصرار کرتی رہی کہ تجھے بتانا ہی ہوگا۔

"وہ اناج، کپڑا، دکان اور بنیا، سب کچھ میں ہی تھا۔" فقیر نے کہا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جب حضرت میاں میرؒ یہ واقعہ بیان کر چکے تو حاجی محمدؒ نے پوچھا۔ "کیا وہ درویش آپ ہی تھے؟"

"وہ کوئی بھی تھا، تمہیں اس سے کیا غرض؟" حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ "وہ تو بس ایک قصہ تھا جو تمہیں سنا دیا گیا۔"

میاں حاجی محمدؒ نے دوبارہ وہی سوال کیا تو حضرت میاں میرؒ نے انہیں تنبیہہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "خبردار! اس بات کو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔"

میاں حاجی محمدؒ کہتے ہیں کہ میں نے بعد میں کچھ ثقہ لوگوں سے تحقیق کی تو پتا چلا کہ سیوستان اور بھکر کے وہ فقیر حضرت میاں میرؒ ہی تھے۔

جب لاہور میں حضرت میاں میرؒ کی کرامات کا چرچا ہونے لگا تو آپ ایک دن خاموشی کے ساتھ رات کے اندھیرے میں سرہند تشریف لے گئے۔ سرہند مشرقی پنجاب (ہندوستان) کا مشہور شہر ہے۔ جہاں سلسلۂ نقشبندیہ کے عظیم بزرگ میاں میرؒ کو سرہند کی آب و ہوا راس نہیں آئی۔ یہاں آ کر آپ گھٹنوں کے درد اور دوسری سخت بیماریوں میں مبتلا ہو گئے مگر پھر بھی خودداری کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اس قدر سنگین اوقات میں بھی کسی کو مدد کیلئے نہیں پکارا۔ یہاں ایک صاحب حاجی نعمت اللہ

سرہندی رہتے تھے۔ انہیں کسی طرح پتہ چل گیا کہ لاہور سے ایک درویش سرہند آئے ہوئے ہیں اور ان دنوں سخت علیل ہیں۔

حاجی نعمت اللہ کسی تاخیر کے بغیر حاضر ہوئے اور حضرت میاں میرؒ کی خدمت گزاری میں مصروف ہو گئے۔ آپ نے حاجی نعمت اللہ کو کئی بار منع کیا مگر وہ یہی کہتے رہے۔ ''میں آپ کی تیمارداری کو اپنے لئے ایک سعادت سمجھتا ہوں۔''

حاجی نعمت اللہ سرہندی کی ضد دیکھ کر حضرت میاں میرؒ خاموش ہو گئے اور انہیں اپنے حجرے میں آنے کی اجازت دے دی۔ حضرت میاں میرؒ کی بیماریوں کا سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ اس دوران حاجی نعمت اللہ سرہندی نے حضرت میاں میرؒ کی خدمت کا حق ادا کر دیا جس کام کو انجام دیتے ہوئے انسان کو اپنی اولاد بھی کراہیت کا احساس کرتی ہے وہی کام حاجی نعمت اللہ سرہندی نہایت اخلاص اور خوشدلی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ تصوف کی تمام معتبر کتابوں میں یہ روایت درج ہے کہ حاجی صاحب حضرت میاں میرؒ کی گندگی بھی صاف کرتے تھے اور اس طرح کہ ان کے چہرے پر ناگواری کا ہلکا سا عکس تک نہیں ہوتا تھا۔ حضرت میاں میرؒ نعمت اللہ سرہندی کی اس مخلصانہ تیمارداری سے بہت خوش ہوئے اور پھر جب صحت یاب ہو گئے تو ایک دن آپ نے حاجی صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''نعمت اللہ! ہم ایک فقیر بے سروسامان ہیں۔ اس لئے تمہیں زر و مال کی صورت میں کچھ نہیں دے سکتے۔ ہاں اگر تم کہو تو اپنے پالنے والے سے تمہارے لئے کچھ روحانی نعمتیں مانگ سکتے ہیں۔''

حضرت میاں میرؒ کی گفتگو سن کر حاجی نعمت اللہ سرہندی نے عرض کیا۔ ''اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو گی کہ میں آپ کی دعاؤں میں شامل ہو جاؤں۔''

حضرت میاں میرؒ نے اسی وقت حاجی نعمت اللہ سرہندی کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کیا اور انتہائی مختصر عرصے میں انہیں سلوک کے درجۂ کمال تک پہنچایا۔ حاجی نعمت اللہ سرہندی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ وہ حضرت میاں میرؒ کے پہلے مرید تھے۔ اس کے بعد حضرت شیخؒ دوبارہ لاہور تشریف لے آئے۔

روایت ہے کہ حاجی نعمت اللہ سرہندی حضرت میاں میرؒ کے مرید ہونے کے بعد یادالٰہی میں مشغول ہو گئے۔ پھر کچھ دن بعد ہی حاجی صاحب کی یہ کیفیت ہو گی کہ ان پر عالم ''ملکوت'' منکشف ہونے لگا۔ حاجی صاحب اس کیفیت کو برداشت نہ کر سکے اور ایک دن شیخ جمیل الدین کے پاس پہنچ کر کہنے لگے۔

''شیخ! مجھے ایک ایسا عالم دکھائی دیتا ہے جس کے دیکھنے سے ایک عجیب سی لذت حاصل ہوتی ہے۔''

شیخ جمیل الدین شیخ ولی الدین کے خلیفہ تھے اور سرہند میں رہا کرتے تھے۔ جب انہوں نے حاجی نعمت اللہ کی بات سنی تو بے ساختہ کہا۔ ''حاجی! وہ عالم ملکوت نہیں جو تجھے نظر آتا ہے بلکہ عالم جنیات

ہے۔ اگر کچھ دن اور تیری یہی کیفیت رہی تو تجھے شدید نقصان پہنچے گا۔'' پھر شیخ جمیل الدین نے اس مبالغہ آمیزی سے کام لیا کہ حاجی نعمت اللہ سرہندی کا اعتقاد دست پڑ گیا اور انہوں نے اس عمل کو چھوڑ دیا جو پیرومرشد نے بطور خاص بخشا تھا۔

پھر جیسے ہی حاجی نعمت اللہ سرہندی نے حضرت میاں میرؒ کے بتائے ہوئے عمل کو ترک کیا عالم ملکوت بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور پھر وہ لذت بھی جاتی رہی جو وظیفہ پڑھنے کے دوران انہیں حاصل ہوتی تھی۔ اپنی بدلی ہوئی کیفیت دیکھ کر حاجی نعمت اللہ اداس رہنے لگے اور پھر ایک دن اپنی اسی اداسی سے تنگ آ کر انہوں نے مکہ معظمہ جانے کا ارادہ کیا۔ پھر حاجی صاحب پیرومرشد سے اجازت لینے کیلئے لاہور حاضر ہوئے۔

پھر جیسے ہی نعمت اللہ سرہندی حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں پہنچے تو پیرومرشد نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا۔ ''کہئے حاجی صاحب آپ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟''

نعمت اللہ سرہندی پیرومرشد کی قوت کشف پر حیران رہ گئے اور پھر انہوں نے پورا واقعہ بے کم و کاست بیان کر دیا۔

اپنے مرید کی گفتگو سن کر حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ ''حاجی! ہمارے ہوتے ہوئے تم غیر کے پاس کیوں گئے؟''

نعمت اللہ سرہندی نے فرطِ ندامت سے سر جھکا لیا۔

''نعمت اللہ! ہم نے تو تمہاری خدمات کو دل سے قبول کر لیا مگر افسوس تم نے ہماری دی ہوئی نعمتوں کی کوئی قدر نہیں کی۔'' حضرت میاں میرؒ کے لہجے سے انتہائی آزردگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ اس درویش نے تمہارے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا؟ وہ شخص تو جانتا ہی نہیں کہ عالم ملکوت کسے کہتے ہیں؟''

خجالت اور شرمندگی کے سبب حاجی نعمت اللہ سرہندی کا سر کچھ اور جھک گیا تھا۔ ''یہ خادم مکہ معظمہ جانا چاہتا ہے تاکہ اسے سکون قلب حاصل ہو سکے۔''

حضرت میاں میرؒ کو اپنے مرید کی حالت پر ترس آ گیا۔ ''حاجی! اگر تم اسی جگہ بیٹھے بیٹھے مکہ معظمہ کی زیارت کر لو تو پھر؟''

''میں بھی تو چاہتا ہوں کہ وہ کھوئی ہوئی لذت دوبارہ حاصل ہو جائے۔'' احساسِ ندامت کی شدت کے سبب نعمت اللہ سرہندی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

حضرت میاں میرؒ نے اپنی خانقاہ کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''آج رات وہاں بیٹھ کر خلوصِ دل کے ساتھ یہ اسمِ الٰہی پڑھو۔ پھر مجھے بتاؤ کہ تمہاری گم شدہ لذت تمہیں واپس ملی یا نہیں؟''

حاجی نعمت اللہ سرہندی نے پیرومرشد کے حکم کے مطابق عمل کیا اور پھر دوسرے دن جب حضرت میاں میرؒ خانقاہ میں تشریف لائے تو حاجی نعمت اللہ حاضرین مجلس کے سامنے زاروقطار رونے لگے۔

"کیا ہوا حاجی؟" حضرت میاں میرؒ نے اپنا دستِ شفقت نعمت اللہ سرہندی کے سر پر رکھتے ہوئے فرمایا۔

"پیرومرشد کی دعاؤں کے طفیل مجھے مکہ معظمہ کی زیارت ہوگئی۔" حاجی نعمت اللہ سرہندیؒ انتہائی وارفتگی کے عالم میں بول رہے تھے۔ "میں پہلے کی طرح منزل بہ منزل گیا اور مکہ معظمہ کی زیارت کرکے واپس آگیا۔"

"اب کہاں جانا چاہتے ہو؟" حضرت میاں میرؒ نے نعمت اللہ سرہندی سے دریافت کیا۔

"مرشد کے قدموں کے سوا میرا کہاں ٹھکانا ہے؟" حاجی نعمت اللہ اپنی غلطیوں کو یاد کرکے رو رہے تھے۔

"تنہائی بہت بری چیز ہے نعمت اللہ!" حضرت میاں میرؒ نے اپنے عاجز و نادم مرید کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "اسی لئے تمہیں اوراد و وظائف بتائے تھے کہ تم ان کے سہارے اپنی تنہائی دور کرو...... مگر تم نے انہیں ترک کردیا اور تنہائی کا شکار ہوکر بھٹک گئے۔"

اس واقعے میں فطرت کے کئی راز پوشیدہ ہیں۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ تنہا انسان بڑی آسانی سے دماغی خلل کا شکار ہوسکتا ہے اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ وحشت و اضطراب میں مبتلا ہوکر کسی سنگین جرم کا ارتکاب کر بیٹھے۔ قانونی اعتبار سے بھی بعض خطرناک مجرموں کو "قید تنہائی" کی سزا دی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ تنہائی دنیا کا سب سے اذیت ناک عمل ہے۔ مادہ پرست ممالک میں اکثر تنہا انسان خودکشی کرکے اپنی کربناک زندگی کا خاتمہ کرلیتے ہیں۔ اسی طرح بوڑھے انسان بھی جب ان کی زندگی کا کوئی مقصد باقی نہیں رہتا، دنیا سے بیزار ہوکر مایوس ہوکر اپنے آپ کو ہلاک کرلیتے ہیں...... اور اس عبرتناک انجام میں صرف ان کی تنہائی کارفرما ہوتی ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ صوفی دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ تنہا ہوتا ہے۔ بعض صوفیائے کرام نے تو پوری زندگی عالم تنہائی میں گزار دی ہے مگر وہ کبھی دلبرداشتہ نہیں ہوئے اور آخری سانس تک بھرپور ذوق و شوق اور توانائی کے ساتھ زندہ رہے۔ اہلِ دنیا انہیں تنہا سمجھتے تھے مگر حقیقتاً وہ تنہا نہیں ہوتے تھے۔ صوفی کسی تاریک غار میں ہو یا خانقاہ کے کسی سنسان گوشے میں، جب وہ ذکر الٰہی کرتا ہے تو تنہا نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ کی ذات اقدس اس کے قریب ہوتی ہے۔ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب، اگر "ذکر" کا علمی تجزیہ کیا جائے تو یہ بات ظاہر ہوجائے گی کہ جب صوفی ذکر حق کرتا ہے تو گویا اپنی تنہائی کو دور کرتا ہے۔ صوفیاء کے بعض گروہ جب بلند آواز سے اللہ کو پکارتے ہیں تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق سے ہم کلام ہیں اور جب کوئی انسان کسی دوسری ذات سے ہم کلام ہے تو پھر اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ تنہا نہیں ہے۔

حضرت میاں میرؒ کے مرید حاجی نعمت اللہ سرہندیؒ چونکہ درجۂ کمال تک نہیں پہنچے تھے، اس لئے تنہائی سے گھبرا گئے اور اپنا ایک اہم راز شیخ جمیل الدین سے کہہ دیا جو معرفت کے اسرار و رموز سے واقف نہیں تھے اور پھر اپنی اسی کم علمی کے سبب شیخ جمیل الدین نے حاجی نعمت اللہ سرہندیؒ کو غلط

راستے پر ڈال دیا اور وہ اپنی کمائی ہوئی دولت گنوا بیٹھے۔

اسی وجہ سے اکثر مشائخ کرام نے فرمایا۔ "ایک مرید کیلئے اکیلے رہنے سے بڑھ کر کوئی آفت نہیں ہوتی۔"

رسالت مآب ﷺ کا بھی ارشاد مقدس ہے۔ "اکیلے کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور دو سے وہ دور رہتا ہے۔" (ترجمہ)

الغرض حضرت میاں میرؒ نے حاجی نعمت اللہ سرہندیؒ کی کوتاہیوں سے درگزر کیا اور پھر انہیں اپنی خانقاہ کے ایک گوشے میں بٹھا کر دوبارہ مشغول حق کیا۔ یہاں تک کہ پیرومرشد کی خصوصی توجہ سے حاجی نعمت اللہؒ درجۂ کمال کو پہنچے۔

حاجی نعمت اللہ سرہندیؒ نے چونکہ حضرت میاں میرؒ کی گندگی صاف کی تھی اس لئے آپ نے خوش ہوکر انہیں دولت روحانی سے مالا مال کردیا۔ تصوف کی معتبر کتابوں میں اسی انداز کا ایک اور عجیب واقعہ بھی نظر آتا ہے جسے پڑھ کر انسانی ذہن کے بند دریچے کھل جاتے ہیں اور خدمت کا حقیقی مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ دہلی میں ایک فقیر دوست انسان ملا سعید خان تھے جو لاہور پہنچ کر اکثر حضرت میاں میرؒ کی مجلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ ایک دن مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کی مشہور تصنیف "نفحات الانس" ملا سعید خان کے زیر مطالعہ تھی۔ کتاب پڑھتے پڑھتے ایک مقام پر ملا سعید خان کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کے بارے میں ایک واقعہ تحریر کیا تھا۔ حضرت شیخؒ کا ایک مرید تھا جس کی ابتدائی زندگی لہوولعب میں بسر ہوئی تھی مگر حضرت جنید بغدادیؒ کی خصوصی توجہ نے اس کے نفس کی ساری کثافتیں دھو ڈالیں اور پھر وہ ولایت کے منصب پر فائز ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت شیخ جنید بغدادیؒ نے اسے خرقۂ خلافت بھی عطا فرمایا۔ پھر جب حضرت شیخؒ دنیا سے رخصت ہوگئے تو وہ خلیفہ خانقاہ میں بیٹھ کر بطور فخر کہا کرتا تھا۔

"میں حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کا ایک ایسا خادم ہوں جس نے مسلسل تیس برس تک اپنے پیرومرشد کی گندگی صاف کی ہے۔"

حاضرین مجلس اس شخص کی بات سنتے اور داد و تحسین کے نعرے بلند کرتے۔ "کیا عجز و انکسار ہے اور کیا خدمت گزاری ہے۔"

ملا سعید خان بھی اس واقعے سے بہت متاثر ہوئے۔ پھر ایک دن ملا سعید خان حضرت میاں میرؒ کی مجلس میں حاضر تھے۔ انہوں نے حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کے خلیفہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "سلوک کے راستے میں لوگوں نے کیسے کیسے کام کئے ہیں؟ ایک شخص تیس سال تک اپنے پیرومرشد کے جسم سے خارج ہونے والی غلاظت اُٹھاتا ہے اور پھر ہزاروں لوگوں کے سامنے اپنی اس خدمت پر فخر بھی کرتا ہے۔ یہ کیسا انکسار ہے اور کیسی خدمت گزاری ہے؟"

جب ملا سعید خان اپنی بات مکمل کرچکے تو حضرت میاں میرؒ نے انہیں اور دیگر حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اسے انکسار نہیں کہتے بلکہ یہ فخر و غرور کی ہی ایک شکل ہے۔"

"پھر انکسار کسے کہتے ہیں؟" ملا سعید خان نے عرض کیا۔

"انکسار اسے کہتے ہیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص اس واقعہ کا حوالہ دیتا تو حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کے خلیفہ کو یوں کہنا چاہئے تھا کہ یہ تو معمولی خدمت ہے۔" حضرت میاں میرؒ نے ملا سعید خان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ "وہ شخص فخر ومباہات کا اسیر تھا اور نمود ونمائش کا غلام۔ وہ برسر مجلس اس واقعے کا ذکر کرکے لوگوں کو بہکانا چاہتا تھا کہ اس نے حضرت شیخؒ کی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے اور اسی خدمت کے نتیجے میں اسے خلافت حاصل ہوئی ہے۔"

حضرت شیخؒ کی حکیمانہ گفتگو سن کر ملا سعید خان اور دیگر حاضرین مجلس حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ لوگ جس بات کو کار عظیم سمجھ رہے تھے، اب وہی خدمت ایک معمولی چیز نظر آرہی تھی۔

مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد ایک عارف کی پُرجلال آواز سے خانقاہ کے در و بام دوبارہ گونج اُٹھے۔ حضرت میاں میرؒ فرما رہے تھے۔ "گندگی اُٹھانا کون سا مشکل کام ہے۔ یہ کام تو ہر شخص کرسکتا ہے اور کر رہا ہے۔ کام تو وہ تھا جو حضرت شیخ جنید بغدادیؒ نے کیا کہ اس شخص کے باطن کو ماسوا اللہ سے پاک کر دیا۔ جسم کی غلاظت تو تھوڑے سے پانی سے دور ہو جاتی ہے مگر روح کی کثافت کو دھونا کس قدر مشکل کام ہے، یہ بات حضرت شیخ جنید بغدادیؒ ہی جانتے تھے۔ اللہ حضرت شیخؒ کی قبر کو نور سے بھر دے کہ انہوں نے اپنے مرید کی بڑی خدمت انجام دی۔"

☆☆............☆☆............☆☆

حضرت میاں میرؒ ایک سال سرہند میں قیام فرمانے کے بعد دوبارہ لاہور تشریف لائے اور آخر عمر تک باغبانوں کے محلے میں سکونت پذیر رہے۔ لاہور کے جدید جغرافیے میں اس محلے کو باغبان پورہ کہتے ہیں۔ یہاں رہ کر حضرت میاں میرؒ نے اپنے مریدوں کی اصلاح فکر اور تہذیب نفس کرکے ایک ایسی جماعت پیدا کی جس سے رشد وہدایت کے چشمے پھوٹے، پورا پنجاب معرفت کے ان آبشاروں سے سیراب ہوا۔

حضرت میاں میرؒ بہت کم لوگوں کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل فرماتے تھے۔ جب کوئی شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اس سے دریافت کرتے۔ "تمہیں میرا پتہ کس نے بتایا ہے اور تم میرے پاس کس کام کیلئے آئے ہو؟"

اگر وہ شخص جواب میں یہ کہتا کہ میں حضرت شیخؒ کے دیدار کیلئے حاضر ہوا ہوں تو آپ اس کے ساتھ بہت شفقت اور مہربانی کے ساتھ پیش آتے اور فرماتے کہ آؤ بیٹھ جاؤ۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگتے اور آنے والے شخص سے مخاطب ہو کر فرماتے۔ "اب تم جاؤ! تمہارا کام ہو گیا۔"

اگر آنے والا شخص یہ کہتا کہ میں طلب حق کیلئے حاضر ہوا ہوں تو حضرت میاں میرؒ اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے۔ اگر وہ شخص آپ کے قریب بیٹھا ہوتا تو اسے اپنے پاس سے اُٹھا دیتے اور انتہائی ناخوشگوار لہجے میں فرماتے۔ "بابا! حق کی طلب آسان نہیں۔ یہ دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ تم اس کام کے لائق نہیں ہو۔ اس لئے بہتر ہے کہ کوئی اور کام کرو۔"

اگر وہ شخص بیعت ہونے کیلئے اصرار کرتا تو حضرت میاں میرؒ برہم ہو جاتے۔ "جب تک تم اس کی طلب میں یگانہ نہیں ہو جاؤ گے، اسے اس وقت تک نہیں پاسکو گے۔ تمہارے پاس ایک ہی دل ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ دنیاوی خواہشات سے بھرا پڑا ہے۔ پہلے اپنے دل کو ان بتوں سے خالی کرو پھر میرے پاس آنا۔ پھر میں دیکھوں گا کہ تم میں طلب حق کی استطاعت ہے یا نہیں؟"

مغل شہزادے دارا شکوہ کے استاد شاہ صاحب فرماتے تھے۔ "جب میں بدخشاں سے ہندوستان آیا تو میں نے چاروں طرف حضرت میاں میرؒ کے اسم گرامی کی گونج سنی۔ میرے دل میں شوق ملاقات پیدا ہوا۔ پھر اس شوق نے اضطرابی کیفیت اختیار کر لی۔ آخر ایک طویل مدت کے بعد حضرت میاں میرؒ نے چشم التفات سے میری طرف دیکھا اور نہایت مشفقانہ لہجے میں فرمایا۔ "شاہ صاحب! آخر تم اس فقیر سے کیا چاہتے ہو؟"

حضرت شیخؒ کو اپنے آپ سے مخاطب پا کر شاہ صاحب کی حیرت ومسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ بے اختیار اپنی جگہ سے اُٹھے اور حضرت میاں میرؒ سے عرض کرنے لگے۔ "بس! حضور کی غلامی چاہتا ہوں۔"

شاہ صاحب کی بے قراری دیکھ کر حضرت میاں میرؒ نے تبسم فرمایا۔ "ہاں! تمہارے سینے میں طلب حق کی آگ روشن ہے۔ اگر تم لالچی ہوتے تو چند ہی روز میں یہ چنگاری بجھ جاتی اور تم مجھے چھوڑ کر چلے جاتے۔" یہ کہہ کر حضرت میاں میرؒ نے شاہ صاحب کا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لے لیا اور ایک طالب حق کو مشغول حق بنا دیا۔

☆☆............☆☆............☆☆

حضرت میاں میرؒ بہت کم لوگوں کو مرید کرتے مگر جب کوئی شخص آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو جاتا تو اس کی تربیت پر خصوصی توجہ فرماتے۔ شوق نمائش سے منع کرتے کہ اسی کا دوسرا نام نفس پرستی ہے۔ ملا خواجہ بہاریؒ حضرت میاں میرؒ کے خلیفہ تھے۔ خواجہ صاحبؒ اپنی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"کچھ لوگ مجھ سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ ہمارے درمیان بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے یہ مکان گرنے والا ہے۔ میں نے اس خطرے کے پیش نظر اپنے مہمانوں سے کہا۔ "آپ حضرات باہر چلے جائیں۔"

مہمانوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "کیا ہوا خواجہ صاحب؟"

"یہ مکان گرنے والا ہے۔" میری آواز سے شدید گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ "جلدی کرو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لوگوں کو کوئی گزند پہنچ جائے۔"

میری بات سن کر تمام مہمان کھڑے ہو گئے۔ "جب مکان گرنے والا ہے تو آپ اطمینان سے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟"

"سوال کرنے کا وقت نہیں ہے۔" میں نے انہیں سخت لہجے میں تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ "اپنی

اپنی جانیں بچانے کی کوشش کرو۔"

الغرض میرے سارے مہمان گھر سے نکل گئے اور میں باآواز بلند کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے لگا۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں پورا مکان منہدم ہوگیا۔ لوگ دیوانہ وار چیخنے لگے۔ "خواجہ بہاری ملبے کے نیچے دبے ہوئے ہیں، انہیں نکالو۔"

مہمان کی چیخیں سن کر محلے کے دوسرے لوگ بھی دوڑ پڑے اور مجھے ملبے کے اندر تلاش کرنے لگے۔ پھر جب وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میرے قریب آئے تو میں نے پکار کر کہا۔ "میں یہاں ہوں اور فضل خدا محفوظ ہوں۔"

آخر جب مکان کا ملبہ ہٹا کر ملا خواجہ بہاریؒ کو نکالا گیا تو وہ بالکل صحیح وسلامت تھے اور ان کے جسم پر ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی تھی۔ دراصل واقعہ یوں ہوا تھا کہ جب مکان کی چھت گری تو دو مضبوط لکڑیاں اس طرح آپس میں مل گئیں کہ ملا خواجہ بہاریؒ محفوظ رہے۔

پھر ایک دن جب حضرت میاں میرؒ کی مجلس میں کسی شخص نے اس واقعے کا ذکر کیا تو وہاں لوگ بھی موجود تھے جو خواجہ صاحبؒ کے مہمان تھے اور جنہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے مکان کو زمین بوس ہوتے دیکھا تھا۔ ان لوگوں کو قوی امید تھی کہ حضرت شیخؒ اس واقعے کو سن کر ملا خواجہ بہاریؒ کی تعریف فرمائیں گے...... مگر جب حضرت میاں میرؒ حاضرین مجلس سے مخاطب ہوئے تو سننے والے حیرت زدہ رہ گئے۔

حضرت میاں میرؒ نے نہایت افسردہ لہجے میں فرمایا۔ "ہائے مرتبہ...... ہائے مرتبہ۔ مرتے وقت بھی اس کا خیال دل سے دور نہیں ہوتا۔"

حضرت میاں میرؒ کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ ملا خواجہ بہاریؒ نے کلمۂ طیبہ بلند آواز سے پڑھا تھا تاکہ لوگ ان کی تعریف کریں کہ ملا بہاری کتنا بڑا درویش تھا کہ مرتے وقت بھی خدا کو یاد کرتا رہا۔

ملا خواجہ بہاریؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت شیخؒ نے مجھے اس طرح تنبیہ کی تھی اور یہ نکتہ سمجھایا تھا کہ کلمۂ طیبہ آہستہ آہستہ پڑھنا چاہئے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت میاں میرؒ عالم جوانی میں اس قدر قناعت پسند اور متوکل تھے کہ آٹھ آٹھ دن تک کھانا نہیں کھایا کرتے تھے۔ پھر جو کچھ غیب سے مل جاتا اسے تناول فرماتے اور اپنے خالق کا اس طرح شکر ادا کرتے کہ تو جس حال میں رکھے وہی حال بہتر ہے۔

حضرت شیخؒ کے ایک خادم کا بیان ہے کہ آخری عمر میں آپ کا طریقۂ کار کسی قدر تبدیل ہوگیا تھا اور یہ تبدیلی بھی صرف مریدوں کی دلجوئی کے سبب تھی۔ حضرت میاں میرؒ نے اپنے خادم کو صرف ایک قسم کا کھانا پکانے کا حکم دیا تھا۔ خادم مٹی کے برتن میں کھانا پکا کر لے جاتا اور حضرت میاں میرؒ تمام مریدوں کے ساتھ مل کر نوش فرماتے۔ اگر اتفاق سے کوئی مرید موجود نہ ہوتا تو اس کا حصہ الگ کر دیا

جاتا۔ خاص طور پر شیخ محمد لاہوریؒ کے گھر کھانا بھیجتے اور فرماتے کہ وہ عیال دار ہے۔

شہزادہ دارا شکوہ تحریر کرتا ہے حضرت میاں میرؒ کا زیادہ تر وقت استغراق میں گزرتا تھا۔ اس لئے آپ دن رات میں بہت کم غذا استعمال فرماتے تھے......اور جو تھوڑا بہت کھاتے تھے، اس کی بھی خبر نہیں ہوتی تھی کہ کیا کھایا ہے۔ ہمیشہ جمال حق کے مشاہدے میں غرق رہتے تھے اور اکثر حاضرین مجلس سے پوچھا کرتے تھے کہ آج کون سا دن یا کون سا مہینہ ہے۔ کبھی استغراق کا یہ عالم ہوتا کہ کھانا کھاتے وقت خادم سے پوچھتے کہ تم نے یہ کیا چیز پکائی ہے؟

حضرت میاں میرؒ امراء اور دیگر صاحبان ثروت کی نذریں قبول نہیں فرماتے تھے۔ ہاں اگر کوئی عقیدت مند اپنی حلال کی کمائی سے بطور نذر کچھ پیش کرتا تو آپ خوشی سے قبول فرما لیتے اور پھر فوراً ہی کھانا پکوا کر حاضرین کو کھلا دیتے۔ جب کھانا ختم ہو جاتا تو باآواز بلند فارسی کا یہ شعر پڑھتے۔

"اگر ساری دنیا خون سے پُر ہو اور مال سے بھر جائے تب بھی مردِ خدا حلال کے سوا کچھ نہیں کھاتا۔"

ایک دن جب حضرت میاں میرؒ نے کھانا کھانے کے بعد یہ شعر پڑھا تو اس وقت ملا عصمت اللہ بھی مجلس میں موجود تھے۔ ملا صاحب نے عرض کیا کہ کسی شاعر نے حدیث رسول ﷺ کا مضمون نظم کر دیا ہے۔

یہ سن کر حضرت میاں میرؒ نے سر نیاز خم کر دیا اور نہایت پُرسوز لہجے میں کہا۔ "بے شک میرے آقا ﷺ نے یہی ارشاد فرمایا ہے کہ اگر سارا جہان خون سے پُر اور مالا مال ہو جائے تب بھی مردِ خدا حلال کے سوا کچھ نہیں کھاتا۔"

اسی مجلس میں ملا معصوم بھی حاضر تھے۔ انہوں نے عرض کیا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"جو ایمان لائے اور پھر ان لوگوں نے نیک اعمال کئے، ان کیلئے کھانے میں کوئی کچھ حرج نہیں، پھر ڈرو اور نیکی کرو۔ اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔" (ترجمہ)

شہزادہ دارا شکوہ لکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص مسلسل کھانا پکا کر لاتا تو آپ اسے منع فرما دیتے تھے۔

ایک دن خادم نے منع کرنے کا سبب پوچھا تو حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔

"چاہے وہ حلال کمائی سے حاصل کیا ہوا رزق ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر کوئی شخص پے در پے نذر بھیجے تو انسانی دل میں ایک اُمید سی پیدا ہو جاتی ہے پھر توکل ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔"

حضرت میاں میرؒ کے اس قول مبارک کے بارے میں دارا شکوہ تحریر کرتا ہے کہ حضرت نے جس خطرے کے متعلق فرمایا تھا اس کا تعلق آپ کی ذات مبارک سے ہرگز نہیں تھا۔ یہ بات محض طالبوں اور مریدوں کو سمجھانے کیلئے کی گئی تھی۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ حضرت میاں میرؒ کے دل میں کبھی کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوا......اور اس شخص کے دل میں خطرہ کس طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ جو شاہان وقت سے ملنا بھی گوارہ نہ کرتا ہو۔

اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کیلئے شہزادہ دارا شکوہ لکھتا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر ایک زمانے میں درویشوں اور صوفیوں سے برائے نام بھی عقیدت نہیں رکھتا تھا بلکہ اس جماعت کے لوگوں کو بے دریغ اذیتیں پہنچاتا تھا۔ ایک بار جہانگیر کے کسی مصاحب نے حضرت میاں میرؒ کے زہد و تقویٰ کا ذکر کیا۔ جہانگیر کو بہت حیرت ہوئی اور اس نے بے اختیار ہو کر کہا۔ ''کیا میری سلطنت میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں؟''

پھر جہانگیر نے حضرت میاں میرؒ کو آزمانے کیلئے، اپنے مصاحب کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ شہنشاہِ ہند آپ سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔

پھر جب مغل شہنشاہ جہانگیر کے مصاحب خاص نے حضرت میاں میرؒ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہو کر فرمانروائے ہندوستان کا پیغام پہنچایا تو اس مردِ درویش نے یہ کہہ کر معذرت کر لی۔ ''میں اپنی عدیم الفرستی کے باعث حکم شاہی کی تعمیل سے معذور ہوں۔''

جہانگیر ایک مرد درویش کا جواب سن کر حیران رہ گیا۔ پھر اس نے حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا۔ ''شیخ بہتر جانتے ہیں کہ میں امورِ سلطنت کی انجام دہی کے سلسلے میں کس قدر مصروف ہوں مگر اس کے ساتھ ہی مجھے آپ سے ملنے کا شوق بھی بے چین رکھتا ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لا کر مجھے ممنون فرمائیں۔''

حضرت میاں میرؒ نے شہنشاہ جہانگیر کا خط پڑھا اور کسی تامل کے بغیر طویل سفر طے کر کے قصرِ شاہی تشریف لے گئے۔

شہزادہ دارا شکوہ لکھتا ہے کہ جب حضرت میاں میرؒ بادشاہ سے ملنے کیلئے ایک مخصوص کمرے میں جلوہ افروز ہوئے تو جہانگیر اپنی عادت کے خلاف آپ کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ (واضح رہے کہ جہانگیر کے دورِ حکومت میں سجدۂ تعظیم کا رواج تھا اور بڑے بڑے علماء چار و ناچار اس رسم کو ادا کرتے تھے مگر جب حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ نے سجدۂ تعظیمی سے انکار کیا تو مغل شہنشاہ غضب ناک ہو گیا اور پھر اس نے حضرت شیخ مجددؒ کو نافرمانی کے جرم میں حوالۂ زنداں کر دیا) آج یہ وہی جہانگیر تھا جو حضرت میاں میرؒ کے احترام میں اپنی نشست سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

شہزادہ دارا شکوہ کا بیان ہے کہ حضرت میاں میرؒ اور جہانگیر کے درمیان بہت دیر تک گفتگو جاری رہی۔ حضرت شیخ کی تقریر اس قدر پُر تاثیر تھی کہ شہنشاہ جہانگیر کا مزاج ہی بدل گیا اور اس کا دل دنیا کی رنگینیوں سے اُچاٹ نظر آنے لگا۔

''آپ سے ملنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ دنیاوی جاہ و منصب کی کوئی حیثیت نہیں۔ سلطنت ہند کے جتنے زر و جواہر ہیں وہ میری نظر میں اینٹ اور پتھر کے برابر ہیں۔ اگر آپ مجھ پر محبت کی نظر کریں تو میں تعلقات دنیا کو ترک کر دوں۔''

حضرت میاں میرؒ نے شہنشاہ جہانگیر کی یہ جذباتی گفتگو سن کر فرمایا۔ ''کامل صوفی وہ ہے جس کی نظر میں پتھر اور جواہرات یکساں ہوں۔ تم کہتے ہو کہ تمہارے نزدیک ہیرے اور پتھر برابر ہیں، اس لئے تم

ہوئی ہو۔'' ایک مرد درویش کی گفتگو سن کر مغل شہنشاہ حیران رہ گیا۔ پھر نہایت پُر سوز لہجے میں عرض کرنے لگا۔ ''میاں جی! آپ ایسی دلیلیں دے کر مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔''

حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ ''تمہارا وجود خلق خدا کی پاسبانی کیلئے ضروری ہے اور تمہارے عدل و انصاف کی برکت سے فقیر بھی دلجمعی کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول ہیں۔''

مغل شہنشاہ حضرت میاں میرؒ کی گفتگو سے اس قدر متاثر ہوا کہ بار بار ایک ہی جملہ دہراتا رہا۔ ''براہِ کرم آپ میرے حال پر توجہ فرمائیں۔''

''پہلے تم مخلوق خدا کی خدمت کیلئے اپنے جیسا نگہبان مہیا کر دو۔ پھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر مشغول حق کر دوں گا۔''

شہنشاہ جہانگیر کو حضرت شیخؒ کی یہ بات بہت پسند آئی۔ پھر عرض کرنے لگا۔ ''میری شدید خواہش ہے کہ آپ مجھے کسی خدمت کا موقع دیں۔''

حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ ''میں جو کچھ تم سے طلب کروں گا کیا تم وہ چیز مجھے دے دو گے؟''

شہنشاہ جہانگیر نہایت پر جوش نظر آنے لگا۔ ''آپ اشارہ تو کریں جو کچھ میرے دائرۂ اختیار میں ہے، وہ سب آپ کی نذر کر دوں گا۔''

''کیا تم اپنے وعدے پر قائم رہو گے؟'' حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔

''حکم تو دیں۔ آپ مجھے ہر حال میں وعدے کا پابند پائیں گے۔'' شہنشاہ جہانگیر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر میری یہی خواہش ہے کہ شہنشاہ مجھے رخصت کریں اور آئندہ زحمت نہ دیں۔'' حضرت میاں میرؒ نے شانِ بے نیازی کے ساتھ فرمایا۔ یہ وہی جواب تھا جو حضرت میاں میرؒ کے پیر و مرشد حضرت خضرؒ نے حاکم سیوستان کی خواہش کے جواب میں دیا تھا۔

شہنشاہ جہانگیر ایک مرد قلندر کا یہ انداز دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر اس نے ہرن کی کھال کا بنا ہوا ایک مصلّیٰ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ ''شیخ! کم سے کم اسے تو قبول فرما لیجئے کہ میری بادشاہی کا بھرم رہ جائے۔''

حضرت میاں میرؒ نے مصلّیٰ قبول کر لیا اور قصرِ شاہی سے رخصت ہو گئے۔

دارا شکوہ اس تاریخ ساز واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جس مرد آزاد نے جہانگیر جیسے شہنشاہ کے عطیات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو، اس کے دل میں متاع دنیا کے حوالے سے کوئی خطرہ کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ تو حضرت شیخؒ نے اپنے مریدوں کو سمجھانے کی غرض سے یہ بات کہی تھی کہ اگر کوئی شخص بار بار نذر بھیجے تو دل میں ایک اُمید سی پیدا ہو جاتی ہے۔ توکل جاتا رہتا ہے اور خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرت میاں میرؒ کے توکل کی شان تو یہ تھی کہ جب کوئی بادشاہ یا امیر آپ کی خدمت میں نذر بھیجتا تو سخت برہم ہو جاتے اور انتہائی پُر جلال لہجے میں فرماتے۔

''تو نے مجھے فقیر سمجھ کر یہ نذر بھیجی ہے لیکن یاد رکھ کہ میں فقیر بھی نہیں ہوں اور اس چیز کا مستحق بھی نہیں ہوں۔ میں غنی ہوں، اس لئے کہ غنی کا بندہ ہوں۔ جس کا اللہ ہو وہ فقیر نہیں ہو سکتا۔ اپنے تحائف واپس لے جاؤ اور انہیں محتاجوں میں تقسیم کر دو۔''

ان تمام واقعات کا ذکر کرنے کے بعد دارا شکوہ حضرت میاں میرؒ کو اس طرح خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ ''میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا شخص نہیں دیکھا جس کی نگاہ میں دنیا اس قدر حقیر ہو جتنی حضرت میاں میرؒ کی نظر میں تھی۔''

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت میاں میرؒ ان جاں باز صوفیا میں سے تھے جن کی ریاضت و عبادت اور نفس کشی تاریخ تصوف کا روشن ترین باب ہے۔ ایک بار آپ سرہند سے لاہور تشریف لا رہے تھے کہ ایک گاؤں میں داخل ہوئے جہاں پٹھانوں کے کئی قبائل آباد تھے۔ حضرت شیخ نے کچھ دنوں تک مقامی مسجد میں قیام فرمایا۔ اتفاق سے رمضان کا مہینہ تھا۔ حضرت میاں میرؒ نے تین دن اور تین رات تک کوئی چیز نہیں کھائی۔ بس پانی سے روزہ افطار کرتے اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ چوتھی رات نماز مغرب کے بعد آپ مسجد سے باہر نکلے اور ایک گاؤں میں داخل ہو گئے۔ پھر ایک مکان پر پہنچے جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ حضرت میاں میرؒ دستک دے کر مالک مکان کو بلانا چاہتے تھے کہ آپ کی نظر ایک خوان پر پڑی جو مختلف قسم کے کھانوں سے بھرا ہوا تھا۔

حضرت میاں میرؒ اس واقعہ کے بارے میں خود فرماتے ہیں۔ ''جب بھوک کی شدت بڑھ گئی تو میرے نفس نے مجھ سے کہا، تم نے سوال کرنا تو اپنے آپ پر حرام کر لیا ہے۔ اب پیٹ بھرنے کی یہی ایک صورت رہ گئی ہے کہ تم خیانت کرو اور کھانا اُٹھا کر کھا لو۔''

میں نے اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہا۔ ''خیانت کرنے سے سوال کرنا بہتر ہے۔''

میرے نفس نے عجیب دلیل پیش کی۔ ''حالت اضطرار میں مردار بھی جائز ہے۔''

الغرض کچھ دیر تک مجھ میں اور میرے نفس میں شدید جنگ ہوتی رہی۔ آخر میں سوال کئے بغیر مسجد میں واپس چلا آیا۔

ابھی مجھے مسجد میں آئے ہوئے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ایک لونڈی کھانے کا خوان اُٹھائے ہوئے میرے پاس آئی۔ میں نے خوان کی طرف غور سے دیکھا اس میں وہی کھانا موجود تھا جسے میں کچھ دیر پہلے ایک مکان کے دروازے میں رکھا ہوا چھوڑ آیا تھا۔ میں نے لونڈی سے پوچھا۔ ''تو یہ کھانا کہاں سے لائی ہے؟''

''میرے مالک نے مجھ سے کہا تھا کہ مسجد میں ایک بھوکا شخص بیٹھا ہے۔ اسے یہ کھانا پہنچا دو۔'' لونڈی نے جواباً کہا۔ ''کیا تم وہ شخص نہیں ہو؟''

''وہ بھوکا شخص تو میں ہی ہوں مگر اب مجھے اس کھانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے لونڈی کو مخاطب کر کے کہا اور ہنسنے لگا۔ لونڈی چند لمحوں تک میری حالت کو تعجب سے دیکھتی رہی اور پھر خوان اُٹھا کر

پس چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ شخص مسجد میں داخل ہوا جس نے کھانا بھیجا تھا۔ ''آخر تم نے کھانا کیوں واپس دیا؟'' اس شخص نے میرے قریب آ کر پوچھا۔ ''اور اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی؟''

میں نے اس شخص کو تمام واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ ''میرے نفس نے مجھے ورغلایا تھا مگر بفضل خدا نے شکست کھائی۔''

یہ ماجرا سن کر وہ شخص میرا معتقد ہو گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ یہ بات جو رات کی تنہائی میں کہی گئی پورے گاؤں میں مشہور ہو گئی۔ لوگ قطار در قطار میرے پاس آنے لگے۔ مجھے ان کی صورتیں دہشت سی ہوتی تھی۔ آخر ایک دن میں رات کی تاریکی میں خاموشی کے ساتھ لاہور چلا آیا۔

عبادت و ریاضت، صبر و قناعت اور نام و نمود سے بیزاری، حضرت میاں میرؒ کے نمایاں اوصاف جہاد زندگانی میں یہی آپ کے ہتھیار تھے اور ان ہی ہتھیاروں کے ذریعے ایک بندۂ مزدور سے شہنشاہِ وقت تک، سب پر حکومت کی۔

مجذوبوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے مگر حضرت میاں میرؒ کے رعب جلال کا یہ عالم تھا کہ بڑے سے بڑا مجذوب بھی آپ کے سامنے آتے ہوئے گھبراتا تھا۔ اگر کسی مجذوب کو معلوم ہو جاتا کہ حضرت میاں میرؒ فلاں راہ سے گزر رہے ہیں تو وہ اپنا راستہ بدل لیتا۔ مغل شہزادہ دارا شکوہ لکھتا ہے کہ اگر کوئی برہنہ مجذوب حضرت میاں میرؒ کے سامنے سے گزر جاتا تو آپ نہایت غضب ناک لہجے میں فرماتے۔

''بےادب! کیا تماشا دکھاتا پھرتا ہے؟ اپنے آپ کو ڈھانک۔''

خواہ وہ کسی مرتبے کا مجذوب ہوتا مگر حضرت میاں میرؒ کی پُر جلال آواز سن کر فوراً ہوش میں آ جاتا اور اپنا بدن ڈھانپنے کی کوشش کرتا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک درویش خرقہ اور عمامہ پہنے دو تین خدمت گاروں کے ساتھ حضرت میاں میرؒ کی مجلس روحانیت میں حاضر ہوا۔ اس کے داخل ہونے کا انداز بڑا متکبرانہ تھا۔ اس نے خود پسندی کے ساتھ چاروں طرف نظر ڈالی اور ایک اونچے مقام پر بیٹھ گیا۔ حاضرین مجلس کو یہ بات ناگوار گزری مگر حضرت شیخؒ کے احترام کے پیش نظر سب لوگ خاموش رہے۔ حضرت میاں میرؒ نے بھی اس درویش کے ریاکارانہ عمل کو دیکھا مگر کوئی تعرض نہیں فرمایا۔

تھوڑی دیر بعد ایک شکستہ حال شخص خانقاہ میں داخل ہوا اور اس جگہ بیٹھ گیا جہاں لوگوں کی جوتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ حضرت میاں میرؒ نے اس شخص کو بھی ایک نظر دیکھا مگر زبان مبارک سے کچھ ارشاد نہ فرمایا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک آسودہ حال شخص مجلس میں داخل ہوا اور اس نے حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں بتیس روپے پیش کئے (واضح رہے کہ اس زمانے کے بتیس روپے موجودہ دور کے ہزاروں روپے سے زیادہ قیمت رکھتے تھے) حضرت میاں میرؒ کی عادت تھی کہ آپ ہر کس و ناکس کی نذر قبول نہیں فرماتے تھے مگر اس روز خلاف دستور آپ نے ہاتھ بڑھا کر وہ روپے

لے لئے۔ نذر پیش کرنے والے شخص کو حاضرین مجلس میں سے کوئی نہیں پہچان سکا۔ وہ اچانک آیا اور تیز رفتاری کے ساتھ واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی حضرت میاں میرؒ نے اس شخص کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا جو حاضرین مجلس کے جوتوں کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔

وہ مفلوک الحال شخص سر جھکائے ہوئے آگے بڑھا اور حضرت میاں میرؒ کے قریب پہنچ کر دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

"یہ تمہارے لئے ہیں۔" حضرت میاں میرؒ نے وہ بتیس روپے اس شخص کو دیتے ہوئے فرمایا۔ "اس رقم سے ایک گھوڑا خریدو اور کچھ پیسے اپنے پاس رکھو۔ پھر فلاں شہزادے کے پاس ملازمت کیلئے جاؤ، انشاء اللہ تمہارا کام ہو جائے گا۔"

اس پریشان حال شخص نے حضرت میاں میرؒ کا شکریہ ادا کیا، پھر آپ کے دست حق پرست کو بوسہ دیا اور اُلٹے قدموں واپس چلا گیا۔

اونچی جگہ پر بیٹھا ہوا وہ خرقہ پوش درویش یہ تمام منظر چپ چاپ دیکھتا رہا۔ پھر جب وہ شخص چلا گیا تو خود پسندر یا کار درویش حضرت میاں میرؒ سے تلخ لہجے میں مخاطب ہوا۔

"شیخ! تم نے یہ کیا کیا؟ فقیروں کا حق غیر مستحق انسان کو دے دیا۔ میں اس شخص سے پہلے مجلس میں داخل ہوا تھا۔ اس لئے اس رقم پر میرا حق زیادہ تھا۔"

"ظاہری طور پر اس شخص کا حق تم سے زیادہ تھا۔" حضرت میاں میرؒ نے انتہائی نرم و شیریں لہجے میں فرمایا۔

خرقہ پوش درویش نے حضرت میاں میرؒ کی پیش کردہ توجیہہ کو لائق اعتنا نہیں سمجھا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر جانے لگا۔ حاضرین مجلس نے دیکھا کہ اس مغرور درویش کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے۔

"ناراض ہو کر کیوں جاتے ہو؟" حضرت میاں میرؒ کے ہونٹوں پر وہی دلنواز تبسم موجود تھا۔ "کھانا تو کھاتے جاؤ۔"

خرقہ پوش درویش نے ان کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا اور وہ پاؤں پٹختا ہوا خانقاہ سے باہر چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی حضرت میاں میرؒ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "کیا زمانہ آ گیا ہے کہ لوگوں نے خرقہ پوشی کو حصولِ آمدنی کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ اس درویش کی کمر کے گرد ایک سو ساڑھے بائیس روپے بندھے ہوئے ہیں اور پھر بھی ضرورت مندوں کے مقابلے میں اپنا حق جتلاتا ہے۔ افسوس! وہ نہیں جانتا کہ یہ ہوس ذرا سے مار ڈالے گی۔"

حاضرین مجلس نے حضرت میاں میرؒ کا ارشاد گرامی سنا اور اپنے سر جھکا لئے...... مگر جو لوگ حضرت شیخؒ کے مقام روحانی سے کسی قدر واقف تھے، انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس خرقہ پوش درویش کے ساتھ عنقریب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے۔

دو تین دن بعد وہ درویش غسل کیلئے ایک حمام میں گیا۔ پھر غسل سے فارغ ہو کر اس نے خرقہ پہنا

اور دوبارہ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس مرتبہ بھی اس کے خانقاہ میں داخل ہونے اور بیٹھنے کا وہی متکبرانہ انداز تھا۔ حضرت میاں میرؒ نے درویش کو دیکھ کر فرمایا۔

"یہ فقیروں کی مجلس ہے۔ کمر کھول کر اطمینان سے بیٹھو۔"

حضرت میاں میرؒ کی بات سن کر درویش کو کچھ یاد آیا اور اس نے گھبرا کر اپنی کمر پر ہاتھ مارا۔ پھر دہشت زدہ انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ حضرت میاں میرؒ نے درویش سے اس کی گھبراہٹ کا سبب پوچھا تو کہنے لگا۔ "میری کوئی چیز کھو گئی ہے۔ میں اس کی تلاش میں جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بدحواسی کے عالم میں خانقاہ سے چلا گیا۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ خرقہ پوش درویش کی کمر کے گرد ایک ہمیانی بندھی ہوئی تھی جس میں ایک سو ساڑھے بائیس روپے موجود تھے۔ جب درویش غسل کرنے کیلئے حمام میں داخل ہوا تو وہ ہمیانی غائب ہو گئی مگر درویش کو اس کا احساس تک نہیں ہوا مگر جب حضرت میاں میرؒ نے درویش سے کمر کھولنے کیلئے کہا تو اسے پتا چلا کہ وہ اپنی رقم سے محروم ہو چکا ہے۔

درویش اپنی کھوئی ہوئی ہمیانی کی تلاش میں صبح سے شام تک سرگرداں پھرتا رہا مگر جب اسے اپنی گمشدہ رقم نہیں مل سکی تو وہ پریشان چہرے اور تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خرقہ پوش درویش کا سارا غرور رخصت ہو چکا تھا اور اب وہ ایک انتہائی شکستہ انسان نظر آ رہا تھا۔ "شیخ! میں اپنی گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ میری کھوئی ہوئی چیز مجھے واپس دلا دیں۔"

حضرت میاں میرؒ نے اس کی گداگرانہ درخواست سن کر فرمایا۔ "مجھے کیا معلوم تمہاری کیا چیز تھی اور وہ کہاں گم ہو گئی؟"

آخر خرقہ پوش درویش افشائے راز پر مجبور ہو گیا۔ "شیخ! میری ہمیانی گم ہو گئی ہے۔ اس میں ایک سو ساڑھے بائیس روپے موجود تھے۔"

درویش کی بات سن کر حاضرین مجلس حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ حضرت میاں میرؒ اس رقم کی طرف پہلے ہی اشارہ فرما چکے تھے۔

"میں اس قابل کہاں کہ تمہاری کھوئی ہوئی رقم تمہیں لوٹا سکوں۔" حضرت میاں میرؒ نے جواباً فرمایا۔

خرقہ پوش درویش بھری مجلس میں بچوں کی طرح مچل گیا۔ "شیخ! یا تو میں اپنی وہ رقم تم سے لوں گا یا پھر مر جاؤں گا۔"

درویش کا واویلا سن کر حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ "دریا کے کنارے فلاں مقام پر ایک بڑی کشتی موجود ہے۔ اس میں ایک فقیر بیٹھا گدڑی سی رہا ہوگا۔ اس کے پاس جا! وہ تجھے تیری ہمیانی دے دے گا۔"

خرقہ پوش درویش بھاگتا ہوا دریا کے کنارے جا پہنچا۔ واقعتاً وہاں ایک بڑی کشتی موجود تھی جس میں ایک فقیر بیٹھا ہوا گدڑی سی رہا تھا۔ خرقہ پوش درویش فقیر کے پاس گیا مگر دل میں یہی سوچتا رہا کہ

یہ کوئی معمولی مزدور ہے۔ حضرت میاں میرؒ نے جس فقیر کے متعلق فرمایا تھا وہ کوئی اور شخص ہوگا۔ ابھی خرقہ پوش درویش یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس فقیر نے سر اُٹھایا اور بڑے عجیب انداز میں بولا۔

"ہاں! میں ایک مزدور ہوں مگر اس بوجھ کو اُٹھاتا ہوں جس کیلئے حضرت میاں میرؒ نے تجھے یہاں بھیجا ہے۔ اپنی ہمیانی پہچان کر اُٹھالے۔"

جب خرقہ پوش درویش نے کشتی پر نگاہ کی تو وہاں بہت سی ہمیانیاں موجود تھیں۔ اس نے اپنی ہمیانی اُٹھالی۔ فقیر نے اسے دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "پوری رقم گن لے۔"

خرقہ پوش درویش نے رقم گنی تو پورے ایک سو ساڑھے بائیس روپے تھے۔ وہ خوشی خوشی اپنی ہمیانی لے کر حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں واپس آیا اور شکریہ ادا کرنے لگا کہ آپ کی توجہ سے مجھے میری کھوئی ہوئی رقم دوبارہ مل گئی۔ لالچی درویش کو رقم تو مل گئی لیکن گردش وقت کے سبب وہ اس کے کام نہ آسکی۔ روپے گم ہو جانے کا درویش کو اس قدر صدمہ پہنچا تھا کہ اسے خونی اسہال کی بیماری لاحق ہوگئی تھی۔ پھر اسی بیماری میں اس کا انتقال ہوگیا۔ درویش کے مرنے کے بعد اس رقم پر اس کے ایک خدمت گار نے قبضہ کرلیا اور فرار ہوگیا۔ پھر جب دوسرے خدمت گار کو اس بات کا پتہ چلا تو اس نے پہلے خادم کو راستے میں جالیا اور قتل کرڈالا۔ راہ گیروں نے یہ منظر دیکھا تو درویش کے دوسرے خادم کو پکڑ لیا اور قصاص کے طور پر اسے بھی مار ڈالا۔

جب لاہور کے باشندوں کو اس المناک واقعے کی خبر ملی تو انہیں حضرت میاں میرؒ کا ارشاد گرامی یاد آیا۔

"یہ ہوس زر درویش کو مار ڈالے گی۔"

اور جس شکستہ حال شخص کو حضرت میاں میرؒ نے بتیس روپے دیئے تھے وہ شاہجہاں کا ملازم ہوا اور اس کا گھر سیم وزر سے بھر گیا۔

حضرت میاں میرؒ کا طریقہ تھا کہ اپنی مجلس میں ذکر الٰہی پر بہت زور دیتے۔ اپنے مریدوں کو اسم ذات "اللہ" کے ذکر کی بار بار تلقین فرماتے۔ کبھی کسی مرید کے دل میں یہ خیال آتا کہ پیرومرشد نے کوئی مشکل وظیفہ کیوں نہیں بتایا تو حضرت میاں میرؒ اپنی تقریر کے دوران اشارات وکنایات میں "اسم ذات" کی اس طرح وضاحت فرماتے کہ حاضرین مجلس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔

ایک بار آپ نے طالبان ذوق کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "حضرت جنید بغدادیؒ وہ بزرگ تھے کہ تیس سال تک راتوں کو کھڑے ہوکر "اللہ اللہ" کیا کرتے تھے۔"

ایک اور موقع پر حضرت میاں میر لاہوریؒ نے فرمایا۔ "حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ کا بھی یہی دستور تھا کہ اسم ذات کا ذکر کرتے اور آپ پر استغراق کی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی کہ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ جب بغداد میں گناہ حد سے زیادہ بڑھ گئے تو ایک بار آپ کو عالم خواب میں صدائے غیب سنائی دی۔

"اے شبلی! اگر تو بغداد میں نہ ہوتا اور اللہ اللہ نہ کرتا تو اس زمین پر ایک ایسی بلا نازل ہوتی کہ جس

کے ہولناک اثرات سے پورا شہر ہلاک ہو جاتا۔"

ایک دن حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے عبدالرحمٰن خراسانی سے پوچھا۔ "کیا تو نے شبلیؒ کے سوا کسی شخص کو دیکھا ہے جو فقط اللہ ہی اللہ کہتا ہو۔"

عبدالرحمٰن خراسانی نے کسی تکلف کے بغیر جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے شبلی کو بھی اللہ اللہ کہتے نہیں سنا۔"

عبدالرحمٰن خراسانی کا جواب سن کر حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ کی حالت غیر ہوگئی۔ پھر آپ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔

"جس وقت تو اللہ کہے، اس وقت بھی وہ اللہ ہے...... اور جب تو چپ رہے تو بھی وہ اللہ ہے...... یا اللہ...... اللہ کیا ہے؟ اور وہ نہیں جانتا کہ اللہ کون ہے؟ وہ پاک، وحدہٗ لاشریک ہے۔" یہ کہہ کر حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ بے ہوش ہوگئے اور زمین پر گر پڑے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ "حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ ہمیشہ "اللہ اللہ" کہا کرتے تھے۔

ایک دن کسی شخص نے برسر مجلس ٹوکتے ہوئے کہا۔ "شیخ! آپ لا الٰہ الا اللہ کیوں نہیں کہتے؟"

اس شخص کا سوال سن کر حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے فرمایا۔ "مجھے اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر میں کس کی نفی کروں؟"

یہ اقرار اور محبت کی آخری منزل ہے کہ بندہ اس ذات واحد کے تصور میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے مالک کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر وہ کس چیز کا انکار کرے؟ حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ کے قول مبارک کا بھی یہی مفہوم ہے۔

حضرت میاں میر لاہوریؒ بھی ہم مجلسوں سے بہت کم کلام کرتے تھے۔ آپ کا بیشتر وقت سکوت اور خاموشی میں گزرتا۔ اگر کبھی کسی جگہ تشریف لے جاتے تو راستے بھر خاموش رہتے۔ اگر دوست اور خدمت گار سرِ راہ گفتگو کرتے تو انہیں واضح الفاظ میں منع فرماتے۔

"بات چیت کم کیا کرو کہ اس طرح انسان ذکر الٰہی سے محروم رہ جاتا ہے۔"

کبھی حاضرین مجلس کو مخاطب کرکے فرماتے۔ "اگر تم راستوں اور بازاروں میں تنہا جاؤ گے تو ذکر الٰہی میں مشغول رہ سکو گے۔"

حضرت میاں میرؒ کا طریقہ تھا کہ امراء کی محفلوں میں جانے سے گریز فرماتے تھے۔ تاریخ کے حوالے سے آپ کی حیات مبارکہ میں بس ایک ہی واقعہ نظر آتا ہے کہ جب مغل شہنشاہ جہانگیر نے بار بار درخواست کی تھی اور آپ فرمانروائے ہندوستان کی نیاز مندی سے مجبور ہوکر قصرِ شاہی تشریف لے گئے تھے...... ورنہ حضرت میاں میرؒ کسی شخص کے گھر یا مجلس میں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی عقیدت مند التجا کرتا کہ شیخ اپنے وجود مسعود سے اس کے غریب کدے کو منور فرمادیں تو آپ ناراض ہو جاتے اور انتہائی ناخوشگوار لہجے میں فرماتے۔

"جو شخص اپنے گھر میں دوسروں کی آمد برداشت نہ کرتا ہو، وہ کسی دوسرے کے گھر جانا کب پسند کرے گا۔"

حضرت میاں میرؒ کی نظر میں اہلِ دنیا کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ ساری زندگی اللہ کے سہارے بسر کی اور مادہ پرستوں پر اس آیت مقدسہ کا مفہوم ثابت کر دیا۔

"ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔" (ترجمہ۔الفاتحہ)

ایک دن حضرت میاں میرؒ کی مجلس آراستہ تھی۔ ایک عقیدت مند نے دست بستہ عرض کیا۔ "شیخ! جب آپ کو اپنے رب کی بارگاہ میں حضوری حاصل ہو، تو میرا بھی خیال رکھنا۔"

اس شخص کی درخواست سن کر حضرت میاں میر لاہوریؒ کو اپنے پیرومرشد حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ یاد آ گئے۔ اس قسم کی درخواست سن کر حضرت شیخؒ نے فرمایا تھا۔ "اللہ مجھے اس وقت کیلئے زندہ نہ رکھے جب اس کے سوا مجھے کسی دوسرے کا خیال آئے۔"

حضرت میاں میرؒ نے بھی اس شخص کی التجا سن کر اپنے پیرومرشد کی طرح کم و بیش یہی الفاظ فرمائے۔ "ایسے وقت پر خاک، جس میں اللہ کے سوا مجھے کوئی دوسرا یاد آئے۔"

حضرت میاں میرؒ کا یہی انداز خدا طلبی تھا کہ جس نے آپ کو ہر شے سے بے نیاز کر دیا تھا......اور جب بندہ ماسوا سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو پھر اسے خالق کائنات کی طرف سے خوشخبری دی جاتی ہے۔

"ہم اس کی آنکھ بن جاتے ہیں ہم اس کی زبان بن جاتے ہیں اور ہم اس کا ہاتھ بن جاتے ہیں۔" (ترجمہ)

علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں مردِ مومن کی اسی شان کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ!
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

حضرت میاں میر لاہوریؒ کی بھی یہی شان عارفانہ تھی۔۔ جس بات کیلئے زبان مبارک سے ارشاد فرما دیتے، حق تعالیٰ اسے پورا کر دیتا۔ جس شخص کیلئے اپنا دامن مراد پھیلا دیتے، اللہ اسے اپنی رحمتوں اور نعمتوں سے بھر دیتا۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

شیخ عبدالواحدؒ، حضرت میاں میر لاہوریؒ کے مرید خاص تھے۔ حضرت شیخ ان پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔ ان ہی شیخ عبدالواحدؒ کا بیان ہے کہ ایک دن پیرومرشد مرزا کامران کے باغ کے سامنے دریا کے کنارے لیٹے ہوئے تھے اور میں حضرت شیخؒ کے پاؤں دبا رہا تھا کیونکہ آپ کو جوڑوں کے درد کا عارضہ لاحق تھا۔ میں نے اسی اثناء میں ایک بہت بڑے کالے سانپ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ خوف سے میرے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ میری یہ حالت دیکھ کر حضرت شیخؒ نے فرمایا۔

"عبدالواحد! کیا بات ہے؟ میں تمہارے چہرے پر خوف اور بے چینی کے آثار دیکھ رہا ہوں۔"

"سیّدی! ایک بڑا کالا سانپ ہماری طرف آ رہا ہے۔" چہرے کے ساتھ ساتھ میرے لہجے سے

بھی پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

حضرت میاں میر لاہوریؒ نے نہایت پُرسکون لہجے میں فرمایا۔ "آنے دو! اسے ہم لوگوں سے کوئی کام ہوگا۔"

شیخ عبدالواحدؒ کہتے ہیں کہ میں پیرومرشد کا ارشاد گرامی سن کر خاموش تو ہو گیا مگر اس خوفناک زہریلے جانور کی دہشت مجھ پر طاری رہی۔ سانپ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا اور حضرت میاں میرؒ اطمینان سے لیٹے رہے۔

پھر جب وہ سانپ سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تو پیرومرشد اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ پھر میری آنکھوں نے عجیب و غریب منظر دیکھا۔ سانپ نے آگے بڑھ کر اپنا پھن حضرت میاں میرؒ کے قدموں کے قریب رکھ دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ زہریلا جانور ایک مردِ خدا کے سامنے اپنی عقیدت کا اظہار کر رہا ہو۔ پھر چند لمحوں بعد وہ سانپ سیدھا ہوا اور اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگیں۔

حضرت شیخؒ کا انداز نشست ایسا تھا جیسے آپ ہمہ تن گوش ہو کر سانپ کی گفتگو سن رہے ہوں۔ پھر جب سانپ کے منہ سے آوازیں نکلنا بند ہو گئیں تو حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ "ٹھیک ہے، اسی طرح سہی۔"

جیسے ہی پیرومرشد کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، سانپ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس نے حضرت میاں میرؒ کے گرد تین چکر لگائے اور خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔

شیخ عبدالواحدؒ مجسمۂ حیرت بنے بیٹھے تھے۔ جب وہ سانپ رخصت ہو گیا تو پیرومرشد کی خدمت میں عرض کرنے لگے۔ "سیدی! یہ کیا راز تھا؟"

حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ "کوئی راز نہیں تھا۔ اس سانپ نے قسم کھائی تھی کہ وہ جب بھی مجھے دیکھے گا، میرے گرد تین چکر لگائے گا۔ جواب میں، میں نے اس سے کہا، ٹھیک ہے، اسی طرح سہی۔"

☆☆..........☆☆..........☆☆

ان ہی شیخ عبدالواحدؒ کی روایت ہے کہ ایک دن حضرت میاں میرؒ زنجان کے باغ میں قیام فرما تھے اور یادِالٰہی میں مشغول تھے۔ میں بھی حاضر خدمت تھا کہ ایک فاختہ کہیں سے اُڑتی ہوئی آئی اور قریب کے ایک درخت پر بیٹھ کر بولنے لگی۔ پیرومرشد نے میری طرف دیکھا اور فرمایا۔

"عبدالواحد! غور سے سنو کہ یہ فاختہ کس شیرینی اور فصاحت کے ساتھ اپنے خالق کا نام لے رہی ہے۔"

میں نے غور سے سنا۔ واقعتاً وہ فاختہ بڑے والہانہ انداز میں بول رہی تھی۔ سنسان جنگل میں فاختہ کی آواز سے عجیب سا سماں پیدا ہو گیا تھا۔

میں نے پیرومرشد کی طرف دیکھا تو آپ پر وجد کی سی کیفیت طاری نظر آئی۔ اتنے میں اچانک کسی سمت سے ایک شکاری غلیل ہاتھ میں لئے ہوئے آیا۔ اس نے فاختہ کا نشانہ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے غلہ چھوڑ دیا۔ دوسرے ہی لمحے فاختہ زمین پر گری اور مر گئی۔ شکاری دوڑتا ہوا پرندے کے پاس

گیا اور اسے اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ شرعی اعتبار سے شکار کیا جانے والا جانور اگر ذبح کئے جانے سے پہلے مرجائے تو وہ حرام اور مُردار کہلاتا ہے۔ اس فاختہ کا بھی یہی حال تھا۔ وہ زمین پر گرتے ہی مرگئی تھی، اس لئے شکاری اسے مُردہ حالت میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

حضرت میاں میرؒ کو شکاری کے اس عمل سے سخت اذیت پہنچی۔ پھر جب وہ چلا گیا تو آپ نے اپنے مرید خاص کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''عبدالواحد! اس معصوم پرندے کو اُٹھالاؤ جو کچھ دیر پہلے اپنے رب کی تسبیح بیان کررہا تھا اور جسے ایک انسان کے دست جفا کار نے خاموش کردیا۔''

پیرومرشد کا حکم سنتے ہی میں دوڑتا ہوا وہاں پہنچا اور مردہ فاختہ کو اُٹھا لایا۔ حضرت میاں میرؒ اس خوبصورت پرندے کو ہاتھ میں لے کر چند لمحوں تک دیکھتے رہے۔ پھر آپ نے فاختہ کے مردہ جسم پر اپنا دست مبارک پھیرتے ہوئے فرمایا۔

''اللہ کے حکم سے زندہ ہوجا اور اپنے رب کی پاکی بیان کر۔''

جیسے ہی حضرت میاں میرؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، فاختہ کے تن مردہ میں حرکت پیدا ہوئی اور دوسرے ہی لمحے وہ اُڑ کر درخت کی شاخ پر جابیٹھی اور اسی والہانہ انداز میں بولنے لگی۔

شکاری جو پرندوں کی تلاش میں تھا، فاختہ کی آواز سن کر واپس لوٹا۔ حضرت میاں میرؒ نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو نہایت پُرجلال لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''عبدالواحد! اس سنگدل شکاری سے کہہ دو کہ اگر دوبارہ اس پرندے کو کوئی ضرر پہنچایا تو نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔''

جب شیخ عبدالواحدؒ نے پیرومرشد کا پیغام شکاری کو پہنچایا تو وہ عاقبت نااندیش انسان ایک درویش کے کلام کا مذاق اُڑانے لگا۔ ''میں برسوں سے شکار کھیل رہا ہوں مگر آج تک میرا کچھ نہیں بگڑا۔ اگر کوئی نقصان پہنچے گا تو اسی فاختہ کو پہنچے گا۔'' شکاری نے نہایت درشت لہجے میں کہا اور پوری طاقت سے غلیل کھینچی اور دوسرے ہی لمحے اس کی دردناک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ دراصل واقعہ یوں ہوا تھا کہ غلیل کھینچتے وقت اس کے ہاتھ کانپ گئے تھے اور نشانہ خطا ہوگیا تھا۔ پتھر کا غلہ فاختہ کے لگنے کے بجائے اس کے اپنے انگوٹھے پر لگا اور وہ درد کی شدت سے تڑپنے لگا۔

شیخ عبدالواحدؒ اپنے پیرومرشد کے پاس پہنچے اور سارا ماجرا بیان کردیا۔ جواب میں حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ ''یہ وہ درد نہیں ہے جو کسی دوا یا تدبیر سے ٹھیک ہوجائے۔ یہ لاعلاج ہے اور لاعلاج ہی رہے گا۔ فقیر نے تو اسے پہلے ہی تنبیہہ کردی تھی۔ اب اگر کوئی آفات و مصائب کے کنویں میں گر جائے تو اسے کون بچا سکتا ہے؟''

شیخ عبدالواحدؒ دوبارہ شکاری کے پاس پہنچے اور آپ نے پیرومرشد کے الفاظ اس کے سامنے دہرا دیئے۔ شکاری درد کی شدت سے چیخ رہا تھا۔ شیخ عبدالواحدؒ کی بات سن کر وہ زمین سے اُٹھا اور تیزی کے ساتھ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ''شیخ! میری حالت پر رحم کھاؤ۔ یہ درد مجھے مار ڈالے گا۔''

''جو انسان اپنی حالت پر رحم نہیں کھاتا اس پر کوئی دوسرا کیسے رحم کھائے گا؟'' حضرت میاں میرؒ نے شکاری کی آہ وزاری سن کر فرمایا۔ ''اے شخص کیا تو بھوکا تھا جو پرندے کو شکار کررہا تھا؟''

شکاری نے نفی میں جواب دیا تو حضرت میاں میرؒ نے انتہائی پُرجلال لہجے میں دوبارہ فرمایا۔

''شریعت نے شکار اسی لئے جائز قرار دیا ہے کہ انسان بھوک اور ضرورت کے وقت چرندوں اور پرندوں کو مار کر اپنے استعمال میں لائے۔ سیر و تفریح اور نفس کی تسکین کیلئے اللہ کی مخلوق کا خون بہانا مناسب نہیں۔''

درد کی شدت اور حضرت میاں میرؒ کی پُرجلال گفتگو سن کر شکاری کا اندازِ فکر بدل گیا اور وہ گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''شیخ! اگر میرے ہاتھ کا درد چلا جائے تو میں ہمیشہ کیلئے شکار سے تائب ہوجاؤں گا۔''

''تو پھر حق تعالیٰ بھی تجھے کسی قسم کی اذیت نہیں دے گا۔'' ابھی فضا میں حضرت میاں میرؒ کے الفاظ کی بازگشت باقی تھی کہ شکاری کے ہاتھ کا درد اس طرح رفع ہوگیا کہ جیسے کبھی یہ شکایت پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔

حضرت میاں میرؒ کی اس کرامت پر دنیاداروں کو حیرت نہیں ہونا چاہئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے دست مقدس سے مٹی کے پرندے بناتے تھے اور اس پر پھونک مار دیا کرتے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پرندے ہوا میں پرواز کرنے لگتے تھے۔ اس کے علاوہ جب کبھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے کسی مُردہ شخص کو لایا جاتا تو آپ باآواز بلند فرماتے۔

''قم باذن اللہ'' (اللہ کے حکم سے زندہ ہوجا) اور وہ مُردہ شخص دوبارہ زندہ ہو کر سرگرم عمل ہوجاتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یہ دونوں معجزات تاریخ عالم میں شہرت عام کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ ایک پیغمبر جلیلؑ کی ذاتی طاقت نہیں تھی کہ وہ مردہ انسانوں کو زندہ کردیتے اور مٹی کے بے جان پرندوں کو پھونک مار کر اُڑا دیتے۔ یہ خالق کائنات کی بخشی ہوئی صفت خاص تھی جس کے اثر سے ناممکن العمل باتیں بھی سہل اور ممکن نظر آتی تھیں۔ اب اگر کسی مردِ خدا سے یہ کرامت ظاہر ہوجائے تو اسے انبیائے کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخصوص سنّت کہا جائے گا۔ جس ذات بے نیاز نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معجزات بخشے تھے، اسی بے حساب دینے والے نے حضرت میاں میرؒ کو بھی یہ کرامت عطا کی تھی کہ آپ کی دعا سے مردہ فاختہ جی اُٹھی تھی اور اپنے رب کی پاکی بیان کرنے لگی تھی۔ اس سلسلے میں کچھ حضرات کا یہ کہنا کہ اس قسم کی باتیں ماورائے عقل ہیں، تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ معجزہ اور کرامت کا مفہوم ہی یہ ہے کہ ان کے بارے میں سوچتے ہوئے انسانی عقل عاجز آجائے۔ سائنس کی بے شمار موشگافیاں ایسی ہیں جن کے متعلق غور کرتے ہوئے عام انسانی ذہن تھک جاتا ہے اور پھر شدید جھنجلاہٹ کے عالم میں کہہ دیا جاتا ہے کہ ان چیزوں کا کوئی وجود نہیں۔ سطحی ذہن رکھنے والوں کے انکار سے سائنس کی عظمتوں پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اسی طرح معجزات اور کرامات کی حقیقت کو بھی اس وقت تک نہیں سمجھا جاسکتا جب تک حق تعالیٰ بطور خاص اپنے بندوں کو ادراک اور مشاہدے کی طاقت نہ بخشے۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ معجزہ اور کرامت سائنس سے بہت آگے کی چیز ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حاجی محمدؒ بھی حضرت میاں میرؒ کے مریدوں میں شامل تھے۔ ان ہی کی روایت ہے کہ ایک دن حضرت میاں میرؒ حاضرین مجلس کو یہ واقعہ سنا رہے تھے۔

''ایک بار چار آدمی مل کر پہاڑ کا سفر کر رہے تھے۔ اتفاق سے تین دن تک ان لوگوں کو کھانے کیلئے کچھ نہیں ملا پھر چاروں مسافر آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ ہمیں حصولِ رزق کیلئے بھرپور کوشش کرنی چاہئے ورنہ بھوک کی شدت ہمیں مار ڈالے گی۔''

آخر غور وفکر اور مشورے کے بعد تین مسافر اُٹھ کھڑے ہوئے اور چوتھے مسافر سے کہنے لگے۔

''ہم تلاش رزق میں آگے جاتے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔''

چوتھا مسافر اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ پھر جب اس کے ساتھیوں نے آگے چلنے کیلئے اصرار کیا تو وہ بولا۔

''تم جاؤ! اگر کھانے کیلئے کچھ مل جائے تو میرا حصہ لیتے آنا۔''

الغرض تینوں مسافر اپنے ساتھی کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ پھر ان لوگوں نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ راستے میں میووں سے لدا ہوا ایک درخت نظر آیا جس کے نیچے میٹھے پانی کی نہر جاری تھی۔ تینوں مسافروں نے بڑی حیرت سے اس میوہ دار درخت کو دیکھا جس کی شاخیں پانی پر جھکی ہوئی تھیں۔ قصہ مختصر یہ کہ ان بھوکے مسافروں نے جی بھر کے میوے کھائے اور نہر کا آب شیریں پیا۔

''یہ میوہ دنیاوی میووں کی سی لذت نہیں رکھتا۔ یہ تو بہشت کا میوہ معلوم ہوتا ہے۔''

شکم سیر ہونے کے بعد تینوں مسافر حیرت واستعجاب کے عالم میں کھڑے رہے۔ پھر ان لوگوں نے اپنے چوتھے ساتھی کیلئے کچھ میوے توڑے اور انہیں ایک کپڑے میں باندھ کر واپس لوٹ آئے۔

''اگر تم بھی ہمارے ساتھ چلتے تو بہت لطف آتا۔'' تینوں مسافروں نے اپنے چوتھے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے ایسے لذیذ پھل آج تک نہیں دیکھے۔ یوں لگتا تھا جیسے جنت کے میوے زمین پر اتر آئے ہوں۔''

چوتھا مسافر خاموشی کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی گفتگو سنتا رہا اور اس نے چہرے سے کسی قسم کا تاثر ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''کیا تمہیں ہماری باتیں سن کر حیرت نہیں ہوئی؟'' تینوں مسافروں نے بیک زبان اپنے ساتھی سے کہا۔

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟'' چوتھے مسافر نے اپنے ساتھیوں کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''قدرت جس طرح چاہتی ہے اپنے بندوں کو نعمتوں اور راحتوں سے سرفراز کرتی ہے۔''

تینوں مسافروں نے اپنے چوتھے ساتھی کی باتوں کی گہرائی پر غور نہیں کیا اور ازراہِ احسان کپڑے میں بندھے ہوئے میوے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہنے لگے۔ ''لو تم بھی انہیں چکھ لو۔ تم نے اپنی پوری زندگی میں ایسے لذیذ میوے نہیں کھائے ہوں گے۔''

چوتھے مسافر نے بڑی بے نیازی کے ساتھ ان میووں کی طرف دیکھا اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب

کرتے ہوئے کہا۔ ''اللہ نے تمہاری بھوک مٹا دی بس یہی کافی ہے۔''

''اور تم جو تین دن سے بھوکے ہو؟'' تینوں مسافروں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''تم لوگ میری بھوک کی کیوں فکر کرتے ہو؟'' چوتھے مسافر نے بے نیازانہ کہا۔ ''تم لوگ ان میووں کو بچا کر رکھ لو۔ پھر کبھی کام آئیں گے مجھے ان کی حاجت نہیں ہے۔'' یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت میاں میرؒ خاموش ہو گئے۔

حاضرین مجلس میں سے کسی شخص نے عرض کیا۔ ''حضرت! وہ چوتھا مسافر کون تھا جس نے شدید بھوک کے عالم میں بھی اس بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔''

حضرت میاں میرؒ نے اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ فرمایا۔ ''بابا! وہ چوتھا مسافر کس طرح میوے کھاتا کہ وہ خود ہی درخت تھا، خود ہی میوہ اور خود ہی بہتا ہوا چشمہ۔''

حضرت میاں میرؒ کی زبان مبارک سے یہ انکشاف سن کر حاضرین مجلس حیرت زدہ رہ گئے۔ اس واقعے کے راوی میاں حاجی محمدؒ کہتے ہیں کہ وہ چوتھے مسافر خود حضرت میاں میرؒ تھے۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت میاں میرؒ کے ایک اور خدمت گار میر محمد خوانیؒ فرماتے ہیں کہ حاجی علیؒ ایک نہایت پرہیزگار انسان تھے جنہیں حضرت میاں میرؒ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ حاجی علیؒ ہر پانچویں سال لاہور سے اپنے وطن جایا کرتے تھے اور میر محمد خوانیؒ کے والد کے یہاں قیام کرتے تھے۔ ایک دن حاجی علیؒ نے میر محمد خوانیؒ کو یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا۔

''ایک بار میں اور میرے ساتھی سفر میں تھے۔ ہم لوگ ایران جا رہے تھے۔ پھر جب قافلے والوں کو شدید تھکن محسوس ہوئی تو اصفہان اور ''نیرو'' کے درمیان میں خیمہ زن ہو گئے۔ اس وقت شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ نیلا آسمان صاف نظر آ رہا تھا اور سورج کی تیز کرنیں انسانی جسموں کو جلائے ڈالتی تھیں۔ میں اور میرے چند ساتھی دوپہر کا کھانا پکانے میں مشغول تھے۔ اچانک میری نظر اُٹھی تو مجھے دور سے ایک بزرگ خیمے کی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ میں اس وقت آٹا گوندھ رہا تھا مگر میری نظریں بزرگ پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر جب فاصلے کم ہوئے تو میں نے بڑی حیرت سے دیکھا۔ آنے والے بزرگ حضرت میاں میرؒ تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پیرومرشد یہاں کیسے تشریف لے آئے؟ کہاں اصفہان اور کہاں لاہور؟ چند لمحوں کیلئے مجھے خیال گزرا کہ آنے والے بزرگ ظاہری طور پر پیرو مرشد سے مشابہت رکھتے ہوں گے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ حضرت شیخؒ کچھ اور قریب آ گئے۔ اب آپ کے خدوخال واضح ہو چکے تھے۔ میں نے انہیں پہچان لیا۔ وہ حضرت میاں میرؒ ہی تھے...... اور مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ میں اسی حالت میں سارے کام چھوڑ کر اُٹھا اور حضرت شیخؒ کے قریب پہنچ کر دست بوسی کی سعادت سے سرفراز ہوا۔

حضرت میاں میرؒ نے اپنے اسی انداز کریمانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے گلے لگا لیا۔ پھر میں نے دست بستہ عرض کیا۔ ''سیّدی! آپ یہاں کیسے تشریف لائے؟''

حضرت میاں میرؒ نے کچھ دیر تامل کیا اور پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''حاجی علی! تم بہت بری جگہ خیمہ زن ہوئے ہو۔''

''پھر غلام کیلئے کیا حکم ہے؟'' میں نے دست بستہ عرض کیا۔

''یہ اہل قافلہ کیلئے وادیٔ ہلاکت ہے۔'' حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ ''ابھی کچھ دیر میں یہاں ایک خوفناک طوفان آنے والا ہے۔ جلدی کرو! اپنا مال واسباب اور خیمہ وقنات اُٹھا کر کسی اونچی جگہ لے جاؤ......اور اس کی اطلاع قافلے کے دوسرے لوگوں کو بھی کر دو۔''

میں چاہتا تھا کہ پیرومرشد سے اس سرزمین پر تشریف لانے کا سبب پوچھوں کہ اچانک مجھے اپنے ساتھی کی تیز آواز سنائی دی۔ میں اس طرف متوجہ ہو گیا اور پھر جب پلٹ کر دیکھا تو حضرت میاں میرؒ وہاں موجود نہیں تھے۔ مجھے دکھ بھی ہوا اور حیرت بھی۔ دکھ اس لئے کہ حضرت شیخؒ کی محبت اور گفتگو سے محروم ہو گیا......اور حیرت اس لئے کہ جب میں لاہور سے چلا تھا تو پیرومرشد اپنے حجرۂ مبارک میں موجود تھے۔ پھر آپ اتنے دور دراز علاقے میں کسی سواری کے بغیر کس طرح تشریف لائے؟ میں کچھ دیر تک ان ہی خیالات میں اُلجھا رہا۔ پھر یکایک مجھے پیرومرشد کے ارشادات گرامی یاد آئے اور میں نے جلدی جلدی اپنا مال واسباب اُٹھا کر بلندی پر پہنچانا شروع کر دیا۔

میری یہ سرگرمی دیکھ کر میرے دوسرے ساتھی حیرت کا اظہار کرنے لگے۔

''تم بھی اپنے خیمے اُکھاڑ لو اور بلندی پر منتقل ہو جاؤ۔'' میں نے نام لئے بغیر پیرومرشد کی ہدایت اہل قافلہ کے گوش گزار کر دی۔ ''ہم دریا کے قریب انتہائی نشیبی علاقے میں خیمہ زن ہیں۔ ابھی کچھ دیر بعد یہاں ایک خوفناک طوفان آنے والا ہے۔ اگر بروقت ہم نے کوئی مناسب انتظام نہیں کیا تو ہلاکت وبربادی کے عمل کو کوئی نہیں روک سکے گا۔''

''یہ تم کہہ رہے ہو، پیر روشن ضمیر؟'' اہل قافلہ نے میرے ساتھ تمسخر شروع کر دیا۔

''اس موسم میں طوفان کہاں سے آئے گا؟'' ایک ساتھی نے نیلے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سورج کس قدر آب وتاب کے ساتھ چمک رہا ہے۔ ہوا ساکت ہے، فلک کی وسعتوں میں بادل کا ہلکا سا ٹکڑا بھی موجود نہیں، اور تم کسی طوفان کی آمد کی پیش گوئی کر رہے ہو؟''

میں نے ان لوگوں کی استہزائیہ گفتگو سنی اور انتہائی دردمندانہ لہجے میں کہا۔ ''میں خود تو پیر روشن ضمیر نہیں ہوں مگر جس بزرگ نے مجھ سے یہ بات کہی ہے وہ ہندوستان کا بہت بڑا روشن ضمیر ہے۔''

میں نے اہل قافلہ کو بہت سمجھایا مگر اکثر لوگوں نے میری بات نہیں مانی۔ کچھ ہم سفروں نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم اس طویل اور دشوار گزار سفر میں تھک کر چور ہو چکے ہیں۔ اتنی شدید گرمی میں پہاڑ پر چڑھنا ہمارے بس کی بات نہیں۔''

الغرض چند لوگوں نے میری بات مان لی اور اپنا سامان اُٹھا کر بلندی پر لے گئے۔ باقی افراد

طوفان بلاخیز سے بے خبر اپنے اپنے خیموں میں آرام سے لیٹے رہے......اور میں نیلے آسمان کی طرف دیکھتا رہا جو سورج کی تمازت سے جل رہا تھا۔

ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ یکایک ایک سیاہ بادل اُٹھا اور پورے آسمان پر چھا گیا۔ اہل قافلہ جو شدید گرمی سے بے حال تھے، قدرت کا یہ پُرلطف منظر دیکھنے کیلئے اپنے اپنے خیموں سے باہر نکل آئے۔ پھر اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ مسافروں کی خوشی میں مزید اضافہ ہو گیا......مگر میں دل ہی دل میں اپنے اللہ کی پناہ مانگ رہا تھا۔ میرے ساتھی بھی پریشان تھے اور انہیں میری پیش گوئی پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ آناً فاناً بارش اور ہوا کا خوفناک طوفان آ گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دریا بھی اُبل پڑا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مسافروں نے محفوظ پناہ گاہوں کی طرف بھاگنے کی کوشش کی......مگر نشیبی علاقے میں ایسی کوئی پناہ گاہ نہیں تھی جہاں انسانی جسم آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رہ سکیں۔ مسافروں کے خیمے اُڑ چکے تھے......اور ان کا مال واسباب دریا برد ہو چکا تھا۔ پھر دریا کے کنارے بھی ٹوٹ گئے۔ پھر خون آشام سیلاب نے ان تمام مسافروں کو نگل لیا جو نشیبی علاقوں میں خیمہ زن تھے۔

جن ساتھیوں نے میری بات مان لی تھی، وہ بار بار اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے......اور میری روحانی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''شیخ! اگر آپ بروقت ہمیں خبردار نہ کرتے تو اس وقت ہم بھی لقمۂ اجل ہو چکے ہوتے۔''

میں نے ساتھیوں کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کوئی شیخ نہیں بلکہ ایک عام گناہ گار انسان ہوں۔ یہ تو میرے مرشد کا فیض روحانی ہے جس نے مجھے طوفان آنے سے پہلے تنبیہہ کی۔''

میرے ساتھی حضرت شیخؒ کے بارے میں پوچھنے لگے تو میں نے اُنہیں بتایا کہ وہ اس وقت لاہور میں قیام فرما ہیں۔ مسافروں کو میری بات کا یقین نہیں آیا......اور سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی تذبذب کا شکار تھا۔

پھر جب میں کئی ماہ بعد لاہور آیا اور میں نے خانقاہ عالیہ کے دوسرے خدمت گاروں سے پوچھا کہ کیا پیرومرشد کچھ دن کیلئے اصفہان (ایران) تشریف لے گئے تھے، تو خدام نے انتہائی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اس دوران میں حضرت شیخؒ خانقاہ سے باہر تشریف نہیں لے گئے اور تم اصفہان جانے کی بات کر رہے ہو؟''

آخر ایک دن میں نے خلوت میں عرض کیا۔ ''سیّدی! میں نے کھلی آنکھوں سے آپ کو اصفہان میں جلوہ افروز دیکھا تھا۔ آخر یہ کیا راز ہے؟''

اپنے مرید کی بات سن کر حضرت میاں میرؒ نے نہایت رازدانہ انداز میں فرمایا۔ ''حاجی علی! تم نے کھلی آنکھوں سے جو منظر دیکھا سمجھ لو کہ کچھ نہیں دیکھا۔ یہ راز اپنے سینے میں رکھو اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں بڑی آفت سے بچا لیا۔''

☆☆......☆☆......☆☆

اپنے آخری ایام میں مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر کشمیر میں سکونت پذیر تھا۔ بعض مصاحبوں نے

مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور حضرت خواجہ محمد باقیؒ کے مرید مرزا حسام الدین کے خلاف بادشاہ کے کان بھرے۔ جہانگیر نے بلاتاخیر حکم جاری کردیا کہ دونوں بزرگ کشمیر میں حاضر ہوجائیں۔ الغرض حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور مرزا حسام الدینؒ مغل شہنشاہ کی خدمت میں پہنچے۔ مغل شہنشاہ نے انتہائی ناخوشگوار نظروں سے دونوں بزرگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مرزا حسام الدین! تمہاری سزا یہ ہے کہ تم اپنے وطن دہلی سے دور کشمیر میں میری نظروں کے سامنے رہو۔" مغل شہنشاہ کا لہجہ غضب ناک تھا۔ "میں تمہاری جلالت علمی کو دیکھتے ہوئے صرف اسی سزا پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ حکومت کے خلاف سازش کرنا ایک ناقابل معافی جرم ہے۔"

اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے مرزا حسام الدینؒ نے فرمایا۔ "شہنشاہ! میں اس تہمت سے بری الذمہ ہوں جو میرے دشمنوں نے مجھ پر لگائی ہے۔"

اسی طرح حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے بھی اپنی صفائی پیش کی مگر مغل شہنشاہ نے دونوں بزرگوں میں سے کسی کا عذر قبول نہیں کیا اور نہایت درشت لہجے میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اور تمہاری سزا یہ ہے کہ تم اور تمہارا بیٹا شیخ نورالحقؒ کابل چلے جاؤ اور میری نظروں سے دور ہوجاؤ۔"

حکم شاہی سن کر حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ بہت آزردہ ہوئے مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ آپ ہندوستان چھوڑ کر کابل چلے جائیں۔ پھر جب حضرت شیخؒ کابل جانے کیلئے لاہور پہنچے تو انہیں اچانک خیال آیا کہ یہاں حضرت میاں میرؒ قیام فرما ہیں۔ اس خیال سے حضرت عبدالحق محدث دہلویؒ کو ایک اطمینان سا حاصل ہوا اور پھر آپ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اپنے دور کے عظیم محدث کو دیکھ کر حضرت میاں میرؒ بہت خوش ہوئے اور آپ نے نہایت والہانہ انداز میں حضرت شیخ عبدالحقؒ کا استقبال کیا۔ پہلے رسم خانقاہ کے مطابق حضرت میاں میرؒ نے مہمان کی تواضع کی۔ پھر حضرت عبدالحق محدث دہلویؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "شیخ! کیا بات ہے؟ آپ چہرے سے بہت پریشان نظر آرہے ہیں۔"

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ چند لمحوں تک خاموش رہے۔ پھر افسردہ لہجے میں کہنے لگے۔

"حضرت! کیا عرض کروں؟ عتاب شاہی کے زیر اثر ہوں۔ حکم ہوا ہے کہ میں اور میرا بیٹا نورالحق اسی وقت ہندوستان چھوڑ کر کابل چلے جائیں۔"

حضرت میاں میرؒ نے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی گفتگو سن کر کچھ دیر کیلئے سکوت اختیار کیا۔ پھر مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "شیخ! انشاءاللہ آپ بھی دہلی میں رہیں گے اور آپ کا فرزند بھی۔"

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اس راز سے باخبر تھے کہ مغل شہنشاہ جہانگیر، حضرت میاں میرؒ کا بہت احترام کرتا ہے، اس لئے حضرت شیخؒ نے یہی سمجھا کہ حضرت میاں میرؒ جہانگیر سے ان کی سفارش کریں گے۔

"تو پھر حضرت! اس کام میں ذرا جلدی کیجئے۔" حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے کہا۔

"کس کام میں عجلت کروں؟" حضرت میاں میرؒ نے حضرت عبدالحق محدث دہلویؒ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

"یہی کہ آپ سفارش میں جلدی کیجئے تاکہ میں اور میرا بیٹا سفر کی صعوبتوں سے بچ جائیں۔" حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے کہا۔

"میں بادشاہ سے تمہاری سفارش کیوں کروں؟" حضرت میاں میرؒ نے پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ "مجھے جس سے کہنا ہے، اسی سے کہوں گا۔"

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے حضرت میاں میرؒ کا ارشاد گرامی سنا مگر ان کے چہرے سے بے اطمینانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

حضرت میاں میرؒ نے حضرت محدث دہلویؒ کی اس کیفیت کو محسوس کرلیا اور پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے فرمایا۔ "شیخ! آپ مطمئن رہیں۔ میں آپ کا اور آپ کے بیٹے کا ذمہ لیتا ہوں۔ آپ اور آپ کا فرزند، بادشاہ کو دیکھے بغیر، انشاءاللہ دہلی ہی میں رہیں گے۔"

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ حضرت میاں میر لاہوریؒ کا رنگ جلال دیکھ کر مطمئن ہوگئے۔ پھر حاضرین مجلس نے دیکھا کہ جب حضرت شیخؒ واپس جارہے تھے تو ان کے چہرے پر خوشی کا گہرا رنگ نمایاں تھا۔

ابھی حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور ان کے فرزند نورالحقؒ لاہور ہی میں مقیم تھے کہ چوتھے دن ہندوستان کی ایک ایک گلی شور ماتم سے گونج اٹھی۔ مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر شدید عالم بے بسی میں دنیا سے رخصت ہوگیا اور حضرت شیخ عبدالحقؒ اپنے بیٹے کے ساتھ دہلی روانہ ہوگئے۔

☆☆..............☆☆..............☆☆

ایک بار شہر لاہور میں طاعون کی سخت وبا پھیلی۔ جب اس بیماری میں گھر کے گھر ویران ہوگئے تو لاہور کے ایک اور بزرگ شیخ پیر نبیؒ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کرنے لگے۔ "شیخ! آئیں، ہم دونوں مل کر اس وبا کو دفع کرنے کیلئے کوشش کریں۔"

شیخ پیر نبیؒ کی بات سن کر حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ "شیخ! جب لوگوں کی قضا آجاتی ہے تو پھر کوئی دعا کارگر ثابت نہیں ہوتی۔"

شیخ پیر نبیؒ نے حضرت میاں میرؒ کی بات پر توجہ نہیں دی اور اکیلے ہی دفع بلا کیلئے ریاضت میں مشغول ہوگئے۔ ابھی شیخ پیر نبیؒ کو وظیفہ پڑھتے ہوئے تھوڑے ہی دیر گزری تھی کہ ان پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ روایت ہے کہ شیخ پیر نبیؒ تین دن اور تین رات تک بے ہوش رہے جس کے سبب ان کی تمام نمازیں قضا ہوگئیں۔ پھر جب چوتھے روز شیخ پیر نبیؒ کو ہوش آیا تو دوبارہ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ پیر نبیؒ کے چہرے پر ندامت و شرمساری کے آثار نظر آرہے تھے۔

"شیخ! میری ساری کوششیں رائیگاں گئیں اور فرض نمازوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔" پیر نبیؒ کے

لہجے سے انتہائی شکستگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

پیر نبیؒ کا احوال سن کر حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ ''شیخ! تم نے دلیری تو بہت کی مگر اس سے خلق خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔''

حضرت میاں میرؒ کی ذات گرامی سے بے شمار کرامات ظاہر ہوئیں مگر آپ اظہار کرامت کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ کا قول مبارک ہے کہ جہاں تک ہو سکے اللہ کی بخشی ہوئی اس نعمت کو پوشیدہ رکھا جائے۔

مغل شہزادہ داراشکوہ اپنی مشہور تصنیف ''سکینۃ الاولیاء'' میں لکھتا ہے کہ حضرت میاں میرؒ کا چہرۂ مبارک دیکھ کر آنکھوں میں نور آ جاتا تھا۔ آپ کا رنگ گندمی تھا جس میں بہت زیادہ ملاحت موجود تھی۔ حضرت میاں میرؒ کی پیشانی بلند تھی جس سے کرامت وسعادت کے آثار نمایاں تھے۔ آپ کی ریش مبارک شرع کے مطابق مٹھی بھر تھی جو آخری عمر میں سفید ہو گئی تھی۔ حضرت میاں میرؒ کا قد درمیانہ تھا اور آپ کثرت ریاضت کے سبب بہت کمزور ہو گئے تھے۔ جب حضرت شیخؒ سو سال کے قریب ہوئے تو پیروں کے درد اور ضعیفی کے سبب بیٹھ کر نماز ادا کیا کرتے تھے۔

آخری دنوں میں حضرت میاں میرؒ کی بینائی اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ آپ کوئی کتاب یا خط نہیں پڑھ سکتے تھے مگر پھر بھی دل کی آنکھیں روشن تھیں۔ ایک دن شہزادہ داراشکوہ کے استاد حضرت اخوند میرکؒ حضرت میاں میرؒ کی زیارت کرنے کیلئے خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے۔ رخصت ہوتے وقت شہزادہ داراشکوہ نے اپنے استاد کو رقعہ دیا کہ اسے حضرت شیخؒ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ حضرت اخوند صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب میں حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے اپنے نزدیک بٹھایا اور بڑی شفقت سے پیش آئے۔ شہزادہ داراشکوہ کا دیا ہوا خط میری دستار میں موجود تھا مگر میرے ذہن سے اُتر گیا تھا۔ حضرت شیخؒ گفتگو کے دوران معرفت کے اسرار و رموز کھولتے رہے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے آج تک حضرت شیخؒ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ حضرت میاں میرؒ نے دست مبارک بڑھا کر میری دستار سے شہزادہ دارا شکوہ کا رقعہ نکال لیا اور اوّل سے آخر تک لفظ بہ لفظ میرے سامنے پڑھ کر سنا دیا۔ جب آپ پورا خط پڑھ چکے تو مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اس کام سے فقیر کا مطلب اظہارِ کرامت نہیں تھا۔ کرامت کا اظہار تو اس گروہ کیلئے نہایت آسان کام ہے۔''

حضرت میاں میرؒ کا لباس فقیروں اور درویشوں کی طرح نہیں تھا۔ آپ خرقہ اور مرقع نہیں پہنتے تھے بلکہ بہت کم قیمت کپڑے کی ایک پگڑی سر پر اور موٹے کپڑے کا کرتا زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ جب بھی آپ کا لباس میلا یا ناپاک ہو جاتا تو عام طور پر دریا کے کنارے جا کر اپنے ہاتھ سے صاف کرتے۔ حضرت میاں میرؒ کے مریدوں اور خدمت گاروں کا لباس بھی آپ ہی جیسا تھا، یعنی جامہ اور دستار۔ حضرت شیخؒ کے کسی مرید نے خرقہ نہیں پہنا۔ آپ کے مسلک میں گدڑی پہننے کا رواج نہیں۔

حضرت میاں میرؒ فرمایا کرتے تھے۔ ''لباس اس قسم کا ہونا چاہئے کہ کوئی شخص فقیر اور عام انسان میں تمیز نہ کر سکے۔''

حضرت میاں میرؒ کے مرید خاص میاں حاجی محمدؒ بڑا بے تکلف لباس پہنا کرتے تھے۔ جب آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ میرا لباس حضرت شیخؒ کے فرمان کے مطابق ہے۔ یہی میاں حاجی محمدؒ کہتے ہیں کہ جب پیرو مرشدؒ نے میرے حال پر توجہ فرمائی تو میں نے گدڑی پہن لی۔ پھر ایک مدت کے بعد وہ گدڑی پارہ پارہ ہو گئی۔ ایک دن میں بازار سے گزر رہا تھا کہ لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔ اتفاق سے حضرت میاں میرؒ اس طرف تشریف لے آئے اور مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے۔

''حاجی محمد! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

میں نے پیرو مرشد کی بات سن کر دست بستہ عرض کیا۔ ''سیدی! میں نے جان بوجھ کر یہ حالت نہیں بنائی ہے۔ میں اس سلسلے میں بے اختیار ہوں۔''

حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ ''جب تجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں ہے تو پھر اس لباس کو اُتار دے اور کوئی ایسا لباس پہن جس سے تیری پہچان ظاہر نہ ہو۔''

حضرت میاں میرؒ کے گھر کا فرش پرانے بوریا کا تھا۔ آپ کو دنیاوی ساز و سامان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حضرت میاں میرؒ فقیروں کو دولت مندوں سے افضل جانتے تھے اور اگر کوئی درویش مالی آسودگی حاصل کر لیتا تو اس پر سخت اعتراض کرتے۔

حضرت میاں میرؒ برملا فرماتے تھے کہ زیادہ روزے رکھنے اور نمازیں ادا کرنے کا نام درویشی نہیں۔ نماز، روزہ اور شب بیداری، یہ سب بندگی کے اسباب ہیں۔ درویشی تو لوگوں کو خوش کرنے کا نام ہے اگر تو حاصل کرے گا تو واصل ہو جائے گا۔

حضرت میاں میرؒ سماع سنا کرتے تھے اور تمام راگوں میں ہندی راگ کو بہت زیادہ پسند فرماتے تھے۔ اگر کوئی قوال آ جاتا تو سماع سنتے ورنہ یہ ضروری نہ تھا کہ قوال ہر وقت آپ کی خانقاہ میں موجود رہیں۔ حضرت میاں میرؒ پر جب سماع کے دوران وجد کی کیفیت طاری ہوتی تو آپ کا چہرۂ مبارک چمکنے لگتا لیکن بلند حوصلگی اور وقار و تمکنت کے سبب آپ رقص کی حالت سے دور رہتے۔ یہاں تک کہ کسی شخص نے آپ کو ہاتھ اُٹھاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔

حضرت میاں میرؒ کا خلق اس درجے کا تھا کہ اگر کوئی شخص گھڑی بھر بھی آپ کی خدمت میں حاضر رہتا تو اس پر اس قدر عنایت وشفقت فرماتے کہ جیسے اس سے زیادہ آپ کو کوئی دوسرا عزیز نہیں۔ ابوجعفر حدادؒ فرماتے ہیں کہ اگر عقل مرد کی شکل میں نظر آتی تو حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کی صورت میں ہوتی۔ حضرت میاں میرؒ کے خلق کے بارے میں داراشکوہ لکھتا ہے کہ اگر خلق کسی مرد کی شکل میں ہوتا تو حضرت میاں میرؒ کی صورت میں نظر آتا۔

حضرت میاں میرؒ جس شخص پر عنایت فرماتے اسے یار اور عزیز کے لفظ سے مخاطب کرتے۔ اپنے کسی مرید کو کبھی مرید نہ کہتے بلکہ یوں فرماتے۔ ''یہ سب میرے یار ہیں۔''

جب شہر لاہور میں حضرت میاں میرؒ کے قیام کو ساٹھ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا تو آپکو اسہال کا عارضہ لاحق ہوا اور پانچ روز تک جاری رہا۔ جب آپ کی بیماری کا علم حاکم شہر وزیر خاں کو ہوا تو وہ خدمت عالیہ میں حاضر ہوا مگر آپ نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ پھر جب مریدوں نے عرض کیا کہ وزیر خاں عیادت کیلئے حاضر ہوا ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ اندر آ جائے مگر زیادہ دیر نہ ٹھہرے۔ وزیر خاں نے حجرۂ مبارک میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ وہ ایک طبیب حاذق کو اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔ اگر حضرت شیخؒ اجازت دیں تو حکیم علاج شروع کرے۔

حضرت میاں میرؒ نے وزیر خاں کی درخواست سن کر فرمایا۔ ''بس اب تم جاؤ! مجھے حکیم مطلق ہی کافی ہے۔''

آخری وقت میں میاں شیخ لاہوریؒ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے حضرت شیخؒ کو نزع کی حالت میں دیکھا۔ آپ کا دہن مبارک آہستہ آہستہ جنبش کر رہا تھا پھر جب میں قریب پہنچا تو حضرت میاں میرؒ کے چہرۂ مبارک پر ہلکا سا اضطراب نظر آیا۔ پھر ہونٹوں کو جنبش ہوئی میں نے دوبار اللہ کا لفظ سنا اور پھر معرفت کا یہ سورج غروب ہو گیا۔ یہ 17 ربیع الاول 1045ھ کا دن تھا جب ایک صدی تک بادشاہان وقت کی نفی کرنے والا، شہنشاہِ حقیقی کے دربار میں حاضر ہوا۔

وصال سے پہلے اپنے بعض مریدوں کو مخاطب کر کے فرمایا کرتے تھے۔ ''دیکھو! میری موت کے بعد میری ہڈیوں کو فروخت نہ کرنا اور دوسرے لوگوں کی طرح دکان نہ سجالینا۔''

حضرت میاں میرؒ کی وفات کے بعد داراشکوہ نے روضۂ مبارک کی تعمیر کیلئے مسالا وغیرہ جمع کیا مگر وقت نے اسے تعمیر کا موقع نہ دیا اور وہ اپنے چھوٹے بھائی اورنگزیب عالمگیر کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد عالمگیر خود قبر مبارک پر حاضر ہوا اور اسی نے حضرت میاں میرؒ کا مزار تعمیر کرایا۔ روضۂ مبارک کی چار دیواری میں اتنی زیادہ قبریں ہیں کہ وہ اچھا خاصا قبرستان بن گیا ہے۔ یہ قبریں زیادہ تر حضرت میاں میرؒ کے عزیزوں، خادموں اور سجادہ نشینوں کی ہیں۔ ان ہی قبروں میں حضرت شیخؒ کی دو بہنوں کی قبریں بھی ہیں۔ ایک قبر شاہجہاں کی بیٹی اور داراشکوہ کی بہن نادرہ بیگم کی ہے۔ یہ قبر بارہ دری کے نام سے مشہور ہے اور حضرت میاں میرؒ کی زندگی میں تعمیر ہوئی تھی۔ نادرہ بیگم نو سال کی تھی، جب وہ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ مغل شہزادی دو سال تک ایک مرد درویش کی خدمت انجام دیتی رہی۔ پھر ایک دن حضرت میاں میرؒ نے نادرہ بیگم کو اپنی خدمت گزاری سے روک دیا اور فرمایا۔

''شہزادی! اب تم جوان ہو گئی ہو۔ اس لئے اپنے گھر چلی جاؤ۔''

نادرہ بیگم قصرِ شاہی واپس چلی گئی مگر بارہویں سال میں قدم رکھنے سے پہلے 1045 ہجری میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اہلِ نظر کہتے ہیں کہ اپنے گھر جانے سے حضرت میاں میرؒ کی مراد سفرِ آخرت تھا۔ شہزادی نادرہ بیگم کی دو سالہ خدمت کا صلہ یہ ہے کہ وہ شہنشاہِ معرفت کے دربار کے ایک گوشے میں محوِ خواب ہے، جہاں ہر وقت اللہ کی رحمتوں کا نزول رہتا ہے۔

حضرت سلطان باہوؒ

ولادت......1039ھ (شور کوٹ)

وفات......1102ھ

مزار مبارک......دریائے چناب کے کنارے موضع قہرگان

خاندانی نام......سلطان محمد باہوؒ......قبیلۂ اعوان سے تعلق رکھتے تھے۔ والدِ گرامی حضرت بایزید محمدؒ مغل شہنشاہ شاہجہاں کے منصب دار تھے۔ حضرت سلطان باہوؒ سلسلۂ قادریہ کے مشہور عالم و فاضل بزرگ تھے۔ آپ نے تصوف کے موضوع پر فارسی زبان میں ڈیڑھ سو کے قریب کتابیں تصنیف کیں۔ حضرت سلطان باہوؒ کی یہ تالیف ایک طالب معرفت کیلئے ایک مرشدِ کامل کا درجہ رکھتی ہیں۔

کربلا کے المناک واقعے کے بعد ''سادات بنی فاطمہ'' گوشہ نشیں ہو گئے تھے اور ان کا سارا وقت عبادت میں گزرتا تھا۔ باقی علوی خلافت کے دعویدار تھے، اس لئے وہ ایران سے ہوتے ہوئے خراسان آئے۔ پھر علویوں میں سے ایک بہادر شخص شاہ حسین نے ہرات پر قبضہ کرلیا۔ شاہ حسین کے بعد ان کے فرزند امان شاہ تخت نشیں ہوئے۔ امان شاہ ''سادات بنی فاطمہ'' کی بہت زیادہ اعانت کرتے تھے، اس لئے ان کی اولاد ''اعوان'' کے لقب سے مشہور ہوئی۔

پھر سادات بنی فاطمہ اور اعوان تین چار پشتوں تک ہرات میں رہے۔ اس کے بعد عباسیوں کے آخری عہد میں اعوان نے پنجاب کا رخ کیا۔ سادات بنی فاطمہ نے اُچ، چوہا سیدن اور دندا شاہ بلاول کو اپنا مسکن بنایا اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ قبیلہ اعوان کے لوگ کالا باغ کی طرف بڑھے۔ اس وقت گردونواح کے علاقے ہندو راجاؤں کے قبضے میں تھے۔ قبیلہ اعوان کے افراد فطرتاً شجاع اور جانباز تھے، اس لئے انہیں ہندوؤں کی برتری قبول نہیں تھی۔ نتیجتاً مقامی راجاؤں اور اعوان کے درمیان کئی خونریز معرکے ہوئے انجام کار اعوان غالب آ گئے۔ پھر اعوان نے اپنے شہر اور گاؤں آباد کئے۔ ان شہروں میں ''پنڈ دادن خان'' اور ''احمد آباد'' مشہور ہیں۔

اسی قبیلہ اعوان میں ایک بزرگ سلطان بایزیدؒ تھے۔ شہاب الدین شاہ جہاں اس خاندان کی بہت عزت و تکریم کرتا تھا۔ مغل فرمانروا نے سلطان بایزیدؒ کی خدمات کے صلے میں انہیں شورکوٹ ضلع جھنگ میں ایک سالم گاؤں بطور انعام دیا تھا۔ اس گاؤں کا نام ''قہرگان'' تھا۔ اس کے علاوہ دربار شاہی کی طرف سے پچاس ہزار بیگھے زمین اور چند آباد کنویں بھی جاگیر کے طور پر عطا کئے گئے تھے۔

سلطان بایزیدؒ کے بارے میں ''مناقب سلطانی'' کے مصنف حضرت شیخ سلطان حامدؒ کا بیان ہے کہ آپ سلطنت دہلی کے منصب دار تھے۔ سلطان بایزیدؒ نے اولاد کی خاطر اپنے خاندان کی ایک متقی اور پرہیزگار خاتون بی بی راستی سے شادی کی۔ بی بی راستی اپنے دور کی عابدہ تھیں۔ سلطان بایزیدؒ اپنی

شریک حیات کے زہد وتقویٰ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ شادی کے چند روز بعد ہی اپنی عمر گزشتہ پر اظہار تاسف کرنے لگے۔

"افسوس! میں نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت دنیاوی ہنگاموں میں برباد کردیا۔ یہ کوئی مردانگی نہیں کہ بیوی تو خدادوست ہو اور شوہر دنیا کی حرص وہوس میں مبتلا ہو کر دردر بھٹکتا رہے۔"

یہ ایک غیبی تنبیہہ تھی۔ آخر سلطان بایزیدؒ نے قدرت کے اشارے کو سمجھا اور ترک دنیا کا فیصلہ کرلیا۔ پھر آپ اپنا منصب چھوڑ کر ملتان کی طرف روانہ ہوگئے۔

پھر جب سلطان بایزیدؒ ملتان کے گھاٹ پر پہنچے تو نگراں نے آپ کو حاکم ملتان کے سامنے پیش کیا۔

سلطان بایزیدؒ کے چہرے سے امارت کے آثار نمایاں تھے مگر آپ نے صورتحال کو حاکم ملتان سے چھپایا۔

"پھر کیا چاہتے ہو؟" حاکم ملتان نے سلطان بایزیدؒ سے پوچھا۔

"گزراوقات کیلئے ایک معمولی سی ملازمت۔" سلطان بایزید نے جواباً کہا۔

بالآخر حاکم ملتان نے دو روپے ماہانہ سلطان بایزیدؒ کی تنخواہ مقرر کردی......اور آپ گوشہ نشیں ہوکر یادالٰہی میں مشغول ہوگئے۔

مناقب سلطانی کے مطالعے سے یہ پتا نہیں چلتا کہ سلطان بایزیدؒ کس کام پر ملازم ہوئے تھے۔ حضرت شیخ سلطان حامدؒ کے بقول سلطان بایزیدؒ نے ملتان کے ایک گوشہ تنہائی میں شدید ریاضتیں کیں اور روحانیت کے بلند درجے پر فائز ہوئے۔

چونکہ سلطان بایزیدؒ اطلاع دیئے بغیر اپنا عہدہ چھوڑ کر چلے آئے تھے، اس لئے شہنشاہ شاہ جہاں کے حکم پر ان کی تلاش شروع ہوئی۔ دربار شاہی کے کارندے شورکوٹ پہنچے اور سلطان بایزیدؒ کی شریک حیات بی بی راستی کو شاہ جہاں کا حکم پڑھ کر سنایا۔ بی بی راستی کے دو حقیقی بھائی اسی وقت سلطان بایزیدؒ کی جستجو میں روانہ ہوگئے۔

ادھر ملتان میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ دریائے ستلج کے مشرقی کنارے اور بیکانیر کے ریگستان کے بارے میں راجہ مروٹ اور حاکم ملتان کے درمیان شدید تنازع کھڑا ہوگیا اور نوبت جنگ تک پہنچ گئی۔

سلطان بایزیدؒ کو اس واقعے کی خبر پہنچی تو آپ اپنے عبادت کے کمرے سے باہر آئے۔ جسم پر ہتھیار سجائے اور اپنی گھوڑی پر سوار ہوکر حاکم ملتان کے دربار میں پہنچے۔ "مناقب سلطانی" کے مصنف نے اس گھوڑی کا نام "سون پوری" تحریر کیا ہے۔

"میں راجہ مروٹ کا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔" دربار میں پہنچ کر سلطان بایزیدؒ نے کہا۔

حاکم ملتان اور دوسرے درباریوں نے آپ کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ "سلطان بایزیدؒ تم اکیلے راجہ مروٹ کا مقابلہ کس طرح کروگے؟"

"چونکہ میں آپ کی دی ہوئی تنخواہ اکیلا ہی کھاتا رہا ہوں، اس لئے مقابلہ بھی تنہا کروں گا۔" سلطان بایزیدؒ کے لہجے میں جوش وغرور کے بجائے انکسار کا رنگ شامل تھا۔

سلطان بایزیدؒ کی بات سن کر درباری مسکرانے لگے مگر آپ نے ان لوگوں کے استہزائی طرز عمل پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ "بس آپ ایک ایسے خدمت گار کو میرے ساتھ روانہ کردیں جو راجہ مروٹ کے علاقے کی طرف میری رہنمائی کرسکے۔" سلطان بایزیدؒ نے حاکم ملتان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"باقی کام اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہ جس طرح چاہے گا، میرے اور راجہ مروٹ کے درمیان معاملے طے کردے گا۔"

حاکم ملتان نے اپنے ایک معتمد شہسوار کو سلطان بایزیدؒ کے ساتھ روانہ کردیا۔ مگر یہ بات اس کی عقل سے بالاتر تھی کہ سلطان بایزید تن تنہا راجہ مروٹ کا مقابلہ کس طرح کریں گے؟

پھر جب آپ مروٹ کے قریب پہنچے تو آپ نے اپنے رہنما ساتھی کو رخصت کردیا۔

پھر سلطان بایزیدؒ اکیلے شہر کی طرف بڑھے۔ یہاں تک کہ قلعے کے نزدیک جا پہنچے۔ آپ کی ظاہری شخصیت پر کسی ایلچی کا گمان ہوتا تھا۔ اس لئے پہرداروں نے قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ سلطان بایزیدؒ گھوڑی کی لگام پکڑے ہوئے قلعے کے اندر داخل ہوئے اور پھر اپنی سواری کے جانور کو ایک طرف باندھ کر راجہ مروٹ کے دربار میں پہنچے۔ درباریوں نے بڑی حیرت سے ایک اجنبی مسلمان کو بے نیازانہ آگے بڑھتے ہوئے دیکھا مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آنے والے کو روک کر اس سے پوچھتے کہ تو کون ہے اور کس مقصد سے یہاں آیا ہے؟ یہ حضرت سلطان بایزید محمدؒ کا جلال روحانی تھا کہ حاضرین دربار کی زبانیں گنگ ہوکر رہ گئی تھیں۔ آپ بڑی استقامت کے ساتھ آگے بڑھے اور راجہ مروٹ کے تخت کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے۔

راجہ مروٹ نے بڑے تعجب سے ایک مسلح مسلمان کی طرف دیکھا۔ پھر غضب ناک لہجے میں بولا۔ "تم کون ہو اور تمہیں یہاں آنے کی اجازت کس نے دی ہے؟"

"ہم اہل حق ہیں اور ہمیں اہل باطل سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔" یہ کہہ کر سلطان بایزیدؒ نے نیام سے تلوار کھینچ لی۔

اجنبی مسلمان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر راجہ مروٹ ہذیانی انداز میں چیخا۔ "بدبختو! اس ظالم کو روکو جو موت بن کر میرے سر پر آپہنچا ہے۔"

راجہ مروٹ کی ہذیانی چیخیں سن کر مسلح محافظوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کرسکے۔ حضرت سلطان بایزید محمدؒ برق کی طرح لپکے اور آپ نے ایک ہی وار میں راجہ مروٹ کا کام تمام کردیا۔ پھر اس کا کٹا ہوا سر لے کر اسی شان بے نیازی کے ساتھ واپس جانے لگے۔ حاضرین دربار اور راجہ مروٹ کے مسلح پہرے دار پتھر کے مجسمے بن کر رہ گئے تھے۔ وہ کھلی آنکھوں سے اپنے حکمراں کا انجام دیکھ رہے تھے مگر اپنے اندر راجہ مروٹ کے قاتل کو پکڑنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

پھر جب حضرت سلطان بایزیدؒ راجہ مروٹ کا کٹا ہوا سر لے کر قلعے کے دروازے کے قریب پہنچے تو محل میں کہرام برپا ہو گیا۔ قوت گویائی اور جسمانی حرکت سے محروم ہو جانے والے درباری چیختے ہوئے صدر دروازے کی طرف دوڑے۔

"راجہ کے قاتل کو روکو اور باہر جانے والے تمام راستے بند کر دو۔"

اس اثناء میں حضرت سلطان بایزیدؒ گھوڑی کی پشت پر سوار ہو چکے تھے۔ قلعے کے مکینوں کی چیخیں سن کر پہرے داروں نے صدر دروازہ بند کر دیا...... مگر جب حضرت سلطان بایزید محمدؒ دروازے کے قریب پہنچے تو وہ خود بخود کھل گیا۔ راجہ مروٹ کے مسلح شہسواروں نے حضرت سلطان بایزید محمدؒ کا بہت دور تک تعاقب کیا مگر آپ کی برق رفتار گھوڑی کفار کی دسترس سے محفوظ رہی اور کسی آندھی کے جھونکے کی طرح ملتان پہنچ گئی۔

حضرت سلطان بایزید محمدؒ نے راجہ مروٹ کا کٹا ہوا سر والیٔ ملتان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

"مناقب سلطانی" میں یہ واقعہ اسی طرح تحریر کیا گیا ہے جس کے متعلق خود مصنف کا یہ بیان موجود ہے۔

"اگرچہ محالات کا ذکر کرنا اچھا نہیں لیکن معذور ہوں...... کیونکہ میں نے بزرگوں سے ایسا ہی سنا ہے۔"

اسی کتاب میں دوسرے مقام پر درج ہے کہ حاکم ملتان کا لشکر ابھی راستے میں تھا کہ حضرت سلطان بایزید محمدؒ راجہ مروٹ کا سر لے کر دربار میں پہنچے اور یہ عجیب کام ظہور میں آیا۔

بظاہر یہ ایک محیر العقول واقعہ ہے جس کے بارے میں خود مصنف کو بھی خدشہ ہے کہ اسے پڑھ کر مخالفین نکتہ چینی کریں گے...... مگر کرامت تو اسی کو کہتے ہیں جو عادت کے خلاف ہو اور جسے سمجھنے سے انسانی عقل قاصر ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ حاکم ملتان اور راجہ مروٹ کے لشکروں کے درمیان خونریز جنگ ہوئی ہو...... اور ایک ملازم کی حیثیت سے حضرت سلطان بایزید محمدؒ اس جنگ میں شریک ہوئے ہوں...... اور آپ نے اپنی تلوار سے راجہ مروٹ کا سر کاٹ کر والیٔ ملتان کی خدمت میں پیش کیا ہو۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے پیر کی شان میں غلو کرنے والے مریدوں نے اصل واقعے کو "خرق عادت" کا رنگ دیدیا ہو۔ بہرحال ہم نے دونوں صورتیں پیش کر دی ہیں۔

راجہ مروٹ کے سر کاٹنے کی شہرت شاہ جہاں کے دربار تک پہنچی تو اس نے اپنے کارندوں کو ملتان بھیجا۔ ان لوگوں نے پہچان لیا کہ یہ وہی سلطان بایزید محمدؒ ہیں جو اپنا منصب چھوڑ کر روپوش ہو گئے تھے۔ کارندوں نے شاہ جہاں کو اطلاع دی تو دربار شاہی سے والیٔ ملتان کے نام حکم صادر ہوا۔

"بایزید محمد کو ان کے علاقے میں واپس بھیج دو تاکہ وہ دوبارہ اپنی ذمہ داریاں سنبھال سکیں۔"

حاکم ملتان نے سلطان بایزید محمدؒ کو اپنے دربار میں طلب کیا اور فرمانروائے ہندوستان شاہ جہاں کا حکم پڑھ کر سنایا۔

جواب میں حضرت سلطان بایزید محمدؒ نے شہنشاہ شاہ جہاں کے نام ایک خط تحریر کیا۔

"میں والیٔ ہندوستان کی عنایات خسروانہ کا تہہ دل سے قائل ہوں...... مگر اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کمزور کاندھے اس بارِ گراں کو نہیں اُٹھا سکیں گے۔ عمر گریزاں بھی خفا خفا سی معلوم ہوتی ہے۔ پتا نہیں، کس وقت میرا ساتھ چھوڑ جائے۔ اس لئے مالک حقیقی کی بارگاہ کی طرف جا رہا ہوں۔ اللہ مجھے توفیق عمل دے اور آپ کو اس حسن سلوک کیلئے جزائے خیر عطا کرے۔ مجھے دربار شاہی میں حاضر ہونے سے معذور تصور کیا جائے۔"

فرمانروائے ہندشاہ جہاں نے سلطان بایزید محمدؒ کا خط پڑھا اور ان کیلئے مزید سرکاری خدمات موقوف کر دیں پھر بھی سابقہ خدمات کے صلے میں ایک پورا گاؤں اور تقریباً پچاس ہزار بیگھے زمین حضرت سلطان بایزید محمدؒ کے نام کر دی۔

کچھ دن بعد بی بی راستی کے دونوں بھائی بھی حضرت سلطان بایزید محمدؒ کو تلاش کرتے کرتے ملتان پہنچ گئے اور آپ سے گھر واپس چلنے کیلئے درخواست کی۔

جواب میں حضرت سلطان بایزید محمدؒ نے فرمایا۔ "تم اپنی بہن سے پوچھ کر بتاؤ کہ وہ کیا چاہتی ہیں؟ اگر بی بی راستی کی خواہش ہے تو میں گھر واپس آ جاؤں گا۔"

حضرت سلطان بایزید محمدؒ کا پیغام لے کر آپ کے دونوں برادران نسبتی واپس آئے اور بی بی راستی کو صورتحال سے آگاہ کیا۔

اگر بی بی راستی چاہتیں تو سلطان بایزید محمدؒ کو گھر بلا سکتی تھیں مگر آپ ایک دیندار خاتون تھیں۔ اس لئے آپ نے شوہر کی خدمت میں حاضر ہونے کو ترجیح دی۔

اس وقت بی بی راستی حاملہ تھیں مگر اس کے باوجود آپ طویل سفر طے کر کے ملتان پہنچیں...... اور شوہر کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ حضرت سلطان بایزید محمدؒ نے اسی دن کیلئے بے شمار دعائیں مانگی تھیں۔ آپ کو وارث کی آرزو تھی۔ بی بی راستی نے وارث کی آمد کی خبر دی تو حضرت سلطان بایزید محمدؒ سجدے میں چلے گئے۔ پھر نہایت جوش جذب کے عالم میں آیت مبارکہ تلاوت کرتے رہے جس کا ترجمہ ہے

"اور آپ بہتر وارث دینے والے ہیں۔"

اس کے بعد حضرت سلطان بایزید محمدؒ شورکوٹ منتقل ہو گئے جو پرگنہ ملتان میں واقع ہے۔

☆☆............☆☆............☆☆

ابھی حضرت سلطان بایزید محمدؒ کو شورکوٹ میں قیام کئے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو ایک ایسے انعام سے نوازا کہ جس کے آگے ہندوستان کی بڑی سے بڑی جاگیر کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ دنیا کا اقتدار اور مال و متاع تو فتنے میں مبتلا کر دینے والی چیزیں ہیں۔ مگر خالق کائنات نے آپ کو ایک ایسی نعمت سے نوازا جس سے آخرت اور دنیا دونوں سنور جاتی ہیں...... اور نعمت عظیم تھے سلطان بایزید محمدؒ کے فرزند حضرت سلطان باہوؒ اگرچہ قرآن کریم نے اولاد کو بھی فتنہ (آزمائش) قرار

دیا ہے...... لیکن حضرت سلطان باہوؒ پیدائشی ولی تھے۔ اس لئے آپ کو والدین کے حق میں نعمت عظمیٰ قرار دیا جاسکتا ہے۔

حضرت سلطان باہوؒ شورکوٹ کے مقام پر 1039ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ فرمانروائے ہندوستان شاہ جہاں کی حکومت کا آخری زمانہ تھا۔ عام طور پر باپ ہی اپنی اولادوں کے نام تجویز کرتا ہے مگر حضرت سلطان باہوؒ کا نام آپ کی والدہ محترمہ بی بی راستیؒ نے تجویز کیا تھا۔ چنانچہ حضرت سلطان باہوؒ اپنی تصنیف ''عین الفقرا'' میں ایک مقام پر اپنی والدہ ماجدہ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

رحمت حق برروان راستی
راستی از راستی آ راستی

(راستی کی جان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، اے راستی! تو نے مجھے راستی (سچائی) سے آراستہ کیا)

پھر لکھتے ہیں کہ میری والدہ پر اللہ اپنا فضل کرے جنہوں نے میرا نام ''باہو'' رکھا جو ایک ہی نقطے سے ''یاہو'' ہو جاتا ہے۔

اکثر تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت سلطان باہوؒ پیدائشی ولی تھے۔ آپ کی ولایت کی پہلی پہچان یہ تھی کہ جب شیرخوارگی کے زمانے میں رمضان المبارک کا مہینہ آیا تو حضرت سلطان باہوؒ نے روزے کے اوقات میں دودھ نہیں پیا، حضرت سلطان بایزیدؒ نے گھبرا کر کسی طبیب کو بلایا۔ طبیب نے ایک شیرخوار بچے کا معائنہ کیا۔ پھر اپنے تجربات کی روشنی میں حضرت سلطان بایزید محمدؒ کو بتایا۔

''بظاہر آپ کے فرزند کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ بچہ کسی وجہ کے بغیر دودھ نہیں پیتا۔ اگر مسلسل چوبیس گھنٹے تک بچے کی یہی کیفیت رہے تو مجھے بتایئے گا۔''

یہ کہہ کر طبیب چلا گیا۔

حضرت سلطان باہوؒ نے دن بھر دودھ نہیں پیا۔ پھر جب افطار کے بعد نماز مغرب سے فارغ ہو کر بی بی راستیؒ نے حضرت سلطان باہوؒ کو دودھ پلایا تو آپ نے ذوق و شوق سے پی لیا۔

پھر دوسرے دن بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ حضرت سلطان بایزید محمدؒ ایک بار پھر پریشان ہو کر طبیب کے پاس جانے لگے تو بی بی راستیؒ نے شوہر کو روکتے ہوئے فرمایا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کا بیٹا کسی مرض میں مبتلا نہیں۔ بلکہ اس کا روزہ ہے...... اور کوئی روزہ دار دن کے وقت کس طرح کھا پی سکتا ہے۔''

حضرت سلطان بایزید محمدؒ نے بڑی حیرت سے شریکِ حیات کی بات سنی۔

''آپ دیکھ لینا کہ افطار کے بعد آپ کا بیٹا باہو بھی دودھ پی لے گا۔'' حضرت بی بی راستیؒ نے شوہر کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ مغرب کے بعد حسب سابق حضرت سلطان باہوؒ نے پیٹ بھر کے دودھ پیا...... اور سلطان بایزید محمدؒ کو یقین آگیا کہ ان کا بیٹا پیدائشی ولی ہے، پھر یہ بات آس پاس کے علاقوں میں مشہور ہوگئی...... اور لوگ اس وقت حضرت سلطان باہوؒ کے چہرۂ مبارک کی زیارت کرنے کیلئے

آنے لگے جب آپ شیرخوارگی کے زمانے سے گزر رہے تھے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

پھر جب حضرت سلطان باہوؒ چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے تو شورکوٹ میں ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ حضرت سلطان باہوؒ کی بچپن سے عادت تھی کہ آپ سر جھکا کر چلتے تھے...... لیکن اگر راستہ چلتے وقت آپ نے نظر اُٹھا کر کسی مسلمان کو دیکھ لیا تو اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا...... اور وہ بے اختیار ہو کر پکار اُٹھتا تھا۔

''واللہ! یہ کوئی عام بچہ نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب روشنی ہے۔ ایسی روشنی جو براہِ راست دلوں کو متاثر کرتی ہے۔''

اور اگر آپ کی نظر کسی بت پرست پر پڑ جاتی تو وہ اپنے آبائی مذہب کو فراموش کر بیٹھتا اور کلمۂ طیبہ پڑھ کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو جاتا۔

پھر جب اس طرح کے کئی واقعات پیش آئے تو مقامی ہندوؤں کی ایک جماعت حضرت سلطان بایزید محمدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ سے حضرت سلطان باہوؒ کی شکایت کرنے لگی۔

''آخر میرے معصوم بچے نے آپ لوگوں کا کیا بگاڑا ہے؟'' حضرت سلطان بایزید محمدؒ نے ہندوؤں کی جماعت سے پوچھا۔ ''یہ تو ابھی کسی پر ہاتھ اُٹھانے کے قابل بھی نہیں ہے۔''

''اگر وہ ہم پر ہاتھ اُٹھا لیتا تو زیادہ اچھا تھا۔'' شورکوٹ کے ایک سرکردہ ہندو نے کہا۔

''پھر تمہیں میرے بیٹے سے کیا گلہ ہے؟'' حضرت سلطان بایزید محمدؒ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''آپ کا بچہ جس ہندو کو بھی نظر بھر کے دیکھ لیتا ہے، وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔'' ہندوؤں کے سربراہ نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کے بچے کی وجہ سے شورکوٹ کے ہندوؤں کا مذہب خطرے میں پڑ گیا ہے۔''

بڑی عجیب شکایت تھی۔ حضرت سلطان بایزید محمدؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر ہندوؤں کی جماعت سے مخاطب ہوئے۔ ''اب آپ ہی بتائیں کہ میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں؟ کمزوری تو ان لوگوں کی ہے جو اپنا مذہب بدل دیتے ہیں۔ اس میں میرے بیٹے کا کیا قصور ہے؟ میں اسے نظر اُٹھا کر دیکھنے سے کس طرح باز رکھ سکتا ہوں؟''

''قصور تو بچے کی دایہ کا ہے جو اسے وقت بے وقت لے جاتی ہے۔'' ہندوؤں کے سربراہ نے کہا۔

''آپ لوگ بڑا عجیب مطالبہ کر رہے ہیں۔'' حضرت سلطان بایزید محمدؒ نے فرمایا۔ ''دایہ کے بازار جانے پر کس طرح پابندی لگائی جاسکتی ہے؟''

''ہماری گزارش ہے کہ آپ بچے کی سیر کیلئے ایک وقت مقرر کردیں۔'' شورکوٹ کے ہندوؤں نے درخواست کی۔

بالآخر حضرت سلطان بایزید محمدؒ نے سختی کے ساتھ دایہ کو ہدایت کردی کہ وہ ایک وقت مقررہ پر حضرت سلطان باہو کو بازار لے جایا کرے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہندوؤں کی شکایت پر حضرت

باہو کے پیروں میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں باندھ دی گئیں تا کہ اگر کبھی وہ وقت بے وقت گھر سے نکلیں تو لوگ گھنٹیوں کی آواز سن کر پہچان لیں کہ حضرت باہوؒ آ رہے ہیں۔ بہرحال ہندوؤں کی جماعت مطمئن ہو کر چلی گئی...... مگر پھر بھی انہیں حضرت سلطان باہوؒ کی طرف سے ایک انجانا خوف لاحق رہتا تھا۔ پتا نہیں، کب اس حق پرست بچے کی نظر اُٹھے اور کسی ہندو کے ماتھے سے "چھاپ اور تلک" کے کافرانہ نشانات کھرچ ڈالے۔

شور کوٹ کے ہندوؤں نے ایک مومن کی نظر سے محفوظ رہنے کیلئے عجیب عجیب انتظامات کئے تھے۔ کئی لوگوں کو خاص طور پر اس لئے ملازم رکھا گیا تھا کہ جب حضرت سلطان باہوؒ کی ملازمہ آپ کو لے کر بازار کی طرف آئے تو وہ لوگ بآواز بلند اعلان کر دیں۔ چنانچہ حضرت سلطان باہوؒ جب بھی اپنی خادمہ کے ساتھ بازار کی طرف روانہ ہوتے، ہندوؤں کے نقیب شور مچانے لگتے۔

"ہوشیار ہو جاؤ! بچہ بازار کی طرف آ رہا ہے۔"

جیسے ہی یہ شور بلند ہوتا، تمام ہندو اپنی اپنی دکانوں میں گھس کر دروازے بند کر لیتے تا کہ حضرت سلطان باہوؒ کی انقلاب آفریں نظر سے محفوظ رہ سکیں۔ راستہ چلنے والے ہندو بھی نقیبوں کی آوازیں سن کر ہوشیار ہو جاتے تھے۔ انہیں شور کوٹ کے پنڈتوں کی طرف سے ہدایت تھی کہ یہ بچہ جہاں بھی نظر آ جائے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کریں اور پیٹھ موڑ کر کھڑے ہو جائیں۔ الغرض اس قدر بندشوں اور احتیاطوں کے باوجود، جب بھی کوئی بت پرست حضرت سلطان باہوؒ کی نظر کی زد میں آ جاتا، وہ مسلمان ہوئے بغیر نہ رہتا۔ تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق شور کوٹ اور دوسرے علاقوں کے سیکڑوں ہندو اس طرح مسلمان ہوئے کہ حضرت سلطان باہوؒ نے انہیں ایک نظر دیکھا اور وہ اپنے ماتھوں سے قشقہ کھرچ کر اور زنار (گردن میں پڑا ہوا دھاگا) توڑ کر کلمۂ طیبہ پڑھنے لگے۔

یہ حضرت سلطان باہوؒ کی سب سے بڑی کرامت تھی۔ آپ کی آنکھوں کی یہ انقلاب آفریں روشنی، سرورِ کونین حضور اکرم ﷺ کی اس حدیث پاک کے مطابق تھی۔

"مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

اور حق تعالیٰ نے حضرت سلطان باہوؒ کی آنکھوں کو یہ نور پیدائشی طور پر بخشا تھا۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

کسی معتبر کتاب سے پتا نہیں چلتا کہ حضرت سلطان باہوؒ نے ظاہری تعلیم کہاں حاصل کی اور آپ کے اساتذہ کون تھے؟ بعض تذکرہ نگاروں کے خیال میں آپ ظاہری علوم سے بے بہرہ تھے۔ شاید اس قیاس آرائی کی وجہ یہ ہو کہ خود حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے ظاہری علم کی نفی کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ "مجھے ظاہری علم حاصل نہیں تھا...... لیکن واردات غیبی کے سبب علم باطن کی فتوحات اس قدر تھیں کہ انہیں بیان کرنے کیلئے کئی دفتر درکار ہیں۔"

ایک اور موقع پر حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے ایک شعر میں علم ظاہری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"اگرچہ میں ظاہری علوم سے محروم ہوں لیکن علم باطنی نے میری زندگی پاک کر دی ہے۔"

آپ کے اسی قول مبارک کی بنیاد پر تذکرہ نگاروں کو مغالطہ ہوا کہ حضرت سلطان باہوؒ ظاہری علوم سے ناواقف تھے...... مگر جب ہم آپ کی کتابوں کی طویل فہرست دیکھتے ہیں تو خود بخود اس بات کی نفی ہو جاتی ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے زمانے کے مروجہ علوم حاصل نہیں کئے تھے۔

آپ کی تصانیف میں عین الفقر کبیر...... عین الفقر صغیر...... عقل بیدار کبیر...... عقل بیدار صغیر...... جامع النبی...... اسرار قادری...... توفیق الہدایت...... شمس العارفین...... رسالہ روحی اورنگ شاہی...... امیر الکونین...... دیوان اردو...... دیوان فارسی...... اور دیوان پنجابی زیادہ شہرت رکھتی ہیں۔ تمام مستند تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت سلطان باہوؒ کی تصانیف کی تعداد ایک سو چالیس سے لے کر ایک سو پچاس تک ہے۔ اتنی کتابوں کا مصنف ظاہری علوم سے کس طرح بے بہرہ ہو سکتا ہے۔

بعض تذکرہ نگاروں نے حضرت سلطان باہوؒ کی عربی تصانیف کا بھی حوالہ دیا ہے۔ ان تمام روایتوں کی روشنی میں ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ عربی، فارسی، اردو اور پنجابی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ایک ولی کیلئے جہاں روحانی کمالات ضروری ہوتے ہیں، وہاں اس کیلئے اپنے علاقے اور عہد کی زبانوں سے آگاہی حاصل کرنا بھی لازمی ہوتا ہے۔ اگرچہ روحانیت کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ اس کی زبان سے ناآشنا ہونے کے باوجود عوام الناس ایک مردِ حق کو پہچان لیتے ہیں...... اور وہ جو پیغام دینا چاہتا ہے اسے آسانی سے سمجھ لیتے ہیں...... مگر کبھی کبھی وہ لمحات بھی آ جاتے ہیں جب پیغامِ حق دینے کیلئے ایک ولی کو غیر مذہب و ملت کے لوگوں سے مخاطب ہونا پڑتا ہے۔ انہیں روحانیت کے اسرار و رموز ان ہی کی زبان میں سمجھانے پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پیغام حق سنانے کیلئے ہندوستان کے صنم خانوں کی طرف رخ کیا تو آپ نے چار سال تک ملتان میں قیام فرمایا اور اس دوران سنسکرت اور ہندی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ اس وقت بھی سنسکرت اور ہندی ہندوستان کی سرکاری اور عوامی زبانیں تھیں۔ پھر آپ اہلِ باطل سے ان ہی کی زبان میں مخاطب ہوئے۔

اسی طرح حضرت سلطان باہوؒ نے بھی اپنے دور کی مروجہ زبانوں پر دسترس حاصل کی...... مگر یہ بات پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ سکی کہ ان علوم میں آپ کے اساتذہ کون تھے؟ حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے کلام اور ملفوظات میں علوم ظاہری سے بہرہ مند ہونے کا جو اعلان کیا ہے، اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ آپ نے حدیث، فقہ، منطق اور ریاضی وغیرہ کی تعلیم اس انداز میں حاصل نہیں کی جیسا کہ زمانہ سابق کا دستور تھا۔ اس لئے آپ نے فرمایا تھا۔

"اگرچہ میں ظاہری علوم سے محروم ہوں لیکن علم باطنی نے میری زندگی پاک کر دی ہے۔"

☆☆..........☆☆..........☆☆

اور جہاں تک علوم باطنی حاصل کرنے کا معاملہ ہے تو حضرت سلطان باہوؒ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی راستیؒ اپنے وقت کی بہت بڑی عابدہ تھیں۔ آپ نے بہت دن تک مادر گرامی سے اکتساب فیض

کیا۔ پھر ایک وہ منزل بھی آ گئی کہ حضرت سلطان باہوؒ باقاعدہ بیعت کیلئے والدہ محترمہ سے درخواست گزار ہوئے۔

جواب میں حضرت بی بی راستیؒ نے فرمایا۔ ''فرزند! میرے دامن میں جتنی دعائیں تھیں، وہ سب تمہاری بھلائی مانگنے میں صرف ہو گئیں...... مگر میں تمہیں اپنا مرید نہیں بنا سکتی۔''

حضرت سلطان باہوؒ والدہ ماجدہ کی محبت میں غرق تھے۔ اس لئے حیران ہو کر عرض کرنے لگے۔

''آخر اس میں کیا حرج ہے۔ آپ جیسی شفیق و مہربان ماں سے بہتر مرشد کون ہو سکتا ہے؟''

''یہ تمہاری شدید محبت اور سعادت مندی ہے مگر ہمارے مذہب کے چند بنیادی اصول ہیں۔ جنہیں کوئی صحیح العقیدہ مسلمان تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' حضرت بی بی راستیؒ نے فرمایا۔ ''تمہاری نظروں میں میرا درجہ کتنا ہی بلند سہی مگر ایک عورت روحانی پیشوائی کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتی۔ تمہیں اپنی روحانیت کی تکمیل کیلئے کسی مرشد کامل کے آستانے پر حاضری دینی ہو گی۔ وہی مردِ حق تمہیں معرفت کے بقیہ رموز سمجھائے گا۔ میرے پاس جس قدر سرمایہ تھا، وہ سب میں نے تم پر لٹا دیا۔''

مادرِ گرامی کا جواب سن کر حضرت سلطان باہوؒ مرشد کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ کی معاشرتی زندگی ان صوفیاء کی طرح نہیں تھی۔ جو تجرد کی زندگی بسر کرتے ہیں یا پھر ویران جنگلوں یا سنسان غاروں میں چلّہ کش ہو جاتے ہیں۔ مرشد کی جستجو میں روانہ ہونے سے پہلے حضرت سلطان باہوؒ تین شادیاں کر چکے تھے اور ظاہری طور پر یہ سنت کی تکمیل تھی۔ آپ کو والد محترم کی طرف سے ورثے میں ایک گاؤں اور پچاس ہزار بیگھے زمین ملی تھی، اس لئے آپ آسودہ زندگی بسر کر رہے تھے...... مگر پھر بھی روح میں ایک اضطراب پوشیدہ تھا جس کی وجہ سے آپ مردانِ حق کی صحبتیں ڈھونڈتے تھے۔

حضرت سلطان باہوؒ مختلف بزرگوں کے مزارات مبارکہ پر حاضری دیتے ہوئے، حضرت مخدوم بہاءالدین زکریاؒ کے آستانہ عالیہ پر حاضر ہوئے۔ بہت دیر مراقبے کی حالت میں بیٹھے رہے۔ اسی دوران حضرت سلطان باہوؒ پر نیند کا غلبہ ہو گیا۔

آپ نے خواب کی حالت میں دیکھا۔ سامنے حضرت مخدوم بہاءالدین زکریا ملتانیؒ تشریف فرما تھے۔ ''مجھے حضرت غوث اعظمؒ کی بارگاہ سے حکم ہوا ہے کہ تمہاری دلداری کروں۔'' حضرت مخدوم بہاءالدین زکریا ملتانیؒ نے حضرت سلطان باہوؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''فرزند مجھے بتاؤ کہ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے؟''

''مخدوم! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔'' حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔

''جب آئے ہو تو خالی ہاتھ کیسے جاؤ گے؟'' حضرت مخدوم بہاءالدین زکریا ملتانیؒ نے فرمایا۔

''میں کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں کرتا؟'' حضرت سلطان باہوؒ نے نہایت ادب و احترام کے

ساتھ عرض کیا۔ ''بس آپ کے چہرۂ مبارک کی زیارت منظور تھی، سو مقصد حاصل ہو گیا۔''

حضرت مخدوم بہاءالدین زکریا ملتانیؒ نے تیسری بار فرمایا۔ ''فرزند! اپنی حاجت بیان کرو۔''

حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔ ''مخدوم! اگر ایسا ہی ہے تو پھر اپنے شہر میں سے ایک پاکیزہ آدمی کا باز و عطا کیجئے۔''

''انشاء اللہ تمہاری یہ خواہش بہت جلد پوری ہو جائے گی۔'' حضرت مخدوم بہاءالدین زکریا ملتانیؒ نے فرمایا اور تشریف لے گئے۔

حضرت سلطان باہوؒ کی آنکھ کھلی تو آپ نے حضرت مخدوم بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کی روح کو ایصالِ ثواب کیا اور مزار مبارک کے احاطے سے باہر نکل آئے۔ پھر شمال کی جانب روانہ ہو گئے۔

ظہر کی نماز کا وقت آیا تو حضرت سلطان باہوؒ نے دریا کے کنارے وضو کیا۔ ابھی آپ نماز کی نیت باندھنا ہی چاہتے تھے کہ آپ کو اپنی پشت کی طرف کسی متنفس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ حضرت سلطان باہوؒ نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک خوبصورت ہندو دوشیزہ ہاتھوں میں جوتے لئے ہوئے کھڑی تھی۔ حضرت سلطان باہوؒ نے فوراً نظریں جھکا لیں اور نامحرم خاتون سے پوچھا۔

''تم کون ہو اور یہاں کیوں آئی ہو؟''

''آپ کے پیچھے چلتے چلتے میرے پاؤں آبلوں سے بھر گئے ہیں۔'' ہندو دوشیزہ نے اپنی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے عرض کیا۔

''خاتون! آخر تمہیں میرے تعاقب کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' حضرت سلطان باہوؒ نے بدستور نظریں جھکائے ہوئے دریافت کیا۔

''میں ملتان کے ساہوکار کی لڑکی ہوں۔'' ہندو دوشیزہ نے عرض کیا۔ ''بہت دنوں سے میرے دل میں ایک عجیب سی خلش تھی۔ مجھے اپنے ہم مذہبوں کی پوجا کا یہ انداز پسند نہیں تھا کہ انسان ہوتے ہوئے پتھر کے مجسموں کے آگے سر جھکا دوں۔ پھر یہی خلش مجھے حضرت غوث الملک (مخدوم بہاءالدین زکریاؒ) کے مزار مبارک پر لے گئی۔ میں نے یہاں کے مسلمانوں سے سنا ہے کہ غوث الملکؒ کے دربار سے بے شمار لوگ فیضیاب ہو چکے ہیں۔ میں بھی اپنے دل میں یہی خواہش لے کر آئی تھی کہ شاید میرا مقدر بھی جاگ جائے۔''

حضرت سلطان باہوؒ نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر فرمایا۔ ''کہیں ظہر کا وقت تنگ نہ ہو جائے۔ اس لئے تم تھوڑا سا انتظار کر لو۔ میں نماز ادا کر لوں۔ پھر تمہارے خلش و اضطراب کا حال سنوں گا۔''

یہ کہہ کر حضرت سلطان باہوؒ نماز کیلئے کھڑے ہو گئے۔

ہندو دوشیزہ بہت قریب سے ایک مردِ مومن کی عبادت کے انداز دیکھتی رہی۔ اسے یہ سب رکوع و سجود بہت عجیب معلوم ہو رہے تھے۔

پھر جب حضرت سلطان باہوؒ نماز سے فارغ ہو گئے تو آپ نے ہندو دوشیزہ سے پوچھا۔ ''تمہاری ذہنی خلش اور تڑپ اپنی جگہ مگر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

"ایک داسی (کنیز) اپنے مالک سے اس کے سوا اور کیا چاہے گی کہ وہ اسے اپنے قدموں میں پڑا رہنے دے۔" ہندو دوشیزہ نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے عرض کیا۔ "میں نے آپ کو غوث الملکؒ (حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ) کے مزار مبارک میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر جب آپ باہر تشریف لائے تو میں آپ کا چہرہ دیکھتے ہی مسلمان ہوگئی...... کیونکہ مجھے غوث الملکؒ کے دربار سے حکم ملا تھا کہ میں آپ کی لونڈی بن جاؤں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ایک داسی کی طرح اپنے مالک کے پیچھے پیچھے چل رہی ہوں۔"

ہندو دوشیزہ کا بیان سن کر حضرت سلطان باہوؒ کو شدید حیرت ہوئی۔ پھر آپ نے کچھ دیر مراقبہ فرمایا۔ مراقبے کے دوران ہی حضرت سلطان باہوؒ کو اپنے الفاظ یاد آئے۔ جب آپ نے حضرت مخدوم بہاء الدین زکریاؒ کی جناب میں عرض کیا تھا۔

"مخدوم! اگر ایسا ہی ہے تو اپنے شہر میں سے ایک پاکیزہ آدمی کا بازو عطا کیجیے۔"

یہ خیال آتے ہی حضرت سلطان باہوؒ نے ہندو دوشیزہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "جب غوث الملک کا حکم ہے تو یہ خادم اسے کیسے ٹال سکتا ہے؟ تم مطمئن ہو جاؤ کہ حق تعالیٰ نے تمہیں تمہاری منزل تک پہنچا دیا۔"

اس کے بعد حضرت سلطان باہوؒ نے ہندو دوشیزہ کو کلمۂ طیبہ کی تلقین کی۔ پھر جب وہ لڑکی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور خاتم النبیین حضور اکرم ﷺ کی رسالت کا اقرار کر چکی تو حضرت سلطان باہوؒ اسے اپنے ہمراہ لے کر شہر کی طرف آئے اور اس علاقے کے اکابرین کی موجودگی میں آپ نے اس سے نکاح کر لیا۔ پھر اپنے آبائی وطن شورکوٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

حضرت سلطان باہوؒ کی والدہ ماجدہ خود بھی ایک صاحب کشف خاتون تھیں۔ آپ حضرت سلطان باہوؒ کی تینوں بیویوں کو مخاطب کر کے اکثر فرمایا کرتی تھیں۔

"میرا بیٹا تمہارے لئے ایک اور سوکن لے کر آئے گا مگر تم رنجیدہ خاطر نہ ہونا کہ تمہارا شوہر ایک ولی ہے اور اسی کے ذریعے تمہیں نجات حاصل ہوگی۔"

حضرت بی بی راستیؒ کا ارشاد سن کر حضرت سلطان باہوؒ کی تینوں بیویاں سرِ تسلیم خم کر دیتی تھیں۔

پھر جس دن حضرت سلطان باہوؒ نے چوتھی عورت کو اپنے نکاح میں داخل کیا تو آپ نے تینوں بہوؤں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "تم آزردہ خاطر نہ ہونا کہ میرا بیٹا تمہاری ایک اور سوکن لے کر آ رہا ہے۔"

حضرت سلطان باہوؒ کی تینوں بیویاں حیران ہوئیں کہ ان کے شوہر تو تلاش مرشد میں نکلے ہیں، پھر یہ سوکن کہاں سے آ گئی؟ دراصل ان عورتوں کو حضرت بی بی راستیؒ کی قوت کشف کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ انہیں محض ایک مہربان اور نیک دل ساس سمجھتی تھیں۔

پھر جب حضرت سلطان باہوؒ اپنی نئی شریک حیات کو لے کر والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت بی بی راستیؒ نے نہایت ناخوشگوار لہجے میں فرمایا۔

"باہو! کیا تجھے اللہ تعالیٰ نے بہت سی عورتیں جمع کرنے کیلئے پیدا کیا ہے یا تیری پیدائش کا مقصد کچھ اور ہے؟"

والدہ ماجدہ کی تلخ گفتگو سن کر حضرت سلطان باہوؒ کچھ گھبرا سے گئے۔ "آپ ہی بتائیے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کس کام کیلئے پیدا کیا ہے؟"

"اپنی معرفت کیلئے، نہ کہ بہت سی شادیاں کرنے کیلئے۔" حضرت بی بی راستیؒ نے فرمایا۔ آپ کے چہرۂ مبارک پر ناخوشگواری کے آثار صاف نمایاں تھے۔

"اُمِ محترم! مجھے معرفت الٰہی حاصل ہے۔" حضرت سلطان باہوؒ نے بصد احترام عرض کیا۔

جواب میں آپ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی راستیؒ نے فرمایا۔ "جب تک کسی مرشد کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہیں دو گے تمہیں معرفت حاصل نہیں ہوگی۔"

"اب آپ ہی بتائیں کہ میں اپنے مرشد کو کہاں تلاش کروں؟"

والدہ ماجدہ نے فرمایا۔ "روئے زمین پر ڈھونڈو۔"

حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔ "اُمِ محترم! اللہ کی زمین تو بہت وسیع ہے۔"

حضرت بی بی راستیؒ نے فرمایا۔ "بے شک! حق تعالیٰ نے اپنی زمین کو بہت وسعت بخشی ہے...... مگر اس کے ساتھ ہی اپنے بندوں کے حوصلے بھی بہت بلند کئے ہیں۔ انہیں نہ صرف ذوق جستجو عطا کیا ہے بلکہ زمین کو ان کیلئے مسخر بھی کر دیا ہے۔"

"پھر بھی کچھ تو نشاندہی فرمائیے۔" حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔

حضرت بی بی راستیؒ نے مراقبہ کیا اور پھر فرزند کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اس طرف سے تمہارے مرشد کی خوشبو آتی ہے۔" حضرت بی بی راستیؒ نے مشرق کی طرف اشارہ کیا تھا۔

بالآخر حضرت سلطان باہوؒ اپنی والدہ محترمہ کی دعاؤں کے سائے میں مشرق کی طرف روانہ ہوگئے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

حضرت سلطان باہوؒ شورکوٹ سے رخصت ہو کر دریائے راوی کے کنارے پہنچے۔ یہاں آپ نے مقامی لوگوں سے ایک بزرگ حضرت شاہ حبیب اللہ قادری کے بارے میں سنا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی بہت سی کرامات مشہور تھیں۔ حضرت سلطان باہوؒ کو آپ کی ذات میں ایک خاص کشش محسوس ہوئی۔ حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ پنجاب کے ایک گاؤں بغداد میں رہتے تھے مگر اب یہ گاؤں پاکستان کے نقشے پر موجود نہیں۔ حضرت سلطان باہوؒ نے مقامی باشندوں سے بغداد گاؤں کا پتا پوچھا اور حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔

اس وقت حضرت شاہ صاحبؒ کی مجلس روحانی میں سیکڑوں طالبانِ حق موجود تھے۔ حضرت سلطان باہوؒ بھی ادب اور خاموشی کے ساتھ مجلس میں بیٹھ گئے۔ بہت دیر تک حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ کا درس جاری رہا۔

پھر حضرت سلطان باہوؒ نے اس خانقاہ کی عجیب رسم دیکھی۔ یہاں ایک دیگ تھی جس کے نیچے ہر

وقت آگ جلتی رہتی تھی اور ہلکی آنچ پر دیگ کا پانی چوبیس گھنٹے گرم رہتا تھا۔ جب کوئی طالبانِ حق آتا تو حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ اسے دیگ کے پانی میں ہاتھ ڈالنے کا حکم دیتے۔ پھر جیسے ہی وہ شخص پانی میں ہاتھ ڈالتا، صاحب کشف ہو جاتا۔

اس روز بھی کئی طالبانِ حق حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ درس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے ان لوگوں کو دیگ کے گرم پانی میں ہاتھ ڈالنے کا حکم دیا۔ طالبانِ حق آگے بڑھے اور کسی جھجک کے بغیر ان حضرات نے پانی میں ہاتھ ڈال دیا۔ حضرت سلطان باہوؒ نے بہت غور سے یہ منظر دیکھا۔ گرم پانی سے ان لوگوں کے ہاتھوں کو کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا۔ یہی حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ کی مشہور کرامت تھی کہ پانی میں ہاتھ ڈالتے ہی طالب حق صاحب کشف ہو جاتا تھا۔

حضرت سلطان باہوؒ کو خاموش بیٹھا دیکھ کر حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے فرمایا۔

''صاحبزادے! تم یہاں کس مقصد کیلئے آئے ہو؟''

حضرت سلطان باہوؒ نے بصد احترام عرض کیا۔ ''تلاش حق میں گھر سے نکلا ہوں۔ حضرت کے کمالات روحانی کا شہرہ سنا تو حاضر ہو گیا۔''

''بندۂ خدا! تم خاموش کیوں بیٹھے ہو؟'' حضرت سلطان باہوؒ کی عرضداشت سن کر حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے فرمایا۔ ''تم نے دوسرے لوگوں کی طرح دیگ میں ہاتھ کیوں نہیں ڈالا؟ اگر ایسا کرتے تو بامراد ہو جاتے۔''

حضرت سلطان باہوؒ نے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا۔ ''میں دیگ میں ہاتھ ڈلنے والوں کا حال دیکھ رہا تھا۔ اس سے میری مراد پوری نہیں ہوتی۔''

حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے نووارد کوچہ معرفت کا جواب سنا اور بڑی حیرت سے حضرت سلطان باہوؒ کی طرف دیکھا۔ ''پھر کیا چاہتے ہو؟''

''میں تو کسی اور ہی منزل کی تلاش میں ہوں۔'' حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔

''تو پھر اے درویش! چند روز خانقاہ میں ٹھہرو۔'' حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے فرمایا۔ ''کچھ دن مجاہدہ کرو اور اس دوران مسجد کا پانی بھرو۔''

☆☆......☆☆......☆☆

حضرت سلطان باہوؒ نے وہ رات حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ کی خانقاہ میں بسر کی۔ پھر دوسرے دن خانقاہ کے منتظمین سے پانی بھرنے کیلئے مشک طلب کی۔

اس کے بعد حضرت سلطان باہوؒ مشک لے کر دریا کے کنارے پہنچے۔ مشک کو پانی سے لبریز کیا اور خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ پھر ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ حضرت سلطان باہوؒ نے ایک ہی مشک میں پورا حمام بھر دیا جبکہ حمام کو بھرنے کیلئے کئی مشکوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ باقی پانی سے آپ نے مسجد کا پورا صحن دھو دیا۔

خانقاہ کے منتظمین بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ایک خادم نے اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کیا۔ ''شیخ! اس نوجوان نے تو ایک ہی مشک میں پورا حمام بھر دیا۔''

حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ کچھ دیر تک خاموش رہے۔ پھر خادم سے فرمایا۔ ''اس نوجوان کو میرے پاس بھیج دو۔''

حضرت سلطان باہوؒ، حضرت حبیب اللہ قادریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شاہ صاحبؒ نے فرمایا۔ ''نوجوان! کیا تمہارے پاس دنیاوی مال و متاع ہے؟''

حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔ ''مجھے والد محترم کی طرف سے زمینی جاگیر ورثے میں ملی ہے۔''

''مال و متاع کی موجودگی میں تم راہِ حق کی دشوار مسافت کس طرح طے کر سکتے ہو؟'' حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے فرمایا۔

''تو پھر میرے لئے کیا حکم ہے؟'' حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔

''مال دنیا کے ہوتے ہوئے تمہیں یکسوئی قلب حاصل نہیں ہو سکتی۔'' حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے فرمایا۔ ''پہلے مال و متاع سے فارغ ہو جاؤ۔ پھر یکسوئی اختیار کرو۔''

حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ کے حکم پر عمل کرنے کیلئے حضرت سلطان باہوؒ اپنے آبائی وطن شورکوٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆......☆☆......☆☆

ابھی حضرت سلطان باہوؒ راستے میں تھے کہ آپ کی والدہ محترمہ حضرت بی بی راستیؒ نے اپنی چاروں بہوؤں کو طلب کر کے فرمایا۔ ''تم لوگ ہوشیار ہو جاؤ۔''

حضرت سلطان باہوؒ کی بیویوں نے گھبرا کر ساس محترمہ کی طرف دیکھا۔ ''آپ کس خطرے کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔''

''میرا بیٹا اور تمہارا شوہر سلطان باہوؒ آ رہا ہے۔'' حضرت بی بی راستیؒ نے فرمایا۔

بیویوں کے چہروں پر خوشی کا گہرا رنگ نمایاں ہو گیا۔ ''اُمِ محترم! یہ تو بڑی خوشخبری ہے۔''

''تمہارے لئے خوشی کی کوئی خبر نہیں۔'' حضرت بی بی راستیؒ نے اپنی بہوؤں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''باہو اپنے پیر و مرشد کے حکم پر سارا مال و متاع لٹانے آ رہا ہے۔''

حضرت سلطان باہوؒ کی بیویاں نیک تھیں مگر تارک الدنیا نہیں تھیں کہ مادی دولت سے خوشی کے ساتھ دستبردار ہو جاتیں۔ اس لئے ان کے چہروں سے پریشانی کے آثار جھلکنے لگے۔

''بہتر یہی ہے کہ تم اپنی نقدی اور زیور بچا لو۔'' حضرت بی بی راستیؒ نے بہوؤں کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا۔ ''برا وقت کہہ کر نہیں آتا۔ اگر تم میری نصیحت پر عمل کرو گی تو یہی مال و متاع تمہارے کام آئے گا۔''

''مگر ہم اپنی نقد رقم اور زیورات کو کس طرح بچا سکتے ہیں؟'' حضرت سلطان باہوؒ کی چاروں بیویوں نے بیک زبان عرض کیا۔ ان کی سمجھ میں کوئی ترکیب نہیں آ رہی تھی۔

"تم سب لوگ اپنی نقدی اور زیورات کسی ایسی جگہ دبا دو جہاں باہو کی نظر نہ پہنچ سکے۔" حضرت بی بی راستیؒ نے بہوؤں کو مشورہ دیا۔

حضرت سلطان باہوؒ کی بیویوں نے ایسا ہی کیا اور سارے خطرات سے بے نیاز ہو کر شوہر کا انتظار کرنے لگیں۔

کچھ دن بعد حضرت سلطان باہوؒ شور کوٹ پہنچے اور والدہ محترمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

"باہو! تم اتنی جلدی کیسے لوٹ آئے؟" حضرت بی بی راستیؒ نے فرزند سے پوچھا۔ "کیا تمہیں کوئی مرشد نہیں مل سکا؟"

"مرشد تو مل گیا ہے مگر شیخ نے بیعت کرنے کیلئے ایک کڑی شرط رکھی ہے۔" حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔

"کیسی شرط؟" حضرت بی بی راستیؒ نے پوچھا۔ اگرچہ آپ اپنے کشف کے سبب صورتحال سے باخبر تھیں مگر حضرت سلطان باہوؒ کی آزمائش کیلئے آپ نے یہ سوال کیا تھا۔

"مرشد کا حکم ہے کہ پہلے مال ومتاع دنیا سے نجات حاصل کرلوں۔" حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔

"فرزند! حکم شیخ پر عمل کرو۔" حضرت بی بی راستیؒ نے فرمایا۔

حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے فرزند اکبر نور محمدؒ کی طرف دیکھا جو گہوارے میں سوئے ہوئے تھے۔ نظر بد سے بچانے کیلئے ان کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی ڈال دی گئی تھی۔ حضرت سلطان باہوؒ نے آگے بڑھ کر شیر خوار بچے کی انگلی سے وہ انگوٹھی اتار لی اور اسے اپنے مکان کے پیچھے گلی میں پھینک دی۔

"مناقب سلطان" کی روایت کے مطابق حضرت سلطان باہوؒ نے سونے کی انگوٹھی گلی میں پھینکنے کے بعد اپنی بیویوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اگر گھر میں کچھ اور مال ومتاع ہے تو وہ بھی لے آؤ تاکہ میں اس سے نجات حاصل کرسکوں۔"

بیویاں اس صورتحال سے بہت پریشان تھیں۔ وہ شوہر کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکیں۔ ان کی جگہ حضرت بی بی راستیؒ نے فرمایا۔ "اس گھر میں مال کہاں؟"

حضرت سلطان باہوؒ نے نہایت ادب واحترام کے ساتھ عرض کیا۔ "مادر گرامی! آپ فرماتی ہیں کہ یہاں مال کہاں...... مگر مجھے تو اس گھر سے متاع دنیا کی بو آرہی ہے۔"

حضرت بی بی راستیؒ نے بیٹے کی بات سن کر فرمایا۔ "باہو! اگر تمہیں اس گھر سے متاع دنیا کی بو آرہی ہے تو پھر خود ہی تلاش کرلو۔"

حضرت سلطان باہوؒ گھر کے ایک سنسان سے گوشے میں تشریف لے گئے اور زمین میں دبا ہوا سارا زیور نکال کر مکان سے باہر پھینک دیا۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

حضرت سلطان باہوؒ دوبارہ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ "میں نے حکم

شیخ پر تمام مال وزر لٹا دیا۔"

"ابھی تمہارے پیروں کی زنجیریں باقی ہیں۔" حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے فرمایا۔

"مجھے حکم دیجئے۔" حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔ "میں ان زنجیروں کو بھی کاٹ پھینکوں گا۔"

"وہ زنجیریں تمہاری بیویاں ہیں۔" حضرت شاہ حبیب اللہ قادری نے فرمایا۔ "تم اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرو گے یا اپنی بیویوں کے؟"

"بندے پر سب سے پہلا حق اللہ تعالیٰ کا ہے۔" حضرت سلطان باہوؒ نے نہایت جذب کے عالم میں فرمایا۔ "اہل دنیا کے حقوق بھی فرمودات الٰہی کے سبب ہیں۔ جب کوئی انسان اپنے خالق کے حقوق ادا نہ کرسکے تو پھر کسی حق کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔"

حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے آپ کے ذوق آگہی کی تعریف کی اور فرمایا۔ "واپس جا کر اپنی بیویوں کو آزاد کردو تاکہ تمہیں مکمل یکسوئی حاصل ہوسکے اور تم پوری طرح راہِ حق پر چلنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔"

حضرت سلطان باہوؒ پر شوق دیدار الٰہی اس قدر غالب تھا کہ آپ اپنے پیروں کی زنجیریں کاٹنے پر آمادہ ہوگئے۔ پھر جب حضرت سلطان باہوؒ طویل سفر طے کرکے اپنے گھر کے نزدیک پہنچے تو حضرت بی بی راستیؒ نے آپ کی چاروں بیویوں کو جمع کرکے فرمایا۔ "اب کی بار میرا بیٹا تم لوگوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے آرہا ہے۔ پہلے اس نے مال دنیا سے پیچھا چھڑایا اور اب وہ تم سے اپنا دامن چھڑانا چاہتا ہے۔"

ایک شادی شدہ عورت کیلئے دنیا میں طلاق سے زیادہ تکلیف دہ عمل کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ حضرت بی بی راستیؒ کی زبانی یہ انکشاف سن کر حضرت سلطان باہوؒ کی ازواج محترم کے ہوش اُڑ گئے۔

حضرت بی بی راستیؒ نے اپنی بہوؤں کی پریشانی دیکھ کر فرمایا۔ "باہو بس آنے ہی والا ہے۔ تم لوگ میری پیٹھ کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شوق معرفت کے سبب وہ تمہارے حق میں کوئی شرعی کلمہ اپنی زبان سے نکال دے۔" شرعی کلمے سے حضرت بی بی راستیؒ کی مراد طلاق کے الفاظ تھے۔

حضرت سلطان باہوؒ کی چاروں بیویاں اپنی محترم ساس کے عقب میں بیٹھ گئیں۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ حضرت سلطان باہوؒ گھر میں داخل ہوئے اور والدہ محترمہ کی خدمت میں سلام پیش کیا۔

اس سے پہلے کہ حضرت سلطان باہوؒ اپنے ارادے کی تکمیل کرتے، حضرت بی بی راستیؒ نے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "باہو! میں جانتی ہوں کہ تم کس ارادے سے آئے ہو؟"

"میرے مرشد کا یہی حکم ہے کہ میں اپنے پیروں کی ان زنجیروں کو کاٹ دوں۔" حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔

"بات تو حقوق ادا کرنے کی ہے۔" حضرت بی بی راستیؒ نے فرمایا۔ "تمہاری کوئی بیوی تمہارے راستے کی رکاوٹ نہیں بنے گی۔ نان ونفقہ کے جو حقوق تمہاری طرف ہیں تم انہیں ادا کرنے سے فارغ ہو۔ تمہاری بیویاں وہ سارے حقوق اللہ کے واسطے بخشتی ہیں۔ اس کے برعکس تمہارے جو

حقوق اپنی بیویوں کے ذمے ہیں وہ بدستور قائم رہیں گے۔ بس اب تم حق کی تلاش میں نکل جاؤ۔ اگر تم حق کو حاصل کر کے واپس آ گئے تو بہتر ہے ورنہ تمہیں اپنی بیویوں کے حقوق ادا کرنے کیلئے آنے کی ضرورت نہیں۔"

حضرت سلطان باہوؒ اپنی حیات مبارک میں شریعت کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ اس لئے آپ پر والدہ محترمہ کے کلام کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ پھر آپ نے اپنی بیویوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اگر تم اپنے حقوق معاف کر دو تو میں تمہیں طلاق دیئے بغیر واپس چلا جاؤں گا۔"

چاروں بیویوں نے زبانی طور پر اپنے تمام حقوق معاف کر دیئے تو حضرت سلطان باہوؒ دوبارہ پیرو مرشد کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

"مناقب سلطانی" میں یہ سارے واقعات اسی طرح تحریر کئے گئے ہیں۔ "تلاش حق" میں سیم و زر اور دنیوی مال ومتاع کا لٹا دینا کوئی خلاف شرع امر نہیں...... بلکہ قرآن کریم کے چوتھے پارے کی تو ابتدا ہی اس آیت مقدسہ سے ہوتی ہے۔

"تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنی محبوب ترین شے قربان نہ کر دو۔" (ترجمہ)

یہی وجہ ہے کہ چند صوفیائے کرام کو چھوڑ کر دنیا کے تمام مشائخ نے بے زری اور فقر و قناعت کی زندگی بسر کی ہے اور اس طرح شدید تکالیف اُٹھا کر نیکی کو حاصل کیا ہے۔ یہاں نیکی سے مراد رضائے الٰہی ہے۔

مگر حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ کی طرف سے حضرت سلطان باہوؒ کو ترک ازواج کا مشورہ دینا شریعت اور سنت کی روح کے منافی ہے۔ اگرچہ بہت سے صوفیاء نے شادی نہ کر کے پوری زندگی حالت تجرید میں گزاری ہے مگر ان کا یہ انفرادی عمل عام مسلمانوں کیلئے حجت نہیں۔ اردو کے نامور شاعر جگر مراد آبادی کے بقول۔

اس حسن برق وش کے دل سوختہ وہی ہیں
شعلوں سے جو کھیلیں، دامن کو بھی بچائیں

حقیقی صوفی وہی ہے جو ہر شعبۂ حیات میں سرورِ کونین ﷺ کے طریقے کی پیروی کرتا ہے......

چونکہ رسالت پناہ ﷺ نے شادی کی، اور بے مثال ازدواجی زندگی بسر کی۔ نتیجتاً صوفیاء کیلئے بھی اس معروف سنت پر عمل کرنا لازمی ہو جاتا ہے......لیکن شادی کے سلسلے میں یہ استثنا موجود ہے کہ اگر کسی شخص کے اقتصادی حالات درست نہیں تو وہ سرکار دو عالم ﷺ کی اس سنت کو مجبوراً ترک کر سکتا ہے...... مگر جو شخص پہلے سے شادی شدہ ہو، اسے بیویوں کو طلاق دینے کی تلقین کرنا، تصوف کا کمال نہیں۔

"مناقب سلطانی" کے فاضل مصنف نے اس واقعے کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کی کہ آخر حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے حضرت سلطان باہوؒ کو ترک ازواج کا مشورہ یا حکم کیوں دیا تھا؟ میرے ناقص خیال میں حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ، حضرت سلطان باہوؒ کے جذبۂ حق پرستی کی آزمائش چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس میں "اموال اور اولاد" کو فتنہ (آزمائش) قرار دیا ہے چونکہ

حضرت سلطان باہوؒ صاحب مال بھی تھے اور صاحب اہل وعیال بھی......اس لئے حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ حضرت سلطان باہوؒ طلب حق میں کتنے سچے ہیں اور راہِ حق میں کس قدر استقامت رکھتے ہیں؟ پھر جب حضرت سلطان باہوؒ اس آزمائشی مرحلے سے گزر گئے تو حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے آپ پر خصوصی توجہ فرمائی۔

☆☆............☆☆............☆☆

حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ سے بیعت ہونے کے سلسلے میں "مناقب سلطانی" کے مصنف شیخ سلطان حامدؒ نے بڑے عجیب واقعات تحریر کئے ہیں۔ ہم اپنے قارئین کی معلومات کیلئے وہ سارے واقعات حرف بہ حرف نقل کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ حضرت شیخ سلطان حامدؒ حضرت سلطان باہوؒ کے پڑپوتے تھے۔

"مناقب سلطانی" کے فاضل مصنف فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے حضرت سلطان باہوؒ پر خصوصی توجہ فرمانے کے کچھ دن بعد آپ سے دریافت کیا۔ "اب تمہیں دلی مراد حاصل ہوئی یا نہیں؟"

جواب میں حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔ "شیخ! آج جو مقامات مجھ پر منکشف ہوئے ہیں، ان سے تو میں گہوارے (جھولے) ہی میں گزر چکا تھا۔"

اپنے مرید کا جواب سن کر حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ کے دل میں خیال گزرا کہ حضرت سلطان باہوؒ کے اس دعوے کی آزمائش کرنی چاہئے۔ چنانچہ آپ حضرت سلطان باہوؒ کی نظر سے غائب ہو گئے۔

حضرت سلطان باہوؒ بھی اپنے پیرو مرشد کے پیچھے مائل پرواز ہوئے۔ یہاں تک کہ آپ اُڑتے اُڑتے کسی ملک کے ایک جنگل میں پہنچے۔ وہاں حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے پیرو مرشد حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ کو اس شکل میں پایا کہ ایک بوڑھا آدمی بیلوں کی جوڑی لئے ہوئے ہل چلا رہا تھا۔

حضرت سلطان باہوؒ اپنے کاندھے پر خرقہ پوشوں کی طرح ایک اجنبی درویش کی صورت میں اپنے پیرو مرشد کے سامنے آئے اور عرض کیا۔ "شیخ! آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ آرام فرمائیں۔ میں ہی آپ کی جگہ ہل چلاؤں گا۔"

یہ سن کر حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت سلطان باہوؒ نے بھی اپنی حقیقی شکل اختیار کر لی۔

پھر دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف روانہ ہو گئے۔ پھر راستہ چلتے چلتے حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

حضرت سلطان باہوؒ نے بھی وہی روش اپنائی اور پیرو مرشد کے تعاقب میں گم ہو گئے۔ یہاں تک کہ آپ نے حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ کو ہندوؤں کے ایک شہر میں دیکھا۔ اس وقت شاہ صاحبؒ ایک بوڑھے برہمن کی صورت میں جلوہ افروز تھے۔ آپ کے ہاتھوں میں ایک برتن تھا جس میں زعفران اور دوسرے رنگ بھرے ہوئے تھے۔ پھر حضرت سلطان باہوؒ نے دیکھا کہ آپ کے پیرو

مرشد بازار میں موجود ہندوؤں کے ماتھوں پر تلک لگا رہے تھے۔

حضرت سلطان باہوؒ نے بھی فوراً اپنا ظاہری حلیہ بدل دیا اور ایک ہندو نوجوان کی صورت اختیار کر کے ایک دکان پر بیٹھ گئے۔

پھر جب حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ اُدھر سے گزرے تو حضرت سلطان باہوؒ دکان سے اُتر کر پیرومرشد کے سامنے کھڑے ہو گئے اور عرض کرنے لگے۔

''بابا! میری پیشانی پر بھی تلک لگاتے جایئے۔''

حضرت حبیب اللہ قادریؒ صورتحال سے واقف ہو کر اپنی اصلی حالت پر آئے اور حضرت سلطان باہوؒ کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف روانہ ہو گئے۔

پھر تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا کہ حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ اچانک چلتے چلتے نظروں سے غائب ہو گئے۔ حضرت سلطان باہوؒ نے بھی وہی راستہ اختیار کیا اور پیرومرشد کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

اب کی بار حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے پیرومرشد کو ایک اسلامی شہر میں موجود پایا۔ حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ ایک غیر معروف مسجد میں تشریف فرما تھے اور بہت سے کم سن بچوں کو قرآن کریم کے قاعدے کی تعلیم دے رہے تھے (اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے مناقب سلطانی کے مصنف نے حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ کے ظاہری حلئے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اپنی اصلی صورت میں مسجد کے اندر موجود تھے)

یہ منظر دیکھ کر حضرت سلطان باہوؒ بھی ایک چھوٹے سے بچے کی صورت میں قاعدہ لے کر حاضر ہوئے اور پیرومرشد سے درخواست کرنے لگے۔ ''شیخ! مجھے بھی تو سبق پڑھایئے۔''

یہ سن کر حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے کم سن طالب علم کی طرف دیکھ لیا اور ایک ہی نظر میں پہچان لیا کہ وہ کوئی مقامی بچہ نہیں بلکہ آپ کے مرید حضرت سلطان باہوؒ تھے۔

حضرت حبیب اللہ قادریؒ مسجد سے باہر تشریف لائے اور حضرت سلطان باہوؒ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گاؤں بغداد (پنجاب) میں آئے۔ پھر حضرت سلطان باہوؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اے درویش! تم جس نعمت کے مستحق ہو، وہ ہمارے امکان سے باہر ہے۔''

''شیخ محترم! پھر میں کہاں جاؤں؟'' حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔

''ہم تمہاری رہنمائی کر سکتے ہیں۔'' حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے فرمایا۔ ''اب تمہارا مقدر ہے کہ تم وہاں سے کتنا حاصل کر سکتے ہو؟''

''آپ میری رہنمائی فرمایئے۔'' حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔ ''تقدیریں تو حق تعالیٰ تحریر کرتا ہے جو کچھ وہ چاہے گا وہی ظہور پذیر ہوگا۔''

حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے فرمایا۔ ''میرے پیرومرشد حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادریؒ دہلی میں شاہی منصب دار ہیں۔ تم ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔''

حضرت سلطان باہوؒ نے حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ سے اجازت لی اور دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ''مناقب سلطانی'' کے مصنف حضرت سلطان حامدؒ خود بھی ایک عالم و فاضل صوفی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت سلطان باہوؒ کے پڑپوتے تھے۔ یہ شیخ حامدؒ کا خاندانی معاملہ تھا۔ اس لئے ان کی بیان کردہ روایات دوسروں کے مقابلے میں زیادہ معتبر ہو سکتی ہیں...... مگر کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیخ حامد کے تحریر کردہ واقعات پر قربت و رشتہ داری اور خوش عقیدگی کا رنگ غالب ہے۔

دوسرے یہ کہ جس طرح حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ نے اپنے مرید کی آزمائش کی...... اور جس طرح حضرت سلطان باہوؒ اس آزمائشی مرحلے سے گزرے، یہ سارے واقعات پڑھ کر ایک عام انسان کے ذہن میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ بے شک! تصوف کی کتابوں میں اس سے بھی زیادہ محیر العقول واقعات درج ہیں...... اور اہل اللہ کے نزدیک یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں...... مگر ان تمام حقائق کے باوجود، ایسے واقعات تحریر کر کے نہ تو حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ اور حضرت سلطان باہوؒ کے عارفانہ مقام میں اضافہ کیا جا سکتا ہے...... اور نہ اسلامی تصوف کی کوئی خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔ ہوا میں پرواز کرنے والے بے شمار ہندو جوگی اور سنیاسی گزرے ہیں مگر ہمارے صوفیاء نے ایسے تمام روحانی کمالات کی نفی کی ہے۔ غوث اعظم حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کا مشہور قول ہے۔

''اگر کوئی شخص تمہیں ہوا میں بھی اُڑتا ہوا نظر آئے تو اس کی روحانیت کا اعتبار نہ کرنا، جب تک اس کا ہر عمل شریعت اور سنّت کے تابع نہ ہو۔''

مختلف تذکرہ نگاروں نے تحریر کیا ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ شریعت و سنّت کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ ہمارے نزدیک یہی آپ کی روحانی عظمت کی پہلی اور آخری دلیل ہے۔ رہا آپ کے خصوصی روحانی مشاہدات اور مکاشفات کا معاملہ تو انہیں اس طرح بیان کرنا مناسب نہیں۔ حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ کا ایک برہمن کے لباس میں ظاہر ہونا اور ہندوؤں کے تلک لگانے کا واقعہ خواہ کتنا ہی درست ہو مگر یہ کتابوں میں تحریر کرنے اور مجلسوں میں بیان کرنے کی چیز نہیں۔ اسی بے احتیاطی اور خوش عقیدگی کے باعث پاک و ہند میں لکھی جانے والی کتابوں میں ایسے واقعات کا انبار جمع ہے جو اسلامی تصوف سے کسی طرح بھی میل نہیں کھاتے بلکہ اکثر واقعات پر طلسمی داستانوں کا گمان ہوتا ہے۔ فارسی کے مایہ ناز شاعر حافظ شیرازی کا ایک مشہور شعر ہے۔ جس پر ہمارے دور کے بعض صوفیاء سر دھنتے ہیں ؎

حافظا گر وصل خواہی صلح کن باخاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام

''اے حافظ! اگر تو وصل کی خواہش رکھتا ہے تو ہر خاص و عام کے ساتھ صلح اور دوستی کا رویّہ اختیار کر۔ صلح کا طریقہ یہ ہے کہ تو مسلمان کے ساتھ اللہ اللہ اور برہمن کے ساتھ رام رام پکار۔'' (ترجمہ)

یہاں حافظ شیرازی کے اس شعر پر کسی بحث کی گنجائش نہیں۔ مگر اتنا ضروری ہے کہ ایک مسلمان

کے ہونٹوں پر اللہ کے سوا کسی دوسرے معبود کا نام نہیں آ سکتا۔ دیگر مذاہب کے ماننے والوں سے صلح کا طریقہ وہی ہے جو باری تعالیٰ نے خود طے فرمایا ہے۔

''تم دوسروں کے معبودوں کو برا مت کہو۔''

یا پھر سورۃ الکافرون کی یہ آیت مقدسہ کہ......''تم اپنے دین پر اور ہم اپنے دین پر۔''

اللہ اور رام کو مخلوط کر دینا ایک خوفناک نظریۂ حیات ہے جس نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مشائخ کرام کی نظر میں حقیقی صوفی وہی ہے جو اللہ کی شریعت اور سرورِ کونین حضور اکرم ﷺ کی سنّت مبارکہ پر امکانی حد تک عمل کرے......اور اگر کسی مقام پر کوتاہیٔ عمل کا شکار ہو جائے تو خالق کائنات کے سامنے عاجزی کے ساتھ استغفار کرے...... جو کہ اللہ کے تمام نبیوں اور رسولوں کی سنّت رہی ہے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

الغرض حضرت شاہ حبیب اللہ قادریؒ کی ہدایت کے مطابق حضرت سلطان باہوؒ اپنے ایک خادم سلطان حمیدؒ کے ساتھ دہلی کی جانب روانہ ہوئے۔ سلطان حمیدؒ کا تعلق بھکر سے تھا جو بعد میں خلافت کے منصب پر فائز ہوئے۔

ابھی حضرت سلطان باہوؒ راستے میں تھے کہ اچانک ایک مجذوب الحال شخص کسی طرف سے نمودار ہوا......اور اس نے آتے ہی سلطان حمیدؒ کی پشت پر ایک لکڑی ماری۔ اگرچہ لکڑی کی ضرب معمولی تھی لیکن سلطان حمیدؒ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ مجذوب نے دوبارہ اپنا ہاتھ بلند کیا۔ وہ سلطان حمیدؒ کے دوسری لکڑی مارنا ہی چاہتا تھا کہ حضرت سلطان باہوؒ تیزی سے آگے بڑھے اور مجذوب کا ہاتھ پکڑ لیا۔

مجذوب نے شرر بار نظروں سے حضرت سلطان باہوؒ کی طرف دیکھا اور نہایت پُر جلال لہجے میں کہا۔ ''راستے سے ہٹ جاؤ اور ہمارے کام میں مداخلت نہ کر۔''

حضرت سلطان باہوؒ نے نرم لہجے میں فرمایا۔ ''اے صاحب! ہم درویش اہلِ صحو ہیں اور ہمارا تعلق اہلسنّت والجماعت سے ہے۔''

جیسے ہی حضرت سلطان باہوؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، مجذوب نے اپنا اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے کر لیا اور خاموشی کے ساتھ ایک طرف روانہ ہو گیا۔

مجذوب کے جانے کے بعد حضرت سلطان باہوؒ نے سلطان حمیدؒ کی طرف دیکھا جو بدستور زمین پر بے ہوش پڑے تھے۔ حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے خادم خاص پر توجہ فرمائی۔ نتیجتاً کچھ دیر بعد سلطان حمیدؒ ''سکر'' کی حالت سے ''صحو'' کی طرف لوٹے اور مکمل طور پر ہوش میں آ گئے۔

حضرت سلطان باہوؒ نے خوش ہوتے ہوئے فرمایا۔ ''حمید! اگر ہم اس وقت مجذوب کی طرف متوجہ نہ ہوتے اور وہ دوسری لکڑی مار دیتا تو تمہاری پوری زندگی مستی کی حالت میں گزرتی۔ پھر ہم بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔''

☆☆..........☆☆..........☆☆

جب حضرت سلطان باہوؒ دہلی کے قریب پہنچے تو حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادریؒ کی مجلس درس آراستہ تھی۔ مریدین، خدام اور عقیدت مند صفیں باندھے دست بستہ بیٹھے تھے۔ شیخ کی زبان گوہر بار سے اسرار و معانی کی بارش ہو رہی تھی۔ حاضرین پر کیف و سرور کی عجیب کیفیت طاری تھی۔ یکا یک حضرت سید عبدالرحمٰن قادریؒ نے درس روک دیا اور اپنے ایک خادم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''فلاں راستے سے اس حلئے کا ایک درویش آ رہا ہے۔ اسے عزت و احترام کے ساتھ ہماری خانقاہ میں لاؤ۔''

حاضرین مجلس نے بڑی حیرت سے شیخ کی بات سنی۔ ''آخر وہ کون سے بزرگ ہیں جن کی میزبانی اس طرح کی جا رہی ہے؟''

مجلس درس میں موجود ہر شخص کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا کہ حضرت سلطان باہوؒ خانقاہ قادریہ میں داخل ہوئے۔ اہل نظر نے فوراً پہچان لیا کہ آنے والا کون تھا؟ حضرت سلطان باہوؒ کے چہرۂ مبارک سے شان ولایت ظاہر تھی...... مگر جو صاحبان نظر نہیں تھے، انہوں نے آپ کو ایک روایتی درویش سمجھا۔

مناقب سلطانی کے بیان کے مطابق حضرت سلطان باہوؒ نے حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادریؒ اور حاضرین مجلس کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ حضرت شیخؒ جواب دیتے ہوئے اپنی نشست سے اُٹھے اور حضرت سلطان باہوؒ کا ہاتھ پکڑ کر خلوت میں لے گئے۔

حضرت سلطان باہوؒ کی رسم بیعت کس طرح ادا ہوئی، اس کے بارے میں فاضل مصنف خاموش ہیں۔ ''مناقب سلطانی'' میں بس اتنا درج ہے کہ ''حضرت سلطان باہوؒ نے ایک قدم میں اور ایک ہی دم میں اپنا ازلی نصیبہ پا لیا۔'' ازلی نصیبے سے مصنف کی مراد انسانی تقدیر کا وہ حصہ ہے جو روزِ ازل لوح محفوظ میں تحریر کر دیا گیا ہے۔

شیخ سلطان حامدؒ کے بیان کے مطابق حضرت سید عبدالرحمٰن قادریؒ نے حضرت سلطان باہوؒ کو چند لمحوں میں ان کا روحانی حصہ عطا کیا اور اسی وقت خانقاہ سے رخصت کر دیا۔

وہ جمعے کا دن تھا۔ حضرت سید عبدالرحمٰن قادریؒ سے فیضیاب ہونے کے بعد حضرت سلطان باہوؒ دہلی کے بازاروں میں گشت کرنے لگے۔ مناقب سلطانی کی روایت کے مطابق حضرت سلطان باہوؒ نے ہر خاص و عام پر توجہ کی نظر ڈالنی شروع کر دی جس کے نتیجے میں مخلوق خدا بہت زیادہ متاثر ہونے لگی۔ شہر میں ہر طرف غل مچ گیا اور طالبان دید کا اس قدر ہجوم ہوا کہ راستے بند ہو گئے۔

پھر یہ خبر اُڑتے اُڑتے حضرت سید عبدالرحمٰن قادریؒ کی خانقاہ تک بھی پہنچ گئی۔ چند خدام نے حضرت شیخؒ کے حضور میں عرض کیا۔ ''سیّدی! آج کل شہر دہلی میں ایک درویش آیا ہوا ہے اور اس کے فیض روحانی کا چرچا عام ہے۔''

حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادریؒ نے اپنے خدام کی بات سنی اور فرمایا۔ ''وہ درویش دہلی میں کس مقام

پر سکونت پذیر ہیں؟"

خدام نے عرض کیا۔ "درویش کا کوئی مستقل مسکن نہیں۔ وہ دہلی کے بازاروں میں گھومتا رہتا ہے اور کھڑے کھڑے معرفت کی دولت لٹا دیتا ہے۔"

حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادریؒ نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ "اس درویش سے جا کر دریافت کرو کہ وہ کون ہے، کہاں کا رہنے والا ہے، کس خاندان سے ہے اور کس سلسلے سے تعلق رکھتا ہے؟"

حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادریؒ کے خدمت گار پیر و مرشد کے حکم سے دہلی کے بازار میں پہنچے۔ وہاں درویش کے عقیدت مندوں کی بھیڑ جمع تھی اور اس تک پہنچنا ایک کارِ دشوار تھا۔ حضرت شیخ قادریؒ کے خدام نے بڑی مشکل سے جگہ بنائی اور درویش تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے...... مگر جب ان کی نظر درویش کے چہرے پر پڑی تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

درویش کی صورت دیکھتے ہی حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادریؒ کے خدام اُلٹے قدموں واپس آئے اور پیر و مرشد کی خدمت میں عرض کرنے لگے۔ "سیّدی! یہ تو وہی درویش ہے جسے آپ نے آج ہی اپنے حلقۂ بیعت میں شامل فرمایا تھا۔"

اپنے خدمت گاروں کی زبانی یہ انکشاف سن کر حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادریؒ رنجیدۂ خاطر ہوگئے اور آپ کے چہرۂ مبارک سے اذیت و کرب کے آثار جھلکنے لگے۔ پھر آپ نے اپنے خدمت گاروں سے فرمایا۔ "بڑا غضب ہوگیا۔ اس درویش کو فوراً میرے پاس لے کر آؤ۔"

پیر و مرشد کا دوسرا حکم سن کر خدام تیز رفتاری کے ساتھ بازار میں پہنچے اور حضرت سلطان باہوؒ کو اپنے ہمراہ لے کر خانقاہ میں واپس آئے۔

"تم نے یہ کیا کیا؟" حضرت سلطان باہوؒ کو دیکھتے ہی پیر و مرشد نے انتہائی ناخوشگوار لہجے میں فرمایا۔

"سیّدی! کیا خادم سے کوئی غلطی ہوگئی؟" حضرت سلطان باہوؒ نے بصد احترام عرض کیا۔

"کیا ہم نے یہ نعمت خاص تمہیں اس لئے عطا کی تھی کہ تم اسے عام کردو؟" حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادریؒ کے لہجے سے بدستور ناگواری کا رنگ جھلک رہا تھا۔

پیر و مرشد کے اس سوال کے جواب میں حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔ "سیّدی! جب کوئی بوڑھی عورت روٹی پکانے کیلئے بازار سے توا خریدتی ہے تو اسے بجا کر دیکھ لیتی ہے کہ وہ کیسا کام دے گا؟ اسی طرح جب ایک لڑکا کمان خریدتا ہے تو اسے کھینچ کر دیکھ لیتا ہے کہ اس میں مطلوبہ لچک موجود ہے یا نہیں؟ سو مجھے بھی جو نعمت عظمٰی آپ کی ذات گرامی سے حاصل ہوئی تھی، میں اسی کی آزمائش کر رہا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ مجھے آپ سے کس قدر نعمت عطا ہوئی اور اس کی حقیقت کیا ہے؟"

"مناقب سلطانی" کی روایت کے مطابق حضرت سلطان باہوؒ نے مزید فرمایا۔

"آپ نے حکم دیا تھا کہ اسے آزماؤ اور فیض کو عام کرو۔ انشاء اللہ قیامت تک یہ نعمت ترقی پر ہوگی۔"

یہ واقعہ رقم کرنے کے بعد شیخ سلطان حامدؒ تحریر کرتے ہیں کہ حضرت سلطان باہوؒ نے اسی وقت اپنے مرشد کامل سے تازہ مہربانی اور بے اندازہ فیض حاصل کیا۔

ان تمام واقعات میں بعض جگہ بڑا ابہام اور تضاد پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مناقب سلطانی کے مصنف فرماتے ہیں۔ "حضرت سلطان باہوؒ نے مرشد کامل سے اپنا ازلی نصیبہ ایک قدم میں اور ایک ہی دم میں پالیا۔ پھر اسی وقت آپ کو رخصت کردیا گیا اور وہ جمعے کا دن تھا۔"

اگر "ایک قدم اور ایک دم" کے الفاظ محاورتاً استعمال کئے گئے ہیں تو ان کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ نے بہت مختصر مدت میں حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادریؒ سے کسب فیض کیا تھا۔ دوسرے بزرگوں کے حوالے سے ایسی دوسری بہت سی مثالیں تاریخ تصوف میں موجود ہیں۔ اس لئے "مناقب سلطانی" کی روایت میں کوئی ظاہری سقم نظر نہیں آتا...... مگر جہاں تک روایت کے دوسرے حصے کا تعلق ہے، وہ کچھ عجیب سا ہے...... یعنی حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادریؒ نے اسی وقت حضرت سلطان باہوؒ کو رخصت کردیا۔ پھر بیعت سے شرف یاب ہونے کے بعد حضرت سلطان باہوؒ کے بازار میں تشریف لائے اور پیر و مرشد سے حاصل کردہ روحانی دولت کو عوام پر لُٹانے لگے۔ یہاں تک کہ پورے شہر میں شور مچ گیا اور یہ خبر حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادریؒ تک بھی پہنچ گئی۔ پھر حضرت شیخؒ نے صورتحال جاننے کیلئے، اپنے خدمت گاروں کو بازار روانہ کیا۔ راستے بند ہونے کے باوجود خدام حضرت سلطان باہوؒ تک پہنچے اور واپس آکر حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادریؒ کو اطلاع دی کہ یہ تو وہی درویش ہے جسے آج ہی آپ نے تلقین فرمائی تھی۔

واقعات کی کثرت بتا رہی ہے کہ یہ سارے کام چند گھنٹوں میں انجام نہیں پاسکتے۔ حضرت سلطان باہوؒ کے فیض روحانی عام کرنے کی اطلاعات پیر و مرشد تک اس وقت پہنچی تھیں، جب پورا شہر ان خبروں کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ راستے بند ہوجانے اور دہلی کے کوچے کوچے میں دھوم مچ جانے کا مرحلہ چند گھنٹوں میں نہیں، چند مہینوں میں طے ہوا تھا۔ دراصل یہ سارے واقعات اپنی جگہ درست ہیں مگر ان کے درمیان کی کڑی غائب ہیں۔ اس لئے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں ابہام پیدا ہوتا ہے۔

ابہام کے علاوہ ایک روایت میں تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کے جب حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادری نے اپنے خدام کے ذریعے حضرت سلطان باہوؒ کو طلب کرکے دریافت کیا کہ اے درویش! ہم نے تجھے نعمت خاص عطا کی اور تو نے عام کردی...... تو جواب میں حضرت سلطان باہوؒ نے عرض کیا۔

"مجھے آپ نے حکم دیا تھا کہ اسے آزماؤ اور فیض کو عام کرو۔"

اب اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ کتاب کی غلطی ہے یا پھر مناقب سلطانی کے مؤلف سے ترجمے میں کوتاہی سرزد ہوئی ہے؟

حضرت سلطان باہوؒ کے سلسلے میں ہماری سب سے بڑی مجبوری یہ ہے کہ اتنے بڑے بزرگ پر تحقیقی کام بہت کم کیا گیا ہے۔ ہمیں جس قدر بھی حوالے ملتے ہیں، وہ سب کے سب "مناقب سلطانی" سے

ماخوذ ہیں۔ ''پنجاب کے صوفی دانشور'' ایک قابل قدر تصنیف ہے مگر اس کے مصنف قاضی جاوید بھی ''مناقب سلطانی'' کے دائرے سے باہر نہیں آتے اور اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ جیسی عظیم المرتبت صوفی پر کی جانے والی تحقیق صرف ''مناقب سلطانی'' تک محدود ہے۔

اس کتاب کے مؤلف شاہد القادری صاحب فرماتے ہیں۔ ''مناقب سلطانی'' کے مصنف حضرت شیخ سلطان حامد اپنے جدامجد حضرت شیخ سلطان باہوؒ کے بعد غالباً اپنے خاندان میں پہلی علمی اور روحانی شخصیت ہیں جنہوں نے سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ کے حالات و واقعات اور آپ کی تعلیمات کو کتابی شکل میں جمع کر کے آئندہ نسلوں پر احسان فرمایا ہے۔ ''مناقب سلطانی'' حضرت سلطان باہوؒ کے حالات زندگی پر سب سے پہلی کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی جامع، مستند اور وقیع ہے آپ نے اس کتاب میں حتی الامکان صحیح ترین حالات کو پوری تحقیق کے ساتھ منضبط فرمایا ہے اور بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت سلطان العارفین سلطان باہوؒ کے حالات و واقعات پر قلم اُٹھانے والا کوئی بھی مؤرخ اس کتاب کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔''

شاہد القادری صاحب کا یہ دعویٰ حرف بہ حرف درست ہے۔ مضمون لکھتے وقت خود میرے سامنے بھی کئی اہم کتابیں اور بہت سے مضامین موجود ہیں مگر کسی ایک کتاب یا تاریخی دستاویز میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مصنفین کے انداز و بیان ضرور مختلف ہیں، مگر حالات و واقعات یکساں ہیں۔ کسی مصنف یا تذکرہ نگار نے کسی نئی تحقیق کا دعویٰ نہیں کیا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ کے حوالے سے ہمارے محققین کا سفر ''مناقب سلطانی'' کے پہلے ورق سے شروع ہوتا ہے اور آخری صفحے پر ختم ہوجاتا ہے۔ اس لئے تمام تذکرے اور تاریخیں یکسانیت کا شکار ہیں۔

''مناقب سلطانی'' کے دیباچے میں آگے چل کر شاہد القادری فرماتے ہیں۔ یہ کتاب آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل فارسی زبان میں لکھی گئی تھی اب تک صرف ایک ادارے نے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا جو نامکمل تھا اور اس میں تقریباً پچاس صفحات کا اردو ترجمہ غائب تھا۔ اب بحمد اللہ تعالیٰ حضرت سلطان غلام جیلانیؒ کے والد محترم حضرت شیخ محمد امیر سلطانؒ کے زیر مطالعہ رہنے والے اصل فارسی نسخے کے مطابق حرف بہ حرف شائع کرنے کا شرف مکتبۂ سلطانیہ کو حاصل ہورہا ہے۔

میرے پیش نظر بھی یہی شائع شدہ نسخہ ہے جس میں قدم قدم پر کتابت کی غلطیاں موجود ہیں۔ جس کی وجہ سے کہیں کہیں قاری اُلجھ جاتا ہے چونکہ ''مناقب سلطانی'' کا ترجمہ فارسی سے کیا گیا ہے، اس لئے اردو ترجمے میں سلاست و روانی بھی مفقود ہے اور کہیں کہیں تسلسل کا بھی فقدان نظر آتا ہے۔

''مناقب سلطانی'' کی تصنیف و تالیف کی مختصر تاریخ بیان کرنے کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

☆☆.............☆☆.............☆☆

''مناقب سلطانی'' کے مصنف نے تو یہی تحریر کیا ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ نے ایک دم اور ایک قدم میں حضرت سید عبدالرحمٰن قادریؒ سے فیض روحانی حاصل کیا اور پھر ایک ہی دن میں اس فیض

روحانی کو عوام میں لٹا دیا اور اسی روز مغل شہنشاہ محی الدین اورنگزیب عالمگیر کو ہدایت فرمائی اور اسی روز کھڑے کھڑے اورنگزیب کی درخواست پر ایک کتاب ''اورنگ شاہی'' تحریر کرائی اس کتاب کی تفصیلات آگے پیش کی جائیں گی۔

''مناقب سلطانی'' کی روایت سے قطع نظر، حالات و واقعات کی کثرت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ نے کچھ عرصے تک دہلی میں قیام فرمایا تھا۔ اسی دوران یہ واقعہ پیش آ گیا جس سے حضرت سلطان باہوؒ کے تصرف روحانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک دن سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ ایک کشادہ راستے پر لیٹے ہوئے تھے اچانک اسی راہ سے ہندو سنیاسیوں کی ایک جماعت گزری حضرت سلطان باہوؒ کو راستے میں لیٹا ہوا دیکھ کر ہندو سنیاسی رک گئے پھر ایک ہندو جوگی نے آپ کو ٹھوکر سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''سو رہے ہو؟''

''مردان حق سوتے میں بھی جاگتے ہیں۔'' حضرت سلطان باہوؒ نے لیٹے لیٹے فرمایا۔

''تو پھر اُٹھو اور ہمیں بتاؤ کہ یہ راستہ کس طرف جاتا ہے؟'' ہندو سنیاسیوں نے کہا۔

حضرت سلطان باہوؒ نے اُٹھتے ہی فرمایا۔ ''راستہ تو ایک ہی ہے لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔''

ہندو سنیاسی ضرب لا الہ الا اللہ کو برداشت نہ کرسکے اور خوف و دہشت کے سبب زمین پر گر پڑے۔

''میں نے تمہیں راستہ بتا دیا۔'' حضرت سلطان باہوؒ نے ہندو جوگیوں کی حالت دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ''اب تم کس راستے پر جانا چاہتے ہو؟''

''آپ نے جس راستے کی طرف اشارہ کیا ہے، اسی پر چلیں گے۔'' ہندو سنیاسیوں نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

حضرت سلطان باہوؒ نے ہندو جوگیوں پر خصوصی توجہ فرمائی۔ بت پرستوں کے اس گروہ نے اسی وقت اپنے ماتھوں سے قشقے کے نشانات کھرچ ڈالے اور کافرانہ لباس اُتار کر پھینک دیا۔

روایت ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ کی نظر کرم سے وہ تمام ہندو سنیاسی خدائے واحد پر ایمان لائے اور روحانی سفر اس طرح طے کیا کہ سب کے سب ابدال کے مرتبے پر فائز ہوئے۔

☆☆.............☆☆.............☆☆

مرشد کامل حضرت سید عبدالرحمٰن قادریؒ سے فیضیاب ہونے کے بعد حضرت سلطان باہوؒ کے جذبات کی وارفتگی میں مزید اضافہ ہوگیا آپ پر ہمہ وقت ایک اضطراب کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ پھر یہی اضطراب روحانی حضرت سلطان باہوؒ کو پہاڑوں، جنگلوں اور سنسان مقامات کی طرف لے جاتا تھا۔ مشائخ کرام کے مطابق ''سیر و سیاحت'' فقراء اور درویشوں کے اعلیٰ مقامات میں سے ہے۔ ''سیر و سیاحت'' کی فضیلت کے بارے میں حضرت امام غزالیؒ اپنی شہرۂ آفاق تصانیف ''احیائے العلوم'' اور ''کیمیائے سعادت'' میں تحریر فرماتے ہیں۔

''درویشوں کیلئے پہاڑوں، بیابانوں اور جنگلوں کی سیاحت اس لئے ضروری ہے کہ ہر درخت کے پتے پر اسرار الٰہی میں سے ایک راز لکھا ہوتا ہے۔ درویش ''علم لدنی'' کے ذریعے ان رازوں کو سمجھتے

ہیں اور علوم باطنی کی تکمیل کرتے ہیں، پہاڑوں اور پتھروں پر تحریر شدہ ''علوم الٰہی'' کا مطالعہ کرتے ہیں پھر شجر وحجر (درخت اور پتھر) علوم الٰہی کے اسرار ورموز کے بارے میں درویشوں سے گفتگو اور مکالمہ کرتے ہیں۔ اولیائے کرام سیر وسیاحت کے ذریعے ایک حال سے دوسرے حال میں ترقی کرتے ہیں چنانچہ ''ذات الٰہی'' کے علم کی کوئی حد نہیں ہے اور یہ درویش بھی علم باطنی کے حصول اور ''سیر فی الذات'' کرنے کیلئے زیادہ مطالعہ کرتے ہیں تاکہ ''سیر فی الذات'' کے احوال اور مقامات سے محروم نہ رہ جائیں۔''

تصوف کی اصطلاح میں علم دو قسم کے ہوتے ہیں ایک اکتسابی جو ظاہری کوششوں اور اساتذہ کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے دوسرا علم لدنی...... جس پر انسان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہ علم اللہ تعالیٰ کی عطائے خاص ہے جو بندوں کو کسی ظاہری کوشش اور سبب کے بغیر بخشا جاتا ہے۔ دوسرے صوفیائے کرام کی اسی طرح حضرت سلطان باہوؒ کو بھی علم لدنی حاصل تھا اگرچہ آپ کی سیر وسیاحت صرف برصغیر پاک وہند کے علاقوں تک محدود تھی، لیکن پھر بھی حضرت سلطان باہوؒ کی حیات مبارک کا بیشتر وقت سیر وسیاحت میں گزرا اور اس دوران آپ نے بے شمار مشاہدات کئے ہیں اور بہت سے لوگوں کو اپنی باطنی نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

ایک بار حضرت سلطان باہوؒ کا گزر پنجاب کے علاقے میں دامان کوہ مغربی جبلِ اسود کی طرف ہوا جہاں آپ نے ایک نوعمر لڑکے کو دیکھا جو گائیں چرا رہا تھا۔ حضرت سلطان باہوؒ نے اس لڑکے پر نظر ڈالی وہ گائیں چرانا بھول گیا اور آپ کے گرد پروانہ وار رقص کرنے لگا۔

پھر جب حضرت سلطان باہوؒ نے اس لڑکے پر دوسری نظر ڈالی تو وہ ہوش میں آ گیا۔ حضرت باہوؒ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے کچھ دور چلنے کے بعد آپ نے مڑ کر دیکھا وہ گوالا لڑکا بھی خاموشی کے ساتھ حضرت سلطان باہوؒ کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

''لڑکے! تم اپنا کام کرو اور ہمیں اپنا کام کرنے دو۔'' حضرت سلطان باہوؒ نے لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اب میرا یہاں کیا کام ہے؟'' لڑکے نے عرض کیا۔

''تمہاری ان گایوں کا کیا ہوگا؟'' حضرت سلطان باہوؒ نے لڑکے سے پوچھا۔

''جس کے جانور ہیں وہ جانیں۔'' لڑکے پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

حضرت سلطان باہوؒ نے لڑکے کو بہت سمجھایا مگر وہ واپس جانے کیلئے تیار نہیں تھا۔ آخر حضرت شیخؒ اسے اپنے ساتھ لے کر کوہ شال کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس لڑکے کا نام کھتران تھا جو آگے چل کر حضرت سلطان نورنگؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔

پھر حضرت سلطان باہوؒ کوہ شالی کے جنگلوں سے گزر کر ایک زرخیز پہاڑی علاقے میں تشریف لے گئے جس کا نام ''کلر کہار'' تھا اس جگہ کی سرسبزی وشادابی دیکھ کر حضرت سلطان باہوؒ پر جذب کی

کیفیت طاری ہو گئی۔

پھر آپ کی یہ کیفیت تین دن اور تین رات تک جاری رہی۔ اس ویران اور غیر آباد علاقے میں نہ کھانے کا انتظام تھا اور نہ پانی کا...... حضرت سلطان باہوؒ کے مرید حضرت سلطان نورنگ کھترانؒ اپنی ریاضت اور مجاہدے کے ابتدائی مرحلے سے گزر رہے تھے اس لئے بھوک اور پیاس کی شدت برداشت نہ کر سکے اور مضطرب ہو کر شیخ کی خدمت عالیہ میں فریاد کرنے لگے۔ ''الجوع الجوع العطش العطش۔'' (بھوک بھوک...... پیاس پیاس)۔

حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے مرید کی فریاد سن کر مراقبے سے سر اُٹھایا اور آنکھیں کھول کر حضرت سلطان نورنگ کھترانؒ کی طرف دیکھا۔ ''فرزند! کیا بات ہے؟''

''شیخ! اب بھوک اور پیاس برداشت نہیں ہوتی۔'' حضرت سلطان نورنگ کھترانؒ نے انتہائی مضطرب لہجے میں عرض کیا۔

حضرت سلطان باہوؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''برات عاشقاں برشاخ آہو'' (عاشقوں کا حصہ ہرن کے سینگوں پر ہوتا ہے۔) (ترجمہ)

جیسے ہی حضرت سلطان باہوؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، پہاڑ کے ایک گوشے سے ایک ہرن برآمد ہوا جس کے سینگوں پر کھانے کا خوان رکھا ہوا تھا اور اس کی گردن میں پانی سے بھرا ہوا آب خورہ لٹک رہا تھا۔

حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے مرید کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ ''اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں سے افطار کرو۔'' یہ کہہ کر حضرت سلطان باہوؒ نے خود بھی افطار فرمایا۔

حضرت سلطان نورنگؒ تیس سال تک اپنے پیر ومرشد کی خدمت میں رہے۔ سفر وحضر میں شیخ کی اس قدر خدمت کی کہ محبوبیت کی منزل تک پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ حضرت سلطان باہوؒ نے آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت سلطان باہوؒ کے اسی قول مبارک سے حضرت نورنگ کھترانؒ کی روحانی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت سلطان باہوؒ نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا کرتے تھے۔

''جتھ اعوان، تتھ کھتران۔'' یعنی جہاں اعوان پہنچا، وہیں کھتران پہنچ گیا۔

حضرت سلطان باہوؒ کا تعلق قبیلۂ اعوان سے تھا چنانچہ اس قول مبارک کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں حضرت سلطان باہوؒ خود پہنچے، وہیں اپنے مرید صادق کو بھی پہنچا دیا۔ ''کھتران'' حضرت سلطان نورنگؒ کی برادری کا نام ہے۔

جب حضرت سلطان نورنگؒ کو عرفان حاصل ہو گیا تو آپ نے اپنے پیر ومرشد حضرت سلطان باہوؒ کے فرمائے ہوئے اس مصرع ''برات عاشقاں برشاخ آہو'' کو مکمل شعر میں ڈھال دیا۔

عجب دیدم تماشا شیخ باہو!
برات عاشقاں بر شاخ آہو

(''اے شیخ باہو! میں نے عجیب تماشا دیکھا کہ عاشقوں کا حصہ ہرن کے سینگ پر تھا۔'' (ترجمہ)

واضح رہے کہ "برات برآہو" فارسی زبان کا ایک محاورہ بھی ہے جس کا مفہوم ہے۔ "زبانی جمع خرچ، جھوٹے وعدے۔" مگر جب ہم حضرت سلطان باہوؒ کے حوالے سے اس مصرع کا مطلب سمجھنا چاہیں گے تو وہی مفہوم ہوگا کہ عاشقوں کا حصہ ہرن کے سینگ پر ہوتا ہے۔

حضرت سلطان نورنگؒ کا مزار مبارک "جبلِ اسود" کے دامن میں ڈیرہ اسماعیل خان کے نزدیک قبضہ "دھوآ" میں آج بھی زیارت گاہ خاص وعام ہے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

ایک بار کا ذکر ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ چند درویش ساتھیوں کے ہمراہ ڈیرہ غازی خان کی طرف سفر کر رہے تھے۔ راستے میں "چھبری" نام کا ایک گاؤں پڑتا تھا۔ یہ گاؤں اس علاقے کے مشہور بزرگ عادل غیاث الدین تیغ براںؒ کے روضۂ مبارک کے قریب ہے جب حضرت سلطان باہوؒ یہاں پہنچے تو چاشت کا وقت تھا۔ ساتھی درویشوں نے عرض کیا۔

"اگر حکم ہو تو کچھ دیر گاؤں میں ٹھہر کر روٹی پکالیں۔"

حضرت سلطان باہوؒ نے اجازت دیدی اور اس عورت کے گھر تشریف لے گئے جو مسافر درویشوں کی خدمت کیا کرتی تھی۔

حضرت شیخؒ کے ساتھی درویش اس عورت کے ساتھ مل کر کھانا پکانے میں مشغول ہوگئے۔ عورت کی ایک شیر خوار بچی گہوارے میں سوئی ہوئی تھی۔ اتفاق سے وہ اس وقت جاگ گئی جب ماں کام میں مصروف تھی۔ بچی نے بیدار ہوتے ہی رونا شروع کر دیا۔ عورت کام چھوڑ کر بچی کے پاس نہیں جاسکتی تھی۔ اس لئے وہیں بیٹھے بیٹھے حضرت سلطان باہوؒ سے مخاطب ہوئی۔

"بابا! میری بچی کے پنگھوڑے کو ہلا دے تاکہ یہ خاموش ہو جائے اور میں اطمینان سے اپنا کام کرسکوں۔"

حضرت سلطان باہوؒ آگے بڑھے اور بچی کے گہوارے کو آہستہ آہستہ ہلانے لگے اور ساتھ ہی ساتھ بلند آواز میں "اللہ ہو، اللہ ہو" کہتے رہے۔ بچی خاموش ہو کر سوگئی۔

پھر جب وہ عورت اپنے کام سے فارغ ہوئی تو اس نے حضرت سلطان باہوؒ سے کہا۔ "بابا تیرا شکریہ، تیری وجہ سے میری بچی سوگئی اور میں نے اپنے سارے کام ختم کر لئے۔"

حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا۔ "مائی! ہم نے صرف گہوارے ہی کو جنبش نہیں دی ہے بلکہ تیری بچی کے دل کو بھی جنبش دیدی ہے اور ایسی جنبش دی ہے کہ قیامت تک اس میں کمی نہیں آئے گی بلکہ زیادتی ہی ہوتی رہے گی۔"

پھر ایسا ہی ہوا۔ حضرت سلطان باہوؒ تو اپنے سفر پر روانہ ہوگئے مگر ایک مردِ حق کی نظر کیمیا اثر نے شیر خوار بچی کی کایا ہی پلٹ دی۔ یہ بچی جوان ہو کر حضرت فاطمہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ حضرت فاطمہؒ کا تعلق بلوچوں کے قبیلے مستوئی سے تھا۔ آپ کا مزار مبارک قصبہ فتح خان اور قلعہ گڑانگ کے قریب ہے۔ آج بھی لاکھوں زائرین فاتحہ خوانی کیلئے حضرت فاطمہؒ کے روضے پر جاتے ہیں۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

حضرت سلطان باہوؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ جسے بھی خصوصی توجہ کے ساتھ ایک بار دیکھ لیتے، اس پر روحانی فیوض و برکات کے دروازے کھل جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے بطور خاص آپ کو یہ صفت بخشی تھی۔ ہم مضمون کے ابتداء میں ذکر کر چکے ہیں کہ عالم طفلی میں بھی حضرت سلطان باہوؒ کی نظر کیمیا اثر کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی بت پرست کو دیکھ لیتے تو وہ اپنے صنم خانۂ دل سے ایک ایک باطل معبود کو نکال کر پھینک دیتا اور کلمۂ طیبہ پڑھ کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو جاتا۔

ایک بار حضرت سلطان باہوؒ درویشوں کے ساتھ سیر و سیاحت کرتے ہوئے علاقہ سنگھڑ سے گزرے جہاں ایک صاحب حال بزرگ حضرت شیخ اسماعیل قریشیؒ سکونت پذیر تھے۔ حضرت شیخ اسماعیل قریشیؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے، حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ کے خلیفہ، حضرت شیخ موسیٰ والاؒ کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت سلطان باہوؒ سنگھڑ سے گزر کر جھنگ تشریف لے گئے اور وہاں رات کو ایک مسجد میں قیام فرمایا۔ اتفاق سے ایک سات سالہ بچہ لعل شاہ، مسجد میں آیا اور حضرت سلطان باہوؒ کے سامنے سے گزرا۔ آپ نے نظر بھر کر لعل شاہ کی طرف دیکھا وہ اپنا سارا کام بھول گیا اور رات بھر حضرت سلطان باہوؒ کی خدمت میں بیٹھا رہا۔

حضرت سلطان باہوؒ نے کئی بار فرمایا۔ "بچے! تم اپنے گھر جاؤ تمہارے ماں باپ پریشان ہوں گے۔"

لعل شاہ نے بڑے غمزدہ لہجے میں عرض کیا۔ "میرے لئے کوئی پریشان نہیں ہوگا اب وہی میرا گھر ہے جہاں آپ ہیں۔"

صبح ہوئی تو لعل شاہ کے عزیز دار اسے تلاش کرتے ہوئے مسجد پہنچے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ لعل شاہ، حضرت سلطان باہوؒ کی خدمت میں حاضر ہے۔ عزیزوں نے بہت منت سماجت کی مگر لعل شاہ کسی طرح بھی اپنے گھر جانے پر رضامند نہیں ہوا۔

عزیز و اقارب نے واپس جا کر لعل شاہ کے والد حضرت شیخ بڈھن شاہؒ کو صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ شیخ بڈھنؒ، حضرت شیخ اسماعیلؒ کی اولاد میں سے تھے۔ یہ خبر سن کر شیخ بڈھنؒ اپنے مریدوں اور دوستوں کے ساتھ مسجد میں حاضر ہوئے اور حضرت سلطان باہوؒ سے عرض کرنے لگے۔

"شیخ! اس بچے کو اجازت دیں کہ یہ اپنے گھر چلا جائے، لعل شاہ کی ماں بہت پریشان ہے۔"

جواب میں حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا۔ "بڈھن شاہ! یہ بچہ تمہاری ملکیت نہیں بلکہ حق تعالیٰ نے اس کا فیض اور نصیب میرے سپرد فرمایا ہے تم واپس جاؤ اب میں ہی لعل شاہ کی تربیت کروں گا۔"

شیخ بڈھنؒ پر حضرت سلطان باہوؒ کا اس قدر رعب طاری ہوا کہ وہ دست بستہ عرض کرنے لگے۔

"شیخ! اب لعل شاہ آپ ہی کے سپرد ہے۔" یہ کہہ کر شیخ بڈھنؒ واپس چلے گئے۔

شیخ بڈھن شاہؒ کا تعلق بزرگوں کے خانوادے سے تھا اور وہ ایک امیر و کبیر شخص تھے۔ شیخ بڈھن شاہؒ نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکا لعل شاہ تھا۔ دوسری بیوی نے آتے ہی شوہر

کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا تھا۔ نتیجتاً شیخ بڈھن شاہؒ نے اپنی پہلی بیوی اور لڑکے لعل شاہ کو لاوارثوں کی طرح گھر کے ایک گوشے میں ڈال دیا تھا۔ جب لعل شاہ کی ماں کو بیٹے کا حال معلوم ہوا تو اس نے حضرت سلطان باہوؒ کی خدمت میں پیغام بھیجا۔ ''شیخ! لعل شاہ میرا ایک ہی بیٹا ہے جس کے سہارے میں اپنی زندگی کے دن گزار رہی ہوں اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں بھی حاضر ہو کر بیٹے کے ساتھ رہوں۔''

جواب میں حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا۔ ''تم ایک پردہ دار خاتون ہو، اطمینان سے گھر کی چار دیواری میں بیٹھی رہو۔''

لعل شاہ کی والدہ نے دوبارہ اپنے ملازم کی زبانی حضرت سلطان باہوؒ کی خدمت میں عرض کیا۔

''جب آپ کا فیض روحانی عام ہے تو پھر مجھے اس نعمت سے کیوں محروم رکھتے ہیں۔''

لعل شاہ کی والدہ کی درخواست سن کر حضرت سلطان باہوؒ نے ایک غمزدہ عورت پر توجہ کی اور ملازم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اپنی مالکہ سے کہو کہ ان کیلئے سورۂ مزمل کا ورد کافی ہے، اللہ مدد کرے گا۔''

حضرت شیخ اسماعیلؒ کے اہل خاندان کی روایت ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ کے اجازت دیتے ہی لعل شاہ کی والدہ صاحب حال ہو گئیں۔ اس روز کے بعد سے ہر وقت ان کی زبان پر سورۂ مزمل کا ورد جاری رہتا تھا۔ دنیاوی کاموں سے بے نیاز ہو گئی تھیں اور دن رات جذب و استغراق کی حالت میں رہتی تھیں۔ اگر کبھی روٹی پکانی پڑ جاتی تو وہ توے پر پڑے پڑے جل جاتی۔

کچھ دن بعد حضرت سلطان باہوؒ، لعل شاہؒ کو لے کر اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو گئے اور اپنے ایک خادم کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ ''میرا کوزہ، مصلّے اور مسواک لعل شاہ کے حوالے کردو۔''

حضرت لعل شاہؒ تیس سال تک پیرومرشد کی خدمت میں رہے۔ اس طویل مدت میں صرف ایک سیاہ کمبل آپ کا لباس تھا جس کا آدھا حصہ زمین پر بچھا کر اسے بستر بنا لیتے تھے اور آدھے حصے کو چادر کے طور پر اوڑھ لیتے تھے۔ حضرت لعل شاہؒ ہمیشہ ننگے سر اور ننگے پیر رہا کرتے تھے۔

پھر جب تیس سال بعد خلافت سے سرفراز ہو کر حضرت لعل شاہؒ رخصت ہونے لگے تو آپ نے پیرومرشد سے عرض کیا۔ ''سیّدی! مجھے کوئی تبرک عطاء کیجئے۔''

حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا۔ ''جو کچھ لینا چاہتے ہو، لے لو۔''

جواب میں حضرت لعل شاہؒ نے عرض کیا۔ ''میں آپ کے کوزے، مصلّے اور مسواک کا امین رہا ہوں ان ہی میں سے کوئی چیز عنایت کر دیجئے تا کہ منزل فراق میں آپ کی کوئی نشانی میرے پاس رہے۔''

حضرت سلطان باہوؒ نے اپنی استعمال شدہ مسواک حضرت لعل شاہؒ کو عنایت کر دی۔

حضرت سلطان باہوؒ کے پڑپوتے اور ''مناقب سلطانی'' کے مصنف حضرت شیخ سلطان حامدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس مسواک کو دیکھا ہے وہ پیلو کے درخت کی تھی اس کا منہ ایسا تھا جیسے مسواک کو تازہ تازہ نچوڑا گیا ہو۔

شیخ سلطان حامدؒ نے اپنے پردادا محترم کی عطاء کردہ وہ مسواک کو تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد دیکھا تھا اس قدر طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی مسواک میں تازگی کا پایا جانا، حضرت سلطان باہوؒ کی کرامت کی روشن دلیل ہے، یہ مسواک آج بھی حضرت سلطان باہوؒ کے گھرانے میں بطور تبرک موجود ہے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

حضرت سلطان باہوؒ کے خلیفہ حضرت سلطانؒ فرماتے ہیں۔

''ایک بار پیرومرشد بھکر کے مقام پر شمال کی طرف سفر کر رہے تھے کہ میں بھی حضرت شیخؒ کے ہمراہ تھا۔ چلتے چلتے پیرومرشد ''دامن چول'' میں ایک ویران ٹیلے پر پہنچے اور ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ ابھی حضرت شیخؒ کو بیٹھے ہوئے بمشکل چند لمحے گزرے ہوں گے کہ آپ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''سیّدی! کیا بات ہے؟'' سلطان حمیدؒ نے عرض کیا۔

''حمید! اس ٹیلے سے جلدی اُترو یہ کسی ظالم کا مکان ہے۔'' حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا اور اس ٹیلے سے اُتر کر ریت کے میدان میں قیام فرمایا۔ پھر کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے سلطان حمیدؒ کے زانو پر سر مبارک رکھ کر لیٹ گئے۔

جب حضرت سلطان باہوؒ ''دامن چول'' کے ریتیلے میدان میں آرام فرما رہے تھے تو سلطان حمیدؒ کو خیال گزرا۔ ''کاش! میرے پاس بھی مال و زر ہوتا تو میں بھی اپنے مرشد اور ہادی کیلئے اطلس اور مخمل کا بستر بنواتا، چونکہ میں مفلس و نادار ہوں، اس لئے میری وجہ سے حضرت شیخؒ کا جسم مبارک خاک آلود ہو رہا ہے۔''

ابھی سلطان حمیدؒ دل ہی دل میں اپنی غربت اور محرومی پر اظہار افسوس کر ہی رہے تھے کہ حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے مرید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''حمید! اپنی آنکھیں بند کرلو پھر جو کچھ تمہیں نظر آئے، مجھے بتاؤ۔''

سلطان حمیدؒ نے پیرومرشد کے حکم کے مطابق جیسے ہی آنکھیں بند کیں، رنگ و نور کی ایک عجیب محفل نظر آئی۔ سلطان حمیدؒ بہ نفس نفیس اس محفل میں موجود تھے اور سامان آرائش کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک محفل کا صدر دروازہ کھلا اور ایک نہایت حسین و جمیل عورت نمودار ہوئی۔ وہ عورت سر سے پاؤں تک جڑاؤ زیور سے آراستہ تھی، مختلف اقسام کے ہیروں کی چمک دمک نے عورت کے ظاہری حسن میں مزید اضافہ کر دیا تھا، عورت بڑے ناز و ادا کے ساتھ سلطان حمیدؒ کی طرف بڑھی اور قریب پہنچ کر والہانہ انداز میں کہنے لگی۔

''اس دنیا میں بے شمار مرد ہیں جو میری طلب رکھتے ہیں مگر میں تمہاری طلب رکھتی ہوں اس لئے خود چل کر تمہارے پاس آئی ہوں تم مجھ سے نکاح کرلو۔''

عورت کی زبان سے دل بستگی کی باتیں سن کر سلطان حمیدؒ گھبرا گئے اور دبی زبان میں کہنے لگے۔

''دور ہو جا! میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جا۔''

''میں دنیا والوں کو ٹھکراتی ہوں اور تم مجھے ٹھکرا رہے ہو؟'' عورت نے بڑے تعجب سے کہا۔

''چلی جا! یہاں سے چلی جا!'' سلطان حمیدؒ بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگے تھے۔ ''یہ انتہائی ادب کا مقام ہے میں اپنے پیرومرشد کی خدمت میں حاضر ہوں یہاں سے دور ہو جا! دور ہو جا!''

ابھی سلطان حمیدؒ کے اس خوبصورت عورت سے یہ مکالمات جاری تھے کہ حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے مرید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''بس حمید! آنکھیں کھول دو۔''

پھر جیسے ہی حضرت شیخؒ کے حکم پر سلطان حمیدؒ نے آنکھیں کھولیں، وہ دلکش محفل اور وہ ہوشربا عورت غائب تھی۔

''حمید! ابھی تم کہاں تھے اور تم نے کیا دیکھا؟'' حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے مرید سے پوچھا۔

سلطان حمیدؒ نے سر جھکائے ہوئے تمام واقعہ سنا دیا۔

حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا۔ ''حمید! تم کچھ دیر پہلے مال و دنیا نہ ہونے کی دل ہی دل میں شکایت کر رہے تھے اور اپنی اس محرومی پر اظہارِ افسوس بھی کیا تھا۔''

''سیّدی درست فرماتے ہیں۔'' سلطان حمیدؒ کی گردن کچھ اور جھک گئی۔

''ابھی ابھی تم نے جو کچھ دیکھا، وہ دنیا ہی تو تھی جو اپنے پیروں سے چل کر تمہارے پاس آئی تھی۔'' حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا۔ ''پھر تم نے دنیا کو قبول کیوں نہیں کیا؟ اگر قبول کر لیتے تو تمہارا گھر بھی مال و زر سے بھر جاتا۔''

سلطان حمیدؒ نے عرض کیا۔ ''سیّدی! میں اللہ تعالیٰ سے اس کی ذات کا نور چاہتا ہوں تاکہ میری روح، دل اور دماغ روشن ہو جائیں۔ میں مال و دولت کی خواہش نہیں رکھتا اسی لئے میں نے عورت کی پیشکش قبول نہیں کی۔''

''تو پھر حق تعالیٰ کی بخشش و عطا پر راضی ہو جاؤ۔'' حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا۔ ''فقرِ محمدیؐ کا اثر تمہارے خاندان سے نہیں جائے گا۔''

پھر ایسا ہی ہوا حضرت شیخ سلطان حمیدؒ نے اپنی پوری زندگی فقر و قناعت میں بسر کی۔ آپ کے بعد آپ کی اولاد اور نسل پر بھی فقر و قناعت ہی کا رنگ غالب رہا۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

ایک بار حضرت سلطان باہوؒ شہر بھکر تشریف لے گئے۔ اس وقت وہاں ایک صاحب کشف بزرگ حضرت شیر شاہؒ سکونت پذیر تھے۔ حضرت شیر شاہؒ کے مرید اور خلیفہ شیخ سلطان طیبؒ تھے جو اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ شیخ طیبؒ نے اپنے مرشد حضرت شیر شاہؒ سے بھی اس سلسلے میں کئی بار دعا کرائی تھی مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا پھر جب شیخ سلطان طیبؒ نے حضرت سلطان باہوؒ کی آمد کی خبر سنی تو آپ خدمت عالیہ میں حاضر ہو کر دعا کے طالب ہوئے۔

اس وقت حضرت سلطان باہوؒ کے پاس دو سیب رکھے ہوئے تھے۔ شیخ سلطان طیبؒ کی درخواست سن کر حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا۔ ''یہ دونوں سیب لے جا کر اپنی بیوی کو کھانے کے

لئے دیدو حق تعالیٰ تمہیں دو فرزند عطا کرے گا، ان فرزندوں میں سے ایک تمہارے لئے ہوگا اور دوسرا ہمارے لئے......''

''شیخ! میں ان دونوں فرزندوں میں تفریق کیسے کروں گا۔'' سلطان طیبؒ نے عرض کیا۔

''یہ تمہارا کام نہیں ہے۔'' حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا۔ ''جو فرزند ہمارے کام کا ہوگا، وہ اپنی نشانی لے کر پیدا ہوگا۔''

شیخ سلطان طیبؒ دونوں سیب لے کر خوشی خوشی چلے گئے ان سیبوں میں سے ایک سیب کچھ داغدار تھا جسے کسی پرندے نے کھا لیا تھا۔

الغرض شیخ سلطان طیبؒ کے دو فرزند پیدا ہوئے۔ آپ نے ایک کا نام سلطان عبد رکھا اور دوسرے کا نام سلطان سوہارا......سلطان عبدؒ پیدائشی مجذوب تھے۔ حضرت سلطان باہوؒ نے اسی نشانی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

''مناقب سلطانی'' کی روایت کے مطابق حضرت سلطان باہوؒ، ذات باری پر توکل فرماتے تھے آپ نے زندگی بھر روزی کمانے کیلئے کوئی دنیاوی شغل اختیار نہیں کیا۔ مغل شہنشاہ شاہجہاں کی طرف سے آپ کے والد محترم سلطان بایزیدؒ کو ایک وسیع جاگیر عطا ہوئی تھی یہ جاگیر پچاس ہزار بیگھے زمین اور اینٹوں کے ایک قلعے پر مشتمل تھی جس میں کئی آباد کنویں جاری تھے، ایک تو وسیع جاگیر کی موجودگی، دوسرے بچپن سے غلبۂ عشق الٰہی...... یہی وہ عوامل تھے جن کے باعث حضرت سلطان باہوؒ فکر دنیا سے آزاد رہے پھر بھی آپ کی حیاتِ مبارکہ میں دو مواقع ایسے نظر آتے ہیں جب آپ نے کاروبار ہستی میں حصہ لینے کی کوشش کی تھی۔ حضرت سلطان باہوؒ نے دو بار کھیتی باڑی کی غرض سے بیلوں کی جوڑی خریدی، پھر خود ہی زمین جوتی مگر جب فصل پکنے کے قریب آئی تو آپ بیلوں کو چھوڑ کر سیر و سیاحت کیلئے کسی طرف نکل گئے۔

جب عزیز و اقارب اور دوستوں میں سے کوئی شخص حضرت سلطان باہوؒ سے اس بے نیازی اور بے رغبتی کی وجہ دریافت کرتا تو آپ نہایت آسودگی اور سرشاری کے لہجے میں فرماتے۔

''فاقے کی رات فقیر کیلئے معراج کی رات ہوتی ہے۔''

ایک اور موقع پر حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا۔

اندروں از طعام خالی دار
تا درآں نور معرفت بنی!

''تو اپنا شکم غذا سے خالی رکھ تاکہ اس میں معرفت کا نور دیکھ سکے۔'' (ترجمہ)

یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے جب حضرت سلطان باہوؒ کھیتی باڑی میں مصروف تھے۔ پنجاب کے کسی دور دراز علاقے میں ایک خاندانی شخص رہا کرتا تھا جس کی کئی بیٹیاں تھیں جو شادی کے قابل ہوگئی تھیں وہ شخص اپنے گھرانے کا بھرم رکھنے کیلئے اُجلا لباس پہنتا تھا جسے دیکھ کر اہلِ محلّہ سمجھتے تھے کہ وہ مالی طور پر

آسودہ حال ہے۔اس شخص کی اسی ظاہری حالت سے متاثر ہوکر اچھے خاندان کے لوگوں نے اس کی بیٹیوں کیلئے رشتے بھیجے تھے مگر وہ اندرونی طور پر اس قابل نہیں تھا کہ بیٹیوں کی شادی کا انتظام کر سکے۔آخر ایک دن وہ اپنے مسائل سے پریشان ہوکر کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''شیخ! میرا تعلق سادات کے خاندان سے ہے میں نے بہت اچھا وقت گزارا ہے مگر اب سفید پوشی کے سوا کچھ بھی باقی نہیں۔لوگ سمجھتے ہیں کہ میں ایک مالدار شخص ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں۔میں اپنی زندگی تو گزار چکا مگر بیٹیوں کا بوجھ برداشت نہیں ہوتا۔قرض خواہ ہر وقت دروازے پر کھڑے رہتے ہیں اب آپ ہی میرے حق میں دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان مشکلات سے نجات دیدے۔''

بزرگ کچھ دیر تک سیّد زادے کی حالت زار پر غور کرتے رہے پھر معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے لگے۔''تمہیں جو بیماری لاحق ہے،اس کی دوا میرے پاس نہیں ہے۔''

''میں تو دعا کیلئے درخواست کر رہا ہوں۔'' سیّد زادے نے اُداس لہجے میں عرض کیا۔

''اب دعا ہی تمہاری دوا ہے......اور میری دعا میں اتنی تاثیر نہیں ہے کہ وہ تمہارے سر اور گھر سے گردش وقت کو ٹال دے۔'' بزرگ نے صاف صاف کہہ دیا۔

''میں نے تو لوگوں سے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔'' بزرگ کا انکار سن کر سیّد صاحب کچھ اور دل شکستہ نظر آنے لگے۔

''وہ لوگوں کا حسن ظن ہے مگر میں تمہیں حقیقت بتا رہا ہوں۔'' بزرگ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔''مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ زمین اللہ کے مستجاب الدعوات بندوں سے خالی ہے میں تمہیں ایک ایسے شخص کا پتا دیتا ہوں جس کی زبان میں بہت تاثیر ہے وہ مرد حق دریائے چناب کے کنارے قصبہ شورکوٹ میں رہتا ہے۔اس کے آستانے پر حاضری دو اللہ تمہاری مشکل آسان کرے گا۔''

سیّد صاحب کے چہرے سے کچھ دیر کیلئے رنج والم کا غبار ڈھل گیا اور وہ تیز آندھیوں میں اُمید کا چراغ جلائے ہوئے شورکوٹ پہنچے۔

اس وقت حضرت سلطان باہوؒ بہت معمولی لباس پہنے ہوئے اپنی زمین پر ہل چلا رہے تھے اگر کوئی اجنبی شخص حضرت شیخؒ کو اس حالت میں دیکھتا تو یہی رائے قائم کرتا کہ ہل چلانے والا کوئی مفلس کسان ہے۔سیّد صاحب نے بھی حضرت سلطان باہوؒ کے بارے میں یہی سوچا اور دل ہی دل میں افسوس کرنے لگے۔

''میرا سفر رائیگاں گیا جو شخص خود اتنا پریشان حال ہو،وہ کسی دوسرے کی کیا مدد کر سکتا ہے۔'' یہی خیال کر کے سیّد صاحب واپس جانے کیلئے مڑے۔

ابھی سیّد صاحب ایک ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ حضرت سلطان باہوؒ کی صدائے دل نواز سنائی دی۔''سیّد! اتنا طویل سفر اختیار کیا اور موسم کی سختیاں برداشت کیں پھر بھی ہم سے ملاقات کئے بغیر واپس جا رہے ہو؟''

اپنا نام سن کر سیّد صاحب حیرت زدہ رہ گئے فوراً گھوڑے کی پشت سے اُترے،بڑی عقیدت کے ساتھ حضرت سلطان باہوؒ کی خدمت میں سلام پیش کیا اور سفر کی وجہ بیان کرنے لگے۔

حضرت سلطان باہوؒ نے بہت غور سے سیّد صاحب کی درخواست سنی پھر نہایت شیریں لہجے میں فرمانے لگے۔''سیّد! تم میرا کام کردو،میں تمہارا کام کئے دیتا ہوں اس لئے کہ کام کا بدلہ کام ہے۔''

سیّد صاحب نے بڑی حیرت سے حضرت سلطان باہوؒ کی طرف دیکھا۔''شیخ! ایک سوالی آپ کے کیا کام آسکتا ہے؟''

''میں اپنے ایک ضروری کام سے فارغ ہوکر ابھی آتا ہوں جب تک تم میرا ہل چلاؤ،بس یہی کام ہے۔'' اتنا کہہ کر حضرت سلطان باہوؒ تشریف لے گئے۔

اس دوران سیّد صاحب ہل چلاتے رہے۔حضرت سلطان باہوؒ کی قوت کشف دیکھ کر انہیں یقین ہوگیا تھا کہ وہ یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جائیں گے۔

تھوڑی دیر بعد حضرت سلطان باہوؒ واپس آئے اور اپنے سامنے پڑا ہوا مٹی کا ایک ڈھیلا اُٹھا کر زمین پر مار دیا۔سیّد صاحب نے حضرت سلطان باہوؒ کے اس عمل کو بڑی حیرت سے دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں اردگرد کے سارے ڈھیلے سونا بن گئے تھے۔

''سید! اپنی ضرورت کے مطابق سونا اُٹھالو'' حضرت سلطان باہوؒ نے بے نیازانہ فرمایا۔

سیّد صاحب نے سونا اُٹھالیا۔پھر حضرت سلطان باہوؒ کے دست مبارک کو بوسہ دیتے ہوئے بڑی وارفتگی کے عالم میں یہ شعر پڑھا۔

نظر جنہاں دی کیمیا، سونا کردے وٹ
قوم اتے موقوف نہیں، کیا سیّد کیا جٹ

''جن لوگوں کی نگاہ کیمیا اثر ہے،وہ ایک ہی نظر سے مٹی کو سونا بنا دیتے ہیں،یہ ذات الٰہی کا فیض ہے جو کسی قوم پر موقوف نہیں،خواہ وہ سیّد ہو یا جٹ۔''

☆☆..........☆☆..........☆☆

آخر میں ہم اس واقعے کا ذکر کریں گے جس کا تعلق مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیرؒ سے ہے۔

''مناقب سلطانی'' کی روایت کے مطابق حضرت سیّد عبدالرحمٰن قادریؒ سے بیعت ہونے کے بعد حضرت سلطان باہوؒ نے دولت روحانی کو عام لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کردیا۔اتفاق سے اس روز جمعہ تھا۔حضرت سلطان باہوؒ جامع مسجد دہلی میں نماز پڑھنے کیلئے حاضر ہوئے تو شہنشاہ جہانگیرؒ بھی اپنے ارکان دولت کے ساتھ وہاں موجود تھا۔جامع مسجد میں نمازیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ کہیں بھی تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔حضرت سلطان باہوؒ سب سے آخر میں اس مقام پر کھڑے ہوگئے جہاں لوگ اپنی جوتیاں رکھتے تھے۔

نماز ختم ہوئی تو حضرت سلطان باہوؒ نے حاضرین پر خصوصی توجہ کی تو مسجد میں ایک شور سا مچ گیا اور تمام نمازیوں پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی مگر تین آدمی یعنی اورنگزیب بادشاہ، قاضی شہر اور کوتوال

جذبے کی تاثیر اور نگاہ کے اثر سے غیر مؤثر اور محجوب رہے۔

پھر تینوں حضرت سلطان باہوؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دست بستہ عرض کرنے لگے۔ ''اے ولی اللہ! ہمارا کیا گناہ ہے کہ ہمیں اس نعمت سے محروم رکھا اور ہم پر توجہ نہ دی۔''

شہنشاہ عالمگیرؒ کی اس درخواست کے جواب میں حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا۔ ''ہم نے تو توجہ یکساں کی تھی تم پر اس لئے اثر نہیں ہوا کہ تمہارے دل سخت تھے۔''

ان تینوں نے پھر دست بستہ ہو کر فیض کیلئے التجا کی تو حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا۔ ''اس کیلئے شرط یہ ہے کہ تم اور تمہاری اولادیں، ہماری اولاد اور پسماندوں کیلئے دنیاوی احوال کی مروت نہ کریں اور ہمارے مکان پر نہ آئیں تاکہ تمہارے دنیاوی احوال کے سبب ہماری اولاد میں دنیاوی جھگڑے نہ پڑ جائیں۔''

جب شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر نے اقرار کیا کہ وہ ایسا کرے گا تو حضرت سلطان باہوؒ نے مغل حکمراں پر توجہ کی اور اسے خاص فیض تک پہنچایا۔ پھر جب آپؒ نے دہلی سے رخصت ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تو اورنگزیب عالمگیرؒ نے کسی یادگار کیلئے درخواست کی۔

جواب میں حضرت سلطان باہوؒ نے وہیں کھڑے کھڑے کتاب ''اورنگزیب شاہی'' تالیف فرمائی جسے شاہی محرروں نے اسی وقت لکھ لیا اور اس ارشادنامے کو بطور یادگار رکھا پھر آپؒ اسی وقت لوٹ آئے۔

(یہاں بھی کھڑے کھڑے لکھنے سے مراد یہی ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ نے مختصر سے عرصے میں ایک ضخیم کتاب تحریر کرائی۔)

بعض محققین کا دعویٰ ہے کہ شہزادہ داراشکوہ کے حوالے سے سلسلۂ قادریہ، اورنگزیب عالمگیرؒ کے تشدد کا نشانہ بنا ہوا تھا چونکہ حضرت سلطان باہوؒ بھی سلسلۂ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے دارالحکومت میں آپ کی موجودگی کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

''مناقب سلطانی'' کی روایت کے مطابق ڈاکٹر لاجونتی رام کرشن لکھتی ہیں کہ اورنگزیب، حضرت سلطان باہوؒ کے بارے میں اپنے مخبروں سے اطلاعات منگواتا رہتا تھا۔

''پنجاب کے صوفی دانشور'' کے مصنف قاضی جاوید کے بقول دوسری روایتوں سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

ہماری نظر میں یہ ساری روایتیں غیر معتبر ہیں اور عالمگیرؒ جیسے بزرگ حکمراں پر کھلی تہمت...... اورنگزیب اور داراشکوہ کے درمیان محض اقتدار کی جنگ تھی۔ عالمگیرؒ خود بھی ایک صاحب دل صوفی تھے۔ مغل فرمانروا کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے اور خلیفہ حضرت خواجہ معصومؒ سے بیعت کا شرف حاصل تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ خزانۂ شاہی کو رعایا کی ملکیت سمجھنے والا، قرآن کریم لکھ کر اور ٹوپیاں سی کر روزی حاصل کرنے والا، پابند شریعت اور متقی حکمراں صرف اپنے بھائی داراشکوہ کی وجہ سے سلسلۂ قادریہ کے تمام بزرگوں پر ستم ڈھاتا، یہ محض بہتان طرازی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں

......عالمگیرؒ کی محرومی یہ ہے کہ انہیں صرف ہندوؤں اور انگریزوں نے ہی بدنام نہیں کیا بلکہ اپنی تنگ نظر اور دنیاداری کے سبب مسلمان مؤرخین اور دانشوروں نے بھی بے جا تنقید کا ہدف بنایا۔

''مناقب سلطانی'' کے مصنف کا یہ تحریر کرنا کہ عالمگیرؒ کا دل سخت تھا، اس لئے ان پر پہلی بار حضرت سلطان باہوؒ کی توجہ کا اثر نہیں ہوا۔ پھر جب مغل شہنشاہ نے دست بستہ درخواست کی تو حضرت سلطان باہوؒ نے انہیں فیضِ روحانی سے سرفراز کیا۔

ہمارے نزدیک اس روایت پر عقیدت کا شدید غلبہ ہے ورنہ تاریخی حقیقت کچھ اور ہے۔ حضرت شیخ سلطان حامدؒ نے جوشِ جذبات میں عالمگیرؒ کو روحانیت سے بے بہرہ ایک سنگدل انسان ثابت کر دیا مگر یہ نہیں دیکھا کہ خود حضرت سلطان باہوؒ، اورنگزیب عالمگیرؒ کے بارے میں کیا تحریر کرتے ہیں۔

''کلید التوحید'' حضرت سلطان باہوؒ کی مشہور تصنیف ہے اس کے آغاز میں حضرت شیخؒ فرماتے ہیں۔

''حمد ونعت کے بعد جاننا چاہئے کہ فقیر باہو ولد بازیہ عرف اعوان ساکن قلعہ شورکوٹ کو محی الدین، تابع علم الیقین، شرع شریف، راسخ الدین شاہ اورنگزیب بادشاہ اسلام کے زمانے میں دیگر رسالوں کے علاوہ اس رسالے کے لکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔

محی الدین، اورنگزیبؒ کا خاندانی نام تھا۔ حضرت سلطان باہوؒ نے عالمگیرؒ کو بادشاہ ہند کے بجائے ''بادشاہِ اسلام'' قرار دیا۔

اسی کتاب ''کلید التوحید'' میں ایک اور مقام پر حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں ۔

برگزیدہ از عباد اللہ الہ
شاہ اورنگ زیب غازی بادشاہ

''اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ مقبول بندوں میں سے سلطان اورنگزیب غازی بادشاہ ہے۔'' (ترجمہ)

جب حضرت سلطان باہوؒ جیسے عظیم المرتبت صوفی ان الفاظ میں عالمگیرؒ کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں تو حرص و ہوس کے اسیر اور دانشوران بے ضمیر کی تحریر کردہ روایتوں کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟

63 سال تک کارِ مسیحائی انجام دینے کے بعد حضرت سلطان باہوؒ 1629ء میں دنیا سے رخصت ہوئے آپ کو دریائے چناب کے کنارے موضع ''قہرگان'' کے قلعے میں سپرد خاک کیا گیا۔

77 سال بعد یعنی 1180ھ میں دریائے چناب شدید طغیانی کی لپیٹ میں آگیا جس کے باعث آپ کے مزار مبارک کے غرق ہوجانے کا خطرہ پیدا ہوا۔ نتیجتاً حضرت سلطان باہوؒ کے جسد مبارک کو بستی سمندری کے قریب منتقل کر دیا گیا۔ اس قدر طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی آپ کا کفن تک میلا نہیں ہوا تھا۔

پھر 157 سال بعد دریائے چناب میں دوبارہ خوفناک سیلاب آیا یہاں تک کہ پانی کی سرکش لہریں مزار مبارک کو چھونے لگی تھیں۔ ایک بار پھر آپ کے جسم مبارک کو منتقل کر کے گڑھ مہاراجہ (ضلع جھنگ) میں آسودۂ خاک کیا گیا۔ اس وقت بھی آپ کا کفن صحیح وسالم تھا۔

حضرت سلطان باہوؒ کی قبر مبارک کی منتقلی میں قدرت کی بڑی عجیب نشانیاں ہیں۔ اگر لوگ سمجھنے کی کوشش کریں۔

''پنجاب کے صوفی دانشور'' میں قاضی جاوید تحریر کرتے ہیں کہ حضرت سلطان باہوؒ کی موجودہ شہرت کا انحصار ان کی پنجابی شاعری پر ہے اسی نے انہیں حیات جاوداں عطا کی ہے۔ یہ ایک ادیب، مؤرخ اور تنقید نگار کی ذاتی رائے ہوسکتی ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت سلطان باہوؒ کیوں زندہ ہیں اور تین سو سال گزر جانے کے بعد بھی بے شمار انسانوں کے دلوں میں کیوں دھڑکتے ہیں۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما!

حضرت سچل سرمستؒ

ولادت......1170ھ، درازن (خیر پور)

وفات......1242ھ، درازن

آپ کا خاندانی نظام عبدالوہاب تھا......مگر سچل سرمستؒ کے نام سے شہرتِ دوام حاصل کی۔ والدِ محترم کا اسمِ گرامی میاں صلاح الدینؒ تھا۔ 38 ویں پشت میں آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے مل جاتا ہے۔ حضرت سچل سرمستؒ کا شمار سندھ کے مشہور صوفیائے کرام میں ہوتا ہے۔ آپ کو سندھی زبان کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی اور پنجابی زبانوں پر پورا عبور حاصل تھا۔ آپ کے ارشادات و ملفوظات شاعری کی صورت میں آج بھی محفوظ ہیں۔

یہ تیرہویں صدی ہجری کے اوائل کا واقعہ ہے۔اس وقت ریاست خیر پور کا حاکم میر رستم علی خان تھا۔ والیٔ خیر پور کی زندگی عیش وسکون میں گزر رہی تھی کہ اچانک اس کا بڑا بیٹا محمد حسین بیمار ہو گیا۔ شروع میں تو یہی سمجھا گیا کہ یہ ایک عام سی بیماری ہے۔ ولی عہد سلطنت چند روز میں صحت یاب ہو جائے گا......مگر جب مرض نے طول کھینچا تو میر رستم علی خان کو فکر لاحق ہوئی۔ اس نے دربار کے طبیب خاص کو طلب کیا۔

''سرکار! پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' طویل معائنے کے بعد درباری طبیب نے عرض کیا۔ ''مرض کی تشخیص ہو گئی ہے۔ میری تجویز کردہ دواؤں سے شہزادہ چند دنوں میں شفایاب ہو جائے گا۔''

طبیب خاص کی پُر یقین گفتگو سن کر حاکم خیر پور میر رستم علی خان مطمئن ہو گیا۔ پھر طبیب خاص کی دوا شروع کی گئی......مگر برائے نام بھی افاقہ نہ ہو سکا بلکہ مرض بڑھتا چلا گیا۔ بیٹے کی محبت نے میر رستم علی خان کو اس قدر بے قرار کر دیا کہ والیٔ خیر پور نے سندھ اور پنجاب کے ان شہروں کی طرف اپنے شہسوار دوڑا دیئے جہاں نامور طبیب موجود تھے۔ چند روز میں کئی طبیبان حاذق خیر پور پہنچ گئے۔ اتنے عرصے میں میر محمد حسین بہت لاغر ہو چکا تھا۔

ماہر اور تجربہ کار حکیموں نے ولی عہد سلطنت کا معائنہ کیا اور مبہم لہجے میں مایوسی کا اظہار کر دیا۔ ''انسانی علم کی حدیں ختم ہو گئیں اور جڑی بوٹیاں اپنا اثر کھو چکیں۔ اب شہزادے کو دواؤں سے زیادہ دعاؤں کی ضرورت ہے۔''

یہ کہہ کر طبیبوں کی جماعت چلی گئی اور میر رستم علی خان تمام تر وسائل کے باوجود اپنے بیٹے کا علاج کرنے سے قاصر رہا۔ حویلی ماتم کدہ بنی ہوئی تھی اور ہر مکین سوگوار تھا۔ اسی کرب ناک فضا میں ایک خدمت گار نوید جانفزا لے کر آیا۔

''سرکار! آپ کے علاقے میں ایک درویش خدامست رہتے ہیں۔ ان کے بارے میں سنا ہے کہ مستجاب الدعوات ہیں۔ آپ شہزادے کی صحت کیلئے ان بزرگ سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟''

میر رستم علی خان نے حیرت سے اپنے خدمت گار کی طرف دیکھا۔ ”وہ بزرگ کہاں رہتے ہیں؟“

”درازن میں۔“ خدمت گار نے عرض کیا۔ ”درازن“ ریاست خیر پور کا مضافاتی علاقہ ہے۔ بعض مؤرخین نے ”درازن“ کو ”درازا“ بھی تحریر کیا ہے۔

”تو پھر بزرگ کی خدمت میں جا کر عرض کرو کہ ہم ان کے دیدار سے مشرف ہونا چاہتے ہیں۔“ میر رستم علی خان نے بے قرار ہو کر کہا۔

خدمت گار نے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو کر والیٔ خیر پور کی خواہش کا اظہار کیا تو بزرگ نے شان بے نیازی کے ساتھ فرمایا۔ ”امیروں کی حویلی میں فقیروں کا گزر کہاں؟“

میر رستم علی خان کے خدمت گار نے اصرار کیا تو بزرگ نے فرمایا۔ ”دراصل درویش کو محلات کی آب و ہوا راس نہیں آتی۔ طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔“

والیٔ خیر پور کا خدمت گار درویش کی گفتگو کا مفہوم نہ سمجھ سکا اور ناکام و نامراد واپس جانے لگا۔ خانقاہ کے دروازے پر ایک مجذوب نما شخص نے اسے روک کر کہا۔ ”اتنی آسانی سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔“

میر رستم علی خان کا خادم مجذوب کی بات سن کر چونک اٹھا۔ ”پھر مجھے اپنی مراد کس طرح حاصل ہو گی؟“

”مخدوم کے دامن سے لپٹ جانا۔“ مجذوب نے کہا۔ ”مخدوم انکار کریں گے کہ وہ کچھ نہیں ہیں ......مگر تم ان کے دامن سے لپٹے رہنا اور درخواست کرتے رہنا۔ اگر تم مخدوم کے انکار سے اُکتا گئے تو پھر کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

خدمت گار واپس چلا گیا اور اس نے درویش کا جواب میر رستم علی خان کے گوش گزار کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی خادم نے مجذوب کا واقعہ بھی بیان کر دیا۔

میر رستم علی خان کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر مضطرب ہو کر کہنے لگا۔ ”بزرگ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ حاجت مند نہیں ہیں۔ سوالی تو ہم ہیں۔ اس لئے خود ہی ان کے دروازے پر جائیں گے۔“

پھر میر رستم علی خان اپنے امراء کے ساتھ درویش کی خدمت میں حاضر ہوا اور ولی عہد سلطنت کی شفایابی کیلئے بزرگ کی دعاؤں کا طالب ہوا۔

درویش نے ایک غمزدہ باپ کی التجا سنی اور بے نیازانہ لہجے میں کہا۔ ”جب سارے طبیب ایک بیمار کا علاج کرنے سے قاصر ہیں تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟ نہ مجھے حکمت آتی ہے اور نہ میں جڑی بوٹیوں سے واقف ہوں۔“

”میں تو شیخ کی خدمت میں دعا کیلئے حاضر ہوا ہوں۔“ میر رستم علی خان نے عرض کیا۔

”میری دعاؤں کی قبولیت پر تمہیں یقین ہے؟“ بزرگ نے والیٔ خیر پور سے پوچھا۔

”میں نہیں، ساری دنیا کہتی ہے کہ آپ مستجاب الدعوات ہیں۔“ میر رستم علی خان نے عرض کیا۔

”دنیا غلط کہتی ہے۔“ بزرگ نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”لوگوں کو کیا معلوم کہ کس کی دعائیں

قبول ہوتی ہیں۔ میں اللہ کا ایک گناہ گار بندہ ہوں اور ایک گوشے میں منہ چھپائے پڑا ہوں۔“

میر رستم علی خان اپنے خدمت گار کی زبانی مجذوب کی باتیں سن چکا تھا، اس لئے وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ ”شیخ! آپ کہیں بھی رہیں مگر مستجاب الدعوات ہیں۔ میں آپ کا آستانہ چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔“

اچانک بزرگ کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ ”میر رستم علی خان! بہت دیر ہو گئی ......بہت دیر ہو گئی۔“ درویش کے لہجے سے اُداسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”شیخ! اللہ کے یہاں دیر سویر کچھ نہیں ہے۔“ میر رستم علی خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ”بس اللہ کا حکم ہی سب کچھ ہے۔ جب وہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے تو پھر میرے بیمار بیٹے کو شفا بھی دے سکتا ہے۔ بس آپ کے دست دعا دراز ہونے کی دیر ہے۔“

بزرگ نے سکوت اختیار کیا۔

”شیخ! آپ کی عنایتیں تو عام ہیں۔“ والیٔ خیر پور زار و قطار رو رہا تھا۔ ”پھر میرے بیٹے کیلئے آپ دعا کیوں نہیں کرتے؟“

بزرگ نے غمزدہ باپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میر رستم علی خان! اب تم جاؤ! اللہ تمہارے بیٹے کو شفا بخشے گا......مگر بہت دیر ہو گئی ہے۔ ولی عہد سلطنت کی جان کے لئے بہت بڑا صدقہ دینا پڑے گا۔“

”شیخ! میں اپنے بیٹے کی خاطر بڑے سے بڑا صدقہ دیدوں گا۔“ میر رستم علی خان نے بزرگ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ”میں ولی عہد کیلئے اپنی سلطنت بھی لٹا دوں گا۔“

”نہیں! میر رستم علی خان! وہ صدقہ تم نہیں دے سکو گے۔“ درویش نے پُرسوز لہجے میں کہا۔ ”وہ صدقہ ہم ہی دیں گے۔ تمہیں فرزند کی زندگی مبارک ہو۔“

آخر والیٔ خیر پور میر رستم علی خان واپس چلا گیا۔ حویلی پہنچ کر اس نے یہ ناقابل یقین منظر دیکھا۔ ولی عہد سلطنت میر محمد حسین کے چہرے کی مردنی ختم ہو گئی تھی اور اب اس کے چہرے پر زندگی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

جب میر رستم علی خان واپس چلا گیا تو درویش نے سجدے میں سر رکھ دیا اور نہایت رقت آمیز لہجے میں دعا کرنے لگے۔

”اے علیم و خبیر! تو خوب جانتا ہے کہ رستم علی خان کے بیٹے میر محمد حسین کی زندگی لوحِ محفوظ پر ختم ہو چکی ہے......مگر تو اس پر بھی قادر ہے کہ جسے چاہے برقرار رکھے اور جسے چاہے مٹا دے۔ والیٔ خیر پور مجھے تیرا مستجاب الدعوات بندہ سمجھتا ہے اور وہ میرے پاس بڑی اُمیدیں لے کر آیا تھا۔ مجھے اس بات سے بہت شرم آئی کہ میں اسے خالی ہاتھ لوٹا دوں۔ حالانکہ سب تیرے ہی در کے بھکاری ہیں، جسے جو کچھ بھی ملتا ہے تیرے ہی خزانۂ غیب سے ملتا ہے۔ مجھ فقیر کو بھی تیرے ہی آستانۂ کرم سے ایک بیٹا عطا ہوا ہے۔ جان کا صدقہ جان ہے۔ اس لئے اے میرے کریم! تو میرے بیٹے کے بدلے میں میر محمد حسین

کو نئی زندگی عطا کر دے۔''

پھر جیسے ہی بزرگ کی دعا ختم ہوئی، میر رستم علی خان کا بیٹا میر محمد حسین صحت یاب ہونے لگا......اور درویش کا بیٹا بستر علالت پر دراز ہو گیا۔

پھر جس روز ولی عہد سلطنت نے غسل صحت کیا، اسی دن درویش نے اپنے بیٹے کو قبر میں اُتارا۔

میر رستم علی خان اظہار شکر گزاری کے طور پر قیمتی تحائف لے کر بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خانقاہ کی حدود میں داخل ہو کر والئ خیر پور نے دیکھا کہ ہر چہرہ غم میں ڈوبا ہوا ہے......اور ہر آنکھ اشکبار ہے۔

''آخر یہاں کیا سانحہ پیش آیا ہے؟'' میر رستم علی خان نے درویش کے خدمت گاروں سے پوچھا۔

''ایسا سانحہ جو کسی پتھر کے ساتھ پیش آتا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔'' ایک خادم نے شیخ کے فرزند کے انتقال کی خبر سناتے ہوئے کہا۔

میر رستم علی خان دم بخود رہ گیا۔

''اور یہ سب کچھ آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔'' درویش کے خادم خاص نے میر رستم علی خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میری وجہ سے؟'' والئ خیر پور نے حیران ہو کر کہا۔

''آپ شیخ سے اپنے بیٹے کی صحت کیلئے دعا کرانے آئے تھے۔'' خادم خاص نے وضاحت کی۔ ''مگر شیخ کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ ولی عہد سلطنت کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ اس لئے ہمارے مخدوم نے بارگاہِ ذوالجلال میں اپنے فرزند کی جان کا صدقہ پیش کر دیا۔''

یہ سن کر والئ خیر پور کو سکتہ سا ہو گیا۔ پھر جب اس کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو وہ بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درویش سے لپٹ کر کہنے لگا۔

''شیخ! یہ آپ ہی کا حوصلہ تھا اور اس انداز کا صدقہ آپ ہی پیش کر سکتے تھے۔'' والئ خیر پور درویش سے لپٹا رو رہا تھا۔ ''ایک غیر شخص کیلئے اپنے فرزند کی قربانی دینا، درویشوں ہی کا منصب ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ بات یہاں تک پہنچ جائے گی۔''

''بات جہاں تک پہنچنا تھی، پہنچ گئی۔'' درویش نے میر رستم علی خان کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ''مشیت میں یوں ہی لکھا تھا۔ تمہیں ولی عہد سلطنت کی زندگی مبارک ہو۔''

میر رستم علی خان واپس چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے سارے تحائف ان فقراء میں تقسیم کر دیئے جو بزرگ کی گلیوں میں پڑے رہتے تھے۔

یہ کریم النفس، حوصلہ مند اور جانباز درویش، سندھ کے مشہور بزرگ حضرت سچل سرمستؒ تھے جنہوں نے ایک غمزدہ باپ کو پُرسکون دیکھنے کیلئے اپنے بیٹے کی جان کا صدقہ پیش کر دیا تھا۔ صوفیاء کی تاریخ میں ایسے کئی واقعات مشہور ہیں۔

اور جہاں تک صدقۂ جان کا تعلق ہے تو اس کی حقیقت بھی تسلیم شدہ ہے۔ اگر صدقہ جان صدق نیت سے پیش کیا جائے تو بارگاہِ ذوالجلال میں قبول ہو جاتا ہے۔ مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر کا واقعہ مشہور ہے کہ جب ولی عہد سلطنت نصیر الدین ہمایوں بیمار ہوا اور ہندوستان بھر کے حاذق اطباء اس کے علاج سے عاجز آ گئے تو کسی درباری عالم نے بابر کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''اگر شہنشاہ اپنی سب سے قیمتی چیز کا صدقہ دیں تو ولی عہد سلطنت کے سر سے یہ بیماری ٹل سکتی ہے؟''

''ہمارے پاس سب سے قیمتی شے کیا ہے؟'' ظہیر الدین بابر نے اپنے وزیروں اور مشیروں سے پوچھا۔

مغلیہ سلطنت کے وزیر خزانہ نے جواباً عرض کیا۔ ''ہمارے پاس دنیا کا سب سے قیمتی اور نایاب الماس (ہیرا) موجود ہے جو ہمیں سلطان علاء الدین خلجی کے خزانے سے حاصل ہوا تھا۔''

مختلف لوگوں نے مختلف صدقات دینے کے مشورے دیئے۔ آخر ظہیر الدین بابر نے اپنے مشیروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب حقیر ترین چیزیں ہیں۔ انسان کی زندگی سے قیمتی کوئی شے نہیں ہوتی۔ اس لئے ہم بارگاہِ ذوالجلال میں ہمایوں کیلئے اپنی جان کا صدقہ پیش کریں گے۔''

یہ کہہ کر مغل شہنشاہ نے وضو کیا اور ہمایوں کے بستر کے گرد سات چکر لگائے۔ اولاد سے بے پناہ محبت کرنے والا باپ باآواز بلند یہ دعا مانگ رہا تھا۔ ''اے تمام جہانوں کے پالنے والے اور مضطرب الحال بندوں کی دعائیں سننے والے! ہمایوں کی ساری بلائیں بابر کے سر! میرے اس صدقے کو قبول فرما کہ تیرے سوا کوئی دینے والا نہیں۔''

سات چکر لگانے کے بعد بابر پر بیماری کے آثار طاری ہونے لگے اور نصیر الدین ہمایوں صحت یاب ہونے لگا۔ پھر جب ہمایوں نے غسل صحت کیا، ظہیر الدین بابر کو غسل میت دیا گیا۔ صدقۂ جان کی حیثیت اپنی جگہ مگر قبولیت اور غیر قبولیت کا انحصار صرف باری تعالیٰ کی مرضی پر ہے۔

حضرت سچل سرمستؒ کی زندگی کے اس اہم ترین واقعے کو مرزا علی قلی بیگ نے اپنی کتاب میں قلم بند کیا ہے۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

خیر پور سندھ کی حدود میں رانی پور سے ایک میل کے فاصلے پر شمال میں ''درازن'' یا ''درازا'' نام کا ایک قصبہ ہے۔ اسی قصبے میں حضرت سچل سرمستؒ پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ پیدائش میں نمایاں اختلافات پایا جاتا ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت سچل سرمستؒ 1170ھ میں پیدا ہوئے......مگر اکثر مؤرخین کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ آپ نے 1152ھ میں آنکھ کھولی۔ حضرت سچل سرمستؒ کا خاندانی نام عبدالوہاب فاروقیؒ تھا۔ انتالیسویں پشت میں آپ کا سلسلۂ نسب امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ سے مل جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی وفات کے بعد آپ کے پوتے شیخ شہاب الدین فاروقیؒ حجاز مقدس

سے عراق منتقل ہو گئے تھے۔ آپ اپنے وقت کے بہت بڑے مدبر تھے اور سیاسی اُمور پر گہری نظر رکھتے تھے۔ جب مسلمانوں نے سندھ پر پہلا حملہ کیا تو اسلامی لشکر کی قیادت بدیل بن طہفہ کر رہے تھے۔ اس معرکہ آرائی میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور بدیل بن طہفہؒ شہید ہو گئے۔ اس شکست کے بعد حضرت شیخ شہاب الدین فاروقیؒ ہی نے گورنر عراق حجاج بن یوسف کو مشورہ دیا کہ سندھ کے سرحدی علاقوں میں تبلیغ اسلام کیلئے بڑے بڑے علماء کو روانہ کیا جائے۔ حجاج بن یوسف نے آپ کی اس تجویز کو پسند کیا۔ پھر جب عامل عراق نے اپنے نوجوان بھتیجے اور داماد محمد بن قاسمؒ کو سندھ پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا تو حضرت شیخ شہاب الدین فاروقیؒ بھی جواں سال امیر لشکر کے ساتھ تھے۔

اکثر تاریخی روایتوں کے مطابق حضرت شیخ شہاب الدین فاروقیؒ فاتح سندھ محمد بن قاسمؒ کو ملکی اور فوجی اُمور میں نہایت مفید مشورے دیا کرتے تھے۔ نتیجتاً سندھ کے غیر مسلم قبائل قطار در قطار حلقۂ اسلام میں داخل ہونے لگے اور مملکت اسلامیہ کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئیں۔ شیخ شہاب الدینؒ کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے شیخ محمد فاروقؒ سیوستان کے حاکم مقرر ہوئے۔ شیخ محمد فاروقؒ کے بعد ان کے فرزند مخدوم نورالدینؒ فرمانروائی کے منصب پر فائز ہوئے۔ پھر سیوستان کی حکمرانی نسل در نسل اسی خاندان میں منتقل ہوتی رہی۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے خلیفۂ حضرت مخدوم حجارؒ بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت سچل سرمستؒ کا تعلق بھی اسی عظیم خاندان سے تھا۔

☆☆.................☆☆.................☆☆

حضرت سچل سرمستؒ کے دادا محترم کا اسمِ گرامی خواجہ محمد حافظؒ تھا۔ مگر عام طور پر آپ سائیں صاحب دینہ فاروقیؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت سائیں دینہؒ اپنے وقت کے ولی کامل تھے۔

حضرت سچل سرمستؒ اپنی ایک فارسی تصنیف میں حضرت سائیں دینہؒ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

"اس وقت سندھ پر کلہوڑہ خاندان کی حکومت تھی۔ اسی حکومت میں میرے دادا محترم حضرت صاحب دینہؒ ایک اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ ایک روز میاں صاحب کسی سرکاری کام سے کوٹری کبیرہ ضلع نوابشاہ سے "ڈیونول" گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جنگل پڑتا تھا۔ جب میاں صاحب دینہؒ جنگل میں داخل ہوئے تو آپ کو ایک مجذوب عورت بیٹھی نظر آئی۔ میاں صاحبؒ نے اسے ایک مخبوط الحواس عورت سمجھا اور آگے بڑھ گئے۔ ابھی میاں صاحب دینہؒ نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ مجذوب عورت کی آواز سنائی دی۔

"میاں صاحب دینہ کہاں جا رہے ہو؟"

حضرت صاحب دینہ فاروقیؒ کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ آپ کو شدید حیرت ہوئی کہ ایک مخبوط الحواس عورت ان کا نام کس طرح جانتی ہے؟ حضرت صاحب دینہؒ واپس لوٹ آئے اور مجذوب خاتون کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "مائی! میں سرکاری کام سے جا رہا ہوں۔"

"کب تک دوسروں کے کام میں اُلجھے رہو گے؟" مجذوب خاتون نے کہا۔ "پہلے اپنے بگڑے

ہوئے کام تو سنوار لو۔"

حضرت میاں صاحب دینہؒ نے بڑی حیرت سے مجذوب خاتون کی طرف دیکھا۔ آپ نے جس عورت کو فاتر العقل سمجھا تھا وہ بہت ہوش کی باتیں کر رہی تھی۔ "مائی! آخر میرا کیا کام ہے؟"

"تمہیں جس کام کیلئے دنیا میں بھیجا گیا ہے، تم وہی کام نہیں کر رہے ہو۔" مجذوب خاتون نے پُر جلال لہجے میں کہا۔ "میاں صاحب دینہ! ابھی وقت ہے۔ اپنی منزل کی طرف لوٹ جاؤ۔ اللہ تم سے کوئی اور ہی کام لینا چاہتا ہے۔"

حضرت صاحب دینہ فاروقیؒ مجذوب خاتون کی باتوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر واپس لوٹ آئے اور سندھ کے حکمراں کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔

"میاں صاحب! آخر بات کیا ہے؟" سندھ کے حکمراں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیا کسی وزیر سے کوئی چپقلش ہو گئی ہے؟"

"نہیں سرکار! میرا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا ہے۔" میاں صاحب دینہ فاروقیؒ نے کہا۔ "اب میں سرکاری کاموں کے قابل نہیں رہا۔ اس لئے معذرت خواہ ہوں۔"

حاکم سندھ نے بہت چاہا کہ میاں صاحبؒ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں مگر آپ اپنے فیصلے پر قائم رہے اور سرکاری ملازمت چھوڑ کر گھر چلے آئے۔ پھر آپ سلسلۂ قادریہ میں شامل ہو کر حضرت خواجہ عبداللہ جیلانیؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور محنت شاقہ کے بعد سلوک کے مختلف مدارج طے کر کے منصب ولایت تک پہنچے۔

جس مجذوب الحال عورت کے چند جملوں نے حضرت میاں صاحب دینہ فاروقیؒ کی دنیا بدل ڈالی، وہ خاتون بی بی بصریؒ تھیں۔ بی بی بصریؒ اپنے وقت کی بڑی عارفہ تھیں مگر اکثر لوگ ان کے روحانی کمالات سے بے خبر تھے۔

☆☆.................☆☆.................☆☆

میاں صاحب دینہ فاروقیؒ کے دو صاحبزادے تھے۔ ایک میاں صلاح الدینؒ اور دوسرے میاں عبدالحقؒ۔ کسی تاریخ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ دونوں بھائیوں میں بڑا کون تھا؟ میاں صاحب دینہؒ کے وصال کے بعد میاں عبدالحقؒ آپ کے سجادہ نشیں ہوئے۔ بس اسی بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاید میاں عبدالحقؒ عمر میں بڑے تھے۔

میاں صلاح الدینؒ کی شادی کو کئی سال ہو چکے تھے مگر آپ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ آخر ایک دن حسرتوں کی بے آب و گیاہ صحرا میں حق تعالیٰ کے لطف و کرم کی بارش ہوئی اور 1152ھ میں حضرت سچل سرمستؒ پیدا ہوئے۔ تشنہ آرزوئیں سیراب ہوئیں اور میاں صلاح الدینؒ اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔

ابھی حضرت شیخ عبدالوہابؒ (سچل سرمستؒ) کی عمر مبارک چھ سال تھی کہ 1158ھ میں آپ کے والد محترم میاں صلاح الدینؒ کا انتقال ہو گیا اور حضرت سچل سرمستؒ بھی صوفیاء کے اسی گروہ

میں شامل ہو گئے جنہیں انتہائی کم سنی کے عالم میں یتیمی کے صدمۂ جانکاہ سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ میاں صلاح الدینؒ کی وفات کے بعد محترم چچا میاں عبدالحقؒ نے حضرت سچل سرمستؒ کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور اس قدر محبت دی کہ یتیم بھتیجے کے دل و دماغ سے تلخ اور اذیت ناک یادیں محو ہوتی چلی گئیں۔

بعض تاریخی روایتوں کے مطابق ایک حبشی نژاد آیا نے حضرت سچل سرمستؒ کی پرورش کی۔ اس آیا کا نام ''جوشیدی'' تھا۔ حضرت سچل سرمستؒ اپنی آیا کو ''کالی اماں'' کے نام سے پکارتے تھے۔ اگر خاندان کا کوئی فرد آپ کو اس طرزِ تخاطب پر ٹوکتا تو جوشیدی بے اختیار بول اُٹھتی۔

''نہیں میاں جی! تم مجھے کالی اماں کے نام ہی سے پکارا کرو۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ تمہارے اس طرح پکارنے سے مجھے کیسی خوشی حاصل ہوتی ہے؟''

اس واقعے سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ شاید آپ کی والدہ محترمہ بھی بچپن ہی میں انتقال فرما گئی تھیں۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حضرت سچل سرمستؒ نے حافظ عبداللہ قریشیؒ کی نگرانی میں قرآن کریم حفظ کیا۔ آپ فطرتاً نہایت ذہین انسان تھے۔ تمام تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت سچل سرمستؒ نے چودہ سال کی عمر میں عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ پھر آپ نے اپنے محترم چچا حضرت میاں عبدالحقؒ سے علوم باطنی حاصل کئے اور ان ہی کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔

بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ حضرت سچل سرمستؒ پر بچپن ہی سے عشق و سرمستی کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اسی سلسلے میں ایک عجیب واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک دن سندھ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ حضرت میاں عبدالحقؒ سے ملنے کیلئے ان کے گھر تشریف لائے۔ اس وقت حضرت سچل سرمستؒ کی عمر آٹھ دس سال ہوگی۔ آپ کے پیروں میں گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے آپ کو دیکھا تو اپنے قریب بلایا اور پیار کرتے ہوئے کہا۔

''ہم نے معرفتِ الٰہی کی لذت دل میں حاصل کی ہے......اور جو دیگ ہم نے پکائی ہے اس کا ڈھکن سچل ہی اتاریں گے۔''

بعض روایتوں میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا یہ قول درج ہے۔ ''ہم نے جو خم تیار کیا ہے، اسے سچل ہی کھولیں گے۔''

پھر 1165ھ میں حضرت شاہ بھٹائیؒ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت حضرت سچل سرمستؒ کی عمر مبارک تیرہ سال تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے بعد حضرت میاں نخی قبول محمدؒ آپ کے خلیفہ ہوئے۔ حضرت سچل سرمستؒ نے ان ہی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

بظاہر دونوں روایتوں میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے مگر حقیقتاً یہ ممکن ہے کہ حضرت سچل سرمستؒ نے پہلے اپنے محترم چچا حضرت میاں عبدالحقؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا ہو اور بعد میں حضرت شاہ

عبداللطیف بھٹائیؒ کے سلسلۂ روحانی میں شامل ہو گئے ہوں۔

روایت ہے کہ حضرت سچل سرمستؒ برسوں ویرانوں اور جنگلوں میں پھرتے رہے۔ اس دوران آپ نے سخت ریاضتیں کیں۔ حضرت سچل سرمستؒ کی پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ لوگ آپ کو ''منصورِ آخرالزماں'' کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ منصور سے مراد حضرت منصور حلاجؒ مراد ہیں۔

حضرت سچل سرمستؒ فطرتاً دنیا کی رنگینیوں اور ہنگامہ آرائیوں سے بے نیاز رہا کرتے تھے۔ ایک بار پیر و مرشد حضرت میاں احمد عبدالحقؒ نے حضرت سچل سرمستؒ کے دوستوں کو طلب کر کے فرمایا۔

''سچل اب جوان ہو گیا ہے۔ اس سے پوچھو کہ وہ شادی کی طرف میلان رکھتا ہے یا نہیں؟''

پھر جب دوستوں نے حضرت سچل سرمستؒ سے ازدواجی زندگی کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے کسی تامل کے بغیر فرمایا۔ ''میں ان اُلجھنوں اور بکھیڑوں کو پسند نہیں کرتا۔ شادی ایک زنجیر ہے اور میں اس زنجیر سے آزاد رہنا چاہتا ہوں۔''

دوستوں نے حضرت میاں عبدالحقؒ کو حضرت سچل سرمستؒ کے جواب سے آگاہ کیا تو آپ نے ایک دن خود ہی بھتیجے کے سامنے یہ موضوع چھیڑ دیا۔ حضرت سچل سرمستؒ نے پیر و مرشد کی خدمت میں بھی وہی الفاظ دہرا دیئے۔

بھتیجے کی گفتگو سن کر حضرت میاں عبدالحقؒ نے فرمایا۔ ''فرزند! شادی ایک زنجیر نہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی ایک معروف سنّت ہے۔ اگر شادی کی استطاعت ہو تو ضرور کرو کہ اس کے بغیر انسان کی تکمیل نہیں ہوتی۔''

اگرچہ حضرت سچل سرمستؒ شادی کی پابندیوں سے آزاد رہنا چاہتے تھے لیکن پیر و مرشد کی رضا کے سامنے آپ نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ پھر حضرت میاں عبدالحقؒ نے اپنی صاحبزادی کے ساتھ حضرت سچل سرمستؒ کا نکاح کر دیا۔ کچھ روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ آپ کی رفیقۂ حیات شادی کے بعد دو سال تک حیات رہیں۔ پھر اچانک بیمار ہوئیں اور چند روز بعد انتقال کر گئیں۔ اکثر تذکرہ نگاروں کی تحقیق کے مطابق آپ کے کوئی اولاد نہیں تھی۔

بعض تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ حضرت سچل سرمستؒ کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جو بعد میں وفات پا گیا۔ اگر یہ روایت درست ہے تو پھر والیٔ خیرپور میر رستم علی خان کا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا اور اپنے قریب المرگ بیٹے میر محمد حسین کی صحت یابی کیلئے دعا کرانے کا واقعہ بھی صحیح ہے......اور اگر حضرت سچل سرمستؒ کے بے اولاد ہونے کی روایت درست ہے تو پھر ہمیں میر رستم علی خان کی حاضری اور میر محمد حسین کی شفایابی کے سلسلے میں کوئی اور توجیہہ پیش کرنی ہوگی۔

☆☆..................☆☆..................☆☆

حضرت میاں عبدالحقؒ آپ کو محبت سے ''سچو'' پکارتے تھے۔ اس لئے آپ نے مرشد کے اس خطاب کو اپنا تخلص قرار دیا اور پھر روحانیت اور شعر و ادب کی دنیا میں ''سچل سرمست'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعض روایتوں کے مطابق آپ بچپن سے سچ بولا کرتے تھے، اس لئے پیر و مرشد نے

آپ کو ''سچو'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔ سندھی زبان میں آپ کو ''سچو'' اور ''سچے ڈینہ'' کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ پنجاب کے لوگ آپ کو ''سچل'' کہا کرتے تھے۔ چونکہ آپ نے فارسی زبان میں بھی شاعری کی ہے، اس لئے ''آشکار'' تخلص اختیار کیا۔

حضرت سچل سرمستؒ کا قد درمیانہ، رنگ گندمی، پیشانی کشادہ اور خدوخال بہت دلکش تھے۔ سر کے بال لمبے تھے اور ہمیشہ سبز رنگ کی ٹوپی پہنتے تھے۔ سفید کرتا اور سفید تہہ بند آپ کا پسندیدہ لباس تھا۔ جب آپ پر عالم جذب طاری ہوتا تو ننگے پاؤں پھرا کرتے تھے۔ ہاتھ میں ہر وقت ایک لمبی لکڑی رکھتے تھے۔ حضرت سچل سرمستؒ کو موسیقی سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ اس لئے یکتارہ (طنبورہ) آپ کے پاس ہوتا تھا۔ بہت کم سوتے اور بہت کم کھاتے تھے۔ اکثر روزہ رکھتے تھے اور لکڑی کی چوکی پر مراقبے میں بیٹھے رہتے تھے۔

حضرت سچل سرمستؒ بہت رحم دل اور سخی انسان تھے۔ پانچوں وقت کی نماز ادا کرتے اور شریعت پر سختی کے ساتھ عمل پیرا رہتے۔ جب کیف و جذب کی حالت ہوتی تو آپ یکتارہ بجا کر گانے لگتے تھے۔ پھر جب ہوش میں آتے تو آپ کو کچھ یاد نہ رہتا۔ اگر کوئی دوست یاد دلاتا تو نہایت پُرسوز لہجے میں فرماتے۔

''وہ میری مستی کا عالم ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کیا کہتا ہوں اور کیا کرتا ہوں؟''

اسی وجہ سے آپ نے اپنا بہت سا کلام دریا برد کرا دیا۔ کسی مرید نے پوچھا۔ ''شیخ! آپ نے بڑی جانفشانی سے یہ اشعار کہے تھے۔ پھر انہیں غرق دریا کیوں کر رہے ہیں؟''

جواب میں حضرت سچل سرمستؒ نے فرمایا۔ ''پتا نہیں، لوگ میری بات کا کیا مطلب سمجھیں اور پھر سیدھے راستے سے بھٹک جائیں۔ اس لئے ان چیزوں کا مٹ جانا ہی بہتر ہے۔''

☆☆..........☆☆..........☆☆

حضرت سچل سرمستؒ کو کئی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ اس لئے کئی زبانوں میں آپ کی شاعری موجود ہے۔ مرزا قلیچ بیگ کے مطابق آپ کے اشعار کی تعداد 9 لاکھ 36 ہزار 6 سو کے قریب ہے۔ آپ کو سندھی زبان میں مرثیے کا بانی کہا جاتا ہے۔ بعض تحقیق نگاروں نے حضرت سچل سرمستؒ کی بیس تصانیف کی نشاندہی کی ہے جن میں مندرجہ ذیل بہت زیادہ مشہور ہیں۔ کافیاں اور دوہے (سندھی اور سرائیکی)......راز نامہ (فارسی)......وحدت نامہ (فارسی)......رہبر نامہ (فارسی)......گداز نامہ (فارسی)......غزلیات (اردو)......اور دیوان آشکار (فارسی)

''دیوان آشکار'' کو پہلی بار والئی خیر پور میر علی مراد خان تالپور نے شائع کرایا تھا۔

حضرت سچل سرمستؒ ''وحدت الوجود'' کے قائل تھے۔ آپ کی شاعری میں قدم قدم پر اس نظریئے کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ ''کوئی اور سمجھنا گناہ ہے۔ ہر صورت میں رب کریم کا جلوہ ہے......کوئی مجھے کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ......لیکن مجھے پروا نہیں......کیونکہ میں جو کچھ ہوں وہی ہوسکتا ہوں۔'' (ترجمہ)

حضرت سچل سرمستؒ کو سرکار دو عالم ﷺ سے بے پناہ محبت تھی۔ ایک مقام پر اس طرح اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

''سید المرسلین ﷺ نے میرے حال پر لطف فرمایا اور مجھے عاشقوں کی جماعت میں شامل کر دیا۔ وحدت کے راز سے مجھے آگاہ کیا۔ پہلے میں ایک گداگر تھا مگر آپ ﷺ نے مجھے شاہ بنا دیا۔'' (ترجمہ)

یہی وہ عشق رسول ﷺ تھا جس نے حضرت سچل سرمستؒ کی نگاہ کو کیمیا اثر بنا دیا تھا۔ اگر زنگ آلود لوہے پر ایک نظر ڈال دیتے تو وہ سونا بن جاتا۔ آپکے دست حق پرست پر ہزاروں بت پرست ایمان لائے اور دولت اسلام سے مالا مال ہوئے۔ علامہ اقبالؒ نے مرد مومن کی اسی شان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

☆☆..........☆☆..........☆☆

ایک بار ریاست خیر پور کے حاکم میر رستم علی خان شکار سے واپس آرہے تھے۔ ان کے ہمراہ وزیروں اور امیروں کا ایک ہجوم تھا۔ اتفاقاً اس وقت حضرت سچل سرمستؒ اپنے جسم مبارک پر ملتانی مٹی ملے ہوئے کنویں کے قریب تشریف فرما تھے۔ ابھی آپ نہانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ میر رستم علی خان اپنے لشکر کے ساتھ آپہنچے۔ حضرت سچل سرمستؒ پر نظر پڑی تو والئی خیر پور قدم بوسی کیلئے آگے بڑھے مگر آپ کے بدن کو مٹی سے آلودہ دیکھ کر رک گئے اور دور سے مزار پرسی کرنے لگے۔ میر رستم علی خان کے چھوٹے بھائی میر علی مراد خان لشکر کے آخر میں تھے۔ جب وہ وہاں پہنچے اور حضرت سچل سرمستؒ کو موجود پایا تو بے تکلفانہ آگے بڑھے اور حضرت شیخؒ سے لپٹ گئے۔

حضرت سچل سرمستؒ نے میر مراد علی خان کی یہ عقیدت دیکھ کر بے اختیار انہیں اپنے سینے سے لگا لیا۔ میر مراد علی خان کی قیمتی پوشاک اور چہرے پر جگہ جگہ گیلی مٹی کے داغ اُبھر آئے۔ حضرت سچل سرمستؒ نے میر رستم علی خان کی طرف دیکھ کر فرمایا۔

''میر صاحب! تم نے مجھے خاک آلود سمجھا اور دور دور رہے......تمہیں دھوکا ہوگیا۔ وہ ملتانی مٹی نہیں تھی۔ جاہ و اقتدار کی مہندی کا رنگ تھا جو میر علی مراد خان کو لگ گیا ہے۔''

حضرت سچل سرمستؒ کی یہ دعا 1843ء میں قبول ہوئی، جب آپ کو دنیا سے رخصت ہوئے ستائیس سال گزر چکے تھے۔ انگریزوں نے سندھ کے تمام میروں سے اقتدار چھین کر برطانوی حکومت قائم کر دی تھی۔ اس وقت پورے سندھ میں خیر پور ہی ایک ایسا علاقہ تھا جس پر میر علی مراد خان کی حکمرانی تھی۔

حضرت سچل سرمستؒ زندگی بھر بیمار نہیں ہوئے مگر آخری وقت میں آپ کو خونی پیچش کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ پھر اسی مرض میں آپ نے 14/رمضان المبارک 1342ھ کو انتقال فرمایا۔ وصال سے چند روز قبل پہلے حضرت سچل سرمستؒ نے مریدوں کی تیمارداری اور بے قراری دیکھ کر واضح الفاظ میں

اپنے سفرِ آخرت کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔

''تم لوگ مجھے روکنے کی کوشش کر رہے ہو اور میں اپنے آقا حضور اکرم ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہونے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔''

حضرت سچل سرمستؒ خاک دراازن میں آسودۂ خواب ہیں۔ والیٔ خیر پور میر رستم علی خان نے مزار مبارک پر مقبرہ تعمیر کرایا۔ پونے دوسو سال گزر گئے۔ اہل دل کے ہزاروں قافلے اپنی پیاسی آنکھوں کو سیراب کرنے کیلئے روضہ مبارک پر حاضر ہو چکے ہیں...... اور یہ سلسلہ قیامت تک اسی طرح قائم رہے گا۔

(ختم شد)